

پس مرگ زندہ

مولانا نور عالم خلیل امینی

استاذ ادب عربی و رئیس تحریر ”الداعی“ عربی

دارالعلوم دیوبند



ادارۃ علم و ادب، افریقی منزل قدیم، نزد چھ مسجد، دیوبند، یوپی، انڈیا

پسِ مرگِ زندہ

عبداللہ سندھي م ۱۳۴۹ء → ۱۹۱۱ء

پسِ مرگِ زندہ

مولانا نور عالم خلیل امینی (پ: ۱۸-۱۲-۱۹۵۲)
(۱۹۶۵)
استاذ ادبِ عربی و رئیس تحریر ”الداعی“ عربی
دارالعلوم دیوبند



ادارہ علم و ادب، افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی، انڈیا

جملہ حقوق بہ حق مؤلف محفوظ

Pas -e- Marg Zindah

By: Maulana Noor Alam Khalil Amini

نام کتاب : پسِ مرگِ زندہ
نام مؤلف : مولانا نور عالم خلیل امینی
ناشر : ادارہ علم و ادب، دیوبند، یوپی
طباعت بہ ذریعہ : فرید بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی ۲
پہلا ایڈیشن : جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ = مئی ۲۰۱۰ء

● ملنے کے پتے ●

۱- ادارہ علم و ادب، افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد، دیوبند ۲۴۷۵۵۴، یوپی

IDARA-E-ILM-O-ADAB

AFRIQI MANZIL QADEEM

NEAR CHHATTA MASJID

DEOBAND-247554 (UP) INDIA

Ph: 01336-222188

Mob: 09412508283

- ۲- کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد، دیوبند، یوپی، انڈیا
۳- کتب خانہ حسینیہ، نزد مسلم فنڈ، دیوبند، یوپی، انڈیا
۴- دگر کتب خانہ ہائے دیوبند
۵- فرید بک ڈپو، ۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون: 011-23289786, 23289159

موت ، تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں، بیداری کا اک پیغام ہے
(علامہ اقبالؒ)

فہرست مضامین

حرف ناگزیر _____ ۳۱

سید الملت

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی ۱۰۷-۳۷

- * ہمہ جہت عالم دین _____ ۴۰
- * بلند پایہ محدث و فقیہ و مفتی _____ ۴۰
- * شان دار و پیغام رساں اہل قلم _____ ۴۱
- * حیوانِ کاتب _____ ۴۲
- * ممتاز مؤرخ و سوانح نگار _____ ۴۲
- * شب بیدار و خوش اوقات عالم _____ ۴۳
- * شیخ الاسلام کے خوانِ سلوک و احسان کے خوشہ چیں _____ ۴۴
- * میدانِ سیاست کے ٹکان نا آشنا شہ سوار ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں _____ ۴۵
- * جمعیۃ علما کے تاریخی اجلاس منعقدہ امر وہہ کی معنویت _____
- اور حضرت کا بہ حیثیت ذمے دار انتخاب _____ ۴۶
- * قید و بند کی آزمائشیں اور حفظ قرآن پاک _____ ۴۶
- * ارتداد کے خطرے کا سد باب اور مجاہدانہ سرگرمیاں _____ ۴۷
- * آزادی کے بعد نسل نو کے لیے ایمانی _____
- و عقائدی حفاظتی دیوار کی تعمیر میں بنیادی کردار _____ ۴۷
- * ادارہ مباحث فقہیہ کا قیام اور اس کی ذمے داری _____ ۴۸
- * الجمعۃ کا احیاء نو اور اس کی ادارت _____ ۴۸
- * راقم السطور کے لیے، حضرت کی حیثیت _____ ۴۸
- * محرومی کی تلخی اور دست گیری کی شیرینی _____ ۴۹
- * حضرت کی عنایتوں کا تسلسل _____ ۵۱

- * علمی ہدیے اور تاریخی یادیں ۵۲
- * دہلی کی دل بری و دل ستانی ۵۳
- * دہلی.. آئی جب اُس کی یاد تو آتی چلی گئی ۵۵
- * دہلی سے دوری کی ناگزیر وجہ ۵۷
- * حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ سے اُن کے دفتر میں ملاقات ۵۹
- * جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے درخواست ۶۰
- * درخواست پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصدیق ۶۲
- * حضرت مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں ۶۴
- * نیکی کا قیام ۶۵
- * نیکی پر قیام کے لیے حضرت کی منظوری ۶۷
- * حضرت کا مکتوب کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں
- اس سال راقم کا داخلہ نہیں ہو سکا ۷۰
- * حضرت مولانا علی میاںؒ کو، حضرت الاستاذ کے خط کے مضمون سے آگاہی ۷۲
- * ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت اور حضرت کو اس کی اطلاع ۷۴
- * حضرت الاستاذ کا ایک خط جو راقم کے لیے وثیقہٴ سعادت ہے ۷۶
- * حضرت الاستاذ کی میرے لیے مسلسل دل سوزی ۷۸
- * حضرت کی احقر کو حسن خط کی داد ۷۹
- * راقم کے درد کو اپنا درد بنالینے کی حضرت کی سعی ۸۰
- * لکھنؤ سے دہلی کا ایک سفر اور حضرت کی زیارت سے شرف یابی ۸۱
- * سیاسی و اقتصادی مسائل کے بعض ابواب کا عربی ترجمہ ۸۳
- * حضرت کی وفات پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی راقم سے تعزیت ۸۳
- * اہم تالیفات ۸۴
- * سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی ۸۶
- * دینی تعلیم و تربیت ۸۹
- * حضرت کے پس ماندگان ۹۰
- * اشیات سوانح (مولانا سید) محمد میاںؒ
- خودنوشت سوانح حضرت مولانا سید محمد میاںؒ ۹۲

- * خاندان اور ولادت ۹۲
- * تعلیم کی بسم اللہ ۹۳
- * آگے کی تعلیم اور دارالعلوم سے فراغت ۹۳
- * تدریسی سلسلہ اور اُس کی تقریب ۹۴
- * مدرسہ شاہی مراد آباد میں ۹۵
- * سیاسی تحریک میں شرکت کی ابتدا ۹۶
- * جمعیتہ علمائے مراد آباد کی ذمہ داری ۹۷
- * اجلاسِ امر وہہ کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ ۹۸
- * مراد آباد سے دہلی آ کر جامع مسجد میں ہر جمعہ کو
- تقریر کی ڈیوٹی کی انجام دہی اور گرفتاری ۱۰۰
- * ”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ کی اشاعت اور ضبطی ۱۰۱
- * ۱۹۴۲ء میں گرفتاری اور جیل اور ۱۹۴۴ء میں رہائی ۱۰۲
- * سوانحی نقوش ۱۰۵

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ۱۰۸-۱۷۶

- * رخت ہستی خاک غم کی شعلہ افشانی سے ہے ۱۰۹
- * برصغیر کی دینی ریاست کا امیر ۱۱۰
- * مثالی سراپا ۱۱۱
- * ذوقِ عبادت و ریاضت ۱۱۲
- * باہمہ و بے ہمہ ۱۱۳
- * کمال و یکتائی کے عناصر ۱۱۳
- * وقت کے رازی و غزالی اُستاد ۱۱۴
- * علمی و عملی سرسبزی و شادابی کا ماحول ۱۱۵
- * کم سنی میں منصبِ اہتمام سپرد کیے جانے کی وجہ ۱۱۹
- * ممبرانِ مجلسِ شوریٰ کی منصبِ اہتمام کے تئیں
- اُن کی غیر معمولی لیاقت کی شہادت ۱۲۱
- * حکیم الاسلام کا طویل دورِ اہتمام اور اُس کے ثمرات و برکات ۱۲۲

- * تاریخی صد سالہ اجلاس _____ ۱۲۳
- * صد سالہ اجلاس کے بعد اختلاف کا ماحول اور حکیم الاسلام کا کرب و الم _____ ۱۲۵
- * اختلاف دارالعلوم اور با بصیرت علما کی راے _____ ۱۲۸
- * حکیم الاسلام اور دفاعِ دین و ملت _____ ۱۲۹
- * دفاعِ دین کے تئیں دارالعلوم کا دیرینہ کردار _____ ۱۳۱
- * قاری محمد طیبؒ کے سر، عظمت و تقدس کے تاج کے سبجے کی ایک بڑی وجہ _____ ۱۳۳
- * مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی جد و جہد _____ ۱۳۴
- * حضرت حکیم الاسلام یعنی لاٹانی خطیب _____ ۱۳۹
- * بلبل چمک رہا ہے ریاضِ رسول میں _____ ۱۴۰
- * نرالا اندازِ خطابت _____ ۱۴۳
- * افکار و خیالات کو سامعین کے ذہنوں میں پیوست کرنے کا بے مثال انداز _____ ۱۴۴
- * ایک نحوی کا واقعہ _____ ۱۴۵
- * ایک دلچسپ واقعہ _____ ۱۴۷
- * حکایات و واقعات سے نتائج و مسائل کے استخراج کا عجیب و غریب ملکہ _____ ۱۴۹
- * حکیم الاسلام کی خطابت.. منفرد خصوصیات _____ ۱۵۲
- * کاش ہم مکبر الصوت ہوتے _____ ۱۵۴
- * قناعت اور مسافرانہ زندگی کی فضیلت _____ ۱۵۵
- * مال و دولت تقرّب الی اللہ کا ذریعہ _____ ۱۵۶
- * تقریر کی لذت کی بے پناہی کے، اُن گنت اسباب _____ ۱۵۷
- * سوانحی نقوش _____ ۱۵۸

ادیب، شاعر، نقاد، محقق، عالمِ دین اور مفتی

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلویؒ ۷۷-۲۱۳

- * مولانا کا سراپا _____ ۱۷۸
- * غیر معمولی اصل کی فرع _____ ۱۷۹
- * بے انتہا سادگی اور ڈھیر ساری ہدکاریاں _____ ۱۸۰
- * خاکِ دہلی کا سچا نمائندہ _____ ۱۸۱

- * مولانا کی شخصیت کے تعمیری عوامل ۱۸۴
- * اردو زبان کا نمایندہ ادیب و شاعر و نقاد ۱۸۶
- * اشعار کے نمونے ۱۸۸
- * اہتمام مدرسہ امینیہ ۱۹۱
- * حساس دل انسان اور بہار کے بعد خزاں سے سابقہ ۱۹۲
- * مولانا سے باقاعدہ تعارف کی تقریب ۱۹۳
- * استحکام تعلقات کے عوامل ۱۹۵
- * اہل قلم اور خطاط ۱۹۷
- * بے پایاں شفقت و عنایت ۱۹۹
- * مولانا کے میرے نام شفقت نامے ۲۰۰
- * لکھنؤ سے دہلی کا پہلا سفر اور مولانا کی میزبانی سے شرف یابی ۲۰۸
- * میری دیوبند آمد اور مولانا سے ملاقات ۲۰۹
- * مولانا کی تصنیفات ۲۰۱
- * مولانا کی آل و اولاد اور خاندان ۲۱۱

جلیل القدر عالم وقائد امیر شریعت

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی ۲۱۴-۲۳۸

- * تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں ۲۱۴
- * اور نگاہوں کے تیر، آج بھی ہیں دل نشیں ۲۱۵
- * نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز ۲۱۷
- * میر کا رواں ۲۱۷
- * کارِ خلیماں خارا گدازی ۲۱۹
- * اللہ کے شیروں کو اتنی نہیں رو باہی ۲۱۹
- * عیش منزل ہے، غریبانِ محبت پہ حرام ۲۲۱
- * ہر قدم، معرکہ کرب و بلا ہے درپیش ۲۲۱
- * تو مرد میدان تو میر لشکر ۲۲۵
- * لذتِ تقریر ۲۲۶

- * سلیقہ تحریر ۲۲۷
- * بندہ مولیٰ صفات ۲۲۷
- * تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر ۲۳۲
- * تربیت فکر و آگہی ۲۳۳
- * نظرِ کیمیا اثر کی کرشمہ سازی ۲۳۵
- * سوانحی خاکہ ۲۳۷

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ ایک استاذ، ایک تاریخ

- * ایک اصول پسند انسان ۲۴۰
- * مادرِ علمی سے مثالی وفاداری ۲۴۱
- * باصلاحیت منتظم ۲۴۱
- * باکمال مدرس ۲۴۲
- * محبوبیت و عقیدت کا خراج ۲۴۳
- * مہرِ مادری اور شفقتِ پدری ۲۴۴
- * مولانا کا وطن ۲۴۶
- * مولانا کے لائق اساتذہ ۲۴۶
- * تدریسی سلسلہ ۲۴۷
- * خوش نصیب مربی ۲۴۷
- * پس ماندگان ۲۴۸
- * حلیہ اور اطوار و عادات ۲۴۸
- * عجم کے حسنِ طبیعت کی جلوہ گری ۲۵۰
- * شامِ زندگی ۲۵۲
- * ہم نے کسے کھو دیا ۲۵۴

استاذِ الاساتذہ

حضرت مولانا محمد حسینؒ ”ملا بہاری“ ۲۵۵-۲۷۴

- * ولادت اور تعلیم ۲۵۵

- * درس و افادہ ۲۵۶
- * مولانا کی زندگی کا سبق آموز پہلو ۲۵۸
- * مولانا کی زندگی کا سبق ۲۶۱
- * مولانا کی قابل ذکر خصوصیتیں ۲۶۲
- * اُن کی امیدیں قلیل اُن کے مقاصد جلیل ۲۶۵
- * اُن کی سرگرمی حیات کا خلاصہ ۲۶۶
- * یادوں کے سایے ۲۶۷
- * مولانا کی ناچیز سے خفگی اور پھر رضامندی کا واقعہ ۲۶۸
- * دارالعلوم دیوبند کی تدریسی زندگی میں، مولانا کا مشورہ اور سکونِ خاطر ۲۶۹
- * مولانا کے تعلق سے مہمان خانہ دارالعلوم کا ایک دلچسپ واقعہ ۲۷۱
- * مدعوین سے ”شاہی نذرانے“ کی وصولی ۲۷۱
- * وفات ۲۷۳

یکتاے زمانہ

حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ ۲۷۵-۲۹۸

- * خدائی صنعت کی خاص دین ۲۷۶
- * معلوم سے مجہول تک رسائی کی غیر معمولی صلاحیت ۲۷۷
- * کتابِ علم کے ساتھ، کتابِ آدابِ حیات پڑھانے والا عبقری مُعَلِّم ۲۷۹
- * سچے اور کامیاب مُعَلِّم کا امتیاز ۲۸۲
- * ہمہ گیر عبقریت ۲۸۲
- * آسانی اور خوش اُسلوبی سے دینے والا داتا ۲۸۴
- * ظاہر و باطن کی یکسانیت ۲۸۵
- * جامعیت کا فیضان ۲۸۷
- * مزاح و تنجیدگی کا توازن ۲۸۷
- * کام کرنے اور کام لینے میں طاق ۲۸۸
- * کام تو کام کرنے سے ہی آتا ہے ۲۹۰
- * نوجوانوں کی تعمیر میں اُن کا طریقہ کار ۲۹۱

- * ساجرانہ طرزِ تکلم ۲۹۲
- * دستِ قدرت کے تراشیدہ ۲۹۳
- * جدید و قدیم طبقتوں میں یگانہ ۲۹۳
- * مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ایک نظر میں ۲۹۴

مورخ، محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ ۲۹۹-۳۲۹

- * ناقابلِ پُر خلا ۳۰۰
- * قاضی صاحب کی شناخت ۳۰۱
- * قابلِ رشک حد تک، اپنے کو بڑا بنانے کا ہنر رکھنے والے ۳۰۱
- * قاضی صاحب سے دید و شنید ۳۰۲
- * چہرے مہرے سے، علم و تحقیق کی پھوٹی روشنی ۳۰۶
- * فقرِ غیور کی صنعت گری ۳۰۷
- * عاشقِ علم و مطالعہ ۳۱۰
- * قاضی صاحب کا سراپا ۳۱۱
- * ناچیز کے نام قاضی صاحبؒ کا گرامی نامہ ۳۱۲
- * سوانحی خاکہ ۳۱۳

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ ۳۳۰-۳۶۳

- * آخری مفتی ۳۳۰
- * عظیم سلف کے عظیم خلف ۳۳۰
- * علم و عمل کی صحیح جامعیت ۳۳۱
- * مسجد چھتہ کا سونا پن ۳۳۲
- * غم و آلم کا ہمہ گیر سایہ ۳۳۳
- * دارالعلوم پر حزن و ملال کی خیمہ زنی ۳۳۴
- * اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد ۳۳۶
- * خاندان اور نشو و نما ۳۳۸

- ۳۴۱ _____ * تعلیم و تربیت
- _____ * تدریس و افتاء اور تربیت و دعوت کے میدانوں میں،
- ۳۴۲ _____ مفتی صاحب مرحوم کے کارہائے نمایاں
- ۳۴۴ _____ * دارالعلوم دیوبند میں آپ کے کارنامے
- ۳۴۶ _____ * دارالعلوم میں رہائش
- ۳۴۶ _____ * علمی کارنامے
- ۳۴۹ _____ * ادبی و شاعرانہ ذوق
- ۳۴۹ _____ * علمی، اصلاحی اور دعوتی اسفار
- ۳۵۰ _____ * نسب اور گھریلو علمی و دینی حالات
- ۳۵۳ _____ * صحت و تن و رستی
- ۳۵۵ _____ * وفات حسرت آیات
- ۳۵۸ _____ * انسانیت و عبودیت کا پیکر
- ۳۶۱ _____ * سراپا
- ۳۶۲ _____ * مختصر سوانحی خاکہ

علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ حلبی شامیؒ ۳۶۴-۳۹۴

- ۳۶۵ _____ * علم و عمل میں بے نظیر عالم
- ۳۶۷ _____ * علمائے ہند سے ربط و تعلق
- ۳۶۸ _____ * دارالعلوم دیوبند اور اُس کے مشائخ سے عقیدت
- ۳۶۹ _____ * علمی ہمہ گیری
- ۳۷۰ _____ * علامہ کی ایک اور خصوصیت
- _____ * نواذیر کتب کے حصول کا شوق بے پناہ
- ۳۷۲ _____ * اور اس سلسلے کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات
- ۳۷۶ _____ * جس کے شعلے نے جلا، بیکڑوں فانوس دیے
- ۳۷۷ _____ * کچھ حسین یادوں کے اُجالے میں گرم تھا اور میرا مٹنڑم سرد!
- ۳۷۸ _____ * علمی کمال اور دینی جمال کی بادی بہاری
- ۳۸۲ _____ * ہندوستان میں علم کا شجر سایہ دار

- * مولانا بدر عالم میرٹھی اور ایک عرب بدو کا واقعہ ۳۸۳
- * آزدل خیزد، بردل ریزد ۳۸۵
- * رابطہ عالم اسلامی کی تیسری عمومی اسلامی کانفرس
- * اور لا زوال مقدّس و بابرکت یادیں ۳۸۶
- * اے بسا آرزو کہ خاک شد ۳۸۸
- * مختصر سوانحی خاکہ ۳۸۸

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ۳۶۳-۳۹۵

- * رفیقہ و لے نہ از دل ما ۳۹۵
- * مولانا نعمانی کی عظمت ۳۹۷
- * جامعیت کا راز ۴۰۱
- * شخصیت کے تشکیل عناصر ۴۰۲
- * دین کی ہمہ جہت خدمت کی راہ پر ۴۰۴
- * الفرقان: دینی خدمت کا مضبوط اور بے مثال پلیٹ فارم ۴۰۶
- * ملی سرگرمیوں میں قائدانہ رول ۴۱۲
- * قلمی خدمات ۴۱۳
- * مولانا کی تحریری خوبی کی جان کاری کی تقریب ۴۱۶
- * مولانا کی زبان میں یہ، خوبی کیوں ہے؟ ۴۱۸
- * مولانا کی بعض تصنیفات کی اہمیت ۴۱۹
- * مولانا کی پہلی زیارت اور پھر باقاعدہ زیارت و تعارف ۴۲۱
- * راقم کی، اسلام کے دو سچے سپاہیوں کی صحبت سے بہرہ مندی ۴۲۲
- * مولانا سے مزید ربط و تعلق ۴۲۵
- * شخصیت کے موضوع پر مولانا کی زندہ جاوید تصنیف ۴۳۳
- * عشقِ جور و فقر غیور کی جلوہ گری ۴۳۴
- * نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر ۴۳۵
- * مولانا کی چند خصوصیات ۴۳۶

- * دارالعلوم دیوبند سے عشق ۴۳۸ _____
- * مولانا محمد منظور نعمانی ایک نظر میں ۴۶۲ _____

داعی الی اللہ

مولانا محمد عمر پال پوری ۲۶۵-۴۸۰

- * عظیم سلف کے عظیم خلف ۴۶۵ _____
- * مولانا کی پہلی پُر درد تقریر کی سماعت اور اُس کی لذت و حلاوت ۴۶۷ _____
- * جنت و دوزخ کی حقیقت کو ایمان آفرین انداز میں بیان کرنے والا مقرر ۴۶۹ _____
- * حسن بیان کی ساحری و یقین آفریزی ۴۷۰ _____
- * دارالعلوم دیوبند میں تبلیغی سرگرمیوں کی کثرت _____
- * اور مولانا کے ایمان پروریات ۴۷۲ _____
- * مرض الموت ۴۷۳ _____
- * وفات ۴۷۴ _____
- * مختصر سوانحی نقوش ۴۷۶ _____

عارف باللہ حضرت مولانا

قاری سید صدیق احمد باندوی ۴۸۱-۴۹۸

- * بے پناہ مقبولیت و محبوبیت ۴۸۲ _____
- * امتیازی اوصاف ۴۸۳ _____
- * جہد مسلسل اور سفر پیہم ۴۸۴ _____
- * مقبولیت عامہ کا نمونہ ۴۸۶ _____
- * آسفار کے حوالے سے معمول ۴۸۷ _____
- * قاری صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسے کی خصوصیت ۴۸۸ _____
- * وفات ۴۸۹ _____
- * مختصر حالات زندگی ۴۹۰ _____

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی ۴۹۹-۵۲۳

- * محض علم اور علمی بڑائی، عمل کے بغیر کوئی چیز نہیں ۵۰۰ _____

- * نسبتاً گم نام؛ لیکن انتہائی نیک نام ۵۰۰ _____
- * دارالعلوم سے وابستگی ۵۰۱ _____
- * اعلیٰ پایے کا انسان ۵۰۲ _____
- * وفات ۵۰۳ _____
- * منشی عزیز کا کمال ۵۰۴ _____
- * منشی عزیز اور لذیذ یادیں ۵۰۵ _____
- * منشی عزیز سے پہلی ملاقات ۵۰۶ _____
- * منشی محمد عزیز کی انفرادیت ۵۰۷ _____
- * دارالعلوم کی تدریسی زندگی میں منشی محمد عزیز سے پہلی ملاقات ۵۰۸ _____
- * منشی محمد عزیز کی انسان نوازی ۵۰۹ _____
- * دارالعلوم کی عظمت کا راز ۵۱۰ _____
- * مرض الموت اور دارالعلوم سے عشق کا مظہر ۵۱۱ _____
- * بے نظیر خادم دارالعلوم ۵۱۲ _____
- * دارالعلوم کی خدمت اُن کے نزدیک خدا کی عبادت ۵۱۳ _____
- * منشی محمد عزیز کے حوالے سے، دارالعلوم کے بڑوں کا اعتراف کمال ۵۱۳ _____
- * شیخ الادب مولانا محمد اعجاز علیؒ کی شہادت ۵۱۴ _____
- * شیخ الادب کی دوسری شہادت ۵۱۵ _____
- * شیخ الادب کی تیسری شہادت ۵۱۹ _____
- * شیخ الاسلام کی شہادت ۵۲۰ _____
- * شیخ الادب کی چوتھی شہادت ۵۲۰ _____
- * ناظم تعلیمات مولانا سید اختر حسین کی شہادت ۵۲۲ _____
- * مختصر سوانحی خاکہ ۵۲۳ _____

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ ۵۲۳-۵۶۲

- * ربّ شکور کے ہاں اُن کی مقبولیت کی دلیل ۵۲۴ _____
- * خداے کریم کی خاص صنعت ۵۲۵ _____
- * خاندانی عظمت ۵۲۵ _____

- * لذتِ سحر گاہی سے آشنا والدین ۵۲۷
- * روشن دل و روشن دماغ اُستادِ کرام ۵۲۸
- * اصحابِ عزیمت و استقامت صلحا و اعیانِ اسلام کی صحبت ۵۲۹
- * شاعرِ اسلام علامہ اقبال سے تاثر و عقیدت ۵۳۳
- * اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعیوں کی تحریروں کی تاثیر ۵۳۶
- * صلحاے زمانہ کی توقعات کے سچے مصداق ۵۴۰
- * پر خلوص تحریر و تقریر کی جادوگری و اثر انگیزی ۵۴۱
- * بے مثال خاک ساری و منکسر المزاجی ۵۴۳
- * انسان مگر فرشتہ ۵۵۶
- * سوانحی نقوش ۵۵۸

بے لوث خادم ملک و ملت

مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ ۵۶۳-۵۸۵

- * عظیم قائدین و علما کے جانشین ۵۶۳
- * مولانا ہاشمی کی قائدانہ شخصیت کے تشکیلی عناصر ۵۶۷
- * مولانا ہاشمی کا تعلیمی و تربیتی سفر اور قائدانہ بال و پر نکلنے کا آغاز ۵۶۸
- * مولانا ہاشمی سے میری شناسائی ۵۷۲
- * مولانا ہاشمی کے لیے خدمتِ خلق غذا، دوا اور ہوا کے درجے کی چیز ۵۷۵
- * مولانا ہاشمی کے ساتھ ایک یادگار اور تاریخی سفر ۵۷۸
- * مولانا ہاشمی کا سراپا اور سیرت و کردار ۵۸۲
- * مولانا ہاشمیؒ ایک نظر میں ۵۸۳

منفرد عالمِ دین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ۵۸۶-۶۲۲

- * ہمہ جہت عالم و دانش ور ۵۸۷
- * دو گرامی قدرانتسابوں کا فیضان ۵۸۸
- * تربیتِ فکر و آگہی کی لائق رشک دین ۵۸۹

* فقیہانہ بصیرت وقائدانہ لیاقت کا آمیزہ ۵۹۰

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی.. ایک عظیم فقیہ

- * مولانا کے تعلق سے راقم کی معصومانہ یادیں ۵۹۲
- * ہمارے علاقے کے تین بافیض علما ۵۹۳
- * مولانا مجاہد اور امارت کے گیسوے برہم کو سنوارنے کا عمل ۵۹۴
- * تعمیر ذات و صفات کے عناصر ترکیبی ۵۹۶
- * غیر معمولی ذہانت ۵۹۹
- * شان ہائے امتیاز ۶۰۰
- * شیریں یادوں کے اُجالے ۶۰۱
- * غیر معمولی قادر الکلامی ۶۰۸
- * فقہ و فضا و افتا کے لیے قدرتی طور پر ڈھلا ہوا ذہن ۶۱۲
- * فکر و نظر کی بھرپور وسعت ۶۱۳
- * مولانا مجاہد اور ملی کونسل ۶۱۴
- * فقہ اکیڈمی انڈیا ۶۱۶
- * علمی نقوش ۶۱۷
- * سوانحی نقوش ۶۱۹

اسلامی عربی اہل قلم

مولانا فصیح الدین دہلوی ۶۲۳-۶۳۵

- * جب الفاظ، احساسات کی ترجمانی نہیں کر پاتے ۶۲۴
- * عربی زبان کے ہنرمند قلم کار ۶۲۶
- * علمی آبرو کا پاس اور احترام ۶۲۷
- * علمی و ثقافتی کام ۶۳۰
- * سوانحی نقوش ۶۳۲

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ

ایک نوجوان اور فعال عالم دین ۶۳۶-۶۳۷

- * ایک ذی استعداد نوجوان ۶۳۶ _____
- * ذہانت اور بذلہ سنجی ۶۳۷ _____
- * راحت رساں رفیق سفر ۶۳۹ _____
- * قاضی مجاہد کے قافلہ علم و فکر سے وابستگی ۶۴۰ _____
- * وہ کوہ گن کی بات پر اُن کے تاثرات ۶۴۱ _____
- * تحریری سرگرمیاں ۶۴۲ _____
- * سوانحی نقوش ۶۴۳ _____

خادمِ علم و دین

مولانا محمد تسلیم سید ھولوی در بھنگویؒ ۶۴۸-۶۶۰

- * مولانا کی سیرت و صورت ۶۴۹ _____
- * مولانا سے دید و شنید ۶۵۱ _____
- * مولانا کے ساتھ ایک یادگار تجربہ ۶۵۲ _____
- * مولانا کی راقم کو دعا اور شاباشی ۶۵۳ _____
- * ہمارے آبائی گاؤں ”راے پور“ میں مولانا کی آمد اور خوش گوار یادیں ۶۵۴ _____
- * مدرسہ امدادیہ اور جامعہ خانقاہ رحمانی میں مولانا کی خدمات ۶۵۵ _____
- * تقریروں میں مولانا کی زبان سے سنے ہوئے اشعار کی لذت ۶۵۶ _____
- * مدرسہ امدادیہ کے تعلق سے مولانا کی مجاہدانہ و بے لوث قربانیاں ۶۵۸ _____
- * سوانحی نقوش ۶۵۹ _____

منفرد ادیب و خطیب

مولانا محمد رضوان القاسمی ۶۶۱-۶۸۹

- * خلقِ خدا کے لیے افادیت کے بہ قدر ہی لوگ جانے والوں کو رویا کرتے ہیں۔ ۶۶۲ _____
- * منفرد تیرتا ہاں ۶۶۳ _____

- * نسبتاً کم عمری ہی میں عزت و شہرت سے بہرہ وری ۶۶۵
- * سلیس، بلیغ اور خوب صورت قلم کے دھنی ۶۶۶
- * ممتاز فاضل دارالعلوم ۶۶۷
- * میرا اُن کا دیرینہ تعلق ۶۶۹
- * مہمان نوازی میں طاق ۶۷۲
- * دارالعلوم دیوبند میں ہماری یادگار مجلسیں ۶۷۳
- * احاطہ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد، میرے اُن کے روابط ۶۷۴
- * دارالعلوم میں اپنی مدرسے کے بعد اُن سے طویل ملاقات کی ایک تاریخی تقریب ۶۸۰
- * مولانا سے راقم کی آخری ملاقات ۶۸۲
- * اُن کا ادارہ، اُن کی بہترین یادگار ۶۸۳
- * مولانا کی علمی میراث، بہترین صدقہ جاریہ ۶۸۴
- * ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ۶۸۵
- * سوانحی نقوش ۶۸۶

مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ ۶۹۰-۶۹۶

- * قاری صاحبؒ سے ملاقات و تائید ۶۹۱
- * خوش خلقی و خندہ روئی ۶۹۲
- * مختصر تعارف ۶۹۵

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقؒ

شخصیت اور شان امتیاز ۶۹۷-۷۲۷

- * داعیان حق کے سلسلے کی آخری کڑی ۶۹۷
- * دنیاوی مقبولیت و محبوبیت، نقد خدائی بدلہ ۶۹۸
- * بیماری کے باوجود پابندی اوقات ۶۹۹
- * نقوش حیات ۷۰۱
- * مثالی طالب علم ۷۰۲
- * توفیق الہی کی ہم رکابی ۷۰۴

- * حضرت تھانویؒ کی دستِ گرفتگی ۷۰۵ _____
- * تدریسی خدمات ۷۰۷ _____
- * دینی و دعوتی و تربیتی خدمات اور کارنامے ۷۰۷ _____
- * چندہ کے سلسلے میں اُن کا مسلک ۷۰۸ _____
- * سننِ نبویہ کا احیا ۷۰۹ _____
- * منکر پر نکیر ۹۱۱ _____
- * قرآنِ کریم کی تصحیح و تجوید کا غیر معمولی اہتمام ۷۱۳ _____
- * اذان و اقامت کی تصحیح کا اہتمام ۷۱۳ _____
- * تصحیحِ نماز کی تحریک و دعوت اور اس کے لیے سرگرمی پیہم ۷۱۵ _____
- * دعوتی و دینی رسائل اور کتابیں ۷۱۶ _____
- * امتیازی اوصاف ۷۱۸ _____
- * پابندیِ اوقات ۷۱۸ _____
- * نظم و نسق پر کاربندی ۷۱۹ _____
- * صفائی ستھرائی کا اہتمام ۷۲۱ _____
- * زہد و ورع کی تصویر مجسم ۷۲۱ _____
- * خوش اخلاقی و نرم خوئی ۷۲۲ _____
- * طلبہ و مریدین کے لیے شفیق باپ ۷۲۳ _____
- * مختصر سوانحی نقوش ۷۲۵ _____

داعیِ اسلام و عاشقِ رسول ادیب

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ ۷۲۸-۷۴۱

- * قابلِ رشک موت ۷۲۹ _____
- * روزِ قیامت آسان حساب کی امید ۷۳۰ _____
- * مولانا کی خوبیاں ۷۳۰ _____
- * مولانا عبدالماجد ریادئیؒ کا رنگ ۷۳۱ _____
- * بصیرت مند عالم و داعی ۷۳۲ _____
- * شرافتِ نفس و شہادۂ قلبی ۷۳۳ _____

- * خدا کے گھر کے پڑوس میں مولانا کے گھر میں اُن سے یادگار ملاقات ۷۳۵
- * میرے نام مولانا کا مکتوب ۷۳۶
- * خوش حالی کے باوجود، سادہ زندگی ۷۳۷
- * سوانحی نقوش ۷۳۹

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

ایک قد آور قائد ۷۴۲-۷۶۵

- * اُن کی کام رانیوں کا ضامن وصف ۷۴۳
- * ہمہ گیر اور بے نظیر مقبولیت ۷۴۴
- * وجہ امتیاز ۷۴۵
- * جہد مسلسل اور یقین محکم ۷۴۵
- * عظمت کا راز ۷۴۶
- * مولانا کی ایک اہم صفت ۴۷

مولانا سید اسعد مدنیؒ.. یعنی مردِ آہن

- * مولانا کی کمی کا احساس ۷۴۹
- * مولانا کے عمل کی مرکزی سمیتیں ۷۵۰
- * اُن کے کام کا انداز ۸۵۱
- * تلخ حقیقت کا ادراک اور حکمتِ عملی ۷۵۳
- * فتح مند قائد ۷۵۵
- * اقدامی حملے کا امتیاز رکھنے والا سپاہی ۷۵۵
- * انسان شناسی اور کام لینے کی صلاحیت ۷۵۶
- * کام کے آدمی کی خاصیت ۷۵۹
- * شیعہ و آہن کی یک جائی ۷۶۰
- * مولانا سے راقم کا تعارف ۷۶۱
- * مولانا کی ایک پر لطف صحبت کی یاد ۷۶۲
- * مختصر سوانحی خاکہ ۷۶۳

مرصالح مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ ۷۷۶-۷۷۷

- * بندہ مومن ۷۷۷
- * دین داری و خوش طبعی ۷۷۷
- * بے تکلفی اور اپنائیت ۷۷۸
- * کئی حیثیتوں سے ممتاز؛ بل کہ بے مثال ۷۷۹
- * مولاناؒ کی خوش نصیبی ۷۷۱
- * رقیق القلمی ۷۷۳
- * سوانحی نقوش ۷۷۵

مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا کفیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندیؒ ۷۷۷-۷۸۹

- * صحت مندی و چستی و پھرتی ۷۷۷
- * وقت کی پابندی ۷۷۹
- * سنجیدگی و بردباری ۷۷۹
- * اچھا مفتی اور اچھا شاعر ۷۸۰
- * اُن کی خاموشی اور سراپا کو دیکھ کے
- * اُن کے اتنے اچھے شاعر ہونے کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا ۷۸۳
- * دین اور علم کی وراثت ۷۸۴
- * خانہ خیال میں اُن کی تصویر کی گردش ۷۸۵
- * سوانحی نقوش ۷۸۷

عالم صالح و بانی فیض مدرس مولانا سید محمد شمس الحق ویشالویؒ ۷۹۰-۷۹۷

- * مولاناؒ کی فیض رسانی ۷۹۱
- * مولاناؒ کی تدریسی خدمات کے تعلق سے خاص بات ۷۹۳

- * مولانا ویشالوی بہاری مٹی کی زرخیزی کا بہترین نمونہ ۷۹۳
- * نہ دیکھنے کے باوجود، وہ میرے لیے دیدہ سے ۷۹۴
- * وفات ۷۹۵
- * سوانحی نقوش ۷۹۵

منفرد عالم و مقرر و محدث حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ ۷۹۸-۸۱۸

- * سیرت و صورت ۷۹۹
- * منفرد اور با کمال مدرس ۸۰۱
- * پر جوش و ولولہ انگیز خطیب ۸۰۳
- * بلند پایہ اہل قلم ۸۰۵
- * بہ حیثیت سیاست داں ۸۰۶
- * بے نظیر خوبیاں ۸۰۹
- * خردوں کی بے مثال حوصلہ افزائی ۸۱۰
- * خود اعتمادی ۸۱۱
- * مولانا سے ایک یادگار ملاقات ۸۱۲
- * مرض الموت اور وفات ۸۱۴
- * مختصر سوانحی نقوش ۸۱۶

پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید محمد اجتہا ندویؒ ۸۱۹-۸۲۶

- * عربی زبان و ادب کا ایک ممتاز عالم ۸۲۰
- * مرحوم سے راقم کی دید و شنید ۸۲۲
- * اُن سے آخری طویل اور یادگار ملاقات ۸۲۳

خدا کا ایک قدرے گم نام، لیکن انتہائی نیک نام بندہ

حافظ محمد اقبال گوٹہ دیؒ ۸۲۷-۸۳۵

- * دین داری سے دمکتا ہوا نمکھڑا ۸۲۸

- * بہت سے قد آور علما سے زیادہ قد آور ”حافظ“ ۸۲۹ _____
- * علماے صالحین کے محبوب ۸۳۱ _____
- * اُن کے متقی ہونے کی یقینی علامت ۸۳۲ _____
- * سوانحی نقوش ۸۳۳ _____

مولانا فضیل احمد قاسمی گورکھپوریؒ ۸۳۶-۸۴۹

- * وطن، خاندان اور تعلیمی سفر ۸۳۸ _____
- * خدمتِ خلق کا پیدائشی جذبہ ۸۳۹ _____
- * قائدِ اندرنگ و آہنگ کا آغاز ۸۴۱ _____
- * مولانا فضیل کی یافت و دریافت ۸۴۲ _____
- * سعودی عرب کے ایک سفر میں مولانا کے جذبہٴ خدمت سے استفادہ ۸۴۳ _____
- * مولانا فضیل کی جمعیتِ علما سے علاحدگی اور نئے سفر کی سمت کی تلاش و تعین ۸۴۵ _____
- * ہر دل عزیز عالمِ دین ۸۴۷ _____

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر

الحاج محمد اجمل علی آسامیؒ ۸۵۰-۸۵۸

- * دینی ورفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والے تاجر ۸۵۱ _____
- * دیانت دار تاجر ۸۵۲ _____
- * علماے صالحین کے دستِ گرفتہ و صحبت یافتہ ۸۵۳ _____
- * دین دار تاجر کی قابلِ تقلید مثال ۸۵۵ _____
- * حاجی صاحبؒ کے ساتھ راقمِ کمدینہ منورہ کا یادگار وفد بہار سفر ۸۵۵ _____

مولانا عبدالحمن قاسمی مظفر پوری سیتا مڑھویؒ ۸۵۹-۸۷۶

- * مرضِ الوفات میں مولانا سے ملاقات ۸۶۰ _____
- * باتوفیقِ عالم اور خوش گفتار مقرر ۸۶۲ _____
- * خوش اوقاتِ عالمِ دین ۸۶۳ _____
- * مولانا کا سراپا ۸۶۴ _____

- * مولانا عبدالرحمان کا تعلیمی کارنامہ ۸۶۴
- * مولانا سے وابستہ ناقابل فراموش یادیں ۸۶۶
- * مولانا کو قریب سے دیکھنے کی تقریریں ۸۶۹
- * لذیذ یادوں کا تسلسل ۸۷۱
- * سوانحی نقوش ۸۷۴

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام

مولانا سید عبداللہ بخاریؒ ۸۹۳-۸۷۷

- * جرأت و بے باکی میں یکتا روزگار ۸۷۹
- * مسلمانوں کی تکلیف کو دیکھ کر ٹپ اٹھنے والے ۸۸۱
- * مولانا بخاری کی یکتائی کا راز و آغاز ۸۸۳
- * مولانا بخاری کی تاریخی تقریر ۸۸۶
- * قیادت سازی میں مولانا کا تاریخی رول ۸۸۷
- * مولانا بخاری مرے بعد زندہ رہیں گے ۸۹۰
- * سوانحی نقوش ۸۹۱

مولانا حکیم عزیز الرحمن مٹوؒ ۹۱۴-۸۹۴

- * حکیم صاحب کا امتیاز ۸۹۵
- * حصول علم ۸۹۶
- * عملی زندگی ۸۹۶
- * جامعہ طیبہ دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت اُستاذ آمد کی تقریر ۸۹۷
- * جامعہ طیبہ میں بہ حیثیت اُستاذ تقرر ۸۹۸
- * جامعہ طیبہ بند ہو جانے کے بعد ۹۰۱
- * حکیم صاحب کی تالیفی خدمات ۹۰۲
- * حکیم صاحب سے تعارف و تعلق ۹۰۳
- * دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت اُستاذ راقم کی آمد اور حکیم صاحب کی مسرت ۹۰۵
- * صورت و سیرت ۹۰۶

- * پس ماندگان ۹۰۸ _____
- * دنیا سے جانے والے اور دل سے نہ جانے والے ۹۰۸ _____
- * موت سے نہ مرنے والے ۹۰۹ _____
- * سوانحی نقوش ۹۱۰ _____

نیک دل عالم، سہل نگار اہل قلم اور بہت اچھے انسان

حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ ۹۱۳-۹۳۲

- * ان سطروں کے لکھنے کی تقریب ۹۱۳ _____
- * اہل قلم کے زندوں پر لکھنے سے احتراز کی عمومی وجہ ۹۱۴ _____
- * زندوں پر لکھنا، بعض وجوہ سے زیادہ مفید ۹۱۵ _____
- * سجاد لاہوری کے طلبہ کا شکریہ ۹۱۶ _____
- * مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے زیادہ گھل مل جانے کی وجہ ۹۱۷ _____
- * شخصیت کی طرح تحریر و تقریر میں سادگی ۹۱۹ _____
- * مفتی صاحب کا تحریری امتیاز ۹۲۰ _____
- * مفتی صاحب کے تحریری و تالیفی کارنامے ۹۲۱ _____
- * مفتی صاحب کے یگانہ روزگار اساتذہ ۹۲۲ _____
- * ظاہر و باطن کی یکسانیت ۹۲۳ _____
- * مخلص و تجربہ کار مشیر ۹۲۳ _____
- * مخدو کی کامیابی کو اپنی کامیابی تصور کرنے والے ۹۲۴ _____
- * یہ سطرین کل کے مؤرخ اور سوانح نگار کے لیے قیمتی سرمایہ ۹۲۸ _____
- * سوانحی خاکہ ۹۲۹ _____

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرفِ ناگزیر

راقم السطور، پندرہ روزہ اور ماہ نامہ ”الداغی“ عربی دارالعلوم دیوبند میں، ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۲ھ میں، اُس کی ادارت کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد سے، تادم تحریر در بیج الثانی ۱۴۳۱ھ/ مارچ ۲۰۱۰ء، ہندو بیرونِ ہند کی وفات پا جانے والی اہم اسلامی شخصیات میں سے، تقریباً تین سو (۳۰۰) شخصیتوں پر، تاثراتی مضامین سپردِ قلم کر چکا ہے۔

ان میں سے جن شخصیتوں کی غیر معمولی اہمیت، یا راقم کی اُن سے کسی وجہ سے زیادہ وابستگی کا اُس پر دباؤ ہوا، اُن پر عربی میں لکھنے کے بعد ہی، اُس نے خود اپنے قلم سے، عربی مضامین کو اُردو کا جامہ پہنا دیا؛ تاکہ اُردو کے قارئین بھی اُن سے بروقت مستفید ہو سکیں؛ لیکن اکثر شخصیتوں کے تذکرے، عربی سے اُردو میں منتقل نہیں ہو سکے۔ جن چند شخصیتوں کے تراجم اپنے اپنے وقت پر اُردو اخبارات یا رسالوں میں شائع ہوئے، انھیں قارئین نے بہت پسند کیا۔ اُن قارئین میں بعض اہل نظر علمنا اور اُردو اور اُس کی اُسلوبیات کا مذاق رکھنے والے پڑھ لکھے حضرات بھی تھے، جن کا خطوط کے ذریعے یا بہ وقت ملاقات بالمشافہ بہت تقاضا رہا کہ انھیں کتابی شکل میں ضرور اور بہ عجلت شائع کر دیا جائے؛ تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں اور جو قارئین اخبارات و رسال میں نہ پڑھ سکے ہوں، اُن کے لیے بھی پڑھنا آسان ہو جائے۔

لیکن بہ وجہ یہ راقم اُن کی خواہش بروقت پوری نہیں کر سکا۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ عاجز چاہتا تھا کہ اپنے قلم سے، یا کسی اور کے ذریعے اُن تذکروں میں سے اکثر یا سب کا اُردو ترجمہ ہو جائے، تبھی انھیں بالترتیب شائع کیا جائے؛ لیکن اُن حضرات کا اصرار بڑھتا رہا

پس مرگ زندہ

کہ جتنے تذکرے، اردو میں آچکے ہیں، انھیں تو ضرور شائع کر دیا جائے، اور دگر تراجم (تذکروں) کو اردو میں منتقل کرنے کی سعی جاری رکھی جائے۔
 اُن کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر تاثراتی مضامین کا یہ مجموعہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ یہ مضامین اُن قارئین کو بھی اُسی طرح پسند آئیں گے، جنہوں نے انھیں اخبارات و رسائل میں پڑھا نہیں تھا، جس طرح اُن قارئین کو پسند آئے، جنہوں نے انھیں اخبارات و رسائل میں پڑھا تھا۔



ان مضامین میں سے اکثر کو بہ وقتِ اشاعت بڑی حد تک مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شخصیات کے سوانحی خاکوں کو لاحقہ کے طور پر ہم رشتہ کر دیا گیا ہے۔ جن شخصیات کے سوانحی خاکے، کوشش کے باوجود نہیں مل سکے، اُن کے سلسلے میں، صرف تاثراتی مضامین پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ان مضامین میں سے زیادہ تر مضامین، مُعَلَّقَہ شخصیتوں کے سوانح بھی ہیں، اُن کے سلسلے میں بھرپور تاثرات بھی اور اُن کے مکمل یا نامکمل خاکے بھی اور اُن کے عہد اور ماحول کے تذکرے بھی؛ اس لیے یہ ہر طرح کے قارئین کے لیے، اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ زبان کی چاشنی، شخصیتوں کے پیش کرنے کا خوب صورت انداز اور اُن کے حوالے سے سچائی نگاری، تحلیل و تجزیے میں دقیقہ رسی، فکر انگیزی اور خیال آفرینی کے اُسلوب جمیل کی وجہ سے، یہ کتاب تذکرہ نویسی کے فن میں، اپنی مثال آپ بن گئی ہے۔ مُصَنَّف کی سابقہ تحریروں کی طرح اُس کی یہ کتاب بھی اِن شاء اللہ قاری کے حسن ظن کے معیار پر نہ صرف مکمل اُترے گی؛ بل کہ اُس سے سوا ثابت ہوگی۔

املا نویسی، اردو نگاری کے عصری انداز اور طباعت و اشاعت کے جمال و کمال اور خوش نمائی و دل رُبائی کے حوالے سے، مَوْلَف کی یہ کتاب بھی اِن شاء اللہ قابلِ تقلید

نمونہ ثابت ہوگی، طلبہ اور نوواردانِ بساطِ تحریر کے لیے، مؤلف کی دگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مُعلِّم اور راہِ نما کا درجہ رکھتی ہے۔ عربی کے جو الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں، اُن کے تلفُّظ میں اکثر غلطی کی جاتی ہے؛ اس لیے اُن میں سے اکثر کو بااعراب لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔



شخصیوں کے پیش کرنے کی ترتیب میں تاریخ و سنہ وفات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اُن کی عظمت اور قدر و قیمت کو معیار نہیں بنایا گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، ان میں سے سارے مضامین اصلاً عربی میں لکھے گئے اور دارالعلوم دیوبند کے عربی ترجمان: ”الداعی“ میں شائع ہوئے، پھر وہ اُردو میں ترجمہ ہو کر، اردو رسالوں اور روزناموں میں شائع ہوئے، اردو کا قالب راقم السطور نے خود ہی دیا ہے، چند مضامین کے اردو ترجمے، میرے بعض تلامذہ نے کیے ہیں اور میں نے اُن میں حکت و اضافہ کیا ہے؛ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ دوسروں کے ترجموں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ تغیر و تبدل کے باوجود، اُن میں کسی نہ کسی درجے میں ترجمے کا رنگ باقی رہ جاتا ہے۔ راقم نے دوسروں کے کیے ہوئے ترجموں کی حاشیے میں نشان دہی کر دی ہے اور مُترجمین کے نام بھی درج کر دیے ہیں۔ ایک دو مضامین ایسے ہیں، جنہیں راقم نے بہ راہِ راست اُردو ہی میں لکھے ہیں، جیسے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلویؒ اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ پر راقم نے جو کچھ اس کتاب میں پیش کیا ہے، وہ بہ راہِ راست اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت کیرانویؒ پر راقم کی مستقل کتاب ”وہ کوہ کن کی بات“ میں جو کچھ ہے، وہ اس کتاب کے مضمون کے علاوہ ہے، اُس میں سے کوئی اقتباس حرفِ مکرر کے طور پر یہاں پیش نہیں کیا گیا ہے۔

یہ سارے مضامین مرحومین پر ہیں، جو اُن کی وفات کے بعد، اُن پر لکھے گئے،

صرف ایک مضمون زندہ شخصیت پر تحریر ہوا تھا، یعنی حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی مدظلہ العالی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و حال صدر فقہ اکیڈمی انڈیا پر، جو افادہ عام کے لیے شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔ جس تقریب سے یہ مضمون معرض تحریر میں آیا تھا، مضمون کے ابتدائے میں، اُس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔



کتاب میں پیش کردہ شخصیتیں، راقم کی صرف شنیدہ نہیں؛ بل کہ دیدہ اور برتی ہوئی ہیں؛ اس لیے اُن کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اُس میں خواہی نہ خواہی اپنا تذکرہ اور اپنے احوال و واقعات گھل مل گئے ہیں۔ بعض دفعہ راقم نے انھیں قلم انداز کرنے کی کوشش کی؛ لیکن وہ اس میں ناکام رہا؛ کیوں کہ یہ واقعات و حالات، صاحب تذکرہ کے حالات و واقعات سے اس طرح ہم رشتہ تھے جیسے دو جان و یک قالب۔

اس کتاب میں ۳۷ شخصیتوں کا تذکرہ ہے، جن میں سے اکثر مشہور اور ہر ایک کے لیے معروف ہیں؛ لیکن چند شخصیتیں گم نام نہیں، تو بہت نام آور اور عام قارئین کے لیے معروف نہیں ہیں؛ لیکن راقم کے فکر و نظر اور علم و عمل پر وہ کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئی ہیں؛ اس لیے اُن کا احسان بھی اُن کے تذکرے کا متقاضی ہوا اور یہ بھی کہ وہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں بہت معروف اور لائق تذکرہ تھیں؛ نیز یہ کہ اصل تذکرہ نویسی تو یہی ہے کہ بالکل گم نام یا قدرے نام آور ہی کو معروف و مشہور کیا جائے؛ تاکہ صحراے فضل و کمال کے متنی دَڑے بھی چمک اُٹھیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ کیسے کیسے اہل کمال ہیں جنہیں وہ اب تک نہیں جانتے تھے، مشہور کو مزید مشہور کرنا اور چمکتے ہوؤں کو چمکانا، بہ نظر غائر دیکھا جائے، تو تحصیل حاصل اور فعلِ عبث ہے، یا زیادہ مفید کام نہیں ہے۔

لیکن دنیا والے اسی روش عام پر گام زن ہیں کہ مشہور کو ہی اور مشہور کرتے رہتے ہیں اور گم نام پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ غالباً انھیں یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ گم ناموں یا

نسبتاً کم معروف لوگوں پر لکھنے سے، وہ خود بھی گم نام اور بے نام ہو جائیں گے۔



بہ ہر کیف، ”وہ کوہ کن کی بات“ کے بعد راقم کی یہ پہلی کتاب ہے، جو تذکرے کے موضوع پر، پیش کی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب بھی پہلی ہی کتاب کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور اللہ پاک اسے بھی اُسی مقبولیت سے نوازے گا، جس سے اُس نے مذکورہ کتاب کو نوازا ہے وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللَّهِ بَعِزٌ۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ ان شخصیتوں کی محبت کے طفیل، راقم الحروف، اُس کے اُساتذہ، اُس کے والدین اور اُن کرم گستروں کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں، جو کسی طرح بھی، اس کتاب کی تیاری، طباعت اور اشاعت کا ذریعہ بنے۔

نور عالم خلیل امینی

استاذ ادب عربی
ورئیس تحریر ”الدااعی“ عربی
دارالعلوم دیوبند

۱۱ بجے صبح دو شنبہ:

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

۲۹ مارچ ۲۰۱۰ء

موت کے ہاتھوں سے، مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اُس کو نہ کر دیتا ، نظامِ کائنات
(علامہ اقبالؒ)

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ

۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء — ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی

بدلتا ہے ہزاروں رنگ، میرا دردِ مجھوری

نحیف الجسم، دراز قد، سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جو نیم باز رہتی تھیں، کشادہ پیشانی، گھنیریں بھنویں، کھڑی سُنو اُن ناک، کتالی چہرہ، ہاتھ میں چھڑی، پاؤں میں سادے جوتے جو عموماً علما و صلحا استعمال کرتے ہیں، بدن پر معمولی سوتی کپڑے کا کرتا پاجامہ، عموماً کھدّر کے کپڑے کا۔ پاجامہ مغلیٰ ہوتا۔ جو صالح علما کا شعار رہا ہے۔ جوانی اور اُدھیر عمری تو راقم نے نہیں دیکھی، بڑھاپے میں، انھیں چھڑی کے سہارے آہستہ روی سے چلتے ہوئے دیکھا، گفتگو میں ٹھہراؤ، عالمانہ وقار اور شریفانہ شرمیلان۔ شخصیت کی ہیئتِ کدائی سے ہر دیکھنے والے کو نہ صرف ضعیف الجسم؛ بل کہ ضعیف الارادہ ہونے کا احساس ہوتا؛ لیکن انھیں ذرا بھی برتنے والے کو فوراً ہی اُن کے غیر معمولی اپنی ارادے والے ہونے کا یقین ہو جاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں کاغذات سے بھرا پرس، یا برہنہ کاغذات ہوتے، کبھی خالی نہ بیٹھتے یا تو مطالعہ کرتے یا لکھتے رہتے، مطالعہ اور تحریر اُن کا لازم تھی۔ چہرے سے مٹّرخ تمام تر حلم و بردباری، مکمل خاک ساری، ہر رویے سے اُبلتی ہوئی شرافت و مروّت کے باوجود ایسا

رُعب کہ اُن کی خواہش؛ بل کہ ”تمنا“ کے باوجود، یہ راقم اُن سے بے تکلف ہوسکا نہ کھل کے بات کر سکا، ہاں مراسلت میں اپنی کسی ضرورت کا کوئی پہلو، قدرے بے تکلفی سے اُن کے سامنے پیش کر پاتا تھا؛ لیکن اُس میں بھی یہ خوف، ہمیشہ دامن گیر رہتا کہ اردو زبان کے کسی ”لب و لہجے“ میں ذرا سی غلطی ہوئی کہ وہ ضرور روک ٹوک کریں گے۔ اُن کی صورت سے شب بیداری، زہد و اتقا، عفاف و قناعت اور صلاح و تقویٰ کے اثرات از خود ہویدا ہوتے تھے۔

تہذیب و شائستگی گھڑی میں پڑی تھی، درس گاہ میں طلبہ کو کسی مسئلے پر گفتگو کے بعد ہمیشہ کہتے: ”خیال فرمایا مولانا!“ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ ”مولانا“ ہی کے لفظ سے مخاطب کرتے، کسی طالب علم کو ”مولوی“ کہتے نہ ”تم“ سے خطاب کرتے؛ بل کہ ہر ایک کو ”آپ“ ہی کہتے، حال آں کہ وہ مغربی یونیورسٹی کے تھے، جہاں ”پنجاب“ سے قربت کی وجہ سے باپ کو بھی بیٹا ”تم“ ہی کہتا ہے اور کوئی باپ بُرا نہیں سمجھتا۔ اُن کے حلم و شرافت سے ہم لوگ اتنے متاثر تھے کہ انہیں مدرسے کے ماحول میں ہمیشہ ”مولانا شریف“ ہی کہتے تھے۔ ہماری طالب علمی میں وہ ستر کے پیٹے میں تھے، بواسیر کی شدت رہتی تھی، خلقتاً کم زور اور نازک تھے، بڑھاپے نے یہی سہی کسر پوری کر دی تھی، ایسے میں جھنجھلاہٹ چڑچڑاپن اور غصہ آنا عام سی بات ہو جاتا ہے؛ لیکن وہ میری طالب علمی کے مکمل ایک سالہ دورانیے میں کبھی ہم لوگوں سے بے مزہ ہوئے، نہ ناراض، نہ کبھی سخت لہجے میں ڈانٹا، نہ کسی بیہودگی پر جو طالب علموں سے ضرور سرزد ہوتی رہتی ہے، آزرده ہوئے نہ افسردہ۔ اُن کے مکان (جو کرایے کا تھا) واقع اندرون احاطہ کالے صاحب، گلی قاسم جان، بلیماران، دہلی، اور مدرسہ امینیہ واقع ”کشمیری گیٹ“ دہلی ۶ کے درمیان کم از کم ۲ کلومیٹر کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ حضرت اس فاصلے کو روزانہ آمد و رفت دونوں صورتوں میں پیدل طے کرتے تھے۔ یہ راستہ انتہائی بھیڑ والا اور دہلی کے اہم بازاروں سے گزرتا ہے، خود ”گلی قاسم جان“ کی گھنیری آبادی اور بھیڑ والی گلی، پھر ”چاندنی چوک“ تک کا

”بلی ماران“ کا علاقہ جو ہمیشہ سے انسانوں کا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ وہاں سے ٹاؤن ہال کی عمارتوں کو عبور کر کے پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن تک کے علاقے کا یہی حال ہے۔ اب تو پرانی دہلی کے اسٹیشن کے سامنے کی بڑی شاہ راہ پر سڑک پار کرنے کے لیے پل بن گیا ہے، اُس زمانے میں یہ پل نہیں تھا، سڑک کو عبور کرنا ہم جیسے لڑکوں کے لیے بھی مشکل تھا؛ لیکن حضرت اپنی چھڑی ٹکیتے ہوئے آہستہ روی سے ہی اُس سڑک کو پار کر کے، دوسری طرف جانب جنوب آتے، پھر مشہور ”کوڑیا“ پل کو پار کرنے کے لیے (۱) اُس کے زینوں پر اپنے ڈنڈے کے سہارے چڑھتے، اس پل پر ہمیشہ آنے جانے والوں کی دورویہ بہت بھیڑ ہوتی؛ لیکن وہ اپنی آہستہ خرامی کے ساتھ ”کشمیری گیٹ“ کی طرف اتر جاتے، وہاں سے مزید جانب شمال تقریباً ۲۰۰ قدم کے فاصلے پر مدرسہ امینیہ کی عمارت واقع ہے۔ یہاں بھی اگر دفتر میں جاتے تو دوسری منزل تک چڑھنا ہی تھا اور اگر درس گاہ میں جاتے تو وہ تیسری منزل پر واقع تھی؛ لہذا یہ سارے زینے وہ آہستہ آہستہ طے کر کے جہاں جانا ہوتا وہاں پہنچ جاتے۔ صبر، تحمل، قناعت اور سادگی اُن کی شناخت تھی۔ یہ وصف اُن کی زندگی کے ہر رنگ میں سب سے زیادہ شوخ نظر آتا تھا۔ اُن کی عمر کے ہم ایسے لوگ ہوتے، تو ایسے کٹھن راستے کو، روزانہ پیدل عبور کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں یہ سطرین لکھ رہا ہوں اور حضرت میرے آگے آگے میری نظروں کے سامنے چلتے ہوئے مجھے دکھ رہے ہیں، لگتا ہے یہ ماضی کا واقعہ نہیں، یہ اسی وقت کی تازہ اور زندہ حقیقت ہے۔

(۱) نہ معلوم اُس کا یہ نام کیوں اور کس نے رکھا تھا۔ یہ پل پرانی دہلی کے اسٹیشن سے جانب شرق میں جمنائے پل، شاہدرہ اور غازی آباد کی اور جاتی ہوئی ریلوے کی گھنیری لائنوں کو عبور کر کے فوراً کے علاقے سے سیدھا کشمیری گیٹ کو جوڑتا ہے اور لوگ یہ غلط اس ”کوریا کے پل“ کے ذریعے فوراً کے طرف سے پانچ نیاں رسیدہ ہونے کی صورت میں ۷-۸ منٹ میں کشمیری گیٹ اور اُدھر سے فوراً کے طرف پہنچ جاتے ہیں۔ یہ پل انگریزی حکومت نے ۱۹۰۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ اپریل ۱۳۳۱ھ مطابق اپریل ۲۰۱۰ء میں اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے کہ ۱۰۷ سال پرانے اس پل کو ریلوے انتظامیہ نے ٹریفک پلان کے تحت عنقریب توڑنے کو ہے۔

ہمہ جہت عالم دین

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلویؒ ہمہ جہت عالم دین تھے۔ وہ بڑے بانیض و باتوفیق مدرس تھے۔ اُن کا درس صرف مغز کا حامل ہوتا، وہ بہت مختصر گفتگو کرتے، جس سے فائدہ اٹھانا اور متعلق موضوع کو سمجھنا اور سمیٹنا طلبہ کے لیے آسان ہوتا۔ کبھی لایعنی گفتگو کرتے، نہ دراز کلامی کرتے، نہ بیجا مزاح کرتے، نہ کبھی زور سے ہنستے، نہ ہنسانے کے لیے کسی چٹکے کا سہارا لیتے۔ اُن کا طرز کلام مفکرانہ، مدبرانہ اور مؤرخانہ ہوتا، درس حدیث میں اسی کے ساتھ محدثانہ و فقیہانہ ہوتا۔ اُن کے اکثر جملوں میں غیر معمولی غور و فکر کی دعوت چھپی ہوتی۔ اُن کے ان تدریسی صفات و خصوصیات کی وجہ سے، ذہین اور ہوش مند طلبہ کے لیے، اُن کے درس سے ایک ہمہ صفات عالم وداعی اِلٰی اللہ بننے کی راہ ہم وار ہوتی۔ زبان اور لب و لہجہ بہت پاکیزہ ہوتا، لفظ لفظ سے شرافت ٹپکتی، ہر تعبیر سے دین کا درد، ایک زاہد شب بیدار کا کرب، ایک مؤرخ اسلام کی بے قراری، ایک پرسوز عالم کا اضطراب اور عالم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بننے والی امت کی زبوں حالی کا بے کراں دکھ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ درس گاہ کے سارے طلبہ، اُن کے درس کی ان ساری خوبیوں کو یکساں طور پر محسوس نہیں کر پاتے تھے؛ بل کہ ہر طالب علم، اپنے ظرف اور مبلغِ فہم و ذکا کے مطابق ہی اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

بلند پایہ محدث و فقیہ و مفتی

وہ بلند پایہ مُجَدِّث تھے اور حدیث میں اپنے عصر کے سب سے بڑے مُجَدِّث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ کم و بیش ۳۲ سال تدریسی خدمت انجام دی (۳۳ سال مدرسہ حنفیہ آرا میں، جہاں سے آپ نے تدریس کا آغاز کیا، ۱۶ سال مدرسہ شاہی مراد آباد میں اور ۱۳ سال مدرسہ امینیہ دہلی میں)، جس میں حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں: صحیح

بخاری اور صحیح مسلم کی تدریس سرفہرست رہی۔ وہ اعلیٰ پایے کے فقیہ و مفتی تھے، فقہ و فتاویٰ کی اہمات الکتاب کا نہ صرف عرصہ دراز تک درس دیا؛ بل کہ مدرسہ شاہی مراد آباد اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی میں مدرسے کے سارے دورانیے میں جو کم از کم ۲۹ سالوں پر محیط ہے، ہمیشہ فتاویٰ بھی تحریر فرماتے رہے۔ فقہ و فتویٰ میں وہ اپنے زمانے میں علمائے برصغیر کے درمیان ایک اہم ستون سمجھے جاتے تھے اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل میں عموماً، علمائے کرام آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے، آپ کے فرعی اجتہاد و نقطہ نظر کو ان اہم مسائل میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

شان دار و پیغام رساں اہل قلم

وہ بہت بڑے اہل قلم اور مؤلف تھے۔ اُن کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے۔ بعض کتابیں متعدد جلدوں میں ہیں۔ مختلف علمی و دینی و قیام رسالوں میں جو لاتعداد علمی و تحقیقی فکر انگیز مقالات لکھے، وہ ان کے علاوہ ہیں، جنہیں جمع کر دیا جائے تو متعدد الّا جزا دیسیوں کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ اُن کے قلم میں عالم کا وقار، فقیہ و مفتی کی جزیسی، مؤرخ کی دیدہ وری و پختہ کاری، ادیب کی فن کاری، چاشنی اور فصاحت و بلاغت و جاذبیت کے ساتھ، دہلوی اردو کا بانگین اور ممتاز رنگ و آہنگ، ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے۔ دردمند عالم کا سوز اُن کی ہر تحریر کا امتیاز ہے۔ ”علمائے ہند کا شان دار ماضی“ اُن کی ساری تصنیفات میں بالخصوص شان دار مقام کی حامل ہے۔ اُن کی یہ تصنیف لطیف اُن کی جوانی اور توانائی کے دور کی تصنیف ہے، اُس میں قلم کی جولانی، انشا پر دازی کے خوب صورت رنگ، سوانح نویسی کے خاص انداز، تاریخ نگاری کی طرح داری، مجاہدانہ کارناموں کی جمع و ترتیب کے نزلا پن، ماضی کی تاب ناک یوں سے مستقبل کے لیے نتیجہ خیز اُجالا اخذ کرنے کی ذہن، علمائے سلف کے مجاہدانہ حالات سے حاضر کے کم ہمت مسافرانِ راہ کے لیے، بھرپور توشہ راہ بہم پہنچانے کی لگن کی قوس قزح کی خوش رنگی اور

پس مرگ زندہ

غیر معمولی جاذبیت، قاری کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہیں، ویسے اُن کی ہر تحریر کا تقریباً یہی رنگ ہے، جو کسی کسی تحریر میں زیادہ نمایاں اور شوخ نظر آتا ہے۔

حیوانِ کاتب

جمعیتِ علمائے ہند کی تاریخ، کارناموں، طریقہ فکر و عمل اور آزادی سے قبل اور اُس کے بعد مسلمانوں کی مختلف الانواع خدمات اور قوم و وطن کی ٹھوس راہ نمائی کے حوالے سے، اُنھوں نے اتنا کچھ لکھا، جو بعد کے سارے مؤرخین کے لیے زبردست اور بھرپور سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمعیت نہ صرف اس حوالے سے؛ بل کہ بہت سارے حوالوں سے، اُن کے احسان کے بار سے سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ پرنویسی و کثرتِ تالیف کی وجہ سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اُنھیں ”حیوانِ کاتب“ کہا کرتے تھے، نہ صرف جمعیت؛ بل کہ دارالعلوم دیوبند اور علما کے ماحول میں یہ لقب زبانِ زدِ خاص و عام ہو گیا تھا۔ وہ علمائے دیوبند میں کثرتِ نگارش کے تعلق سے گنے چنے سعادت نصیبوں میں تھے۔

ممتاز مؤرخ و سوانح نگار

وہ ممتاز مؤرخ اور سوانح نگار تھے۔ ”علمائے ہند کا شان دار ماضی“، ”علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے“، ”حیاتِ شیخ الاسلام“، ”مجاہدِ جلیل“، ”اسیرانِ مالٹا“، ”تحریکِ شیخ الہند“ وغیرہ اُن کی تاریخ نگاری اور ساتھ ہی سوانح نویسی کا بہترین نمونہ ہیں اور اُن کی خوب صورت و چاشنی بھری نثر کا نقشِ دوام بھی۔ ان کتابوں سے جہاں فرنگی سامراج کی چیرہ دستیائیں اُلْمِ نثر شرح ہوتی ہیں، وہیں پچاسوں علمائے حق کی سرفروشیوں کی ولولہ انگیز داستانوں کی شعور خیز جان کاری بھی ہوتی ہے اور یہ سبق بھی ملتا ہے کہ علما نے ہر زمانے میں، اُس زمانے کے تقاضے کے مطابق، سیاسی سرگرمیوں میں نہ صرف حصہ لیا

ہے؛ بل کہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور دار و رسن کو بھی بہ خوشی لبیک کہا ہے؛ اس لیے زمانہ حال میں، اُس کے تقاضے کے مطابق سیاسی تحریک میں، دین و ملت کی خدمت کے لیے، مخلصانہ طور پر حصہ لینا، علما کی شان کے خلاف ہے، نہ کوئی بدعت ہے؛ بل کہ اصحاب دعوت و عزیمت علما کی سنہری روایات کو زندہ کرنا ہے۔

شب بیدار و خوش اوقات عالم

وہ شب بیدار اہل دل اور خوش اوقات عالم دین تھے، مشاغل کی بے پناہی، کبھی باجماعت نماز میں خلل انداز ہوتی تھی نہ شب بیداری، تہجد گزاری اور آہ سحر گاہی میں، وہ صحیح معنی میں فارس بالتہار اور راہب باللیل تھے؛ کیوں کہ وہ جن اساتذہ کے شاگرد تھے، وہ صرف حرفِ علم کے پجاری نہ تھے؛ بل کہ وہ علم و عمل دونوں کے شہسوار تھے؛ اس لیے اُن کی گود میں پلا بڑھا ہر عالم صحیح معنی میں علم و عمل کا جامع ہوتا تھا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی اس کی نمایاں مثال تھے۔ اس راقم نے اُن کی انتہائی کم زوری، پیرانہ سالی اور بیماریوں کی مسلسل یلغار سے، انھیں زار و زار رہنے کا دور دیکھا ہے؛ لیکن وہ جہاں ہوتے، جس حال میں ہوتے، موسم جاڑے کا ہو یا لُوکا، برسات کی جھری ہو یا رات کی تاریکی وہ اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے مسجد پہنچتے اور باجماعت نماز ادا کرتے۔ عبادت کا ذوق، ذکرِ الہی کا شوق، تلاوت اور اوراد و وظائف کی پابندی، اُن کی ذات کا امتیازی وصف تھا۔ مدرسِ وفقیہ و مفتی و محدث، و مؤلف و سیاسی میدان کے سرگرم قائد مولانا سید محمد میاں، دراصل ایک متقی، خداترس اور زہدِ آداب عالم دین تھے، اُن کی زندگی کا یہی وصف درحقیقت سب سے زیادہ نمایاں اور اُن کی عظمت کے بار کا سب سے قیمتی موتی ہے کہ اس کے بغیر سارے کارنامے لفظِ بے معنی اور نقشِ ناتمام؛ بل کہ سچی ناکام ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے:

پس مرگ زندہ
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہ سحرگاہی

شیخ الاسلام کے خوانِ سلوک و احسان کے خوشہ چیں

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے دستِ گرفتہ اور اُن کے خوانِ سلوک و احسان کے ممتاز خوشہ چینوں میں تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی احسانی تعلیم و تربیت اور ایمانی حرارت و عبادتی ذوق و شوق سے صرف خانقاہ کی خلوتوں ہی میں فائدہ نہیں اٹھایا؛ بلکہ ملک و ملت کی بھرپور خدمتوں اور جمعیتِ علمائے ہند کی بے پناہ سرگرمیوں کی جلوتوں میں بھی، اُن کے نفسِ گرم کی تاثیر کو جذب کیا تھا۔ اُن کی خاک ساری اور تواضع اور فروتنی ہو سکتا ہے کہ اُن کے موروثی ساداتی رنگ کی عکاس ہو؛ لیکن اُس کی شوخی و گہرائی، بالیقین شیخ الاسلام کی صحبتِ اکسیری کی رہینِ منت تھی۔ شیخ الاسلام کی خاک ساری ضربِ المثل تھی؛ لیکن اِس راقمِ آثم کو اِس کے تجربے کی سعادت حاصل نہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں کی خاک ساری میں نے دیکھی اور برتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں چند ہی خداترسوں کو، اُن کے ایسا خاک سار اور منکسر المزاج پایا ہے۔

میدانِ سیاست کے تکانِ نا آشنا شہ سوار

اِسی کے ساتھ وہ میدانِ سیاست کے پُر جوش اور تکانِ نا آشنا شہ سوار تھے۔ آزادیِ وطن کی سرگرمیوں میں، اُنھوں نے سرفروشانہ حصہ لیا اور علمی و تدریسی مشاغل کے گم بھیر بوجھ کے باوجود، زبان و قلم اور حرکت و عمل کی ساری توانائیوں سے، تحریکِ آزادی کے انتہائی فعال، مخلص اور سچے سپاہی کا بے مثال کردار ادا کیا۔ اِس سلسلے میں وہ ساحل کے تماشا کی نہ تھے؛ بلکہ طرح طرح کی سختیوں، آزمائشوں، چکی کی مشقتوں اور جیل کی

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

سلاخوں، حوالات کے عذابوں، گرفتاریوں کی دردناکیوں اور خوف و دہشت کی تلاطم خیزیوں سے دیوانہ وار مقابلہ کیا، جس کی کچھ تفصیل ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں بالخصوص مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خودنوشت بہ شکل مضمون میں قاری کے سامنے آئے گی، جس سے اندازہ ہوگا کہ فرنگی سامراج کے خلاف نفرت و عداوت کا جو بیج، اُن کے عظیم اساتذہ اور پیش رو علمائے بویا تھا، وہ اس باشعور تاریخ کے مزاج آشنا اور اُمت کے عروج و زوال کے اسباب کا ادراک رکھنے والے دردمند عالم کے دل میں کیسا تازہ اور بار آور درخت بن گیا تھا۔ اس حوالے سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ غالب کے اس شعر کا مصداق تھے:

خانہ زاد زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیا

ہیں گرفتار وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا

وہ منحنی الجسم، دبلے پتلے اور چھریرے بدن کے تھے، انھیں دیکھ کر کسی کو قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ نسبتاً ایسے کم زور ڈھانچے میں شیر دل شخصیت چھپی ہوگی اور وہ تحریک آزادی کے میدان کے فولادی ارادے کے سپاہی رہے ہوں گے، جن کی عزیمت کو استعماری حکومت کی کوئی تدبیر کبھی چیلنج کر سکی نہ راہ کی سختیاں اور حالات کی دھوپ چھاؤں اُن کے پائے استقلال میں لرزش پیدا کر سکی۔ عربی شاعر نے بہت صحیح کہا ہے:

تَرَى الرَّجُلَ النَّحِيفَ فَتَزْدَرِيهِ

وَفِيْ اَثْوَابِهِ اَسَدٌ مَّزِيْرٌ

تم ایک نحیف الجسم انسان کو دیکھ کر اُس کو ہچکچھو گے، حال اُن کہ اُس کے اندر ایک پختہ دل شیر چھپا ہوگا (جس کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہی ہو سکے گا)

ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں

سیاسی میدان میں آپ کی تگ و دو اور جمعیۃ علمائے ہند سے وابستگی، دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ فراغت کے بعد ہی مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علمائے ساتویں

پس مرگ زندہ

اجلاس کلمتہ میں دارالعلوم کے اکابر کے ساتھ آپ نے شرکت فرمائی (۱) لیکن سیاسی سرگرمیوں کا اصل دور ”مدرسہ شاہی“ مراد آباد آمد کے بعد شروع ہوا، جو تاحیات باقی رہا۔ سب سے پہلے آپ جمعیتہ علما مراد آباد کے نائب ناظم منتخب ہوئے، پھر جمعیتہ علماے ہند کے ناظم اعلیٰ چنے گئے اور درگزر بڑی بڑی ذمے داریاں انجام دیں۔

جمعیتہ علما کے تاریخی اجلاس منعقدہ امر وہہ کی معنویت اور حضرت کا بہ حیثیت ذمے دار انتخاب

مئی ۱۹۳۰ء میں جمعیتہ علما کا تاریخی اجلاس شہر ”امروہہ“ میں منعقد ہوا، اس کی بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں کانگریس کے ساتھ شراکت عمل کی قرارداد پاس کی گئی۔ اس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیتہ علما شہر مراد آباد کی مجلس منظمہ کے اجلاس میں آپ کو شہر مراد آباد کی جمعیت کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، کچھ دنوں بعد باقاعدہ ناظم بنادیا گیا، پھر جمعیتہ علما صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنایا گیا؛ کیوں کہ اُس وقت جمعیتہ علما، تبلیغ کی سرگرمیاں بھی انجام دیتی تھی۔ پھر آگرہ اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے ناظم جمعیتہ بنادیے گئے، پھر اجلاس جمعیتہ سہارنپور ۲۴ تا ۲۷ مئی ۱۹۳۵ء میں جمعیتہ علماے ہند کے ناظم منتخب ہوئے، اسی اجلاس میں مجلہ ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء - ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) جمعیتہ کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمن کی وفات کے بعد ایک سال جمعیتہ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ آپ جمعیتہ کی نظامت کے عہدے پر تقریباً ۳۵ سال فائز رہے۔ نظامت علیا سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی، آپ جمعیتہ کی مجلس عاملہ کے رکن اور اُس کے ادارے ”ادارہ مباحث فقہیہ“ کے ناظم اور جمعیتہ ٹرسٹ کے سکریٹری رہے۔

قید و بند کی آزمائشیں اور حفظ قرآن پاک

جدوجہد آزادی کے دوران آپ پانچ مرتبہ قید و بند کی آزمائشوں سے گزرے،

(۱) ماہنامہ ”ندائے شاہی“ شمارہ اپریل - مئی ۱۹۹۰ء، ص: ۱۳۔

جس کے دوران آپ نے قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی؛ کیوں کہ بچپن میں آپ قرآن پاک حفظ نہیں کر سکے تھے۔ مراد آباد، دہلی، میرٹھ، بریلی اور فیض آباد کی جیلوں میں آپ قید رہے۔ جیل میں آپ نے چکی کی مشقت بھی سہی اور طرح طرح کی سختیاں بھی جھیلیں؛ لیکن اپنے اسلاف و مشائخ سے صبر و استقلال کا جو سبق سیکھا تھا، اُس کی وجہ سے آپ کے عزم و استقلال میں کبھی کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا۔

ارتداد کے خطرے کا سد باب اور مجاہدانہ سرگرمیاں

ملک کی آزادی کے بعد، جہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں رہ گئے تھے، وہاں ارتداد کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ان مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنا بڑا نازک مسئلہ بن گیا تھا، آپ نے اس سلسلے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا، راجستھان، میوات، ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں شب و روز دورے کیے، دینی مکاتب قائم کیے، ان مسلمانوں کو دینی معلومات بہم پہنچائیں، انھیں حکمتِ عملی سے اسلام کی قیمت و اہمیت بتائی، اس سلسلے میں بعض ایسی جگہوں کا سفر کیا، جہاں جانا بڑی ہمت اور عزیمت کا کام تھا، ان کے کم زور جسم میں اپنی ارادے کا ایک بہت طاقت ور انسان نہ ہوتا، تو وہ ہرگز یہ مہم انجام نہیں دے سکتے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں متعدد درختاے کار کو کام پر لگایا اور ان کی علمی و فکری تربیت کی۔ اس طرح ان گنت مسلمانوں کو ارتداد سے بچایا۔ یہ ان کے دینی و ملی کارناموں میں بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔

آزادی کے بعد نسلِ نو کے لیے ایمانی و عقائدی

حفاظتی دیوار کی تعمیر میں بنیادی کردار

اسی طرح آزادی کے بعد کے مرحلے میں مسلمانوں کی نئی نسلوں میں دین کی حفاظت اور عقیدہ اسلام پر انھیں برقرار رکھنا بھی دینی و ملی فریضے میں بنیادی حیثیت کا کام

پس مرگ زندہ

تھا، جمعیتِ علمائے ہند نے اپنے سولہویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶ تا ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم پر ارتکاز کو اپنا بنیادی پروگرام قرار دیا اور اس مہم کو انجام دینے کی ذمہ داری آپ ہی کے ذمے کی گئی، آپ نے نہ صرف اُسے مطلوبہ معیار پر انجام دیا؛ بلکہ اس کے لیے نصابی رسالے بھی مرتب فرمائے، جو دینی ”تعلیم کے رسالے“ کے نام سے بہت مشہور و مقبول ہوئے اور آپ کی میزانِ حسنات میں گراں قدر اضافے کا باعث بنے۔

ادارہ مباحثِ فقہیہ کا قیام اور اُس کی ذمہ داری

آپ ہی کی تحریک و ترغیب پر جمعیتِ علمائے ”ادارہ مباحثِ فقہیہ“ قائم کیا؛ تاکہ بدلتے ہوئے حالات میں، پیدا شدہ مسائل پر تحقیق اور غور و خوض کر کے، ملت کی اُن کے سلسلے میں رہ نمائی کی جائے۔ اس کے تحت متعدد اہم موضوعات پر آپ نے تحقیقی کام کیے، جو ملک کے نام و ز علما و فقہاء کے نزدیک بنیادی اہمیت کی نظر سے دیکھے گئے۔

الجمعیت کا احیائے نو اور اس کی ادارت

جمعیتِ علمائے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء سے روزنامہ ”الجمعیت“ دوبارہ جاری کیا تو اُس کی ادارت کی ذمہ داری آپ ہی نے انجام دی، اس تاریخ سے ۹ سال پہلے برطانوی حکومت نے اسے بند کر دیا تھا، اس وقت وہ سہ روزہ نکلا کرتا تھا۔

جمعیتِ علمائے تاریخ و دستاویزات کے تعلق سے، آپ کی تحریریں ہی اصل سرمایہ ہیں، آپ نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور تاریخ نویسوں کے لیے بنیادی مواد فراہم کر دیا۔

راقم السطور کے لیے، حضرت کی حیثیت

میرے لیے وہ شفقتِ پدری اور مہرِ مادری کا مجموعہ تھے۔ میں تین ماہ کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا؛ اس لیے میں نے اپنے باپ کی شفقت نہیں دیکھی، البتہ ماں کی

مہربانی اور پیار کا تسلسل الحمد للہ آج بھی (بہ روز یک شنبہ ۱۷ شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹ اگست ۲۰۰۹ء) قائم ہے، جب کہ میری عمر کی چھٹی دہائی کی تکمیل میں صرف ۳ سال رہ گئے ہیں۔ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ میرے لیے ذاتی طور پر والدین کی ساری خوبیوں کا پیکر تھے۔ یادش بہ خیر کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ (سابق مفتی و مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند و مشہور اہل قلم) نے ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ / دسمبر ۱۹۷۰ء میں دہلی کے اپنے سفر کے دوران، جو انھوں نے میری درخواست پر، میری خاطر کیا تھا اور مدرسہ امینیہ ہی میں قیام فرمایا تھا، مدرسہ امینیہ کی مسجد میں جانب شمال کے گوشے میں، جہاں اُس وقت حضرت الاستاذ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیا کرتے تھے، کیوں کہ شدید ٹھنڈک کی وجہ سے اپنی درس گاہ میں، جو تیسری منزل پر واقع تھی، اُن کے لیے جانا دشوار ہوتا تھا؛ حضرت الاستاذ سے ملاقات کی، میرا نام لے کر تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ اپنی دارالعلوم دیوبند کی خادمانہ زندگی میں جن چند طلبہ سے میں بے حد متاثر ہوا، اُن میں سے ایک یہ مولوی نور عالم مظفر پوری ہیں۔ یہ اُن کی بے حد سعادت کی بات ہے کہ یہ آپ کے تلمذ میں آگئے ہیں۔ اِن شاء اللہ آپ اِن سے خوش ہوں گے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ یہ بہت نادار ہیں، شیر خوارگی سے ہی سایہ پدری سے محروم ہیں، بے مایہ والدہ کے سوا کوئی اِن کا کفیل نہیں۔ بے سروسامانی اور محرومی کے تکلیف دہ احساس کے باوجود، الحمد للہ انھوں نے اپنے وقت کی قدر کرنا سیکھا ہے۔

محرومی کی تلخی اور دست گیری کی شیرینی

یہ چند جملے جو عاجلانہ طور پر حضرت الاستاذ کے کان میں پڑے، میں دل ہی دل میں اُن کے تعلق سے سوچتا رہا کہ یہ بہ جلد کافور ہو جائیں گے۔ یہ بزرگ سال حضرت بھلا انھیں کہاں یاد رکھ سکیں گے اور یاد رہے بھی تو اِن جملوں کا اُن کی طرف سے مجھے کیا

فائدہ ہو سکتا ہے؟ لیکن دسمبر کا نصفِ آخر آیا اور شدید ٹھنڈک نے دہلی اور مغربی یوپی کے اس پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شب و روز جیسا کہ یہاں اس موسم میں ہر طرف کی ہمیشہ ہوا کرتا ہے، بخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ میرے پاس یہاں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لیے ہمہ وقت پہننے کے کپڑے تھے یا کھڈر کی چادر، جو اُس زمانے میں ہمارے وسیع تر اطراف کے سارے طلبہ کے جسم پر نظر آتی تھی؛ کیوں کہ اُس وقت ہر گھر میں خواتین پَر خنے پر سوت کاتیتیں اور کھادی بھنڈاروں میں، جو ہر ممتاز گاؤں بالخصوص بلاک والے گاؤں میں ہوا کرتے تھے، فروخت کرتیں، اُس کے بدلے میں کچھ نقد روپے اور کھادی کے کپڑے، اوڑھنے کی چادریں اور بیڈ شیٹس حاصل کرتیں۔ اس طرح نادار خواتین کسی نہ کسی طرح روزمرہ کے مصارف کے لیے پندرہ روز یا ایک ماہ کے بعد کچھ نہ کچھ نقد پالیتیں۔ صبح اور شام کے وقت بالعموم اور چلے کی سردی میں بالخصوص جسم کے مجرّد کپڑے اور یہ بے چاری چادر جسم کے اندر پیوست ہوتی ہوئی برقیلی ہواؤں کو نہیں روک پاتی تھی؛ لیکن یہ سمجھ کر میں برداشت کرتا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لڑکپن کی مدافعت قوت، قناعت کی طاقت اور یہ سوچ کہ سردی کا یہ ہر صورت اسی ناتواں ہتھیار سے مقابلہ کرنا ہے، ایک طرح کی بھرپور قوتِ مدافعت کو جنم دیتی تھی۔

اسی حال میں، میں ایک روز صبح کے گھنٹے میں حضرت الاستاذ کے سامنے سمٹا، سکڑا ہوا ٹھنڈک کی بھرپور جارحانہ و تمام تر بے رحمانہ یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے بیٹھا ہوا تھا کہ درس کی تقریر کے دوران، اچانک حضرت الاستاذ کی نگاہ میرے کپکپاتے ہوئے جسم پر پڑ گئی۔ میں قدرے شرم سار ہوا کہ شاید آج میری بے مائیگی ان کے سامنے برہنہ ہو گئی ہے۔ انسان بڑے سے بڑے مشفق کے سامنے بھی اگر وہ بے تکلف اور دیرینہ درد آشنانہ ہو، تو اپنے کسی زخم کی ٹیس کے آشکارا ہو جانے سے بہت شرمندہ ہوتا ہے؛ حال آں کہ اُس کا علاج اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اُس کو کسی چارہ ساز پنہ نہاد کپاس، روئی کے سامنے بیان کیا جائے، یا از خود اُس کو اس کا علم ہو جائے؛ لیکن انسانی فطرت اگر وہ

خارجی عوامل کے ہاتھوں مسمار نہ ہو چکی ہو، اپنے دکھ کا حال، درد آشنائے ہم راز کے سامنے کہنے سے بھی ابا کرتی ہے۔

دوسرے روز صبح کے گھنٹے کے ختم پر حضرت الاستاذ نے مسجد ہی میں مجھے روک لیا۔ اور دگر طلبہ کو اپنے اپنے کمروں میں جانے دیا۔ جب تنہائی سی ہوئی، تو اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی نرم سی ایک چیز میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ آپ اس کو استعمال کریں، یہ جرسی ہے، ہے تو مستعمل لیکن ابھی درست حالت میں ہے اور آپ کے پاس کچھ نہ ہونے سے بہتر ہوگا کہ یہ پرانی جرسی ہی سہی بدن پر رہے۔ میں نے حضرت الاستاذ کے ہدیے کو جہاں اپنی سعادت سمجھا وہیں شرمندگی اور محرومی کے ملے جلے جذبات نے میرے زخمی دل کے تاروں کو بُری طرح چھیڑ دیا، کافی دیر تک میرے آنسو کسی طرح نہیں تھھے۔ حضرت نے فرمایا: تم اس قدر متاثر کیوں ہو؟ مجھے کوئی جواب اس کے سوانہ بن پڑا کہ شکستہ اور لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ میں، میں نے جزاک اللہ کہا اور کمرے میں جا کے آنکھیں پوچھ، دوسرے گھنٹے کی تیاری کر مسلم شریف کے لیے، حضرت مولانا سید محمد مشہود احسن امر وہی مدظلہ (۱) کی درس گاہ میں حاضر ہو گیا۔

حضرت کی عنایتوں کا تسلسل

اس کے بعد حضرت کی عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ درس گاہ میں سبق کی تفہیم کے دوران، اکثر مجھے ہی مخاطب کرتے، شاید انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سبق کو زیادہ غور سے سنتا، اُس سے دلچسپی لیتا اور اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؛ لہذا میری تقریر و تفہیم کی امانت کا یہی زیادہ حق دار ہے۔ مُدَرِّس اور مُقَرَّر، مُخاطَبین میں سے عموماً اُنھی

(۱) اور اب اس مضمون کے کتابی شکل میں طباعت کے لیے لاسٹ چنگ سے گزارے جانے کے وقت رحمۃ اللہ علیہ؛

اس لیے کہ انھوں نے ۲۵ صفر ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۰/ فروری ۲۰۱۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی تاریخ پیدائش

۲۹ مئی ۱۹۲۷ء مطابق ۲۶/ مئی ۱۳۳۵ھ ہے۔

پس مرگ زندہ

لوگوں کی طرف زیادہ روئے سخن مرکوز کرتا ہے، جن کے چہرے سے دلچسپی، توجُّہ، سمجھ داری اور پیش کی جارہی باتوں کی قدردانی آشکارا ہوتی ہے۔ مدرس اور مقرر کسی جانب روئے سخن کے ارتکاز کے حوالے سے مجبور ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس سلسلے میں اُس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حاضرین و سامعین کی توجُّہات میں، خداے حکیم نے مقناطیسی جاذبیت رکھی ہے۔

مدرسوں میں عموماً سنہ ہجری کی پہلی دوسری تاریخ کو مدرسین و ملازمین کو تنخواہیں ملا کرتی ہیں۔ پہلی یا دوسری تاریخ کو جب حضرت الاستاذ کو تنخواہ ملتی، تو ہر مہینے تو نہیں؛ لیکن دوسرے تیسرے مہینے وہ اپنے سبق کے ختم پر، تیسری منزل پر واقع اپنی درس گاہ سے نیچے اترنے کے لیے زینے پر قدم رکھنے سے قبل، مجھے بلاتے اور دس یا پندرہ روپے عنایت فرماتے۔ چوں کہ جب بھی وہ یہ رقم ہدیہ فرماتے تو اسی جگہ فرماتے تھے؛ اس لیے مجھے اس جگہ سے ایک طرح کی انسیت سی ہو گئی تھی، مثنوی نے سچ کہا ہے:

وَكُلُّ امْرِئٍ يُولِي الْحَمِيلَ مُحَبَّبٌ
وَكُلُّ مَكَانٍ يُنْبِئُ الْعِزَّ طَيِّبٌ

ہر احسان کنندہ انسان، انتہائی محبوب ہوتا ہے اور عزت دہندہ ہر جگہ خوش گوار اور مسرت انگیز ہوتی ہے۔ یہاں پہلے مصرع کے حوالے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس کا مضمون ہر ایک کے لیے عیاں ہے؛ لیکن دوسرے مصرع کو ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ پڑھ دیا جائے، تو وہ تمام تر میرے مطلب کا ہو جائے گا:

وَكُلُّ مَكَانٍ يُنْبِئُ النَّقْدَ طَيِّبٌ

یعنی ہر وہ جگہ جہاں رقم یا روپے پیسہ ملا کرتا ہے وہ جائے خوشی ہوتی ہے۔

علمی ہدیے اور تاریخی یادیں

حضرت کی اُس زمانے میں ایک سے زائد تصنیفات شائع ہوئیں۔ ”حضرت

عثمان ذی النورین کے شواہد تقدسؒ، زیور طبع سے آراستہ ہوئی، تو بانس کے کاغذ میں پیک کر کے باقاعدہ میرانا نام لکھ کے ہدیہ کیا، جیسے میں بھی کوئی اہل علم و اہل قلم ہوں۔ اُن کے الطاف کے سامنے مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی؛ لیکن اُن کا رُعب نہ صرف میری عقل و خرد پر، بل کہ میری زبان پر بھی ایسا مُسلط رہتا تھا کہ میں تلمیذ یا ترید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ پاتا تھا۔ یہ کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۹ء - ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) کی مشہور کتاب ”خلافت و ملکیت“ کے اُس حصے کو جواب میں لکھی گئی تھی، جس میں اُنھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما پر نازیبا اعتراضات کیے ہیں، جن کے جواب میں علمائے دیوبند میں سے مُعَدِّذِ اہل علم و قلم نے مُحَقِّقانہ کتابیں لکھیں۔ حضرت الاستاذ کی یہ کتب جب منظرِ عام پر آئی، تو مولانا مودودیؒ کے مُعْتَقِدِین میں سے کئی اہل قلم نے اِس کے رد میں تیز و تند لہجے والی کتابیں تصنیف کیں، جن میں انتہائی سخت کتاب مولانا مودودیؒ کے ایک پُر جوش دیوبندی اہل قلم و شاعر و صحافی مولانا عامر عثمانیؒ (پ: ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء، متوفی شب ۳۰ ربیع الاول - یکم ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ = ۱۲ - ۱۳ اپریل ۱۹۷۵ء) کی تھی، جس میں در پیدہ وئی کی حد کردی گئی ^{کستہ بدلتہ} تھی۔ مجھے یاد ہے، اُن کے یہ مضامین جو پہلے اُن کے ماہ نامہ ”تجلی“ میں چھپے اور پھر کتابی شکل میں شائع ہوئے، جب حضرت الاستاذ کے مُطالَعے میں آئے، تو آپ کو سخت قلبی اذیت ہوئی؛ کیوں کہ مولانا عامر عثمانیؒ کا سو قیام نہ اور تمسخر کا انداز دل کو چھلنی کرنے والا تھا۔ مولانا عثمانیؒ چوں کہ مزاحیہ نگار بھی تھے اور اُنھیں کسی بڑے سے بڑے اہل فضل کے خلاف انتہائی ٹکلیے الفاظ کے استعمال میں کوئی باک نہ ہوتا تھا؛ اِس لیے یہی اندازِ تحریر اُنھوں نے حضرت الاستاذ کے خلاف بھی استعمال کیا تھا۔ آج دونوں حضرات اِس دنیا میں نہیں؛ لیکن حضرت مولانا سید محمد میاں کا ذکرِ حسن بہت بڑے دینی و علمی حلقے کی زبان پر رہا کرتا ہے اور اِنْ شاء اللہ رہے گا؛ جب کہ مولانا عامر عثمانیؒ کا نام، اُن کی تحریروں کی تمام تر چاشنی اور شاعری کے سارے نرالے پن کے باوجود، شاید و باید ہی کوئی لیتا ہوگا۔

پس مرگ زندہ

یہ صورتِ حال باعثِ عبرت بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

اسی کے کچھ عرصے بعد حضرت الاستاذ کی ”سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ“ شائع ہوئی، تو حضرت نے اسی اہتمام سے ناچیز کو ہدیہ کیا اور فرمایا کہ مطالعے کے بعد اگر طباعت وغیرہ کی غلطیاں نظر آئیں، تو ضرور بتائیے گا؛ تاکہ آئندہ اشاعت کے وقت اُن کی تصحیح ہو جائے۔

لینے والا
دہلی کی دل بَری و دل ستانی لینے والا

کئی بار حضرتؒ کے ساتھ اُن کی مسجد ”مسجدِ نواب قاسم جان“ (جو ”احاطہ کالے صاحب“ کے باہر گلی قاسم جان کی سڑک پر واقع ہے) یا اُن کے مکان واقع اندرون ”احاطہ کالے صاحب“ جانے کا موقع ملا۔ عموماً وہ کسی تحریر کو اُس وقت صاف کرنے کی خدمت میرے سپرد کرتے، جب اُن کے اس کام کے لیے مخصوص تمبیض کنندہ بڑے میاں موجود نہ ہوتے یا دیگر تمبیضی کاموں میں لگے ہوتے۔ حدیث شریف کی موٹی موٹی کتابیں صرف تعلیمی گھنٹوں کے محدود دورانیے میں عموماً ختم نہیں ہو پاتیں؛ اس لیے ان کتابوں کے مدرسین بالخصوص صحابِ ثلاثہ: صحیح بخاری شریف، صحیح مسلم شریف، اور جامع ترمذی شریف کے اساتذہ انھیں فرصت کے دیگر اوقات میں پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم لوگ بھی صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھنے کے لیے، جمعہ کے دن علی الصبح اور دیگر ایام میں مغرب سے ذرا پہلے ”مسجدِ نواب قاسم جان“ قاسم جان اسٹریٹ، پٹی ماران آتے اور مذکورہ کتابوں کے اسباق حضرت الاستاذؒ سے پڑھتے۔ ایک بزرگ تاجر مسجد کے پڑوس کے حضرتؒ کے بے حد معتقد تھے، اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے، وہ ہم سارے طلبہ کو کبھی لسی اور کبھی پھلوں کا رس پلاتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ دہلی کا گلی کوچہ ویسے بھی ہر مسلمان کو محبوب ہے؛ کیوں کہ بقول علامہ حالی (مولانا الطاف حسین انصاری شمس العلماء

۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء-۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء):

چپے چپے پہ ہے یاں گوہر یکتا تہ خاک
دُن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اور بہ قول شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبال (ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء-
۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء):

سرزمینِ دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذّرے ذّرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاکِ اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمین
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الائم کے تاج دار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو ترپاتی ہے اب تک گرمی محفل کی یاد
جل چکا حاصل؛ مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

دہلی.. آئی جب اُس کی یاد تو آتی چلی گئی

یہاں کے گلی کو چوں میں چلیے تو ایسا لگتا ہے، جیسے روحانیت اور ایک خاص قسم کی
دینی کیفیت نہ صرف مصافحہ و معانقہ؛ بل کہ ہر سانس کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں
سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کی لذت کا جس ہمہ گیر طور پر ایک باشعور
مسلمان کو ادراک ہوتا ہے، اُس کو وہ زبان و بیان کی ساری صلاحیتوں کے باوجود، صحیح
طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ ذّرے ذّرے میں دینی کیف اور اُن گنت خاصانِ خدا و شب
زندہ دار علما و صلحا اور ہر فن کے باکمال انسانوں کی آہِ سحرگانی کے اثرات اور اُن کی
بوسیدہ ہڈیوں کے سفوف کی جاں فزا و کیف آور و یقین افروز خوشبوئیں مشامِ جاں کو
مُعطر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ فراق گورکھپوری (رگھوپتی سہائے ۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء)

دل جلے روئے ہیں شاید اس جگہ، اے کوئے یار!

خاک کا اتنا چمک جانا، ذرا دشوار تھا

لیکن بلی ماران کا یہ بڑا علاقہ اور گلی قاسم جان کا نسبتاً چھوٹا خطہ، جہاں ۱۹۷۰ء-۱۹۷۱ء میں ان گنت بار آنا جانا ہوا، اتنا پیارا اور بھلا معلوم ہونے لگا تھا کہ جب اگست ۱۹۸۲ء / شوال ۱۴۰۲ھ میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں، بہ حیثیت استاذ و مدیر ”الداعی“ عربی تقرر ہوا اور اللہ پاک کی تقدیر سے انھی گلی کوچوں میں (جمعیت بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی میں) قیام کے لیے ”الداعی“ کے کاموں سے لاتعداد مرتبہ دہلی آنے جانے کے موقع سے، آنے جانے کا موقع ملا، تو وہ خوب صورت دن یاد آئے، جب حضرت الاستاذؒ کی حیات میں، اُن سے استفادے کے لیے، بار بار یہاں آتا تھا، شروع شروع میں کئی بار خوشی کے احساس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ”مسجد نواب قاسم جان“ میں بھی ”جمعیت بلڈنگ“ میں واقع دفتر ”الکفاح“ (۱) پندرہ روزہ عربی کے دفتر میں قیام کے دوران کئی مرتبہ جمعہ کی نمازیں اور بہت سی مرتبہ پنج وقتہ نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، کئی سال تک مسجد ہو یہ ہو وہی تھی، جو حضرت الاستاذؒ کے زمانے میں تھی، اُس میں کسی طرح کی ترمیم نہیں ہوئی تھی، اسی مسجد کے ایک کمرے میں حضرت الاستاذ کا ذاتی تجارتی کتب خانہ ”کتبستان“ تھا؛ لیکن ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کے عرصے میں یہ مسجد شہید ہو کر دوبارہ بہت خوب صورت، کئی منزلہ آرسیسی کی انتہائی مضبوط بن گئی ہے۔

(۱) ”الکفاح“ ”جمعیت علمائے ہند“ کا پندرہ روزہ عربی ترجمان تھا، جو ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۷ء (۸ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ) کا شمارہ شائع ہونے کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ اس کے بانی اور چیف ایڈیٹر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی (۱۳۳۹ھ - ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء) تھے اور نائب ایڈیٹر حضرت کے شاگرد مولانا منزل الحق قاسمی میرٹھی ثم الدہلوی، ٹیچر سینئر سکندری اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تھے۔

جمعیتہ بلڈنگ گلی قاسم جان کا ذکر قلم کی زبان پر آ ہی گیا ہے، تو یہ بھی کیوں نہ ذکر کر دیا جائے کہ اسی جمعیتہ بلڈنگ میں اُس زمانے میں پابندی سے شائع ہونے والے جمعیتہ کے اردو ترجمان روزنامہ ”الجمعیتہ“ کا دفتر بھی تھا اور اُس وقت ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء میں، اُس کے ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء-۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) تھے، جن سے بہتر ادارے اور تبصرے کوئی اردو صحافی نہیں لکھ پاتا تھا، اسی جمعیتہ بلڈنگ میں ہفت روزہ ”الجمعیتہ“ کا دفتر بھی تھا، اس ہفت روزہ کے ایڈیٹر اُس وقت مولانا وحید الدین خاں تھے، جن کی رہائش بھی اسی بلڈنگ میں تھی۔ اسی ”جمعیتہ بلڈنگ“ میں ”جمعیتہ علما“ کا مشہور فقہی و تحقیقی ادارہ ”إدارة المباحث الفقہیہ“ تھا، جس کے حضرت الاستاذ ہی محرزک اور مؤسس تھے۔ یادش بہ خیر کہ اسی ادارہ مباحث فقہیہ کے دفتر میں، ۱۹۷۱ء (۱۳۹۱ھ) کی کسی تاریخ کو ملت اسلامیہ ہند کے بے باک قائد، دور میں عالم اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تائیس کے محرزک و اولین جنرل سکریٹری امیر شریعت سید شاہ منت اللہ رحمانی (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) حضرت الاستاذ کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوئے اور اس راقم کی خوش قسمتی کہ حضرت الاستاذ کے حکم سے یہی انھیں پرانی دہلی کے اسٹیشن سے اپنے ساتھ لا کر یہاں رکایا اور جب تک وہ دہلی رہے اُن کی خدمت کی۔

دہلی سے دوری کی ناگزیر وجہ

مدرسہ امینیہ میں شوال ۱۳۹۰ھ سے شعبان ۱۳۹۱ھ تک کا تعلیمی سال اس طرح گزر گیا کہ کچھ زیادہ احساس نہ ہوا، شعبان کے بعد رمضان آیا، میں نے رمضان کے ابتدائی ایام مدرسہ امینیہ ہی میں گزارے۔ ایک روز صبح کو ۸-۹ بجے کے قریب مسجد کے حوض پر، جو مدرسے کے صدر دروازے کے مدخل پر مسجد کے صحن کے کنارے شمالاً

پس مرگ زندہ

وجوہاً لمبائی اور شرقاً و غرباً چوڑائی میں واقع ہے، وضو کر رہا تھا کہ روز کی طرح رمضان کے آج کے مبارک دن کی ابتدا بھی تلاوتِ قرآنِ پاک سے کروں کہ اچانک صدر گیٹ سے حضرت الاستاذ کو اپنی چھتری ٹیکتے مدر سے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا؛ کیوں کہ میں مشرق کی طرف ہی رخ کر کے بیٹھا ہوا تھا، جدھر مدر سے کا صدر دروازہ ہے۔ میں نے وضو کو نا تمام چھوڑ آگے بڑھ کر حضرت کو سلام کیا اور ان کے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کے بوجھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، تو حضرت نے منع فرمادیا۔ خبر خیریت دریافت فرماتے ہوئے استفسار فرمایا کہ آپ رمضان میں یہیں رہیں گے یا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو یہیں رکوں گا؛ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ حال ہی میں مدینہ منورہ میں کوئی جامعہ ”جامعہ اسلامیہ“ کے نام سے قائم ہوئی ہے (۱)۔ مجھے وہاں داخلہ لینے اور تعلیم حاصل کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ اس سلسلے میں حضرت کی خصوصی دعا اور مدد کا طلب گار ہوں۔ یہ سن کر حضرت حوض کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: یہ آپ نے بہت مشکل معاملہ میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ بیرون ملک مجھے کوئی جانتا نہیں، سعودی عرب کے کسی عالم سے میرے تعلقات نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہاں داخلے کا طریقہ کار کیا ہے؟ پھر معاً فرمایا: ہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء) سے اس سلسلے میں معلوم کیا جائے۔ اُن کے تعلقات علما اور مشاہیر وقت سے میری بہ نسبت زیادہ ہیں۔ وہ شاید اس سلسلے میں دست گیری اور راہ نمائی کریں۔ ایسا ہے کہ کل فجر کی نماز آپ میرے ساتھ ”مسجد نواب قاسم جان“ میں پڑھیں۔ میں آپ کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی صاحب کے ہاں لے چلوں گا اور اس مسئلے میں اُن سے مدد کی درخواست کروں گا۔

(۱) یہ جامعہ، مدینہ منورہ میں بروز منگل ۱۳۸۱/۳/۲۵ھ مطابق ۱۹۶۱/۸/۸ء کو قائم ہوئی تھی۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ سے اُن کے دفتر میں ملاقات

راقم نے حضرت کے حکم کے مطابق، فجر کی نماز مسجد نواب قاسم جان، گلی قاسم جان میں ادا کی، دعا کے بعد حضرت سے ملا، حضرت نے فرمایا کہ ابھی تو بہت سویرا ہے، میں تلاوت کے معمول سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد چلتے ہیں۔ حضرت اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلتا رہا، چاوڑی بازار کے راستے ہم جامع مسجد اردو بازار میں ”ندوة المصنفین“ کے دفتر پہنچے، اندر داخل ہوئے، بھاری بھر کم سی دو منزلہ چوڑی چوڑی دیواروں والی دو منزلہ عمارت۔ ہم کشادہ گیلری میں جو خوب صورت خوب صورت گول گول پر شکوہ کھمبوں پر قائم تھی، لکڑیوں کے پُرانے طرز کی شان دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں موجود خادم سے حضرت نے فرمایا کہ مفتی صاحب ہیں کہ نہیں؟ اُس نے کہا: ہیں؛ لیکن اس وقت گھر ہوں گے، میں خبر کیے دیتا ہوں کہ مہمان آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ کہنا کہ مدرسہ امینیہ سے محمد میاں آیا ہے۔ چند منٹ بعد مفتی صاحب تشریف لے آئے، علیک سلیک کے بعد، مفتی صاحب نے حضرت سے تشریف لانے کی وجہ معلوم کی۔ حضرت نے فرمایا: یہ مولوی نور عالم ہیں، ذی استعداد ہیں، عربی زبان سے خاصا شغف ہے، یہ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں کوئی جامعہ اسلامیہ قائم ہوئی ہے اور وہاں دوسرے ملکوں کے طلبہ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ یہ بھی وہاں داخلے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مجھے تو یہ نہیں معلوم کی وہاں داخلے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ انھوں نے کل مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، تو میں نے ان سے کہا کہ مفتی صاحب ہی کو اس سلسلے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے؛ لہذا اُن سے مل کے کوئی صورت نکل سکتی ہے؛ میں صبح سویرے اس لیے آ گیا کہ آپ کہیں نکل نہ جائیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا: میری معلومات کے مطابق یہاں ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی اور پاکستان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اُس کی

پس مرگ زندہ

مجلس شوریٰ یا مجلس منظمہ میں لیا گیا ہے، میرا اندازہ ہے کہ اگر مولانا ندوی نے سفارش لکھ دی، تو ان کا داخلہ بالضرور وہاں ہو جائے گا، میں انھیں خط لکھے دیتا ہوں، یہ اپنی درخواست کے ساتھ اس کو ان کے پاس رجسٹری بھیج دیں۔ ان شاء اللہ وہ ضرور سفارش لکھ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا: آپ تو خط تحریر فرما ہی دیں، میں بھی انھیں لکھوں گا؛ تاکہ مزید تاکید ہو جائے۔ ایک اچھی تقریب یہ بھی بن گئی ہے کہ ابھی چند روز قبل مولانا نے اپنی کتاب ”مختارات“ کی جلدیں میرے پاس رائے جاننے کے لیے بھیجی ہیں۔ میں کتاب پر اپنی رائے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے سفارش کی درخواست بھی کر دوں گا۔

اُسی چاوڑی بازار، جو جامع مسجد کے جانبِ غرب میں واقع ہے، کے راستے سے ہم لوگ گلی قاسم جان کے لیے روانہ ہوئے۔ حضرت نے راستے میں اس ناچیز سے کہا: آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کی درخواست عربی میں تیار کر لیں اور اپنے خطِ نسخ میں، جسے آپ خوب صورت لکھتے ہیں، اُس کو خوش خط لکھ لیں۔ میں آج ہی مولانا ندوی کے نام خط لکھ رکھتا ہوں، ان شاء اللہ کل ہم رجسٹری بھیج دیں گے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے، درخواست

اردو بازار جامع مسجد میں ان دنوں خوش نویسی کے لوازمات کی ایک دکان تھی۔ راقم نے چند ہی روز قبل اُس دکان سے جرمنی کا بنا ہوا قلم کا ایک پرس نمائش خرید ا تھا، جس میں خطِ نستعلیق و خطِ نسخ و خطِ رقعہ لکھنے کے لیے، کئی طرح کے موٹے اور باریک قلم اور لکیر کھینچنے کے بھی دو تین قلم تھے۔ میں انھیں لے کر بیٹھ گیا۔ میرے پاس بہت اچھا سفید قدرے دبیز کاغذ تھا، ”سن لائٹ“ میں نے اُس میں سے فلس کیپ (Foolscap) سائز کے دو تین صفحات علاحدہ کیے۔ پہلے فائونٹین پن (Fountain pen) سے ایک صفحے پر عربی میں درخواست لکھی، پھر انھی مذکورہ قلموں سے دوسرے صفحے پر خطِ نسخ میں، جیسے

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیہ انویؒ (۱۳۳۹ھ/۱۹۳۰ء-۱۳۴۵ھ/۱۹۹۵ء) نے ٹائپ رائٹر (Type writer) کی تحریر کی طرح کٹے کٹے انداز میں لکھنا سکھایا تھا، اُسے بڑے اہتمام سے خوش خط لکھا اور دوسرے دن ۸-۹ بجے صبح کو مدرسہ امینیہ میں حضرت کی آمد کے وقت، اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک میں بھی پابندی سے ۸-۹ بجے مدرسے آتے اور ۱۲ بجے کے قریب تشریف لے جاتے؛ کیوں کہ وہ شیخ الحدیث و صدر مدرس کے ساتھ ساتھ، صدر مفتی بھی تھے اور رمضان المبارک میں بھی لوگ کثرت سے فتویٰ لینے آیا کرتے تھے؛ اس لیے کہ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہؒ (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کی ذات گرامی کی وجہ سے فقہ و فتویٰ کے حوالے سے، مدرسہ امینیہ کو جو شہرت ملی تھی، وہ ہنوز قائم تھی۔ دہلی کا کوئی اور مدرسہ اس حوالے سے مدرسہ امینیہ کا ہم سر نہ تھا۔

حضرت کچھ دیر تک تحریر کو دیکھتے رہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ شاید حضرت کو حسن تحریر پسند آیا ہے؛ اسی لیے اسے بار بار الٹ پلٹ کے دیکھ رہے ہیں؛ لیکن زبان سے میرے سامنے پسندیدگی کی غمازی کرنے والا کوئی لفظ نہیں کہا۔ دوسرے روز صبح کو ارشاد فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو لکھا ہے کہ ہم رشتہ درخواست کی عربی زبان اور اُس کی کتابت دونوں ہی درخواست دہندہ کی ہیں، اگر ان سے اُس کی کسی صلاحیت کا اندازہ ہو، تو آں محترم اُس کے لیے ضرور سفارش تحریر فرمادیں، بہ صورتِ دگر میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ حضرت کو نہ صرف میری خوش خطی؛ بل کہ درخواست کی عربی زبان بھی، اس حد تک پسند آئی کہ آپ نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو پُر اعتماد لہجے میں سفارش تحریر فرمادینے کی بات کہی، گویا آپ کو یقین تھا کہ عربی زبان کے مولانا علی میاں جیسے رمز آشنافاضل بے بدل، ایک نوعمر طالب علم کی اس تحریر کے ”ظاہر“ و ”باطن“ سے اتنا متاثر تو ضرور ہوں گے کہ وہ ایسی سفارش لکھ دیں گے کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اُس کا داخلہ یقینی ہو جائے گا۔

درخواست پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصدیق

یہ درخواست اور ہم رشتہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، حضرت الاستاذؒ، نیز حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصفؒ (۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء - ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء) مہتمم مدرسہ امینیہ کے خطوطِ اواخرِ رمضان میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجے گئے، جو یقیناً حضرت مولاناؒ کو شوال میں موصول ہوئے ہوں گے۔ رمضان کے معمولات کی وجہ سے، شوال میں بھی علمی و تالیفی کاموں کی بھیڑ رہی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ ضروری اسفار بھی رہے ہوں، جو وہ کثرت سے کیا کرتے تھے؛ اس لیے میری درخواست پر اُن کی سفارش اور حضرت الاستاذؒ کے نام اُن کا مکتوب گرامی، حضرت الاستاذؒ کو ذی قعدہ کے اواخر میں ملا۔ یہ ناچیز اُن دنوں دیوبند گیا ہوا تھا، جہاں عید الاضحیٰ کے ایام اپنے ہم درسوں اور ہم قریب دوستوں کے ساتھ گزرے۔ یہاں ایک ماہ کے قریب قیام رہا۔ میں احتیاطاً حضرت کو دو ایک لفافے دے آیا تھا، جن پر دیوبند کا میرا پتہ درج تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا اگر اس اثنا میں جواب آئے اور حضرت مجھے اُس سے بروقت مطلع کرنا ضروری سمجھیں، تو مطلع فرمادیں۔

عید الاضحیٰ ۱۳۹۱ھ کے نصف اور فروری ۱۹۷۲ء کے اوائل کی کسی تاریخ کو میں اپنے دیرینہ حجرےؒ دار جدید (جو مدنی گیٹ اور باب الظاہر سے آتی ہوئی دار جدید کے کمروں کی دونوں لائنوں کے سنگم پر دوسری منزل پر واقع تھا اور اُس کے سامنے نسبتاً کم اونچا ایک کمرہ بنا ہوا تھا، جس کی چھت اُس کمرےؒ کے لیے صحن کا کام دیتی تھی) کے صحن میں بیٹھا غسلِ آفتابی کر رہا تھا؛ کیوں کہ یہ جاڑے کے دن تھے، کہ ابجے کے قریب ”پیارے“ ڈاکیہ نے ”نورِ عالم مظفر پوری“ کہہ کر صحن میں میرے نام کا لفافہ اُچھال دیا۔ لفافے کی پشت پر جیسے ہی میں نے محمد میاں، کتابستان، گلِ قاسم جان، دہلی ۶ لکھا ہوا دیکھا کہ میں سمجھ گیا کہ حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے جواب کے تعلق

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

سے کوئی بات لکھی ہوگی۔ میں نے جلدی میں لفافے کو چاک کیا، تو حضرتؒ کی اس مضمون کی تحریر میرے سامنے تھی:

عزیز محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج عزیز؟۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے آپ کی درخواست پر بہت اچھی سفارش لکھی دی ہے، ساتھ ہی انھوں نے میرے نام اپنے مکتوب گرامی میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی تحریر کی زبان اور حسنِ خط سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں عرصے سے ندوۃ العلماء کا ناظم ہوں، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی نو عمر طالب علم کا اتنا پاکیزہ خط میری نظر سے گزرا ہو۔ درسِ نظامی میں میرے علم کے مطابق عموماً عربی تحریر و انشا کی مشق کما حقہ نہیں کرائی جاتی؛ لیکن اس طالب علم کی عربی درخواست میں، جو اُس نے آں محترم کی تحریر کے مطابق، خود تیار کی ہے، زبان اور صرف و نحو کے حوالے سے کسی طرح کی فروگزاشت نہ ہونا، خوش آئند بات ہے۔ توقع ہے کہ جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ میں انھیں قبول کر لیا جائے گا۔ اس کا رروائی میں عموماً خاصا وقت لگ جاتا ہے اور گنجائش نہ ہونے کی صورت میں جامعہ کی انتظامیہ امیدوار طالب علم کے داخلے کو آئندہ تعلیمی سال کے لیے معلق کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں، میں بھی عربی زبان کا طالب علم ہوں، آپ کے تلمیذ رشید اگر مجھ سے یہاں لکھنؤ یا رائے بریلی میں ملیں، تو مجھے خوشی ہوگی۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کے اس انتہائی حوصلہ افزا خط کے بعد، اب آپ کا کام اس وقت یہ ہے کہ آپ بہ عجلت تمام دہلی آجائیں اور مولانا سے ملنے کے لیے لکھنؤ چلے جائیں۔ کرایے کے لیے روپے شاید آپ کے پاس نہیں ہوں گے، تو وہ میں دوں گا۔

دعا گو و دعا جو

محمد میاں

حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں

دو تین دن کے اندر میں دہلی آیا، حضرت سے ملا اور لکھنؤ کے سفر کی ترتیب قائم کی۔ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے اواخر اور فروری ۱۹۹۲ء کے واسط میں، میں دہلی لکھنؤ میل سے، نئی دہلی سے لکھنؤ کے لیے ۹-۱۰ بجے رات میں روانہ ہوا۔ صبح کو ۷-۸ بجے لکھنؤ ”چارباغ اسٹیشن“ اور وہاں سے گوتمی ندی کے ساحل پر، ٹیگور مارگ پر واقع دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچا، دہلی کے ایک طالب علم (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے) جس کا حضرت نے ہی نام دیتا دیا تھا، سے ملا، خبر خیریت معلوم کرنے کے بعد وہ مجھے لے کر مہمان خانہ آئے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ابھی صبح کو یہیں تھے؛ لہذا اُن سے بروقت ملاقات ہو جائے گی؛ لیکن وہاں موجود ایک صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا ابھی چند منٹ پہلے رائے بریلی روانہ ہو گئے ہیں۔ آپ فوراً اسٹیشن ”چارباغ“ چلے جائیے، آپ کو فلاں گاڑی مل جائے گی اور آپ ظہر کے وقت تک مولانا کے گاؤں ”تکیہ کلاں“ رائے بریلی پہنچ جائیں گے۔

الغرض میں اسٹیشن آیا، رائے بریلی کا ٹکٹ لیا، گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ چل پڑی رائے بریلی اسٹیشن پر اتر کر میں نے رکشالیا اور مولانا کے گاؤں ”تکیہ کلاں“ پہنچا۔ مہمان خانے میں اپنا سامان رکھا، وہاں موجود ایک صاحب سے میں نے کہا کہ مجھے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملنا ہے۔ اُنھوں نے کہا: وہ بھی ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہیں، چوں کہ ظہر کی اذان ہو چکی ہے؛ اس لیے وہ مسجد تشریف لے گئے ہیں، آپ بھی مسجد ہی چلے جائیے، وضو وغیرہ کا وہیں نظم ہے، وہیں حضرت مولانا سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں مسجد آیا، تو حضرت مولانا سست پڑھ رہے تھے۔ اُن کے خادم عبدالرزاق صاحب (اور اب الحاج عبدالرزاق صاحب) نے مجھے اجلی جان کر فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے اپنا نام بتایا اور یہ کہ میں دہلی سے آیا ہوں، حضرت مولانا سید محمد میاں دہلوی کا شاگرد ہوں، اُنھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی فرمائش

کے مطابق مجھے اُن سے ملنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں وضو کر کے آیا، تو حضرت مولانا سقّت سے فارغ ہو چکے تھے اور بھائی عبدالرزاق میری بابت اُنھیں بتا چکے تھے۔ میں نے حضرت کو سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو اُنھوں نے فرمایا کہ آپ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے صرف شاگرد ہیں یا عزیز قریب؟ میں نے عرض کیا: صرف ایک ادنیٰ شاگرد۔ حضرت نے فرمایا اس زمانے میں کوئی استاد اپنے شاگرد سے شاید وہاں ہی اتنی محبت کرتا ہوگا، جتنی مولانا آپ سے کرتے ہیں۔ اس سال مختلف تقریبوں سے اُن کے میرے پاس جتنے خطوط آئے، ہر ایک میں اُنھوں نے آپ کا ذکر خیر ضرور کیا اور یہ کہ آپ کو عربی زبان سے بہت تعلق ہے۔

دنیا میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی کے تعلق سے کرتے کم ہیں اور کہتے زیادہ ہیں؛ بل کہ بعض لوگ تو ایسے ستم ظریف بھی ہوتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کرتے؛ لیکن جتنا بہت ہیں۔ اور اگر تھوڑا بہت بھولے بھٹکے میں واقعی کچھ کر دیں، تب تو اتنا احسان دھرتے ہیں کہ وہ بیچارہ شرم سے گھڑی ہو جاتا ہے۔ حضرت الأستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت و رحم دلی اور بے کسوں کی تاحد اِمکان دست گیری کی صفات کا مجھے اُن کی ایک سالہ صحبت میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا؛ لیکن مجھے یہ قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے لُحْتِ جگر کی طرح سمجھتے اور میری ذات کی تعمیر اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے، اُسی طرح کوشاں رہتے ہیں جیسے کوئی دردمند باپ اپنے سپوت اور انتہائی فرماں بردار بیٹے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ جس وقت مذکورہ بالا الفاظ ارشاد فرما رہے تھے، حضرت الاستاذؒ کے تئیں شکر و سپاس کے بے طرح جذبات سے میرا سینا اس طرح لبریز ہو رہا تھا کہ لگتا تھا کہ وہ شق ہو جائے گا۔

تکیے کا قیام

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ دو پہر کا کھانا وہ مہمانوں اور اپنے

خدام واعترہ کے ساتھ، اپنے مہمان خانے میں ظہر کی نماز کے بعد تناول فرماتے تھے، چنانچہ دسترخوان بچھا اور حضرت کے ساتھ سارے حاضرین کھانے پر بیٹھ گئے، حضرت نے مجھے اپنے سامنے بٹھایا، کھانے کے دوران میرا اور حضرت الأستاذ کا احوال معلوم کرتے رہے۔ کھانے کے بعد قیلوے کے لیے گھر جانے سے قبل، مہمان خانے کی الماریوں میں سے ایک الماری سے مشہور اہل قلم و ادیب و مورخ ڈاکٹر احمد امین مصریؒ (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء - ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء) کی خود نوشت سوانح عمری ”حیاتِ نبی“ نکال کر مجھے دی اور فرمایا کہ آپ یہ کتاب پڑھیے، آپ کا جی بھی لگے گا اور بہت فائدہ ہوگا۔ دوسرے روز صبح ناشتے پر حضرت نے فرمایا: آپ نے یہ کتاب کتنی سمجھی؟ میں نے عرض کیا: ۶۵-۷۰ فی صد سمجھ میں آتی ہے اور ۳۰-۳۵ فی صد الفاظ و تعبیرات میرے لیے یکسر نامعلوم و نامانوس ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہے؛ کیوں کہ آپ جس نصابِ تعلیم کے فارغ ہیں، عموماً وہاں آج کی عربی نثر و نظم کا چلن نہیں ہے؛ اس لیے آپ کا اتنا سمجھ لینا، آپ کی ذاتی محنت اور عربی سے تعلق کی دلیل ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ آپ دہلی میں اس وقت کیا کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: بس یوں ہی آزاد مطالعہ کرنے کے لیے، ٹھکانے کے طور پر فراراش خانہ دہلی ۶ کے ”کثرہ بچی“ کی ایک مسجد میں امام کے طور پر ذمے داری لے رکھی ہے۔ حضرت نے فرمایا: آپ چاہیں تو میرے ساتھ رہیے۔ میں رائے بریلی رہوں تو یہیں رہیے، لکھنؤ جاؤں تو وہاں ساتھ رہیے اور اگر اندرون ملک یا بیرون ملک میرا طویل سفر ہو، تو آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہیے، وہاں کتب خانے سے فائدہ اٹھائیے، میں وہاں آپ کے قیام و طعام کا نظم کردوں گا۔ آپ کا خط بہت پاکیزہ ہے، میں بھی آپ سے فائدہ اٹھاؤں گا، بالخصوص عربی تحریر کے حوالے سے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو صرف تین دنوں کے لیے بہ حیثیت مہمان آیا تھا؛ کیوں کہ حضرت الأستاذ کا حکم تھا کہ صرف تین دن رہنا، اس سے زیادہ قیام کی شکل میں آدمی مہمان نہیں رہتا؛ بل کہ میزبان کا کھانا صدقے کا کھانا ہو جاتا

ہے؛ چنانچہ میں نے کل کا ٹکٹ لے رکھا ہے، آج حضرت کے ہاں قیام کا دوسرا دن ہے، اب آپ کا حکم ہو، تو میں لکھنؤ جا کر خود یا کسی کو بھیج کر ٹکٹ از لکھنؤ تا دہلی واپس کروادوں اور حضرت الأستاذ کو رجسٹری جوابی خط لکھ کے اُن کا عندیہ معلوم کر لوں؟ حضرت نے فرمایا: ہاں آپ حضرت مولانا سے اُن کی رائے معلوم کر لیں، اُن کی اجازت کے بغیر آپ کا اپنے تئیں کوئی فیصلہ ناروا ہوگا۔ ٹکٹ واپس کرنے کے لیے آپ خود نہ جاییے، ہمارے ہاں سے کوئی نہ کوئی ابھی تھوڑی دیر میں یا شام کو لکھنؤ ضرور جائے گا، میں اُس کے ذریعے مولوی طاہر (۱) کو آپ کا ٹکٹ بھجوادوں گا، وہ واپس کر دیں گے۔

تیکے پر قیام کے لیے حضرت کی منظوری

ہفتہ عشرہ میں حضرت الأستاذ کا جواب آیا کہ آپ حضرت مولانا علی میاں کی فرمائش کی ضرورت قیام کریں، یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ انھوں نے از خود اپنے پاس رکنے کا مشورہ دیا، وہاں کے قیام سے آپ کی علمی صلاحیت پختہ ہوگی۔ البتہ روزمرہ کے مصارف کے لیے آپ کو پریشانی ہو سکتی ہے، ان شاء اللہ میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) مولانا طاہر حسینی مظاہری بن سید محمد یوسف حسینی منصور پوری مظفرنگری ثم لکھنوی، اصلاً منصور پور ضلع مظفرنگر کے باسی تھے؛ لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب کی برادرزادی، یعنی مولانا ڈاکٹر عبدالحی حسینی (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) کی صاحبزادی کے اُن کی زوجیت میں آجانے کے بعد، وہ لکھنؤ کے باسی ہو گئے، پھر ندوۃ العلماء کے دفتر نظامت کے ذمے دار اعلیٰ کی حیثیت سے تاحین حیات و صحت ذمے داری ادا کی۔ کبار علمائے صالحین کے صحبت و تربیت یافتہ تھے، بڑے نیک، عبادت گزار اور شب بیدار تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء-۱۳۰۲ھ/۱۹۸۲ء) کے نہ صرف دستِ گرفتہ؛ بل کہ اُن کے خلیفہ مجاز تھے۔ مشہور عالم دین و داعی الی اللہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی انھیں کے فرزند اکبر ہیں۔ تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں بہ روز سوار، بہ وقت فجر ۸ شوال ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۲۰۰۲ء کو ”خانوں منزل“، گولانچ لکھنؤ میں وفات پائی اور حضرت مولانا علی میاں کے وطن ”تکیہ کلاں“ رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی۔

چنانچہ میں حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں رہ گیا۔ اکثر تو تکیہ ہی پر قیام رہا اور بیچ بیچ میں کچھ دنوں کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں۔ اُن دنوں حضرت مولانا، عربی خطوط یا عربی مضامین اور کتابیں، عموماً مجھے ہی اِملاکراتے تھے اور عربی تحریر سے مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ دگر کئی طرح کے علمی کاموں میں حضرت مجھ سے خدمت لیتے رہے۔ مجھے اِس قیام سے جو بے پناہ فائدہ ہوا، اُس کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں تکیہ کلاں اور لکھنؤ قیام کے دوران، نہ صرف اپنے مکتوبات کے ذریعے میری راہ نمائی کی، ڈھارس بندھائی اور ہم دردی و غم گساری کی؛ بل کہ دو تین دفعہ مادی مدد بھی کی، جس کی وہاں کے قیام کے دوران سخت ضرورت تھی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وطن ”تکیہ کلاں“ میں خور و نوش اُن کے ساتھ ہوتا تھا اور لکھنؤ میں قیام کے دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مطبخ سے انھیں کے حکم سے ناشتہ دان میں صبح و شام کا کھانا آجاتا تھا؛ لیکن دگر ضرورتوں کے لیے مجھے نقد رقم کی سخت ضرورت رہتی تھی، سچ یہ ہے کہ میں نے یہ دن بڑی کس پرسی کے عالم میں گزارے، حضرت الاستاذؒ کی دو تین دفعہ کی امداد بھی کئی ماہ کے قیام کے دوران ناکافی ہوتی تھی؛ لیکن اللہ انھیں اپنی جنت میں بہترین بدلہ دے کہ انھوں نے میری دیکھ ریکھ اور خبر گیری میں اپنی حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لکھنؤ آمد کے دو تین روز بعد ہی میں نے حضرت کو جو خط لکھا، اُس کے جواب میں آپ نے ۱۵ روپے کا منی آرڈر ارسال فرمایا اور اُس کے کوپن پر تحریر فرمایا کہ:

عزیز محترم! زادت مزایا کم وفزتُم بمقاصد کم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لغافہ پہنچا، حالات معلوم ہوئے، اللہ تعالیٰ آپ کو اعلیٰ مقاصد میں کام یابی بخشے۔ مبلغ پندرہ روپیے، ضروریات کے لیے ارسال ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ کے قیام لکھنؤ تک ماہانہ پیش کرتا رہوں۔ دعا فرمائیے۔ حضرت

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

مولانا (علی میاں) کا خط ساجد سلمہ کو لے گیا تھا، سفیر صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی، اُن کے سکرٹری نے ایک انگریزی مضمون کا عربی ترجمہ کرایا، تقرر کی اطلاع وہ بذریعہ ڈاک دیں گے، پتہ لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کام یابی بخشے۔ دعا کیجیے (۱)۔ حضرت مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پیش کر دیں۔

محمد میاں

۱۵ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ = ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء

مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت الاستاذؒ نے، صاحب زادہ گرامی کے سعودی سفارت خانے میں ملازمت کے لیے ٹیسٹ دینے اور انھیں انتخاب میں ترجیح دینے کے لیے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سفارتی مکتوب کے موصول ہو جانے کی طرف جو اشارہ فرمایا ہے، تو دوسرے مکتوب میں، جس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے، اُن کا وہاں تقرر کر لیے جانے اور اُن کے وہاں سرگرم کار ہو جانے کی ان الفاظ میں خوش خبری دی اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا اپنی طرف سے شکریہ ادا کرنے کا، اس ناچیز کو مکلف فرمایا:

عزیز محترم! زادت معالیکم

سلام مسنون۔ عرصے سے خط نہیں آیا، خیرت نہیں معلوم ہوئی۔
حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زاد مجدہم کا گرامی نامہ ہتھورا، باندہ

(۱) سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں ملازمت کے لیے، حضرت الاستاذؒ کے صاحب زادے: محترم مولانا ساجد میاں صاحب در خواست دینی چاہتے تھے، حضرت الاستاذؒ نے یہ سوچ کر کہ صلاحیت کے باوجود بعض دفعہ کسی اہم شخصیت کی سفارش سے نسبتاً کم صلاحیت کے آدمی کو لے لیا جاتا ہے۔ مولانا سید ساجد میاں کا جس جگہ تقرر ہونا تھا اُس کے لیے کئی امیدوار تھے اور گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے حضرات اُن کے سفارشی تھے؛ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اس ناچیز کی وساطت سے سفارشی تحریر یعنی مناسب سمجھا۔ اس خط میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ الحمد للہ کہ اُن کا اُس جگہ پر تقرر کر لیا گیا۔ وہ اس تحریر کے بہ روز شنبہ: ۷/ رمضان ۱۴۳۰ھ = ۲۹/ اگست ۲۰۰۹ء، لکھے جانے کے وقت تھی، سعودی سفارت خانے میں برسرِ عمل ہیں۔ اس وقت وہ وہاں کے اہم اہل کاروں اور دیریہ ذمہ داروں میں سے ایک ہیں۔

سے آیا تھا، وہ واپس تشریف لے آئے ہوں گے، تو اُن کی خدمت میں سلام عرض کر دیجیے۔ ساجد سلمہ کا تقرر فرمالیا گیا ہے، الحمد للہ۔ وہ بھی بھرپور کام کر رہا ہے، اگرچہ دن بھر کھانے سے محروم رہتا ہے، صبح ۸ بجے جاتا ہے، کھانا لے جانا خلاف شان ہے؛ مگر الحمد للہ وہ مطمئن ہے اور کام سے بھی بفضلہ تعالیٰ مطمئن ہے۔ پہلے جو صاحب تھے، اُن کا مشاہرہ ۵۰۰ روپے تھا اور اس کا مشاہرہ ۷۰۰ روپے تھا۔ سورپے تحریر فرمایا ہے اور وہ ماہِ محرم کا ۱۲ دن کام کرنے کا ادا بھی کر دیا ہے۔ حضرت مولانا کا مزید شکریہ اور درخواست دعا۔ ”مشکاۃ الآثار“ (۱) حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچ چکی ہے؟ اُس کا تذکرہ فرمادیجیے۔

والسلام

نیاز مند محتاج دعا

محمد میاں

حضرت کا مکتوب کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اس سال راقم کا داخلہ نہیں ہو سکا

اپریل ۱۹۷۲ء کے اواخر میں حضرت الاستاذ کا خط ملا، جس سے معلوم ہوا کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے میری درخواست کے حوالے سے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس سال داخلہ نہ ہو سکے گا، جگہ پُر ہو چکی ہے؛ لیکن آئندہ سال ضرور لے لیا جائے گا؛ لیکن میں اپنی شدید بے مائیگی کی وجہ سے، آئندہ سال کے لیے انتظار نہیں کر سکتا تھا؛ کیوں کہ میرے گھر پر کوئی میرا سہارا نہ تھا، صرف والدہ محترمہ — اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے — تھیں؛ اس لیے وہاں داخلہ نہ ہونے کی صورت میں، اب ضروری تھا کہ میں تدریس وغیرہ کی خدمت کے ذریعے، روزی روٹی کی کوئی سبیل پیدا کروں۔ میرے

(۱) یہ حضرت الاستاذ کی حدیث کے موضوع پر کتاب ہے، جس میں آپ نے منتخب حدیثیں جمع فرمادی ہیں، جن کی روزمرہ کی ضروریات میں مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے، بہت سے مدرسوں بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں داخل نصاب ہے۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

ایسے بے بس و بے کس انسان کے لیے زندگی کے اس مرحلے میں محض صلاحیت کی پختہ کاری ایک بے سود عمل تھا۔ میں نے سمجھتے ہوئے یہ سارا احوال تفصیل سے، حضرت الاستاذؒ کو لکھا اور گزارش کی کہ حضرت میرے لیے بہ نجلتِ ممکنہ کوئی راہ پیدا فرمادیں۔ حضرت نے اُس کے جواب میں یہ والا نامہ تحریر فرمایا:

عزیز محترم مولانا نور عالم صاحب مظفر پوری زادت معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج عزیز؟

نامہ عزیز مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ = ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء، کا صفحہ حالات ہوا۔ آپ کی پریشانیوں کا علم ہو کر سخت افسوس اور قلق ہوا۔ آپ کو بالواسطہ والدہ محترمہ کے حالات کا علم ہوا۔ کیا آپ نے والدہ محترمہ کو موجودہ پتے کی خبر نہیں دی۔ آپ نے تحقیقِ حال کے لیے، مکان خط لکھا ہوگا۔ خدا کرے خیرت کی اطلاع آگئی ہو اور آپ مطمئن ہوں۔

کسی مشغلے کا نہ ہونا واقعی بہت تکلیف دہ اور باعثِ پریشانی ہے، اس سے انسان کی صلاحیتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی بہتر مشغلہ عنایت فرمادے۔ جہاں تک دہلی یا دیوبند کا تعلق ہے، اگر کوئی صورت نکل سکتی، تو آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی، احقر خود کوشش کرتا؛ مگر ان دونوں جگہ تو فی الحال کوئی صورت ہے، نہ مستقبل قریب میں کوئی توقع ہے۔

کلکتے کے ایک صاحب ہیں شیخ غلام رسول، بہت دولت مند آدمی ہیں، تبلیغی جماعت کے اہم ترین کارکن؛ بل کہ بنیادی رکن، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ مولانا علی میاں کا تعلق بھی بہت مؤثر ہے۔ اُن کا کلکتے میں ایک مدرسہ ہے، معلوم ہوا ہے کہ اُس مدرسے میں ایک استاد کی ضرورت ہے، احقر نے اُن کو آپ کے متعلق لکھا ہے، عربی کے

پس مرگ زندہ

سلسلے میں آپ کی خصوصیات بھی تحریر کر دی ہیں۔ احقر نے اُن کو لکھا ہے کہ اگر بالفرض کوئی جگہ نہ بھی ہو تب بھی مولوی نور عالم صاحب کے لیے، جو عربیت سے خاص شغف رکھتے ہیں اور عربیت میں اُن کو خاصی دسترس ہے، کوئی جگہ پیدا کریں۔ خدا کرے احقر کی تحریر کام یاب ہو اور آپ کے لیے کوئی مشغلہ نکل آئے۔ جواب آنے پر آپ کو مطلع کروں گا؛ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اب آپ کہاں ہیں؟ لکھنؤ ہیں یا مکان چلے گئے ہیں؟ احقر کے خیال میں آپ کو مکان چلا جانا چاہیے اور وہاں سے بذریعہ مراسلت کسی جگہ کام یابی کی کوشش کرتے رہتے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب بھی اُن کو خط تحریر فرمادیں، تو امید ہے کہ وہ احقر کے خط سے زیادہ مؤثر ہوگا۔ مناسب سمجھیں تو احقر کا یہ عریضہ مولانا کو سنادیں۔

باقی حالات بہ دستور ہیں، دعاؤں کا محتاج ہوں۔ ساجد (۱) اور اُن کے بہن بھائی وغیرہ سب خدا کے فضل سے خیرت سے ہیں۔ والسلام

نیاز مند محتاج دعا

محمد میاں

۱۵/۱۱/۱۳۹۲ھ

حضرت مولانا علی میاں کو،

حضرت الاستاذ کے خط کے مضمون سے آگاہی

حضرت الاستاذ کے مشورے کے مطابق، ناچیز نے مذکورہ بالا مکتوب گرامی کے مضمون سے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو آگاہ کیا اور اپنے طور پر بھی گزارش کی کہ

(۱) مولانا سید ساجد میاں صاحب (جن کا پہلے بھی تذکرہ آچکا ہے) حضرت الاستاذ کے صاحب زادے ہیں، جو مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی کے فاضل اور عربی میں دہلی یونیورسٹی سے ایم اے ہیں، سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔

حضرت! یہ ناچیز یہاں حضرت کی خدمت میں کئی ماہ سے مقیم ہے، اطمینان کی صورت ہوتی تو وہ جتنا حضرت کی خدمت میں رہتا، اُس کے لیے دینی و علمی ہر اعتبار سے بہت مفید تھا؛ لیکن اُس کی بے مائیگی اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے، کسی جگہ تدریسی یا غیر تدریسی مشغلے میں لگ جائے۔ حضرت نے سنتے ہی فرمایا: مولوی نور صاحب (۱) میں نے تو اپنے رفقاءے کار سے مشورے سے طے کر لیا ہے کہ مئی کی چھٹی (۲) کے بعد آپ کو ان شاء اللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت کے لیے رکھ لیں گے، آپ کہیں اور جگہ کے لیے تگ و دو چھوڑ دیجیے۔ میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کو بھی، اُن کی رائے جاننے کے لیے، آج کل میں عریضہ لکھنے والا ہوں۔ توقع ہے کہ وہ آپ کی یہاں تدریس کے لیے رضامند ہو جائیں گے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے یہ فرمانے کے بعد میں یک سو ہو گیا اور اُس دن حضرت کو لکھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت کی انجام دہی کے لیے تقرر فرمانے کی بات کہہ رہے تھے، شاید آپ کو بھی حضرت نے بہ راہ راست لکھا ہوگا، جیسا کہ وہ فرما رہے تھے؛ لیکن حضرت کے مشورے اور رضامندی کے بغیر ظاہر ہے کہ یہ ناچیز کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا؛ اس لیے حضرت بہ عجلت تمام، اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔ حضرت کا ۸-۹ روز کے اندر ہی جواب آ گیا کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا علی میاں نے، آپ کو اپنے دارالعلوم کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔ آپ بے چون و چرا یہ پیش کش قبول فرمائیں، ان شاء اللہ آپ کے لیے ہر طرح باعثِ خیر و برکت ہوگا اور عربی زبان سے آپ کو جو شغف ہے، اُس کا دارالعلوم ندوۃ العلماء بہترین میدان ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہ، گرامی نامہ بھی، اس

(۱) حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اس ناچیز کو ہمیشہ ”مولوی نور صاحب“ کے لفظ سے ہی مخاطب کرتے تھے، البتہ تحریراً

خط و کتابت میں ”عزیز گرامی مولوی نور عالم صاحب“ سے خطاب کرتے تھے یا ان سے ملتے جلتے الفاظ سے۔

(۲) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عصری تعلیم گاہوں کی طرح، مئی کے مہینے میں گری کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔

مضمون کا موصول ہوا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ آپ پر بہت اعتماد کرتے ہیں، یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

ندوة العلماء میں تدریسی خدمت اور حضرت کو اس کی اطلاع

تقرّر کے بعد جب میں نے اوّل جون ۱۹۷۲ء (آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) سے تدریسی کام شروع کر دیا، تو حضرت کو اس کی اطلاع دینے، نیز یافت کی مقدار بتانے کے لیے، عریضہ ارسال کیا تو حضرت کا اُس کے جواب میں عاجلانہ شفقت نامہ موصول ہوا، جس میں حضرت نے اظہارِ مسرّت کے ساتھ دعا اور نصیحتوں سے نوازا تھا:

عزیز گرامی قدر! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج گرامی؟

نامہ عزیز باعثِ صدمسرت ہوا۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، عارض کو مستقل اور زہید کو کثیر بھی بنادے گا۔ محنت شرط ہے اور ایسی لگن گویا آپ کو ہمیشہ ہمیں رہنا اور ہمیں کام کرنا ہے۔ مطالعہ پوری توجہ سے کیجیے، طلبہ کو مانوس رکھیے، ہر ایک کا احترام کیجیے، کسی کی بُرائی نہ کیجیے، مطالعہ وسیع کیجیے، ہر مضمون کو خود حل کیجیے، البتہ ضرورت کے وقت ارشادِ ربّانی فَاَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ کی تعمیل کیجیے، کما قالوا: ”شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ“۔

والدہ محترمہ کی دعائیں حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، اس کے بغیر برکت میسر نہیں آسکتی۔

والسلام

محتاج دعا، محمد میاں

۸ جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ

۲۰ جون ۱۹۷۲ء

ایک دو ماہ تدریسی خدمت میں گزارنے کے بعد، اپنی کارکردگی کی تفصیل

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

حضرت الأستاذ کو لکھی، تو حضرت نے مندرجہ ذیل عنایت نامہ تحریر فرمایا اور اداروں اور اجتماعی کام کی جگہوں میں، برسرِ عمل رہنے کے دوران، جس اصول پر مضبوطی سے کاربند رہنا چاہیے، اُس کی طرف راہ نمائی فرمائی:

۹ شعبان ۱۳۹۲ھ = ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء

عزیز محترم! زادت مزایا کم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف؟

طویل انتظار کے بعد، نامہ عزیز کاشفِ حالات اور موجب تسکین و طمانینتِ قلب ہوا۔ میری مسرت یہ ہے کہ آپ تدریسی مشاغل میں منہمک ہیں، طلبہ اور حضراتِ اربابِ ادارہ آپ سے مطمئن ہیں۔ یہ سب بڑی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کامیابی سے بہرہ اندوز فرمائے۔

حضرت الأستاذ شیخ الادب (مولانا محمد اعجاز علیؒ) نے احقر کو ہدایت فرمائی تھی کہ مدرس کا فرض درسی مشاغل میں انہماک ہے، اُس کو ادارے کی سیاسیات میں دخل دینا چاہیے نہ اندرونی معاملات میں۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کامیابی بھی یہی ہے۔ ان سے منقول ہے کہ ہمارے لیے (اور تمام مسلمانوں کے لیے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ تھی ”لَا تُنَازِعِ الْأَمْرَ أَهْلَهُ“ امید ہے کہ آپ بھی یہی مسلک اختیار کریں گے۔

والسلام

نیاز مند و محتاج دعا

محمد میاں

۲۶ رزی الحجۃ ۱۳۹۲ھ کے عریضے میں ناچیز نے یہ لکھا تھا کہ بعض دفعہ یہ حقیر چاہنے کے باوجود حضرت کو خط نہیں لکھتا کہ اُس کے جواب کی زحمت میں مبتلا نہ کروں؛ کیوں کہ پیرانہ سالی، بیماری اور کثرتِ مشاغل کی وجہ سے، حضرت ویسے ہی بوجھل

پس مرگ زندہ

رہتے ہیں؛ اس لیے جب بھی کوئی عریضہ تحریر کرتا ہوں، تو ڈرتے ڈرتے ہی کرتا ہوں۔ اُس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

عزیز محترم! زادت مزایا کم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج عزیز؟

احقر کو خطوط موصولہ کے جوابات سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ از خود کسی کو خط لکھ سکوں؛ مگر آپ کے خط کا انتظار اور خیریت کا اشتیاق مسلسل رہتا ہے۔ الحمد للہ مکتوب سامی مورخہ ۲۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ سے اشتیاق نے انبساط و ابہتاج حاصل کیا۔ جزاکم اللہ

عید الاضحیٰ کے بعد سے، طبیعت خراب چل رہی ہے، ۴ فروری ۱۹۷۳ء کو خونی بواسیر کے شدید دورے نے صاحب فراش بنادیا۔ الحمد للہ اب دورہ نہیں رہا؛ لیکن صحت کی رفتار شافی الامراض صحیح رکھے، تو کم از کم ایک مہینے کے بعد، مدر سے جانے کی بحث ہو سکے گی۔ دعا کی ضرورت ہے۔ احباب اور اکابر سلام قبول فرمائیں۔ الحمد للہ سب خیریت سے ہیں۔ مشفق محترم مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

نیازمند محتاج دعا

محمد میاں

یوم شنبہ: ۶ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

حضرت الاستاذ کا ایک خط

جو راقم کے لیے وثیقہ سعادت ہے

۲۲ شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء کے مکتوب گرامی میں، حضرت الاستاذ نے ناچیز کے حوالے سے، حضرت مولانا علی میاں صاحب کے خط کا ایک اقتباس نقل فرمایا،

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ نے ہمیشہ کی طرح، اپنے کسی مکتوب میں حضرت مولاناؒ کی مزید توجہ میری طرف مبذول کرائی ہوگی۔ حضرت الاستاذ کا یہ خط اور حضرت مولاناؒ کے خط کا مضمون، جو حضرت الاستاذؒ نے اپنے گرامی نامے میں درج فرمایا ہے، اس ناچیز کے لیے سعادت و برکت کا بہترین وثیقہ ہیں:

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

حضرت مولانا کا مکتوب گرامی صادر ہو گیا ہے، تحریر فرمایا ہے:

(عزیزی مولوی نور عالم صاحب سے مجھے خود تعلق خاطر ہے۔ آپ نے اُن کو یہاں بھیج کر ہم کو ایک اچھا تحفہ دیا ہے۔ میں ان شاء اللہ اُن کے معاملے پر جلد توجہ کروں گا اور جو کچھ اُن کی مدد ہو سکے گی، اُس سے ان شاء اللہ دریغ نہ ہوگا۔ اُن کو کسی موقع سے باہر بھیجنے کا بھی انتظام ہو جائے گا؛ تاکہ وہ زیادہ مفید بن سکیں۔ رمضان وہ اپنے وطن کرنا چاہتے ہیں، شادی کا بھی ارادہ ہے، اس سلسلے میں جو خدمت کی جاسکے گی، کی جائے گی۔)

حضرت مولانا کی اس تحریر کے بعد احقر کا کام تو یہ رہ جاتا ہے کہ دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے اعتماد کو زیادہ کرے اور آپ کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ زیادہ سے زیادہ مفید اور قابل اعتماد ہوں۔

مولانا کو جواب، اس لیے نہیں لکھا کہ انھوں نے ایک رسالہ بھیجا ہے: ”إِسْمَاعِيلِي يَا إِيزَائِي!“ اس کے مطالعے کے بعد جواب لکھوں گا، ان شاء اللہ۔ دوسری بات: احقر کی صحت روبہ تنزل ہے، چند تالیفی کام ادھورے باقی ہیں، دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ اُن کی تکمیل کی توفیق بخشے۔

والسلام

نیاز مند، محمد میاں

۲۲ شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۶ ستمبر ۱۹۷۳ء

حضرت الاستاذ کی میرے لیے مسلسل دل سوزی

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ناچیز کی شادی کی طرف جو اشارہ فرمایا ہے، وہ اُس وقت بہ وجوہ ٹلی، تو کئی سال کے لیے مؤخر ہو گئی اور بالآخر وہ شنبہ - یک شنبہ: ۱۵-۱۶ شوال ۱۳۹۹ھ مطابق ۸-۹ ستمبر ۱۹۷۹ء کی شب میں انجام پذیر ہو سکی۔ پیرانہ سالی، جسمانی کم زوری اور امراض و مشاغل کی کثرت کے باوجود، کبھی ایسا نہ ہوا کہ حضرت الاستاذؒ نے میرے کسی عریضے کا جواب نہ دیا ہو۔ اُن کے ہر مکتوب سے، اُن کی میرے لیے دل سوزی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا۔ مجھے بے حد قلق ہے کہ اُن کے چند خطوط ہی محفوظ رہ سکے۔ اللہ پاک اُن کی شفقتوں کا بہترین بدلہ انھیں عطا کرے اور جنت الفردوس میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کا جوار نصیب کرے۔

ایک بار میں شدید طور پر کافی دنوں تک بیمار رہا، میں نے حضرت کو اپنا احوال لکھا اور دعا کی درخواست کی، تو حضرت نے نصیحتوں اور ہم دردیوں بھرا ذیل کا مکتوب ارسال فرمایا:

۲۱ صفر ۱۳۹۹ھ = ۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج عزیز؟

ایک عرصے کے بعد، دستی مکتوب موصول ہوا، حالات کا علم ہوا۔ آپ کی علالت سے تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ علاج کی طرف پوری توجہ کیجیے۔ بہ ظاہر نزلے کا اثر ہے اور تنقیہ کی ضرورت ہے، طبیعت کا علاج ہی ان شاء اللہ مفید ہوگا۔ غذا میں احتیاط کی ضرورت ہے، بڑا گوشت تو استعمال نہ ہونا چاہیے اور گوشت کے بہ جاے سبزی ترکاری کا استعمال زیادہ مفید ہوگا اور بیماری کی اصل علت احقر کے خیال میں یہ ہے کہ آپ ورزش

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

نہیں کرتے، اس عمر میں ورزش ضروری ہے اور بہترین ورزش یہ ہے کہ نماز صبح سے پہلے یا فوراً بعد کم از کم دو میل کا گشت کریں اور کچھ دوڑ دوڑا کریں۔ یہ آپ کے لیے بہت آسان ہے، ندوہ شہر سے باہر ہے، کھلی ہوا میں آپ صبح کی گشت کر لیں، تو چند روز ہی میں آپ صحت میں نمایاں فرق دیکھیں گے۔ احقر اب چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے؛ ورنہ آپ کی عمر میں جب تھا تو ڈنڈ لگایا کرتا تھا، پھر دہلی آ کر اس ورزش کا موقع نہیں ملا؛ مگر صبح کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گشت کا معمول رہا۔

دین و ملت کی خدمت اگر اہمیت رکھتی ہے، تو تحفظ صحت بھی اتنی ہی اہم ہے؛ کیوں کہ خدمت کے لیے صحت شرط ہے اور فرض کا مقدمہ بھی فرض ہوتا ہے۔

والسلام

نیاز مند و محتاج دعا

محمد میاں

حضرت کی احقر کو حسنِ خط کی داد

ایک خط میں حضرت الاستاذؒ نے، اس ناچیز کو حسنِ خط کی بہت داد دی، خط کا آغاز ہی تحسینِ آفریں الفاظ سے فرمایا:
عزیز محترم! زادت معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مزاج گرامی؟

نامہ عزیز سے محفوظ و مسرور ہوا۔ باطن کی طرح آپ کے خط کا ظاہر بھی دل کش ہوتا ہے، یعنی قلم نفیس اور دیدہ زیب، تحریر میں روانی بھی بہت

والسلام

دعا گو محتاج دعا

محمد میاں

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ = ۳ جولائی ۱۹۷۳ء

مذکورہ بالا خط بہت لمبا ہے اور ”انٹر دیٹی پٹر کارڈ“ (Inland letter card) کے تینوں صفحات پر حضرت کی باریک تحریر میں لکھا ہوا ہے، طوالت کی وجہ سے میں یہاں پورا خط نقل نہیں کر سکا۔ حضرتؒ نے اس خط میں سابقہ دیگر کئی خطوں کی طرح تنخواہ کی قلت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے میری بہت سی گھریلو ذمے داریوں کے پیش نظر کئی طرح کے مشورے دیے تھے۔ ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ آپ چاہیں تو لکھنؤ سے آجائیں ”میوات“ کے ”نوح“ کے مدرسے میں جو مولانا نور محمد صاحب (شاگرد و خلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی) کی سرپرستی میں چلتا ہے، صدر مدرس کی جگہ خالی ہے اور ہاں کے ذمے دار حضرات اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے، مجھ سے مسلسل رابطے میں ہیں۔ دوسرا مشورہ یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے چند فضلا ایک مدرسے میں کام کر رہے ہیں، انھوں نے وہاں اچھا تعلیمی معیار قائم کیا ہے، وہ آپ جیسے عربی داں کی تلاش میں ہیں، تنخواہ حسب طلب دیں گے؛ لیکن یہ ناچیز بہ وجوہ حضرت کے ان مشوروں پر اُس وقت عمل نہ کر سکا اور یافت کی قلت اور ضروریات کی کثرت کے باوجود، لکھنؤ میں تدریس کو ترجیح دی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی صحبت تمام پریشانیوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔

راقم کے درد کو اپنا درد بنا لینے کی حضرت کی سعی

حضرت الاستاذؒ نے جس طرح میرے درد کو اپنا درد بنا لیا تھا، اُس کی مثال اس

زمانے میں مولانا رومؒ (۶۰۳ھ/ ۱۲۰۷ء-۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی ملے گی۔ یوں تو ہر اُس آدمی کا یہ ناچیز بے پناہ احسان مانتا ہے اور روزانہ اُس کے لیے دعائیں کرتا ہے، جس نے ایک لفظ کا بھی اُس کو فائدہ پہنچایا؛ لیکن چند اساتذہ جنھوں نے مجھے ذرے سے آفتاب بنانا چاہا اور میری راہ کے سارے کانٹوں کو اپنے ہاتھوں سے چننے کی کوشش کی؛ اُن میں حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں سرفہرست ہیں۔ اکثر دفعہ آدمی کسی تحسن کے احسان کی ہمہ گیری، اُس کی افادیت کی بے شمار سمتوں اور اُس کے دُور رس اثرات کا بروقت احساس نہیں کر پاتا، بالخصوص نو عمری اور نا تجربہ کاری کی حالت میں، جب تحسن کے احسان کے اٹھاپن کا اُسے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا۔ حضرت الاستاذؒ کے احسانات کے حوالے سے، اُس وقت جب یہ میرے اوپر ہو رہے تھے، اس کم عمر، کم عقل اور نا تجربہ کار کا یہی رویہ رہا۔ آج جب اُن احسانات کی وسعتوں اور گہرائیوں پر غور کرتا ہوں تو بے حد شرمندگی اور افسوس ہوتا ہے کہ اگر حضرت کی حیات میں، اُن کے احسانات کی قدر ہوتی، تو میں اُن کی تمناؤں پر پورا اُترنے کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتا، اس طرح اُن کا دل خوش ہوتا اور وہ مزید دعائیں دیتے۔

لکھنؤ سے دہلی کا ایک سفر اور حضرت کی زیارت سے شرف یابی

اواخرِ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ = اواسطِ فروری ۱۹۷۲ء میں، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں آمد اور تکیہ اور لکھنؤ میں کئی مہینے قیام کے بعد، اوائلِ جون ۱۹۷۲ء (اواخرِ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ مقرر کیے جانے کے بعد، حضرت الاستاذؒ کی حیات میں صرف ایک بار: جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ/ مئی ۱۹۷۳ء میں دہلی کے سفر کا موقع ملا اور حضرت سے ملاقات اور کئی روزہ صحبت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے، چاہنے کے باوجود، دہلی کا سفر ہوا نہ حضرت کی

زیارت کی سعادت حاصل ہو سکی۔ یہ سفر اس لیے بھی یادگار تھا کہ حضرت نے ایک روز دوپہر میں اپنے گھر واقع اندورن ”احاطہ کالے صاحب“ گلی قاسم جان، اس ناچیز کی دعوت کی اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کچھ تو حضرت کا رعب جو ہمیشہ میرے اوپر طاری رہتا تھا اور کچھ یہ بات کہ زندگی میں پہلی بار میں نے دیکھا کہ روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹی ہوئی ڈھکی ہیں اور حضرت ایک ایک نکال کے دے رہے ہیں؛ اس لیے ایک آدھ چپاتی ہی لے سکا۔ ہمارے دیار بہار میں اُس وقت تک روٹیوں کو ڈھک کر دسترخوان پر رکھنے کا چلن نہیں ہوا تھا، اب آمدورفت کی کثرت اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے آپسی اختلاط کی وجہ سے، تہذیب و تمدن کا لین دین زیادہ ہو گیا ہے؛ اس لیے ہمارے ہاں کے لوگ بھی اس کلچر کو برتنے لگے ہیں۔ بہر کیف میں نے روٹیوں کے ڈھکی ہونے اور ایک ختم ہونے کے بعد دوسری نکال کے دیے جانے کی وجہ سے یہ سمجھا کہ شاید حضرت کے ہاں کسی وجہ سے روٹیاں کم پکی ہیں، اس لیے انھیں ڈھک دیا گیا ہے اور اُن میں سے ایک ایک نکال کے دی جا رہی ہے؛ اس لیے مجھے کم کھانا چاہیے، چنانچہ میں نے بہ مشکل ایک چپاتی لی اور ذرا سا چاول، حضرت نے جھڑکنے کے انداز میں فرمایا بھی کہ مولانا! آپ اور کھانا لیں؛ لیکن مزید لینے کے لیے میں کسی طرح بھی ہمت جٹا نہیں سکا۔ شام کو لال کنواں کے کوچہ پنڈت کی ایک مسجد کے، طالب علمی کے زمانے سے امام، اپنے ایک رفیقِ درس مولانا برہان احمد سہارنپوری سے، اُن کی مسجد میں ملاقات ہوئی، تو میں نے اُن سے کہا: بھئی! آج دوپہر میں حضرت الاسٹاڈ نے کھانے پر بلایا تھا، دسترخوان پر روٹیاں ڈھکی ہوئی تھیں، میں نے سمجھا کہ کسی وجہ سے کم پکی ہوں گی؛ اس لیے ڈھک دی گئی ہیں؛ تاکہ مہمان احتیاط سے کھائیں اور تھوڑی بہت چھوڑ دیں۔ مولانا برہان بہت تھلکھلا کے ہنسے اور کہا: بھئی! یہ تو ہمارے خطے: مغربی یوپی اور دہلی کا عام رواج ہے کہ روٹیوں کو خواتین پکانے کے دوران ہی ڈھک دیتی ہیں؛ تاکہ گرم رہیں؛ کیوں کہ ٹھنڈی روٹیاں کھائی نہیں جاتیں، بے مزہ سی لگتی ہیں؛ بل کہ عموماً عورتیں، اگر کوئی مجبوری یا

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

معذوری نہ ہو، دسترخوان پر لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد پکانا شروع کرتی ہیں؛ تاکہ گرم گرم روٹیاں تازہ تازہ دسترخوان پر پہنچتی رہیں۔

سیاسی و اقتصادی مسائل کے بعض ابواب کا عربی ترجمہ

اسی سفر میں، ناچیز نے حضرت الأستاذ کو اُن کی مشہور کتاب ”سیاسی و اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات و ارشادات“ کے ایک معتد بہ حصے کا عربی ترجمہ دکھایا، جو اُس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان ”البعث الاسلامی“ میں قسط وار شائع ہونے کے لیے دیا تھا، وہی شائع شدہ صفحات حضرت کی خدمت میں پیش کیے، جنہیں دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی اور دعائیں دیں، لیکن فرمایا کہ اس عربی ترجمے کو کتاب کی شکل میں چھاپنے کی کیا صورت ہوگی؟ میں تو اس کی قدرت نہیں رکھتا۔ ناچیز نے عرض کیا کہ ”البعث الاسلامی“ میں شائع کرنے کا مقصد اصلاً تو یہ ہے کہ اس طرح ترجمے کی میری صلاحیت پختہ ہوگی اور فی الجملہ علمائے عرب آپ جیسے علما سے واقف ہوں گے، اب اگر یہ ترجمہ کتاب کی شکل میں کسی طرح چھپ جاتا ہے، تو وہ ایک مستقل فائدے کی چیز ہوگی؛ لیکن اس کی کیا صورت ہوگی؟ یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی؟

اس کتاب کے بعض مباحث کا میں اُس وقت ترجمہ نہ کر سکا، تو اس وقت تک بھی نہ ہوسکا؛ ورنہ عربی کے کسی ناشر سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔

حضرت کی وفات پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی راقم سے تعزیت

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کے انعقاد کی تیاری شبابِ پرتھی، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے، حضرت سے نہ صرف اُس میں شرکت؛ بل کہ علمی و فکری مشارکت کی فرمائش کی تھی کہ اچانک ایک روز یہ اطلاع ملی کہ چہار شنبہ: ۶/ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کی شام کو ساڑھے ۶ بجے حضرت کا انتقال ہو گیا۔ اس

ناچیز کے لیے یہ خبر بڑی صاعقہ اثر ثابت ہوئی۔ کئی ماہ تک کسی کام میں جی نہ لگا، ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا ہے۔ ایک روز حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، اپنے نائب و شاگرد عزیز مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (متوفی ۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳/ اگست ۱۹۹۹ء) نائب ناظم ندوۃ العلماء کے ساتھ میرے کمرے میں، جو سلیمانیہ ہاسٹل کی بالائی منزل پر تھا، تشریف لائے، میں بہت اچنبھا ہوا کہ حضرت نے کیسے اتنی زحمت کی؟ بیٹھے نہیں کھڑے کھڑے فرمایا: عزیزم! یہاں حضرت مولانا سید محمد میاں کا تمھارے سوا کوئی قریب اور عزیز نہیں، تم اُن کے لیے قریب ترین عزیز سے عزیز تر تھے۔ انھیں تم سے جو تعلق تھا وہ بہت کم اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے ہوتا ہے، اس لیے اُن کی وفات پر ہم دونوں تم سے دلی تعزیت کرتے ہیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ کہہ کر دونوں حضرات واپس ہو گئے، میری گزارش کے باوجود نہیں رکے۔ اُن کے تشریف لے جانے کے بعد اور شدت کے ساتھ غم کا سایہ میرے اوپر دراز ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کئی موقعوں سے میرے سامنے، حضرت الاستاذ کی مدح سرائی کی اور فرمایا: حضرت مولانا سید محمد میاں، علم و عمل کے صحیح معنی میں جامع تھے، زہد و استغنا اور دنیا سے بے نیازی میں وہ ممتاز تھے۔ اپنے علم و قلم سے ملت کی بے لوث خدمت کی، وہ بڑے قد کے عالم تھے؛ لیکن خلوت نشینی اور شہرت و نمود سے دوری کی وجہ سے، کم لوگ اُن کے مقام و مرتبے سے واقف ہیں۔

اہم تالیفات

حضرت کے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں دہلوی مدظلہ کے مخطوطہ مضمون جو انھوں نے والد ماجد پر لکھا ہے، میں تحریر ہے کہ حضرت نے اپنے کسی مضمون میں خود تحریر فرمایا ہے کہ اُن کی تالیفات کی تعداد کم و بیش ستر ہے، جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی، بعض تحریریں وقت کی ضرورت کے تحت لکھی گئیں، جو بعد میں ناپید

ہو گئیں، بعض کتابیں اور نگارشات کسی مصلحت کے تحت دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں۔ اہم کتابوں کی ایک فہرست اور مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱- سیرت مبارکہ: سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ، چھ سو صفحات کی اس کتاب کے مضامین کا اصل ماخذ قرآن مجید کی آیات ہیں، جن کی مزید تشریح احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہؓ کے ذریعے کی گئی ہے، اس وجہ سے سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وہ شخصیت سامنے آئی ہے جو قرآن مجید نے پیش کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں رسول اکرمؐ کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرے کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تاریخی حقائق کے دلچسپ تذکرے کے ساتھ، مصنفؒ کی زبان کی ادبی چاشنی نے کتاب کو بار بار مطالعہ کرنے اور ساتھ رکھنے کے قابل بنادیا ہے۔

۲- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا عہد زریں اور مثالی حکومتیں: اس کتاب کا اصل ماخذ ”إزالة الخفا عن خلافة الخلفاء“ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہے، جس کا اردو ترجمہ مصنفؒ نے زمانہ اسارت میں شروع کیا تھا؛ لیکن بعد میں مضامین کے پھیلاؤ اور کثرت کی وجہ سے ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ دو جلدوں اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم واجب الاحترام کیوں ہیں، صحابہ کرامؓ کائنات کی آنکھ کا تارا ہیں، یہ محض ایک عقیدت ہے یا حقیقت؟ کلامِ الہی نے اس جماعت کے کیا فضائل بتائے ہیں؟ خلافت راشدہ اور اُس کے مراتب، تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کی اہمیت اور قرآن وحدیث سے اُس اہمیت کے دلائل وشواہد، بلاشبہ یہ کتاب جس کا نام ”عہد زریں“ ہے مصنفؒ کی زندگی کے عہد زریں کی بہترین علمی صلاحیتوں کا نچوڑ اور شاہ کار ہے اور کتاب کا بنیادی مقصد حضرات صحابہؓ کی مقدس جماعت پر تنقید و تنقیص کے دروازے کو بند کرنا ہے، جو تحقیق کے نام پر کھول دیا گیا ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر نہ

صرف حقائق کو بیان کر کے، حضراتِ صحابہ کی مبارک شخصیات سے غبار کو صاف کرتا ہے؛ بل کہ قاری کے دل کو، اُن کی محبت و عقیدت سے سرشار کر دیتا ہے۔

۳- تاریخ الاسلام: غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ بچوں کے لیے سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مکی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم ﷺ کے اخلاق و عادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ زبان انتہائی سادہ اور انداز دلچسپ ہے۔

۴- ہمارے پیغمبر ﷺ: بچوں کے لیے لکھی گئی اس مختصر کتاب میں سیرت مبارکہ کو آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی داخلِ نصاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

۵- حضرت عثمان ذی النورین کے شواہدِ تقدس: علمی تحقیق و جستجو کے نام پر، جن صحابہ کرام کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، اُن میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا اسم مبارک سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں ناقدین کے حوالوں اور دعوؤں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور حضرت ذی النورین کی مقدس شخصیت کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی

۶- علمائے ہند کا شاندار ماضی: مصنف کی شہرہ آفاق اور بے نظیر کتاب ہے، جس کی اشاعت پر کتاب ضبط ہو گئی، پریس بند کر دیا گیا اور مصنف پر مقدمہ چلا، چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب کے پہلے حصے میں مجدد الف ثانیؒ کے دور پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کی زندگی میں مغل بادشاہ، اکبر، جہانگیر اور عالم گیر سریرِ آراء سلطنت ہوئے اور بادشاہ اکبر کے زمانے میں ”دین الہی“ کی شکل میں جو کفر و الحاد کا فتنہ اٹھا تھا

اُس کا سبب باب کیا اور اس جدوجہد میں قید و بند کی مصیبت برداشت کی، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جدوجہد و قربانیوں کے نتیجے میں، بادشاہ عالم گیرؒ کے زمانے تک، اس فتنہ کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ، اُن کے خلفا اور خلفا کے خلفا کی سوانح، اُن کے معاصرین کے حالات اور سیاسی کارنامے اور اُس زمانے کا سیاسی و حکومتی نظام، نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سیاسی نظریات، اُن کی تعلیم و تربیت کے مراکز، حضرت سید احمد شہیدؒ، اُن کے رفقاء کے مجاہدانہ کارنامے اور قربانیاں وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ: علمائے ”صادق پور“ اور اُن کے پُر اسرار مجاہدانہ کارنامے، سکھوں کی حکومت کا زوال وغیرہ، کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

چوتھا حصہ: جو برطانوی استعمار کے خلاف علمائے کرام کی جدوجہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، علما کی جدوجہد کی چار سو سالہ تاریخ کا سب سے خونیں دور سے متعلق معلومات کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ تمام واقعات انتہائی مستند اور قابل اعتبار حوالوں سے ماخوذ ہیں۔ مصنفؒ کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اپنے موضوع پر ایک ریفرنس (حوالہ) مانی جاتی ہے۔

۷۔ علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے: اس کتاب میں تحریک

آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت کے دوران، علما کا کردار اور جدوجہد اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی قربانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کے حالات اور اس دور میں جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا ذکر ہے۔

۸۔ ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں: بہ قول مصنف، یہ علمائے ہند کا

شان دار ماضی، کا تمہ ہے دوسرے الفاظ میں وہ شان دار ماضی کی داستان تھی اور یہ

داستانِ بربادی ہے۔

- ۹۔ پانی پیت اور بزرگانِ پانی پیت: حضرت شاہ قلندرؒ اور آپ کے معاصرین اور پانی پیت کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔
- ۱۰۔ دورِ حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات و ارشادات۔

- ۱۱۔ ہمارا وطن اور اُس کی شرعی حیثیت۔
- ۱۲۔ اسلام اور حفاظتِ جان۔
- ۱۳۔ مسلم سوشلسٹ۔
- ۱۴۔ صالح جمہوریت اور معتبر جمہوریت۔
- ۱۵۔ اقسامِ حکومت: (ترجمہ أنواع الدول)
- ۱۶۔ سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر: امامت امت کا دستور اساسی۔
- ۱۷۔ اسلام کیا اور اسلامی فکر کیا ہے؟
- ۱۸۔ دین و دنیا کا سنگم۔
- ۱۹۔ حیاتِ مسلم: مسلمان کی زندگی، مہد سے لحد تک۔
- ۲۰۔ اسلام کیوں؟
- ۲۱۔ قرآن حکیم اور تفسیرِ انسانیت۔
- ۲۲۔ انسان اور انسانیت، منزل بہ منزل۔
- ۲۳۔ مراد آباد جیل میں: درس قرآن کی سات مجلسیں۔ (شیخ الاسلامؒ کی تقاریر)
- ۲۴۔ آنے والے انقلاب کی تصویر۔
- ۲۵۔ خطرناک نعرے۔
- ۲۶۔ دررِ منشورہ (مولانا مودودیؒ کے افکار کے رد میں)
- ۲۷۔ حواشی بر ”تقریرِ دل پذیر“ از حضرت مولانا نانوتویؒ۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

- ۲۸- حواشی بر اختصار ”تقریر دل پذیر“ از حضرت نانوتویؒ۔
- ۲۹- مشکاة الآثار: احادیث مبارکہ کا ایک مختصر مجموعہ، جو درس نظامی میں مشکاة سے پہلے پڑھایا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں داخل ہے۔
- ۳۰- اسلامی تعلیمات کا مرقع: ایک چارٹ کی شکل میں ابتدائی تعلیمات درج کی گئی ہیں۔
- ۳۱- مسنون دعائیں: دعاؤں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جس کے شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے۔
- ۳۲- اربعین: چالیس احادیث کا مجموعہ مع ترجمہ و شرح۔
- ۳۳- مجموعہ خطبات ماثورہ و منقولہ: جمعہ وعیدین کے لیے، خطبات کا مجموعہ، جس کا ترجمہ، تقریر کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
- ۳۴- روزہ وزکاۃ۔
- ۳۵- اسلامی تقریرات بچوں کے لیے۔
- ۳۶- رویت ہلال رمضان وعید: رویت ہلال کے بارے میں، جمعیتہ علمائے ہند کا فتویٰ۔
- ۳۷- چاند تارے، زمین و آسمان: تسخیر کائنات کی کوششوں کے ساتھ، جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، اُن کے بارے میں شرعی رہنمائی۔
- ۳۸- حیاتِ آدم: دنیا کی پہلی آباد کاری۔

دینی تعلیم و تربیت

بہ طور معلم اور ماہر تعلیم، مولانا سید محمد میاںؒ کا ایک بڑا کارنامہ، وہ تعلیمی نصاب ہے، جو آپ نے مرتب فرمایا، جس میں نہ صرف طلباء کے لیے ٹیکسٹ بکس ہیں؛ بلکہ استادوں کی تربیت کے لیے بھی مواد موجود ہے۔

۳۹- دینی تعلیم کا رسالہ: ۱۲ حصوں میں، جمعیتہ علمائے ہند کے مکاتب میں

رائج ہے۔

۴۰- طریقہ تقریر: دو حصوں میں۔

۴۱- تعلیمی چارٹ اور تعلیمی کارڈ۔

۴۲- مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم۔ (۱)

حضرت کے پس ماندگان

حضرت مولانا سید محمد میاں کے ایک بھائی تھے: احمد میاں اور دو بہنیں تھیں: صغیرہ خاتون اور سعیدہ خاتون۔ مولانا کی پہلی اہلیہ سے صرف ایک صاحب زادے تھے: مولانا سید حامد میاں، تاریخ پیدائش: بہ روز جمعرات: ۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۵- تاریخ وفات: بہ روز جمعرات شام ۴ بجے ۱۳/ربیع ۱۴۰۸ھ۔ مولانا حامد میاں جلیل القدر عالم، عظیم المرتبہ شیخ و مربی اور بڑے مقبول، محبوب صاحب نسبت بزرگ تھے، وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے خلیفہ و مجاز تھے اور چاروں سلسلوں میں انھیں خرقہ خلافت عطا ہوا تھا۔ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان کے مشہور ثقافتی شہر لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں کی سکونت اختیار کی، وہاں انھوں نے ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں جامعہ مدنیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس نے بڑی ترقی کی اور پاکستان کے چند مدرسوں میں سے ایک شمار ہونے لگا۔ شروع میں اس مدرسے کا نام ”مدرسہ احیاء العلوم“ تھا۔

مولانا حامد میاں کی پہلی شادی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں مراد آباد میں ہوئی اور دوسری شادی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں لاہور پاکستان میں ہوئی۔ اُن کے ۵ لڑکے ہیں: حافظ مولانا سید رشید میاں، مولانا سید وحید میاں، مولانا سید محمود میاں، مولانا سید مسعود

(۱) کتاب کے تعارف و فہرست کے سلسلے میں، حضرت کے صاحب زادے، محترم مولانا سید ساجد میاں مدظلہ کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

میاں، حافظ سید مقصود میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی دوسری اہلیہ محترمہ سے تین صاحب زادے ہوئے: حافظ سید خالد میاںؒ، جنھوں نے حضرت کی تالیفات کی اشاعت کے لیے ”علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے“ کی نئی اشاعت کے ساتھ، ایک ادارہ ”کتبستان“ قائم کیا، اس ادارے کا مقصد حضرتؒ کی کتابوں کو بالخصوص اور دیگر علمائے مصنفین کی تصنیفات کو بالعموم جدید معیاری انداز میں شائع کرنا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ جرمنی چلے گئے، جہاں کمپیوٹر کی تربیت حاصل کی اور ایک لائق پروگرامر بنے، حضرتؒ کی حیات میں وہ کئی بار وطن دہلی آئے۔ آخری بار وہ رمضان المبارک گزارنے ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء میں دہلی آئے، دو ہی روز تراویح میں شریک ہوئے کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ۲۹ رمضان مطابق ۳۰ مارچ کی شب میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور تیس سال والد ماجد سے دور رہنے کے بعد موت کے بعد اُنھی کے قدموں میں مدفون ہوئے۔

دوسرے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں ہیں، جو مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی سے فارغ ہیں، اُس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۲ء سے سعودی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔ اپنی نیکی، دیانت داری اور مفوضہ کاموں کی صلاحیت کے ساتھ محنت و لگن کی وجہ سے سارے ذمے داروں اور رفقاء کے کار میں محبوب ہیں۔ اُن کے ۴ لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں: سید ارشد میاں، حافظ مولانا علی میاں، سید اطیب میاں، سید حسن میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے تیسرے صاحب زادے سید شاہد میاں ہیں، جو گریجویٹ ہیں اور کمپیوٹر کے ایک ماہر پروگرامر ہیں اور اسی لائن میں برسرِ ملازمت ہیں۔ اُن کے ۴ لڑکیاں ہیں۔

حضرت کے ۳ صاحب زادیاں ہوئیں: خالدہ خاتون، عائشہ خاتون اور میمونہ خاتون۔ اول الذکر مولانا قاری قاضی سعید عالم (محلہ قاضیان مظفر نگر) کے نکاح میں

تھیں۔ قاری سعید عالم مرحوم دارالعلوم وقف میں استاذ تھے۔ دوسری صاحب زادی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے منجھلے صاحب زادے مولانا محمد اسلم قاسمی کے نکاح میں ہیں، تیسری صاحب زادی ”ڈھکا“ سنبھل کے جناب بذل الرحمن فاروقی کو منسوب ہیں۔ ساری بچیاں صاحبِ اولاد ہیں۔

اشتات سوانح (مولانا سید محمد میاںؒ)

خودنوشت سوانح حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ کا اپنے سلسلے میں اپنے قلم سے لکھا ہوا مضمون، مکمل طور پر درج کر دیا جائے، جس میں حضرتؒ کے سلسلے میں اصل اور بنیادی معلومات آگئی ہیں، اس کی حیثیت دستاویز کی ہے؛ کیوں کہ اُن کی سیرت اور سوانح کے سلسلے میں، جتنا اعتماد اس پر کیا جاسکتا ہے کسی اور تحریر پر نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت نے اس کا عنوان اپنے قلم سے ”اشتات سوانح محمد میاں“ رکھا تھا، اُن کی وفات کے بعد، اُن کے صاحب زادہ گرامی مولانا سید ساجد میاں مدظلہ نے دارالعلوم دیوبند کے اردو ترجمان رسالہ ”دارالعلوم“ میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا اور وہ مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں ۱۱ تا ۱۷ صفحات پر شائع ہوا تھا، ذیلی عناوین کا اضافہ راقم نے کیا ہے تاکہ قاری کے لیے پڑھنے میں سہولت ہو:

خاندان اور ولادت:

محمد میاں ولد سید منظور محمد صاحب عرف ”اچھے میاں“ مرحوم، والدہ محترمہ کا نام ”اکرام النساء“ بنت سید ریاض احمد، تاریخ پیدائش ۱۲/رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ مسقطِ راس: محلہ پیرزادگان، دیوبند، ضلع سہارنپور۔

تعلیم کی بسم اللہ

والد صاحب محکمہ نہر میں ملازم تھے، قیام دیہات میں رہتا تھا، احقر بھی مع والدہ محترمہ انھی کے ساتھ رہتا تھا۔ پانچ یا چھ برس کی عمر ہوئی تو احقر کی تعلیم کی فکر ہوئی، موضع ”بچولہ“ ضلع ”بلند شہر“ جو والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا، تو محترمہ نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور والدین کی درخواست پر انھوں نے بسم اللہ کرا دی، نانی صاحبہ بہت صالحہ و صابر و شاکر خاتون تھیں، میری والدہ اور میرے ماموں سید بشیر احمد (مولانا حافظ سید محمد اعلیٰ صاحب کے والد) یہ دو بچے ہی ہوئے تھے کہ نانا صاحب کا انتقال ہو گیا، بیوگی کے دور میں بھی، اُن دونوں بچوں کی پرورش کی، صوم و صلاۃ کے علاوہ اور ادکی بھی پابند تھیں، سونے سے پہلے سورہ ملک اور غالباً سورہ واقعہ کے علاوہ ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا، جس میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔

آگے کی تعلیم اور دارالعلوم سے فراغت

والد صاحب مرحوم، اس تاریک قریہ میں تھوڑے عرصے رہے، پھر موضع ”ٹنڈھیڑہ“ ضلع مظفر نگر اُن کا تبادلہ ہو گیا، جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا، احقر مکتب میں داخل کر دیا گیا، پھر والد صاحب کا قصبہ ”ہبسونہ“ تبادلہ ہوا وہاں ایک صاحب تھے، خلیل احمد صاحب اُن کا اسم گرامی تھا، پیشہ چرم دوزی تھا؛ مگر فارسی کی قابلیت بہت عمدہ تھی، یہ احقر قرآن شریف ختم ہونے پر موصوف کے حوالہ کیا گیا کہ فارسی پڑھائیں؛ مگر یہ عارضی انتظامات تھے اور چوں کہ تقریباً چھ ماہ بعد والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، تو یہ انتظامات بھی نا کافی رہتے تھے، تو اب والد صاحب مرحوم نے متعلقین کو دیوبند ہی بھیج دیا کہ احقر کی تعلیم کا انتظام ہو سکے، خاندان کے نئے رواج کے مطابق، احقر کو انگریزی

پس مرگ زندہ

پڑھانے کے لیے سرکاری اسکول میں داخل کرانا چاہیے؛ مگر انگریزی تعلیم کے مصارف ناقابل برداشت سمجھے گئے اور احقر دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخل کر دیا گیا، جہاں تعلیم مفت تھی، یہ غالباً ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے، درجات فارسی کی تکمیل کے بعد احقر درجات عربی میں داخل ہوا ۱۳۳۳ھ/۱۹۲۵ء میں احقر فارغ ہوا۔ دورہ حدیث میں میرے گرامی قدر استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے فیوض علمی سے مجھ پر علم و حقیقت کی راہ کھلی۔

تدریسی سلسلہ اور اس کی تقریب

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیتہ علمائے ہند کا دوسرا اجلاس زیر صدارت علامہ سید سلیمان ندوی (۱) رحمۃ اللہ علیہ ہوا تھا، حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے جملہ اکابر اس میں شامل ہوئے، واپسی پر ”آرہ شاہ آباد“ کے اسٹیشن پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند: حضرت علامہ کشمیری سے ایسے مدرس کی فرمائش کی، جو عربی تقریر و تحریر کی مشق اور خصوصاً فنِ ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے، حضرت موصوف دیوبند واپس ہوئے، تو حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعجاز علی صاحب کے مشورے سے اس خدمت کے لیے احقر کو منتخب کیا گیا، احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرہ میں قیام کیا، اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف مدرسے کے حضرات؛ بل کہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر سے مانوس ہو گئے، صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علما اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہو گیا؛ مگر احقر اس مدرسے سے خاطر برداشتہ رہا؛ کیوں کہ اس مدرسے کو سرکاری ایلڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجاتِ فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو

(۱) پیدائش: ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۳ء۔ وفات: ۱۳/ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء۔

دارالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، اُنھوں نے اگرچہ وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرمادیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصے اور قیام کرتا تو ”شمس الہدیٰ“ پٹنہ میں پروفیسر ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہو جاتا؛ کیوں کہ احقر کے تعلقات وسیع ہو گئے تھے اور وہاں پرنسپل شپ کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں تھی، اُس زمانے میں مولانا محمد سہول صاحب^(۱) پرنسپل تھے جو صرف دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور دیوبند وغیرہ میں بااثر استاذ رہ چکے تھے، اُن کے پاس کوئی ڈگری تو کیا ہوتی، وہ بہ ظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے؛ لیکن احقر کسی ایسے مدرسے کی خدمت کا خواہاں تھا، جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔

مدرسہ شاہی مراد آباد میں

حسن اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہوئی، جو درجاتِ علیا کی تعلیم دے سکے اور دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم^(۲) دارالعلوم دیوبند نے احقر کی سفارش فرمادی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے، اس سفارش کی تائید فرمائی اور مجھے تحریر فرمایا کہ اب ایسے مدرسے میں بھیجا جا رہا ہے، جو علم کا مرکز ہے۔

احقر ۱۹۲۸ء کے مارچ میں مدرسہ شاہی پہنچا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سائنس کمیشن ہندوستان پہنچ کرنا کام واپس ہوا تھا^(۳)۔ مدرسہ شاہی کی فضا احقر کے مزاج کے مطابق

(۱) مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوری شیخ الہند کے شاگرد تھے، دارالعلوم میں بھی تین سال صدر مفتی رہے تھے، وفات ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء۔ (پیشی)

(۲) متوفی ۳۰ رجب ۱۳۴۸ھ۔

(۳) برطانوی حکومت کا یہ کمیشن ۳۰ فروری ۱۹۲۸ء کو ممبئی کے ساحل پر اترآ، اور ۳۱ مارچ ۱۹۲۸ء کو نا کام واپس ہوا۔

تھی، دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا، اس مدرسے کے صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱) تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیتہ علمائے ہند کے صدر ہوئے۔

مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں اُن کے پختہ معتقد تھے (آپ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا اور حضرت علامہ کی تحقیقات علمیہ کا بڑا ذخیرہ آپ کے سینے میں محفوظ تھا) تحریک خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے، مگر کام بہت کیا، زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں، جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے، سیاسی تحریک کے سلسلے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔

سیاسی تحریک میں شرکت کی ابتدا

یہی وہ زمانہ تھا جب تقریباً سات سال کی خاموشی کے بعد تحریک نے پھر کروٹ لینی شروع کی تھی ”بارڈولی“ (۲) میں ولجہ بھائی پٹیل (۳) نے لگان نہ ادا کرنے کی تحریک چلائی ۱۹۲۹ء شروع ہوا تو بیداری اور بڑھی، کلکتے میں بدیشی کپڑوں کو اکٹھا کر کے آگ لگائی گئی اور مارچ کے مہینے میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک کا اعلان کر دیا اور ”ڈانڈی“ (۴) کے مشہور مارچ سے تحریک میں تازہ روح پھونک دی، اُس وقت سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جمعیتہ علمائے ہند نے اس سوال پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لیے، امر وہہ میں اجلاس کیا، مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ

(۱) پیدائش: ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء، وفات: ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵ اپریل ۱۹۷۲ء۔ (امینی)

(۲) گجرات کے ”سورت“ ضلع کا ایک قصبہ۔

(۳) سردار ولجہ بھائی پٹیل (۱۸۷۵-۱۹۵۰ء)

(۴) ضلع ”نوساری“ صوبہ گجرات کا ایک قصبہ۔

اللہ علیہ اس اجلاس کے صدر تھے۔

مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریک آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی؛ لیکن دوسری جماعت، جن کی سربراہ جمعیتہ علمائے ہند تھی، اُس کا یقین یہ تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے، جو دوسرے برادرانِ وطن سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، برادرانِ وطن اس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے تھے؛ مگر مسلمانوں کے لیے اس کی نوعیت مذہبی مسئلے کی بھی ہے، جس کا مدار کسی معاہدے پر نہیں ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار؛ بل کہ اُس کی سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدے کا تصور جوے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے؛ چنانچہ جیسے ہی جمعیتہ علمائے ہند نے امر وہہ میں اجلاس عام کا اعلان کیا، دوسری جماعت، جمعیتہ علمائے اسلام کے نام سے کھڑی ہو گئی اور اُس نے بھی انہی تاریخوں میں امر وہہ میں اپنی جمعیت کا اجلاس کیا۔

بہر حال اجلاس امر وہہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کے دوش بہ دوش تحریک آزادی میں گرم جوشی سے حصہ لیں اور اس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

جمعیتہ علماء مراد آباد کی ذمہ داری

احقر کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں کام کرتے ہوئے، ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہو گئی، اُس سال جمعیتہ علماء مراد آباد کا بھی انتخاب ہوا تو احقر نائب ناظم بنایا گیا، کچھ دنوں بعد جمعیتہ علمائے ہند نے شاردا ایکٹ کی تحریک چلائی، تو احقر نے پوری سرگرمی سے اُس میں حصہ لیا، حتیٰ کہ موٹو وغیرہ خود اپنے ہاتھ سے لکھے، ضابطہ کے لحاظ سے احقر جمعیتہ علمائے ہند کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتا تھا؛ کیوں کہ اُس کا رُکن نہیں تھا؛ مگر احقر نے سفارشوں کے ذریعے پاس حاصل کر لیا اور اجلاس میں شریک ہو کر علماء کی بحث سنی، کچھ قانون داں، وکیل اور ایک بیرسٹر صاحب اور ایک بڑے

پس مرگ زندہ

عالم جو سرکار کے حامی تھے، صدر کی اجازت سے وہ بھی اجلاس میں شریک ہوئے اور جناب صدر نے اُن کو بھی بحث میں حصہ لینے کی اجازت دی، اُنھوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اُس میں حصہ لینا نہیں چاہیے، اُن کے پیش کردہ دلائل اُن کی نظر میں مضبوط ہوں گے؛ مگر احقر کو نہایت لچر معلوم ہوئے، جمعیتِ علما کے ارکان میں سے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (۱)، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تقریروں نے احقر کو متاثر کیا، سید صاحب کی تقریر تاریخی اور سیاسی نوعیت کی تھی اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی، مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس تجویز کے محرک تھے، آخر میں اُن کی تقریر بھی ہوئی؛ مگر وہ اُس وقت اتنے اونچے درجے کے مقرر نہیں تھے، رات کو جلسہ عام ہوا جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کی تقریر ہوئی، غالباً تین گھنٹے تک وہ تقریر جاری رہی، معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلوں کی بارش ہو رہی ہے، چیز زہنیں ہوتے تھے؛ بل کہ مضطربانہ نعرے بلند ہوتے تھے، کچھ پروجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، بہر حال احقر جذباتی لحاظ سے اُس تقریر سے متاثر ہوا۔

اجلاسِ امر وہہ کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ

اجلاس ختم ہوا اور احقر مراد آباد واپس ہوا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی مراد آباد تشریف لائے، احقر نے چاہا کہ اجلاس اور جلسہ کی ہماہمی کے علاوہ سکون اور اطمینان کی صورت میں بھی حضرت شیخ سے استصواب کرے، چنانچہ احقر نے تنہائی میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ کیا مجھے کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے اور تحریک میں حصہ لینا چاہیے؟ مولانا کا جواب لامحالہ اثبات میں تھا، مزید فرمایا: یورپ خصوصاً گورنمنٹ برٹش نے، دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجے میں کس رکھا ہے اور

(۱) پیدائش ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۵ء، وفات: ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء۔

برٹش کی یہ طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے، ہندوستان پر برٹش کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے، تو اُن کم زور ممالک پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور انھیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حضرت شیخ کے اس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح ہو گیا؛ چنانچہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا دست و بازو بن کر تحریک میں کام شروع کر دیا۔ چند روز میں پورے مراد آباد پر تحریک چھا گئی اور صوبہ سرحد کے بعد صرف شہر مراد آباد کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے، کچھ عرصے بعد مراد آباد میں یوپی کونسل کا ضمنی الیکشن ہوا، تو اس سے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی گئی، اُس وقت انتخاب جداگانہ ہوتے تھے امیدوار ایک مسلمان صاحب تھے، تو ووٹر بھی مسلمان ہی تھے، جب پولنگ شروع ہونے کا وقت آیا تو ناؤن ہال کے راستوں پر ایک طرف مسلح پولیس کے پیادہ اور سوار جوان تھے دوسری جانب جمعیتہ علماء کے رضا کار۔

احقر نے نماز فجر کے وقت سے شہر کا گشت کر کے اُن رضا کاروں کو بھیجا تھا، پولنگ شروع ہوا، تو دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ہڑبونگ شروع ہو گئی، بے قابو مجمع میونسپلٹی کے دفتر میں گھس گیا، پولیس کو بہانہ مل گیا، اُس نے فائرنگ شروع کر دی، پھر لاشی چارج کے بہ جائے گھوڑے دوڑا دیے، احقر میدان میں تھا اور آخر تک وہاں رہا اور عجیب و غریب طرح سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کے چھروں سے بچا، فائرنگ بند ہو گئی، تو زخمیوں کو اُٹھوایا، عبدالنبی ایسا مجروح ہوا کہ جاں بر نہ ہوسکا، دوسرے زخمی اچھے ہو گئے، پشاور میں قصہ خوانی بازار کی فائرنگ کے بعد، یہ یوپی میں پہلی فائرنگ تھی، اس کے تقریباً دو ہفتے بعد احقر کو نیز حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو گرفتار کر لیا گیا، ایک ایک سال کی سزا ہوئی؛ مگر مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی، ارون بیکنٹ ہو گیا، جس کی ایک شرط عام رہائی بھی تھی، چنانچہ تمام سیاسی اسیر رہا کر دیے گئے، ہم بھی سال ختم ہونے سے پہلے صرف ساڑھے پانچ ماہ بعد رہا ہو گئے۔

معاهدے کے بعد صرف ایک سال تک سیاسی فضا خاموش رہی؛ لیکن گول میز

پس مرگ زندہ

کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی ابھی تک ہندوستان پہنچنے نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ لنکڈن کی تشدد پسند پالیسی کی وجہ سے تحریک پھر شروع ہو گئی، کانگریس کی طرح جمعیتہ علمائے ہند کے ذمہ دار حضرات مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند و صدر مولانا احمد سعید صاحب ناظم عمومی وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے، کانگریس خلاف قانون قرار دی گئی، جمعیتہ علمائے ہند خلاف قانون تو نہیں قرار دی گئی؛ مگر معاملہ اُس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا، دفتر پر بار بار چھاپا مارا گیا۔ تلاشی لی گئی، کانگریس نے ورکنگ کمیٹی اور صدر کے بہ جائے ڈکٹیٹر شپ جاری کی تھی، اسی طرح مرکزی جمعیتہ علمائے ہند بھی ڈکٹیٹر بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا، مرکزی جمعیتہ علمائے ہند کے آٹھ ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے، تو احقر کو بھی اس منصب جلیل پر فائز کیا گیا، ادھر پراونشل کانگریس کمیٹی نے صوبائی کانگریس کا ڈکٹیٹر احقر کو بنادیا۔

مراد آباد سے دہلی آ کر جامع مسجد میں

ہر جمعہ کو تقریر کی ڈیوٹی کی انجام دہی اور گرفتاری

اُس زمانہ میں ڈیوٹیاں مقرر کر دی گئی تھیں، جمعیتہ علمائے ہند کے ہائی کمانڈر حضرت مولانا سجاد صاحب نے احقر کی ڈیوٹی یہ مقرر کی تھی کہ ہر جمعہ کو مراد آباد سے آ کر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد (دہلی) میں تقریر کرے اور فوراً واپس ہو جائے۔ کئی ہفتے اسی طرح کرتا رہا، بالآخر پولیس نے قابو پا لیا اور احقر کو کوٹوالی کے سامنے سے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا، یہ اگست کا مہینہ تھا، بارشیں ہو رہی تھیں، مگر تب بھی گرمی سخت تھی بالخصوص اُس ہال میں جس میں صرف ایک طرف دروازہ تھا، احقر کے علاوہ ۸ مولوی صاحبان اور طلبہ عربی اور بھی تھے جو اس ہال میں بند کر دیے گئے تھے، صرف ایک گھنٹے کے لیے صبح کو ضروریات کے لیے باہر لایا جاتا تھا، وضو وغیرہ سب اندر کرنا ہوتا تھا، نالی نہیں تھی، تو آدھے ہال میں پانی بھر گیا، آدھے ہال میں فرش زمین پر آٹھ آدمیوں کے بسترے تھے،

اس وقت مقدمہ نہیں چلایا گیا؛ بل کہ ایک ہفتہ بعد نوٹس تعمیل کرایا گیا کہ چھ ماہ تک دہلی نہیں آسکتے اور پولیس کی حراست میں شاہد رہ پہنچا دیا گیا، رہائی کے بعد احقر مراد آباد پہنچا اور چند روز بعد کانگریس اور جمعیتہ علما کے پروگرام کے بہ موجب ایک ہاتھ میں کانگریس کا اور دوسرے میں جمعیتہ علما کا جھنڈا لگا کر دفعتاً چوک میں نمودار ہوا، کانگریس اور جمعیتہ علما کے ممبر اور رضا کار جو ادھر ادھر مکانوں اور دوکانوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ بھی نکل آئے اور جلوس بنا کر مارچ شروع کر دیا، یہ جلوس تقریباً دو فرلانگ چلا تھا کہ پولیس نے آکر قائد جلوس (احقر) کو گرفتار کر لیا، پھر لاٹھی چارج کر کے جلوس کو منتشر کر دیا؛ لیکن اگلے روز سترہ کارکن گرفتار کر لیے، جو کانگریس کے لیڈر تھے۔ مقدمہ جیل میں بھی چلا؛ مگر پالیسی یہ تھی کہ پیروی نہ کی جائے؛ لہذا کیدار ناتھ صاحب بیرسٹر جو آزاد راہ ہمدردی پیروی کے لیے تشریف لے آئے تھے، اُن کو بھی ہم نے واپس کر دیا، اس کے بعد جب رہائی ہوئی، تو تحریک نے نیارنگ اختیار کر لیا تھا، اُس وقت جو اختیارات ہندوستان کو دیے گئے تھے، اگرچہ وہ اطمینان بخش نہیں تھے؛ مگر کانگریس کی اکثریت نے الیکشن میں حصہ لینا طے کر لیا تھا، چنانچہ اسی کے نتیجے میں غالباً ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہو گئیں؛ لیکن تقریباً دو سال بعد ہٹلر نے حملہ کر کے یورپ میں جنگ شروع کر دی، برٹش اس کا حریف تھا، برطانیہ عظمیٰ نے ہندوستان کی رائے لیے بغیر، ہندوستان پر بھی جنگ مسلط کر دی، کانگریس اور جمعیتہ علما ہندوؤں جماعتوں نے اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر گاندھی جی نے، انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام تجویز فرمادیا۔

”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ کی اشاعت اور ضبطی

اُسی زمانے میں احقر کی کتاب ”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ طبع ہوئی، جو ضبط کی گئی، پریس بھی ضبط کر لیا گیا، مصنف کو گرفتار کر کے معمولی ضمانت پر رہا کر دیا گیا، احقر محمد میاں انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں نہیں؛ بل کہ اُس کتاب کے سلسلے میں گرفتار ہو کر

پس مرگ زندہ

سزایاب ہوا۔ مراد آباد کانگریس نے احقر کی سزایابی کو تحریک کے سلسلے میں شمار کیا۔ ”شان دار ماضی“ کی تصنیف کے مقصد دو تھے: اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علما کی شرکت کو علما کی شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جا رہا تھا۔ اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علما نے ہر دور میں اُس دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں؛ لہذا اس دور میں اس دور کے تقاضے کے مطابق، تحریک میں حصہ لینا علما کی شان کے خلاف نہیں؛ بل کہ ان کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے، دوسرا مقصد تحریک آزادی کو تقویت دینا تھا؛ اسی لیے اُن مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اس وقت تک انگریزوں نے کیے تھے، اس مقدمہ میں، طویل سزا ہو سکتی تھی مگر چوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور وکلا صاحبان نے مجسٹریٹ صاحب کو یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ مطبوعہ اور شائع شدہ مستند حوالے سے جو بات بیان کی جائے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، وہ قابل اعتراض نہیں۔ اس کے علاوہ چند الفاظ جو فی الواقع مہذب تصنیف میں آنے کے قابل نہیں تھے اور جذبات کی رو میں احقر سے لکھ گئے تھے، اُن الفاظ سے احقر نے تحریری معذرت پیش کر دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تاہر خواست اجلاس احقر کو سزا دی گئی، اس طرح پولیس کی بات بھی رہ گئی۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری اور جیل اور ۱۹۴۴ء میں رہائی

۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی، جس کا نام کوٹ انڈیا، والی تحریک مشہور ہوا۔ اُس وقت پالیسی یہ تھی کہ کام خفیہ طور سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنے آپ کو چھپایا جائے، چنانچہ جیسے ہی احقر کو معلوم ہوا کہ مراد آباد میں گرفتاریاں ہو رہی ہیں، احقر مراد آباد سے باہر نکل آیا، اول ایک گاؤں میں رہا، پھر دہلی پہنچ کر مجلس عاملہ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، پھر مجلس عاملہ کی تجویز جس میں تحریک

آزادی میں شرکت کے لیے مسلمانوں کو ابھارا گیا تھا، چھپوا کر اُس کی تقسیم کرنے کے لیے، یوپی کا دورہ کیا، بہار جانے کا ارادہ تھا؛ مگر بارش اور تحریک کے کارکنوں نے ریلوے لائن کو اس درجہ خراب کر دیا تھا کہ مغل سرائے سے آگے گاڑیاں نہیں جا رہی تھیں، مجبوراً واپس ہوا، دہلی میں قیام مشکل تھا خصوصاً اس بنا پر کہ یہاں کی پولیس کو احقر کے متعلق خیال ہو گیا تھا کہ بم بنانے والی پارٹی سے میرا تعلق ہے؛ لہذا دوسرے مقامات سے گم نام ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع کرنے شروع کیے، کچھ کاربن سے لکھ کر خاص خاص مرکزوں میں بھیجا کرتا تھا، اسی طرح کا ایک پمفلٹ پشاور پہنچ گیا، وہاں کانج کے نوجوانوں نے میرے نام کے حوالے سے، اس کو چھپوا کر تقسیم کیا، وہ مضمون یوپی کی پولیس کو مل گیا، یا صوبہ سرحد کی پولیس نے بھیجا، بہر حال اس طرح کی سرگرمیوں کی بنا پر اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ایک تقریر کی بنا پر جو آپ نے چھپواؤں، ضلع مراد آباد میں کی تھی، اپریل ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیے گئے تھے، اُس وقت کانگریس کی پالیسی یہ تھی کہ گرفتاری کے خلاف مقدمہ کی پیروی کی جائے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مراد آباد جیل کی حوالات میں تھے، نہ صرف اس مقدمہ؛ بل کہ اس طرح کے تمام مقدمات کی پیروی احقر نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، اس پیروی کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا؛ کیوں کہ حج حکومت کی منشا کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے؛ مگر یہ نتیجہ ظاہر تھا اور مقصود تھا کہ لوگوں میں جذبات پیدا ہوں اور بڑھیں۔ حضرت مولانا کے مقدمے میں بحث کے لیے مسٹر آصف علی سے احقر نے درخواست کی، انھوں نے منظور فرمائی اور مراد آباد پہنچ کر کٹہرہ عدالت میں تقریباً چار گھنٹے مسلسل تقریر کی، مراد آباد کے تمام وکلا اس بحث کو سننے کے لیے، اس عدالت میں سمٹ آئے تھے، بہر حال اس شان دار بحث کے باوجود فیصلہ میں چھ ماہ کی سزا با مشقت تجویز کی گئی۔ ابھی حضرت شیخ کی یہ سزا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۸ اگست آگیا اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن

پس مرگ زندہ

صاحب، حافظ محمد ابراہیم صاحب گکینوی (جو کانگریس گورنمنٹ کے وزیر رہ چکے تھے اور آئندہ وزیر ہونے والے تھے) قاری عبداللہ صاحب مرحوم مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، منشی معین الدین صاحب سنبھلی، محمد ابراہیم صاحب مالک کارخانہ بیڑی مراد آباد وغیرہ، حضرت شیخ کے پاس پہنچ گئے، پھر احقر حاضر خدمت ہو گیا، تھوڑے دنوں یہ مجمع مراد آباد جیل میں رہا، پھر کچھ کورہا کر دیا گیا، جو باقی رہے اُن کو منتشر کر دیا گیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کو مینی سینٹرل جیل اور مولانا حفظ الرحمن صاحب اور احقر محمد میاں کو بریلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا، تقریباً دو سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۴ء کے اکتوبر میں رہائیاں شروع ہوئیں، پہلے احقر پھر مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب، پھر حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ رہا ہوئے، اس کے بعد گرفتاری کی نوبت نہیں آئی، تقریباً دو سال تک صوبائی کونسلوں پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات رہے، جو مسلم لیگ کے شدید مقابلے کی بنا پر نہایت سخت تھے، مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے جمعیۃ علما اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا، جس میں جمعیۃ علما کے علاوہ مجلس احرار اسلام، مسلم مجلس، صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار، مومن کانفرنس وغیرہ آزادی پسند جماعتیں شریک تھیں۔ احقر کبھی کسی سیٹ کا امیدوار تو نہیں بنا؛ مگر تمام امیدواروں کی خدمت دفتری حیثیت میں احقر کی زیر نگرانی تھی، یہ ہنگامے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی پر ختم ہو گئے، جس کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے، جو آج تک ختم نہیں ہوئے، اُن کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی، اُن ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا، جس کا عنوان ریلیف ہے، یعنی کشنگانِ ستم کو دفنانا، مجروحوں کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دل داری کا مرہم لگانا، اُجڑے ہوؤں کو بسانا اور ان کاموں کے لیے لوگوں سے بھیک مانگنا، پھر مظلوموں اور اُن کی ضرورتوں کو پہنچانا اور بہ تقاضاے حالات، اُن کی امداد کرنا۔ احقر نے ان خدمات میں بھی حصہ لیا؛ مگر ان کو کہاں تک بیان کیا جائے:

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

عمر بگذشت وحدہ بیٹ درد ما آخر نہ شد

شب آخر شد اکنوں کوتاہ کنم افسانہ را

مختصر تذکرہ خدمات جمعیتہ علمائے ہند کے متعدد نمبروں میں، اس کے علاوہ علمائے حق جلد دوم میں ان سب واقعات کا تذکرہ ہے، جو ملاحظہ فرمایا جائے۔

سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: (مولانا) سید محمد میاں بن سید منظور محمد بن سید یوسف علی بن سید محمد علی بن سید ظہور ولی بن سید محمد فردوس بن سید شاہ شیلی بن حضرت بندگان محمد اسماعیل بن حضرت سید محمد ابراہیم قدس اللہ سرہ بن سید سعد اللہ بن سید محمود قلندر بن سید احمد بن سید فرید بن وجیہ الدین بن علاء الدین بن سید احمد کبیر بن سید شہاب الدین بن حسین علی بن عبد الباسط بن ابو العباس بن اسحاق عندلیب المکی بن القاضی حسین علی ہادی بن لطف اللہ بن تاج الدین احمد بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین احمد بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الأعرج بن ابی عبد اللہ احمد بن موسیٰ المبرقع بن محمد تقی بن موسیٰ علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن زین العابدین بن ابی عبد اللہ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ و سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ۔ (۱)

گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں خاندان سادات کے ایک بزرگ سید محمد ابراہیم (متوفی ۵۱۰۳۳ھ مطابق ۲۲ جون ۱۶۲۵ء نے بعض اہل اللہ کے مشورے سے، اسلام کی دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے دیوبند کا انتخاب فرمایا۔ دیوبند میں سید صاحب کے قیام کے لیے دہلی کی مغلیہ حکومت کی طرف سے مسجد اور وسیع خانقاہ تعمیر کرائی گئی، جس میں افادۂ باطنی کے حلقے کے ساتھ ساتھ، علوم ظاہری کی تعلیم و تعلم کی مسند بھی بچھی ہوئی تھی۔ (۲)

✽ ولادت: ۱۲ رجب ۱۳۳۱ھ = ۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

✽ جائے ولادت: محلہ ”سرائے پیر زادگان“ دیوبند، بہار پور، یوپی۔

(۱) تذکرہ سادات رضویہ دیوبند، ص: ۳۰ و ۳۵۔ مصنفہ سید محبوب رضوی (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء) شائع کردہ علی مرکز دیوبند۔

(۲) تذکرہ سادات رضویہ، ص: ۳۰۔

پس مرگ زندہ

تعلیم: تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، نانی صاحبہ سے قرآن پاک وغیرہ پڑھا، اردو اور فارسی کی بعض کتابیں ”نڈھیر“ ضلع مظفرنگر اور قصبہ ”پسونہ“ میں خلیل احمد سے پڑھیں۔ ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجہ فارسی میں داخل ہوئے، اُس کو عبور کرنے کے بعد درجات عربی میں داخل ہوئے ۱۳۳۴ھ/۱۹۲۵ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، دورہ حدیث میں آپ کے استاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) تھے۔ اُن کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء-۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی امرہویؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء-۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء-۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) مولانا غلام رسول ہزارویؒ (متوفی ۱۸ محرم ۱۳۳۷ھ= ۲۵ ستمبر ۱۹۱۸ء) جیسے اُساطین روزگار بھی تھے۔

بچپن میں قرآن پاک حفظ نہیں کر سکے تھے، یہ سعادت جدوجہد آزادی کے زمانے میں قید و بند کی صعوبتوں کے دوران حاصل کی۔

اصلاحی تعلق: تزکیہ نفس کے لیے، آپ نے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے تعلق قائم فرمایا اور اُن سے بیعت ہو کر احسان کی منزلیں طے کیں اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔

درس و تدریس: تدریس کی ابتدا آپ نے ”مدرسہ خفیہ“ شہر ”آرہ“ سے کیا، یہاں آپ نے یہ خدمت ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک انجام دی۔ مارچ ۱۹۲۸ء (شوال ۱۳۴۷ھ) سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی۔ یہاں سے آپ مدرس، مفتی، منتظم، مہتمم اور رکن شوری و رکن عاملہ کی حیثیت سے تاحیات وابستہ رہے، حتیٰ کہ دہلی میں جمعیتہ علما کے ناظم اور مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران بھی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں آپ نے بہ حیثیت مدرس و مفتی و منتظم ۱۶ سال باقاعدہ قیام فرمایا۔

جمعیتہ علماے ہند کی خدمت کے لیے دہلی آمد: ۱۹۳۵ء میں جمعیتہ کی خدمت کے لیے دہلی آئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ آزادی و تقسیم ملک کے بعد مستقل دہلی میں قیام فرمایا، دہلی آمد کے بعد مدرسہ شاہی کے رکن شوری منتخب ہوئے، ۱۳۸۰ھ میں اعزازی مہتمم ہوئے، ۱۳۹۵ھ میں صدر مہتمم بنائے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیتہ مراد آباد کے ناظم بنے، پھر ناظم ہوئے، پھر ناظم شعبہ تبلیغ جمعیتہ صوبہ آگرہ ہوئے، پھر ناظم جمعیتہ آگرہ، پھر ناظم صوبہ آگرہ وادھ منتخب ہوئے۔ ۴-۷ مئی ۱۹۴۵ء میں جمعیتہ کے اجلاس سہارنپور میں جمعیتہ علماے ہند کے ناظم منتخب ہوئے، مجاہد ملت مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کے انتقال کے معا بعد، ناظم اعلیٰ جمعیتہ علماے ہند منتخب کیے گئے، مگر صرف ایک سال ہی اس عہدے پر فائز رہ کر اس سے سبک دوش ہو گئے، پھر رکن عاملہ جمعیتہ منتخب ہوئے اور جمعیتہ ٹرسٹ کے ناظم اور ادارہ مباحث فقہیہ کے مدیر کے عہدوں پر تہ

حیات فائز ہے۔

✽ شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی: ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں دہلی کی مشہور عالم درس گاہ اور علامہ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کی یادگار مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے اور تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

✽ جدوجہد آزادی میں حصہ: آزادی وطن کی سرگرمیوں میں آپ نے سرگرم حصہ لیا اور مراد آباد، دہلی، میرٹھ، بریلی، فیض آباد کی جیلوں میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔

✽ مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کی سعی مشکور: ہنگامہ آزادی کے دوران، جہاں جہاں سے مسلمان ہجرت کر گئے تھے، وہاں ارتداد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور بہت سے مسلمان ایمان کے حوالے سے متزلزل ہو گئے تھے۔ مشرقی پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کا ایک بڑا علاقہ، اس صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا، آپ نے وہاں شانہ روز محنت کی اور گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو ڈھارس بندھائی اور ایمان پر انھیں قائم رکھنے کی ٹھوس جدوجہد کی اور مکاتب کے جال کے ذریعے، وہاں دینی تعلیم و تبلیغ کا باقاعدہ نظام قائم فرمایا۔

✽ وفات: بروز چہار شنبہ ۶/ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴/ اکتوبر ۱۹۷۵ء شام ساڑھے چار بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ غفر لہ اللہ وأدخلہ فسیح جناتہ۔ ”گوریہاں“ قبرستان میں (جو آج کل کے آئی ٹی او کے علاقے میں، جمعیۃ علمائے ہند کے مرکزی دفتر واقع مسجد عبدالنبی کے قریب واقع ہے) تدفین عمل میں آئی (۱)۔



(۱) اس مضمون کو، راقم الحروف نے بہ راہ راست اردو میں یک شنبہ: ۱۷/ شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹/ اگست ۲۰۰۹ء کو لکھنا شروع کیا تھا۔ رمضان المبارک میں اس کا اکثر حصہ تحریر ہو گیا تھا؛ لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے، اس کی تکمیل سہ شنبہ: ۲۹/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۶/ مارچ ۲۰۱۰ء کو ہو سکی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء — ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

یاد سے تیری ، دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں ، دعاؤں سے فضا معمور ہے

یک شنبہ: ۶/شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو ٹھیک پونے ۱۲ بجے، میں ”الداعی“ کے دفتر میں بیٹھا، حسب معمول تحریری کاموں میں منہمک تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی مسجد قدیم (جو صدر گیٹ پر احاطہ دفتر میں واقع ہے) کے مناروں پر نصب مائک کے بھونپوؤں سے اچانک، پہلے کسی گھبرائے ہوئے انسان کی سانسوں کی آہٹ محسوس ہوئی، پھر اُس نے عجیب و غریب منفرد لہجے اور غم و الم انگیز و بھرائی ہوئی آواز میں یہ اعلان کر کے، سارے اساتذہ و طلبہ و حلقہٴ علم و علما پر بجلی گرا دی کہ ابھی ابھی ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم، ملت اسلامیہ کی آبرو، برصغیر کے سب سے بڑے عالم، ترجمانِ دین، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اعلان کنندہ شخص، تقریباً دس منٹ تک ان الفاظ کو بار بار دہراتا رہا؛ لیکن جیسا کہ ہر بڑے اور غیر معمولی انسان کی موت پر ہوا کرتا ہے کہ لوگوں کو تا دیر اُس کی وفات کا یقین نہیں آتا اور وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس اعلان کنندہ اور موت کی خبر دینے والے کی خبر غلط ثابت ہو اور بعد میں یہ ثابت ہو کہ اُس نے غلط فہمی سے، اُس کی موت کا اعلان کر دیا تھا، الحمد للہ وہ حسب سابق صحیح سالم ہے، بیہوشی کو لوگوں نے موت باور کر لیا تھا۔

دارالعلوم میں، شہر دیوبند میں اور قرب و جوار کے تمام شہر و دیہات میں جس نے،

پس مرگ زندہ

جہاں یہ خبر سنی وہ حیرت زدہ رہ گیا، ہر طرف سناٹا چھا گیا اور غم و اُلم کی شدید لہر دوڑ گئی۔ سارے انسانوں کا رُخ حکیم الاسلام کے دولت کدے کی طرف تھا، جو انھیں موت کے بعد ایک نظر دیکھنے اور اُن کے پس ماندگان بالخصوص اُن کے صاحب زادوں سے تعزیت کے لیے بے تاب نظر آرہے تھے۔ انتقال کے دو ہی گھنٹے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اس عظیم انسان کی وفات کی خبر نشر کر دی اور ہندو بیرون ہند کے کونے کونے میں لوگوں کو، اُسی دن معلوم ہو گیا کہ بلبلِ اسلام، جو برسوں اسلامی شریعت و حکمت اور علم و عرفان کی اپنی شیریں اور مشک و عنبر سے دھلی ہوئی زبان سے حدیٰ خوانی کرتا رہا، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

یک شنبہ و دو شنبہ: ۶-۷ شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷-۱۸ جولائی ۱۹۸۳ء کی درمیان شب میں آل انڈیا ریڈیو نے تفصیل سے اُن کی زندگی پر روشنی ڈالی اور اُن کے مُعَوِّدِ مُعَاَصِرین کے، اُن کے حوالے سے ذاتی تاثرات نشر کیے، نیز ریڈیو پاکستان اور برصغیر کے تمام اخبارات و رسائل نے، جلی عنوان کے ساتھ حکیم الاسلام کے انتقال پر ملال کی خبر شائع کی اور بہت سے اہل قلم کے تاثراتی اور سوانحی مضامین بھی چھاپے۔

یک شنبہ و دو شنبہ: ۶-۷ شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷-۱۸ جولائی ۱۹۸۳ء کی شب میں عشا کی نماز کے فوراً بعد، دارالعلوم دیوبند کے مشہور احاطہ مولسری میں، اُن کی نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں ہزاروں اساتذہ و طلبہ و علما و باشندگان شہر اور مختلف اطراف سے آئے ہوئے علما و صلحا اور عام مسلمانوں نے شرکت کی اور مقبرہ قاسمیہ میں تدفین عمل میں آئی، جس میں بانی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ اکثر اکابر دارالعلوم تارو و حشرِ محو خواب ہیں، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ وَاَرْحَمْهُمْ وَاَدْخِلْهُمْ فِیْ سَبِیْلِ جَنَّتِكَ مَعَ الْاَنْبِیَاءِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالشّٰہِدِیْنَ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسِّنْ اَوْلِیٰكَ رَفِیْقًا۔

اسباب، پٹاٹ

رخت ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے

بہ وقت وفات حضرت کی عمر ۸۸ سال تھی؛ اس لیے کہ آپ کاسنہ ولادت ۱۳۱۵ھ/

۱۸۹۷ء ہے۔ شدید بڑھاپے اور اُس کے مختلف الانواع عوارض کی وجہ سے خاصے نحیف و ناتواں ہو گئے تھے۔ رہی سہی کسر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک جاری رہنے والے دارالعلوم کے قضیہ نامرضیہ نے پوری کردی تھی، جس کی وجہ سے آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ محسوس ہوتے تھے؛ لیکن تادم وفات آپ کے ذہنی قویٰ علیٰ حالہ کام کرتے رہے، جو آپ کے صلاح و تقویٰ، علوم شریعت کی تاحیات خدمت کی برکت اور عند اللہ مقبولیت کی دلیل ہے۔ وفات والے دن آپ حسب معمول بیدار ہوئے، حوائج بشریہ سے فراغت اور وضو کے بعد آپ نے نماز فجر ادا کی، روزانہ کی طرح قرآن پاک کی اتنی ہی تلاوت کی جتنی آپ کرتے تھے، مگر بعض وہ کام بھی آپ نے کیے، جو آپ کے معمولات میں داخل تھے۔ صبح دس بجے آپ نے ایک بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور موت سے ذرا پہلے پیش آمدہ احوال اُس کو بتایا، ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا، ابھی چند منٹ بھی گزرے نہ تھے کہ نبض کی رفتار از خود کم زور پڑتی گئی، اور دو چار منٹ کے اندر ہی روح قفصِ عنصری سے پرواز کر گئی، ایسا لگا جیسے اللہ نے اپنے اس نیک اور وارثِ علم و عمل بندے کو بہت آرام کی نیند روزِ محشر تک کے لیے سلادی اور سکرات کی بہ ظاہر اُن سختیوں سے نہیں گزارا، جن سے عموماً نہ صرف ہر فرد بشر؛ بل کہ نیک لوگوں اور علوم شریعت کے حاملین کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔

برصغیر کی دینی ریاست کا امیر

حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو برصغیر میں بلا اختلاف دینی سرِ داری اور ریاست حاصل تھی، دین و ملت کی کوئی مجلس بپا ہو، اُمتِ اسلامیہ ہند یہ کی کوئی تنظیم تشکیل پائے، علم و دانش کی کوئی بزمِ سنواری جائے، مذہب و ملت کی بقا و ترقی کے لیے کوئی منصوبہ بنایا جائے، اسلام اور مسلمانوں پر آنے والی کسی آنچ کو بجھانے کی کوئی اجتماعی تدبیر کی جائے؛ ہر موقع سے اُس کی صدارت و قیادت کے لیے نظرِ انتخاب اُسی علم کے پتلے، حکمت کی

شبیہ، روح شریعت کے اپنے وقت کے ممتاز جان کار اور سب سے بڑے شارح اور اسلام کی ناطق زبان فیض ترجمان پر پڑتی اور لوگ بالافتاق، اُسی کو صدر نشین بناتے۔ وہ اپنے چہرے بشرے، اپنی ہیئت کذائی، فطری وقار، طبعی شرافت، ہر سمت سے پھوٹی ہوئی علمی کرنوں، علم و صلاح و زہد تقویٰ کی بے پایاں روشنی سے منور کھڑے، جس سے اُن کا پورا وجود روشن دکھتا تھا اور اپنی ملکوتی معصومیت؛ کی وجہ سے وہ از خود ہر مجلس کے صدر اور ہر بزم کے سرپرست لگتے تھے۔

مثالی سراپا

گورا چٹا سرخی گھلا ہوا اور صباحت کی مثال کتابی و بیضوی آمیزے کا چہرہ، کھڑی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، گھنیریں بھنویں، متوسط القامت، نحیف الجسم، مستقیم القدر و جود، گھنیری داڑھی، سر پر دوپٹی ممتاز طور پر کھڑی ٹوپی، جو اُن کی شان امتیاز تھی، جاڑے اور گرمی دونوں موسموں میں بہ وقت ضرورت و خواہش خوب صورت جاذب رنگ کی شیروانی، ہاتھ میں اُن کے ذوق لطیف کی غماز خوب صورت سی چھڑی، ہونٹوں پر ہلکی گلابی جو قدرتی گلابی سے گھل مل کر مزید کپکپش ہو جاتی تھی، اوپر کی جیب میں نستعلیق سا قلم، چال میں عالمانہ شان، نشست و برخاست میں دین دارانہ امتیاز، حرکات و سکنات سے صالحانہ عظمت و وقار کا ترشح، بات میں متوازن و ہیمپن، عام مجلس ہو یا بزم خاص ہر جگہ علم و فضل کی بارش۔ بیٹھے ہوں، یا چل رہے ہوں یا کھڑے ہوں، لوگ اُن کی دید سے اتنے محفوظ ہوتے کہ جس کی نظیر، میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ سلوک و برتاؤ میں نرمی اور دل میں اُس سے زیادہ نرمی و بردباری، جوش میں آتے، نہ بلند آواز سے بولتے، اس کے ساتھ ظرافت و بذلہ سنجی میں بھی ممتاز تھے۔ نثر و نظم دونوں پر قدرت تھی، اُن کا بڑا علمی سرمایہ تو نثر ہی میں ہے؛ لیکن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعری میراث بھی چھوٹی ہے۔ اُن کی تقریر ہی کی طرح اُن کی تحریر بھی، بڑی سہل اور اُن کے زبردست علم

و فکر کی ترجمانی کے باوجود، انتہائی رواں، سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی، جو بہ ذاتِ خود ان کا وجہ امتیاز تھی۔

ذوقِ عبادت و ریاضت

وہ عبادت و ریاضت کے رسیا تھے، لگتا تھا کہ واقعی اسی کے لیے مخلوق ہوئے ہیں، سنن و نوافل اور قیام باللیل کی اسفار میں بھی ایسی پابندی کہ جواں سال حوصلہ مند صالح جوانوں کی ہمت بھی اُس کے سامنے جواب دے دیتی تھی۔ مغرب کے بعد نوافل اور وقتِ تہجد کی نمازوں میں کئی کئی پارہ تلاوت کا معمول رہا، جس میں موت تک کبھی خلل نہیں پڑا۔ وہ عبادت و تلاوت میں انہماک کے حوالے سے بھی اپنے اسلاف کے امانت دار وارث تھے۔ دارالعلوم جیسے عظیم ادارے کی اتنے طویل عرصے تک قیادت کے لیے جو باطنی جوہر، قلبی کیفیات اور روحانی واردات درکار تھیں اُن کے معیار پر نہ صرف وہ مکمل طور پر اُترتے تھے؛ بل کہ پوری جماعت کے لیے، اس حوالے سے بھی قائد و داعی تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس ادارے کی اس طویل دورانیے تک سربراہی کے لیے خدائے حکیم نے ہی انھیں بنایا اور منتخب کیا تھا۔ تاریخ کے ہر طالب علم کا اس سچائی پر ایمان ہے کہ موزوں انسان جب جب کسی موزوں جگہ پر فائز رہا ہے، انسانی معاشرہ، فکر و عمل کے بے طرح نتائج سے مستفید ہوا ہے، جن کے برکات و ثمرات کا احاطہ بعض دفعہ، بڑے بڑے بصیرت نگاہ مؤرخ کے لیے ایک مشکل عمل ثابت ہوا ہے۔ اُس کے برعکس ہونے کی صورت میں، انسانوں کو دیر پا اور دُور رس نتائج بھگتتے پڑے ہیں۔ حکیم الاسلام خدا کی تقدیر و انتخاب سے اس کے سربراہ ہوئے اور خدائے قدیر نے انھیں اُن تمام خوبیوں سے نوازا جو اس الہامی ادارے کی کشتی کو صحیح سمت میں بہ سلامت کھینے کے لیے ناگزیر تھیں۔

باہمہ وبے ہمہ

انتظام وانصرام کے مشاغل اور ذمے داریاں، خواہ وہ کسی نوعیت کی ہوں اور کسی بھی ادارے، تنظیم یا جماعت کی ہوں، اپنے انجام دینے والوں کو علمی مشاغل سے دور کر کے، اُن کا مذاق علمی سلب کر لیتی ہیں، اسی طرح اُسفار کی کثرت، زیارتوں و ملاقاتوں اور چلت پھرت کی بہتات بھی انسان کو علمی و فکری کام کے لائق نہیں رہنے دیتی؛ لیکن مولانا قاری محمد طیب دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے کے عرصہ ساٹھ سال تک مہتمم بالشان مہتمم رہے اور سفر و آمد و رفت اُنھوں نے، اندرون ملک و بیرون ملک گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کثرت سے کی کہ شاید اُن کے زمانے میں ہندوستان میں، اُن سے زیادہ سفر کرنے والا کوئی نہ رہا ہوگا، اُن کی زندگی کا بیش تر حصہ سفر ہی میں گزر گیا، اس کے باوجود اُن کی علمی شادابی اور فکری زرخیزی میں کوئی کمی نہ آئی، اُن کی تقریریں اُن کے علم غریب اور غیر معمولی استخراج کی گواہ ہیں، ساتھ ہی اُنھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں مختلف اسلامی موضوعات پر لکھیں، جو زبان کی چاشنی کے ساتھ، اُن کی علمی بے پناہی اور فکری تخلیق کی بہترین مثال ہیں۔

یہ امتیاز حکیم الاسلام کے دیگر امتیازات کی طرح غور اور جائزے کا مقتضی ہے کہ وہ اپنے بے طرح مشغول اور کاموں سے بوجھل اوقات میں سے علمی تخلیقات کے لیے، کس طرح وقت بچا لیتے تھے اور مطالعہ اور غور و فکر کے لیے، کیسے گنجائش پیدا کر لیتے تھے۔ ایک ایسا باہمہ انسان بے ہمہ رہنے کا کون سا گر جانتا تھا؟ وہ واقعی غیر معمولی انسان تھے۔

کمال و یکتائی کے عناصر

حکیم الاسلام میں، خداے قادر و وہاب نے عظمت و عبقریت و کمال و یکتائی کے بہت سے عناصر جمع کر دیے تھے، وہ ہند میں سرمایہ ملت کے دورِ آخر کے سب سے

بڑے نگہبان اور اسلامی علوم و ثقافت و ایمانی میراث کے اولوالعزم و بیدار مغز پاسبان، بانی دارالعلوم دیوبند حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۳۸ھ/۱۸۳۲ء- ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے پوتے یعنی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حافظ محمد احمد (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء- ۱۳۳۷ھ/۱۹۲۸ء) کے بیٹے اور صدیقی النسب شیخ تھے؛ اس لیے انھوں نے علمی اور نسبی عظمت، وراثت میں پائی تھی، تقویٰ شعار و شب بیدار صلیحا کی صلیبی اولاد تھے؛ اس لیے اُن کی آہ سحرگاہی، نسلی پاکیزگی، سیرت و کردار کی طہارت اور شبانہ روز کی دعاؤں کا فیضان، اُن کے وجود کا حصہ اور اُن کے خیر کا اصلی عنصر تھا۔

وقت کے رازی و غزالی اُساتذہ

وہ وقت کے بخاری و مسلم اور رازی و غزالی کے شاگرد تھے۔ بڑے صغیر کے دورِ آخر کی تاریخ ایسے اُساتذہ باکمال، مردانِ مردم ساز اور علم و عمل کے یکساں طور پر جامع علما و رجالِ تربیت کی مثال سے یکسر خالی نظر آتی ہے۔

اُن کے اساتذہ گرامی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء- ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) (۱) محدثِ کبیر و علامہ العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء- ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء- ۱۳۳۷ھ/۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۹ء) علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ ثم الپاکستانی (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء- ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء- ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء) مولانا محمد اعجاز علی امر دہویؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء- ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء- ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) جیسے امام علم و فضل شامل ہیں۔

(۱) کیوں کہ آپ کی ہم اللہ حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن اور آپ کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد نے ہی کرائی تھی۔

پس مرگ زندہ

انھوں نے ترکیہ و احسان کے باب میں، اپنے گرامی قدر استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کی، حضرت کی وفات کے بعد اپنے استاذ حدیث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے رجوع ہوئے اور اُن سے تربیت حاصل کی، پھر حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں خلافت سے سرفراز ہوئے۔

علمی و عملی سرسبزی و شادابی کا ماحول

آپ نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف دین داری، علمی و عملی سرسبزی و شادابی، سادگی و قناعت پسندی کے ماحول کا دبیز سایہ، گھر سے تعلیم گاہ تک خیمہ زن نظر آیا؛ اس لیے اُن عظیم صفات اور غیر معمولی کمالات پر، پروان چڑھنے میں، آپ کا ماحول آپ کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوا، جن کے نتائج و اثرات سے بڑے صغیر کا چپہ چپہ بالخصوص اور عالم اسلام کا بڑا حصہ بالعموم تقریباً پون صدی تک بہرہ ور رہا۔ یہ سب کچھ خدا کی توفیق کی بات تھی وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ شَيْئًا هَيَّأْنَا لَهُ سُبُلَهُ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو معرض وجود میں لانا چاہتا ہے، تو وہ خود اُس کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ خود فرماتے ہیں:

چودھویں صدی ہجری کے شروع اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور ایک نئی تہذیب و تعلیم کا غلغلہ تھا۔ میری پیدائش میرے جد امجد حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے گھرانے میں ہوئی ہے، جو اپنے وقت میں علم و دین کے متحد تھے اور اُن کی زندگی سادہ، توکل پسندی، کم سے کم اسباب معیشت اور جفاکشی کا نمونہ تھی۔ اُن کی اہلیہ محترمہ میری دادی صاحبہ حضرت نانوتویؒ کے فیضانِ محبت اور رفاقت سے بہ راہِ راست مستفید تھیں۔ دادی صاحبہ اپنی عبادت و ریاضت، سخاوت و کشادہ دلی،

شعائرِ دین پر پختگی، نماز روزہ ذکر و شغل کی پابندی میں اپنی مثال آپ تھیں۔

میرے والد مرحوم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور اُن کی والدہ صاحبہ میری دادی مرحومہ کے زیرِ سایہ مجھے تعلیم و تربیت نصیب ہوئی۔ اُن کی ساری ضروریاتِ زندگی میں بے حد سادگی، مزاجوں میں انکساری اور تواضع کے ساتھ، اُن سیکڑوں طلبہ دارالعلوم کے لیے، جو ملک و بیرون ملک سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آتے اور دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے، میری دادی صاحبہ، والد مرحوم اور سارے گھرانے کی طرف سے، غیر معمولی شفقت اور ہر وقت اُن کی تعلیمی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن تھی، بس یہی ماحول تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی۔

والد مرحوم کا یہ ایک قصہ ضرور قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم کے ایک طالب علم نے دھلے ہوئے گیلے پٹڑے سکھانے کے لیے، دارالعلوم کی مسجد میں ڈالے۔ والد صاحب مرحوم نے دیکھا، تو خفا ہوئے اور ڈانٹ ڈپٹ کی؛ مگر بعد میں آپ نے جذبہِ ترحم سے اپنی سخت گیری پر جو صرف مسجد کی حرمت کے لیے تھی اتنے متأسف ہوئے کہ اُس طالب علم کو بلا کر اُس سے معذرت کی اور کئی ہفتے اپنے ساتھ کھانے میں شریک رکھا۔ یہ گویا طلبہ دارالعلوم کے حق میں، اُن کی پدرانہ شفقت کا ایک بے اختیارانہ جذبہ تھا۔ جو طلبہ میں معروف تھا۔

یہاں ایک واقعہ یہ بھی بیان کرنا مناسب ہوگا کہ میری دادی صاحبہ ایک دفعہ ”امروہہ“ ضلع ”مراد آباد“ تشریف لے گئیں۔ جہاں میرے دادا صاحب کے ممتاز شاگرد حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امر وہی (۱) تشریف فرما تھے، وہ ”امروہہ“ ہی کے باشندے تھے۔ حضرت مولانا امر وہی، مرحومہ دادی اماں کو اسٹیشن سے پاکی میں، اس شان سے گھر لائے کہ کہا روں کے ساتھ پاکی کو اٹھانے والوں میں خود بھی شریک تھے۔ یہ تھا اُس دور میں

(۱) پ: ۱۲۶ مطابق ۱۸۵۰ء، وفات: شب ۲۸-۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۷-۱۸ فروری ۱۹۱۲ء۔ (ایمی)

پس مرگ زندہ

اپنے اساتذہ اور اُن کے متعلقین کے ساتھ اور اُن کی اولاد کے ساتھ، شاگردوں کا ادب و احترام۔ میرا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے، جس میں دین کے سب ہی شعبوں، بالخصوص دینی تعلیم اور دین کے نادر طلبہ سے محبت و شفقت کو زندگی کا ایک بہت بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ میرے آبا و اجداد نے طلبہ علوم دینیہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اور یہاں تک کہ بعضوں کی شادی کی تقریبات بھی خود ہی انجام دیں۔ کتنے ہی علما و فضلاء ہیں جن کی مجالس نکاح، ہمارے گھر پر آراستہ ہوئیں۔ حضرت قبلہ مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی شادی بھی، میرے والد صاحب کے اہتمام سے ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد جامعہ قاسمیہ (۱)، خود دیوبند کے ایک اونچے خاندان کے فرد تھے، اُن کی تقریب شادی بھی میرے والد صاحبؒ نے کی۔ غرض کہ میرا گھرانہ علما و فضلاء عصر کا مؤثر رُو تھا۔ دوسرے مُجْتَہِدِ علما و فضلاء نے سال ہا سال تک میری وادی صاحبہ اور والدہ صاحبہ کے زیر سایہ، راحت و آرام سے وقت گزارا۔ تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانہ روزگار علما و فضلاء کرام سے استفادے کا موقع ملا۔

حفظ قرآن اور تجویدِ قراءت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ، فارسی میں مولانا محمد یٰسین صاحب (والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب) فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ اور علوم کتب و سنت میں علامہ دیگانہ روزگار الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانیؒ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ، مولانا محمد اعجاز علی امر ویؒ، مولانا رسول خان ہزارویؒ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین میرے اساتذہ رہے۔ اپنے رفقاء درس میں

(۱) پ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء، وفات ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء۔ (پجی)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

بڑے بڑے فضلاء کو جمع پاتا ہوں؛ لیکن جن رُفقا کے ساتھ تعلیمی دور کا اکثر وقت گزرا، اُن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی اور مولانا میرک شاہ کشمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات بھی اپنے علم و فضل میں بے نظیر ہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی، یہ سب حضرات میرے بعد کے فضلاء دارالعلوم میں سے ہیں۔ اساتذہ نے کس قدر غیر معمولی شفقت کا ثبوت دیا، اس کے بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حدیث شریف کے اُستاذِ اعلیٰ تھے، مگر بے حد نازک مزاج اور حساس طبیعت کے بزرگ تھے، طلبہ کی ذرا سی غفلت پر خفا ہو جاتے۔ ایک دفعہ طلبہ کی کسی غلطی پر خفا ہو کر، گھر میں بیٹھ گئے اور دارالعلوم میں سبق پڑھانا موقوف کر دیا۔ طلبہ پر استاذ کی خفگی کا بڑا اثر ہوا۔ مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی، اور طلبہ نے یہ طے کیا کہ حضرت مولانا عثمانی کے منانے کے لیے، اُن کے سامنے مجھے پیش کیا جائے۔ حال آں کہ میں خود بھی اُس سال حضرت کے ہاں ایک طالب علم ہی تھا۔

چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں جا کر عرض معروض اور طلبہ کی طرف سے ندامت کا اظہار کیا، تو حضرت مولانا نے خندہ پیشانی سے میری سفارش قبول فرمائی اور فوراً ہی تشریف لے آئے اور اسباق کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میرے ساتھ بزرگوں کی یہ شفقت و عنایت دیکھ کر، اکابر کی کشیدگیوں کو دور کرنے کے لیے، اساتذہ کی طرف سے مجھے ہی منتخب کیا جاتا تھا۔

وہ خدائے کریم کے فضلِ خاص سے غیر معمولی فطری صلاحیت کے ساتھ، اس عالم رنگ و بو میں آئے۔ علم و عمل کی دنیا میں، اُنھوں نے جو نئے نقش و نگار بنائے،

پس مرگ زندہ

علمی اکتسابات اور فکری حصول یا بیوں کے جو غیر معمولی نقش ثبت کیے، انفرادیت کا جو جادو جگایا، عظمت و افتخار کا جو تاج زرّیں اُن کے سر سجا، اسلامی شریعت کی روح، علوم کتاب و سنت پر بھرپور عبور اور اسلامی احکام و قوانین کے غیر معمولی استحضار سے کشیدہ نصف صدی سے زائد عرصے تک دنیا کے کونے کونے میں جو تقریریں کیں اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا جو بے مثال فریضہ انجام دیا، نسبتاً بہت کم سنی میں جس طرح دارالعلوم جیسے الہامی و الہی ادارے کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں دی گئی، پھر اُنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصے تک جس طرح اُس کی شان دار قیادت کی، ترقی کے بام عروج پر پہنچایا اور پوری دنیا میں اُس کا غلغلہ بلند ہوا اور قریہ بہ قریہ اور کوہِ کو اُس کی آواز پہنچی، یہ سب کچھ اور اس کے سوا بہت کچھ، اُن کی وہی صلاحیت اور خدا داد لیاقت کی روشن دلیل ہے۔

کم سنی میں منصبِ اہتمام سپرد کیے جانے کی وجہ

جس وقت اُنھیں نائبِ مہتمم کا عہدہ سپرد کیا گیا، اُس وقت اُن کی عمر صرف ۲۵-۲۶ سال تھی؛ کیوں کہ اُن کا سنہٴ پیدائش ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء ہے۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۲ء میں، دارالعلوم جیسے عظیم تاریخی بین الاقوامی ادارے کے اس اہم منصب کے لیے، اس نو عمر کو اُس دور میں کیوں ترجیح دی گئی، جو دارالعلوم کے اولین پانیوں اور سرپرستوں کے حوالے سے گویا ”ثم الذین یلونہم“ کا دور تھا۔

رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۳۰ھ میں اس سوال کے جواب کے لیے اُس وقت کے اعلیٰ علم و فضل و صلاح اَرکانِ شوریٰ کی حضرت حکیم الاسلام کو نائبِ مہتمم منتخب کیے جانے کے تعلق سے، تجویز کے مندرجہ ذیل متن پر نگاہ ڈال لینی کافی ہے:

”حضرت مہتمم صاحب (۱) اور نائبِ مہتمم صاحب (۲) ستمہما کی جو کچھ

(۱) یعنی حکیم الاسلام کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ احمد بن الامام محمد قاسم نانوتوی۔

(۲) یعنی حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی۔

خدمات ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات، بہ وجہ تقاضاے عمر و نیز بہ سبب امراض گوناگوں، ضعیف ہو گئے ہیں، اگرچہ خدمات دارالعلوم میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے ہیں؛ لیکن مجلس شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا احساس کر کے، ایسے وسائل پیدا کرے، جس میں دونوں حضرات کو خاص طور سے اپنے کاموں میں امداد ملے؛ لہذا ایک عہدہ نائب دوم کا تجویز کرنا ضروری ہے اور اس خدمت پر ایسا شخص تجویز کرنا ضروری ہوگا، جو صاحب علم، عالی خاندان اور با اثر ہو، دارالعلوم کے ساتھ سچی اور دلی ہم دردی مثل اُن ہر دو حضرات کے رکھتا ہو، پس میں اپنی رائے میں، اس عہدے کے لیے مولانا قاری محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو، تجویز کرتا ہوں۔ مولانا موصوف، نوجوان، صالح، صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسل بعد نسل سچی ودلی ہم دردی رکھنے والے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے فرزند اکبر ہیں، مولانا محمد طیب صاحب پوتے۔ حضرت مہتمم صاحب کے زمانے میں دارالعلوم کو جس قدر ترقیات آمدنی میں ہوئیں اور جس قدر درجات تعلیم اٹھا عاف ہوئے، جس قدر طلبہ کی تعداد بڑھی اور جس قدر ہندوستان سے باہر دور دراز اقالیم و ممالک میں، اس دارالعلوم کی قدر و منزلت قلوب میں عامۃً روز افزوں پیدا ہوئی، اس کے ثبوت میں، خود دارالعلوم ایک مجسم شہادت موجود ہے؛ لہذا تمام مسلمانانِ بھی خواہانِ دارالعلوم پر عموماً اور مجلس شوریٰ پر خصوصاً، روحانی طور سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُس خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ میں بہ شرط قابلیت و صلاحیت، نظام دارالعلوم تفویض کر دیا جائے؛ تاکہ وہ روحانی فیض جو ترقیات دارالعلوم کے لیے باطنی طور پر مُمد و معاون ہے، برابر جاری رہے۔

مجلس شوریٰ کی اسی تجویز کی رو سے، حکیم الاسلام کو ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں نائب مہتمم

بنایا گیا؛ اپنے علمی رجحان کی وجہ سے بہ جلد آپ نے اس انتظامی عہدے سے اپنے آپ کو تعلیمی و تدریسی شعبے میں منتقل کروالیا؛ لیکن اکابر دارالعلوم کے اصرار پر دوبارہ نیابتِ اہتمام پر واپس آنا پڑا۔ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۸ء تک اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ کے زیر نگرانی و مشورہ، ادارہ اہتمام کے انتظامی امور میں حصہ لیتے رہے۔

ممبرانِ مجلسِ شوریٰ کی منصبِ اہتمام کے تئیں

اُن کی غیر معمولی لیاقت کی شہادت

۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۹ء کے وسط میں مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد حکیم الاسلام کو قائم مقام مہتمم بنایا گیا اور کچھ ہی عرصے بعد جب اس بات کا اندازہ کر لیا گیا کہ اس منصبِ جلیل کو سنبھالنے کی صلاحیت اُن میں بہ درجہ اتم موجود ہے تو مجلسِ شوریٰ نے اپنے ذیل کے فیصلے کے ساتھ، انھیں مستقلاً اس پر فائز کر دیا:

”ہم سب ممبرانِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۸/شوال ۱۳۳۸ھ سے ۲۱/شوال ۱۳۳۸ھ تک دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معائنہ کیا، جو امور بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلسِ شوریٰ میں پیش کیے، اُن کا بلاور و رعایت تصفیہ کیا، ہم ممبرانِ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولوی قاری محمد طیب صاحب نے زمامِ اہتمام، اپنے ہاتھ میں لی ہے، اُن کے ہر طریقِ عمل سے صدق و اخلاص، نیت، حُب و بغض فی اللہ اور اداے حقوق و فرض شناسی میں، عزم قوی اور ثبات و استقلال بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے، واللہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ہم سب حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے قوی امید رکھتے ہیں کہ اس تھوڑی سی مدت میں، جن غویوں کا مہتمم صاحب سے ظہور ہوا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے اضعافاً مضاعفہ ظاہر ہوگا، ”وما ذلک علی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

اللہ بعزیز“ یہ الفاظ بے اختیار قلب سے نکلے ہیں، اس میں نہ تصنع کو دخل ہے اور نہ مہتمم صاحب کی خدمات کی داد ہے۔ (۱)

حکیم الاسلام کا طویل دورِ اہتمام اور اُس کے ثمرات و برکات

حکیم الاسلامؒ کا دورِ اہتمام نہ صرف سب سے زیادہ طویل تھا؛ بل کہ دارالعلوم کی ہمہ گیر ترقی، عالمی شہرت اور اُس کے ایک مدرسہ سے واقعی جامعہ بننے کا عمل، اُنھی کے سعادت مند اندہ دور میں پایہ انجام کو پہنچا۔ دارالعلوم کی اکثر قابل ذکر عمارتیں، اُنھی کے زمانے میں بنیں، دارالعلوم کے نئے نئے اور مفید سے مفید تر ضروری شعبے، اُنھی کے دور میں قائم ہوئے، اندرون ملک و بیرون ملک کے بے شمار ممتاز علما و فضلا و مشاہیر وقت اور سرکاری و غیر سرکاری سربراہوں کے وفود کی دارالعلوم میں آمد اور اُس کی دینی و علمی و مظہری ترقی سے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار، اُنھی کے دورِ اہتمام میں سب سے زیادہ روبہ عمل آیا۔ ملک کی آزادی اور اُس کے بعد ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے کشت و خون کا طویل و شدید الم ناک واقعہ، اُنھی کے زمانے میں پیش آیا اور آزادی سے پہلے کے حالات سے، یکسر مختلف آزادی کے بعد کے حالات سے، دارالعلوم کو ہم آہنگ کرنے اور اپنی سمیت کھنجر میں کسی تردد کے بغیر جو سفر رہنے کا یا رہا؛ اُنھی نے دیا اور اپنی علمی لیاقت، اسلامی ذہانت اور ہمہ گیر فکری صلاحیت کی وجہ سے اُس کی رفتارِ کار میں نہ صرف کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیا؛ بل کہ بہ ظاہر احوال پہلے سے زیادہ تازہ دم، تیز گامی، اور اولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھنے اور علوم شریعت اور خدمتِ دین و ملت کے میدان میں، نئے نئے نقش ہائے عمل ثبت کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس طویل دورِ اہتمام میں دارالعلوم کے لیے بہت سے نازک موڑ آئے، جن سے، حکیم الاسلامؒ اپنی علمی و فکری

(۱) رجسٹر تھاویہ مجلس شوریٰ ۱۳۳۰ھ، نیز روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۸ و ۱۳۳۹ھ ص: ۵۰۔

پس مرگ زندہ

و دینی بصیرت اور دور اندیشی کے ذریعے، بہ خوبی گزر گئے اور دارالعلوم کی رفتار عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

تاریخی صد سالہ اجلاس

حکیم الاسلام کی وفات سے دو تین سال قبل، آپ کی فکر و کوشش کے طفیل، دارالعلوم کا عظیم الشان صد سالہ اجلاس ۲۱-۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء (۳-۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ) کو ہوا، جو ہر اعتبار سے بے نظیر تھا، ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا اتنا بڑا دینی و علمی اجتماع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جس میں ہندوستان و پاکستان و بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے گوشے گوشے سے، علماء و فضلاء و مفکرین و دعاۃ اور اخبار نویس و ذرائع ابلاغ کے لوگ، اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک جگہ جمع ہوئے ہوں۔ اس عظیم مجمع میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے عظیم عالم و داعی و مفکر (جنہوں نے دنیا کا گوشہ گوشہ دیکھا اور دنیا کے بڑے سے بڑے مسلمانوں کے اجتماع کو جنہیں خطاب کرنے کا موقع ملا تھا) یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء - ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) نے اسی اجلاس کی تیسری نشست بہ روز شنبہ بہ وقت ۹ بجے صبح تا ۱:۳۰ ظہر ۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء (۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ھ) میں فرمایا تھا کہ میں نے میدانِ عرفات کے بعد دنیا میں مسلمانوں کا اتنا بڑا مجمع اپنی آنکھوں سے اب تک کہیں نہیں دیکھا ہے۔ سعودی عرب کے روزنامہ ”المدینہ“ اخبار کے نمائندے استاذ ابراہیم محمد سرسین نے اپنے اخبار میں ہندوستان سے واپسی کے بعد، شنبہ: ۱۹/۵/۱۴۰۰ھ کو اس اجلاس کے تعلق سے اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا:

”اس یونیورسٹی کے ساتھ میں نے لوگوں کے اکرام کا جو معاملہ دیکھا،

اس سے واقعتاً میرے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوئی، لوگوں کو اس ادارے سے جو ہم دردی ہے، محبت ہے، ہم آہنگی اور روحانی و قلبی تعلق ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی علمی ادارے کے حوالے سے مشکل ہی سے ملے گی۔

اس ادارے کے ساتھ ایسے جذباتی لگاؤ اور وارفتگی کی وجہ سے، میں نے

ایسا منظر دیکھا، جو میں نے صرف میدانِ عرفات میں رُخِ اکبر میں دیکھا تھا۔“

اس اجلاس کے لیے (۶۰۰۰۰۰) چھ لاکھ مربع فٹ میں پنڈال نصب کیا گیا تھا،

مختلف صوبوں اور ملکوں کے نمائندوں اور وفد کے لیے، اس کے علاوہ الگ الگ خیمے

نصب کیے گئے تھے، صرف اسٹیج کی پیمائش ۵۰ + ۱۵۰ فٹ تھی۔ اجلاس کی تیاری اور

اُس کو بہ خیر و خوبی انجام تک پہنچانے کے لیے ماہرین اور مجتہدین و اساتذہ دارالعلوم کی ۲۱

کمیشیاں تشکیل دی گئی تھیں۔

ہفتہ عشرہ تک دیوبند کا اسٹیشن عملاً صرف مسلمان مسافروں ہی کے لیے مخصوص

رہا، ایسا لگتا تھا کہ پورے برصغیر کا رُخ، صرف قصبہ دیوبند کی طرف ہے۔ ملک کے اکثر

اسٹیشنوں، بس اڈوں اور پبلک ٹرانسپورٹ کے مرکزوں پر صرف دیوبند آنے والے

مسلمانوں اور علما کے لباس میں نظر آنے والے انسانوں کی بھیڑ نظر آتی تھی، ہندوستان کی

حکومت نے ملک کے مختلف شہروں سے دیوبند اور دیوبند سے اُن شہروں کے لیے، بہت

سی اسپیشل گاڑیاں چلائیں۔ دنیا کے اسلامی ملکوں بالخصوص عربی ملکوں کی حکومتوں نے،

اس بے مثال تاریخی اسلامی جشن کے لیے اپنے وفد بھیجے، بالخصوص سعودی عرب، مصر،

کویت، عراق، اردن، عمان اور پاکستان کی حکومتوں نے۔

ہندوستان کے اُس وقت کے صدر جمہوریہ ”نیلیم سنجیواریڈی“ (۱۹۱۳ء — ۱۹۹۶ء)

نے پرجوش پیغام بھیجا، اُس وقت کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی (۱۹۱۷ء — ۱۹۸۴ء)

بہ ذات خود اس اجلاس میں حاضر ہوئیں اور جمعہ ۲۱ مارچ ۱۹۸۰ء (۳ جمادی الاولیٰ

۱۴۰۰ھ) کو اُس کے افتتاحی اجلاس کو خطاب بھی کیا، وہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع

کے، جس میں کم از کم ۱۵-۲۰ لاکھ مسلمان شریک تھے، پرسکون و پروقار رہنے پر، بہت

حیرت زدہ تھیں۔ ہندوستان کے محکمہ ڈاک نے اس موقع سے دارالعلوم کی مرکزی عمارت

کی تصویر والا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ ہندوستان کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے

علاوہ عرب ممالک کے اخبار و رسائل کے اہم نمائندے بھی رپورٹنگ کے لیے موجود رہے، جن میں ”البلاغ“، ”عرب ٹائمز“، ”الوعی الاسلامی“، کویت، ”اخبار العالم الاسلامی“ مکہ مکرمہ، ”صوت الشرق“ و رسالہ ”منبر الاسلام“ قاہرہ، ”الشریعۃ“ اردن، ”المدینہ“ سعودی عرب، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں تعینات عرب ممالک کے اکثر سفرانے اجلاس میں شرکت کی اور اپنے اپنے ملکوں کے وفد کی رہنمائی کی۔

اس ملک کے مسلمان برسوں تک اس اجلاس کا مزے لے لے کر تذکرہ کرتے رہے، ہر اس آدمی کو اس میں کسی وجہ سے شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس رہا، جو کسی درجے میں بھی اسلامی شعور سے، بہرہ ور تھا۔ ہندی مسلمانوں کے لیے بلاشبہ اس اجلاس کے دن یادگار اور تاریخی تھے، جن کی یادوں کی شمع اب تک دیکھنے والوں کے دلوں میں روشن ہے۔

صد سالہ اجلاس کے بعد اختلاف کا ماحول

اور حکیم الاسلام کا کرب و الم

بدقسمتی سے شاید دارالعلوم کو یہ اجلاس راس نہ آیا، یا شاید اُسے کسی کی نظر لگ گئی، چنانچہ اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد، بعض مرئی و غیر مرئی وجوہ و اسباب کی وجہ سے، دارالعلوم میں شورش، خلفشار اور شدید اختلاف کا ماحول بن گیا، جس سے سن رسیدہ و نرم و گرم چشیدہ و جہاں دیدہ مہتمم حضرت حکیم الاسلام کا نہ صرف دل بُری طرح شکستہ ہو گیا؛ بل کہ اُن کا پورا وجود اندر سے بُری طرح ہموار ہو گیا، اپنے جدا مجد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم اور اُن کے رفقا کے بوئے ہوئے پودے کو اپنی پوری زندگی خونِ جگر سے سیرنچا تھا، اب وہ اپنے بڑھاپے کی زندگی میں، جو سن و سال کے اُن گنت واقعات و حادثات سے ویسے ہی بوچھل ہو چکی تھی، اُس کے خدانہ خواستہ برگ و بار لانے کے عمل کے (۱) محدود

(۱) جیسا کہ اس طرح کے اختلاف کے اداروں اور جماعتوں میں رونما ہونے کے وقت عام طور پر اس کا خطرہ رہتا ہے۔ دارالعلوم کے مشائخ و اکابر کے اخلاص بے پایاں کی وجہ سے الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی اور وہ اس طوفان کو بھی اسی طرح بے خیر و خوبی صہیل گیا، جس طرح ماضی میں کی طوفانوں سے گزر گیا تھا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

ہو جانے کے ماحول کو، رو بہ عمل آتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اُن کا دل بُری طرح زخمی تھا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ اس ادارے کا انھوں نے جشن بہاراں منایا اور ابھی اُس کی گردِ بیٹھی بھی نہ تھی کہ اختلاف کی آندھی نے آگھیرا۔ اپنے پچاس ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں انھوں نے بڑے بڑے نازک حالات دیکھے اور کٹھن سے کٹھن مرحلوں سے گزرے، اپنے حسن تدبیر اور وہی حکمتِ عملی سے اُن سے بہ حسن و خوبی پار اُتر گئے اور دارالعلوم کو کسی جھیلے کے نتائج بد کا شکار نہ ہونے دیا؛ لیکن صد سالہ اجلاس کے معا بعد، جو باہمی اختلاف کا طوفان اُٹھا، وہ نہ صرف پوری جماعت کے لیے سوہانِ روح بنا؛ بل کہ حضرت قاری محمد طیبؒ کے لیے، موت سے پہلے لاتعداد موت کا باعث بنا۔

صبا سے ہر سحر مجھ کو، لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گل چیں نے، یہ کس بلبل کا دل توڑا

(سودا)

انھوں نے اُس وقت کی مجلسِ شوریٰ کے سب سے نمایاں رکن عالمِ جلیل وداعی اِلی اللہ مولانا محمد منظور نعمانی (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء - ۱۳۷۱ھ/۱۹۹۷ء) کے نام جو کچھ اُس وقت لکھا تھا، اُس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا دل اس دل خراش واقعے سے کس طرح چھلنی ہو گیا تھا، اُس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انھیں دارالعلوم سے کیسا عشق تھا؛ بل کہ اُن کے لیے سرمایہٴ حیات تھا اور وہ اس ناگفتہ بہ واقعے سے کتنے درد و کرب میں مبتلا تھے:

محترم المقام مولانا محمد منظور نعمانی! زید مجدکم
السلام علیکم

گمراہ نامہ مؤرخہ ۲۸ اپریل ۱۹۸۳ء باعثِ شرف اور موجبِ تسلی

ہوا۔ یہ میرے لیے روح کی غذا اور صحتِ مندی کی علامت ہے، آج کا دور کرب کا دور ہے، اخلاقی انتشارِ عالمی پینے پر بڑھ رہا ہے، ۹۹ فی صد غلط فہمیاں چھائی ہوئی ہیں اور ایک فی صد حقیقت پر حاوی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند

صرف ایک مدرسہ نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبے میں، اُمت کی راہ نمائی اور عوام اُمت کی خدمت؛ اُس کا نصب العین رہا ہے۔ آج اُس کا کیا حال ہے؟ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئلہ ہیں۔ یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، میں دہلی میں پنت ہسپتال میں رہا، اب دیوبند میں ہوں۔ میرا کھانا پینا صرف دوا ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی مرض نہیں اور حال یہ ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں۔ نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا؛ بل کہ غم دارالعلوم کا ہے۔ جماعت جو ایک سو سولہ (۱۱۶) برس تک اوروں کے لیے ہدایت، تقویٰ اور توحید کی علامت تھی، بکھر کر رہ گئی۔ یہی میری بیماری ہے، ویسے یہ عمر کا تقاضا ہے۔ اس عالم بے چارگی میں آپ کا مکتوب گرامی ملا، جسے میں اپنے لیے اور دارالعلوم کے لیے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں۔ آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی خطا وار نہیں سمجھا کہ اُن کی زبان پر معافی کی بات آئے، معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں، نہ معافی کا ہے؛ بل کہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے۔ ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگیں اور کچھ مانگیں (اللہ دعا مانگیں)۔ ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جواب دہی سے نجات ملے۔

من و تو ہر دو خولجہ تا شایم

بندہ بارگاہ سلطانی

اُس دن سے، جس نے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو یہ دن دکھائے، میں نے تین الفاظ اختیار کر لیے ہیں: السُّكُوتُ وَالصَّبْرُ وَالْغِنَى انھی تینوں پر اب بھی قائم ہوں۔ زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ، جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

فیصلے ایک راے سے ہوتے تھے، پھر بہ حال ہو جائے۔ آں محترم سے دعا کی
درخواست ہے۔ وَالْأَمْرُ لِلَّهِ الْكَرِيمِ۔
والسلام

محمد طیب غفرلہ

۱۹۸۳/۵/۷ء

اختلافِ دارالعلوم اور بالبصیرت علما کی راے

برصغیر کے چوٹی کے علما و مفکرین، جنہیں ان اختلافات سے دلی دکھ ہوا، اُن میں سے ہر ایک کی دلی آرزو تھی کہ کاش یہ دل گداز واقعہ، قاری محمد طیبؒ کی اس بڑھاپے کی عمر میں رونمانہ ہوا ہوتا، اُن کی وفات (جو اس واقعے کے دوران ہی دو ایک سال کے اندر ہی واقع ہو گئی اور کہنا چاہیے کہ شاید یہی واقعہ، اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا) کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا؛ لیکن مُقَدَّر رات کو کسی تدبیر سے ٹالا نہیں جاسکتا تھا، چنانچہ یہ واقعہ جاں گداز، حکیم الاسلامؒ کی آخری زندگی میں پیش آ کر رہا اور اُنہوں نے ایسی تلخ کامیاں دیکھیں، جن سے اُنہیں اپنی زندگی میں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اُن کے لیے، زیادہ دُکھ کی بات یہ تھی کہ وہ اس جھگڑے میں اصلاً بالکل ہی فریق نہ تھے، کیوں کہ جھگڑا مٹنا اُن کی فطرت کے یکسر خلاف تھا۔ مجھ سے کئی ثقہ عالم نے یہ بات کہی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے کئی بار اپنی جماعت کے لوگوں سے فرمایا کہ بھئی! اگر تمہیں لڑنا ہے تو قائد اور سپہ سالار بدل لو، میں دارالعلوم کے حوالے سے کسی اختلافی جھگڑے کی قیادت کا کسی طرح بھی اہل تھا نہ ہوں۔

الْبَلَايَا لِلْمُجْرِمِينَ عُقُوبَاتٌ، وَلِلْأَبْرَارِ مَكْفِرَاتٌ، وَلِلْمُقَرَّبِينَ دَرَجَاتٌ (مصائب گنہ گاروں کے لیے سزا، نیکوں کے لیے گناہوں کا کفارہ اور مقربین بارگاہِ الہی کے لیے رفع درجات کا ذریعہ ہوتے ہیں) کی روشنی میں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انسان ہونے کی وجہ سے حکیم الاسلامؒ سے جو خطائیں ہوئی ہوں گی، اُن کی تکفیر اور اُن کے درجات کی بلندی کے لیے، ربِّ کریم نے، ان روح فرسا واقعات سے اُنہیں

پس مرگ زندہ

گزارا؛ تاکہ وہاں اُنھیں اپنی کسی تقصیر کا کوئی مشکل حساب نہ دینا پڑے اور اپنے رب کی اعلیٰ جنت کے مکین بنیں، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَاَرْحَمْهُ وَاَرْفَعْ دَرَجَتَهُ فِيْ جَنَّتِكَ .

قاری صاحبؒ کی وفات کے سال با سال بعد تاخیر سے سہی، شیخ الاسلام حضرت مدنی کے جگر گوشہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور حکیم الاسلام کے صاحب زادہ گرامی قدر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ نے بہت اچھا کیا کہ، دارالعلوم کی تاریخ پر بدنام داغ کی حیثیت رکھنے والے اس اختلاف کو از خود ختم کر لیا اور نہ صرف یہ دونوں؛ بل کہ دونوں کی جماعتوں، اہل خاندان اور رفقاء کے کار نے بھی ایک دوسرے کے حوالے سے اپنا دل صاف کر لیا اور آخرت تک دلوں کی کدورت کو دراز ہونے نہیں دیا۔ فَجَزَاهُمَا اللّٰهُ خَيْرًا۔

حکیم الاسلام اور دفاعِ دین و ملت

قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اُن تمام صفات سے بہرہ ور کیا تھا، جن سے دین کی ترجمانی، اسلام کے دفاع، کتاب و سنت کی عملی و علمی شرح اور امت مسلمہ ہندوستان کی علمی و فکری و دینی رہ نمائی کے لیے، وقت کا اُن کے ایسا مطلوبہ عالم تشکیل پاسکتا تھا۔ وہ انتہائی وجیبہ اشکل، روشن رو، مردانہ حسن کی مثال، نرم خو، خوش خصال، کریم النفس، حلیم و متواضع، خندہ رو، کشادہ نفس اور پرکشش مؤنث صورت کے حامل ہونے کے ساتھ، کتاب و سنت کے علوم پر نہ صرف بصیرت مندانہ گہری وہمہ گیر نظر رکھتے تھے؛ بل کہ علمی استحضار، فکری بیداری، استنتاجی صلاحیت اور شریعت کے اصول و نصوص کو عصر حاضر کے حالات و واقعات پر منطبق کرنے کا اپنے اکابر و مشائخ کی طرح بے نظیر کمال رکھتے تھے۔ امام غزالیؒ (ابو حامد محمد ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء - ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (احمد بن عبدالرحیم ۱۱۱۳ھ / ۱۷۰۳ء - ۶۱ھ / ۱۷۶۲ء) اور اپنے جد امجد امام محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۲۸ھ / ۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) کی کتابوں اور اسرار شریعت کے حوالے سے اُن کے افکار و خیالات کو کما حقہ پی چکے تھے، اسی کے ساتھ وہ بڑے ذہین، ذکی الحس، حاضر

جواب، ظریف الطبع تھے۔ خدائے حکیم و وہاب نے انھیں شیریں بیانی، ترمیب مضامین اور مشکل سے مشکل مضمون کو عام فہم اور بڑے خوب صورت انداز میں پیش کرنے کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ وہ جس جگہ ہوتے، اُن کی معصومیت اور علم و عمل کی جامع پرکشش شخصیت دعوتِ نظارہ دیتی اور لوگ ٹوٹ کے اُن سے محبت کرتے، ایسا لگتا تھا کہ خلقِ خدا کے دل، اُن کے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں، لوگ اُن سے صرف محبت کرتے تھے اور اُن سے محبت کے لیے اپنے کو مجبور پاتے تھے، اُن کو دیکھنے اور سننے اور اُن سے ملنے والا شاید ہی کوئی ”عجوبہ“ انسان رہا ہوگا، جس کا دل اُن کی طرف مائل نہ ہوا ہوگا۔ زندگی کے اُن کے سارے رویوں میں محبوبیت تھی، وہ ہر جگہ مرکزِ توجہ ہوتے اور لوگ انھیں ایک نظر دیکھ لینے کے لیے بے تاب نظر آتے۔

اسی کے ساتھ وہ عالی نسب صدیقی خاندان کے چشم و چراغ تھے، وہ نصف صدی سے زائد عرصے یعنی تقریباً ساٹھ سال تک برصغیر کے سب سے بڑے اور سب سے بابرکت اور تقویٰ اساس ادارہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے، جو اس وسیع تردیاریں جسم اسلامی میں دھڑکتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کو اللہ نے اس دیار میں جو مقبولیت و محبوبیت و مرجعیت عطا کی ہے، اپنی سی ساری کوششوں کے باوجود کوئی دینی ادارہ اُس کو، اس کے حوالے سے تادم تحریر چیلنج نہیں کر سکا؛ کیوں کہ اُس کو یہ سعادت خدائے بخشنہ کی بخشی ہوئی ہے، اُس کے اپنے ”زورِ بازو“ کا نتیجہ نہیں۔

قاری محمد طیبؒ کو دیکھ کر دل گواہی دیتا تھا کہ اس غیر معمولی ادارے کے لیے، اسی طرح کا غیر معمولی مہتمم اور ذمے دار اعلیٰ ہونا چاہیے تھا، گویا وہ اس ادارے کے لیے خدائی انتخاب تھے، اسی لیے پورے برصغیر میں جہاں بھی وہ جاتے، لگتا تھا کہ پورا دارالعلوم وہاں آگیا ہے۔ برصغیر میں جہاں بھی صرف ”مہتمم صاحب“ کہا جاتا تھا، تو از خود ہن مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ہی کی طرف جاتا تھا، گویا اُن کا دوسرا عرفی نام ”مہتمم صاحب“ ہی ہو گیا تھا۔ جیسے پورے برصغیر میں سیکڑوں دارالعلوموں کے

پس مرگ زندہ

بچ اگر صرف ”دارالعلوم“ استعمال کیا جائے، تو ہر کسی کا ذہن ”دارالعلوم دیوبند“ ہی کی طرف جاتا ہے۔ میرے پاس ”الداعی“ کی بہت سی ڈاک ایسی آئی، جس پر صرف ”دارالعلوم انڈیا“ لکھا ہوا تھا اور وہ مجھے مل گئی۔

برصغیر میں اگر کوئی دینی ادارہ مسلمانوں کے دل و نگاہ کے لیے واقعی مرکزِ توجہ ہے، تو وہ دارالعلوم دیوبند ہی ہے کہ اگر اُن پر کوئی دینی و اجتماعی افتاد پڑے؛ اُن کے شعائر پر عمل کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ کھڑی کی جائے، یا کوئی حل طلب پیچیدہ دینی مسئلہ آن کھڑا ہو، تو ہندی مسلمان سب سے پہلے دارالعلوم کی طرف دیکھتا ہے اور ہر نازک وقت میں اُسی کا سہارا لیتا ہے اور دین و عقیدہ و عبادت و احکام پر آنے والی کسی بھی آنچ کوفر و کرنے کے لیے، وہ دفعتاً اُسی سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔

دفاعِ دین کے تئیں دارالعلوم کا دیرینہ کردار

انگریزی استعمار کے دور میں بھی نومبر ۱۹۱۷ء (صفر ۱۳۳۶ھ) میں جب یہ خطرہ درپیش تھا کہ استعماری حکومت مسلمانوں کے عائلی قانون میں تغیر و تبدل کا ارادہ رکھتی ہے، تو اُس وقت دارالعلوم دیوبند نے، دس دفعات پر مشتمل ایک میمورنڈم تیار کیا، جو اُس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد (بن امام مولانا محمد قاسم نانوتوی) ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء - ۱۳۳۷ھ/۱۹۲۸ء والد ماجد حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کی سربراہی میں ایک موقر وفد دہلی میں برطانوی وزیر ہندوستان سے ملا۔ اس میمورنڈم میں واضح کیا گیا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل سے، برطانوی گورنمنٹ چھیڑ چھاڑ نہ کرے؛ کیوں کہ مسلمانوں کو یہ کسی طرح بھی گوارا نہ ہوگا۔ اس میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلم پرسنل لا کو برپا کرنے کے لیے عہدہ قضا قائم کیا جائے، نیز مسلمانوں کے مذہبی شعائر: مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہی اداروں کے تحفظ کے لیے، شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے۔ ان مطالبات پر دارالعلوم نے، اس دور کے ہر فکر و خیال کے پانچ سو علما کے توشیحی

۱۹۲۹ء (۱۳۳۸ھ) میں عہد استعمار میں مسلم اوقاف کا مسئلہ اٹھا جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک حصہ تھا، برطانوی استعماری حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے، اُس وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی نگرانی میں وقف بل کے مسودے پر، شریعت کی روشنی میں تنقید کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے پیش کردہ اشکالات کا تحریری حل پیش کیا گیا اور ایک تحریر بہ عنوان ”الانصاف فی قانون الاوقاف“ مرتب کی گئی، جس پر سارے لائق ذکر علما کے دستخط ثبت ہوئے اور اس سلسلے میں ساری ممکنہ مساعی عمل میں لائی گئیں۔

۱۹۴۷ء (۱۳۶۶ھ) سے کچھ پہلے، علماے دیوبند کی طرف سے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک کتاب ”الحيلة الناجزة“ شائع کی، جس میں ظالم خاوندوں کی پسی ہوئی بے بس عورتوں کی گلو خلاصی کی شرعی صورتیں پیش کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند نے، علما کی ایک کمیٹی قائم کی، جس نے اُن ہی شرعی اصولوں کی روشنی میں فیصلے کیے اور سیکڑوں عورتوں کو ظالم شوہروں سے رہائی ملی۔

۱۹۴۷ء (۱۳۶۶ھ) میں آزادی وطن کے کچھ ہی دنوں بعد، حکومت کی طرف سے تنسیخ زمین داری کا مسئلہ اٹھا، جس کا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑتا تھا، جو مسلم پرسنل لا ہی کا بنیادی جزو تھا، اس سلسلے میں مسلمانوں کا ایک وفد، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیادت میں مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء-۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سے ملا، دوبارہ یہی وفد لکھنؤ میں یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند ولہ پنتھ (۱۸۸۷ء-۱۹۶۱ء) سے ملا اور یوپی کونسل میں وزرا کی موجودگی میں اوقاف کے چیرمین کے ساتھ اس مسئلے پر غور و خوض ہوا۔ الغرض دارالعلوم اور اُس کے اکابر نے، ہمیشہ دین و ملت کی بھلائی کے لیے، اس ملک میں وہ سب کچھ کیا جو اُس کے بس میں تھا۔

قاری محمد طیبؒ کے سر

عظمت و تقدس کے تاج کے سجنے کی ایک بڑی وجہ

اس عظیم ادارے کا اتنے عرصے تک لیاقت و استحقاق کے ساتھ انتظام و انصرام کی باگ ڈور سنبھالنے کی وجہ سے بھی قاری محمد طیب کو وہ عزت و احترام ملا، جو کسی عالم دین کو نہ مل سکا۔ دارالعلوم کے سر پر، عظمت و تقدس کا جو تاج سجا ہوا ہے، اُسی کی وجہ سے، اُس کے ہر اُستاد و ملازم کو بے مثال احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور محض اُس کی طرف انتساب کی وجہ سے بھی، کسی بھی فرد کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے، خواہ وہ اپنی جگہ پر بے استعداد اور معمولی انسان، ہی کیوں نہ ہو۔ اب اگر قاری محمد طیب جیسا آدمی، اُس کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہو تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے لیے عزت و احترام کا کیسا جذبہ مَوْجُزَن رہا ہوگا۔

اسی لیے عہدے، مناصب اور اعزازات اُن کے قدموں میں از خود آکر گرتے رہے، اُنھوں نے یا اُن کے لوگوں نے اُن کے حصول کے لیے خواہش کی نہ کوشش، کیوں کہ اُن کے حیات ہوتے ہوئے کسی بڑے دینی منصب کے لیے، از خود سمجھوں کی نظریں اُنھی کی طرف اٹھتی تھیں، وہ گویا ہر دینی منصب اور عہدے کے لیے بنے بنائے صدر تھے۔

قاری محمد طیب صاحبؒ کو اس برگزیدہ ادارے کے اس عظیم منصب پر فائز ہونے کا ہمیشہ ذمے دارانہ احساس رہا، چنانچہ اُنھوں نے خدا کی توفیق سے، ہمیشہ اُن ذمے داریوں سے بہ خوبی اور ثمر آور طور پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی، جو اُن پر دارالعلوم جیسے کعبہ مقصود ادارے کا مہتمم ہونے کی وجہ سے عائد ہوتی تھیں۔ اُنھوں نے ”اسلام اور مسلمانوں کے دفاع“ کے ہمہ گیر محاذ پر قائدانہ رول ادا کیا؛ کیوں کہ اُن کے اسلاف و مشائخ بھی اس حساس محاذ کے غیرت مند سپاہی و قائد تھے، انگریزی سامراج کے خلاف اُن کے سر بہ کف میدان میں اُترنے کے طفیل ہی ہمارا ملک، اُس کی غلامی سے آزاد ہوا، نیز اُنھوں نے باطل فرقوں اور

تخریب پسند تحریکوں اور دعوتوں کے خلاف بھی کام یابی سے محاذ چھیڑا اور اُس کو جیتا۔ عیسائی مبلغین سے لوہا لیا، قادیانیت کو کفر ثابت کیا اور برصغیر میں، اُس کی تلبیسی دعوت کا پردہ چاک کیا اور یہاں مسلمانوں کو مسلمان باقی رہنے کی کامیاب تدبیریں کیں۔

مولانا قاری محمد طیبؒ نے، اپنے اساتذہ کبار کے ساتھ، ان باطل فرقوں کے تعاقب میں اپنی نوجوانی سے حصّہ بنایا اور بعد کے دور میں ہندو احیاء پرستی کے خطرات سمیت اہل بدعت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والی ہر انتہا پسندی کے توڑ کے لیے، قائدانہ کردار ادا کیا۔ اُن کی زبان اور علمی بے پناہی، دونوں اُن کی پوری زندگی میں صحیح اسلام کے لیے ڈھال ثابت ہوئیں، وہ سچے دین کی سچی تعبیر کے حوالے سے؛ اپنی مثال آپ تھے، اس سلسلے میں اُن کا اندازِ کار بھی اُن کی ذات ہی کی طرح بے مثال اور نرالا تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت کی اس طرح تشریح کرتے تھے کہ اُس کے کسی شدید سے شدید معاند کو بھی، اُس سے کوئی دشمنی نہ ہوتی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف کوئی منفی جذبہ، اُن کے دل میں بیدار ہوتا تھا، وہ ”کَلِمَا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِمْ“ کا بہترین نمونہ تھے، قول و فعل میں حکمتِ عملی پر کاربندی، اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی، انھوں نے اپنے کسی کردار سے، مسلمانوں کے لیے لاشعوری طور پر بھی کبھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا اور نہ مخالفینِ اسلام و مسلمین کو اس کا کوئی موقع بہم پہنچایا۔ وہ اس حوالے سے بھی سیرتِ نبوی پر کاربندی کا قابلِ تقلید نمونہ تھے۔ وہ کبھی مشتعل ہوتے تھے نہ کسی کو مشتعل ہونے کا موقع دیتے تھے، وہ پھول کی طرح کھلتے اور مہکتے تھے، خوشبو کی طرح پاکیزگی بکھیرتے تھے، بلبل کی طرح چمکتے تھے۔ دھیمپن، سنجیدگی، ہر گوشہ زندگی میں عالمانہ رویہ اور صالحانہ انکسار، اُن کی ذات و صفات کا طرّہ امتیاز تھا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی جدّ و جہد

آزادی کے بعد کے ہندوستان میں، اسلامی شرائع کی حفاظت کا مسئلہ انگریزوں

کے دور سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ثابت ہوا، اس حوالے سے دارالعلوم کے اکابر و مشائخ نے اپنا قائدانہ کردار اُسی طرح ادا کیا، جس طرح استعماری عزائم کے خلاف ادا کیا تھا۔ حالات و واقعات نے اندازِ کار کو بدل دینے کی دعوت دی، تو وہ نئی صورتِ حال سے بڑی چابک دستی سے بہ جلد تمام ہم آہنگ ہو گئے۔ اس حوالے سے اپنے اساتذہ و اسلاف کے بعد قاری محمد طیبؒ کا کردار بڑا نمایاں اور ممتاز رہا۔

اس ملک میں آزادی کے بعد سے ہندو اُجیا پرستی اور سرکاری وغیر سرکاری تعصب و تنگ نظری کے ہاتھوں مسلمانوں کو اپنی دینی شناخت کے ساتھ چینے کے لیے، بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ اُن کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہر سمنٹ سے کھڑی کی جانی رہی ہیں، جس کا سلسلہ دن گزرنے کے ساتھ اور شدت اختیار کرتا رہا ہے۔ اتنے مسائل پیدا کیے جاتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر کے لیے کوئی موقع نہیں ملا، وہ ہمیشہ اُن مسائل سے نمٹنے ہی میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بہ طورِ خاص مسلمانوں کے پرسنل لاپرواہی و رشور سے حملہ کیا گیا۔ ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء میں شاہ بانو کیس کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور مسلمانوں کے نام نہاد مغرب زدہ روشن خیال دانشوروں کے ذریعے، یہ شور مچوایا گیا کہ اسلامی شریعت عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، تو اُس کا علمی جائزہ لینے اور اُس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لیے، حضراتِ اساتذہ و اربابِ افتادِ دارالعلوم دیوبند کی ایک مسلم پرسنل لاکمیٹی بنائی گئی؛ تاکہ وہ اُن مسائل کے سلسلے میں مدلل دفاع کا فریضہ انجام دے، چنانچہ کمیٹی نے خاطر خواہ طریق پر اپنا کام انجام دیا، اس سلسلے میں اولاً حضرت حکیم الاسلامؒ نے ممتاز فضلاء دیوبند کا ایک اجتماع ۱۴ مارچ ۱۹۷۲ء (۲۶ صفر ۱۳۹۲ھ) کو دارالعلوم میں طلب کیا، جس میں ملک کے دوسرے دانشوروں کو بھی دعوت دی گئی، وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے کے بارے میں ہر چند حضراتِ علمائے کرام نے بلاشبہ کافی توجہ فرمائی، مضامین و مقالات اور رسائل شائع کیے؛ لیکن یہ ساری جدوجہد انفرادی اور شخصی

مالیگاؤ نوی، حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب امارت شریعہ بہار (۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء - ۱۳۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء) جناب مولانا برہان الدین صاحب مدظلہ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء - ۰۰۰۰/۰۰۰۰) اور اراکین مسلم پرسنل لاکمیٹی دارالعلوم دیوبند نے شرکت کر کے بحث میں حصہ لیا۔

اس جلسے میں شریک علما و اکابر نے مطبوعہ سوال نامے کے جوابات سننے کے بعد جو دارالعلوم کے اساتذہ اور فضلا نے مرتب کیے تھے اور جن کے لیے حضرت حکیم الاسلام نے اُن کے پاس چند رہنما اصول پہلے ہی سے ارسال کر دیے تھے، سب نے اس پر اظہارِ مسرت کیا کہ وقت کے ان اہم ترین مسائل پر علما کے جوابات محققانہ اور عقلی و نقلی دلائل سے مزین ہیں، جن سے مسائل زیر بحث میں اسلامی موقف پورے طرح کھل کر سامنے آ گیا ہے اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ شریعت اسلامی کے ناقابل تبدیل اصول، ہر دور کے مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسانیت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

تیاری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مجوزہ عام اجتماع کی تاریخ اور مقام طے کرنے کے لیے پانچ افراد کے ایک وفد نے، جو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، مولانا سید منت اللہ رحمانی (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء - ۱۳۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۲۶ء - ۰۰۰۰/۰۰۰۰) پر مشتمل تھا، بمبئی (اب ممبئی) کا دورہ کیا، بمبئی کے مخلص اور حوصلہ مند مسلمانوں نے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اس کا ذمہ لیا کہ یہ آل انڈیا کنونشن بمبئی میں منعقد ہو، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاکمیٹی کے لیے ۲۰، ۲۱، ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ (۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء) کی تاریخیں طے ہو گئیں، مقصد کی اہمیت کے پیش نظر یہ مناسب اور مفید سمجھا گیا کہ ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے اکابر اور معروف و مسلم تنظیموں کے سربراہوں کی طرف سے مشترکہ دعوت نامہ جاری کیا جائے، چنانچہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء = ۲۰-۲۱ ذی قعدہ

۱۳۹۲ھ کو یہ عظیم کنونشن، اپنی غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ، بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں نے حصہ لیا۔

مسلمانان ہند کے مختلف مکاتب فکر کے اجتماع اور نمائندگی کے لحاظ سے یہ کنونشن جس قدر غیر معمولی تھا، اُسی حد تک خدا تعالیٰ نے اُسے کامیاب بھی کیا، کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی متفقہ رائے سے، جن میں سنی، شیعہ، مہدوی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے علاوہ، دوسری سیاسی غیر سیاسی جماعتوں کے رہنما موجود تھے، حکیم الاسلام قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم کو کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا، ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مذہبی مکاتب فکر اور طبقات میں سے کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں رہا، جس کے اکابر علما و زعماء کنونشن کے پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو گئے ہوں، اس کنونشن نے اور دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے مسلمانوں نے، متحدہ آواز کے ساتھ اپنے ریزولوشن کے ذریعے اعلان کر دیا کہ وہ کسی حالت میں بھی، مسلم پرسنل لا میں تغیر و تبدل کو گوارا نہیں کر سکتے، یہ شریعت اسلامی کا ایک حصہ ہے، اس متحدہ آواز کا اثر ملک اور حکومت دونوں پر پڑا اور اس ذریعے سے ہندوستان کے تمام مسلمان، وحدت کلمہ کی بنا پر متحد ہو گئے، جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک بے مثال صورت حال تھی۔

تحریک خلافت کے بعد، یہ پہلا موقع تھا کہ ہر مکتب فکر کے مسلمانوں نے متحد ہو کر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر، اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا، اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دوسرا عظیم اجتماع حیدرآباد میں منعقد ہوا، اس جلسے کی ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور جنرل سکرٹری امیر شریعت بہار واڑیہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کو منتخب کیا۔

بمبئی کے کنونشن کا بنیادی مقصد پرسنل لا کا تحفظ اور ترمیم سے اُس کا بچاؤ کرتے ہوئے، تمام مکاتب فکر کے اہل علم و فضل اور دانش وروں کو یہ اعلان کرنا تھا کہ مسلمانان ہند خواہ اُن کا تعلق کسی مکتب فکر سے ہو، اپنے پرسنل لا کے تعلق سے کسی ایسے قانون کو

پس مرگ زندہ

قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جو پرسنل لا کے کسی ایک شرعی جزیئے پر بھی اثر انداز ہو، بالفاظ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جن پر اُن کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور اُن کا ممتاز شرعی اور قومی امتیاز قائم ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اس دورِ آخر میں ”دفاع عن الاسلام“ کے حوالے سے آزاد ہندوستان میں پہلا اور سب سے طاقت ور وسیع البیاد پلیٹ فارم ثابت ہوا اور اپنی تاسیس کے بعد سے اب تک (نصف ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ابتداء مارچ ۲۰۱۰ء، جس وقت یہ مضمون طباعت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے) کسی نہ کسی شکل میں یہی اس وقت مسلمانوں کے لیے، اسلامی قوانین پر آنے والی، کسی بھی آنچ سے حفاظت کا طاقت ور اور متحدہ اسلحہ ہے اور اس کی تعمیر کا اصل سہرہ حکیم الاسلامؒ اور دارالعلوم دیوبند کے سر جاتا ہے، جو ہمیشہ ہندی مسلمانوں کے لیے ”دفاع عن الاسلام“ کا اولیس قائد رہا ہے۔ حکیم الاسلامؒ، تاحیات اس کے متفقہ صدر، سربراہ اور راہنما رہے۔ (۱)

حضرت حکیم الاسلام یعنی لاثانی خطیب

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

خداے علیم وخبیر کو گواہ بنا کے یہ ناچیز یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں، ہندوستان کے طول و عرض میں اور برصغیر کے وسیع تر خطے میں، کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا، جس نے وعظ و تقریر کے اسلحہ پر بیٹھ کے، لوگوں کے دلوں اور جذبات پر: اپنے علم کی

(۱) اس مضمون کا، یہاں تک کا بڑا حصہ عربی میں، حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات کے کچھ ہی روز بعد لکھا گیا، جو پندرہ روزہ ”الداغی“ کے شمارہ ۱۹، جلد ۶، ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء مطابق ۳۰ ریشوال ۱۴۰۳ھ میں شائع ہوا۔ اردو میں اس کو راقم نے خود یک شنبہ: ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق ۷ مارچ ۲۰۱۰ء کو اضافے کے ساتھ تحریر کیا۔

بے پناہی؛ معلومات کی کثرت؛ مطالعے کی وسعت؛ بھرپور دماغی سرمایے؛ کتاب و سنت اور اُن کے سرچشمے سے نکلے ہوئے علوم پر کامل عبور؛ رموزِ شریعت سے غیر معمولی آگاہی؛ اسلام، اسلامی احکام و قوانین و آداب کو پیش کرنے کے انمول اور خوش نما انداز؛ نیز اپنی شیریں گفتاری، سلاستِ لسانی، جادو بیانی، حسنِ ظاہر، سلیقہٴ پوشش، عالمانہ وقار، مومنانہ استحضار، متکلمانہ شان، صالحانہ اندازِ تکلم، مناظرانہ طرزِ استدلال اور اپنی دھیمی، مرتب، حکمت ریز و علم خیز موتی کی لڑی جیسی تقریر سے، اس طرح قابو پانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، جیسی حجتہ الاسلام، حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۳۸-۱۲۹۷ھ = ۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) بانی دارالعلوم دیوبند کے نیرۃ عظیم اور جگر گوشہٴ نانوتوی دارالعلوم کے سابق مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (۱۲۷۹-۱۳۳۷ھ = ۱۸۶۲-۱۹۲۸ء) کے مجسمِ علم و ہنر صاحب زادے اور اپنے دور میں دارالعلوم کی عالمی شہرت و عزت کے یکتا ضامن: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز (۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ = ۱۸۹۷-۱۹۸۳ء) رکھتے تھے۔

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

وہ جب محوِ تکلم ہوتے تو سچ مچ لگتا کہ ”بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں“ یا کوئی معصوم فرشتہ وحی الہی کی ادائیگی میں مشغول ہے۔ اُن کی تقریر میں زیادہ اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، وہ میدانِ ندیوں کی طرح دھیمی رفتار سے بہتے اور مسلسل اور بلا انقطاع بہتے۔ اپنی آواز سے کسی کے لیے، باعثِ سمع خراشی ہوتے، نہ اپنے پر جوش و پر شور اندازِ گفتار سے کسی کے لیے باعثِ اذیت، نہ وہ بہ تکلف ہنسی کا ماحول بنانے کے لیے کوئی ”کرتب“ دکھاتے، نہ وہ ہاتھ کو ناپسندیدہ انداز میں حرکت دیتے، نہ انگلیوں کے مکروہ اشاروں کا سہارا لیتے، نہ گر جتے برستے، نہ منہ سے جھاگ نکالتے، نہ ”آنکھیں دکھاتے“ نہ عام مُقَرِّرین کی طرح منہ چڑاتے، نہ دین کا ”بے وجہ“ نشا، اُن کو بد مست کرتا، نہ مسلمانوں

کے حال بدکا واقعی ادراک اُن کے لیے مصنوعی آنسوؤں کے چھلکنے کا باعث بنتا، نہ حاضرین کی طرف سے داد کے طالب ہوتے، نہ ستائش کی تمنا کرتے، نہ صلے کی پرواہ۔ وہ نرمی، گدازی، اور حلم و کرم کے ساتھ، اس طرح بولتے جیسے شیریں خواب، محو خواب انسان کے دل و دماغ کو، لذت و انبساط اور تازہ دم کی خوش گواری سے، عجیب سی نہ ختم ہونے والی مسرت بخش جاتا ہے۔

وہ بولتے تو موتی پروتے۔ وہ اسلام کی سچائیوں کو اس طرح آشکارا کرتے جیسے کوئی پھول نچھاور کر رہا ہو۔ وہ جہنم سے ڈرانے جنت کا لالچ دلانے میں، عام مقرروں کی طرح کسی ”انتہا پسندی“ کا سہارا لیتے، نہ کوئی غیر معمولی انداز اختیار کرتے، جس سے آدمی چنٹ منٹ بعد ہی بالیقین اُوب جاتا ہے۔ نہ وہ الفاظ کی تلاش میں سرکھپاتے، نہ تعبیرات کا پیچھا کر کے در ماندہ ہوتے، نہ لفظیات کا جمال اُن سے خیانت کرتا، نہ خیالات کی خوبی اُن سے دغا کرتی، نہ افکار کا جادو سرتابی دکھاتا؛ بل کہ یہ سارے کے سارے، اُن کے سامنے دست بستہ اور انتہائی نیاز مندی کے ساتھ کھڑے رہتے اور اپنی بندگی میں قبول کر لینے کے لیے، اُن سے بے طرح آروز اور منت کرتے۔ خیالات کا آبشار، فکر اور جہند کے ہمالیہ سے، اس طرح تسلسل کے ساتھ گرتا کہ سامعین کے لیے، اُس کو سمیٹنا مشکل ہوتا؛ لیکن اُن کی — سامعین کی — خوشی اور سرمستی کا عالم دیدنی ہوتا۔ اُن کے لیے معمولی سے معمولی موضوع کو جو عام سامعین کے نزدیک کسی معنویت کا حامل نہ ہوتا گراں قدر بنا دینا، بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ عوام کے نزدیک تمام تر بے وقعتی رکھنے والے مضمون پر بھی عام طور پر دو تین گھنٹہ بول لیتے تھے اور سامعین اس طرح شوق و ذوق سے سنتے رہتے، جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف اور صرف حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کو ایسا مقرر پایا جس کے سامعین واقعی باتمکین ہوتے تھے، مضمون کی لذت، جو اکثر اندازِ سخن سے پیدا ہوتی تھی، کسی سامع کو اپنی ”بد ذوقی“ کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع نہ دیتی تھی۔ کسی پراسنچے کا دباؤ اُس کو اپنی

جگہ سے اٹھنے پر مجبور کرتا، نہ تمباکو نوشی کی عادت کا اضطراب کسی کو اپنی جگہ چھوڑنے پر گدگداتا، نہ پیاس کی شدت کسی کو ستاتی، نہ کوئی اور عارضہ کسی کے لیے جلسے کی پرسکون فضا میں ادنیٰ سے انتشار کو جنم دینے کی دعوت دیتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اتنے بازوق و پرشوق، لذت کے رسیا، معلومات کے انوکھے پین کے اتنے دل دادہ اور اپنے مخاطب کے اتنے با وفا و قدر شناس سامع، ہمارے ہوش میں کسی کو نہ ملے ہوں گے، جتنے قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کے ملے۔ یہ سامعین کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اُن جیسے پھول برسانے، راحت پہنچانے، لذت دینے اور خوشیاں لٹانے والے مقرر و واعظ ملے کہ جب وہ اپنی عمومی طور پر دراز نفس تقریر کو دعائیہ کلمات اور رخصت کے الفاظ پر ختم کرنے کا اعلان کرتے، تو نہ صرف اُن کی — سامعین کی — زبان سے یہ یک زبان افسوس کے الفاظ نکل پڑتے؛ بل کہ جب وہ یہ کہتے کہ ”انھی الفاظ پر میں اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں“ تو سامعین کے چہرے پر غم کی لکیریں ابھر آتیں اور وہ اُس غیر معمولی لذت سے، اچانک محرومی کے اعلان پر تڑپ اٹھتے کہ کس نے ان سے کہا ہے کہ انھی الفاظ پر بات ختم کر دیں، ہم ہنوز سیر نہیں ہوئے اور ہماری بے تابی اور بڑھ گئی ہے اور ہمارا شوق اب ہمیشہ طالب تسکین رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے اٹھنے والے سامعین کو دلچسپ صحبت، یا گھنیرے سایے کے لطف، یا روح پرور گانے کی دھوم مچا دینے والی لے، یا شیرینی ولذت میں بے مثل مٹھائی سے، یا بہ یک وقت ان ساری چیزوں اور ان کے علاوہ بہت ساری چیزوں سے محروم ہو جانے کا شکوہ ہوتا تھا۔

بیرون ملک کی مسلم اکثریت و اقلیت کے علاوہ برصغیر کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے مدارس، اداروں، تنظیموں اور عام مسلمانوں کی طرف سے، اُن کے پاس بڑے چھوٹے جلسوں کو رونق بخشنے کی گزارشوں اور افتتاحوں، بنیاد گزاریوں، دعا کی مجلسوں، خوشیوں کی تقریبوں وغیرہ میں، اپنے قدوم میمنت لزوم سے، براہِ انِ اسلام کو سرفراز کرنے کے اتنے سارے دعوت نامے اُن کے پاس آتے رہتے کہ اُن کا شمار بھی مشکل

پس مرگ زندہ

تھا۔ وہ ایک ایک سفر میں بعض دفعہ دسیوں، بیسیوں ہی نہیں سیکڑوں جلسوں اور تقریپوں کو خطاب کرتے۔ کسی شہر میں مدعو ہوتے، یا کسی دیہات میں اُن کی آمد ہوتی، تو سارے مدارس، جماعتیں اور تنظیمیں؛ جنہوں نے اُن کو مدعو بھی نہیں کیا ہوتا تھا، اُن کی تشریف آوری کو غنیمت جان کر فوراً اپنا اپنا پروگرام بھی برپا کر دیتیں کہ اتنی بڑی دولت بے بہا سے، جو اُن خود ہاتھ آگئی ہے محروم رہ جانا بڑی بد قسمتی کی بات ہے۔ اب جو وہاں کہیں بھی جلسہ ہوتا تو سارا شہر اور سارا علاقہ اُنڈ پڑتا اور جہاں کئی روز کا قیام ہو جاتا، وہاں عید کی سی رونق اور خوشی کا ماحول دیکھنے کو ملتا۔

نرالا اندازِ خطابت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریروں کا انداز بالکل نرالا تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بولتے، بات سے بات پیدا کرتے جاتے اور مرکزی موضوعِ محوّد ذیلی موضوعات پر، اس طرح پھیل جاتا کہ اُن کی تقریر کے دوران بیچ میں حاضر مجلس ہونے والا سامع، بسا اوقات یہی سمجھتا کہ حضرت فلاں موضوع پر گفتگو فرما رہے ہیں، حال آں کہ وہ کوئی ذیلی گوشہ ہوتا جس پر وہ اظہارِ خیال کر رہے ہوتے تھے۔ اُن کی تقریر شاخ در شاخ ہو کر پھر مرکزی تنے سے اس طرح جڑتی چلی جاتی تھی کہ بہت کم مقرر رُوں کے لیے، اس طرح کی لمبی لمبی شاخوں کو مرکزی موضوع سے جوڑنے کی صلاحیت ہوتی ہوگی۔ وہ نہ کبھی مرکز سے ہٹتے، نہ اصل موضوع کو بھولتے، جب کہ ذیلی موضوعات پر دراز کلامی سے، عموماً مرکزی موضوع کا سر ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا ہے۔ وہ ہر ذیلی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے اور پھر قرینے سے اُنھیں اصل موضوع سے جوڑ دیتے۔

تقریر کے دوران کتاب و سنت کے نصوص کو اصل عربی میں پڑھتے اور اُن کا انتہائی سلیس اور مزے دار ترجمہ کرتے۔ اقوالِ سلف کو بھی اُن کی اصل زبان میں ہی پیش فرماتے: عربی ہو یا فارسی یا اردو۔ دلچسپ لطیفوں، درس انگیز حکایات، عبرت خیز نکات،

نازک اشارات، معنی ریز تشبیہات، عقل کشا واقعات، ذہن کو بیدار کرنے والے نت نئے خیالات و التفاتات اور سب سے بڑھ کر تجدیدِ ایمان و یقین کا سامان صد ہزار رکھنے والے ایسے حقائقِ حیات سے، اُن کی تقریریں بھری پُری ہوتیں، جن سے دل کا ہر زنگ دور ہو جاتا، ہمتِ عمل پر سان چڑھتی، کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی اُن گنت نشانیوں پر غور کرنے کا نہ ختم ہونے والا جذبہ بیدار ہوتا اور بہت سی مرتبہ گنہ گار آنکھوں کو غسلِ تطہیر کا سامان مُنیر آجاتا اور آدمی سابقہ خطاؤں سے بالکلیہ توبہ کر لینے کی، ایسی توفیق لے کر اٹھتا کہ آئندہ زندگی میں اپنی تقدیر، اپنے ہاتھ سے لکھنے کی راہ پا جاتا۔

افکار و خیالات کو سامعین کے ذہنوں میں پیوست کرنے کا بے مثال انداز

حضرت رحمۃ اللہ علیہ، ضرب الامثال، کہاوتوں، محاوروں نیز زبان و بیان کے مختلف اُسالیب اور لسانی ساختیات کے مختلف رویوں سے، اپنے افکار و خیالات کو سامعین کے ذہنوں میں اُتارنے میں لاجواب تھے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے ابتدائی سالوں میں سے کسی سال کے محرم کی بات ہے، لکھنؤ کے احاطہ شوکت علی میں منعقد ہونے والے فضائلِ صحابہ کے پندرہ روزہ پروگرام کے تحت، حضرت قدس سرہ خطبہ کے سر تاج کی حیثیت سے — جیسا کہ وہ واقعتاً تھے بھی — ایک روز تقریر فرما رہے تھے، جس کی ایک ماہ سے زائد عرصے سے لکھنؤ میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ گنہ گار حضرت کی تقریر کے عشاق میں ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے، اولیں وقت میں، جلسہ گاہ میں حضرت کی تشریف آوری سے مناسب وقت پہلے، اسٹیج سے مناسب فاصلے پر ایسی جگہ سیٹ حاصل کر چکا تھا، جہاں سے حضرت کے سراپے کو اچھی طرح دیکھنا اور حضرت کی بات کو بہ حسن و خوبی رُو در رُو سننا ممکن تھا۔ اب تو یہ بات یاد نہیں رہی کہ حضرت کی تقریر کا مرکزی موضوع کیا تھا؛ لیکن بالیقین

فضائلِ صحابہ ہی رہا ہوگا۔ حضرت کی گفتگو کا خلاصہ اس وقت میرے ذہن میں یہ ہے کہ راستے مختلف ہو سکتے ہیں؛ لیکن اصل اور مطلوبہ منزل تک اگر وہ پہنچتے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ صحابہ کرام میں بھی مختلف المزاج لوگ تھے، اُن کے طریقہ ہائے کار میں کبھی اختلاف بھی ہوتا تھا؛ لیکن اُن کی منزل صرف رب کی رضا جوئی اور خدا کی خوشنودی تھی؛ اسی لیے وہ سب خدا کے دین کے سپاہی اور جنت کے راہی تھے۔ حضور ﷺ کے ہر صحابی جنتی تھے، کوئی صحابی جنت سے محروم نہ ہوں گے۔ اگر اُن میں سے بھی کوئی ایسا ہو کہ اُس کو جنت نہ ملے، تو پھر بعد کا تو کوئی انسان بھی مستحق جنت نہیں ہو سکتا؛ اس لیے کہ کسی کا ایمان و عمل اُس معیار پر نہیں اتر سکتا جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے؛ کیوں کہ انھیں حضور ﷺ کی، بہ حالت ایمان، کاپیٹ صحبت سے سرفرازی حاصل تھی، جو بعد کے بڑے سے بڑے ولی اللہ کو حاصل نہ ہو سکی۔ راستے مختلف ہوں اور وہ سبھی مطلوبہ منزل تک جاتے ہوں، تو اُن میں سے کسی کا بھی راہی ہونا چنداں مضرت نہیں۔ مضرب یہ ہے کہ آپ ”کعبہ“ تک پہنچنے کے لیے ”ترکستان“ کی راہ پر چل پڑیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ آپ سوئے حرمِ محو سفر ہیں۔ حضرت نے اس کو ایک واقعے سے اس طرح واضح فرمایا:

ایک نحوی کا واقعہ

ایک نحوی (ماہر علم نحو) انتہائی سیاہ رو اور بد شکل تھے (۱)۔ رات کی تاریکی اُن پر رشک

(۱) حضرت سے میں نے اپنی نوجوانی میں ایسا ہی کچھ سنا تھا، ہو سکتا ہے کہ میں نے محفوظ رکھنے میں غلطی کی ہو؛ لیکن ۱۳۲۲ھ کی ”ام القریٰ“ جنتری میں، میں نے اس قصے کا اختصار اس طرح دیکھا تھا: ”عمران بن حطان — متوفی ۸۴ھ/۷۰۳ء زبردست خطیب، پر کوہِ بلیغ شاعر اور اعلیٰ پایے کے فصیح اللسان تھے اور اُسی درجے کے بد صورت اور سیاہ رو تھے۔ ایک روز اُن کی بیوی نے، جو انھی کے برعکس حد درجہ حسین و جمیل تھی، اُن سے کہا: ”تو قہقہہ دوںوں ہی جنت میں جائیں گے۔ میں تو اس لیے جاؤں گی کہ اللہ نے مجھے تم ایسے پر صبر کی توفیق بخشی اور تم اس لیے جنت میں جاؤ گے کہ اللہ نے مجھ جیسی مہ پارہ بیوی کی نعمت سے تمہیں نوازا اور انتہائی صابر اور انتہائی شاکر دونوں جنت میں جائیں گے۔“

کرتی تھی جب کہ اُن کی بیوی انتہائی گوری اور بے نظیر حسینہ تھی، وہ چاند کا کلڑا لگتی اور ماہ تمام سے تراشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ جب دونوں: میاں و بیوی اکٹھے ہوتے، تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ ایک آفتاب اور دوسرا سایا ہے۔ بل کہ دونوں شب و روز کی طرح ممتاز ہوتے اور ایک دوسرے کی نفیض، یا آگ پانی کی طرح ضدین محسوس ہوتے۔ ایک دن دونوں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ میاں نے بیوی سے کہا: ہم دونوں بالیقین جنتی ہیں۔ اہلیہ نے کہا: تمہارے منہ میں گھی شکر، خدا کرے ہم دونوں جنت نصیب ہوں؛ لیکن تم نبی ہونے سے رہے، جس کو خدا بہ وقت ضرورت، بہ طور حکمت و مصلحت، غیب کی بعض باتیں بتا دیا کرتا ہے، تو تمہیں یہ کیسے معلوم کہ ہم ان شاء اللہ جنتی ہیں؟ میاں نے کہا کہ ہم دونوں کے تعلق سے جنتی ہونے کی بات معلوم کرنے کے لیے نبی اور ولی ہونے کی چنداں ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ تم اس وقت لاثانی حسینہ عالم ہو، اس کے باوجود تم نہ اتراتی ہو، نہ بدستی دکھاتی ہو، نہ غرور بے جا میں مبتلا ہوتی ہو؛ بل کہ یک سوئی کے ساتھ ذکر الہی، عبادت خداوندی اور شوہر کی طاعت اور فرماں برداری میں لگی رہتی ہو، حسن کی نمائش، عشوہ واداکو عالم آشکارا کرنے کی کوئی خواہش، تمہیں کسی لمحہ بھی نہیں ستاتی؛ اس لیے میں شکر و امتنان کے ایسے مرتبے پر فائز ہو چکا ہوں، جو شاید آج دنیا کے کسی انسان کو بھی نصیب نہیں۔ میں ہمہ وقت تیری ایسی چودہویں کے چاند اور آفتاب عالم تاب بیوی کی شکل میں ملی ہوئی، بے نظیر دولت عظمیٰ کے استحضار سے، مست رہتا ہوں اور میرے ہر بن موصے شکر و عرفان کے جذبات اُبلتے رہتے ہیں۔

اس کے برعکس میں آج روئے زمین کا شاید سب سے بد صورت انسان ہوں، دنیا کے کسی گوشے میں میری نظیر تلاش بسیار کے باوجود بھی مشکل سے ملے گی، چڑے میرے سیاہ، ہونٹ میرے سولے، گردن میری فرہ، جسم میرا بے ڈھنگا: غرض میری کوئی کل سیدھی نہ لائق توجہ؛ بل کہ خدا کی مصلحت سے میں نہ صرف تیرے لیے؛ بل کہ ہر دیکھنے والے کے لیے باعثِ عبرت؛ بل کہ باعثِ اذیت ہوں کہ اتنی بُری شکل کا

پس مرگ زندہ

آدمی بھی اُن لوگوں کو خواہی نہ خواہی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا کے غیر متعلق انسانوں کے لیے میں اپنی مکروہ صورت سے باعث تنفر و تکدر ہوں، تو توتیرے ایسی مہ پارے کے لیے میں کتنے تحمل، صبر اور خدا کے فیصلے پر راضی رہنے کے ہمہ وقت امتحان کا باعث بنا رہتا ہوں، اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں اور میرے خدا کو تو ہر چھپے کھلے کا بہ خوبی علم ہے، اس کے باوجود تم میرے اوپر نہ صرف صبر کرتی ہو؛ بل کہ خدائی تقسیم اور رب کا فیصلہ سمجھتے ہوئے، اس صورتِ حال کو بھی (جیسا کہ تمہارے سارے رویوں سے عیاں ہے) نعمتِ الہی باور کرتی ہو؛ لہذا تمہیں صبر کا ایسا اعلیٰ ارفع درجہ ملا ہوا ہے، جو شاید آج اس کرۂ ارض پر کسی کو نصیب نہ ہوگا۔ اس طرح تیرا خاکسار شوہر شکر و امتنان کی انتہائی اونچی منزل کا باسی ہے اور تم صبر و تحمل کی چوٹی پر متمکن ہو؛ اس لیے میں راہِ شکر کا راہی ہوں اور تم راہِ صبر کی مسافر ہو۔ راستے تو ہم دونوں کے مختلف ہیں؛ لیکن منزل ہم دونوں کی ایک ہی ہے۔

اس ناچیز کو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرتؑ نے اس واقعے کو اتنی تفصیل سے اور اتنے مزے دار انداز میں بیان فرمایا تھا کہ سارا جلسہ لوٹ پوٹ ہوتا رہا تھا اور لوگوں کا ہنسنے ہنسنے برا حال ہو گیا تھا۔ میاں بیوی کے حسن و قبح کو انھوں نے ایسی لفظیات دی تھیں اور قصے کے بیان میں ایسی لطف انگیز تعبیریں اختیار کی تھیں؛ جو انھی کا حصہ تھیں۔ اُن کا کمال نہ صرف اس مجلس میں؛ بل کہ ہر مجلس میں یہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہلکی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے تھے اور سامعین کا بہت سے مواقع پر ہنسی کے تسلسل سے حال دگرگوں ہو جاتا تھا۔ اُن کی دورانِ تقریر بہ وقتِ ضرورت مسکراہٹ بھی، اُن کے اندازِ سخن کو نہ صرف پر لطف؛ بل کہ معنی خیز بنا دیا کرتی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بعض سوانح نگاروں نے، ضرب الامثال اور حکایتوں

کے تئیں اُن کی مہارت کا ایک دل چسپ واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ
 ”ملتان — پاکستان — میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ قاری صاحب قرآن کریم کے
 ترجمے کے اصول و ضوابط بیان فرما رہے تھے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے، اُنھوں
 نے فرمایا: صحیح مترجم وہ ہوتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرے، اُس کو اُس زبان کے
 محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال پر پورا عبور ہو۔ اس سلسلے میں قاری صاحبؒ نے
 ایک فرنگی افسر کی مثال دی۔ فرمایا: یہ انگریز افسر برسوں سے ہندوستان میں مقیم تھا، یہاں
 رہتے بستے اور ملازمت کرتے کرتے اردو سیکھ گیا۔ ایک دن لہر اکرا اپنے اُردلی سے کہا:
 مجھے اردو پر پورا عبور حاصل ہو گیا ہے۔ اُردلی مسکرایا، وہ اہل زبان تھا، ادب سے بولا:
 نہیں صاحب کہ ع
 بہادہ، ساآہ رہنے والا سپاہی

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

”فرنگی بولا: نہیں، مجھے پورا عبور حاصل ہے۔ اردلی نے کہا: کیا میں آپ کا امتحان
 لے لوں؟ فرنگی نے لپک کر کہا: ضرور! اردلی نے پوچھا بتائیے ”کریلا اور نیم چڑھا“ کا
 کیا مطلب ہے؟ فرنگی صاحب فرمانے لگے کہ ”کریلا“ ”نیم چڑھا“ کے درمیان ”اور“
 بمعنی واؤ حرف عطف یا رابطہ ہے یہ کیوں؟ اردلی نے کہا: آپ اسے جانے دیجیے،
 صرف ”کریلا نیم چڑھا“ ہی کا مطلب بتا دیجیے۔ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ غور و فکر
 کے بعد بولے: ”کریلا“ تو ایک سبزی کا نام ہے اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہا: ”نیم“ کا
 مطلب ہے ”آدھا“ پھر مزید وقفے کے بعد فرمایا: ”چڑھا“ کا مطلب ہے کہ ہنڈیا میں
 چولھے پر چڑھا اور پھر ہنس کر کہا: تمہیں معلوم ہے کہ کریلا کڑوی سبزی ہے، کسی نادان
 نے پکایا تو پوری طرح پک نہیں سکا؛ بل کہ ”نیم“ یعنی آدھا پکایا، جس کے نتیجے میں
 کریلے کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی۔ بس اب مطلب صاف اور واضح ہے۔

”اردلی ہنس پڑا، عرض کیا: صاحب! میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو اردو پر
 عبور حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے صحیح مطلب بیان نہیں کیا۔ میں آپ کو

پس مرگ زندہ

اس کا صحیح مطلب بتاتا ہوں۔ سنیے! کریلا تو ہوتا ہی کڑوا ہے، کسی نے اُس کی نیل کو اُس سے بھی زیادہ کڑوے پتوں والے درخت یعنی ”نیم“ کے درخت پر چڑھا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اور زیادہ کڑوا ہو گیا، انگریز افسر بولا: اچھا! میرا دھیان ”نیم“ کے درخت کی طرف نہیں گیا؛ ورنہ صحیح مطلب معلوم ہو جاتا۔

”یہ مثال بیان کرنے کے بعد حضرت قاری صاحبؒ نے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا: اُس انگریز نے ”کریلے“ کا نام سن رکھا تھا، اُس نے فارسی کا لفظ ”نیم“ بھی پڑھا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فارسی میں ”نیم“ کے معنی نصف کے ہوتے ہیں۔ اب اُس ”صاحبِ عبور“ نے کیا یہ کہ ہندی کے لفظ ”چڑھا“ کو ساتھ ملا لیا اور اسے ہنڈیا میں ڈال کے چولے پر چڑھا دیا اور یوں محاورے کا ستیاناس کر دیا اور جب اردلی نے اُس محاورے کا صحیح مطلب بتایا، تو وہ کھسیانا ہو گیا۔ کہنے لگا: اچھا کچھ اور پوچھو، میں صحیح جواب دوں گا۔ اردلی نے کہا: صاحب! کچھ اور پوچھوں گا تو آپ بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔ انگریز نے کہا: نہیں نہیں، کچھ اور پوچھو۔ اردلی نے کہا کہ چلیے یہی بتا دیجیے کہ ”بغلیں جھانکنے“ کا کیا مطلب ہے؟ انگریز نے دایاں بازو اٹھایا، بغل میں جھانکا، پھر بایاں بازو اٹھا کر بائیں بغل میں جھانکا اور کہا کہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں بغلوں کو جھانک لوں گا۔ یہ سن کر اردلی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ اب اُس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔“ (۱)

حکایات و واقعات سے

نتائج و مسائل کے استخراج کا عجیب و غریب ملکہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کو حکایات و واقعات سے نتائج، مسائل اور طرح طرح کے

(۱) ”میس مردانِ حق“، ج: ۲، ص: ۸۲-۸۳، مکتبہ رشیدیہ ۲۵ لوز مال، لاہور۔ طبع اول جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ =

اُسباق و غیر کے استخراج میں جو کمال حاصل تھا، وہ اُنھی جیسے دقیق النظر، وسیع المطالعہ اور روح شریعت سے بھرپور واقفیت رکھنے والے عالم ہی کو حاصل ہوا کرتا ہے، جو روز روز پیدا نہیں ہوتا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ اسلام، ایمان اور احسان والی حدیث طلبہ و علما بار بار پڑھتے سنتے اور پڑھاتے رہتے ہیں۔ (۱) عموماً اس حدیث کے تعلق سے لوگ مذکورہ تینوں حقائق کے بیان پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کسی اور بات کی طرف شاید و باید ہی ”اہل علم“ کا ذہن جاتا ہوگا۔ ہم لوگوں نے بھی اس حدیث کو اساتذہ سے سمجھ کے پڑھا، پھر عملی زندگی میں اس پر غور کرنے اور تدریسی زندگی میں اس کے حوالے سے طلبہ کو، بہ وقت ضرورت بار بار دین کی سچائیوں کو سمجھانے کی توفیق حاصل رہی؛ لیکن جب قاری صاحب سے اس حدیث کو ایک مشہور مدرسے کی مسجد میں اپنی تقریر میں پڑھتے، ترجمہ کرتے اور اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کو بار بار نچوڑ کر، اُس سے شریں تر مُعَطَّر و مُصَنَّفِی رس، اپنی زبان کے انتہائی حَقَّافِ گلاس میں سامعین کو، پیش کرتے ہوئے دیکھا اور براہ راست سنا، تو خدا کی خلافت اور قاری صاحب کے فہم دین و علوم دین کا ہلکا سا تجربہ کر کے حیرت، رشک اور خوشی کے ملے جلے جذبات کی بے پناہی کی وجہ سے محسوس ہوا کہ میرا ”تنگ ظرف“ سینہ شاید شق ہو جائے گا:

حضرتؒ نے جہاں پوری حدیث کی عربی میں تلاوت فرمائی، وہیں اُس کا خوب صورت ترجمہ فرمایا اور پھر حقائق کے ساغر اندینا شروع کیے، تو لوگ جھوم جھوم اٹھے۔

(۱) حدیث کا پورا متن اس طرح ہے:

عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدِ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَتَقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتُحِبَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ. ←

إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدٌ بَيَاضُ الثِّيَابِ: فرمایا چوں کہ حضرت جبریل ”طالب علمانہ“ تشریف لائے تھے، اس لیے سرکار کی خدمت میں، جنہیں اُس وقت خدا کے حکم سے انھوں نے ”معلم“ بنایا تھا، گندے سندے کپڑوں میں تشریف نہیں لائے؛ بل کہ اُن کے کپڑے انتہائی سفید تھے، جس سے سفید لباسوں کی مرد کے لیے فضیلت کے ساتھ ساتھ، طالب علم کو صاف ستھرا رہنے کی تاکید بھی مُترشح ہوتی ہے۔ اس سے جہاں اُستاذ کے دل و دماغ میں طالب علم کی طرف سے اچھا تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ صفائی پسند، سلیقہ مند، نستعلیق، اچھائیوں کو فطرتاً اختیار کرنے والا ہے؛ وہیں خود طالب علم کے اپنے ذہن اور اپنی ذات پر بھی خوش گوار اثر قائم ہوتا ہے۔ وہ صحت مند، خوش، نفسیاتی طور پر اخذِ علم کے لیے تیار، تلقین کیے گئے اسباق کو مکماٹھ محفوظ رکھنے اور سمجھنے کے لیے بیدار رہتا ہے اور ساتھ ہی معاشرے کے دگر انسانوں کے لیے، صفائی ستھرائی کا عملی مُعَلِّم بن کر انسانوں کے لیے دور رس فوائد کی طرح ڈالنے والا ثابت ہوتا ہے۔

شَدِيدٌ سَوَادِ الشَّعْرِ سے کم عمری میں حصولِ علم کی تلقین ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ بالیقین طلبِ علم، حصولِ فن اور ہنر کو سیکھنے کے لیے، انسانوں کے لیے، اُن کے خالق نے یہی عمر متعین کی ہے۔ اس میں کسی بھی چیز کا حصول آسان ہوتا ہے کہ سیکھنے کا جذبہ و ملکہ، از خود اُشیا سے آگہی کے لیے انسان کو آمادہ کرتا رہتا ہے۔ جستجو، جان کاری اور تجسس کا شوق ہر وقت جادہ پیا رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے اور نو عمر لوگ

→ قَالَ: "أَنْ تُوْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرُهُ وَشَرُّهُ". قَالَ: صَلَفَتْ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ. قَالَ: "أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ". قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ. قَالَ: "مَّا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّأَلِ". قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَتِهَا. قَالَ: "أَنْ تَلِدَ الْأُمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحَفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّيْءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُيُوتِ". ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا. ثُمَّ قَالَ: يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مِنَ السَّأَلِ؟ قُلْتُ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: "فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ". (رواه مُسْلِم)

ہر وقت ہر چیز کے متعلق اپنے بڑوں سے، سوال کرتے رہتے ہیں۔ گو اسلام نے مہد سے لحد تک طلب علم میں لگے رہنے کی دعوت دی ہے؛ لیکن حصول علم کا اصل زمانہ نوعمری ہے، جس میں سارے قویٰ صحیح طور پر کام کرتے رہتے ہیں اور عمر کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ، سارے قویٰ رفتہ رفتہ مضحمل ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔

فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ سے یہ حکم مُسْتَبْطُ ہوتا ہے کہ طالب علم کو انتہائی باادب بیٹھنا چاہیے۔ اس سے اُستاذ کے ذہن میں جہاں طالب علم کی اطاعت شعاری، سلیقہ مندی، خاک ساری اور سیکھنے کے لیے انتہائی آمادگی کا تاثر اُبھرتا ہے؛ وہیں طالب علم کے لیے دیے گئے سبق، تلقین کیے گئے مواد اور پیش کی گئی باتوں کے حرف حرف کو بہ غور سننا اور بہ دقت یاد رکھنا، زیادہ قرین قیاس اور آسان ہوتا ہے۔

ناچیز نے یہاں اپنی یاد سے انتہائی اختصار کے ساتھ، حدیث سے اخذ کردہ بعض باتیں لکھی ہیں۔ قاری صاحبؒ نے اس مضمون کو ۹۰ ربیع سے ساڑھے ۱۲ ربیع تک، یعنی ساڑھے تین گھنٹے تک بیان فرمایا تھا۔ طلبہ اور اساتذہ، ذوق و شوق سے اس طرح دھیان کے ساتھ سنتے رہے کہ شاید اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی کسی کام سے اس طویل وقفے میں اٹھا، نہ کسی نے اکتا کر بلاوجہ کھانس کر سامعین کی توجہ کو منتشر کیا، نہ کسی کو ”حوالج بشریہ“ کے عذر نے پریشان کیا؛ کیوں کہ اندر کا شوق اور دل کا جذبہ بہت سی رکاوٹوں کو خود لاشے بنا دیا کرتا ہے اور انسان غیر مرئی ”خرقِ عادت“ طاقت کے ذریعے، اُن پر پوری طرح قابو پالیتا ہے۔

حکیم الاسلام کی خطابت.. منفرد خصوصیات

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کی خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کے لیے، یقیناً مستقل کثیر الصفحات کتاب کی ضرورت ہے؛ لیکن یہاں مختصراً چند اہم خصوصیات کی

طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جو ناچیز نے اُنھیں سننے کے دوران اخذ کی تھیں:

۱- وہ جس موضوع کو بھی چھیڑتے، اُس پر بھرپور طریقے سے بولتے تھے اور وضاحت، دلائل، رد و قدح، ہر شعبے کے ازالے کے ساتھ متعلقہ سارے گوشوں کا احاطہ اور اُن سے متعلق وہ ساری جان کاریاں ضرور دیتے، جن کے متعلق وہ یہ محسوس کرتے کہ سامعین کے لیے، یہ ضروری اور انتہائی مفید مطلب ہیں۔ اپنے وسیع تجربے، زندگی، انسان اور انسانی معاشروں کے مسائل سے اپنی گہری اور بصیرت افروز معلومات کی وجہ سے، وہ سامعین کے دامن جستجو کو مالامال کر دیتے تھے۔

۲- وہ چھوٹے اور بڑے، غیر معمولی اور معمولی: دونوں طرح کے موضوعات پر یک ساں تقریری ملکہ سے اس طرح بولتے تھے کہ موضوع سے متعلق کسی طرح کی تشنگی کا، کسی سامع کو کبھی احساس نہ ہوتا تھا۔ کوئی بھی تقریب ہو، کیسا بھی وقت ہو، کیسا ہی موقع ہو، قاری صاحب کو جب بھی دعوتِ سخن دی جاتی، تو وہ اس طرح محوِ تکلم ہو جاتے، جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا ہو۔

۳- بعض دفعہ اچانک انتہائی معمولی موضوع پر گفتگو کے لیے، اُن سے فرمائش کی جاتی۔ سامعین کو محسوس ہوتا کہ حضرتؑ کے لیے، اس پر بولنا شاید مشکل ہوگا کہ یہ بھی کوئی موضوع ہے، جس کی معلومات کسی پڑھے لکھے کے پاس ہوگی یا اُس نے اس پر غور کرنے کی سوچی ہوگی؛ لیکن وہ الحمد للہ الخ کر کے شروع ہو جاتے اور اُس موضوع کو اتنا اہم، غیر معمولی اور ایسا مبارک بنا دیتے کہ حاضرین عیش عیش کرنے لگتے۔ اُن کی جادو بیانی، شیریں مقالی، بہ وقت ضرورت مزاحیانہ انداز، نکتہ آفرینی، بات سے بات پیدا کرنے کی عجیب سی قدرت، حاضر دماغی، طرزِ ادا، معلومات کا انوکھا پن، فکری جولانی، غیبی مدد، تعلق مع اللہ کا پانی میں راہ پیدا کر دینے کی کرامت؛ ایسا رنگ دکھاتی کہ لوگوں کی حیرت کی صلاحیت بھی جواب دے جاتی۔

۴- وہ مُرتب انداز میں تسلسل کے ساتھ دھیمی رفتار سے، لیکن شیریں گفتاری

سے، اس طرح تقریر کرتے کہ نہ معلومات کا خزانہ کبھی ختم ہوتا، نہ الفاظ کا ذخیرہ ناپید۔ بس شروع کرنے کی دیر ہوتی، پھر ختم کرنا صرف اُن کی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا۔ کسی سامع کے اُبا کی مجال نہ تھی کہ اُن کی بزم میں، اپنے کسی رویئے سے اپنے کو بد ذوق ثابت کرنے کی ہمت کرے۔ خیالات و افکار، معلومات و معارف اور الفاظ و تعبیرات کے صف بستہ قافلے جوق در جوق، اُن کی خدمت میں اس طرح پیش ہوتے رہتے، جیسے وہ خدائی حکم سے مجبور محض ہوں۔

۵۔ اُن کی تقریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ سامعین، اُن کے پیش کردہ آراء و افکار میں اُن کے بالکل ہم راے محسوس ہوتے۔ یہ کسی مقرر کا اعجاز ہوتا ہے کہ وہ اپنی قادر الکلامی اور مدلل گفتگو سے، اپنے مخاطبین کو اپنا ہم راے بنالے۔ حاضرین خواہ اس مجلس سے پہلے اُس راے کے حامل نہ رہے ہوں جو قاری صاحبؒ نے پیش کی ہوتی تھی؛ لیکن قاری صاحبؒ کی بزم وعظ میں شرکت کے بعد، وہی بات اور خیال اُن کے دل اور زبان پر ہوتا جو انھوں نے پیش کیا ہوتا تھا۔ اُن کی تقریر کو سن کر، ہر سامع زبان حال اور اکثر دفعہ زبانِ قال سے کہہ اٹھتا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا، یہ بھی میرے دل میں ہے

کاش ہم مکبر الصوت ہوتے

دارالعلوم میں طلبہ کی عربی انجمن ”النادی الادبی“ نے لاؤڈ سپیکر خریدا۔ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء) نے النادی کے معتمد اور اہم ذمے داروں سے فرمایا کہ حضرت قاری صاحبؒ کے ذریعے، اس کا افتتاح ہونا چاہیے۔ تم لوگ حضرت سے وقت لے کر افتتاح کی تقریب برپا کرو، ان شاء اللہ اس سے برکت ہوگی۔ چنانچہ حضرتؒ کی تقریر سے ہی اُس کا افتتاح ہوا۔ حضرتؒ نے اس

موقع سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی جو تقریر کی، مکبر الصوت کی فضیلت پر جو روشنی ڈالی، اُس بے جان آلے کی خوبی و افادے کے گوشوں کو جس طرح اُجاگر کیا، دین و دعوت اور تعلیم و تربیت کے میدان میں اُس کو برتے جانے کے پہلوؤں کو جس طرح گنوا یا، تو ایسا لگا کہ وہ حضرت حسن بصری، سعید بن المسیب، عبد اللہ بن المبارک، امام غزالی، یا ائمہ اربعہ کے فضائل بیان کر رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو بہت سے طلبہ کے لاشعور میں یہ تمنا جاگ اُٹھی کہ کاش ہم ”مکبر الصوت“ ہی ہوتے: روزِ محشر حساب و کتاب سے بچ جاتے اور حضرت قاری صاحبؒ کی اتنی ساری تعریفوں کا مستحق بھی بن جاتے!۔

قناعت اور مسافرانہ زندگی کی فضیلت

ایک بار میں نے قناعت اور دنیا میں مسافرانہ زندگی گزارنے کے موضوع پر، حضرتؒ کی تقریر سنی، تولّدِ تقریر اور دلائل کی کثرت کی وجہ سے، میرے دل میں یہ بات جا گزریں ہو گئی کہ ایک سچے مسلمان کی مثالی زندگی یقیناً وہی ہو سکتی ہے جو حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور اُنھی کی طرح کے صحابہ و تابعینؓ اور امت کے زاہدین نے گزاری اور اُس کی دعوت بھی دی۔ دل نے پوری طاقت سے گواہی دی کہ اس قابلِ رشک ایمانی زندگی سے مختلف جو زندگی بھی گزاری جائے گی، بلاشبہ وہ ہوا و ہوس، بے عقلی اور پاگل پن سے عبارت ہوگی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت تقریر فرما رہے تھے، تو اکثر حاضرین کی آنکھیں اشک بارتھیں، اُن کے دلوں کا زنگ کافور ہو رہا تھا، اُن کے ایمان پر سان چڑھ رہی تھی، دنیاوی وہم و گمان اور خواب و خیال اور تمناؤں اور نہ ختم ہونے والی خواہشات کے بت اور اندھے منہ گر رہے تھے اور مادہ و معدہ، حرص و ہوس، اُناہیت اور خود پسندی اور اپنی ذات کے سارے پجاری اپنی خیر منار ہے تھے۔ یقین جانیے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے آواز آرہی تھی کہ قناعت! زندہ باد، مال و دولت کی ہوس! مردہ باد۔

مال و دولت تقرب الی اللہ کا ذریعہ

چند سالوں بعد میں نے ٹیپ ریکارڈر سے حضرت کی، ہندوستان کے معاشی دارالحکومت اور تجارتی راج دھانی بمبئی کی ایک تقریر سنی، جس میں حضرت نے مال و دولت کی فضیلت اور اُس کے ذریعے بھلائی کے بے شمار کاموں کے انجام پذیر ہونے کا تذکرہ کیا تھا۔ حضرتؒ نے اس تقریر میں خیر کے اتنے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا، جن کی طرف عموماً لوگوں کا ذہن نہیں جاتا اور کارِ خیر میں سبقت کرنے والے اور اسلامی و انسانی سرگرمیوں کی انجام دہی پر مال و دولت کا دہانہ کھول دینے والے سعادت مند انسانوں کی توجہ کا، وہ کسی طرح اور کبھی بھی باعث نہیں بنتے۔ اس تقریر کو سن کر میں اور میرے بہت سے شرکاء مجلس خوشی کے مارے اچھلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ مجلس کی فضا، آس پاس کی دیواریں، ارد گرد کے درخت اور سارے سننے والوں کی زبانیں بے خود ہو کر داد دے رہی ہیں اور ہر طرف سے اللہ اکبر، واہ واہ، خوب بہت خوب، سبحان اللہ اور جلیل القدر و فرید العصر مقرر کے لیے دعاؤں کی آوازیں آرہی تھیں۔

اُس وقت دل میں اس خیال نے طاقت سے انگڑائی لی کہ دنیا کی سب سے بڑی بہتری اور برتری، کارِ خیر کے لیے دولت کا حصول ہے؛ کیوں کہ دنیا کی اُن گنت بھلائیاں ایسی ہیں، جنہیں صرف اور صرف مال و دولت کے ذریعے ہی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ گویا اُن کارِ ہائے خیر کے حوالے سے، خدا کا تقرب اُسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے، جب آدمی مال و دولت سے بہرہ ور ہو؛ لہذا مال و دولت تقرب الی اللہ اور اُس کی جنت کے حصول کا یقینی ذریعہ ہے، بہ شرطے کہ تقرب الی اللہ کے لیے، اُس کو خرچ کرنے کی توفیق میسر رہے۔

بہت سے لوگ محض مال و دولت کے حصول اور دنیوی وسائل کے جٹانے کو ہی بہت بُرا سمجھتے ہیں اور اس سمت کے کسی راہی کے حوالے سے، اُن کا خیال ہمیشہ منفی اور

بہت بُرا ہوتا ہے۔ حضرت کی تقریر سن کر اندازہ ہو گیا کہ محض مال لعنت نہیں؛ بل کہ دنیوی عیش میں پڑ کر آخرت کو فراموش کر بیٹھنا اور حاصل شدہ یا حاصل کردہ مال کو اپنی ذاتی ”ہنرمندی“ کا نتیجہ اور اپنے ہاتھ کا کھیل اور اپنی محنت کا صلہ سمجھنا، یا مال کے حصول میں حلال و حرام کی تمیز نہ کرنا اور اُس کے حوالے سے اللہ کے احکام کی پیروی نہ کرنا اور فقر و مساکین کا حق نہ دینا اور زکات و صدقات کو ضیاع مال کا ذریعہ باور کرنا، یہ دونوں باتیں بُری ہیں اور خدا کی لعنت کا ذریعہ ہیں۔ حصول مال و زر بُرا نہیں؛ بل کہ غلط طریقے سے اُس کا حصول اور غلط جگہوں میں اُس کا خرچ بُرا ہے۔

اسی طرح محض فقر محمود نہیں، اگر محمود ہوتا تو اللہ کے رسول اُس سے صبح و شام اس طرح کیوں پناہ مانگتے جیسے کفر سے پناہ مانگتے تھے۔ ہاں اگر اللہ نے اپنی تقدیر اور حکمت سے فقیر بنا دیا ہو، تو اللہ پر توکل، تھوڑے پر قناعت کو، اُنپا اور اُن کے سچے جانشین کی طرح، اپنا شیوہ بنانا چاہیے اور اُس سے پیدا شدہ ہم دردی، غم خواری، تواضع، انکساری، رجوع الی اللہ کی کیفیت، رقتِ قلب، وغیرہ کو بہت غنیمت جاننا چاہیے کہ اللہ نے اتنا سارا ”مال و دولت“ عطا کیا ہے۔ یقیناً انھیں ہم آخرت کا ذخیرہ، جنت کا زینہ، رضاے الہی کا ذریعہ اور اُس کی دید کا سبب بنا سکتے ہیں اور صبر کر کے اللہ پاک کے بے شمار ثواب و انعام کا مستحق بن سکتے ہیں، جو صرف صابرین اور اجرِ الہی کا یقین رکھنے والوں ہی کو ملے گا۔

تقریر کی لذت کی بے پناہی کے، اُن گنت اسباب

اُن کی تقریر کی لذت کی بے پناہی کے بہت سے اسباب تھے۔ اُن کا علم، بے پناہ تھا، عمل بے ریا تھا، اخلاص اُن کی شخصیت کی کلید تھی، حلم و کرم سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ اُن کے یادداشت کا سرمایہ نہ ختم ہونے والا عجیب سا خزانہ تھا۔ اُن کی ذہانت بڑی اُتھاؤ تھی۔ اسلاف کی علمی و کتابی صحبت کا ایسا فیض یافتہ مقرر، برصغیر کی خاک سے خال خال ہی اٹھا

ہے۔ اُن کی شخصی نستعلیقیت؛ اُن کا مردانہ جمال؛ اُن کی معصوم سی موہنی صورت؛ جسمانی ساخت کا اعتدال؛ اُن کے چہرے کی دمک؛ آنکھوں کی چمک؛ سفید سرخ رنگ؛ اُن کا حسن قامت؛ شیروانی کی نفاست؛ کلاہ تاج نما کی رفعت؛ خوب صورت اور نازک سی اُن کی چھڑی کا اُن کے ہاتھ میں چلنا؛ کرسی خطابت پر اُن کی باوقار نشست؛ فضول گوئی سے احتراز؛ مفید دنیا و آخرت باتوں پر اکتفا؛ زبان و افکار پر قابو؛ نشست و برخاست، قیام و قعود، حرکات و سکنات میں غیر معمولی سنجیدگی؛ اُن کے ظاہری روئے روشن پر اُن کے باطنی نور کا غارہ جمال، جو اُن کے سارے وجود پر نور افشانی کرتا تھا؛ اُن کا موروثی اعلیٰ و ارفع حسب، جو اُن کے لیے فرشتے جیسی معصومیت کا ضامن تھا اور جس کی وجہ سے لوگ اُن سے بے اختیارانہ اور بے تحاشا محبت کرتے تھے؛ یہ اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں تھیں، جو اُن کی ذات کو بے مثال علمی، دینی، قائدانہ، خطیبانہ شخصیت کا روپ دیتی تھیں، اُسی شخصیت کو لوگ ”حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند“ کہتے اور لکھتے تھکتے تھے، نہ اُکتاتے تھے۔ اُس شخصیت میں جادو کا اثر تھا، تازگی اور مسرت بخش کپسول کی طاقت تھی۔ یعنی وہ ایک ایسی شخصیت تھی جو حضرت حکیم الاسلام کی شکل میں پائی گئی اور اُنھی پر ختم ہو گئی۔ اُن کے بعد مولانا رومؒ کا چراغ لے کر بھی تلاش بسیار کے باوجود مل سکی نہ اب کبھی ملے گی۔ رہے نام اللہ کا۔

بسیار خوباں دیدہ ام؛ لیکن تو چیزے دیگری (*)

سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: (مولانا قاری) محمد طیب بن محمد احمد بن (حجۃ الاسلام مولانا) محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد ہاشم بن شاہ محمد بن قاضی طہ بن مفتی مبارک بن

(*) یہ تحریر بہ راہ راست اردو میں بہ روز یک شنبہ ۲۰ شوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۲ نومبر ۲۰۰۶ء ۱۰ بجے دن میں، حکیم الاسلام سیمینار منعقدہ ۲۳، ۲۴، ۲۵ شوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ نومبر ۲۰۰۶ء کے لیے لکھی گئی۔

قاضی جمال الدین بن قاضی میران، جن کا سلسلہ نسب حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

✽ پیدائش اور تعلیم: محرم ۱۳۱۵ھ / جون ۱۸۹۷ء بہ روز اتوار دیوبند میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا۔ بعد میں محمد طیب تجویز کیا گیا، آپ نے اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ اور آپ کے والد محترم مولانا حافظ محمد احمدؒ کی موجودگی میں آپ کی بسملہ اللہ کرائی گئی۔ ۲ سال کی مدت میں ہی قرآن پاک مع تجوید حفظ کیا، حفظ قرآن پاک کے بعد درجہ فارسی میں داخل ہوئے اور پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کیا، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے شعبہ عربی میں داخل ہوئے اور آٹھ سال کی مدت میں دارالعلوم کی ساری نصابی کتابیں مکمل کرنے کے بعد ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء میں سند فضیلت حاصل کی، حدیث میں آپ کے خصوصی استاذ محدث کبیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ آپ کو وقت کے مشاہیر علما سے بھی خصوصی سند حدیث حاصل ہوئی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بہ طور خود آپ کو سہارنپور طلب فرما کر اوائل حدیث کی تلاوت کرا کر، اپنی خصوصی سند خود اپنے دست مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی، اسی طرح مولانا عبداللہ انصاری اور اپنے والد ماجد مولانا محمد احمد سے بھی سند حدیث لی۔

✽ بیعت و خلافت: آپ ۱۳۳۹ھ میں یعنی دارالعلوم سے فراغت کے دو سال بعد، شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، ترکیہ و احسان کی منزلیں طے ہی کر رہے تھے کہ شیخ الہندؒ کی وفات ہو گئی۔ ۱۳۳۳ھ میں آپ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور انھی کے زیر تربیت سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں۔ ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔

✽ تدریس: فراغت کے بعد آپ نے مادر علمی میں درس دینا شروع کیا اور مختلف علوم و فنون کی اہم کتابیں پڑھائیں، خصوصیت کے ساتھ ”حجة اللہ البالغۃ“ تقریباً ہمیشہ ہی آپ کے درس میں رہی، اس کے علاوہ ابن ماجہ شریف، مشکاۃ شریف اور شمائل ترمذی کا بھی آپ نے سال ہا سال درس دیا، ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۷ھ تک آپ نے مستقلاً درس دیا، اُس کے بعد اہتمام کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بھی آپ نے ”حجة اللہ البالغۃ“ کا درس تقریباً آخر تک جاری رکھا۔

✽ منصب اہتمام کے لیے انتخاب: ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ فائز کیے گئے جس پر اوائل ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۸ء تک فائز رہے۔ وسط ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں آپ کو مہتمم منتخب کیا

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ
گیا۔ اس عہدے پر آپ تقریباً تاحیات فائز رہے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں، دارالعلوم کی تعمیر، تعلیمی، تنظیمی، ترقی،

اور مشاہیر وقت کی آمد پر ایک طائرانہ نظر

✽ آپ نے سب سے پہلے دارالعلوم کی مسجد قدیم کی بالائی منزل تعمیر کی۔

✽ ۱۳۴۹ھ میں دارالحدیث کی پر شکوہ عمارت، جو عرصے سے زیرِ تعمیر تھی آپ کے مساعی سے تکمیل کو پہنچی۔

✽ دورہ تفسیر کا اجرا: ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں آپ کے دورِ اہتمام میں دورہ تفسیر کا اجرا عمل میں آیا۔

✽ دارالحدیث فوقانی کی تعمیر: ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں دارالحدیث فوقانی کی عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا اور چند سالوں میں اُس کی تکمیل ہوئی۔

✽ اسی سال قواعد داخلہ میں اصلاح و ترمیم کی گئی

✽ نیز کھانے کے کٹکٹ کا اجرا ہوا۔

✽ صدارتِ اہتمام: ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو صدر مہتمم منتخب کیا گیا۔

✽ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ دارالعلوم کی سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔

✽ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں تین شعبوں کا قیام ہوا: شعبہ تنظیم و ترقی، شعبہ محافظ خانہ،

شعبہ ورزش۔

✽ علمائے مصر کا وفد: ۲۰ رزی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو جامعہ ازہر کے علما کا ایک مؤقر وفد دارالعلوم آیا

جس نے دارالعلوم کا معائنہ کیا اور اساتذہ کی محنت اور تعلیم و تدریس کی جامعیت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوا۔

✽ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں چند جدید عمارتیں: درجہ فارسی کی درس گاہ ”یادگار سعدی“ کے

نام سے تعمیر ہوئی، دوسری محافظ خانہ کی دو منزلہ عمارت جو دارالاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے، تیسری

عمارت دارِ جدید کی تکمیل سے متعلق ہے جو مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی کے دور میں تعمیر

ہونا شروع ہوئی تھی، لیکن اُس کی تکمیل حضرت حکیم الاسلام کے دور میں پایہ انجام کو پہنچی۔

✽ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء حافظ محمد ابراہیم وزیرِ رسل و رسائل کا ورود دارالعلوم: جنھوں

نے دارالعلوم کوریلوے اسٹیشن سے ملانے کے لیے باب الظاہر سے سڑک تعمیر کرنے کی منظوری دی۔
 ✽ سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ: اسی سال یعنی ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، جس کے دوران اُن کی سلطان ابن سعود سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کتب خانہ دارالعلوم کے لیے حکومت حجاز کی جانب سے شائع کردہ کتابیں عنایت فرمائیں۔
 ✽ حکیم الاسلام کا سفر افغانستان: دارالعلوم دیوبند میں ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تبریک و تہنیت کا جلسہ منعقد ہوا، پس موقع پر مجلس عاملہ نے طے کیا کہ دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اور اُن کو مستحکم بنانے کے لیے، مہتمم صاحب دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے، کابل تشریف لے جائیں، چنانچہ آپ کا یہ سفر ہوا اور آپ نے وہاں دارالعلوم کا زبردست تعارف کرایا۔
 ✽ دارالنفیس کی تعمیر: ۱۳۵۸ھ میں دارالحدیث کی بالائی منزل کی درس گاہ دارالنفیس کے نام سے تعمیر کی گئی، دارالنفیس کے اوپر ایک پُر شکوہ گنبد بنایا گیا، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھ دیا گیا ہے۔

✽ باب الظاہر کی تعمیر: ۱۳۵۹ھ میں افغانی عطیے کے مصرف کے تعلق سے مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ چونکہ دارالعلوم کی مخصوص سڑک تیار ہوگئی ہے اور دارالنفیس کا گنبد بھی مکمل ہو چکا ہے، اس لیے دارالحدیث کے بالمقابل دارالطلبہ کے صدر دروازے کا بنوایا جانا ضروری ہو گیا ہے؛ لہذا افغانی عطیے سے، شاہ افغانستان کے نام پر صدر دروازہ تعمیر کروا کے، اُس کا نام ”باب الظاہر“ رکھا جائے۔ اس کا سنگ بنیاد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء - ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء) کے ذریعے رکھوایا گیا۔

✽ مسلم یونیورسٹی میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر: مسلم یونیورسٹی کی انجمن ”اسلامی تاریخ و تمدن“ کی جانب سے مہتمم صاحب کو ”اسلام سائنس“ کے موضوع پر تقریر کی دعوت دی گئی، آپ نے دعوت قبول کرتے ہوئے وہاں تشریف لے جا کر، مذکورہ موضوع پر معرکتہ الآراء عالمانہ و فلسفیانہ تقریر فرمائی، جو وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے حلقے میں بے حد پسند کی گئی۔

✽ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء میں دارچدید کے کمروں کی تکمیل۔

✽ ماہ نامہ دارالعلوم کا اجرا: جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ سے دارالعلوم کے نام سے ایک اردو ماہ

نامہ رسالے کا اجرا عمل میں آیا۔

✽ علامہ عثمانی کی یکسوئی: ۱۳۵۴ھ میں علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم مقرر ہوئے تھے، ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں مجلس شوریٰ نے وقتی حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تمام اختیارات مہتمم دارالعلوم مولانا قاری محمد طیب صاحب کو منتقل کر دیے اور علامہ عثمانی مستعفی ہو کر، اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو گئے۔

✽ شعبہ خوش خطی کا اجرا: ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں شعبہ خوش خطی کا اجرا عمل میں آیا۔

✽ ۱۳۶۵ھ میں دارالصنائع کا قیام: ۱۳۶۵ھ میں شعبہ تجلید سے دارالصنائع کا افتتاح

عمل میں آیا۔

✽ دارالافتا کی جدید عمارت: ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء میں دارالافتا کی متعدد کمروں پر مشتمل

عمارت بن کر تیار ہوئی اور دارالافتا کو اُس میں منتقل کر دیا گیا۔

✽ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لیے علمائے دیوبند کا انتخاب: ۱۳۶۸ھ میں پہلا موقع

تھا کہ مسلم یونیورسٹی نے، اپنے کورٹ کے لیے علمائے دیوبند کو منتخب کیا، مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی، مولانا محفوظ الرحمن نامی اور مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو کورٹ کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا۔

✽ پاکستانی طلبہ کے داخلے میں حکومت ہند کا تعاون: ہندوستان کی تقسیم کے بعد

پر مٹ سٹم (اُس وقت دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ اور ویزا نہ تھا، پر مٹ لے کر ایک دوسرے ملک میں سفر کیا جاسکتا تھا) کی وجہ سے پاکستانی علاقے کے طلبہ کی آمد و رفت بالکل بند ہو گئی تھی، بالخصوص مذہبی طلبہ پاکستان کے لیے، دارالعلوم میں حصول علم کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا، اس صورت حال کو حکومت ہند کے سامنے پیش کیا گیا، وزارت تعلیم نے دارالعلوم کی اس درخواست کو منظور کر کے ۱۳۶۹ھ میں یہ اجازت دے دی کہ جو طلبہ پاکستان سے دارالعلوم آنا چاہیں، انھیں درخواست پیش کرنے پر، ایک سال کا پر مٹ دے دیا جائے گا، جس کی بعد میں صوبائی حکومت سے توسیع کرائی جاسکتی ہے، مگر اس اجازت کے باوجود، دفتری ضوابط کی وجہ سے زیادہ عرصے تک یہ سلسلہ چل نہ سکا۔

✽ حکومت ہند کی جانب سے بیرون ہند دارالعلوم کا تعارف: اسی سال یعنی

۱۳۶۹ھ میں وزارت خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کے سلسلے میں، اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دارالعلوم کی تاریخ اور موجودہ حالات کا بیرونی دنیا، بالخصوص مشرق وسطیٰ کے ممالک میں، تعارف کرایا جائے، چنانچہ اس مقصد سے دارالعلوم کے حالات اور تصاویر لینے کے لیے، یکے بعد

دیگرے وزارت خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اراکین دیوبند آئے، جنہوں نے دارالعلوم کے معاینے کے بعد بلند الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

✽ سفیر افغانستان کی دارالعلوم میں آمد: ۷/ رجب ۱۳۶۹ھ کو سفیر افغانستان سردار نجیب اللہ خان دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے تشریف لائے، انہوں نے اس موقع سے فرمایا:

”دارالعلوم دیوبند، افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک علمی درس گاہ ہے؛

مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درس گاہ ہی نہیں؛

بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم تہا ہندوستان کا ورثہ نہیں؛ بلکہ تمام

عالم اسلام کی میراث ہے۔“

✽ مولانا آزاد کی تشریف آوری: ۲۹/ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ کی صبح کو حکومت ہند کے وزیر

تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد، دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، اس موقع سے انہوں نے دارالعلوم کے طلبہ کو خطاب کیا اور حصول علم کی راہ میں انہیں انتھک کوشش کی دعوت دی۔

✽ اچاریہ دنوبابھائے کی دارالعلوم آمد: ۲/ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ مطابق ۲/ دسمبر ۱۹۵۱ء کو

”اچاریہ دنوبابھائے“ اپنی بھومی دان تحریک کے سلسلے میں وارد دیوبند ہوئے، سات بجے شب میں دارالعلوم دیکھنے آئے اور طلبہ کی خواہش پر ان کے درمیان ایک مختصر تقریر میں کہا:

”یہ یونیورسٹی ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے، جس میں پورے ایشیا

کے نوجوان جمع ہیں، غلامی کے دور میں اس یونیورسٹی نے جو خدمت انجام دی ہے،

مجھے امید ہے کہ یہ آزادی کے دور میں اس سے بہت زیادہ عظیم الشان خدمت

انجام دے گی، انہوں نے کہا: یہی ایک ادارہ ہے جس نے پہلے دن سے برطانوی

سامراج کی مخالفت کی اور اس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے قربانیاں دیں۔“

✽ ایک مصری فاضل کا ورود: اسی سال عرب لیگ نے دارالعلوم کے نوادر مخطوطات کے

مشاہدے اور ان کے حصول کے لیے اپنے نمائندے شیخ محمد رشاد بن عبدالمطلب کو دیوبند بھیجا، انہوں نے

کتاب معاینہ میں دارالعلوم کے حوالے سے جو کچھ کہا اس میں یہ بھی لکھا کہ کوئی شبہ نہیں کہ فخر و مباہات

کے زبردست اسباب میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ میں نے اس ادارے کی زیارت کی جو مضبوط

بنیادوں پر قائم ہے؛ کیوں کہ اس کے قائم کرنے والے انتہائی مخلص اور صالح تھے۔

✽ شعبۂ طب میں اضافہ اور دارالشفاء کا قیام: ۱۳۷۲ھ میں دارالعلوم نے شعبۂ طب میں اضافہ کیا اور دارالشفاء میں سات معلمین، چھ کارکن اور دوا کی تقسیم کے لیے افراد میں اضافہ کیا۔

✽ مملک حجاز کا پیغام تبریک و عطیہ: مسجد نبوی میں توسیع کے ارادے اور اُس کے لیے نقشہ تیار کیے جانے کے موقع سے ۱۳۷۳ھ میں دارالعلوم نے اپنی طرف سے شاہ سعود کو مبارک باد پیش کی، جس کے جواب میں شاہ سعود نے اپنے سفیر مقیم ہند کے ذریعے دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا، اتفاق سے اسی سال شاہ سعود ہندوستان تشریف لائے اور دارالعلوم کو بہ طور خاص ۲۵ ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا۔

✽ انور السادات کی دارالعلوم آمد: اسی سال عرب جمہوریہ مصر کے، بعد میں ہونے والے صدر محمد انور السادات، جو اُس وقت ”مؤتمر اسلامی“ کے جنرل سکریٹری تھے دارالعلوم تشریف لائے، اس موقع سے انھوں نے کتاب معاینہ میں بڑے اچھے تاثرات رقم کیے، جن میں لکھا کہ اس عظیم دینی اور تاریخی درس گاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں بہ صمیم قلب اپنے بھائیوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کروں جو اس عظیم ادارے کو چلا رہے ہیں۔

✽ امریکہ اور یورپ میں دارالعلوم کا تعارف: اسی سال یعنی ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں کناڈا یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ایک ریسرچ اسکالر کی طلب پر، دارالعلوم کی علمی و دینی تاریخ پر، ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بھیجا گیا، جو امریکہ اور یورپ کے علمی حلقوں میں دارالعلوم کے تعارف کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا۔

✽ مصر سے دارالعلوم کے روابط: مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری محمد انور السادات کی آمد کے موقع پر حکیم الاسلامؒ نے، موصوف سے جملعہ از ہر اور دارالعلوم کے مابین روابط قائم کیے جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، مؤتمر اسلامی اور جملعہ از ہر میں مہتمم صاحب کی اس تجویز کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا اور ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء میں جملعہ از ہر مصر سے دو جلیل القدر آساتذہ شیخ عبد المنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقبانی کو دو سال کے لیے، دارالعلوم میں جدید عربی ادب اور انشائی تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔

✽ دارالعلوم کی مسجد میں توسیع: اسی سال یعنی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء میں مسجد کے حوض کو وسط صحن سے ہٹا کر مشرق کی جانب، دارالافتا کی عمارت کے نیچے بنایا گیا، جس سے مسجد کے صحن میں کشادگی پیدا ہو گئی، اسی کے ساتھ سردی کے موسم میں گرم پانی کے لیے ایک ٹنکی تیار کرائی گئی۔

✽ فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین: حضرت مہتمم صاحب کی اس تجویز کو مجلس شوریٰ نے پسند کیا

کہ فتاویٰ دارالعلوم کو فقہی ترتیب پر ابواب وار مرتب کر کے شائع کیا جائے، چنانچہ ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء سے تدوین و ترمیم فتاویٰ کا کام مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی کے سپرد ہوا، فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی۔

✽ صدر جمہوریہ ہند کی دارالعلوم میں آمد: ۱۳/ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ/ ۱۳/ جولائی ۱۹۵۷ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد دارالعلوم تشریف لائے، اس موقع سے ایک عظیم الشان جلسے کو صدر جمہوریہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

”دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اس ملک کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی؛ بل کہ انھوں نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پا کر اپنے ملکوں میں واپس جا کر اُس کی اشاعت کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم میں جو علم سکھایا جاتا ہے اُس سے صرف دارالعلوم یا مسلمانوں کی خدمت نہیں؛ بل کہ پورے ملک اور پوری دنیا کی خدمت ہوتی ہے۔ آج دنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے، اُس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لیے مہیا فرما رہے ہیں۔“

✽ حکیم الاسلام کا سفرِ برما: اسی سال یعنی ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء میں مہتمم صاحب نے برما کا سفر کیا، اُن کا یہ سفر ۱۵ جمادی الاولیٰ سے ۲۸/ رجب تک جاری رہا، جس کے دوران انھوں نے برما کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور عوام و خواص کے جلسوں کو خطاب کیا، جس سے دارالعلوم کے تعارف اور حلقہ اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

✽ شاہِ افغانستان کا ورود: ۵/ شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵/ فروری ۱۹۵۸ء کو شاہِ افغانستان محمد ظاہر شاہ بہ ذریعہ کار دہلی سے دارالعلوم تشریف لائے، یہاں اُن کا شان دار استقبال کیا گیا، شاہِ افغانستان نے دارالعلوم کے دارجید کے احاطے میں ۲۰ ہزار افراد کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ملا، یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور پر وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے، افغانستان کے علماء دارالعلوم کے بانیوں اور یہاں کے

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

اساتذہ کو عزت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، افغانستان میں اس دارالعلوم کی شہرت محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ایک مشہور ادارہ ہے؛ بل کہ دراصل یہ نتیجہ ہے اُن تعلقات کا جو افغانستان اور اس دارالعلوم کے درمیان عرصہ دراز سے قائم رہے ہیں۔

● شعبہ تنظیم فضلاء دارالعلوم: ۱۳۷۸ھ میں فضلاء دارالعلوم کی تنظیم قائم کی گئی، جو ایک دیرینہ آرزو تھی۔

● حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ: ۶ محرم ۱۳۷۹ھ کو ہم دردان دارالعلوم کی دعوت پر حکیم الاسلامؒ نے ری یونین کا سفر فرمایا۔ اس سفر کے دوران زنجبار، دارالسلام، موریشس، مڈغاسکر اور ری یونین کے مختلف شہروں کا دورہ کیا، وہاں کے باشندوں نے جگہ جگہ جلسے کیے، جنہیں حکیم الاسلام نے خطاب کیا۔

● دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جو بلی میں دارالعلوم کی نمائندگی: دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے جنوری ۱۹۶۰ء میں بڑے پیمانے پر جو بلی منانے کا انتظام کیا، اُس میں نمائندگی کے لیے دارالعلوم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔

● صدر جمال عبدالناصر کے لیے دارالعلوم کی طرف سے علمی ہدیہ: مارچ ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ہندوستان کا دورہ کیا، انھیں دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب، قاہرہ میں اپنی موجودگی کے دوران دارالعلوم آنے کی دعوت دے چکے تھے؛ لیکن صدر کے ہندوستان آمد کے وقت شوال کا پہلا ہفتہ تھا، جو دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ ہوتا ہے؛ اس لیے مہتمم دارالعلوم نے خود دہلی پہنچ کر جمال عبدالناصر سے ملاقات کی اور دارالعلوم کی طرف سے فیض الباری، فتح مہملہ اور سوانح قاسمی کے نسخے، علمی ہدیے کے طور پر پیش فرمائے، صدر ناصر نے کھڑے ہو کر بڑی عقیدت سے قبول کیا اور موقع الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

● جامعہ طیبیہ کا اجرا: ۱۳۸۰ھ میں جامعہ طیبیہ کی باقاعدہ عمارت بنی، جس میں چار سالہ نصاب کے ذریعے فرق طب کی علمی اور عملی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

● ڈاکٹر پی ہارڈی کی آمد: اسی سال لندن یونیورسٹی میں ”شعبہ تعلیم اسلام“ کے لکچرار ڈاکٹر ”پی ہارڈی“ اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلے میں دیوبند آئے اور ایک ہفتہ دارالعلوم میں قیام کیا، وہ دارالعلوم سے بہت متاثر ہوئے اور کتاب معاینہ میں عقیدت مندانہ تاثرات لکھے۔

● مسٹر ہمایوں کبیر کی آمد: جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ میں مرکزی حکومت کے وزیر ثقافت

وسانسی تحقیقات ”پروفیسر ہمایوں کبیر“ دارالعلوم دیوبند آئے اور انھوں نے خیر مقدمی جلسے میں دارالعلوم کی دینی اور ملکی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور فرمایا: ”یہ دارالعلوم ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے۔“

✽ کتب خانہ کی ترتیب نو: ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کے کتب خانے کی مزید ترتیب کی ضرورت پیش آئی، اس کے لیے مجلس شوریٰ کی تجویز سے مولانا مفتی ظفر الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا، موصوف نے بڑی جگر کاوی سے، فہرست سازی کا کام انجام دیا، نیز مخطوطات کی تعارفی فہرست بھی تیار کی۔
✽ شام کے جلیل القدر عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی آمد: اسی سال جامعہ حلب شام کے استاذ جلیل شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے دارالعلوم کو دیکھ کر جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ غیر معمولی نوعیت کے ہیں، انھوں نے اس موقع سے مشائخ دارالعلوم کی اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کی دعوت دی۔

✽ حکیم الاسلام کا سفر افریقہ و مصر: ۱۳۸۳ھ میں حکیم الاسلام نے دو بیرونی سفر کیے، پہلا سفر جنوبی افریقہ کا تھا، دوسرا مصر کا۔ یہ دونوں سفر مختلف حیثیتوں سے دارالعلوم کے لیے مفید ترین ثابت ہوئے۔ آپ کا یہ سفر اوائل محرم ۱۳۸۳ھ میں شروع ہوا، جس وقت آپ جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر اترے، تو جنوبی افریقہ کے چاروں صوبوں کے مسلمانوں کا نمائندہ اجتماع خوش آمدید کہنے کے لیے مجتمع تھا، جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھا، جوہانسبرگ کے ڈچ میئر ”اوربر ہولز“ خیر مقدم کے لیے، اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے، آپ نے اس موقع سے ڈربن اور کیپ ٹاؤن کا دورہ کیا اور بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کیا۔

دوسرا سفر: ۱۹ شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو ”عالمی مؤتمر اسلامی“ قاہرہ کی دعوت پر ہوا، اس مؤتمر میں دنیا بھر کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی، ہندو پاک کے نمائندے سب کے سب فضلاء دیوبند تھے، دارالعلوم کے وفد میں مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے علاوہ مولانا سید منت اللہ رحمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی تھے، مؤتمر کے بعد حکیم الاسلام اور مولانا منت اللہ رحمانی قاہرہ سے حج بیت اللہ کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے، اس دوران جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور اپنے اعزاز میں منعقدہ خیر مقدمی جلسے سے خطاب کیا، جس کے دوران آپ نے دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ ۶ محرم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹ مئی ۱۹۶۳ء کو حکیم الاسلام دیوبند واپس تشریف لائے۔

✽ مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت: وٹیان بھون دہلی میں مستشرقین

کی بین الاقوامی کانگریس کا ۲۶واں اجلاس جنوری ۱۹۶۴ء کی شروع تاریخوں میں منعقد ہوا، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کی درخواست پر، دارالعلوم کے منتخب مخطوطات اس موقع پر پیش کیے گئے، مستشرقین نے انھیں خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، کانگریس میں یہ شرکت دارالعلوم کے وسیع تعارف کا ذریعہ بنی۔

✽ عربی مجلہ دعوت الحق کا اجرا: ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم کے حلقے کو وسیع تر بنانے کے لیے ایک سہ ماہی عربی مجلہ دعوت الحق کے نام سے نکالا گیا، جس کے چیف ایڈیٹر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ تھے۔

✽ اتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد: ۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء کو اتر پردیش کے گورنر ”وشواناتھ داس“ دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر جلسہ عام میں اپنے گہرے اور گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا۔

✽ دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں: اسی سال مرکزی حکومت کی طرف سے ”ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے“ کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا، جس میں دارالعلوم دیوبند کا مختصر، لیکن بہت اچھا تعارف کرایا گیا۔

✽ کتب خانے کا جدید ہال: ۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانے کی توسیع کے لیے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اضافہ ہوا، یہ ہال عربی زبان کی کتابوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔

✽ علمائے دیوبند کی تصانیف: اسی سال دارالعلوم کے کتب خانے میں تصانیفِ علمائے دیوبند کے لیے ایک گوشہ مخصوص کیا گیا اور ان کی کتابیں ایک جگہ جمع کی گئیں۔

✽ مصر، شام اور اردن کے لیے امداد: ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ ملتِ اسلامیہ کا ایک ایسا اندوہناک واقعہ تھا، جس سے پورا عالم اسلام بری طرح متاثر ہوا، دنیا بھر میں اسلام بالعموم مظلوم عربوں کی امداد و اعانت میں حصہ لے رہی تھی، دارالعلوم نے بھی اپنی سابقہ روایت کے تحت، اس کے لیے ملک کے مسلمانوں سے اپیل کی اور ایک خطیر رقم فراہم کر کے مصر، شام اور اردن کی حکومتوں کو پیش کی گئی۔

✽ مغربی ممالک کے ریسرچ اسکالرشپ: دارالعلوم آمد: ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۷۰ء میں امریکہ سے ”مسز گیلی گراہم“، جرمنی سے ”مس کیری ڈیٹ میرا“ اور کیلی فورنیا سے ”مسز مکاف“ اپنے تحقیقی

مقالے کی تیاری کے لیے دیوبند آئیں اور دارالعلوم کے کتب خانے سے استفادہ کیا، جرمن طالبہ نے اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ: ”مجھے دارالعلوم میں توقع سے زیادہ مواد ملا، مجھے امید نہیں تھی کہ میرے تحقیقی مقالے کے تعلق سے، یہاں کی لائبریری میں اتنا زیادہ مواد مل سکے گا۔“

✽ عرب ممالک کے زائرین کے تاثرات: رجب ۱۳۸۹ھ میں عرب ملکوں میں سے مراکش، الجزائر اور شرقی اردن کے چند حضرات دارالعلوم تشریف لائے اور اپنے گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا۔

✽ مسجد چھتہ میں تعمیر: ۱۳۸۹ھ میں چھتہ مسجد کے شمالی حجرے، جس میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا قیام رہا کرتا تھا، کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔

✽ نصاب تعلیم میں تبدیلی: ۱۳۹۰ھ میں دارالعلوم میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی جس کے نتیجے میں حسب ذیل تبدیلیاں زیرِ عمل آئیں۔

۱- نصاب تعلیم میں درجہ بندی کو لازم قرار دیا گیا، اس سے قبل کتاب وار طریقہ تعلیم جاری تھا۔

۲- نصاب تعلیم میں کچھ کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔

۳- درجات کی تکمیل کے سلسلے میں تکمیلِ تفسیر، تکمیلِ دینیات، تکمیلِ معقولات اور تکمیلِ ادب کا

اجرا کیا گیا۔

✽ جدید تعمیرات: ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں مندرجہ ذیل اضافہ ہوا:

۱- دارالشفاء جامعہ طبیہ کی نامکمل عمارت مکمل ہو گئی۔

۲- دارالشفاء کے شمال میں افریقی طلبہ کے لیے ”افریقی بلڈنگ“ کے نام سے ایک عمارت تعمیر ہوئی۔

۳- جدید دارالاقامہ (دارجدید) کے کچھ کمروں میں تعمیری تعمیر کر کے، اُن کو غلے کا گودام بنایا گیا۔

✽ آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر کی دارالعلوم آمد: اسی سال آل انڈیا زرعی کمیشن

کے ایک ممبر ”چودھری رندھیر سنگھ“ نے دارالعلوم کا دورہ کیا اور جلسہ عام میں دارالعلوم کی تعریف میں پُر جوش تقریر کی۔

✽ حکیم الاسلام کا سفر یورپ: ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں حکیم الاسلام نے

انگلستان، فرانس اور مغربی جرمنی کا سفر کیا، یہ سفر ۱۵ شعبان ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا، اس کے دوران آپ نے

انگلستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا، جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں: گلوئسٹر، بریڈ فروڈ باٹے، بلیک

برنڈ، برسٹنگ، بولٹن، شیفلڈ، کوٹری، برمنگھم، راجڈیل، وال سول اور لندن، اس دوران آپ نے بڑے

بڑے اجتماعات کو خطاب کیا اور بریڈ فورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کی خواہش پر، اُن کے ایک جلسے میں بھی تقریر کی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ء تک انگلستان میں قیام رہا، وہاں سے واپسی میں ”پیرس“ جانا ہوا وہاں کے دو جلسوں میں عربی میں تقریریں کی، پیرس سے ”مغربی جرمنی“ کا سفر ہوا اور وہاں سے مکہ مکرمہ حاضری ہوئی، عمرہ اور روضہ اقدس کی زیارت کے بعد ”کویت“ کا سفر ہوا، وہاں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی۔

✽ مصری ثقافتی وفد کی آمد: اسی سال ”محمد توفیق عویضہ“ کی قیادت میں مصر کا ایک وفد دہلی سے بذریعہ کار دیو بند پہنچا، وفد نے ملاقات کے دوران کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں علامہ رشید رضا کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ ”ہندوستان میں جس شخص نے دارالعلوم کو نہیں دیکھا، اُس نے کچھ بھی نہیں دیکھا“۔

✽ جاپانی وفد کی آمد: ۷ ستمبر ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) کو بذریعہ کار دہلی سے ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کے اردو پروفیسر ”تاکیش سوزا“ اور تاریخ کے پروفیسر ”مت میو آرا“ ایک اسکا لرخاتون کے ساتھ دارالعلوم آئے اور دارالعلوم کی معلومات حاصل کیں، وہ یہاں کے ماحول اور سکون فضا سے بہت متاثر ہوئے۔

✽ رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی آمد: ۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب سے دو وفد دارالعلوم آئے، ایک وفد ”رابطہ عالم اسلامی“ مکہ مکرمہ کی جانب سے، دارالعلوم آیا جو دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہا تھا، اس وفد کے سربراہ ”سید ابراہیم ثقاف“ تھے اُس کے کچھ عرصے بعد دوسرا وفد شعبان ۱۳۹۴ھ کے اوائل میں آیا، اُس میں وزارت معارف کے ڈائریکٹر اور ”ادارہ مباحث اسلامیہ“ کے نمائندے شامل تھے۔ ان حضرات نے دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد، اُسے علم کارون مینارہ، عرفان و معرفت کا مرجع اور طالبین ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیا۔

✽ گورنر اتر پردیش کی آمد: ۱۳۹۳ھ کے اواخر میں اتر پردیش کے گورنر ”اکبر علی خان“ دارالعلوم دیکھنے آئے اور بلند الفاظ میں دارالعلوم کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا، اس موقع پر انھوں نے دیوبند میں ”بھارت ڈگری کالج“ کا سنگ بنیاد رکھا۔

✽ دارالقضا کا قیام: ۱۳۹۴ھ میں مسلم پرسنل لا اور قوانین شریعت کے تحفظ و بقا کے لیے عملی طور پر محکمہ قضا قائم کیا گیا۔

✽ حکیم الاسلام کا سفر افریقہ و حجاز و یورپ: اوائل شعبان ۱۳۹۵ھ میں مشرقی افریقہ کے ملک ”ری یونین“ میں ”سینڈ پیٹز“ کے مقام پر حکیم الاسلام نے عالی شان مسجد کا افتتاح فرمایا، وہاں سے ”رابطہ عالم اسلامی“ کی دعوت پر ”رسالہ المسجد“ کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے

پس مرگ زندہ

گئے۔ اس اجلاس میں مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید منت اللہ رحمانی اراکین شوریٰ دارالعلوم نے بھی شرکت کی۔ مکہ مکرمہ سے حکیم الاسلام پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے لندن تشریف لے گئے اور وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب کیا۔

✽ شیخ الازہر اور دیگر علمائے عرب کی آمد: ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبد الرحمن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خالد اور سابق شیخ الازہر شیخ محمد الحام دارالعلوم تشریف لائے، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے اپنے خطاب میں کہا کہ: ”میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، رفعتِ علم اور اخلاص وللہیت ہی کے یہ آثار ہیں، جو اس ادارے میں دیکھے جا رہے ہیں۔“ شیخ محمد الحام نے اپنے خطاب میں فرمایا: ”میں ایک زمانے سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کا مشتاق تھا، میرا یہ اشتیاق دن بدن بڑھتا رہا، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت اُس وقت تک نہ آئے جب تک میں دارالعلوم کی زیارت نہ کر لوں۔ الحمد للہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی، جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا، وہ اُس سے بہت زیادہ ہے جو میں نے سنا تھا۔“

✽ ان حضرات کے چند روز بعد علمائے عرب کی ایک دوسری جماعت آئی جس میں یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومت کویت، استاذ عبد الرحمن مدیر البلاغ کویت اور قطر کے شیخ عبد المعز عبد الستار کے ساتھ ”تاشقند“ کے نمائندے، ”شرف الدین محمود“ وغیرہ شامل تھے۔ سارے عرب مہمانوں نے دارالعلوم کو دیکھ کر جلسہ عام میں دارالعلوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

✽ صدر جمہوریہ ہند کی آمد: ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد دارالعلوم کی زیارت کو دہلی سے بذریعہ ہیلی کوپٹر تشریف لائے۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ اور گورنر کے علاوہ چند مرکزی اور صوبائی وزراء بھی ہم رکاب تھے۔

صدر جمہوریہ نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ یہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بل کہ پوری دنیاے اسلام کی ایک اہم عظیم تاریخی اور دینی درس گاہ ہے، میں اس کے اکابر اور اساتذہ کے خلوص اور اسلامی سادگی سے بے حد متاثر ہوں۔

✽ صد سالہ اجلاس منعقدہ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء سے معاہدہ کی گئیں اہم تعمیرات:

۱- ”دار جدید“ کے نام سے مشہور دارالاقامہ کی دوسری منزل پر دیویوں کمرے تعمیر کیے گئے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

- ۲- دارالحدیث تحتانی کی شمالی و جنوبی جانب دوسری منزل پر دو بڑی درس گاہیں تعمیر ہوئیں۔
- ۳- دارالعلوم کی مرکزی عمارت کے دونوں جانب شمال و جنوب کے مناروں کو سہ منزلہ تعمیر کیا گیا، پہلے یہ دونوں دو منزلہ ہی تھے۔
- ۴- مسجد قدیم میں ترمیم و اصلاح کی گئی اور دونوں منارے اونچے کیے گئے۔ مسجد کا صدر دروازہ تعمیر کیا گیا، نیز مسجد کے حوض کو اور مشرقی جانب منتقل کیا گیا اور پہلے سے بڑا تعمیر کیا گیا۔
- ۵- احاطہ باغ کو احاطہ دار جدید سے جوڑنے کے لیے راستہ بنایا گیا۔
- ۶- احاطہ باغ کی بالائی منزل پر بہت سے چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر ہوئے۔
- ۷- تعلیمات کی دوسری عمارت اسی جگہ پر پہلے سے کشادہ اور ضرورت کے مطابق تعمیر کی گئی۔
- ۸- دارالعلوم کے صدر گیٹ ”باب قاسم“ کو از سر نو ترمیم کے ذریعے پہلے سے زیادہ اچھا اور جاذب نظر کیا گیا۔

۹- احاطہ کتب خانہ میں ہمہ جہت دو منزلہ گیلری تعمیر کی گئی۔

۱۰- دارالنفیس کے گنبد کی تزئین کاری کی گئی۔

● اسفار: حکیم الاسلام نے برصغیر سمیت، ایشیا، امریکہ، یورپ اور افریقہ کے کونے کونے اور شہروں اور دیہاتوں کا اتنا سفر کیا کہ کم مشاہیر ہند کو اتنے اسفار کا موقع ملا ہوگا۔ انھوں نے اپنے اسفار، ملاقاتوں اور دوروں سے دارالعلوم کے کام، مقام اور نام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ وہ جہاں گئے اُن کی ذات و صفات اور علم و کمال کا لائٹنی امتیاز، نقشِ جاوداں چھوڑ آیا اور ہر جگہ کے لوگوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت یہ گواہی دی کہ یہ فرشتہ صفت، مؤمنی صورت انسان، جس مذہب اور جس ادارے سے وابستہ ہے، وہ یقیناً سچے اور حق و صداقت کے نمائندے ہیں۔

● اہم علمی نقوش: سائنس اور اسلام ● اسلام میں اخلاق کا نظام ● فطری حکومت ● خاتم النبیین ● اسلام اور مسیحی اقوام ● حدیث کا قرآنی معیار ● کلمہ طیب ● دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات ● قوموں کی ترقی و زوال کے اسباب ● مذہب و سیاست ● دعوتِ اسلامی کے اصول ● اسلامی مساوات ● اجتہاد و تقلید۔

اس کے علاوہ اُن کی تقریروں کا مجموعہ بھی دسیوں جلد میں چھپ چکا ہے اور اُن کا شعری دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔

دارالعلوم میں خلفشار اور اہتمام سے استعفا: ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں دارالعلوم میں اختلاف اور خلفشار رونما ہو جانے کے بعد، آپ نے ۱۸/ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ۹/اگست ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کو اپنا استعفا پیش کر دیا اور اہتمام کی ذمہ داریوں سے سبک دوشی اختیار کر لی۔

وفات: ۶/شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار ٹھیک ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر آپ کی روح قفسِ عصری سے پرواز کر گئی۔ بدوقتِ وفات آپ ۸۸ سال کے تھے۔

اتوار و سوار: ۶-۷/شوال کی درمیانی شب میں آپ کی نماز جنازہ ابجے احاطہ مولسری دارالعلوم دیوبند میں آپ کے صاحبزادہ اکبر مولانا محمد سالم قاسمی نے پڑھائی۔ جید امجد حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتوی کے پہلو میں، مقبرہ قاسمیہ میں تدفین عمل میں آئی۔ تقریباً ایک لاکھ آدمی نے نماز جنازہ پڑھی، جن میں زیادہ تعداد علماء و صلحا و طلبہ کی تھی۔

پس ماندگان

حکیم الاسلام کے چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہوئیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صاحبزادگان

۱- حضرت مولانا محمد سالم قاسمی: پیدائش جنوری ۱۹۲۶ء (جمادی الاخریٰ ۱۳۴۴ھ) آپ نے ازاول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۹۴۸ء (۱۳۶۷ھ) میں فارغ ہونے کے بعد آپ نے سال ہا سال تک دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۹۸۲ء (۱۴۰۳ھ) میں دارالعلوم میں پیدا ہونے والے اختلاف کے بعد، آپ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کر لیا، جس کے شروع سے متہتم ہیں اور وہیں بخاری شریف کی تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اسی کے ساتھ ملک اور بیرون ملک میں سیکڑوں دینی اور دعوتی اسفار کیے۔ پرسنل لا بورڈ کے رکن مجلس عاملہ رہے اور اب اُس کے نائب صدر ہیں۔ مجلس مشاورت کے بھی صدر ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ، مظاہر العلوم وقف کی مجلس شوریٰ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے رکن ہیں، انھیں مصری حکومت کئی سال پہلے برصغیر کے ممتاز عالم کے نشان امتیاز سے نواز چکی ہے۔

۲- مولانا محمد عاصم قاسمی: دارالعلوم دیوبند میں حفظ قرآن کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ۱۶ مئی ۱۹۴۲ء (۷/جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ) میں ۱۴ سال کی عمر میں وفات ہو گئی۔

۳- مولانا محمد اسلم قاسمی: پیدائش ۱۹۳۸ء (۱۳۵۷ھ) انھوں نے بھی ساری تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، پھر دارالعلوم کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار اور منتظم رہے۔ اُس کے بعد شعبہ

تنظیم و ترقی کے ناظم اور ۱۹۸۰ء (۱۴۰۰ھ) میں منعقد ہونے والے صد سالہ اجلاس کے ناظم کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم وقف کے قیام کے بعد، اُسی میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ اس وقت ہندوستان کے منتخب واعظین اور خطباء میں شمار کیے جاتے ہیں، انھیں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت ہے۔

۴۔ محمد اعظم قاسمی: دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ساری تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی، چنانچہ بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں بہ طور لیکچرار تقرر ہوا اور ترقی کر کے پروفیسر بنے، ۲۰۰۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں ہی رہائش پذیر ہیں۔

صاحب زادیاں

۱۔ فاطمہ بیگم: یہ سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، ماسٹر رشید احمد صاحب (بریلی) کے نکاح میں تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئیں اور کراچی میں رہائش اختیار کر لی، وفات کے بعد وہیں مدفون ہیں۔

۲۔ ہاجرہ بیگم: ان کا نکاح مولانا حامد الانصاری غازیؒ (رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند و مدیر المدینہ اخبار بنجور) سے ہوا، وہ بڑے ادبی ذوق کی حامل تھیں، برصغیر کے ادبی حلقوں میں وہ معتبر نام شمار ہوتی تھیں، ”نازی“ تخلص کرتی تھیں۔ ۱۸ سے زائد اصلاحی و معاشرتی ناولوں کی مصنفہ ہونے کے علاوہ ہندو پاک کے مختلف دینی، ادبی اور اصلاحی ماہ ناموں میں مختلف موضوعات پر، اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں علی گڑھ میں وفات پائی، یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئیں۔

۳۔ حمیرا بیگم: دیوبند کے معروف گھرانے کے سابق چیرمین اور رئیس دیوبند مختتم صاحب کے صاحبزادے: سید احتشام کاظمی سے منسوب ہیں، احتشام صاحب تقسیم ملک کے بعد، کراچی منتقل ہو گئے اور وہیں بودو باس اختیار کر لی، گذشتہ تین دہائیوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔

۴۔ عذرا بیگم: دیوبند کے ڈاکٹر افضال سے نکاح ہوا، اور شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں بعمر ۲۱ سال وفات ہو گئی، قاسمی قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

احفاد (بنائے شیخ محمد سالم قاسمی)

۱۔ محمد سلمان قاسمی: شرح جامی تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی، ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں بہ غرض ملازمت جہہ چلے گئے، چار سال وہاں قیام رہا ۱۹۸۶ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور پی۔ آئی۔ اے میں ملازم ہوئے، تا حال اسی عہدے پر فائز ہیں۔

۲- محمد سفیان قاسمی: حفظ قرآن کریم کے بعد، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کی، ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، دورانِ تعلیم ہی پرائیویٹ طریقے پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہائی اسکول سے ایم اے تک امتحانات دیے، ۱۹۷۶ء جلد۱۱ لاہور، قاہرہ میں کلیدیہ شرعیہ سے ماجسٹر (ایم اے) کیا، ۱۹۸۰ء میں واپسی ہوئی، ۱۹۸۳ء سے دارالعلوم وقف سے وابستگی ہوئی اور ابتدائی کتب زیر تدریس رہیں، تدریجاً انتظامی ذمہ داریاں بھی سپرد ہوئیں، گذشتہ چار برس سے نیابتِ اہتمام متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ، ترمذی شریف جلد ثانی کے اسباق متعلق ہیں۔ ۲۰۰۷ء کلکتہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن منتخب کیے گئے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن ہیں۔

۳- محمد عدنان قاسمی: جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ہائی اسکول کرنے کے بعد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم کام تک تعلیم حاصل کی، تجارتی سرگرمی کے لیے ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء ساؤتھ امریکہ کے ملک چلی میں مقیم رہے۔ حالیا دہلی میں مقیم ہیں اور تجارتی مصروفیات میں مشغول ہیں۔

۴- حافظ محمد عاصم قاسمی: حفظ قرآن کے بعد، جامعہ ملیہ دہلی سے ہائی اسکول کیا، جید حافظ ہونے کے ساتھ، خوش لحن انداز میں قراءت سے متاثر ہو کر، بعض عرب حضرات نے بہ غرض تراویح امریکہ کی دعوت دی، بقیہ تعلیم وہیں پر مکمل کی، تعلیم کے بعد تجارتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ، واشنگٹن کے اسلامک سینٹر سے بھی وابستہ رہے۔ اور اپنے حلقہ اثر میں تبلیغ اسلام خاص موضوع رہا، چالیس سے زائد افراد نے دل نشیں اندازِ تعلیمات سے متاثر ہو کر، اسلام قبول کیا، جنہیں قرآن کی تعلیم دی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں قیام پذیر رہے اور امریکی شہریت اختیار کی، حالیا دہلی میں مقیم ہیں۔

۵- اسماء اعجاز: سید اعجاز حسن صاحب، جو کہ چاند پور ضلع بجنور کے ایک معروف گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، سے منسوب ہیں، ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی، حالیا دہلی میں مقیم ہیں۔

۶- عظمیٰ ناہید: مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کے صاحب زادے سلمان منصور غازی صاحب کے نکاح میں ہیں، اقراء ابجو کیشنل فاؤنڈیشن شکاگو کی ہندوستانی شاخ کی چیر پرسن ہیں، اس کے علاوہ ملک دبیر و ملک اصلاحی تحریکات سے فعال وابستگی کی بنیاد پر، ملک کی معتبر ترین خاتون کی حیثیت سے متعارف ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں خواتین ونگ میں نہایت فعال شخصیت کی حیثیت

سے جانی جاتی ہیں۔

(ابنائے مولانا محمد اسلم قاسمی)

۱- مولانا محمد فاروق قاسمی: دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فضیلت کی، اُس کے بعد امریکہ چلے گئے، وہاں پر دس سالہ قیام میں درس و تدریس سے وابستہ رہے، ۲۰۰۰ء میں وطن واپسی ہوئی، دارالعلوم وقف دیوبند سے منسلک ہو گئے، تاحال اسی ادارے میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

۲- محمد ہشام قاسمی: حفظ کلام اللہ کے بعد ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کرنے کے بعد، ہائی اسکول تائیم اے دہلی یونیورسٹی سے کیا، اس کے بعد اپنے تجارتی کاروبار میں مشغول ہو گئے ہیں۔

۳- فوزیہ زرین: امریکہ میں مقیم جمیری خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک ذی استعداد فاضل سے منسوب ہو کر امریکہ چلی گئیں اور وہیں پر ۳۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ بی اے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پرائیویٹ طریقے پر امتحانات دے کر تعلیم حاصل کی تھی۔

۴- فرح زرین: گھر پر رہ کر ضروری دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، پرائیویٹ طریقے پر ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور کاندھلہ کے ایک معروف گھرانے کے فرد بدرالاسلام صاحب سے منسوب ہیں۔

(ابنائے محمد اعظم قاسمی)

۱- احمد فرید: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابتدا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، فضائی فوج کے لیے منتخب کر لیے گئے، حالیا دہلی میں مقیم ہیں اور لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

۲- قاسم رشید: علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، دہلی میں زیر تعلیم ہیں۔

۳- صباحت، زینب: دونوں لڑکیاں شادی ہونے کے بعد، امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔



ادیب، شاعر، نقاد، محقق، عالم دین اور مفتی حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلویؒ

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء - ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء

۲۳ سال پہلے کی بات ہے (کیوں کہ میں یہ سطریں آج سہ شنبہ: ۵/شعبان ۱۴۳۰ھ = ۲۸/جولائی ۲۰۰۹ء کو سپردِ قلم کر رہا ہوں) راقم الحروف کی جمعہ ۱۱/شعبان ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳/مارچ ۱۹۸۷ء کو سعودی عرب کے ایک سفر سے واپسی ہوئی۔ مجھے کسی ناگزیر کام سے اردو بازار دہلی کے کتب خانہ عزیز یہ میں اذان عصر کے وقت چند منٹ کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ کتب خانے کے منیجر مولوی عبدالحکیم صاحبؒ (۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء - ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء) پر خُز د مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ (۱۳۳۵ھ/۱۹۰۷ء - ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) دنواسہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء - ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کی جیسے ہی میرے اوپر نظر پڑی، کہنے لگے: مولانا! آپ کو معلوم ہے ابھی ابھی مولانا حفیظ الرحمن صاحب واصف کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے بہت عجلت تھی؛ کیوں کہ کسی بہت ضروری داعیے سے اُسی وقت دیوبند لوٹنا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کا بے ساختہ وردِ گرتے ہوئے، اُن سے کہا کہ مولانا مرحوم کے کسی صاحب زادے سے ملاقات ہو جاتی تو میں کم سے کم تعزیت کی سنت کی ادائیگی کی سعادت حاصل کر لیتا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مولانا مرحوم کی رہائش، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہمارے کتب خانے کے اوپر ہی ہے؛ لیکن اِس وقت شاید بیٹھک میں بھیڑ ہو اور آپ کو جلدی ہے؛ آپ شاید بہ عجلت کسی سے نہ مل سکیں گے کہ اتنے میں مولانا مرحوم کے ایک

پس مرگ زندہ

صاحب زادے محمد قاسم (جو بعد میں ماشاء اللہ ڈاکٹر محمد قاسم ہو گئے) اپنے مکان سے اتر کے کسی عاجلانہ ضرورت کے لیے نیچے آئے، میں فوراً اُن سے بغل گیر ہوا اور باپ چشمِ نم اُن سے اظہارِ تعزیت کیا، موصوف نے کہا آپ کی تعزیت سے بڑی تقویت ملی، والد صاحب آپ سے بڑی محبت کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ کا ذکر خیر کرتے تھے۔

مولانا کا سراپا

دہلی سے دیوبند کے پورے راستے میں رہ رہ کے مولانا مرحوم کی یاد آتی اور ستاتی رہی۔ وہ میرے اُن بڑوں میں تھے جنہوں نے ایسی شفقت و محبت دی، جس کا اب کسی بڑے سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ انہیں اُن کی عنایتوں کے بدلے وہاں کی بڑائی نصیب کرے جہاں کی بڑائی ہی اصل بڑائی ہے۔ اُن کا سراپا آنکھوں کے سامنے پھرتا اور سفر کی تنہائی میں بار بار ہم کلام ہوتا رہا: گندم گوں رنگ، چھریا بدن، چال میں متانت، چہرے پر وقار، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور تامل و تفکر کی جھلک، سر پر بال والی سیاہ سفید کھڑی کشتی نما ٹوپی، بدن پر ہلکی سُرمئی رنگ کی شیروانی، رفتار میں سرعت، گفتار میں سنجیدگی، دراز قد بھنویں گھنیری، پیشانی کشادہ۔ گویا ہوتے تو مطالعے کی وسعت، علمی تنوع، تاریخی جان کاری اور عہدِ رفتہ کی عظمتوں کی بے پناہ معلومات کی جھری لگ جاتی۔ مخاطب کو متکلم کی راست گوئی اور زبان و دل کی یکسانیت پر ایمانِ راسخ کی طرح یقین ہوتا؛ کیوں کہ وہی کہتے جودل میں ہوتا، لہجے میں صفائی، بات میں ترتیب و ہم آہنگی ہوتی۔ لباس معمولی اور سادہ لیکن زعفرق تا یہ قدمِ نستعلیقیت پھوٹی پڑتی۔ زندگی میں برتی جانے والی اُن کی کسی چیز میں بدنمائی ہونی نہ بے ڈھنگا پن۔ مہذب و مُرتب انسان کا وہ اعلیٰ وارفع نمونہ تھے۔ اُن کی سیرت و سلوک سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی جینے کے فن کے اعلیٰ پایے کے ماہرین میں سے ایک ہیں۔ سچ یہ ہے کہ فنِ حیات کے بڑے آرٹسٹ (Artist) اور

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

زبردست کاری کرتے۔ اُن کے پاس بار بار جانے کو جی چاہتا اور جب بھی اُن کے پاس سے اُٹھتے جی برا ہوتا، اُن کے دل کی پائیزگی اور خلوص کی جاذبیت میں مقناطیس کی کشش تھی، مجھے لگتا تھا کہ انسانیت کے خالص پارس کو تحلیل کر کے اُن کی شخصیت کا خمیر اُٹھایا گیا تھا، قناعت پسندی و کفایت شعاری اُن کا وصف خاص تھا اور لایعنی گفتگو سے پرہیز اُن کا ماہر الامتیاز۔

غیر معمولی اصل کی فرع

اُن کی لاتعداد خوبیوں کو دیکھ کے از خود اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی غیر معمولی اصل کی فرع ہیں۔ پھر جب اُنھیں برتنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ علامہ یگانہ مفتی اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند ہیں تو اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ بالیقین یہ اُسی غیر معمولی درخت کی خوب صورت اور نرالی شاخ ہیں۔ مفتی صاحبؒ کے بارے میں جاننے والے کو معلوم ہے کہ وہ نہ صرف ایسے فقیہ اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ میں مجتہدانہ درک رکھنے والے ایسے عالم و فاضل روزگار تھے کہ سارے علمائے حق کو اُن کی فقیہانہ بصیرت اور مفتیانہ عبقریت و عظمت پر اتفاق تھا؛ بل کہ بعض علما و مُفکرین کے نزدیک اُن کی فقہی بصیرت ایسی تھی جیسے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت ۸۰ھ/ ۶۹۹ء - ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) کے بہ راہ راست شاگرد کی۔ اسی کے ساتھ وہ عربی اور اردو زبانوں کے بلند پایہ عالم تھے، دونوں زبانوں کے پختہ اسلوب شاعر تھے وہ اردو میں ایسی نثر لکھتے تھے کہ دقیقہ رس ناقد کو بھی اُس میں کہیں حشو و زوائد یا زبان کی ساختیات و اسلوبیات کے خلاف کوئی تعبیر تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ علمائے کبار اور فقہائے عظام کے درمیان کئی حوالوں سے امتیازی شان کے مالک تھے۔ اُن کی تقریر و تحریر انتہائی مُرتب و مُختصر اور صرف مغز کی حامل ہوتی تھی۔ وہ فتاویٰ بھی بہت مُختصر و مُرتب اور واضح نثر میں لکھتے

تھے، جب کہ فقہا و علما کی زبان اپنی پیچیدگی کے لیے مشہور ہے؛ اسی لیے وہ تاحیات جب تک مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن رہے، تجویزوں اور فیصلوں کی عبارتیں ہمیشہ وہی تحریر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ عربی اور اردو کے بڑے خطاط اور خوش نویس بھی تھے، مولانا حفیظ الرحمن واصف مرحوم نے اپنی بیٹھک والے کمرے میں اُن کے لکھے ہوئے کئی طغریں دکھائے جو حسنِ کتابت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ فنِ کارطبخ بھی تھے، چنانچہ وہ جب قافلہ آزادی کے اپنے قد آور دوستوں حکیم اجمل خاں دہلوی (مسح الملک حکیم محمد اجمل خاں دہلوی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۸ء - ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۲۷ء) اور ڈاکٹر انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء - ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) وغیرہ کی کبھی دعوت کرتے تھے، تو وہ حضرات اُن کے اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی فرمائش کرتے تھے کہ اُن میں جو لذت ہوتی تھی وہ بعض دفعہ خواتین کے تیار کردہ کھانوں میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑے نکیا بھی تھے کہ ہاتھ سے مشین کی طرح باریک اور خوب صورت سلائی کر لیتے تھے، اگر ضرورت پڑتی تو اپنا مکمل جوڑا اپنے ہاتھ سے سل لیا کرتے تھے۔ غرض زندگی کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو اپنے ناحن تدبیر سے پوری کر لینے کی ایسی صلاحیت رکھتے تھے، جو عموماً بڑے اور باکمال علما میں نہیں ہوتی؛ کیوں کہ حرفِ علم کی اچھی معرفت رکھنے والا، بالعموم حرفِ حیات سے نا آشنا محض ہوتا ہے؛ لیکن مفتی صاحب کو اللہ نے دقیقہ رسی اور فقہی باریک بینی کے ساتھ، مسائلِ حیات کی ہمہ گیر آگہی بھی عطا فرمائی تھی۔ وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ.

بے انتہا سادگی اور ڈھیر ساری پُرکاریاں

مولانا حفیظ الرحمن واصف کو دیکھنے والا گواہی دے سکتا تھا کہ واقعی عظیم باپ نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں اپنی عالمانہ و فقیہانہ و تجربہ کارانہ فن کارانہ صلاحیت کا بھرپور ثبوت دیا ہے اور ہونہار، سپوت اور فرماں بردار وسعادت نصیب بیٹے نے، اُس

پدری تربیت کو مکمل طور پر جذب کر کے، عظیم باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ توفیق الہی نے ہمہ نصیب بیٹے کا ہمہ لمحہ بہ خوبی ساتھ دیا ہے؛ اس لیے ہونہاری و فرماں برداری کے معیارِ مطلوب پر پورا اُترنے میں کامیابی نے ہر گام پر اُس کے قدم چومے ہیں؛ لہذا اُس کی صلاحیت کی ہمہ گیری، شخصیت کی نرمالی، سچ، سیرت و کردار کا بانک پن، علم و فکر کے نتائج کے خوش نمارنگ و ڈھنگ، انہی عوامل کی مشترکہ اثر خیزی کی دین ہیں۔

مولانا واصف مرحوم عالمِ دین، مُفتی، مؤرخ، جَقِش، ادیب، شاعر، نقاد، خطاط اور مؤلف و اہل قلم تھے؛ لیکن اُن کی سادگی کو دیکھ کر اتنی ساری پُرکاریوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اُن کے کسی روپے سے علمی کڑ و فر کا اندازہ نہ ہوتا تھا؛ ہاں اُن کی عالمانہ ہیئت سے بیشک اُن کے پڑھے لکھے ہونے کا اندازہ ہو جاتا تھا؛ لیکن کسی طرح کسی کو اولین و ہلے میں اُن کے اُتنے بڑے ہونے کا، جتنے کہ وہ تھے، انکل نہ ملتا تھا۔ وہ بہت بڑے ہو کر بہت چھوٹے لگتے تھے، ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تو تھا؛ لیکن علمی پندار سے قطعاً منزّہ تھے۔ وہ کسی اجنبی سے پہلی ملاقات میں بہت کھلتے نہ کسی ملنے والے سے بہت سمٹتے تھے؛ لیکن وہ بہت جلد گھل مل جاتے تھے؛ بالخصوص اُس وقت جب وہ ملنے والے میں کسی طرح کا علمی ذوق محسوس کرتے، انھیں جیسے ہی اپنے ملاقاتی میں اپنی ہم جنسی کا احساس ہوتا اُن کی بانچھیں کھل جاتیں۔

خاکِ دہلی کا سچا نمایندہ

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ تو اصلاً ”شاہ جہاں پور“ یوپی کے تھے؛ لیکن جوانی سے بڑھاپے اور وفات تک دہلی ہی میں رہے اور اُسی کی خاک کا پیوند بنے۔ اُن کی بود و باش تو شروع شروع میں ”بارہ درہی شیر افگن خاں“ میں کرایے کے مکان میں رہی، اُس کے بعد ”حویلی اعظم خاں“ میں کئی مکان تبدیل کیے، کرایے

کے مکانوں میں سب سے آخری مکان ”کوچہ فولا دھاں“ گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ میں لیا، جس میں ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء سے ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء تک قیام رہا۔ اسی دوران دہلی کے مشہور محلہ ”کوچہ چیلان“ میں ایک ذاتی مکان خرید لیا اور اصلاح و مرمت کے بعد ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء سے تا وفات اسی میں رہائش رہی۔ یہ کوچہ ہمیشہ سے گہوارہٴ علم و ادب اور علمائے وصال کا مسکن رہا تھا۔ یہیں اُستاد العلماء مولانا مملوک العلّی نانوتویؒ (۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء - ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اُن کے باکمال و عبقری فرزند صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء - ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) اور دورِ آخر میں ہند میں سرمایہٴ ملت کے نگہبان و پشتیبان حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) بانی دارالعلوم دیوبند کا طالب علمی کے زمانے میں قیام رہا تھا اور غالباً اُن کے رفیقِ درس و ہم راز و ہم فکر فقیہ و محدث کبیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء - ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کی بھی زمانہٴ طالب علمی میں اپنے استاذ مولانا مملوک العلّی کے ساتھ اسی کوچے میں یا قرب وجوار میں رہائش رہی تھی۔ اسی کوچے میں مفتی اعظم کے زمانے میں اُن کے عظیم المرتبت شاگرد سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ (۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء - ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء) اور پیر ستر آصف علی دہلویؒ (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء - ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) کا مسکن بھی تھا۔ یہی کوچہ اپنے زمانے میں عظیم اردو شاعر و حکیم مومن خان مومن دہلویؒ (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء - ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء) کی جائے پیدائش و وفات بھی رہا تھا۔

مولانا حفیظ الرحمن و اصحف دہلوی ۱۰ فروری ۱۹۱۰ء (۲۸ محرم ۱۳۲۸ھ) کو اس جہان آب و گل میں آئے۔ پیدائش تو اُن کی غالباً حویلی اعظم خاں میں ہوئی ہوگی؛ لیکن بچپن، بڑپن اور جوانی کا زمانہ اسی کوچہ چیلان میں گزرا اور دہلی کی بالعموم اور اس کوچہٴ علم و حکمت کی بالخصوص علمی و ادبی فضا میں پرورش پائی۔ اُس وقت تک دلی علم و ادب، شعر و سخن، اور ثقافت و تہذیب کی باقیات کی بڑی حد تک امین تھی، اُس کی

اصلیت، ثقافت و تہذیب اور زبان و ادب کا بانک بہن بڑی حد تک گہنایا نہ تھا؛ اس لیے مولانا کو بچپن سے ثقافت و تہذیب اور زبان و ادب کی شفاف فضا میں سانس لینے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا، لہذا وہ نہ صرف دہلوی الوادۃ تھے؛ بل کہ خالص دہلوی ثقافت و اللسان بھی تھے، اسی لیے اردو زبان، اُس کی نوک پلک، لب و لہجہ، روزمرہ، صحیح تلفظ و صحیح اِملاء، مفردات و مرکبات کے صحیح و بر محل استعمال کے حوالے سے، وہ جس درجہ حساس اور استاذانہ لیاقت کے حامل تھے، میں نے اپنی زندگی میں علما و غیر علما میں کسی کو دیکھا نہ برتا۔

اُنھوں نے از اوّل تا آخر تعلیم بھی دہلی ہی کے مدرسہ امینیہ میں حاصل کی، یہیں اردو و فارسی زبان و ادب، علم عروض و قوافی، علم فقہ و حدیث، حکمت و فلسفہ، تاریخ اسلام، معقولات و منقولات اور افتا کی تعلیم حاصل کی اور اپنے عظیم والد علامہ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کی تربیت و سرپرستی میں اپنے دیگر اساتذہ گرامی سے بھی ہر علم و فن میں خوب خوب فیض پایا۔ وہ جہاں پختہ علم عالم و فقیہ و مفتی تھے، وہیں عربی و فارسی کے رمز آشنا اور اردو زبان کے قد آور ادیب و شاعر و نقاد تھے۔ اردو کے حوالے سے وہ دہلی میں آخری مُستند استاذ تھے، جس پر ہر ایک کو اتفاق تھا۔ اُن کی وفات پر اہل کمال اُدبا و ناقدین نے اُن پر جو مضامین و تاثرات لکھے تھے، اُن میں بہ یک زبان اُنھیں اردو و فارسی لسانیات کے حوالے سے خاکِ دہلی کا آخری فرزند شمار کیا گیا تھا اور ۱۸۵۷ء میں اُجڑنے والی دہلی کے ملبے سے پورے تمدن و ثقافت کی نئی اور دل آویز عمارت تعمیر کرنے کی ہمت جٹانے والے سرخیلوں میں اُنھیں گردانا گیا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ وہ رہائش کے اعتبار سے بھی سو فی صد یا اس سے زیادہ دہلوی تھے۔ وہ یہاں سے شاید و باید کہیں چند روز کے لیے گئے ہوں گے، اُنھوں نے زندگی کے سارے شیریں و تلخ لمحے یہیں گزارے۔ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا مولوی، عالم و غیرہ کا امتحان بھی یہیں سے دیا۔ اُنھوں نے ۱۹۳۳ء سے سبزی منڈی کے اسکول میں عربی کے ٹیچر کی

پس مرگ زندہ

حیثیت سے عملی زندگی کی ابتدا کر کے یہیں روزی روٹی کا بندوبست کیا۔ گویا وہ خاکِ دہلی کے فرزندانوں میں گنے چنے سپوتوں میں تھے؛ اسی لیے دہلی کے مٹنے، اُس کی تہذیب اور اُس کے تمدن کے مسار اور زبان و روزمرہ کے تہس نہس ہو جانے کا اُنھیں بہت غم تھا۔ اُنھوں نے اپنے اس غم کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

”گھر میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا ہوں، باہر کیا نکلوں اور کہاں جاؤں؟ اگر کبھی باہر نکلتا ہوں تو نگاہیں دلی کو ڈھونڈتی ہیں؛ مگر دلی کہیں دکھائی نہیں دیتی“ (۱)

مولانا کی شخصیت کے تعمیری عوامل

مولانا و اصف دہلی کی جامع الکملات ہستیوں کی آخری یادگار تھے، اُن کی ہمہ گیر عظمت کی تعمیر میں عظیم القدر والد مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ، اُن کے ہنرمند اساتذہ گرامی اور اُن کے ذاتی جوہر کے علاوہ جو ذرا سی جلا بخشی سے ذرے سے آفتاب بن جانے کے لیے قدرت کی طرف سے اُنھیں ودیعت ہوا تھا، اُس دور کی فطرت کو بھی بڑا دخل تھا، جو غیر معمولی تیز رفتار، سماجی و تہذیبی تبدیلیوں، ہنگامہ خیز تحریکوں، استعماری مظالم سے پیہم ٹکر لینے والی اولوالعزم مانہ سرگرمیوں اور حصولِ آزادی کی چوکھٹ تک سرفروشی کی تمناؤں میں شب و روز بسر کرنے والی ہندی قوم کے عزم و ہمت پر سان چڑھاتی، اُس کے ضمیر کو گہری سطحوں تک جھنجھوڑتی اور اُس کی مردم خیزی کی صلاحیت کو ساحرانہ قوت سے ہم کنار کر رہی تھی۔ برسرِ پے کار مخالف طاقت سے سخت اور مسلسل تصادم کی فطرت زبردست خلاقی قوت کی حامل ہوتی ہے؛ اسی لیے ہمارے اسلامی اور

(۱) مضمون ”شہر میں اک چراغ تھانہ رہا“ از ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی فرزند مولانا و اصف مرحوم شائع شدہ در ”کتاب نما“ دہلی، اپریل ۱۹۸۹ء۔

عربی ملکوں میں دورِ غلامی نے جتنے بڑے اور عبقری انسانوں کو جنم دیا اور ہر شعبہٴ حیات کا دامن جیسے جیسے بے مثال باکمالوں سے مالا مال رہا، اُن میں سے کسی ایک کے قد کا کوئی انسان آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کی معمولی سی شبیہ دیکھنے کو آنکھیں بے تاب اور دل مچلتے ہیں؛ لیکن یہ عُنُقاً ہمیں آج نظر نہیں آتا۔

مولانا واصفؒ نے علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء) بانی مدرسہ امینیہ دہلی: مولانا امین الدین اورنگ آبادی ایلولی (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء-۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مجاہد ملت مولانا حفیظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا شاہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء-۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سحبانُ الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ حسن نظامیؒ (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء-۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء) اور اُن کے ہم عصر بہت سے جلیل القدر علما و ادبا و مفکرین و قائدین کو بار بار دیکھا سنا اور انھیں مفتی صاحب (مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ) سے ملک و ملت کے لیے بہت سی مجلسوں میں تبادلہٴ خیال کرتے ہوئے پایا۔ جنگِ آزادی کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا، اُس کی تحریکات کی ہنگامہ خیزیوں میں وقت گزارا اور اُس کے ہراول دستے کے مُعتمدِ ذِ سپہ سالاروں سے انھیں ملنے اور اُن کے افکار و خیالات سے قریب سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) مولانا محمد علی جوہرؒ (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء-۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء) مہاتما گاندھی (۱۸۶۹-۱۹۴۸ء) پنڈت موتی لال نہرو (۱۸۶۱-۱۹۳۱ء) اور جواہر لال نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۴ء) جیسے اُساطینِ جنگِ آزادی کو سننے سمجھنے اور دیکھنے کی انھیں فرصت ملتی رہی۔

انسانی فکر و خیال کی تعمیر اور کسی بڑی شخصیت کی تشکیل میں ”چراغ سے چراغ

پس مرگ زندہ

جلنے“ کا عمل زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مولانا واصف کی تعمیر میں بھی یہ عامل (Factor) پوری طرح مؤثر رہا تھا۔ وہ ان بڑوں کے اٹھ جانے کے بعد ان کی صورتیں اپنے خانہ خیال میں مستحضر کرتے اور ان کی یادوں سے اُجالے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور گزری ہوئی صحبتوں پر ان الفاظ میں حسرت و افسوس کا اظہار کرتے تھے:

اب کہاں واصف ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں

اب وہ باتیں سر بہ سر خواب پریشاں ہو گئیں

اردو زبان کا نمایندہ ادیب و شاعر و نقاد

نسلِ نو کے شعرا و اُدبا و اہل قلم کی زبان و محاورات کے تعلق سے فروگزاشتوں پر بہت آزرہ ہوتے تھے؛ کیوں کہ اردو زبان، اُس کے محاورات، اُس کی لفظیات و ساختیات، الفاظ و تعبیرات کی اصل، اُن کے استعمالی سفر، قواعد صرف و نحو وغیرہ پر اُن کی ایسی غائرانہ نظر تھی کہ اُن کے ہم عصروں میں کم لوگوں کی رہی ہوگی۔ انھیں زبان لکھنے، بولنے اور استعمال کرنے والوں کو صحیح ڈگر پر لانے اور باقی رکھنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، اسی داعیے کے پیش نظر انھوں نے نہ صرف اپنی کتاب ”ادبی بھول بھلیاں“، لکھی؛ بل کہ ”آج کل“ ”برہان“ ”نگار“ ”ہماری زبان“ اور ”کتاب نما“ جیسے علمی و ادبی رسالوں میں بہت سے لا جواب ادبی و لسانی، تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے۔ نیز ”اردو مصدر نامہ“ تالیف فرمائی، جس میں اردو زبان کے تیرہ سو مصادر اور اُنیس سو مشتق الفاظ کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور اساتذہ سخن کے چیدہ اشعار سے استعمال و تعبیرات کی صحت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مولانا کی نثر و نظم حشو و زوائد سے پاک اور صحتِ اداء، نقاستِ زبان، برجستگی، روانی، شیرینی اور جاذبیت کا نمونہ ہوتی تھی۔ وہ تاریخ نگاری کرتے، ادبی مضامین تحریر کرتے، یا علمی و تنقیدی تحریریں لکھتے، ہر جگہ اُن کے ہاں یہ خوبیاں اُن کا امتیاز

ہوتیں۔ اُن کی تحریروں سے جہاں اُن کی دقیقہ رسی و ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اُن کی ذہانت، صحیح نتائج تک پہنچنے کی اُن کی استاذانہ لیاقت اور تلمیسی پردوں کو چاک کر دینے میں اُن کی غیر معمولی مہارت سطر سطر سے چھلکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی تاریخی و تحقیقی تحریروں میں بہت سی غلطیوں کی تصحیح کی جنھیں حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اُنھیں اپنے عظیم والد سے تحقیق و تدقیق، سچائی پسندی، سچائی کی تلاش اور سچائی تک بہ ہر حال پہنچنے کی جو جو اور حوصلہ وراثت میں ملا تھا، اُس کی وجہ سے وہ کسی ”حقیقت“ کو پرکھے بغیر قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ تحقیق و جستجو کا طویل، پرچہ اور انتہائی دشوار سفر، اُن کے لیے بالکل آسان تھا۔ علم و تحقیق کے باب میں عرق ریزی اُن کا لذت انگیز مشغلہ تھی۔ اس راہ میں وہ جتنا پریشان ہوتے، اتنا ہی اُنھیں مزا آتا۔ علم و تحقیق کے اصلی مسافر کی یہی پہچان ہے کہ وہ راہ کی طوالت و دشوار گزاری کے باوجود ہمیشہ نا آشناے ٹکان رہتا ہے۔

اُنھوں نے پندرہ-سولہ سال کی عمر سے ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اس کی ابتدا اُنھوں نے فارسی زبان سے کی، اُن کے مجموعہ کلام ”زیرِ گل“ میں جو فارسی حمد شامل ہے، اُس پر تحریر کردہ نوٹ میں کہا گیا ہے: ”یہ نظم میری پہلی شاعری ہے۔“ اردو میں اُن کا پہلا کلام مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں کہا گیا تھا اور سہ روزہ ”الجمعیۃ“ دہلی میں شائع ہوا تھا، جس کے دو شعر اس طرح تھے:

مسیح الملک جو سدرہ نشینِ عزم و ہمت تھا
سحابِ فیض، کوہِ استقامت، بحرِ حکمت تھا
پیا پے آرہی ہے یہ صدا شہرِ خموشاں سے
جو قابلِ ناز کے تھی، لٹ گئی رونقِ گلستاں سے

شعر گوئی کی ابتدا کے ایک دو سال بعد ہی شعبان ۱۳۴۶ھ/ جنوری ۱۹۲۸ء میں حضرت سائل دہلویؒ (مرزا سراج الدین احمد خاں ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۲ء - ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۲۵ء)

تلمیذ داغ دہلویؒ (نواب مرزا خاں ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۳۱ء- ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) سے سلسلہ تلمذ قائم ہوا، جو سائل صاحب کی وفات تک قائم رہا۔ حضرت نواب سائل دہلویؒ سن رسیدگی کے بعد چلنے پھرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے تب بھی بلا ناغہ شام کو رکشے پر بیٹھ کر اردو بازار میں، مولانا واصفؒ کے مرحوم کتب خانہ رحیمہ میں تشریف لاتے اور استاذ و شاگرد شعر و شاعری کی باریکیوں پر تبادلہ خیال کرتے۔ سائل دہلوی اپنے شاگرد واصف دہلوی کی قدردانی اور حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے تھے، کم سنی میں جب دلی کے کسی مشاعرے میں عزیز شاگرد نے اپنے اشعار پڑھتے وقت ہچکچاہٹ محسوس کی، تو سائل صاحب نے اُن کے اشعار خود ہی مشاعرے میں پڑھے اور شاگرد کی بے پناہ حوصلہ افزائی کا سامان بہم پہنچایا۔ سائل صاحب کی وفات کے بعد، مولانا واصف نے داغ دہلوی کے ایک دوسرے شاگرد نوح ناروی (محمد نوح ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء- ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) سے مشورہ نخب جاری رکھا۔ مولانا واصف نے اپنی جوانی میں دہلی کے مشاعروں میں نہ صرف شرکت کی؛ بل کہ اپنی معنی ریز اور اشارت خیز غزلوں اور نظموں کے ذریعے انھیں خوب خوب لوٹا۔ بعد میں علم و تحقیق کی خاموش وادیوں کی مسافریت نے انھیں نہ صرف تنہائی پسند بنا دیا؛ بل کہ اُن کے رب نے اپنی توفیق خاص سے، انھیں لب خاموش اور دلی گویا سے نوازا دیا۔

اشعار کے نمونے

مولانا واصفؒ کے اشعار میں سوز و گداز، حقیقت شناسی، استغنا و بے نیازی، خودداری و خود شناسی، حکمت و دانائی، حوصلہ مندی و وفاداری، جوش جنوں و آبلہ پائی، امید و یقین، رجائیت افزا حسرت، بے وفائی کا شکوہ لیکن وفا کی بے انتہا امید، خرد مندی کی عیاری اور جنوں بے خطر کی سادہ لوحی کا ایک دریا پوری طرح موج زن نظر آتا ہے، جو اپنی سبق آموز لہروں کے ذریعے قاری کے لیے زندگی کے بیاباں کی شپ تاریک میں

قندیلِ رہبانی ثابت ہوتا ہے:

کیا بہار اور کیا خزاں ، واصفؒ نظر کا کھیل ہے
لی جہاں انگڑائی دل نے ، موسم گل آگیا

آزمائشِ گہِ غم میں ، دلِ نازک کو نہ لا
کہ زرِ گل نہیں ہوتا کبھی معیارِ طلب

نہ بولو مجھ سے ؛ لیکن کیا مجھے دل سے بھلا دو گے
کسی کی یاد مٹ جائے ، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

اے میری حسرتو ! ابھی سو جاؤ رات ہے
یہ آہ کی چمک ہے ، نمودِ سحر نہیں

مرے سر پھوڑنے کو موجِ بوے گل ہی کافی ہے
نہیں جوشِ جنوں ، وابستہ دیوار و در اپنا

با وفا ثابت ہوا ، اُس بے مرّت کا خیال
بے تکلف آگیا ، خلوت میں دل بہلا گیا

ستارے ، یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری
مرا ہر اک قدم ، خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

پس مرگ زندہ
تلاش بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں
سمجھ لیتا جو خود کو، بن ہی جاتا بے کراں اب تک

کسی کا نام آتے ہی، مہک اٹھتے ہیں صحرا بھی
بہاریں مسکراتی ہیں، نظارے جگمگاتے ہیں

میں بے نیاز تھا اس واسطے رہا معتب
وہاں انھیں ضرورت تھی نیاز مندوں کی

منافی تھا یہ اے منصور! دستورِ امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھ دینا

حمد باری تعالیٰ کے، اُن کے یہ اشعار بھی بے حد پسندیدہ اور مقبول ہیں:

تری شان کے ہولائق، وہ ثنا کہاں سے لاؤں
تجھے آئے پیار جس پر، وہ ندا کہاں سے لاؤں
نہ ہولب پہ کوئی شکوہ، وہ رضا کہاں سے لاؤں
کوئی سن سکے نہ جس کو، وہ صدا کہاں سے لاؤں
ملکوت کے عنادل، جسے سن کے جھوم انھیں
وہ ترانہ کس سے سیکھوں، وہ نوا کہاں سے لاؤں
ترے آستاں سے اٹھوں، تو میں جاؤں کس کے در پر
جو ہو بے مثال تجھ سا، وہ خدا کہاں سے لاؤں

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلویؒ

دلی زار کی کہانی، میں سناؤں کس کو یارب !
وہ سماں شکستگی کا، وہ صدا کہاں سے لاؤں
یہ وسیع صحن گلشن، ہے قفس سے بڑھ کے واصف
یہ سوادِ کوئے جاناں، وہ فضا کہاں سے لاؤں

اہتمام مدرسہ امینیہ

جیسا کہ پچھلے صفحات میں ایک جگہ عرض کیا گیا کہ مولانا واصفؒ نے عملی زندگی کا آغاز محکمہ تعلیم دہلی میں عربی زبان کے مدرس کی ملازمت سے کیا؛ لیکن والد بزرگ وار حضرت مفتی اعظمؒ کے حکم سے یہ ملازمت چھوڑ کتب خانہ رحیمہ دہلی کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالی۔ پنج شنبہ - جمعہ: ۱۳-۱۴/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب میں ۱۰ ۱/۲ بجے جب حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ مہتمم مدرسہ امینیہ کا انتقال ہو گیا، تو آپ کے انتقال کے ۱۲ دن بعد مدرسے کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہوا تو کچھ دنوں کے لیے اہتمام کا عہدہ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ کے سپرد ہوا؛ لیکن کچھ ہی دنوں بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۹ء - ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء)، حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مولانا حفیظ الرحمن سیوہارویؒ (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء - ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) وغیرہ اکابر و ارکان مجلس منتظمہ کی محققہ رائے سے یہ منصب، مفتی اعظم کے فرزند ارجمند مولانا حفیظ الرحمن واصف کے سپرد کیا گیا، جسے انھوں نے، اپنے علمی مشاغل اور تنہائی پسند طبیعت کے باوجود، بہ حسن و خوبی نبایا اور مدرسے کی ترقی اور تعلیمی استحکام کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ ۱۹۷۹ء (۱۳۹۹ھ) میں آپ نے اپنی ناتوانی کی وجہ سے اس عہدے کی گراں بار ذمہ داریوں سے اپنے کو علاحدہ کر لیا۔ زندگی کے اپنے اس گراں مایہ چند سالوں کو، یادِ الہی اور تکمیل طلب علمی کاموں کی تکمیل میں یک سو ہو کر صرف کیا۔

حساس دل انسان اور بہار کے بعد خزاں سے سابقہ

مولانا واصف نہ صرف بڑے کی اولاد تھے؛ بل کہ بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا تھا، اُن کی صحبتوں سے فیض پایا تھا، اُن کی عظمتوں کے مظاہر دیکھے تھے، اُن کی قربانیوں کی یادیں اُن کے خانہ خیال کا بہترین اثاثہ تھیں۔ اب چند لوگوں کے استئنا کے ساتھ نسبتاً بہت چھوٹوں سے اُنھیں سابقہ پڑا تھا، جو اخلاق، کردار، مروت، انسانیت، وفاداری اور علم و ہنر و فکر و آگہی: ہر اعتبار سے اُن بڑوں کے پاسنگ برابر بھی نہ تھے۔ دوسری طرف اکابر کی جدوجہد آزادی کی برس ہا برس کی سرفروشانہ کوششوں کے (ملک کی تقسیم، فسادات، انتشار، کشت و خون اور خونِ مسلم کی بہ طورِ خاص ارزانی، ہر شعبہ حیات میں عدم انصاف کی فراوانی کی شکل میں) رانگاں جانے کے مشاہدے سے اُن کے حساس دل کا آگینہ بُری طرح چور چور ہو گیا تھا۔ وہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں:

اے ہم نشیں وطن کے مرے! داستاں نہ پوچھ

لوٹا ہے کس نے آہ! مرا آشیاں نہ پوچھ

اُن کے چہرے بٹھرے کو دیکھ کر جس پر برسوں کے اُتار چڑھاؤ کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں، کوئی بھی حساس انسان، اُن کے باطنی کرب اور ذہنی کوفت کو معلوم کر سکتا اور دل کی گہرائیوں میں پیچ و تاب کھانے والی غم و اندوہ کی لہروں کی آوازیں بہ خوبی سن سکتا تھا۔ اُن کے دل کا کیف آور درد اُن کی گفتگو میں صاف طور پر جھلکتا تھا۔ وہ سن و سال کے گہرے تجربوں کے بوجھ سے دبے کچلے محسوس ہوتے تھے۔ اُن کی طرح کے اُن کے دگر ہم عصروں کا بھی کچھ یہی حال رہا ہوگا؛ لیکن زیاں کا احساس بہ قدرِ حساسیت ہی ہوا کرتا ہے۔ ناحساس یا کم احساس کا انسان بڑے سے بڑے واقعے کو کوئی حیثیت نہیں دیتا؛ لیکن نازک احساس کا انسان، اُس کے نتائج و مضمرات کو سوچ سوچ کر قریب المرگ یا جاں

بہ حق تسلیم ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے کسی زخم کا کوئی مداوا اگر، تقدیر الہی کے طفیل، تدبیر انسانی سے ممکن ہوتا ہے، تو اسی دوسری نوع کے انسانوں کے ذریعے ہی روبہ عمل آتا ہے۔ پہلی قسم کے انسان نما لوگ اپنے لیے کچھ زیادہ مفید ہوتے ہیں نہ دوسروں کے لیے۔

مولانا سے باقاعدہ تعارف کی تقریب

مدرسہ امینیہ کے وہ مہتمم تھے اور حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۱ھ/ ۱۹۰۳ء - ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) وہاں کے صدر مفتی اور شیخ الحدیث، جن سے بہ راہ راست کسب فیض کی تمنا مجھے شاہ جہاں آباد: دہلی لے آئی تھی اور مدرسہ امینیہ کا طالب علم بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ حضرت مولانا سے تو اسباق میں روزانہ ہی باقاعدہ ملاقات ہو جاتی تھی؛ لیکن مولانا واصف صاحب مرحوم سے صرف دور سے علیک سلیک کے سوا کئی ماہ تک باقاعدہ ملاقات کی کوئی تقریب پیدا ہوئی تھی نہ میں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی؛ کیوں کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی؛ اس لیے کہ میرے اوپر مولانا موصوف کے علمی پُرث نہیں کھلے تھے اور نہ کسی ضرورت نے ابھی تک اُن سے ملنے پر مجبور کیا تھا۔ اُس وقت اقامت گاہ میں مدرسہ نے خورد و نوش کا انتظام نہیں کیا ہوا تھا، طلبہ کو نقد و وظیفہ دے دیے جاتے تھے، وہ حسب منشا و فرصت کھانا اپنے کمروں ہی میں از خود تیار کر لیتے تھے یا عموماً جامع مسجد کے پاس میاں محل کے ہوٹلوں میں جا کر کھایا کرتے تھے۔ وظائف کی تقسیم کا کام بالعموم مدرسہ کے دو منشیوں میں سے کوئی ایک کیا کرتا تھا، جب دونوں کسی وجہ سے غائب ہو جاتے تو یہ فریضہ خود مہتمم مولانا حفیظ الرحمن صاحب واصف انجام دیتے تھے۔ مدرسہ میں ۳-۴ ماہ گزارنے کے بعد ایک مرتبہ یہ سعادت مجھے حاصل ہوئی کہ دونوں منشی رخصت پر تھے، مولانا موصوف ہی وظیفہ تقسیم کر رہے تھے اور اُن سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ میں نے بالقصد اپنی باری سارے طلبہ کے بعد رکھی؛ تاکہ اطمینان کے چند

لمحے ملیں اور اُن سے نہ صرف سلام و کلام؛ بل کہ تعارف کا بھی موقع حاصل ہو۔ اُن کا اہتمامی حجرہ دفتر کی عمارت کے بیچ میں واقع تھا، چھوٹا سا حجرہ جیسے کسی خانقاہ کا خلوت خانہ، جس میں دو دروازے جانبِ غرب و جنوب میں کھلتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوا تو ہر طرف سے عیاں ہو رہی ترتیب، سلیقہ، سکھڑاپا اور حسنِ انتظام کے منظر نے دل کو موہ لیا۔ خوب صورت سی چھوٹی سی تپائی، پیتل کا سنہرے رنگ کا اُگال دان، ردی کی نستعلیق ٹوکری، چھوٹے سے ڈنڈے میں بندھی ہوئی خوش رنگ جھاڑن اور اُن کے سامنے کا نفیس ڈسک؛ ہر چیز سے اُس کے رکھنے اور برتنے والے کی شایستگی اور ذوق عیاں ہوتا تھا۔ میں جیسے ہی کمرہ میں داخل ہوا اور سلام کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے اپنا نام بتایا، اُنھوں نے فوراً فرمایا: بھی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب تمھارا تذکرہ مجھ سے وقتاً فوقتاً کرتے ہیں اور تمھاری صلاحیت اور سلامت روی کو سراہتے ہیں؛ لیکن تم تو کبھی دفتر میں آتے ہو نہ مجھ سے ملتے ہو۔ میں نے اپنے شرمیلے پن اور بڑوں سے ملنے میں حجاب کے احساس کی بات کہی تو فرمایا: یہ شرمیلا پن بعض دفعہ تو صحیح ہوتا ہے؛ لیکن ہمت کر کے بڑوں سے کبھی کبھار ملتے رہنا چاہیے، اس سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے حجرے میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ وہ روپے کے مڑے ہوئے نوٹوں کی سلوٹوں کو پانی کے ذریعے اپنی انگلیوں سے ٹھیک کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گول گول پتھروں سے دبا دبا کے رکھ رہے ہیں: سو کے نوٹ، پچاس کے نوٹ، بیس کے، دس کے، پانچ کے، ایک کے، علاحدہ علاحدہ رکھتے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلا آدمی دیکھا ہے، جسے نوٹوں کی نوک پلک درست کرنے اور اُن کی سکڑنوں کو دور کر کے، اُن کی بگڑی ہوئی شکل و صورت کو اپنی اصلی حالت پر لانے کا اتنا اہتمام ہے۔ حجرے کی ترتیب، سامانوں کی سلیقہ سے سجاوٹ اور نوٹوں پر اُن کی اتنی ساری عنایات دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ یہ حضرت حد درجہ سلیقہ مند ہیں اور کسی بھی چیز کی بد سلیقگی و بے قرینگی سے انھیں بہت ہی نفور ہے۔ کچھ دیر

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

ملاطفت کی باتیں کرنے کے بعد اُنھوں نے پہلے سے درست کیے نوٹوں کی گڈیوں میں سے، مجھے میرے وظیفہ کی رقم عنایت کی۔ میں اُٹھنے لگا تو فرمایا: حضرت مولانا سید محمد میاں تم سے اتنے خوش ہیں، اس سے مجھے بہت خوشی ہے، اسی طرح محنت کرتے رہو اور وقتاً فوقتاً مل لیا کرو۔

استحکام تعلقات کے عوامل

اس تقریب کے بعد، اُن سے ملاقات میں کوئی حجاب نہ رہا، اُن کی قرینہ پسندی کو دیکھ کر اُن سے بار بار ملنے کو جی چاہنے لگا۔ ظہر کی نماز وہ مدرسے کی مسجد ہی میں ادا کرتے تھے، اُس کے بعد وہ دفتر جاتے اور شیر والی زیب تن کرتے پھر جامع مسجد اردو بازار میں واقع اپنے مکان تشریف لے جاتے۔ میں اس ملاقات کے بعد ظہر کی نماز میں اکثر اُن کے بغل میں کھڑا ہوتا اور اگر جماعت شروع ہو جاتی اور میں کسی وجہ سے ادھر ادھر صف میں کھڑا ہو جاتا، تو نماز کے بعد اُنھیں سلام کرنے اور اُن سے ملنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز اُن سے اُن کے دفتر میں جا کے ملا تو فرمانے لگے: مولوی صاحب! دہلی میں واقع کویت کے سفارت خانے سے بہت ساری عربی کی کتابیں خوب صورت خوب صورت سی آئی ہیں، اکثر نئی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، چند ایک قدیم مصنفین کی نئی چھپی ہوئی کتابیں بھی ہیں، میں نے حضرت مولانا سید محمد میاں کی نشست گاہ والے کمرے کی شیشے کی الماریوں میں اُنھیں چنوا دیا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ نے صرف تمھارے لیے بھیجوا دی ہیں، جدید عربی میں لکھی ہوئی کتابیں عموماً ہمارے علما پڑھتے ہیں نہ اُن کے مماثل طور پر سمجھ میں آنے کی ہیں، تمھارے لیے اجازت ہے کہ دفتر کے اوقات میں جب چاہو وہاں آکر مطالعہ کر سکتے ہو، بالخصوص خالی گھنٹوں میں۔

میں کسی طرح وقت نکال کے روزانہ ہی ایک آدھ گھنٹہ دفتر کے حضرت مولانا سید

محمد میاں والے کمرے میں جاتا اور سکون کے ساتھ وہاں بیٹھ کے اُن کتابوں کا مطالعہ کرتا اور نہ صرف اُن کے مضامین و شمولات سے فائدہ اُٹھاتا؛ بل کہ اُن کی عربی زبان پر بہت زیادہ غور کرتا۔ الفاظ کے استعمال، صلہ جات، ترکیبوں، ساختیات کے ساتھ ساتھ، رموزِ املا؛ کاما، سبکی کولن، بیانیہ، علامتِ ندا و مفاجات وغیرہ کے موقع و محل پر بہ طور خاص غور کرتا۔ رمضان کی چھٹی میں جو شعبان کے اوائل سے ہی شروع ہو گئی تھی، بالخصوص بہت استفادے کا موقع ملا۔ مولانا و اصفؒ رمضان میں بھی پابندی سے دفتر آتے اور متعلقہ امور انجام دیتے تھے۔ مطالعہ کا یہ موقع اُن سے بار بار یعنی روزانہ ہی ملنے کا موقع ثابت ہوا اور میری اُن سے قربت کا ذریعہ بنا۔ اُن کتابوں میں کئی کتابیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۳ء - ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی تھیں: الْأَرْكَانُ الْأَرْبَعَةُ، مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِإِنْحِطَاطِ الْمُسْلِمِينَ، الصِّرَافُ بَيْنَ الْفِكْرِ الْأَلَا سَلَامِيَّةِ وَالْفِكْرِ الْغَرْبِيَّةِ میں ان تینوں کتابوں کو از اوّل تا آخر نہ صرف پڑھ گیا؛ بل کہ اُن میں سے بعض کتابوں کے بعض پیرا گراف خواندگی بسیار کی وجہ سے زبانی یاد ہو گئے۔

ایک روز مطالعے سے فارغ ہو کر، اُن کے حجرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ انھوں نے آواز دی: مولوی نور عالم! میں فوراً حجرے میں داخل ہوا، سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا: ”لو یہ ایک اہم کتاب ہے (مفتی اعظم کی یاد) اس کا مطالعہ کرنا، حضرت والد صاحبؒ پر میں نے اس میں بہت سا مواد جمع کر دیا ہے۔“ میں نے رمضان ہی میں وہ کتاب بھی از اوّل تا آخر پڑھ ڈالی اور اُس کی روشنی میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ پر ایک مُفَصَّل مضمون دو تین ماہ بعد لکھا جسے رسالہ ”دارالعلوم دیوبند“ کے سابق ایڈیٹر مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ (۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء - ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء) نے کئی قسطوں میں اپنے رسالے میں شائع کیا۔ اُس کے بعد اُن کا بار بار پوسٹ کارڈ ملتا رہا کہ آپ اسی طرح کے اور مضامین رسالہ ”دارالعلوم“ کے

لیے لکھیں؛ لیکن بدحوہ میں اُن کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔

شوال ۱۳۹۱ھ / نومبر ۱۹۷۱ء میں ایک مرتبہ اُن کے گھر، اردو بازار، جامع مسجد دہلی جانا ہوا۔ دیوان خانہ جو اُن کا کتب خانہ بھی تھا، میں فرش پر سفید سوتی کپڑے کی چاندنی بچھی ہوئی تھی، جس پر کسی جگہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی شکن نہیں ملی۔ کتابیں لکڑی کی کھلی الماریوں میں سجی تھیں اور دیوار پر چاروں طرف طغریٰ سجے تھے، میرے استفسار پر مولاناؒ نے فرمایا کہ ان میں سے کچھ والد صاحبؒ کے ہاتھ کے اور کچھ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پھر اُنھوں نے اپنی زیر ترتیب کتاب ”کفایت المفتی“ (مجموعہ فتاویٰ حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ) کے ٹائٹل پر دی جانے والی نام و پتے والی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کئی خطوں والی عبارت دکھائی اور فرمایا: پسند کرو، کون سا اچھا رہے گا؟ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو مبتدی ہوں آپ کا ذوق عالی جو کہے وہی منتخب فرمائیں۔ فرمایا: نہیں تم اپنی پسند بتاؤ، اُس کے بعد میں اپنی پسند سے اُس کا موازنہ کروں گا۔ میں نے عرض کیا: یہ خط نسخ والی عبارت زیادہ اچھی لگتی ہے۔ مولاناؒ نے بھی اُسی کو پسند فرما رکھا تھا، چنانچہ اُسی کو ترجیح دی گئی۔

اہل قلم اور خطاط

عموماً خطاط موٹے اور جلی حروف میں تو اچھا لکھ لیتے ہیں، لیکن باریک کتابت کے حوالے سے بہت بدخط ہوتے ہیں؛ لیکن مولانا حفیظ الرحمن واصفؒ فاؤنٹین پن سے بھی بہت خوب صورت اور خوش حروف خط نستعلیق و خط نسخ لکھتے تھے۔ اُنھوں نے اُسی ملاقات میں ”کفایت المفتی“ کے مسودوں کے بعض صفحات دکھائے، اس موٹی سی کئی جلدوں والی کتاب کے سارے مسودے، اُن کے قلم سے یکساں خوش خط نستعلیق میں لکھے ہوئے تھے، اُن کی تحریر بڑی واضح اور نوک ملک کی صحت اور نقطوں کے واضح ہونے اور صحیح جگہ میں پڑنے کے حوالے سے اتنی ممتاز تھی کہ میں دیر تک دیکھتا

پس مرگ زندہ

اور سر دھتارہا۔ اس سے پہلے میں نے کسی بڑے اہل قلم کی، ایسی تحریر نہیں دیکھی تھی، جو طویل ہونے کے باوجود اتنی حسین اور خوش خطی کے ”معیار و اقدار“ کی اس درجہ حامل ہو۔ سچ یہ ہے کہ میں نے پہلا انسان دیکھا تھا جو بہ یک وقت عالم و فقیہ اور کاتب (رائٹر) و شاعر و ادیب اور خوش نویس تھا۔ خط فاؤنٹین پن سے، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کا بھی بہت پاکیزہ ہوتا تھا؛ لیکن وہ خطاط اور اہل قلم و مؤلف تو تھے؛ مگر فاؤنٹین پن کی ان کی تحریریں کشیدہ اور قواعد کتابت و خوش خطی سے قدرے ناموافق ہوتی تھیں۔

۱۱ جولائی ۱۹۷۲ء (۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) کو، راقم الحروف دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مندرجہ مندرج ہوا، تو مولاناؒ نے وہاں کے طویل قیام کے دوران مجھے کئی خطوط لکھے، جن کے مضامین تو پرکشش تھے ہی؛ لیکن ان کے حسن خط کو میں بار بار دیکھتا اور سیر نہ ہوتا۔ کئی کئی روز ان خطوط کو سامنے کسی جگہ رکھتا، بار بار پڑھتا اور مشمولات کے ساتھ ساتھ خوش خطی کے ساحرانہ جمال سے آنکھوں کو ٹھنڈی کرتا۔ ایک بار ایک پوسٹ کارڈ بھیجا، جس میں لکھا تھا کہ اب تمہارے خطوط نہیں آتے، شاید تم بھول گئے ہو، مولانا علی میاںؒ ایسے خوب صورت علم والے، خوب سیرت انسان کو پا کر ہم جیسوں کو بھول جانا قریب قیاس معلوم ہوتا ہے۔ توقع ہے کہ تم ان سے تعلق کے ساتھ مجھے بھی یاد رکھتے ہو گے۔ انھوں نے اپنے خط میں حضرت مولانا علی میاںؒ کو سلام کہنے کا حکم دیا اور اس شعر پر خط کو ختم کیا۔

چوں باحبیب نشینی و بادہ پیمائی

بہ یاد آحریفان بادہ پیمارا

ناچیز نے حسب سابق خط کو کئی بار پڑھا، جب قدرے طبیعت سیر ہو گئی، تو حضرت مولانا علی میاںؒ کی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں آمد اور قیام کے موقع سے، میں نے وہ خط انھیں پڑھنے کو دیا، تو حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ

مولانا واصف صاحب کا خط اتنا خوب صورت ہوتا ہے؟ میں نے شاید ہی کسی اہل قلم کا اتنا پاکیزہ خط دیکھا ہوگا۔ اہل قلم، افکار و خیالات و مواد پر تو جہم دہی کی وجہ سے، تحریر کے ظاہر کو سنوارنے کے لائق نہیں رہتے؛ اس لیے عموماً نہ صرف یہ کہ خوش خط نہیں ہوتے؛ بل کہ بدخط ہوتے ہیں، اللہ نظر بد سے انھیں بچائے، آپ جب بھی انھیں خط لکھیے گا، میرا سلام ضرور لکھیے گا اور میرا یہ تاثر بھی۔ صد افسوس کہ مولانا کا یہ خط میرے کاغذات میں تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔

مولانا واصف رحمۃ اللہ علیہ خوش نویسی میں مشہور خطاط منشی عبدالغنی کے شاگرد تھے، جو اپنے والد منشی ممتاز علی کے واسطے سے بہادر شاہ ظفرؒ آخری شہنشاہ ہند (ابوالمظفر محمد سراج الدین ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء-۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) کے تلمیذ تھے۔

بے پایاں شفقت و عنایت

رمضان ۱۳۹۲ھ کی کسی تاریخ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے ناچیز کی درخواست پر، جو اُس نے خود ہی عربی میں تیار کی اور خود ہی خطِ نسخ میں اُس کی کتابت کی تھی، سفارش کے لیے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دہلویؒ نے اپنے گرامی نامے کے ساتھ، اُس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی خدمت میں روانہ فرمانے کا ارادہ کیا تو ایک روز، ناچیز نے اس کا تذکرہ مولانا واصف صاحبؒ سے کیا۔ انھوں نے از خود، میری گزارش کے بغیر فرمایا کہ مولانا علی میاںؒ تو مجھ سے بھی بہت بے تکلف ہیں، وہ میرے بہنوئی مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ کے کتب خانہ عزیز، اردو بازار، جامع مسجد دہلی میں (جو ہندوستان کی علمی و ادبی، سماجی و سیاسی، فکری و دعوتی ممتاز شخصیتوں کا ہمہ گیر مرکز رہا ہے) اُس وقت بہت تشریف لاتے تھے، جب اُن کا حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا ندھلویؒ (۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء-۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء) کی خدمت میں آنے جانے کا یہم سلسلہ تھا اور دگر علمی و دینی تقاضوں سے بھی اُن کا دہلی آنا جانا لگا

رہتا تھا۔ اِنْ شَاءَ اللہ میں بھی اُنھیں تمھارے لیے خط لکھوں گا؛ تاکہ وہ ضرور سفارش لکھ دیں۔ میں نے عرض کیا: حضرت! ابھی لکھ دیجیے؛ تاکہ اُسے حضرت الاستاذ کے خط کے ساتھ ہی روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی منشی مدرسہ امینیہ کے ذریعے خط تیار کروا کے میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ چند روز بعد یہ خط میں اپنے قلم سے لکھتا، تو کچھ اور بات ہوتی، اِس وقت کئی چیزوں میں بے حد مشغول ہوں؛ لیکن تم یہ صحیح کہہ رہے ہو کہ ہم رشتہ دونوں خطوط جائیں گے تو زیادہ مؤثر ہوں گے۔ چنانچہ مولانا علی میاں نے وہ سفارش لکھ دی اور جوابی رجسٹری لفافے میں موصول ہوگئی؛ لیکن جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جانا مُقَدَّر نہ تھا؛ اِس لیے نہ جاسکا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مولانا کے میرے نام شفقت نامے

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میرے دس سالہ تدریسی دور ایسے میں، مولانا واصفؒ نے موقع بہ موقع اپنے گرامی ناموں کے ذریعے، اپنی شفقت و عنایت سے نوازا۔ پہلے سال بالخصوص میرے خطوط کے جواب میں اُنھوں نے کئی شفقت نامے تحریر فرمائے۔ مدرسہ امینیہ میں دفتر کے قریب جاب شمال میں واقع ایک مختصر سے حجرے میں، میں نے اپنے سامان رکھ دیے تھے؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں مہمان کی حیثیت سے صرف تین دنوں کے لیے گیا تھا؛ لیکن مولانا نے اپنی بے پایاں عنایت کے طفیل مجھے اپنے پاس ہی روک لیا اور بالآخر مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس منتخب کیا۔ میں بار بار مولانا واصفؒ کو لکھتا کہ حضرت! میں مدرسہ کا ایک کمرہ گو مختصر سا ہی سہی، طویل عرصے سے مشغول کیے ہوا ہوں، مجھے اِس سے بے حد شرمندگی ہے؛ لیکن میری مجبوری ہے کہ میں سال کے بیچ میں دہلی آکر اپنا سامان لا بھی نہیں سکتا۔ مولانا کا جواب آتا کہ مجھے اِس سے کوئی گرائی نہیں اور دینا مدرسہ سے کا کوئی نقصان بھی نہیں؛ کیوں کہ اُس قبر نما کمرے میں کوئی کبھی رہتا ہے نہ رہ سکتا ہے، آپ خاطر جمع رکھیے اور اپنی فرصت اور گنجائش کے مطابق ہی آئیے، آپ کا سامان جب تک آپ

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

لے نہیں جائیں گے۔ محفوظ رہے گا۔

اس سلسلے کے اُن خطوں میں سے ایک خط یہ تھا:

17.5.

بزرگ محترم مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

علیکم السلام۔ مبارکباد عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا

کی رسالت سے مدد ملے گی یا دعاؤں سے مدد ملے گی۔

یہ امر موجب اطمینان و مسرت ہے کہ تحریک ایک عالمی محول

میں مطالعہ و تحقیق کا موقع ملا۔ اور یہ ہے اہل فکر و دانش

اور صالح حضرات کی صحبت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تحسین

و انتفاع اور پھر افادہ کی توفیق و سعادت ارزانی فرمائے

احمد

میں اتنی ہی عزیز تھیں و اگر اندویش اپنی خاموشی و اوقات کی

دعاؤں میں ہم گنگہ روں کو بھی یاد رکھنا۔

جو با حبیبیت و بارہ پائی

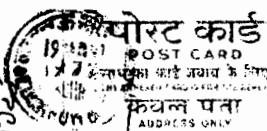
جاوے کر حریفان بارہ پائے

بیشک دعا سامان اُس جس بحر میں تھیں۔

اور کہی وجہ نہیں۔ جس میں سے تھی

گوئی نہیں

6294



تمہا اصفیٰ حسن رہے میں تم کو اگر
خاموش رہے وہ مجھ کو بھیجنا کی کوشش
کو تو ایجا ہوتا۔ دستم بخیر سلامت
و عشق بخیر و کامرانی

مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

اور مولانا محمد رفیع الدین

دراقت حضرت سے سلام عرض

کے بعد دعا کی درخواست کی

خیرات لکھنؤ

عبدالمجید

عبدالمجید دہلی

عزیز گرامی قدر مولانا نور عالم یعنی مفتوح پوری
معرفت حضرت مولانا محمد رفیع الدین

DAR-UL-ULOOM NUDWA-TUL

- ULAMA. LUCKNOW

U. P.

پس مرگ زندہ

۱۲ مارچ ۱۹۷۲ء (۲۳ محرم ۱۳۹۲ھ) کو میں نے مولانا کو ”کفایت المفتی“ کے حوالے سے یاد دلایا کہ اگر وہ چھپ گئی ہو، تو آپ حضرت مولانا علی میاں صاحب کو ضرور بھیج دیں، وہ بہت خوش ہوں گے۔ اُس کے جواب میں اُن کا یہ عنایت نامہ موصول ہوا:

۳۰
۷/۲
۷۲
۷۲
۷۲

دہلی

غیر مکمل زینتِ عالم

للہم - آپہ سارا چہ و غیرہ خط ملا تھا مگر کثرت

تغافل کی وجہ سے جلد میں تاخیر ہوئی =

عوام سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔

آج کل آپ کا کر رہے ہیں؟ مطلع کیجئے نیز اپنی اور

مولانا علی میاں کی خیر و عافیت سے بھی مطلع کیجئے۔

مولانا کو میرا سلام و برکت بھی پہنچا دیجئے۔

کفایت المفتی کی تیسری جلد چھپ رہی ہے۔

دوسری بند میری جھمکے گی۔ تیسری اور پہلی جلد

ساتھ ہی ساتھ مولانا کو انشاء اللہ عنقریب۔

بھائیو! - امید ہے آپ بخیر ہوئے۔

فقد و غم دعاؤں کے ساتھ

To. MAULVI NOOR ALAM
AMINI
c/o MAULANA MUHAMMAD
AL-HASANI
DARUL-ULOM
NADWATUL-ULAMA
LUCKNOW



حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

احقر کے ایک ناچیز نامے کے جواب میں ۱۵ شعبان ۱۳۹۳ھ (۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ء) کو مندرجہ ذیل مکرم نامہ ارسال فرمایا، جس کی سطر سطر سے شفقت و محبت کا ظہور ہوتا ہے:

۱۵ شعبان ۱۳۹۳ھ

عزیز مکرم زیدت علیکم

۱۷۵۶

علیکم السلام ورحمۃ اللہ - تمہارا خدایا بیجا مہم نہ لایا۔

ہمیں انکا انشا غافل کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو چکی۔

انتظار میں قوی ہوئی۔

یاد تھا کہ اکثر آدمی رہتے ہیں اور دل کو گونا گونی پڑتی ہے

قابلِ فخر ہے وہ سہارن پور میں جو اپنی جانے والی

کو چاہے اس لئے اس دور کی تعلیق کو آفریں بنا جو۔

الدر ب الفوت، تمہارے علم و عمل میں برکت اور افزائی

علاوہ اُن سے اور تمہارے تمام دینی و دنیاوی مقاصد پر کمال

بھی میری ناچیز تالیف کا معنی نام گرد و گرد و نامہ

اور تاریخی نام معیار البلاغہ ہے۔ کتاب شروع

ہو چکی ہے۔ دعا کا ضرورت ہے۔

میں تحریر ہوں۔ امید ہے تم بھی بخیر ہو گے

حضرت مولانا علی بیاض اگر زندہ ہیں تو تشریف فرما ہوں

تو انھار کی طرف سے سلام مسنون اور تہنیت ذیل تحت

موزون پر پیش کر دینا۔

بائی کردہ کہ غافل زیادہ کرتے ہیں

سلام کا جواب نہ کر سکتے ہیں

نقطہ تمہارا غیر انگریزی

۴/۹/۷۳

पोस्ट कार्ड
POST CARD

मुंबई पोस्ट
MUMBAI POST



بھلائی بخیریم مولوی نور عالم افغانی

دارالعلوم ندوۃ العلماء

LUCKNOW

U. P.

پس مرگ زندہ

۱۳/۶/۱۹۷۳ء (۱۲/جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ) کے شفقت نامے میں جس محبت و قدردانی کا اظہار فرمایا ہے، وہ انھی کا حصہ تھی۔ اس دنیا میں اب میرے ایسے ”بڑے“ اور بزرگوار لوگ نہیں رہے، جو ایسے خلوص و محبت سے مجھے نوازیں:

۱۴/۶/۷۳

عزیز مکرم زینت عالم

وعلیک السلام - تمہارا خط موصول ہوا اور بہت مسرت ہوا
یاد تود رہا ممنون اور دعا گو ہوں -

تمہارا باتیں یاد آتی رہتی ہیں۔ محبت، اخلاق،
مروت۔ ادب، احترام، شرفہ دل۔ وغیرہ

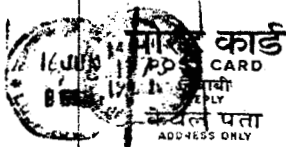
لہذا تمہاری نصیحتیں خوش رکھے اور تمام تمہا صدفی
دوستوں میں فائز و کامیاب کرے۔ آمین۔

گرمی کی شدت کی وجہ سے چھوٹا بیمار ہو گیا تھا
اور مجھے بھی اختلاف قلب و فک کی مسئلہ پت ہو گئی تھی
اب اکھوند دونوں بخیریت ہیں۔ سب بچے سیدھے نفس

کرتے ہیں۔

دمتم بخیر و سلامہ
عشتم بعز و کرامہ
دعا گو۔ علیک السلام

۶۹۷۰۷



بلاخانہ عزیز مکرم مولانا نور عالم امینی
دارالعلوم ندوۃ العلماء
LUCKNOW
U. P.

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلویؒ

مولاناؒ کی مشہور کتاب ”اردو مصدر نامہ“ چھپی تو انھوں نے میری عزت افزائی کے لیے، اُس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی روانہ فرمایا۔ مطالعے کے بعد ناچیز نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، تو آپ نے اُس کی (ناچیز کی) اپنی بڑائی کی وجہ سے اتنے بلند الفاظ سے حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہرگز اُن کا مستحق نہ تھا:

۱۱/۱۱/۷۶

فیروز کم زبوت علیکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ - آپ کا عبارت نہ معلوم کچھ موجب مسرت و اربابِ علم
آپ کی غیر عادتِ معلوم ہوگئی۔ ادبِ اللغۃ کا کچھ خض و خشم رکھ کر زندگی پر روشنی

بنا بہ عطا فرمائیں۔

اردو مصدر نامہ کو آپ نے پسند کیا۔ مجھے حاد دل آگئی۔ کہیں اپنی نثر اور جو بڑی
نثر پسندیدہ میری منت میں آجی مہدی ہے۔ بیتِ غنمی ہوگئی۔ اردو کو جو علمِ غیر ہے۔ تبت
میرے حوصلہ افزائی کے۔ اب آئینہ اس قسم کی منت کا اثر فحشیت پر بائیں ہلکے اور زیادہ

نفاذ کار حاصل ہوگا۔

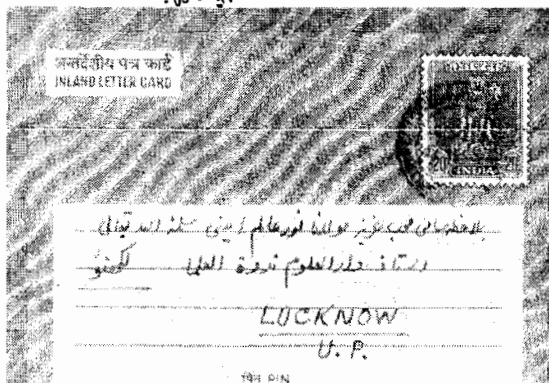
میرا آپ کے لئے کھانے کا رشتہ ہے۔ اردو میری آپ کی ہی دعا میں رہا ہے

رکھیں گے۔ جو خداوندِ عالم نے آپ کو فیض میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہم سب آپ کی

بابت غور کرتے ہیں۔

فیروز کم زبوت علیکم

نقد و رسم
مصلحتاً



پس مرگ زندہ

مجھے لکھنؤ میں پہلی بار اہل تعلق نے مُتوجّہ کیا کہ اپنا پاسپورٹ بنوالینا چاہیے؛ کیوں کہ یہ مختلف الاغراض ہوتا ہے اور اُس کی ہر جگہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لیے پیدائش کی سند کی ضرورت تھی، میں نے مولانا موصوف کو لکھا کہ آپ کے مدرسے کے ریکارڈ میں میری جو تاریخ پیدائش درج ہے، وہ ہمیں عنایت فرمادیں، مجھے دستاویز کے لیے ضرورت ہے، حضرت نے اس سلسلے میں معذرت کی اور وہ معذرت معقول تھی، اس سلسلے میں یہ عنایت نامہ موصول ہوا۔



عزیز مکن

وعلیکم السلام - افسوس! آپ نے ایک ایسی خدمت میرے سپرد کی ہے کہ اس کا انجام دنیا میں نہیں ہے۔ ہمارے دینی علم میں چونکہ تعلیم کے لئے عمر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اور پھر ملازمت کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ان تاریخ پیدائش کوئی خانہ نہیں۔ اور فارم داخلہ میں تخمینہ عمر طالب علم جو اپنے آپ لکھ دیتا ہے اسکی تصدیق ہم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم کسی طالب علم سے تاریخ پیدائش اسٹیمپٹ نہیں مانگتے۔ اپنی تاریخ پیدائش اسٹیمپٹ تو اپنے وطن سے ہی حاصل کیجئے۔

(عید) مزاج بخیر ہوگا - فقط والسلام

محمد طاہر مستم

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

ندوة العلماء کے پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی کی روداد مولانا سید محمد الحسنی (۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء-۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) سابق ایڈیٹر ”البعث الاسلامی“ (عربی ترجمان دارالعلوم ندوة العلماء) نے لکھی تو میں نے اُس کا ایک نسخہ مولانا کی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے، ان الفاظ میں وصول یابی کی رسید دی:

۱۱/۱۲/۷۶
۹ ذی الحجہ ۱۴۰۰

غیر موزن و قیمت کا علم
لکھ

وعلیکم السلام ورحمة اللہ - (مدرسہ بنی برکت ہونے پر)
لورڈ آئی صحت و سلامتی لورڈ افروز عاقبتاً باک و رگہ العزہ

سے طالب ہوں -

روداد جن پر موصول ہو چکا ہے اور جس پر تہہ

نظر بھی ڈال دے۔ میٹر تو قابلِ تحسین ہے ہی، تہہ

بھی قابلِ ستائش ہے۔ اس دعا کی آپ کے حوالہ

علو و ترقی عطا فرمائیں۔ آمین

آپ کے سب بھائی بہن بھینجی و عاقبت میں

سلام عرض کرتے ہیں

بہن ایک ہی دعا یعنی حسنِ خاتمہ کی دعا محتاج

ہوں۔ امید ہے اگر فراموش نہ کریں گے۔ فقط

دعا گو مصطفیٰ و ائمتہ

مدرسہ اہلسنہ دینی

पोस्ट कार्ड
POST CARD
साथ का कार्ड जवाब के लिए
THE ATTACHED CARD IS FOR THE REPLY
केवल पता
ADDRESS ONLY



بلا خطہ بغیر موزن و قیمت کا علم مولانا سید محمد الحسنی

استاذ دارالعلوم ندوة العلماء

لکھنؤ

NADWAT-UL-ULAMA

LUCKNOW

پین PIN

U. P.

افسوس ہے کہ مولاناؒ کے متعدد خطوط کاغذات میں کہیں گم ہو گئے، رسالہ ”دارالعلوم“ میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر میرے دراز نقش مضمون کو پڑھ کر انہوں نے بڑا حوصلہ افزا خط لکھا تھا اور بہت داد دی تھی، حال آں کہ یہ مضمون اردو میں میری پہلی کاوش تھی، اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد منتخب ہونے پر بھی بہت شاباشی دی تھی؛ لیکن یہ خطوط زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکے، جس کا بہت قتل ہے۔

لکھنؤ سے دہلی کا پہلا سفر اور مولاناؒ کی میزبانی سے شرف یابی

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ / مئی ۱۹۷۳ء میں، ایک سال سے زائد مدت کے بعد گرمی کی چھٹی میں دہلی آیا، کئی روز قیام رہا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دہلویؒ اور مولانا واصفؒ کے ہاں پہلی بار دوپہر کے کھانے میں یکے بعد دیگرے مدعو ہوا۔ مولانا واصفؒ کے دسترخوان کا قرینہ دیکھ کے مجھے کھانا لینے میں تکلف ہوا کہ اس قرینے کے آداب کو صحیح طور پر برتنے کی سطح پر، میں پورا اتر سکوں گا کہ نہیں۔ مولاناؒ نے اپنے مُعَدِّد بڑے صاحب زادوں کو جو ان کی پہلی اہلیہ محترمہ ”شفیعہ خاتون“ ہمیشہ مولانا سمیع اللہ قاسمی سے تھے بلوایا تھا؛ تا کہ میرا ان کا تعارف بھی ہو جائے اور میرے اکرام میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں مولانا جمیل الرحمن قاسمی مرحوم (متوفی چہار شنبہ: یکم رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۹۶ء) جنہوں نے عربی میں ایم اے کرنے کے بعد اینٹگلو عربک اسکول میں ٹیچر کی خدمات انجام دیں، پھر سال ہا سال ریاض میں برسر ملازمت رہے اور بعد میں وفات تک مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم بھی رہے۔ نیز مولانا انیس الرحمن قاسمی (جو ذاکر حسین کالج میں لکچرر اور پھر پروفیسر ہیں) بہ طور خاص یاد ہیں۔ آخر الذکر سے دارالعلوم دیوبند آمد کے بعد بھی کئی بار ان کے گھر پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

کھانے کے بعد دیر تک مجلس جمعی اور طرح طرح کی یادوں اور باتوں کو خوش گوار

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلویؒ

وہ بہار علمی ماحول میں دہرایا جاتا رہا۔ عموماً علماً قیلولہ کی سنت ادا کرتے ہیں، یقیناً مولانا واصفؒ اور اُن کے لائق فرزند اُن بھی اِس کے عادی رہے ہوں گے؛ لیکن اُس دن مولانا واصفؒ نے مدرسہ امینیہ کی تاریخ، جہادِ آزادی اور جمعیتہ علماء اور اپنے مدرسے کے تعلق سے مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے تاریخی و علمی و مجاہدانہ کارناموں کا ایسا خوب صورت تذکرہ چھیڑا کہ ہم لوگ عصر کی اذان کے وقت ہی اُن کی مجلس سے اُٹھ سکے۔ میں اُن کے مکان سے نیچے اردو بازار کی سڑک پر اتر رہا تھا تو ایسا محسوس ہوا کہ پاؤں پیچھے کوکھنچ رہے ہیں؛ کیوں کہ عظیم انسان کے ولولہ انگیز کارناموں کو سن کے دل میں جوش و مسرت کی ایسی حسین لہریں اُٹھ رہی تھیں کہ یہ افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اِس مجلس کے اختتام کو اتنی آسانی سے کیسے گوارا کر لیا۔

میری دیوبند آمد اور مولانا سے ملاقات

شوال ۱۴۰۲ھ / اگست ۱۹۸۲ء میں، راقم الحروف استاذ دارالعلوم دیوبند اور چیف ایڈیٹر پندرہ روزہ ”الداغی“ عربی (۱) کی حیثیت سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند آ گیا۔ چوں کہ شروع شروع میں طباعت کے لیے بار بار خود ہی دہلی جاتا تھا؛ اِس لیے کثرت سے دہلی جانے آنے کا سلسلہ لگا رہتا تھا؛ اِس کے باوجود کثرتِ مشاغل کی وجہ سے مولانا واصفؒ سے دیوبند آمد کے بعد صرف دو بار اُن کے مکان پر ملنے کی سعادت حاصل ہو سکی۔ وہ دارالعلوم کے ۱۹۸۰ء سے تقریباً دو سال تک جاری رہنے والے جھگڑے، اُس کی تقسیم، علما کی ہوا خیزی اور تاریخ دارالعلوم کی بدنامی سے بہت زیادہ رنجیدہ اور خوشیاں بہت کم پاسکا ہوں؛ لیکن اِس غم کی وسعت و گہرائی پر غور کرتا ہوں تو دل چھلنی ہو جاتا ہے۔ علما شخصی اور سیاسی نزاع کو کہاں تک لے جاسکتے ہیں، اِس کا اندازہ

(۱) جوشارہ، جلد نمبر ۱، شائع شدہ صفر - ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق اگست ۱۹۹۳ء سے ماہ نامہ میں تبدیل ہو گیا۔

نہ تھا۔ مدرسہ امینیہ کی تاریخ میں بھی طرح طرح کی ناہم واریوں کے زخم سہنے پڑے ہیں؛ لیکن دارالعلوم کا گھاؤ گہرا اور ناقابلِ اندمال ہے۔ کاش میرے مولیٰ نے اس واقعے سے پہلے مجھے اٹھالیا ہوتا۔

مولانا کی تصنیفات

۱- کفایت المفتی، نو جلدیں، طبع اول ۱۹۷۲ء، طبع دوم ۱۹۸۲ء۔ یہ حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جو مولانا واصف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سال ہا سال کی محنت اور عرق ریزی کے بعد جمع کیا تھا۔ علما و مفتیانِ کرام کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

۲- درس الاسلام، طبع شدہ ۱۹۶۲ء، یہ منظوم تعلیم الاسلام (تالیف حضرت مفتی اعظم) ہے۔

۳- مفتی اعظم کی یاد، مطبوعہ ۱۹۶۷ء، اس میں وہ سارے مضامین و تاثرات جمع کر دیے گئے ہیں، جو اہل علم و فضل اور بڑے بڑے قائدین نے حضرت مفتی اعظم کے انتقال پر لکھے تھے یا تقریریں اُن کا اظہار کیا تھا۔ خود مولانا واصف صاحب کے قلم سے اُس میں ایک مفصل مربوط اور مؤثر مضمون ہے۔

۴- اردو مصدر نامہ، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، اردو زبان کے تیرہ سو مصادر اور انیس سو مشتق الفاظ کا ذخیرہ۔

۵- تذکرہ سائل، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، حضرت سائل دہلوی کی سوانح اور نمونہ کلام۔

۶- زرِ گل، مطبوعہ ۱۹۷۶ء، مجموعہ کلام حضرت واصف دہلوی۔

۷- سہ لسانی مصدر نامہ، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، اردو مصادر کے عربی، فارسی مترادفات کی تحقیق و تشریح و طریقہ استعمال۔

۸- ادبی بھول بھلیاں، مطبوعہ ۱۹۸۰ء، لسانی و ادبی تحقیق و تنقید۔

حضرت مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی

۹- قرآنی پندنامہ، مطبوعہ ۱۹۸۱ء، آداب معاشرت سے متعلق قرآنی آیات کا ترجمہ و تفسیر اور ضروری وضاحت۔

۱۰- مَطْلَعُہ کی شرعی حیثیت، مطبوعہ ۱۹۸۵ء (بہ شکل پمفلٹ)

۱۱- عقیدہ ورواداری، مطبوعہ ۱۹۸۵ء، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے پر شرعی نقطہ نظر کو بڑے صائب اور معقول انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۲- جمعیت علماء پر تاریخی تبصرہ، مطبوعہ ۱۹۶۹ء، اس مختصر سی کتاب میں بہت سے اصل حقائق کو اجاگر کیا گیا ہے، جس سے جمعیت کی اصل تاریخ کی بصیرت افروز آگہی حاصل ہوتی ہے۔

۱۳- مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی، طبع چہارم ۱۹۶۹ء۔ اس میں مدرسے کی تاسیس، دہلی میں اُس کی ضرورت، نیز مدرسے کے بانیان بالخصوص مولانا امین الدین اورنگ آبادی، حضرت مفتی مولانا محمد کفایت اللہ اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری کا مختصر مگر جامع تذکرہ اور ساتھ ہی مدرسے کے اکابر اور نام ورفضلاً بالخصوص حضرت مفتی اعظم کے تلامذہ کا اجمالی تذکرہ بھی شامل ہے۔ مدرسہ امینیہ کی ضرورت و اہمیت اور کارنامے کو جاننے کے لیے، اس رسالے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

۱۴- مدرسہ حسین بخش کا تعارف۔

۱۵- قصہ نبی کا، مطبوعہ ۱۹۸۰ء، فارسی نظم کا منظوم اردو ترجمہ۔

مولانا کی آل و اولاد اور خاندان

مولانا کی پہلی شادی مولانا سمیع اللہ قاسمی کی، ہمیشہ ”شفیعہ خاتون“ سے ہوئی، جن کے لٹن سے ۴ لڑکے اور ایک لڑکی ”سکینہ خاتون“ متولد ہوئی:

۱- حمید الرحمن بے اے، جو عرصے تک ایران اٹمیسی میں اہم عہدے پر کام کرتے رہے۔

- ۲- حبیب الرحمن ایران میں انگریزی زبان کے پروفیسر رہے۔
- ۳- مولانا جمیل الرحمن قاسمی، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد اینگلو عربک اسکول دہلی میں ٹیچر رہے، پھر سال ہا سال ریاض میں برسرِ عمل رہے، آخر میں مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم کے عہدے پر فائز رہے۔ چار شنبہ: یکم رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۹۶ء کو وفات پا گئے۔
- ۴- مولانا انیس الرحمن قاسمی، ایم اے عربی، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسکول، نہرو یونیورسٹی دہلی سے تعلیم حاصل کی اور ذاکر حسین کالج میں لکچرار اور پروفیسر ہیں۔
- ۵- محترمہ سیکنہ خاتون حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی کے برادرِ اوسط جناب حمید الزماں سے منسوب تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد وہ مولانا ہی کے اہل خاندان کے ساتھ گزر بسر کرتی ہیں، لا ولد ہیں۔
- مولانا واصف کی دوسری شادی ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء کے دوران مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی کی نواسی ”نور جہاں بیگم“ سے ہوئی۔ اُن کے والد کا نام مولانا سید جلال الدین تھا۔ اُن کے بطن سے مولانا کے ۳ صاحبزادے اور ۶ صاحبزادیاں ہوئیں:
- ۱- محمود الرحمن ایم ایس سی، سعودی عرب میں الیکٹرانک انجینئر رہے بالخصوص مکہ مکرمہ اور ریاض میں۔
- ۲- ڈاکٹر محمد قاسم دہلی یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس، اُن کی ذاتی کلینک ہے۔
- ۳- محمد سالم انجینئر بلڈنگ (آرکیٹیکٹ)۔
- ۴- امینہ بیگم (بی اے) گھریلو خاتون۔
- ۵- امینہ بیگم (بی اے) ٹیچر۔
- ۶- عقیلہ بیگم (ایم اے) ٹیچر۔

۷- خدیجہ بیگم (ایم اے) گھریلو خاتون۔

۸- شکیلہ بیگم (ایم اے) لائبریری سائنس) مدینہ منورہ میں قیام پذیر۔

۹- نسیم فاطمہ (ڈاکٹر) شارجہ، امارات میں قیام پذیر۔

مولانا واصفؒ کے اُن سے ایک چھوٹے بھائی تھے، جنہوں نے کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اُن کا اسم گرامی خلیل الرحمن تھا، اُن کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی، لڑکے کا قیام کنڈا میں تھا۔ مولانا واصفؒ کی دو ہم شیرہ بھین، ایک اپنے خاوند کے ساتھ کراچی جا بسی تھیں اور ایک مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ کی اہلیہ تھیں۔ اُن کے ۳ لڑکے اور ایک لڑکی تھی:

۱- عبدالسلام جو دہلی کے اسکول میں ٹیچر رہے۔

۲- عبدالعزیز، امریکہ میں برسرِ عمل رہے۔

۳- عبدالحکیمؒ، جو کتب خانہ عزیز یہ اردو بازار کے منیجر تھے۔

۴- سلیمہ خاتون۔



جلیل القدر عالم وقائد امیر شریعت

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ — چند یادیں

۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء — ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء

۱۹۱۴

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں

۳/رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کی صبح کو دیوبند میں، دیوبند ہی کے ایک دوست نے اچانک ملاقات کے دوران بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو کے آج کے شب کے نشریے سے معلوم ہوا کہ امیر شریعت بہار واڑیسیہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی ۲-۳/رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹-۲۰/مارچ ۱۹۹۱ء سہ شنبہ و چہار شنبہ کی درمیانی شب میں، اس جہانِ آب و گل سے روپوش ہو گئے۔

اس خبر و حشت اثر کو اچانک اور بغیر کسی ذہنی آمادگی کے، سُن کر دل دھک سے رہ گیا۔ استعجاب و غم و اندوہ کے ملے جلے جذبات کے درمیان کچھ دیر تک بٹکا سا رہا اور ایسا لگا جیسے کسی نے نہ صرف میرا بل کہ پوری ملت کا سرمایہ حیات لوٹ لیا ہو۔ دل کی گہرائیوں میں معصوم خیال پیدا ہوا کہ کاش یہ خبر غلط ہو، لیکن دیگر ذرائع سے یہ تحقیق ہو گئی کہ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی، ہم مسلمانانِ ہند کو یتیم سا چھوڑ کر اپنے رب کے جوارِ رحمت میں جا چکے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ہرچند کہ مولانا سال ہا سال سے شکر کے مریض تھے؛ لیکن اس موذی مرض کے تمام تر اثرات کے باوجود، معاصر علما اور دانشوروں کے درمیان اُن کی ممتاز، فعال، متحرک اور سرگرم شخصیت کے پیش نظر، اس خبر کی تصدیق میں خاصا تردد ہوا، اور یہ حادثہ وفات ایک ”ناگہانی واقعہ“ سمجھوس ہوا۔ خصوصاً اُس لیے کہ اُن کے مُعْتَدِ دہم عصرِ رفقاءے کار علما، سن و سال میں اُن سے بڑے اور امراض کی وجہ سے عرصے سے رہینِ فراش ہیں، ذہن اُن کی خیر وفات سننے کے لیے بہت حد تک تیار ہے، اس کے برعکس مولانا دمِ واپس تک سرگرمی و زیست کی راہ پر محو سفر رہے؛ لیکن کیا کیا جائے کہ جب کسی کی موت کا وقت مُعْتَن آجاتا ہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی مؤخر نہیں ہو پاتا اور ہماری خواہشیں اور ضروریات اُس کو نہیں ٹال پاتیں۔ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔

اور نگاہوں کے تیر، آج بھی ہیں دل نشیں

میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۸۱ھ سے جانتا تھا، جب میں مدرسہ امدادیہ، لہریا سرائے درجہ نگہ (بہار) میں درجہ ششمِ اردو کا طالب علم تھا، مولانا مدرسے کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے، مجھ جیسے وہ طلبہ جنہوں نے انہیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا؛ بل کہ اُن کے متعلق صرف سنا تھا (بل کہ اس سے قبل موجودہ ہندی مسلمانوں کی کشتی کی ناخدائی کرنے والے کسی قدر آور عالم کی دید سے اُن کی آنکھیں شرف یاب نہیں ہو سکی تھیں) انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ مولانا کے اوصاف و کمالات کا ہلکا سا نقش میرے ذہن میں عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ پہلے سے صرف اتنا ہی قائم تھا، جتنا ایک ۹-۱۰ سال کے بچے کے ذہن میں قائم ہو سکتا تھا۔ میں نے مولانا کے متعلق جو کچھ پہلے سنا ہوگا، اُس کا واحد ذریعہ میرے مربی اول و استاذِ برادرِ معظم حضرت مولانا اولیس القاسمی رائپوری (۱) تھے، جو اُس وقت مدرسہ

(۱) متوفی بہ روز جمعہ ۱۱ ربیعہ اول ۱۳۱۹ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء۔

امدادِ بیہ کے باوقار استاذ تھے۔

مولانا کی ایلمپیڈر کار مدرسے کے میدان میں آ کر رکی اور مدرسین مدرسہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کے جم غفیر نے کار کو گھیر لیا، مدرسین استقبال کے لیے اور طلبہ دیدار کے لیے۔ مولانا کار سے اترے اور اپنی پُر رونق شکل و صورت سے ہماری نگاہوں میں بس گئے: درخشندہ چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں جو ذہانت اور فہم و فراست کی غماز تھیں، بڑا سا سر جو دماغوں اور خزانہ ہائے فکر و نظر سے بھرا ہوا تھا اور دو ہرا بدن — کچھ دیر بعد یعنی مغرب کے بعد جلسے کی صدارتی تقریر کے دوران اپنی واضح اور گونجتی ہوئی آواز اور مربوط و مُرتَّب گفتگو سے میرے معصوم دل کے سادہ صفحے پر احترام و محبت کا پر شکوہ شیش محل بنا گئے۔ شعور و آگہی کے آئینہ دور میں بہ خوبی اندازہ ہو گیا کہ معاصر علما و قائدین کے درمیان، بیہ صفت مولانا کے امتیازات میں سے تھی۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد مولانا ہم لوگوں کے لیے، صرف ایک بڑے ہندوستانی عالم نہیں رہ گئے؛ بل کہ وہ ہمارے فردِ خاندان اور ہماری عقیدتوں کا گہوارہ بھی بن گئے، ہمیں اُن سے ہزاروں مضبوط رشتے مربوط کر چکے تھے۔ اُن رشتوں کا سرچشمہ ہمارے گھر، خاندان اور ہمارے وسیع تر علاقے میں اُن کا مسلسل ذکرِ خیر تھا۔ ممکن نہیں تھا کہ علم و فضل کے حوالے سے کوئی مجلس منعقد ہو اور علما و فضلا کی زبان اُن کے تذکرہ سے خالی رہے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بہار و اڑیسہ کے اکثر مدرسوں کے مولانا صدر یا نگران تھے۔ اُن رشتوں کی دوسری بنیاد، اُن کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ بڑے صغیر میں اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں اُن کی بے پناہ کوشش پیہم کا اعتراف و قدر دانی تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل و دماغ کو شاد اور فخر و نازش کے جذبات سے سرشار کرتی گئی۔ خدائے کریم انھیں نبیوں، صدیقیوں، شہداء اور صالحین کے ساتھ جنت الفردوس سے نوازے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً ہے کہ توفیق و صلاحیت بندوں میں محض خدا کی طرف سے تقسیم ہوتی ہے اور یہ کہ باری تعالیٰ ہی وقت کے تقاضے کے مطابق، رجالِ کار پیدا کرتا ہے، تو یقیناً یہ بھی سچ ہے کہ خداے قدیر نے مولانا کو بیدار مغز اور باتو فقی بنا کر پیدا کیا تھا؛ تاکہ وہ آفتاب آزادی کے طلوع سے ہنوز ہندی مسلمانوں کو تلامہاے مصیبت میں گھری ہوئی کشتی کے چیدہ سعادت مند خداؤں میں سے ایک ہوں۔ خدا نے انھیں دو ایسے زبردست اوصاف سے نوازا تھا، جن میں معاصر علما و قائدین میں سے کوئی اُن کا شریک نہ تھا۔ یعنی ذہانت اور جرأت؛ اسی لیے آزاد اور سیکولر ہندوستان میں مذہب و عقیدہ پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں درپیش مسائل و آزمائشیں مولانا مَنّت اللہ رحمانیؒ اور اُن جیسے ذہین و جرأت مند علما و قائدین کی موجودگی میں، مسلمانوں کے لیے حوصلہ شکن نہ بن سکیں؛ کیوں کہ اُن علما و قائدین نے انھیں مسائل و مشکلات سے نمٹنے، اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے اور ”سیکولر قومی دھارے“ یا ”یکساں شہری قانون“ کی گردن پر لٹکتی ہوئی تلوار سے بچے رہنے کی ہمت دی۔ چنانچہ وہ تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود، خود ارادی و خود اعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کے جذبے سے سرشار ہیں اور ملی و قومی زندگی کی بے حساب و بے رحم ناہمواریاں، اُن کے صبر و عزیمت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہتی ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

میر کا رواں

مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے ہندی مسلمانوں کے لیے مولانا کی زبردست خدمات ہمیشہ نا قابلِ فراموش رہیں گی۔ یہ بورڈ اُن کی اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (متوفی شوال ۱۴۰۳ھ مطابق

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

جولائی ۱۹۸۳ء) رحمۃ اللہ علیہا کی تحریک و دعوت پر بمبئی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو منعقدہ تاریخ ساز اجلاس میں، زیرِ عمل آیا تھا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے علما و فضلا شریک ہوئے تھے۔ علما و قائدین نے متفقہ طور پر، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو بورڈ کا سکریٹری جنرل اور حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کو صدر منتخب کیا۔ قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اس کے صدر منتخب ہوئے اور کئی سال تک اس منصبِ جلیل کی زینت رہے۔

اس بورڈ کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں نے پوری طاقت سے یہ اعلان کر دیا کہ وہ مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کریں گے۔ مسلم پرسنل لا کو بے اثر کرنے والے، ہندوستان کے قانون ساز اداروں کی طرف سے وضع کردہ قوانین پر مسلسل نظر رکھنے کے لیے بورڈ نے باقاعدہ کمیٹی بنائی، جس نے حسن و خوبی سے اپنی ذمہ داری ادا کی اور آئندہ بھی اسی جوش و جذبے کے ساتھ ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی سعی مسلسل، اُن کی بے پناہ بیدار مغزی اور ہوش مندانہ قیادت کے طفیل، مسلم پرسنل لا کی حفاظت ہندوستان گیر تحریک بن کر ابھری اور ملک کے طول و عرض اور شہر و دیہات میں مسلمانوں کے اندر اسلامی شعور کی بیداری اور اسلامی زندگی اختیار کرنے اور جاہلی زندگی سے گریز کرنے اور مذہب و عقیدے کی راہ میں پیہم خطرات اور اندیشوں سے باخبر رہنے کا احساس اُجاگر کرنے میں، اس تحریک نے قابلِ ستائش کردار ادا کیا۔ نیز اس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں، جو مغربی تہذیب کا پروردہ اور مغربی ثقافت کا دیوانہ ہے، اسلامی شریعت کی آفاقیت، ابدیت اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونے کے حوالے سے، اعتماد بحال کیا اور یہ یقین بھی کہ اسلامی شریعت اتنی جامع، کشادہ اور لچک دار ہے کہ اُس کے پاس زندگی کے نت نئے مسائل کا کلی اور اطمینان بخش حل موجود ہے۔

کارِ خلیلاں خارا گدازی گدازتیں، گدازتیں

ہندوستانی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس کا فیصلہ کرتے ہوئے، یہ حکم دیا کہ مسلم مطلقہ کا اُس کے طلاق دہندہ شوہر پر، اُس وقت تک نفقہ واجب ہوگا، جب تک مطلقہ شادی نہ کر لے۔ یہ حکم کھلم کھلا اسلامی شریعت پر حملہ تھا اور دوسری طرف بورڈ کے لیے ایک بڑا چیلنج اور مسلمانوں کی اپنے دین کے سلسلے میں ذکاوت حس کا امتحان بھی۔ مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، اُس وقت پوری طاقت و قوت کے ساتھ حرکت میں آ گئے اور اُن کا بورڈ پوری طرح سرگرم عمل ہو گیا۔ مولانا اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح کمر بستہ ہو گئے۔ ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا، مسلم رائے عامہ کو اس حکم کے خلاف بیدار اور ہموار کیا اور اس کے پیچھے مسلم پرسنل لا میں دخل اندازی کے لیے کار فرما، جذبے سے عوام و خواص کو واقف کرایا۔ بورڈ نے اس سلسلے میں ملک کے مختلف شہروں میں جلسے اور میٹنگیں کیں۔ قائدین نے اس کے خلاف بیانات دیے۔ مولانا رحمانی کی حکمت عملی اور اُن کی ذہانت و جرأت، نیز بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بھاری بھر کم شخصیت اور بورڈ سے متعلق علما و قائدین کے جہد مسلسل کی وجہ سے، حکومت کو مسلمانوں کے ارادے کے سامنے سپر انداز ہو کر، مطلقہ سے متعلق قانون میں، مسلم پرسنل لا کی خواہش کے مطابق، بل پاس کرنا پڑا۔ یہ بورڈ کا؛ بل کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا ایک تاریخی کارنامہ تھا۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہندوستان کی سابق وزیر (اعلیٰ) آں جہانی اندرا گاندھی (۱۹۱۷-۱۹۸۴ء) نے ہندوستان میں ایمر جنسی نافذ کی اور اپنے تیز و طرار چھوٹے بیٹے نجی گاندھی (۱۹۳۶-۱۹۸۰ء) کے تعاون سے عام باشندوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً، جبری نس

بندی کا زور شور اور حکومت کی طاقت سے عمل شروع کیا۔ لوگوں کے منہ بند کر دیے گئے، زبانیں منجمد کر دی گئیں، قلم توڑ دیے گئے، پریس اور ذرائع ابلاغ پر سخت قسم کا سنسر عائد کر دیا گیا۔ عوام تو عوام خواص کو ذرا دھمکا کر بھیگی ملی بنا دینے کی کوشش کی گئی، شہریوں پر ایسی آہنی گرفت عمل میں لائی گئی کہ اللہ کی پناہ، وطن عزیز کے عزیزوں کو ذلیل کیا گیا، حرمت و عزت کو پامال کیا گیا، ظلم و جور کے آہنی شکنجوں سے ملک کی چیخ نکل پڑی، جبری نس بندی کے خوف سے لوگ بعض دفعہ اپنا گھر چھوڑ کر جنگلوں، دھان، گیہوں اور گنے کے کھیتوں میں چھپ کر رات گزارنے پر مجبور ہوئے۔ مسلم علما کو کبھی ترغیب اور کبھی تہدید کے ذریعے کرام کرنے کی کوشش کی گئی، مفتیان کرام کو نس بندی کے حق میں فتوے دینے پر مجبور کیا گیا اور زعمائے ملت سے زبردستی انٹرویو کر کے، اُن کی گفتگو کو سیاق و سباق سے ہٹا کر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں نشر کیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ اُس وقت کلمہ حق کا اظہار بُرے سے بُرے نتائج کو دعوت دیتا تھا۔ چناں چہ بہت سے علما تو کسی گوشہ نامعلوم میں خلوت گزریں ہو گئے یا مصیبت کے ٹلنے کے انتظار میں خاموش رہے۔ وہ ایسا وقت تھا جب خلق خدا زبان حال و زبانِ قل سے کہہ رہی تھی ”مَتٰی نَصُرُ اللّٰہَ“ خدا کی مدد کب آئے گی؟ اور گویا پوری قوم یہ کہہ رہی تھی ۔

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ، جگر

اُسی جنت پہ، جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہاں یہ بھی کہنے دیجیے کہ آخرش یہی واقعات آں جہانی اندرا گاندھی کی حکومت کے اختتام کا باعث بنے اور اُس وقت کے انتخابات میں انھیں شکستِ فاش کھانا پڑا؛ کیوں کہ انھوں نے نوحۂ دیوار پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

آسودہ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں

ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

ان حالات میں مولانا رحمانیؒ آگے بڑھے، کلمہ حق کے اظہار کا بیڑا اٹھایا، دہلی

پس مرگ زندہ

میں مسلم قائدین کا اجلاس منعقد کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمام مسلم علماء و زعماء سے پہلے وہ اور اُن کے دست و بازو رفقاءے کار دہلی پہنچے۔ دیگر علماء و قائدین یہ معلوم کرنے کے بعد ہی دہلی پہنچنے کی جرأت کر سکے کہ مولانا رحمانی دہلی پہنچ چکے ہیں۔ مسلم قائدین اور مولانا نے جبری نس بندی کے خلاف بیانات دیے اور مستعبد رسال تصنیف کیے، جن میں نس بندی کے متعلق اسلام کا موقف واضح کیا گیا، ملک کی مختلف زبانوں میں اُن کا ترجمہ ہوا اور ملک کے طول و عرض میں انھیں تقسیم کیا گیا۔ شہریوں خصوصاً مسلمانوں میں اس کام یاب جدوجہد کی وجہ سے اعتماد پیدا ہوا اور حکومت کو اپنے نامہ اعمال کا جائزہ لینے کی تحریک ہوئی، اس سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کو ظلم کے خلاف کہنے سننے کا حوصلہ ہوا۔ یہ واقعہ بھی مولانا رحمانی کی مثالی بے باکی کا غماز ہے۔

عیشِ منزل ہے، غریبانِ محبت پہ حرام

آزادی کے بعد سے اب تک فسادات کی آتش فروزاں میں مسلسل جلنے اور خانما برباد ہونے والے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں مولانا کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ وہ حکاموں سے ملتے، فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے، اسباب و متاع پر حکومت کی توجہ مبذول کرتے، مصیبت زدوں کو ہر ممکن مدد پہنچاتے، اُن کی اشک شوئی اور دل جوئی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے۔ وہ سب کچھ ایک فوجی کی چستی، چوکیدار کی بیداری، مومن کے احساسِ ذمہ داری اور مجاہد فی سبیل اللہ کی قربانی کی روح کے ساتھ کرتے تھے۔

ہر قدم، معرکہ کرب و بلا ہے درپیش

یوپی کی صوبائی حکومت نے بابری مسجد کے گیٹ پر ۱۹۵۲ء سے پڑا ہوا تالا ہندوؤں کے لیے کھول دیا اور بابری مسجد کے منبر و محراب میں کھلے عام بتوں کی پرستش کی اجازت دے دی اور مسلمانوں پر مسجد کو کلیتہاً حرام کر دیا۔ پھر تشدد اور تعصب پسند

ہندو جماعتوں نے تھ یا ترا، پد یا ترا اور طرح طرح کی یا تراؤں کے ذریعے، ملک کے طول و عرض میں آگ سی لگادی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی کو پہلے سے زیادہ تیز کردی گئی، قریہ قریہ اور شہر شہر مسلمان ہراساں و خوف زدہ کر دیے گئے، زمین مسلمانوں پر اپنی تمام تر کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو گئی، خون مسلم کو آب سے زیادہ ارزاں بنا دیا گیا، مسلمانوں کی عزت و ناموس کو پامال کیا گیا، ظلم و جور کے ایسے مناظر سامنے آئے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرٹھ، ملیانہ اور بھاگلپور وغیرہ ہندوستانی تاریخ سیاست و حکومت پر، ایک بدنما داغ بن کر ابھرے اور ظلم و بربریت کے ننگے ناچ کے لیے، ضرب المثل کے طور پر صحافی، مؤرخ اور عوام کے قلم و زبان پر شب و روز جاری ہو کر، تاریخ کا ناقابل محو جزو بن گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملیانہ و بھاگلپور وغیرہ کی داستان خونچکاں قلم بند کرتے ہوئے، کس طرح قلم کاروں کے ہاتھ کاپٹنے لگتے تھے، روح فرسا واقعات کی حکایت بیان کرتے وقت، الفاظ زبانوں پر ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے۔

اس رنگ سے اٹھائی، کل اُس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے، غم ناک ہو گئے

دوسری طرف اسلام نا آشنا، انگریزی تعلیم یافتہ وہ طبقہ جس کے ساتھ موروثی طور پر ”مسلمان“ کا لفظ چپک گیا ہے اور جو صرف مغربی تہذیب و تمدن کو راہ سعادت و نجات سمجھتا ہے، علمائے دین پر سکوت و جمود کی تہمت کا علم لے کر کھڑا ہو گیا اور اپنی تحریر و تقریر میں حسب عادت اُس کو زمانہ نا آشنا، تنگ نظر، حالات سے بے خبر رہنے وغیرہ کہنے لگا اور ساتھ ہی یہ ”فتویٰ“ بھی صادر کرنے لگا کہ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی خاطر، باہری مسجد سے دست کش ہو جانا چاہیے۔

ان حالات میں مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم پھر سامنے آئے اور انھوں نے دسمبر ۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سایہ تلے، مسلم علماء و عوام کو جمع کیا، اس اجلاس نے

حکومت اور مسلم عوام کے نام دوا لگ الگ پیغام دیے۔ حکومت کو یاد دلایا گیا کہ: ”اقلیت کی حفاظت کے بغیر، ملک کا مستقبل ہر وقت خطرے میں رہے گا اور ملک کا سیکولر و جمہوری کردار لاینڈ آرڈر کے ذریعے باقی رہ سکتا ہے۔ قانون کی بالادستی حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ مسلسل تین سال سے فرقہ پرست، ملک کے اطراف و اکناف میں اشتعال انگیز تقریروں، تحریروں اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے فرقہ پرستی کو شعلہ زن کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے مختلف جگہوں پر بدترین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان پر قابو پانا اور روک لگانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں نے اب تک ملک کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صبر کا دامن تھامے رکھا ہے اور انھوں نے تشدد کا جواب تشدد سے دینے سے گریز کیا ہے۔

بورڈ بابرہ مسجد کے حوالے سے، اپنا موقف واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مسجد اور مسجد کی جگہ خدا کی ملکیت ہے؛ لہذا ان میں کسی طرح کی تبدیلی یا ان کی خرید و فروخت یا کسی جماعت، فرد یا حکومت کی کسی عقد صلح کے ذریعے، سپردگی جائز نہیں اور نہ ہی حکومت کو اکوار کرنے کا حق ہے۔ ناقابل انکار دلائل و دستاویزات سے ثابت ہے کہ بابرہ مسجد، مسجد ہی ہے اور بابرہ مسجد، کسی غصب شدہ زمین یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی ہے؛ لہذا شرعاً اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی مسجد کی ہوا کرتی ہے؛ اس لیے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء والی پوزیشن کے ساتھ بابرہ مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا جانا چاہیے۔“

مسلمانوں کے نام پیغام میں کہا گیا کہ:

”اس ملک میں مسلمانوں کا وجود کسی حکومت، کسی اکثریت یا کسی فرقہ کی رہین منت نہیں ہے۔ مسلمان محض خدا کے بھروسے پر یہاں جی رہے ہیں۔ وہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ذریعے ہی آئندہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

اور محض خدا کے طفیل سے وہ دین و ایمان پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ساتھ ساتھ ان شاء اللہ، روشن مستقبل کی طرف محو سفر ہیں گے۔“
مسلمانوں سے مزید کہا گیا کہ:

”فسادات کو خود ہوا نہ دیں۔ لیکن اُن کی جان و مال اور آبرو پر جب حملہ

ہو، تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنے سے ہرگز دریغ نہ کریں۔“

اس موقع سے ایک باوقار وفد کی سربراہی کرتے ہوئے، مولانا رحمانی نے وزیر اعظم چندر شیکھر (۱۹۲۷-۲۰۰۷ء) سے ملاقات کر کے بابرہی مسجد کے تعلق سے، اسلام کا موقف واضح کرنے اور فرقہ وارانہ فسادات کے دہکتے ہوئے شعلوں کو فرو کرنے کے لیے، حکومت کی توجہ مبذول کرانے کی سوچی کہ ۔

درِ دل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دکھلا دوں جس سے خونِ شہکنا ہو
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکا اپنا جس سے خونِ شہکنا ہو
مولانا نے جب مذکورہ مسائل پر گفتگو شروع کی تو مسٹر چندر شیکھر نے نہایت نامعقول جواب دیا، جو ہندوستان جیسے ملک کے وزیر اعظم کے لیے، کسی طرح موزوں نہ تھا۔ اُنھوں نے کہا: ”آپ سب لوگ بھنگ کے کنویں سے پانی پی کر آئے ہیں۔“ مولانا کہاں چوکنے والے تھے، آپ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ۔

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے

آدی ہوں، مرے منہ میں بھی زبان ہے سانی

مولانا نے چندر شیکھر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”حکومت تو پاگل نہیں ہوگئی ہے؟“ اس جملے کے بعد چندر شیکھر کو ہوش آیا اور اُنھوں نے سنجیدہ ماحول میں وفد کی گفتگو سنی:

پہلے تو عرض غم پہ، وہ جھنجھلا کے رہ گئے

پھر کچھ سمجھ کے، سوچ کے، شرما کے رہ گئے

ادھر چند سالوں سے موجودہ ہندوستان میں مولانا کی حیثیت ہندی مسلمانوں کے لیے ایک ماہر حکیم کی ہو گئی تھی، جس سے لوگ پیچیدہ اور لاعلاج مرض کے سلسلے میں رجوع کرتے اور اُس کی صحیح تشخیص و تجویز سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نازک ترین وقت میں بھی مسلمانوں کو اس سے ڈھارس بندھتی تھی کہ ہمارے درمیان مولانا رحمانی ایسے عظیم لوگ موجود ہیں؛ اس لیے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل خدا کی مدد اور توفیق سے ضرور نکل آئے گا:

زندگی میں آگیا جب، کوئی وقت امتحان
اُس نے دیکھا ہے جگر، بے اختیار نہ مجھے

تو مر دمیدال تو میر لشکر

امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ (اور مولانا کی وفات کے کئی سال بعد بہار سے کٹ کر بننے والے صوبے جھارکھنڈ) کے اسٹیج سے، جس کے وہ ۳۳ سال امیر رہے، اُن کی خدمات، اُن کے زندہ جاوید کارناموں کے نامہ اعمال میں روشن ستارے کی طرح چمکتے اور ہمیشہ کے لیے زمانے کی زبان پر نغمہ شیریں بن کر گونجتے رہیں گے۔ اُن کے عہدِ امارت میں، امارتِ شرعیہ نے کتنا وکیفاً سطح پر ترقی کی، اُس کے شعبوں، اداروں اور شاخوں میں وسعت و بہتری آئی اور امارت کو مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کے سنوارنے اور قانونِ شریعت کے مطابق استوار کرنے میں قابل ذکر و شکر کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔

تینوں صوبوں میں مختلف مقامات پر دارالقضا کا قیام عمل میں آیا، قضاۃ سازی اور مفتیانِ کرام کی ٹریننگ کا باقاعدہ نظام قائم ہوا، اس کے لیے باقاعدہ بجٹ کا ایک حصہ مخصوص کیا گیا۔ امارت کے قائم کردہ دارالقضا کی وجہ سے مسلمانوں کو عائلی مسائل میں سیکولر عدلیہ کا سہارا لینے کے عذاب سے نجات حاصل ہوئی۔ سرکاری سطح پر بھی تینوں

صوبوں میں اُن دارالقضاؤں کی حیثیت تسلیم کی گئی اور پرسنل لا اور عائلی مسائل میں حکومت نے اُن سے رجوع کیا۔

بہار واڑیسہ وجھار کھنڈ میں امارت کی کارگزاری کو دیکھ کر قائدین کی خواہش ہوئی کہ اس کو وسعت دے کر ملک گیر کر دیا جائے۔ اس سمت میں مولانا کے جوش عمل کے نتیجے میں پیش رفت بھی ہوئی اور متعدد صوبوں میں خصوصاً جنوبی اور مغربی علاقوں میں امارت کے طرز پر کام شروع ہو چکا ہے اور وہاں کے دارالقضا، سرگرمی سے اپنی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔

امارت نے بیت المال کے نظام کو بھی وسعت دی اور اُسے نہایت درجہ فعال ادارہ بنادیا۔ سیلاب اور فسادات سے تباہ حال لوگوں کی امداد، بیوہ گان اور یتیموں کی کفالت اور غریب لڑکیوں کی شادی ایسی خدمات میں بیت المال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نیز بہار واڑیسہ میں مختلف مساجد میں ائمہ و مؤذنین کے انتظام اور اُن کی تنخواہ کے بند و بست میں اُس نے مدد دی۔ نیز تعلیمی و تربیتی اور عصری اداروں کا قیام عمل میں آیا۔

چند سال قبل امارت کی مرکزی عمارت کی تعمیر، زیر عمل آئی جو دفاتر، لائبریری، میٹنگ ہال اور ایک پروقار و قابل اعتبار فلاحی ہسپتال، پر مشتمل ہے، عمارت سادہ و پرکار ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے منصوبے زیر غور اور بہت سے زیر تنفیذ تھے، اُن کے لیے مال اور وسائل کی فراہمی کا کام بھی جاری تھا۔ لیکن مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ۔

لذّتِ تقریر

مولانا کی تقریر پر مغز ہوتی تھی، چچے تلے الفاظ استعمال کرتے؛ لیکن مضامین مُرتب، مُدلل اور لہجہ واضح اور گونج دار ہوتا۔ اکتا دینے والی طولانی اور خلل انداز ایجاز بیانی، دونوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے۔ تقریر میں حافظہ، تعبیر، الفاظ اور مضامین کی غیر معمولی معنویت: سبھی اُن کا ساتھ دیتے۔

جب وہ کرسی خطابت پر فروکش ہوتے، تو حاضرین کی نگاہیں اُن کی بھاری بھر کم، پروقار اور جاذب نظر شخصیت کی دید سے سرور ہو جاتیں۔ اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سامعین کے دل میں پیوست ہو جاتا؛ اس لیے کہ وہ اپنے ہر لفظ کو ایک ماہر اور ذہین استاذ کی طرح استعمال کرتے تھے جو درس سے قبل اپنے محاضرے کو تیار کر لیتا اور اُس میں ترتیب اور تقدیم و تاخیر کی رعایت کر چکا ہوتا ہے۔

سلیقہ تحریر

وہ اردو میں تصنیف و تالیف کا حسین ذوق رکھتے تھے؛ لیکن مذہب و ملت کی خدمت کے سلسلے میں مسلسل اسفار اور ملک کے گوشے گوشے میں پیہم آمد و رفت، نیز دورانِ قیام نوع بہ نوع مشاغل کے ہجوم کی وجہ سے، تصنیف و تالیف کے لیے وہ وقت نکال سکے اور نہ ہی انھیں وہ سکون و اطمینان حاصل ہو سکا، جن کے بغیر اس طرح کا کام انجام دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود انھوں نے مختلف فقہی موضوعات پر متعدد پر مغز اور کارآمد رسالے لکھے۔ نیز مختلف اوقات میں دیگر مختلف عنوانوں پر بہ وقت ضرورت، بہت سارے مضامین اُن کے علمی قلم سے نکلے۔ اُن کی نگارشات میں ”مکاتب گیلانی“ کے نام سے علامہ مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ-۱۹۵۶ء) کے گراں قدر خطوط کی جمع و ترتیب بھی پایے کی چیز ہے۔

بندہ مولیٰ صفات

مولانا اپنے پہلو میں ایک نہایت ہم درد دل رکھتے تھے، مجھے طالب علمی کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بارہا اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اُن سے ہر بار مل کر انسانیت اور شراف کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ۱۹۷۱ء میں، میں مدرسہ امینیہ دہلی میں طالب علم تھا۔ میرے شفیق و محترم المقام استاذ، فقہ و تاریخ کے عظیم

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

مصنف، مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء) نے مجھے حکم فرمایا کہ میں، مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا دیوبند سے آتے ہوئے پرانی دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کروں، پروگرام کے مطابق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیتہ بلڈنگ گلی قاسم جان میں ”ادارہ مباحث فقہیہ“ کے دفتر میں قیام کرنا تھا۔

مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اس ادارے کے ذمہ دار تھے۔ اس دوران دور روز تک مولانا کی خدمت میں بار بار آنے اور اُن سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے مولاناؒ میں وقار کے ساتھ تواضع، ذہانت کے ساتھ علم، زود فہمی کے ساتھ دور رس، چھوٹوں پر شفقت کے ساتھ دنیا و آخرت میں اُس کی بھلائی کی نصیحتیں اور غیر معمولی حلم و بردباری دیکھی۔

مولاناؒ سے اس ملاقات کے بعد چوں کہ میرا اُن سے تعارف بھی ہو گیا اور وہ دہلی میں ملاقات کے دوران بہت شفقت و محبت سے بھی پیش آئے؛ اس لیے اُن سے مراسلت اور اپنی تعلیمی زندگی میں مشورہ ورہ نمائی لینے میں کوئی تکلف اور حجاب مانع نہیں رہا، ناچیز کے ایک عریضے کے جواب میں انھوں نے جو شفقت نامہ تحریر فرمایا، اُس کی سطر سطر سے غیر معمولی محبت و اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا:

از منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ

خانقاہ رحمانی، مونگیر

۱۹۷۱/۹/۳ء

عزیز مکرم! وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، محبت نامہ ملا، آں عزیز نے اس عاجز کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ محض آپ کی فطری صلاح و سعادت کا اثر ہے؛ ورنہ ”صاحبُ البیتِ اُذریٰ بِمَا فِیْہِ“ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ آپ کو علم و عمل سے سرفراز کرے اور شر و روفتن سے محفوظ رکھے۔ آمین

مولوی محمد شعیب صاحب آواپوری (۱) کہاں ہیں؛ اگر اُن سے آپ کی ملاقات ہو تو کہہ دیں کہ رمضان میں ایک آدھ ہفتے کا وقت مونگیر میں گزاریں حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام کہہ دیں۔
والسلام
منت اللہ

مولانا کے مکتوب کے بعد، مولانا شعیب آواپوری کو تلاش کیا تو وہ اتفاق سے ہفتے تک نہیں ملے، اس کی اطلاع فوراً ایک عریضے کے ذریعے، مولانا کو دی؛ تاکہ انھیں انتظار کی اذیت نہ ہو، تو مولانا نے یہ شفقت نامہ ارسال فرمایا:

منت اللہ رحمانی
خانقاہ رحمانی، مونگیر

۱۲/۹/۱۹۷۱ء

عزیز کرم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
خط ملا، مولانا شعیب آواپوری کی تلاش میں عجلت کی ضرورت نہیں، جب ملاقات ہو، کہہ دیا جائے۔ الحمد للہ جملہ اہالیان خانقاہ وجامعہ بہ عافیت ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ آں عزیز کو علم نافع عطا فرمائے اور عمل صالح کی توفیق دے۔ آمین

اس خط کے جواب کی ضرورت نہیں، میں اکتوبر میں اکثر و بیشتر باہر ہی

(۱) مولانا محمد شعیب، موضع آواپور، ضلع بیتا مڑھی، سابق ضلع مظفر پور کے باسی تھے، میرے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے، ہم لوگوں سے کئی درجہ اوپر تھے، میں جب مدرسہ امینیہ میں ۱۹۷۱ء میں تھا، تو وہ دارالعلوم سے فارغ ہو کر جامعہ طیبہ دہلی میں، جو اُس وقت کنگلی قاسم جان میں تھی، طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، غالباً مولانا منت اللہ رحمانی کے دست گرفتہ ہو گئے تھے، مولانا سید احمد ہاشمی سابق ناظم عمومی جمعیتہ علماء ہند کی صاحبزادی سے اُن کی شادی ہوئی، اب صاحب اولاد ہیں، پہلے جامعہ طیبہ جے پور کے پرنسپل رہے اب تکمیل الطب کان لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ دھیمی طبیعت، نرم مزاج، دھیمی رفتار، نرم گفتار کے آدمی ہیں، اللہ انھیں عمر دراز نصیب کرے۔

رہوں گا، اگر خط لکھنا ہو تو اوائل رمضان میں لکھیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ سے سلام مسنون کہہ دیں۔

والسلام
منت اللہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران بھی مولاناؒ سے، وہاں کی مجلس منظمہ کے جلسوں اور دیگر تقریبات میں شرکت کے لیے اُن کی آمد کے موقع سے، کئی بار ملاقات ہوئی اور اُن سے تعلق و عقیدت میں اضافہ ہوا۔ اُن کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا سید محمد ولی رحمانی، جو اب اُن کے جانشین اور سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مولگیر ہیں، اُن کا ایک گراں قدر مضمون ”اجتہاد“ کے موضوع پر، عربی میں ترجمہ کے لیے، اس ناچیز کے پاس لے کر دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، راتم نے استطاعت کے مطابق اُس کا اچھے سے اچھا ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور مکمل کر کے، انھیں بھیجا تو انھوں نے حد درجہ پسند فرمایا، بہت دعائیں دیں اور اپنے مکتوب میں اُس کا شکریہ ادا کیا، افسوس ہے کہ اُن کے سارے خطوط میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس تقریب کی وجہ سے مولانا ولی رحمانی مدظلہ سے بھی گہرا تعلق قائم ہو گیا، اُس کے بعد وہ جب بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء آتے تو ناچیز ہی کے پاس اکثر قیام فرماتے۔

ہمارے شمالی بہار کے وسیع تر خطے کے عظیم داعی و شیخ مولانا بشارت کریمؒ (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷-۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) کے نبیرہ مولوی مظہر الحق کریمیؒ (۱) کے داخلے کے تعلق سے بھی امیر شریعتؒ نے اس ناچیز کو بڑے اعتماد کے ساتھ، اُن کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا، کرنے کا حکم فرمایا، اُس سلسلے میں یہ مکتوب ارسال فرمایا:

منت اللہ رحمانی

امیر شریعت بہار واڑیہ

(۱) دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہوئے اور وہیں استاذ مقرر ہوئے۔

خانقاہ رحمانی، مونگیر

عزیز گرامی قدر مولانا عالم صاحب امینی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ میں آپ کو حصولِ ثواب کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں: حضرت مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے: مولوی مظہر الحق سلمہ اللہ فضل دیوبند، تخصص فی الادب میں داخلے کے لیے ندوہ جارہے ہیں۔ اس تعارف کے بعد اب عزیز موصوف آپ کے لیے اجنبی نہ ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ داخلہ اور کمرہ وغیرہ ملنے تک انھیں اپنا مہمان رکھیں گے، اور جو سہولتیں آپ بہم پہنچا سکتے ہوں، پہنچائیں گے۔

والسلام

منت اللہ

۱۹۷۹ء کے اواخر میں، فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (۱) کے حکم پر، میں نے عربی زبان میں امارتِ شرعیہ کے تعارف میں ایک دراز نفس مقالہ لکھا، جسے کچھ ہی دنوں بعد امارت والوں نے ”خِدْمَةُ دِیْنِیَّةٌ عَظِیْمَةٌ“ کے عنوان سے مستقل رسالے کی شکل میں شائع کیا، اُس تحریر پر مولانا مجاہد الاسلام اپنے گراں قدر تائثرات کا اظہار ایک سہ زائد خط میں طباعت سے قبل اور طباعت کے بعد، کر چکے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد حضرت مولانا رحمانیؒ کا مندرجہ ذیل خط باعثِ سرفرازی ہوا، جو گویا ایک اہل نظر اور عظیم اہل علم کی ایک طالب علم کے لیے قیمتی سند ہے۔ مولانا نے گرامی نامہ میں اصرار کے ساتھ مونگیر آنے کی دعوت دی تھی؛ لیکن افسوس کہ اپنی مشغولیات کی وجہ سے نہ اُس وقت مونگیر جاسکا اور نہ اس کے بعد کبھی اس کا موقع ملا۔

”عزیز مكرم! وَفَّقَكُمُ اللّٰهُ لِمَا يَحِبُّ وَيَرْضٰى“، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) متوفی فب ۲۰-۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۲-۲۳ اپریل ۲۰۰۲ء۔

و برکاتہ، خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں، ابھی ابھی مولوی ولی سلمہ نے ”خِذْمَةُ دِیْنِیَّةٖ عَظِیْمَةُ“ کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا۔ تحریر بلند اور طباعت ناقص ہے، جو اس دور کے لیے مناسب نہیں۔ بہ ہر حال اس تحریر کے سامنے آتے ہی آپ یاد آ گئے اور آپ کا وعدہ مونگیر آنے سے متعلق بھی یاد آ گیا۔ آپ ۲۴ جون کی شام تک مونگیر آئیں، ان شاء اللہ میں بھی رہوں گا اور ولی سلمہ بھی، ٹریننگ کیمپ بھی چل رہا ہوگا۔ اگر ۲۴ کو نہ آسکیں تو ۲۵-۲۶ کو ضرور آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں آپ تخلف نہ کریں گے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔“

والسلام

منت اللہ

۱۶ جون ۱۹۸۰ء

تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا سے کثرت سے ملنے اور اُن کی ذہانت اور علم و فکر سے حسبِ ظرفِ خوشہ چینی کا موقع ملا۔ دارالعلوم دیوبند سے مولانا کو چوں کہ غیر معمولی محبت تھی اور وہ اُس کی ترقی و بہبود کے لیے ایک ہوش مند اور سپوتِ فرزند کی حیثیت سے کوشاں اور فکر مند رہا کرتے تھے؛ اس لیے شوریٰ کے اجلاس سے عموماً دو ایک روز قبل دیوبند تشریف لے آتے اور تین روزہ اجلاس کے ایک دو روز بعد تشریف لے جاتے۔ مولانا کی رائے اور مشورے کو فکرِ رسا پر مبنی ہونے کی وجہ سے، دارالعلوم کی شوریٰ میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ سال میں دو مرتبہ شوریٰ کے اجلاس اور دیگر تقریبات کے مواقع سے مولانا کے کئی روزہ قیام دارالعلوم سے طلبہ دارالعلوم کو مستفیض ہونے کا سنہرا موقع ہاتھ آ جایا کرتا تھا۔

دارالعلوم میں میرے چند رفقا کی ایک جماعت تھی، خیالات و رجحانات کی

یکسانیت اور زبان و ادب سے مناسبت کے قدرِ اشتراک نے ہم لوگوں میں ایسا تعلق خاطر پیدا کر دیا تھا، جسے ان شاء اللہ موت ہی ختم کر سکتی ہے۔ ہماری اس جماعت کے سربراہ اردو زبان کے ممتاز اور صاحبِ طرز اہل قلم اور دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد کے بانی و سرپرست برادرِ معظم مولانا محمد رضوان القاسمی (۱) تھے۔ اس کے ممبران میں اردو کے فطری شاعر و ادیب و انسان و دنیا و زندگی کا بصیرت مندانہ تجربہ رکھنے والے حافظ قاری شہیر احمد در بھنگوی مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھر وارہ، ضلع در بھنگہ؛ ممتاز عربی داں و عربی انشا پرداز برادرِ محترم مولانا بدر الحسن قاسمی (حالِ مقیم کویت) زمیلِ مکرم مولانا حافظ ابرار احمد در بھنگوی (امام و خطیب جامع مسجد لہریا سرانے در بھنگہ) اور حافظ و نگیر احمد قاسمی جالوی در بھنگوی وغیرہ تھے۔

ہماری یہ جماعت مولانا کے قیام دیوبند کو بہ طورِ خاص غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کے ساتھ اُستادِ الاساتذہ حضرت مولانا محمد حسین بہاری استاذ دارالعلوم (۲) اور حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مفتی دارالعلوم (۳) بھی مہمان خانہ میں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں تشریف لے آتے، تو مجلس اور بھی مفید اور پر لطف ہو جاتی۔

تربیتِ فکر و آگہی

کسی انسان کی قیمت، اُس کے حسب و نسب کی نہ جائے، اُس کی اپنی لیاقت اور

(۱) متوفی دوشنبہ ڈھائی بجے سہ پہر ۲۵ شعبان ۱۴۲۵ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۴ء۔

(۲) متوفی ۶ رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۹۲ء۔

(۳) اور اب یہ وقتِ تیارِ کتاب برائے اشاعت در اپریل ۲۰۱۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) اس لیے کہ شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق اگست ۲۰۰۸ء میں بیماری اور بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے عوارض کی وجہ سے مستعفی ہو کر اپنے وطن ”پورانو دیہا“ ضلع در بھنگہ تشریف لے گئے۔

جوہر سے متعین کی جاتی ہے۔ مولانا کی یہ سعادت و عظمت تھی کہ وہ الحمد للہ دونوں پہلوؤں سے بڑے تھے، علم و فضل و تقویٰ میں مولانا کو جو مقام حاصل تھا، وہ محتاج تعارف نہیں، دوسری طرف وہ عظیم ترین باپ یعنی بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری (متوفی ۱۳۴۶ھ = ۱۹۲۷ء) خلیفہ خاص حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ) کے فرزند ارجمند تھے۔ وہ اسی علمی و دینی گھرانے میں ۹ جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مونگیر و حیدر آباد میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، جہاں چار سال تک زیر تعلیم رہ کر وہاں کے باکمال اساتذہ سے مستفیض ہوئے، ۱۳۳۹ھ میں ایشیا کی عظیم و قدیم ورجال ساز درس گاہ و دانش گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے صاحب عزیمت مجاہد شیخ و محدث مولانا سید حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء) آخری دور میں برصغیر کے جلیل القدر عالم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم الباکستانی الکرچی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) عالم باعمل مولانا سید اصغر حسین دیوبندی (متوفی ۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۴ء) جیسے یگانہ روزگار علما سے اکتساب علم و آگہی کی۔ دیوبند میں زمانہ طالب علمی میں انھوں نے جدوجہد آزادی ہند میں حصہ لیا اور سہارنپور میں اس کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں جمعیت علماے بہار کے ناظم عمومی منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ہی ابوالحسن مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پارٹی تشکیل دی اور مولانا کو اس کا ممبر نامزد کیا، اسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے وہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں بہار قانون ساز اسمبلی کے سہرسہ سے ممبر چنے گئے۔ ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کی سجادہ نشینی کے خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۷۴ھ = ۱۹۵۵ء میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر منتخب ہوئے اور تادم حیات، اس عہدے پر فائز رہے اور دارالعلوم کو اپنے قیمتی مشوروں، طویل تجربوں اور روشن افکار و خیالات سے فائدہ پہنچا کر اپنا دامن اجر و سعادت بھرتے رہے۔ ۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے چوتھے

پس مرگ زندہ

امیر شریعت کا منصب جلیل سپرد کیا گیا۔ امارت شرعیہ کو ابوالحسن مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں مولانا نے جامعہ رحمانی کو از سر نو زندہ کیا۔ اس کی بنیاد خود حضرت مولانا مولگیرؒ نے اپنے دستِ اقدس سے رکھی تھی۔ مولانا نے اپنی نتیجہ خیز صلاحیت و ذہانت و مساعی سے اُسے ہندوستان کا ممتاز ادارہ اور بہار کا بڑا مدرسہ بنادیا تھا۔ ۱۳۸۳ھ = ۱۹۶۳ء میں انھوں نے قاہرہ میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ واپسی پر سفر کی روداد بھی قلم بند کی، اسی طرح پہلی بار جب حج و زیارت کی سعادتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوئے، تو ہندوستان واپس آ کر سفرنامہ حج مرتب فرمایا۔ مُتَعَدِّدِ عربی اور اسلامی ملکوں میں منعقدہ کانفرنسوں اور مجالسِ علمیہ میں شرکت کی اور ہر جگہ اپنی ذہانت و فراست اور علم و تجربہ کا نقشِ لافانی ثبت کیا۔

نظرِ کیمیا اثر کی کرشمہ سازی

ہندوستان کے جن علما و قائدین کو ہمیں دیکھنے، برتنے، جینے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے، اُن میں متعدد حضرات کو ہم نے پایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس بات کے کوشاں نظر آئے کہ ”قد آروں“ کے قدر تراش دیں؛ تاکہ وہ منفرد ”قد آرز“ رہ جائیں اور سارے ”بڑوں“ کو کسی طرح نگل کر تباہ ”بڑے“ رہیں؛ اس لیے وہ علما جو بہ ذاتِ خود ”بڑے“ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ”بڑے“ بن جانے یا ”بڑا“ بنے رہنے کو نہ صرف یہ کہ گوارا کر لینے کا ظرف رکھتے ہیں؛ بل کہ ”چھوٹوں“ کو بڑا بنانے کی صلاحیت رکھتے اور بڑا بنادینے کے لیے اپنی ممکنہ صلاحیتوں اور ذرائع کا کشادہ نفسی و سلیقہ مندی سے استعمال کر کے، ایسے رجالِ کار اور جانشینِ باکمال پیدا کر جاتے ہیں، جو اُن کے بعد لیاقت کے ساتھ اُن کی قائم مقامی کرتے، اُن کے چھیڑے ہوئے کاموں اور چھوڑے ہوئے مشن کو پایہ تکمیل پہنچاتے اور اُن کی دکھائی راہ پر پورے اعتماد و بصیرت کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف محو سفر رہتے ہیں؛ درحقیقت یہی بڑے علما و قائدین کہلانے کا حق

رکھتے ہیں اور انھی کی قسم کے علما و مشائخ اس لائق ہیں کہ اُن کی عظمت کی چوکھٹ پر قدردانوں کی جمینِ نیاز و سپاس خم ہو کہ یہی لوگ درحقیقت راہِ سلف کے مسافر اور اُن عظماءِ اسلام کے نقشِ پا پر چلنے والے ہیں، جنہوں نے علم و معرفت، فکر و نظر، رشد و ہدایت اور زہد و قناعت کے ایسے بلند مینارے تعمیر کیے، جن کی روشنی میں قافلہٴ بشر، شاہ راہِ صواب پر صدیوں سے بغیر بھٹکے ہوئے سفر کرتا آ رہا ہے۔ رحمہم اللہ

مولانا رحمانیؒ انھی خوش نصیب علما میں تھے۔ مولاناؒ نے علم و فکر و عمل کے میدان کے ”مسافرِ انو“ یا ”سپاہِ تازہ“ کو اُن کے ذوق و رجحان کے مطابق کام میں لگا کر، اُن کی صلاحیتوں کو اس طرح مہمیز کیا کہ وہ اُن کی زندگی میں ”بڑے“ ہونے کی سند عوام و خواص کی زبانِ حال و اعترافِ قائل سے حاصل کر لی۔ میں اُن میں سے صرف تین آدمی کا اس وقت نام لے سکتا ہوں۔ یعنی امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ کے قاضی القضاۃ، برصغیر کے فقیہ وقت اور دارالعلوم دیوبند کے لائق نازش و افتخار فاضل مولانا مجاہد الاسلام قاسمی؛ خادمِ مملکت اور امارتِ شرعیہ کے بارگراں کو اپنی دوش پر، لیاقت کے ساتھ کسی اکٹھا ہٹ، تھکاوٹ یا شکایت کے بغیر مسلسل اٹھائے رہنے والے مولانا سید نظام الدین اور ہر مجلس میں اپنی ذہانت، سوجھ بوجھ اور ہنرمندی کا سکہ جمادینے والے مولانا رحمانیؒ کے پسر خوش خصال مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ۔

تو واردِ نئے خانہ تھا، ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہ اٹھے ”یا پیر مے خانہ“ مجھے

میں ان سطروں میں مولانا رحمانیؒ کو برصغیر کا سب سے بڑا اور عدیم المثال عالم نہیں کہنا چاہتا؛ لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ مولانا کو قسّامِ ازل نے جو صلاحیتیں و دیعت کی تھیں، اُن میں اُن کے معاصرین و رفقاءے کار علما میں کوئی اُن کا شریک نہ تھا۔ کہ توفیقِ باندازہ ہمت ہے ازل سے

خداے حکیم ہر ایک کو دین و دنیا سے متعلق سرگرمیوں کی ایک الگ توفیق سے نوازتا

پس مرگ زندہ

ہے اور علم و فضل میں سے ہر ایک کا حصہ اپنے اندازے سے متعین کرتا ہے۔ از آدم تا ایں دم انسانوں سے متعلق اُس کی یہی سنت رہی ہے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (خدا کی سنت تبدیل نہیں ہوا کرتی)۔

خدا اُن کو، اُن کے اعمال کی بہترین جزا دے اور انھیں جنت الفردوس کا مکین بنائے۔ (*)

سوانحی خاکہ

۱۹۱۳

✽ ولادت: ۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۱۳ء (۲۱۷)

✽ جاے پیدائش: خانقاہ رحمانی موٹگیر

✽ والد ماجد: حضرت مولانا سید محمد علی موٹگیریؒ (۱۲۶۲ھ/۱۸۳۶ء = ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء)

✽ ابتدائی تعلیم: قرآن پاک ناظرہ اور ابتدائی عربی و فارسی کتابیں وطن میں پڑھیں، اس کے بعد عربی صرف و نحو منطق کی کتابیں حیدر آباد میں ۱۱ سال کی عمر میں مولانا مفتی عبداللطیف متونی ۱۳۷۹ھ سے پڑھیں، اُن کی خدمت میں ایک سال قیام فرمایا۔

✽ متوسط تعلیم: ۴ سال تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔

✽ اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم دیوبند، ۱۳۳۹ھ میں داخل ہوئے اور ۱۳۵۲ھ میں تکمیل علوم عالیہ سے فارغ ہوئے۔ آپ نے بخاری شریف شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے پڑھی۔

آپ نے متعدد کتابیں اور رسالے تالیف فرمائے، بالخصوص فقہی اور مسلمانوں کے پرسنل لا کے موضوعات پر، آپ کا اردو اسلوب پختہ، سادہ اور دلکش تھا، آپ کی تالیف ”سفرنامہ مصر و حجاز“ کو بڑی شہرت ملی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ انگریزی سے واقفیت رکھتے تھے۔ تقریر و تحریر دونوں پر یکساں قدرت تھی، انھوں نے جامعہ رحمانی کا از سر نو اجرا فرمایا اور اس کو بہت ترقی دی، اُن کی زندگی میں یہ بہار کا بہت مشہور

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۲۱-۲۲، جلد ۱۳، ۲۷/۲۸ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ و ۱۲ محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۰-۲۵ جولائی ۱۹۹۱ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود، جو اخبار شرقِ ملکتہ اور ملک کے مختلف اخبارات و رسالوں میں شائع ہوئی۔

مدرسہ بن گیا تھا۔

امارت شرعیہ کو، آپ کی امارت کے زمانے میں، ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور ملک میں متعدد جگہ شاخیں قائم ہوئیں، بالخصوص بہار واڈیہ میں۔

✽ عہدے و مناصب: ۱۳۵۵ھ میں آپ بہار اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین بنائے گئے، ۱۳۷۴ھ میں دارالعلوم دیوبند کی شوروی کے رکن منتخب ہوئے اور تاحیات رکن رہے۔ ۱۳۷۶ھ میں انھیں بہار واڈیہ (بہار اب دوصوبوں میں بہار اور جھارکھنڈ میں تقسیم ہو چکا ہے) کا امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ۱۳۸۳ھ = ۱۹۶۴ء میں موتمر اسلامی قاہرہ میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے محرک اور شروع سے اُس کے تاحیات جنرل سکریٹری رہے۔

مولانا رحمانی ملک کے چیدہ عالم و قائد تھے، اُن کی ذہانت، اصابتِ رائے، قوتِ فیصلہ، ہر مجلس میں اُن کی پہچان تھی۔



حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

ایک استاذ، ایک تاریخ

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء — ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء

غزلاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو دیرانے پہ کیا گزری؟

۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں، میں دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت طالب علم داخل ہوا، گو میں ایشیا کی اس عظیم دانش گاہ کے اُن اساتذہ کے سلسلۃ الذہب کو دیکھنے سے محروم رہا جو اپنے علم و فضل و تقویٰ میں یگانہ روزگار تھے؛ لیکن عظیم سلف کے مُتَعَدِّد اُن جانشینوں کو دیکھنے، اُن سے پڑھنے اور اُن کی کیمیا نظری سے حسبِ توفیق، اکتسابِ فیض کرنے کی سعادت ملی، جو اُن کے علم و صلاح، ایثار و قربانی اور تعلیم و تربیت کے میدان میں انفرادیت کے بڑی حد تک امین تھے۔ جن میں سرِ فہرست دارالعلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (وفات ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب (وفات ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء) مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادی (وفات ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم (وفات ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء) اور نائب مہتمم اور بعد میں صدر مدرس حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی کا نام لیا جاسکتا ہے، جو یک شبہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸/۸/۱۹۹۱ء کو سوا دس بجے دن میں ربِّ کریم کے حضور پہنچ کر ہزاروں دلوں کو رنجور اور ہزاروں آنکھوں کو اشکبار کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایک اصول پسند انسان

داخلہ کے بعد دارالعلوم میں چند ہی ہفتے گزرے ہوں گے کہ طلبہ سے اختلاط، دارالعلوم کے نظام کار سے واقفیت، اساتذہ سے دید و شنید اور دفاتر سے سابقہ پڑتے ہی مولانا معراج الحق صاحب کو اچھی طرح پہچان گیا۔ مولانا دارالعلوم کے نظام و قانون کی پامالی کرنے والوں کے تئیں سخت گیری، اور دارالعلوم کے لائحہ عمل کی تصریحات و دفعات کو دیانت دارانہ طور پر نافذ کرنے کی پابندی کے لیے؛ اُس وقت مشہور تھے۔ چنانچہ سارا دارالعلوم اُن کی اُصول پسندی کا قائل تھا۔ کسی ”بڑے باہمت“ آدمی کے علاوہ کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ اُصول و ضوابط کی خلاف ورزی کرے۔ مولانا دارالعلوم کے چپے چپے میں اُصول و ضوابط کی عمل داری کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت مجھے اپنی نا تجربہ کاری کے باوجود اس کا خوب اندازہ ہوا کہ ایک اُصول پسند شخص، جس کو اپنی ذمہ داری کا مطلوبہ احساس، اپنے ماتحتوں کی دار و گیر پر مجبور کرتا ہو، عموماً اپنے زیر دستوں میں مبعوض نہیں تو محبوب بھی ہو سکتا؛ اِس لیے کہ انسانی نفس بڑا سرکش واقع ہوا ہے، وہ لامحدود آزادی اور سارے گوشہ ہائے حیات میں تمام قسم کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد رہنے کا دل دادہ ہے؛ اِسی لیے اُس کو بدی سے عموماً رغبت اور نیکی سے عموماً نفرت رہا کرتی ہے۔

چنانچہ مولانا اُس وقت سہولت پسندوں ”حالات کی رعایت“ اور ”حقیقت حال سے مصالحت“ پر ایمان رکھنے والوں کی ناوک فکری کا نشانہ تھے۔ مولانا کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اُس سطح پر اپنے آپ کو اتار لیں، جس پر مذکورہ قسم کے لوگ انھیں دیکھنا چاہتے تھے؛ اِس لیے کہ وہ خودی، خودداری اور خود ارادی سے سرفراز، اُن عظیم انسانوں میں سے تھے جو شب کے سنائے میں (جب انسان کے ساتھ اُس کی ذات اور اُس کے خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا) بھی کسی خلافِ مروت و شرافت عمل سے، گریزاں رہا کرتے ہیں۔

مادر علمی سے مثالی وفاداری

مولاناؒ کی اصول پسندی میرے علم و تجربہ میں، اولاً اُن کی طبع سلیم کا فیضان تھی، چنانچہ اس کی جلوہ گری تمام کارہائے حیات میں نمایاں تھی، اور ثانیاً دارالعلوم کے سلسلے میں اُن کی غیر معمولی عقیدت و محبت اور اپنے منصب کے حوالے سے مکمل احساس ذمہ داری کا نتیجہ تھی۔ دارالعلوم کے لیے اُن کی عقیدت و محبت کا سرچشمہ اُن کے وہ اساتذہ گرامی تھے، جو علم و فضل کے آفتاب و ماہ تاب تھے۔ عقیدت و محبت نے ہی انھیں کم و بیش پچاس سال تک مادرِ علمی کی خدمت کی سعادت کے حصول کے لیے صبر و شکر کے ساتھ سرگرم عمل رہنے پر مجبور رکھا۔ اس طویل عرصے میں حالات کی استواری و ناہمواری کی دھوپ چھاؤں سے بھی وہ گزرے؛ لیکن دارالعلوم سے اُن کی وابستگی و وفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا — حساس قلب و جگر رکھنے کے باوجود!

میں، مولاناؒ سے کسی درسی کتاب کے باقاعدہ پڑھنے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا؛ لیکن دارالعلوم اور دارالعلوم سے باہر میں نے، جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اُن میں سے سب یا اکثر مولاناؒ کے شاگرد تھے اور طالبِ علمی میں، دارالعلوم کے طلبہ سے جو مولاناؒ کے پاس آتے جاتے، یا اُن کی خدمت میں رہا کرتے تھے، اُن کے متعلق جو کچھ سنتا تھا اُس سے میرے دل میں اُن کی عظمت و رفعت کا احساس اور اُن کے لیے احترام و عقیدت کا جذبہ بے پناہ پیدا ہو گیا تھا۔ طلبہ اُن کے شامل و خصائل، اُن کی تدریسی مہارت، بالغ نظری اور بلند خیالی کا لذت و عقیدت کے ساتھ تذکرہ کیا کرتے تھے۔

باصلاحیت منتظم

پچاس سال کا طویل عرصہ، انھوں نے مادرِ علمی کی چہار دیواری میں گزارا، تدریس کے ساتھ ساتھ، وقفے وقفے سے وہ مختلف انتظامی صیغوں سے بھی وابستہ رہے۔ کبھی

ناظم دارالاقامہ کبھی نائب مہتمم اور کبھی بہ حیثیت صدر مدرس؛ اس لیے دارالعلوم کے گوشے گوشے میں اُن کے فکر و عمل کے لازوال نقوش نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے تعلیمی اور انتظامی شعبوں میں بہت سی مفید اور کارآمد اصلاحات کیں، جن سے دارالعلوم کے نظام تعلیم و تربیت کو زیادہ نتیجہ خیز اور انتظامی ڈھانچوں کو زیادہ کارگر بنانے میں مدد ملی۔ دارالعلوم کا موجودہ نظام امتحان ہر چند کہ شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے؛ لیکن اُس کا بانی اور نوک پلک کی نزاکت، مولانا کی وقتِ نظر کا کرشمہ ہے۔ ہماری طالب علمی میں یہاں درجہ بندی نہیں تھی، مولانا نے ہی درجہ بندی کی تحریک کی اور اُسے عملی طور پر برپا کرنے کے لیے، سن رسیدگی کے باوجود، اپنی محنت و توانائی کا بہت بڑا حصہ صرف کیا۔

باکمال مدرس

دارالعلوم اور برصغیر ہندوپاک و بنگلہ دیش میں، دارالعلوم کی طرز کے ہزاروں مدرسوں میں پڑھائے جانے والے، تقریباً سارے مضامین پر مولانا کو قابل ذکر دست رس حاصل تھا؛ لیکن چوں کہ وہ شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی صاحب کے خصوصی شاگردوں میں تھے اور اُن کی تعلیم و تربیت کا اثر اُنھوں نے گہرائی سے جذب کیا تھا؛ اس لیے اُن پر فقہ و ادب کا رنگ شوخ تھا۔ دیوانِ حماسہ اور ہدایہ اخیرین زمانہ تدریس کے اوائل سے اُن کی وفات تک، تقریباً ہر سال اُن کے زیرِ درس رہیں۔ اول الذکر کے اکثر اشعار مولانا کو از بر تھے۔ حماسی شعراء کے حالات، مختلف قصیدوں کا پس منظر، اشعار میں ذکر شدہ جگہوں کا جغرافیائی تناظر، اُن کے الفاظ و تعبیرات کے معنی و مفہوم کی سرگزشت اور اخلاقی، اجتماعی پہلو والے اشعار جو سیرت سازی میں معین ہو سکتے ہیں، مولانا کو خوب یاد تھے، اور اُنھیں بر موقع سنایا کرتے تھے۔ ثانی الذکر کتاب، اُس کے مضمون اور متعلقہ فن پر مولانا کے عبور کی غمازی کے لیے صرف یہ بتانا کافی ہے کہ ہماری طالب علمی میں،

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

طلبہ انھیں ”صاحبِ ہدایہ“ کہا کرتے تھے اور اُن کے اِس سبق میں طلبہ جس ذوق و شوق سے جاتے تھے، اُس کی مثال اب شاید واید ہی ملے گی۔

مولاناؒ کے درس کی مقبولیت کا راز ایک طرف علم و فن میں غایت درجہ کمال میں پنہاں ہے، تو دوسری طرف اُن کے حسن بیان اور دل رُبا طریقہ تدریس میں، جس کی وجہ سے طلبہ نہایت آسانی سے، اُن کے مضمون کو ہضم اور یاد کر لیا کرتے تھے۔ وہ درس میں بے جا تفصیل، دراز بیانی، سمع خراش شور اور درس کی رونق و رعنائی میں اضافے کی خاطر بلا ضرورت طنز و مزاح کا سہارا لینے کے قائل تھے نہ عامل اور اب تو مدارس کے ماحول میں اِس عنصر کی فراوانی اور مقبولیت فزوں تر ہے۔ مولاناؒ اُن نابغہ روزگار اساتذہ کے ہونہار شاگرد تھے، جو تفہیم درس میں اختصار و سہولت سے کام لے کر نفس مسئلہ کو، طلبہ کے ذہن میں اتار دینے میں چابک دست تھے اور بہ جاے خود سب کچھ کہنے کے، طلبہ کو محنت، جاں فشانی، استخراج مسائل، اور دقت نظر سے کام لینے کا خوگر بنا دینے کی مہارت رکھتے تھے۔ اِسی لیے اُن کے شاگرد اپنی اپنی جگہ جبلِ علم ہوا کرتے تھے۔

محبوبیت و عقیدت کا خراج

انسان، جس درجہ دوسروں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے، اُسی درجہ وہ مخلوق میں محبوب ہوتا ہے۔ مولاناؒ کی طلبہ و اساتذہ میں غایت درجہ محبوبیت، اُن کی وفات کی خبر کے دارالعلوم میں پھیلتے ہی دیکھنے میں آئی، جب سارے طلبہ و اساتذہ مغموم چہروں اور اشک آلود آنکھوں کے ساتھ، اُن کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے اور جنازہ اٹھنے اور اُن کی تدفین کے وقت تک اُن کے دیدار کے لیے، نہ ختم ہونے والے تسلسل کے ساتھ آتے رہے، سارا دارالعلوم سوگ وار اور آنکھیں، خوں بار نظر آرہی تھیں۔ جنازہ کو قبرستان تک جس شوق و عقیدت کے ساتھ طلبہ و اساتذہ کا ہمِ غم لے گیا، وہ منظر بھی دیدنی تھا۔ اللہم اغفر له وارحمہ۔

مولانا نے شادی نہیں کی اور نہ اُن کے اولاد تھی، جو اُن کی محبت کو تقسیم کر سکتی، یا اُن کی توجہات اور اوقاتِ زندگی کا قیمتی حصہ مشغول کر لیتی۔ اُن کا جذبہ محبت محفوظ، اُن کی دل چسپیاں صحیح سلامت اور اُن کے اوقاتِ زیست خالی تھے۔ اُنھوں نے سلیقہ سے اپنے اوقات اور دلچسپیوں کو اپنی محبوب جامعہ کی خدمت میں صرف کیا۔ طلبہ کو علم و آگہی سے، اساتذہ کو فکر و نظر اور مشورہ سے اور ملازمین کو نصیحت و راہ نمائی سے فائدہ پہنچایا اور اپنی تمام محفوظ توانائیوں کو دارالعلوم کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے اور بزرگوں کے حسین خوابوں کی خوب صورت تعبیر برآمد کرنے کے لیے صرف کر دیں۔

مہرِ مادری اور شفقتِ پدری

اگر یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے ذخیرہ محبت کو، اپنے پاس والوں میں صرف کیے بغیر زندگی نہیں جی سکتا، تو یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی محبت و شفقت کا مرکز طلبہ دارالعلوم کو بنایا، خصوصاً اُن طلبہ کو جو اُن سے استفادے کی خاطر اُن سے زیادہ مربوط رہے۔ اُن طلبہ نے بہت سی دفعہ اُن کی شفقت و محبت کے ایسے مظاہر دیکھے، جن کے سامنے شفقتِ پدری اور مہرِ مادری ہیچ محسوس ہوئی اور جن سے اُن کی اُس سخت گیری کی تکذیب ہو جاتی ہے، جو سہولت پسندوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ وہ سخت گیر ضرور تھے؛ لیکن یہ سخت گیری درحقیقت مثبت ردِ عمل تھی، دارالعلوم، اُس کے اساتذہ، اُس کے طلبہ، اُس کے ملازمین اور اُس کی تاریخ اور اُس کے روشن دل و روشن فکر بانیوں سے سچی محبت کا۔ وہ دارالعلوم کو دیگر صاحبِ بصیرت فضلاء دارالعلوم کی طرح، اسلام اور اسلامی دعوت و فکر کا مضبوط قلعہ اور قدرتِ الہی کے بعد اس دپار میں (حکومت مغلیہ کے زوال کے بعد) اسلامی وجود کی بقا کا ذریعہ بننے والے ایمانی دستوں کا ہر اول سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے اساتذہ گرامی کی طرح، کسی ایسی کوتاہی کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے جو دارالعلوم کی بخششی صلاحیت کو دیر یا سویر مجروح کر سکتی تھی؛ اس

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

لیے ممکن حد تک ہاتھ کی طاقت، ورنہ زبان کی صلاحیت سے ”مُتَنَزَّہ“ کے ازالے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ”أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ“ والے درجے یعنی دل میں برامان کر خاموش رہنے پر، شدید مجبوری کی حالت میں ہی عمل کر پاتے تھے۔

ایک دہائی سے زیادہ دارالعلوم سے غیر حاضری کے بعد، جب میں دس گیارہ سال قبل (۱)، دارالعلوم میں استاذ اور پندرہ روزہ عربی جریدہ ”الداعی“ کے مدیر کی حیثیت سے دارالعلوم واپس آیا، تو مولاناؒ کے متعلق جو سخت گیری مشہور تھی، وہ میں نے اُن میں یکسر مفقود دیکھی۔ طالب علمی کے زمانے میں، شاید ہی مولاناؒ کے ہاں بہ راہ راست آمد و رفت کا کوئی اتفاق ہوا ہو؛ لیکن دورِ تدریسی میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو، جس میں مولاناؒ سے شرفِ ملاقات اور تبادلۂ خیال اور اُن کے پُر سلیقہ دستِ خوان پر چائے نوشی کا موقع نہ ملتا رہا ہو؛ اس لیے اس دورِ ثانی میں اُن کے خیالات، اُن کی ترجیحات اور اُن کے مزاج کو پڑھنے کا صحیح موقع ملا۔ میں نے مولاناؒ کو نہایت حلیم، کریم، شفیق، مانوس ہو جانے والا اور مانوس کر لینے والا پایا۔ غصہ ہوتے، چڑھتے، اور دھڑکڑ کرتے، میں نے انھیں شاید ہی دیکھا اور جانا ہو۔ البتہ آخری چند سالوں میں مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ اُن کو ایک طرح کی وحشت اور تنہائی کا احساس دامن گیر ہے، اُس شخص کی طرح جس نے اپنے سارے رفقاءِ حیات کھو دیے ہوں۔ چنانچہ وہ اساتذہ دارالعلوم، خصوصاً ہم ایسے نوجوان اساتذہ کی ملاقات سے بے حد مانوس و مسرور ہوتے۔ اگر ایک دو ہفتے ہم غیر حاضر ہو جاتے، تو شکوہ کرتے، ہماری طویل نشست کے خواہش مند رہتے، ہماری گفتگو اور علمی، فکری، اور عالمِ اسلامی کے مسائل پر ہم لوگوں کی ہرزہ سرائیوں سے بہت خوش ہوتے اور اپنے تجربات اور پختہ خیالات کی روشنی میں ہمارے خیالات کی تصحیح کرتے۔

(۱) یہ سطوریں ۱۴۱۲ھ = ۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا معراج الحق کے انتقال کے وقت لکھی گئیں، راقم الحروف دارالعلوم دیوبند بحیثیت مدیر ”الداعی“ عربی و استاذِ ادب عربی شوال ۱۴۰۲ھ / اگست ۱۹۸۲ء میں آیا تھا۔

مولانا کا وطن

مولانا معراج الحق بن منشی نور الحق کا وطن خاص ”دیوبند“ ہے جسے خاصانِ خدا اور عالمانِ دینِ قیم نے، اسلامی قلعہ کی تعمیر کے لیے انتخاب کیا تھا۔ مولانا (۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ) میں دیوبند کے جنوب مغربی سمت کے ایک محلہ ”بیرون کوئلہ“ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی، پھر وہ دارالعلوم دیوبند میں درجہ متوسطات میں ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں داخل ہوئے اور پہلے سال میں مختصر المعانی اور ہدایہ اولین وغیرہ پڑھی، دوسرے سال میں ہدایہ اخیرین، جلائین اور مشکوٰۃ شریف وغیرہ اور تیسرے سال دورہ حدیث میں صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث پڑھیں اور ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں فارغ ہوئے۔ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں انھوں نے دارالعلوم میں مزید ایک سال لگایا اور مختلف علوم و فنون کی امہات الکتاب پڑھیں۔ مولانا دارالعلوم کے ممتاز طلبہ میں تھے۔ سالانہ امتحان کے نمبرات (جو دارالعلوم کی سالانہ رواد میں ریکارڈ ہیں) کے دیکھنے سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسے محنتی اور اپنے وقت کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے والے طالب علم تھے۔

مولانا کے لائق اساتذہ

مولانا کے قابلِ ذکر اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (وفات ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (وفات ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی امر وہوئی (وفات ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۴ء) علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (وفات ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء) مولانا مبارک علی سابق نائب مہتمم دارالعلوم (وفات ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء) اور مولانا عبدالسمیع دیوبندی (وفات ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء) جیسے آسمانِ علم و فضل ہیں۔

تدریسی سلسلہ

دارالعلوم سے فراغت کے بعد، مولاناؒ نے کئی ایک مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، چنانچہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء کے عرصے میں بمبئی میں زکریا مسجد کے مدرسے میں وہ رہے۔ اس کے بعد گل برگہ کے ایک مدرسے میں ۱۹۴۱ء تک کام کیا۔ پھر یکم محرم ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۹/ دسمبر ۱۹۴۳ء کو دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس اُن کا تقرر ہوا۔ انھیں شرح وقایہ، شرح عقائد نسفی، مقامات حریری، شرح مائتہ عامل، ہدایۃ النخو، اصول الشاشی اور نور الانوار وغیرہ پڑھانے کو دی گئیں۔ وفات کے وقت دیوان حماسہ، سبع تعلقات اور ہدایہ اُن کے زیر تدریس تھیں۔ تقریباً پچاس سال کے طویل عرصے میں، انھوں نے دارالعلوم کے نصاب میں داخل اکثر کتابوں کو حسن و خوبی سے پڑھایا اور علم و آگہی کا جام لٹدھایا۔ انھوں نے حدیث شریف کی متعدد کتابیں بھی پڑھائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ، انھوں نے مختلف انتظامی شعبوں کی ذمہ داریاں لیاقت کے ساتھ نبھائیں۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں وہ ناظم دارالاقامہ بنائے گئے، شوال ۱۳۸۶ھ مطابق جنوری ۱۹۶۷ء میں وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نائب (مہتمم) مقرر ہوئے، اس منصب جلیل پر رجب ۱۳۹۶ھ مطابق جولائی ۱۹۷۶ء تک فائز رہے۔ ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء سے تاحین وفات وہ صدر مدرس رہے۔

خوش نصیب مربی

مولاناؒ نے کسی موضوع پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی؛ لیکن بزرگ و دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد چھوڑے ہیں، جن میں علماء، مبلغین، مصنفین، فقہاء، اصحابِ افتاء اور زندگی کے مختلف زمروں سے متعلق افراد موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کامیاب مدرس جو باصلاحیت افراد پیدا کرتا اور مطلوبہ رجالِ کار تیار کر جاتا

پس مرگ زندہ

ہے، وہ بسا اوقات اُن مُصَتَفِیْنَ اور قلم کاروں سے زیادہ لائق تحسین اور لائقِ شکر و ثواب ہوا کرتا ہے، جو نفع بخش کتابوں کی شکل میں صدقہ جاریہ چھوڑ جاتے ہیں۔

پس ماندگان

مولانا کے پانچ بھائی تھے، ایک بھائی اُن سے بڑے تھے، باقی سبھی اُن سے چھوٹے تھے۔ ایک بھائی ثناء الحق دہلی ہمدرد و خانہ میں ملازم تھے، اُن کا مستقل قیام ”گلی قاسم جان“ میں رہا۔ باقی دیگر برادران تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور مولانا کی وفات تک بہ قید حیات تھے، تین بہنیں تھیں۔ اُن میں سے ایک بہن پاکستان میں زندہ تھیں دو بہنیں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

مشہور مؤرخ، مصنف، مدرسہ امینیہ دہلی کے سابق صدر مفتی اور شیخ الحدیث اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) کے خصوصی شاگرد مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء) مولانا کے بہنوئی تھے۔ مولانا محمد میاں کی اولاد بھی مولانا کے برادرِ محرز ثناء الحق صاحب کے ساتھ ہی عرصے تک گلی قاسم جان دہلی میں مستقل طور پر متوطن رہی۔ راقم الحروف کو مولانا محمد میاں صاحب سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل ہے اور اُن کی بے پناہ عنایتوں اور شفقتوں سے سرفراز رہا ہے۔ مولانا معراج الحق صاحب کو مولانا مرحوم کے ساتھ ناچیز کے اس تعلق کا بڑا خیال تھا، میرے ساتھ غیر معمولی نوازشوں کا جو معاملہ فرماتے تھے، یقیناً اس میں اس احساسِ تعلق کو بڑا دخل تھا۔

حلیہ اور اطوار و عادات

مولانا خوش وضع، خوش لباس، اور خوش شکل تھے، کچھ سال قبل تک کسی بھی موسم میں کمرے سے باہر، شیر وانی اُن کے تن سے شاید ہی جدا ہوتی تھی، اُن کی نستعلیقیت اور

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

خوش وضعی تمام امور زندگی میں نمایاں تھی۔ مولانا کا سراپا کچھ اس طرح تھا: کتابی چہرہ، سرخ و سپید جسم، اونچی ناک، دراز قد، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، گھنی بھویں، متوازن، سیدھی اور خوب صورت باڈی، سر کا اکثر حصہ گنجا، آواز صاف، کشیدہ قامت ہونے کی وجہ سے لمبا قد اٹھاتے اور تیز چلتے، ہاتھ میں خوب صورت سی چھڑی رکھتے، راست باز اور صائب الرائے تھے۔ ارادے کے پختہ، دل کے مضبوط، صاف دل، کم گو، کم خواب اور کم خور تھے، پُر وقار اور پر رعب تھے۔ میں طالب علمی کے زمانہ میں اکثر دیکھتا کہ مولانا جس راہ پر دور سے بھی نظر آجاتے، طلبہ اپنا راستہ بدل لیتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ عصر کی نماز کے بعد، دارالعلوم کی مسجد کے جنوبی در میں وہ خاص انداز سے کھڑے ہو کر مسجد سے بھیڑ کے نکل جانے کا انتظار کرتے، اُن کے ایک ہاتھ میں جوتے، دوسری میں چھڑی، اور کندھے پر رومال ہوتا۔ طلبہ کو ہمت نہ ہوتی کہ اُن کے آگے سے نکل جائیں، دائیں بائیں سے کٹ کر اور سمٹ کر نکلتے تھے۔ اُن کی سلیقہ مندی اور خوش وضعی کی شہرت کی وجہ سے، ایسے ویسے طلبہ اُن کی خدمت میں آنے جانے، یا خدمت میں رہنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ سلیقہ مند، باادب، مہذب اور خوش نصیب ہی، اس سعادت سے بہرہ مند ہو پاتے تھے۔

وہ عشا کے بعد فوراً سو جانے اور سحر خیزی کے عادی تھے۔ رات کے آخری حصے میں بیدار اور اپنے معمولات سے فارغ ہو کر، اپنے رب سے مُوَجَّہ ہوتے، فجر کی نماز کے بعد ساتھ رہنے والے طلبہ کے تعاون سے چائے ناشتہ تیار کرتے۔ وہ اپنی خدمت آپ کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ برتن دھونے، چائے یا کھانا اور پان بنانے میں سلیقہ مندی نمایاں ہوتی۔ مولانا اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو پان کا خاص اہتمام کرتی تھی، چائے کا ذوق بہت لطیف تھا، چائے کے سلسلے میں یہ ذوق لطیف شرفا کا حصہ تھا، اب صرف خال خال علما کے یہاں باقی رہ گیا ہے۔ دارالعلوم کے مُتَعَدِّد اساتذہ اور اور شیوخ کے ہاں چائے کا جو اہتمام ہنوز باقی ہے، اُس کی مثال قہوہ کے ساتھ عربوں کے عشق

پس مرگ زندہ

سے دی جاسکتی ہے۔ میں کئی ایک عظیم ترین عصری تعلیم گاہوں کے بہت سارے اساتذہ سے ملا ہوں، نیز شعراء، ادبا اور صحافیوں سے سابقہ رہا ہے، اُن کے دسترخوان پر چائے نوشی کا موقع بھی ملتا رہا ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بالخصوص چائے کے حوالے سے، علما کے طبقے میں، جو ذوقِ عالی اب تک باقی ہے وہ اُن کے ہاں یکسر مفقود ہے۔

عجم کے حسنِ طبیعت کی جلوہ گری

مولانا کونو اورات اور نفیس اُشیا کے جمع کرنے کا خاص شوق تھا۔ اُن کا کمرہ (جودار جدید کے جنوبی دروازہ کے اوپر تھا اور عرصہ دراز سے اُن کا مسکن ہونے کی وجہ سے یہ دروازہ بھی دارالعلوم میں ”معراجی گیٹ“ یا ”باب معراج“ سے معروف ہو چکا ہے) مختلف قسم کے سیکڑوں نوادرات سے بھرا ہوتا، ہر چیز اپنی جگہ اس سلیقے سے رکھی ہوتی جیسے کسی پارک میں طرح طرح کے پھول قرینے سے کیاریوں میں لگے ہوں، ہر پھول، اپنی خوشبو، رنگ اور شوخی حسن میں ایک دوسرے سے مختلف۔ مولانا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک ملاقاتی کو سامانوں کا تنوع، قوس قزح کی رنگینی اور حسنِ امتزاج کے ساتھ، اپنی طرف مائل کر لیتا۔ ایسا لگتا کہ عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں، کمرے کی ترتیب میں اپنا اثر دکھا گیا ہے۔ لیمپ کی مختلف قسمیں، انگیٹھیوں کے متعدد اقسام، چائے کے طرح طرح کے کپ، انواع و اقسام کی چائے دانیاں، اُن کے والد صاحب کو جہیز میں ملی ہوئی مسہری، خوب صورت قسم کی الماریاں، اعلیٰ درجے کی قابلِ اعتبار کمپنی کی سلائی مشین، کتابوں کی مخصوص ترتیب، سونے کا ایک دو بستر فرش اور ایک آدھ مسہری پر، قرینے سے بچھی ہوئی چٹائیاں، مختلف سمتوں سے لگے ہوئے پردوں کے ذریعے متعدد خانوں میں تقسیم شدہ اُن کا حجرہ، چھوٹے بڑے کئی عدد گاوٹیکے اور تکیے، ایک گوشے میں رکھا ہوا فرج، قرینے سے سجے ہوئے برتن، اپنی مخصوص نشست پر رکھا ہوا گیس کا چولہا اور سلنڈر، مولانا کی نشست گاہ کے قریب اور سامنے رکھا ہوا پان دان،

اگال دان، پان کے مسالوں کی چھوٹی سی صینی اور خوب صورت ساسروتا، کپڑے ٹانگنے کی خوش نما کھونٹیاں، شیر و اینیوں کی مخصوص جگہ اور ہاتھ میں رکھنے کی چھڑی کی خاص وضع۔ بڑے چھوٹے قدرے اونچے اور کم اونچے لکڑی کے پیڑھے، متعدد تپائیاں اور ڈسک، مطالعے کی متعین جگہ اور ایک گونے میں بنا ہوا چھوٹا سا وضو خانہ، کمرے میں مختلف جگہ چھت کی کڑیوں میں بدھی ہوئی لنگتی ہوئی رسیاں، جن سے آخری سالوں میں ضعف کی زیادتی کے بعد اٹھتے وقت سہارا لیا کرتے تھے اور دیگر وہ بہت ساری اشیاء جو میرے خانہ خیال کی گرفت میں نہیں، مولانا کے کمرے کو ایک خاص قسم کا حسن سحر خیز دیتی تھیں۔ مولانا سال چھ مہینے کے بعد سامانوں کی ترتیب اور اُن کی جائے وقوع بدلتے رہتے تھے کہ یک رنگی اور یکسانیت سے وہ اکتا جایا کرتے تھے۔

انھیں مرغی، بطخ، کبوتر اور بکری پالنے کا بھی شوق تھا۔ ادھر کوئی دس بارہ سال سے بکریاں تو نہیں رکھتے تھے؛ لیکن اول الذکر قسم کے پرندے اُن کی وفات کے دل دوز واقعے کے مشاہدہ سے غالباً انسانوں کی طرح یا اُن سے زیادہ مغموم تھے۔ کئی ایک بطخ اب تک موجود ہیں۔ میں جب مولانا کے کمرے کے پاس سے گزرتا ہوں، تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور ان بطخوں کو دیکھ کر مولانا کی یاد تازہ اور زخمِ دل مزید ہرا ہو جاتا ہے۔ ابھی کل یہ کمرہ شفقت و مرحمت، علم و ہنر، فکر و نظر، سلیقہ و قرینہ، صلابت و اصابت رائے کا گہوارہ تھا اور اس کے دیوار و در ایک ”رجل رشید“ کی جلوہ گری سے تابندہ و درخشندہ اور آنے جانے والوں کے تسلسل کی وجہ سے شاد و آباد تھے، مگر آج۔ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔

بطخوں، مرغیوں اور کبوتروں کے لیے آرام دہ رہائش گاہ بنواتے، اُن کی اس طرح دیکھ کر کھرتے، جیسے انسان اپنے لختِ جگر کی۔ جاڑے کے موسم میں اُن رہائش گاہوں میں بجلی کا بلب بھی جلاتے؛ تاکہ ٹھنڈک کی شدت سے، ان بے زباں پرندوں کو کوئی گزند نہ پہنچے، انھیں بیماری آزاری سے بچانے کی تدبیریں کرتے، اُن کے زیادہ

پس مرگ زندہ

شور کرنے پر فکر مند ہوتے کہ مبادا انھیں کو کوئی تکلیف تو نہیں۔

شامِ زندگی

خور و نوش کے تعلق سے مولانا بڑے محتاط تھے، اور اکثر عام قسم کی بیماریوں کا علاج، وہ دوا کی بہ جائے غذا سے کر لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ شدید نزلے میں مبتلا تھے۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ نے کوئی دوا نہیں لی؟ فرمایا میں کل سے اس نزلے کی حالت تباہ کیے ہوا ہوں، نہ کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں۔ عزیزم! میں تو اس طرح کی بیماریوں کو، اکثر اتنا پریشان کر دیتا ہوں کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

لیکن خدا کی حکمت، قدرت اور مشیت کہ شعبان ۱۴۱۰ھ میں وہ تقریباً ۲۸ روز تک مسلسل پیش میں مبتلا رہے۔ اُن کے بھائی ثناء الحق صاحب انھیں اپنے ہاں دہلی لے گئے۔ مولانا انگریزی طریقہ علاج کے عموماً اور ایلوپیتھک کے خصوصاً مخالف تھے۔ وہ یونانی طریقہ علاج اور ادویہ کی تاثیر اور بے ضرر ہونے کے قائل تھے؛ لیکن جب یونانی دوائیوں سے کوئی فائدہ محسوس نہ ہوا، تو بھائی کے اصرار پر انگریزی دواؤں کے استعمال پر رضامند ہو گئے، دو ایک ماہ کے علاج کے بعد افاقہ ہوا؛ لیکن نہایت کم زور اور نحیف ہو گئے۔ میں ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ کے اوائل میں گھر سے واپسی پر دہلی میں احاطہ کالے صاحب گلی قاسم جان میں واقع، اُن کے بھائی کے مکان پر، اُن کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، تو بہت خوش ہوئے؛ مگر گفتگو کے دوران صبر و عزمیت کے اُس کوہِ وقار نے بار بار یہ دہرایا کہ عزیزم! میں تو اب زندگی سے مایوس ہو چلا ہوں اور میں تو اب مرض الموت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مولانا شفا یابی کے بعد غالباً ذی قعدہ کے اواخر میں دہلی سے دیوبند آ گئے اور ایک آدھ ماہ کے بعد، انھوں نے حسب معمول درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا؛ لیکن عرصے تک اُن کے منہ میں چھالے پڑتے رہے اور معدہ اس درجہ کم

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

زور ہو گیا تھا کہ مرج کا ایک ذرہ بھی اُن کو ہضم نہ ہوتا تھا۔ دو ایک مرتبہ میں نے گزارش کی کہ حضرت! میں اپنے ہاں سے کوئی پسند کا کھانا بچھوا دوں؟ فرمایا عزیزم! ضرور بچھوا دو بس مرچیں بالکل نہ ہوں، پھر شکر دانی میں سے شکر کا ایک دانہ نکال کر فرمایا: دیکھو! اتنی سی مرچ بھی معدے کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

اس بیماری سے وہ کئی طور پر شفا یاب نہ ہو سکے اور اس کا تسلسل اُن کی وفات پر منج ہوا۔ حکما اور ڈاکٹر مکمل طبی جانچ کے بعد کہتے کہ مولانا کو کوئی مرض نہیں ہے؛ لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ اُن کو کھانا ہضم کیوں نہیں ہوتا؛ جس کے نتیجے میں اُن کے جسم میں خون کی خطرناک حد تک کمی ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ آخری دنوں میں صرف ہڈیوں کا مجموعہ رہ گئے تھے۔ رمضان کے نصفِ آخر میں، میں گھر چلا گیا، ذی قعدہ کے اوائل میں واپسی ہوئی تو مولانا سالِ گذشتہ سے زیادہ ناتواں اور زندگی سے مایوس تھے۔ مہتمم صاحب مدظلہ نے انھیں مہمان خانے میں قیام پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہاں اُن کے کمرے سے زیادہ بعض سہولتیں تھیں۔ میں گھر سے آیا تو اپنے وطن ”مظفر پور“ کی پیچی ڈرتے ڈرتے، ایک طالب علم کی معرفت بھجوا دی؛ لیکن یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ مولانا نے نہ صرف یہ کہ اُس کی پذیرائی کی؛ بل کہ شوق و رغبت سے تناول فرمایا اور حاضرینِ خدمت کو بھی چکھایا، سوئے اتفاق کہ گھر سے آتے ہی ذی قعدہ کے وسط میں میرے بائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور دیگر معذوریوں کے ساتھ کپڑے پہنا بھی مشکل تھا؛ اس لیے اُن کے مرض الموت میں اُن کی بہت کم عیادت کی سعادت حاصل ہو سکی۔ عید الاضحیٰ کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں بالائی منزل پر میں نے بائیں جانب ادا کی مولانا دائیں طرف پہلی صف میں تھے۔ نماز کے بعد دو طالب علم دونوں بازو پکڑ کر سہارے سے، انھیں اٹھانا چاہ رہے تھے کہ جلدی سے پہنچ کر میں نے مصافحہ کیا۔ حسرت سے دیکھنے لگے اور میری کلائی کو دیکھ کر کہنے لگے: تم نے یہ کیا کر لیا؟ جن دوستوں سے مل کر زندگی کے ان لمحوں میں خوشی ہوتی، وہ بھی مجبوریوں اور معذوریوں کی نذر ہو گئے۔

ہم نے کسے کھودیا

مولانا کی وفات سے ہم نے درحقیقت وہ کڑی کھودی ہے، جو ہمیں اُن اساتذہ و مشائخ دارالعلوم کے سلسلۃ الذہب سے مربوط کرتی تھی۔ جو علم و فضل کے منارے، ورع و تقویٰ کی مثال اور سادگی و قناعت، پاک دامنی اور پاک نفسی کا نمونہ تھے۔

اُن کی موت سے اساتذہ اور ذمہ داران دارالعلوم نے ایک باوقار و روشن دماغ سرپرست اور امانت دار و صاحب لیاقت مشیر کار کھودیا ہے۔ جو مضبوط رائے قائم کرنے، بروقت کسی الجھن کا حل ڈھونڈ نکالنے، بار آور طریقہ کار وضع کرنے اور تعلیمی و انتظامی صیغوں کے مفید ترین خاکوں کی ایجاد و تنفیذ پر ماہرانہ اور بصیرت افروز قدرت رکھتا تھا۔ مولانا کے ایسا پختہ رائے اور کسی نظریے پر تادیر اور ہر حالت میں ثابت قدم رہنے والا آدمی میں نے زندگی اور تجربہ میں حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (متوفی شب ۳ رمضان ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء) کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے۔ اُن کی رائے فولاد کی طرح ٹھوس ہوتی اور وہ اُس پر پہاڑ کی طرح جم جاتے تھے۔

باوجودے کہ مولانا اہتمام سے متعلق نہ تھے؛ لیکن دارالعلوم کے منتظمین و ذمہ داران، دارالعلوم کے بہت سے مسائل و معاملات میں مولانا کے مشوروں اور خیالات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اُن کی موت بزرگِ علمی اور مذہبی حلقوں کا عمومی خسارہ ہے اور حالات و واقعات کے تناظر میں مولانا جیسے فاضل کے خلا کا پرہونا مشکل ہے۔ یوں تو خداے ذوالجلال ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔ کسی بزرگ ہستی کے چلے جانے سے سب سے بڑا نقصان، اُن کے تجربات، خیالات اور اکتسابات سے محرومی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ بزرگوں کے ہم سے جدا ہو جانے کا، یہی سب سے سنگین اور قابلِ رنج و ملال پہلو ہے۔ (*)

(*) عربی تحریر شائع شدہ پندرہ روزہ ”الداعی“ شمارہ ۳، جلد ۱۵، ص ۳۰، ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۹۱ء اور تحریر یہ قلم خود، جو عربی تحریر کے چند روز بعد ہی سپرد قلم ہوئی اور اخبار مشرقِ مملکت اور دیگر اخبارات و رسائل بالخصوص ”ماہ نامہ دارالعلوم“ میں شائع ہوئی۔

اُستاذ الاساتذہ

حضرت مولانا محمد حسین ”ملا بہاری“

۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء — ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء

اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دِل فریب، اُس کی نگہ دِل نواز

ولادت اور تعلیم

مولانا محمد حسین بہاری، ضلع مظفرپور (حال سیتامڑھی) کے ایک دور افتادہ گاؤں ”شیخ بسہیا“ میں ۱۳ شوال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۰۵ء کو ایک مفلوک الحال خاندان میں پیدا ہوئے۔ معمولی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں اپنے برادرِ بزرگ ابو بکر صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد وہ کئی ایک مدرسوں میں زیرِ تعلیم رہے، جن میں سرفہرست دارالعلوم منوناتھ بھجن ہے، جہاں انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء) کے ایک ہونہار ترین اور مشہور صاحبِ درس شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) سے استفادے کی سعادت حاصل کی اور ان سے مروجہ علوم و فنون کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ مولانا کریم بخش سنبھلی محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (متوفی ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۹۲ء) اور مشہور اسلامی اہل قلم و داعی الی اللہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ (۱) کے

(۱) وفات: شبِ دو شنبہ: ۲۷/۲۸ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۵ مئی ۱۹۹۷ء۔

بھی مربی اور استاذ تھے۔

مولانا بہارئیؒ نے کئی سال مظاہر علوم سہارنپور میں بھی گزارے، وہاں انھوں نے موقوف علیہ تک پڑھنے کے بعد ۱۳ شوال ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶/۱۱/۱۹۲۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث شریف میں داخلہ لیا اور دوسرے سال یعنی ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ حدیث پاک کی اکثر کتابیں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سے پڑھیں۔ وہ حضرت مدنیؒ سے دورہ حدیث مکمل کرنے والی پہلی کھپ کے فضلا میں تھے؛ اس لیے کہ مولانا مدنیؒ کا دارالعلوم میں تقرر ۱۳۳۶ھ میں ہوا جب علامہ محمد انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء) دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تھے۔ دارالعلوم میں مولانا بہارئی کے دیگر قابل ذکر اساتذہ میں علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (متوفی ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) اور شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی امر وہوی (متوفی ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) تھے۔ دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادی (متوفی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء) اور مدرسہ عالیہ فتھپوری دہلی کے سابق صدر مدرس و شیخ الحدیث مولانا قاضی سجاد حسینؒ (متوفی ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء) دارالعلوم میں مولانا کے رفقاء درس میں تھے۔

درس و افادہ

دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے متعدد مدرسوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، ایک عرصہ تک راندر (گجرات) کے مدرسے سے وابستہ رہے، وہاں سے واپس آئے تو سہارنپور کے شاہ بہلول کے مدرسے میں صدر مدرس ہو گئے، کچھ عرصے بعد پھانگ جش خان (دہلی) کے مدرسہ صدیقیہ والوں نے انھیں باصرار اپنے وہاں بلوالیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ہند کے پُر آشوب و خون ریز موقع پر وہ اسی مدرسہ میں موجود تھے اور دہلی اور اُس کے اطراف میں خصوصاً اور پورے ہندوستان میں عموماً اُس

وقت پہا ہونے والے ہمہ گیر دول دوز ہندو مسلم فسادات میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر وہ اپنے وطن مالوف ”شیخ بسہیا“ ضلع مظفر پور (حال ضلع سیتا مرھی) بہار، آ گئے۔

اس موقع سے اُن کے ذہن میں خدا نے ایک مبارک خیال یہ ڈالا کہ اپنے گاؤں میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک تعلیم گاہ قائم کریں، کہ اس علاقے کے مسلمان اقتصادی و تعلیمی اعتبار سے بہ طور خاص پس ماندہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے استاذ و مربی مولانا مدنیؒ کے دست مبارک سے ”مدرسہ مدنیہ“ کے نام سے ۱۹۳۸ء میں اس تعلیم گاہ کا آغاز کیا۔ مولانا کے فرزندوں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ مدرسہ ہنوز کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے اور علاقے کے نو نھالان توحید کو روشنی علم و ہنر سے مستفید ہونے میں مدد دے رہا ہے۔

مولانا کو درس نظامی کے مدرسوں میں پڑھائے جانے والے تقریباً سبھی علوم سے خاصی مناسبت تھی، اُن کا علم ٹھوس تھا؛ اس لیے کہ وہ شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد ایک زبردست ذہنی چوٹ کے نتیجے میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے (جس کی طرف آئندہ سطروں میں اشارہ کیا جائے گا) اس لیے انھوں نے طلب علم میں اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو یکسوئی، محنت اور لگن کے ساتھ صرف کیا۔ پھر یہ کہ وہ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے، عمیق مطالعہ اور غور و فکر کے بعد پڑھاتے تھے۔ وہ معمولی سے معمولی فن یا کتاب بغیر مطالعے کے پڑھانے کے قائل تھے نہ عامل۔ علوم عقلیہ اور منطق و فلسفہ سے طبعی مناسبت نے ان کے فکر و نظر پر مطلوبہ مثبت اثرات ڈالے اور اُن کا ذہن کسی علمی نظریے اور مسئلے کو مرتب و معقول طور پر سوچنے اور مربوط و مختصر جملوں میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا عادی بن گیا تھا۔ درس میں اُن کی مختصر بیانی طلبہ کے لیے بہت مفید ہوتی تھی، کہ اُن کے لیے مسئلے کا فہم اور اُس کا اخذ و ہضم آسان ہوتا تھا، جو کسی مختصر و مائل و دل گفتگو کا سب سے مثبت اور نفع بخش پہلو ہوا کرتا ہے، جب کہ درازی گفتار اکثر مرتبہ مضمون کو خبط اور مخاطب کے لیے اُس کو مزید پیچیدہ کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر مولانا کے شاگردوں کو اُن سے جو محبت و عقیدت تھی وہ گئے چنے اساتذہ ہی کے ساتھ ہوا کرتی ہے، جن کی نفع بخشی و فیض رسانی کی مخلصانہ کوشش و صلاحیت کی محسوس برکتیں ادنیٰ فہم کے طالب علم کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ مولانا کے باکمال تلامذہ کو اُن کی شاگردی پر جس فخر و اعزاز کا اظہار کرتے دیکھا ہے، وہ دارالعلوم کے اساتذہ سلف ہی کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

مُرُوجِ علوم و فنون سے ہمہ گیر مناسبت کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند ایسی عظیم درس گاہ میں اُس کی درسیات کی اکثر کتابوں اور فنون کو لیاقت، اعتماد اور قابل ذکر خوش اسلوبی کے ساتھ، تقریباً ساڑھے چار دہائیوں تک پڑھایا۔ مولانا دارالعلوم کے اُن چند ہما نصیب اساتذہ گرامی قدر میں تھے، جنھوں نے وہاں کی درسیات کی اتنی ساری کتابیں، اس وقار و اعتبار سے پڑھائیں کہ دارالعلوم کے انتظامیہ اور اُن کے شب بیدار و خوش اوقات بازوق طلبہ کے دل و دماغ میں، اُن کے لیے اعتقاد اور محبت کا جذبہ بے پناہ پیدا ہو گیا تھا۔ وفات والے دن عصر کے بعد احاطہِ مولسری میں اُن کی نمازِ جنازہ میں اور مقبرہ قاسمیہ تک مشایعت اور سپردِ خاک کرنے کے موقع پر جو رشک افزا بھیڑ میں نے دیکھی، وہ فضلاء دارالعلوم اور اُن کے تلامذہ کی اُن سے بے پایاں عقیدت و محبت کی واضح علامت تھی۔

مولانا کی زندگی کا سبق آموز پہلو

اُن کی زندگی کا نہایت درجہ سبق آموز پہلو یہ ہے کہ وہ اسبابِ زیست سے تہی دست گھرانے میں پیدا ہوئے، ابھی دس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بے سروسامانی کی تیز دھوپ اُن کے سر پر پڑنے لگی۔ والدین کے بعد اُن کی کفالت کی ذمہ داری اُن کے ماموں کے سر آئی؛ لیکن وہ بھی تنگ دست تھے؛ اس لیے مولانا کو اپنی زندگی کی شمع روشن رکھنے کے لیے، دوسروں کے چراغ سے تیل حاصل کرنا پڑا،

جس کی قیمت وہ اُن کی گائے بھینس یا بیل و بکریاں چرا کر ادا کرتے تھے۔
 وہ ایک چرواہے کی زندگی گزار رہے تھے کہ خدائے علیم و حکیم نے (جس کے یہاں
 ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے) ایک روز اُن کے دل میں یہ بات ڈالی کہ انھیں با معنی اور
 قدر و قیمت والی زندگی جینے کے لیے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ مولانا نے اس نیک ارادے
 کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی اور وہ ہندوستان کے کئی ایک مدرسوں میں یکے بعد دیگرے
 داخل ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے، تا آن کہ برصغیر کی سب سے قدیم و عظیم اسلامی
 دانش گاہ یعنی دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کی سعادت عظمیٰ حاصل کی۔

انھوں نے علم و معرفت کے اکتساب میں اس طرح داد و محنت دی کہ وہ اپنے بہت
 سے اُن ہم عمروں اور رفقاء درس سے بہت آگے نکل گئے، جو خوش حالی کی گود میں کھیلنے
 اور نعمتوں کی سیج پر لوٹنے والوں میں تھے، جنھیں مقدراتِ الہی نے روزی روٹی کی فکر سے
 آزاد اور سایہ والدین سے سرفراز رکھا تھا جب کہ مولانا زندگی کے اُن تمام وسائل سے
 قطعاً محروم تھے، جو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے سنجیدگی سے سوچنے کا حوصلہ دیتے
 اور اس سلسلے میں نتیجہ خیز قدم اٹھانے کے لیے ایک انسان کو آمادہ کرتے ہیں۔

یہی نہیں بل کہ مولانا کے بقول اُن کا ذہن و حافظہ بھی کسبِ علم میں اُن کے لیے
 معین نہیں تھا، وہ تحصیلِ علم کا حوصلہ پا کر بھی اپنے کو اس کے حصول سے معذور محسوس
 کرتے تھے۔ یہ بات اُن کے لیے قلبی کرب کا باعث رہا کرتی تھی کہ وہ کسی علمی مسئلے کو
 بڑی دقت نظر کے بعد سمجھتے اور نہایت محنت کے بعد یاد کرتے تھے اور پھر وہ جلد ہی اُن
 کے حافظے سے ہرن ہو جاتا تھا۔

فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے میں بڑا دل شکستہ رہا کرتا تھا اور شکستگیِ قلب کا
 احساس جب اتنا بڑھ جاتا کہ میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا، تو میں اپنے رب
 سے اکثر اس طرح گریہ کنناں ہوتا تھا، جیسے ایک معصوم بچہ اپنی ماں سے چٹ کر، اپنی
 معصوم ہمتوں کو پورا کر دینے کی ٹپ ٹپ کر اور رورو کر، اس طرح درخواست کرتا ہے

کہ وہ کسی صورت سے اُس کی درخواست رو نہیں کر پاتی۔ فرماتے تھے کہ تھوڑے عرصے بعد میرے فکر و فہم نے میری دادرسی شروع کی اور مشکل ترین مسائل کا سمجھنا اور یاد کرنا میرے لیے نہایت آسان ہو گیا۔

مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر چوں کہ وہ تحصیل علم کی طرف قدرے تاخیر سے متوجہ ہوئے، اس لیے دارالعلوم سے فراغت کے وقت وہ توانا اور جوان ہو چکے تھے۔ طبعی طور پر ان کا جی چاہا کہ شادی کے ذریعے زندگی کا وہ سکون حاصل کریں جس سے وہ تاحال محروم رہے ہیں؛ لیکن اُن کے بہ قول چوں کہ وہ نادار بھی تھے اور شکل و صورت بھی اتنی جاذبِ نظر نہ تھی جو غربت کے باوجود ہندوستانی معاشرے میں اور خصوصاً اُن کے علاقے میں ایک باپ کو اُن کے ایسے جوان سے اپنی لڑکی بیاہنے پر آمادہ کر سکتی، چنانچہ لوگوں نے اُن کی غربت اور گہرے گندمی رنگ کی وجہ سے اُنھیں اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا۔

اُس وقت اُنھیں ایک مرتبہ پھر سخت ذہنی صدمہ پہنچا؛ لیکن اس صدمے کی تہوں میں اُن کے لیے زندگی کا گہرا سبق موجود تھا۔ اُنھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ زندگی بڑی تنگ دل اور سنگ گراں ہے، قبول و انکار اور پسند و ناپسند کے سلسلے میں اُس کا اپنا مخصوص پیمانہ ہے، انسان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے سلسلے میں اُس کا اپنا خصوصی معیار ہے۔ اُنھوں نے اُس وقت جی کڑا کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اُنھیں زندگی کا چیلنج قبول کرنا اور اُس کی دھوپ چھاؤں میں اُس کی مرضی کے مطابق جینا ہے۔

اُنھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اُن مدرسوں میں سے ایک میں تدریس کی ملازمت شروع کی، جو تاریخ کے نامعلوم سرنگوں میں گم ہوتی ہوئی قدیم ترین صنم پرستی کے اس دیار میں فرزندانِ توحید کی دینی بیداری اور اسلام کی غیر معمولی تاثیر قوت کی واضح علامت ہیں۔

وہ نہایت درجہ سادہ زندگی گزارتے اور اپنی تنخواہ سے ماہ بہ ماہ کچھ پس انداز

کرتے رہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مدارس اسلامیہ میں تنخواہ کا معیار ہنوز ناقابل ذکر حد تک گرا ہوا ہے۔ مولانا کی تدریسی زندگی کے آغاز کے وقت بھی اُس وقت کے حالات کے چوکھٹے میں مدارس کی تنخواہیں یقیناً بہت کم رہی ہوں گی۔ اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا قوتِ لایموت کی کس سطح کو اپنا کر اپنی تنخواہ سے رقم پس انداز کرتے رہے ہوں گے۔

پس اندازی کی حکیمانہ پالیسی کے ذریعے انھوں نے اتنی رقم جمع کر لی، جس سے انھوں نے اتنی ”بہت سی“ زراعتی زمینیں خرید لیں، جن سے انھیں ”مال داروں“ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اُس وقت متعدد والدین اپنی لڑکیوں سے اُن کی شادی کے لیے خواہش مند ہوئے۔ انھوں نے اُن میں سے ایک لڑکی کا انتخاب کیا، جسے قضاے الہی نے اُن کی زوجیت میں دینا طے کیا تھا۔ اس سے ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ دو لڑکے مولوی احمد حسین اور مولوی نجم الحسن بالترتیب ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۱ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ مولانا کے تمام لڑکے الحمد للہ کام سے لگے ہوئے ہیں، اُن کی اہلیہ اُن کی وفات سے تقریباً ۲۳ سال قبل اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

مولانا کی زندگی کا سبق

مولانا کو اپنی زندگی میں روزِ اول سے تنگ دستی کی جس پُر خار وادی سے گزرنا پڑا اُس نے انھیں زندگی بھر مال و زر کا قدرداں بنائے رکھا، اُن کو عملی زندگی میں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ تہی دامن انسان کو نہایت زہریلے سانپ سے زیادہ بری طرح ڈسنے اور خبیث پتھرو سے زیادہ مسلسل ڈنک مارتے رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے؛ اِس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور نہایت ضرورت کے وقت ہی خرچ کرتے تھے۔ آمد و خرچ میں ”مکمل توازن“ قائم کرنے کی جو صلاحیت اُن کے رب نے انھیں دی تھی اور اِس سلسلے میں اُن کی قوتِ ارادی میں جو صلابت تھی وہ اُن کا خاص حصہ تھی۔ انھوں نے مدرسوں کی قلیل

تنخواہوں کے ذریعے اپنے بچوں کے لیے اتنا کچھ کر دیا کہ ان شاء اللہ اُن کے بعد انھیں تازیست کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس طرح انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر مکمل عمل کیا جس میں ورثا کو اغنیا چھوڑنے کی ترغیب اور تنگ دست چھوڑنے کی نکیر کی گئی ہے۔

مولانا کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ بعض دفعہ عمدہ قسم کے درخت شوریدہ زمین میں اُگتے اور مخالف ماحول، نامناسب موسم، پانی سے دوری، بارش کی کمی اور کسان کی عدم دلچسپی اور اُن کی دیکھ ریکھ کے سلسلے میں اُس کی طرف سے مکمل کوتاہی کے باوجود، وہ اس طرح بڑھتے، پروان چڑھتے اور رب کائنات کی مرضی سے ہر موسم میں اُتار بگ و بار لاتے ہیں کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

اس کے برخلاف بعض دفعہ ”لا خیرے درخت“ سرسبز و شاداب زمین میں، شیریں چشموں کے بیج اُگتے ہیں، انھیں عمدہ ماحول اور مناسب موسم میسر ہوتا ہے، رب العالمین بروقت بارشوں سے اُن کی قدرتی سیچائی بھی کرتا رہتا ہے، کسان اُن کی نگہداشت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا؛ لیکن وہ لاخیرے ہی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَالَّذِي حَبَّتْ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾ کے مصداق، بیج ہے خدائے ذوالجلال ہر چیز پر، ہر طرح اور ہر وقت اور ہر جگہ قادر ہے۔

مولانا کی قابل ذکر خصوصیتیں

دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ میں اس بات پر اتفاق تھا کہ مولانا دو باتوں میں امتیازی شان کے مالک ہیں: نماز باجماعت کی موانعت اور درس کی پابندی۔ کڑا کے کی سردی ہو یا گرمی میں لو کی تپش یا برسات کی جھڑی، کوئی چیز مولانا کے لیے دارالعلوم کے وسط میں واقع مسجد میں باجماعت بیج گانہ کی ادائیگی سے روک نہیں سکتی تھی۔ وفات سے کچھ ہفتے پہلے چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہی سے قبل تک اُن کی مسجد کی حاضری میں

کوئی خلل کبھی نہ ہوا۔ وہ اذان سے قبل وضو سے فارغ ہو جاتے اور اذان کے فوراً بعد ایک دو طالب علم کے سہارے اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے مسجد پہنچ جاتے۔ پیرانہ سالی اور کم زوری کی وجہ سے وہ خاصی دھیمی رفتار سے چلتے، بعض دفعہ آگے کی صفیں بھر جاتیں؛ لیکن وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے اور طلبہ انھیں دیکھ کر از خود اُن کے صفوں سے گزرنے اور آگے بڑھنے کے لیے جگہ خالی کر دیتے۔ بعض دفعہ وہ اپنی خاص آواز اور شفقت آمیز لہجے میں اُن طلبہ کو ڈانٹتے جو نو وارد ہونے کی وجہ سے اُن کو نہ جانتے اور اپنی جگہ سے نہ ہٹتے، طلبہ اُن کی دیگر ڈانٹوں کی طرح اس ڈانٹ سے بھی مزے لیتے اور مسکراتے ہوئے پہلی صف میں پہنچ جاتے۔

مولانا کی روزمرہ زندگی ہر طرح کے تکلفات اور نستعلیقیت سے خالی بے حد سادہ تھی، اُن کے کمرے میں جو دار جدید کے شمال مشرقی کونہ پر دوسری منزل پر تھا، چند عدد کھانے پینے کے برتن، ایک دو عدد چار پائی، معمولی سا بستر، ایک آدھ بکس، ایک پرانا سا ٹیبل فین، سادہ سا پان دان، چند عدد پلاسٹک اور شیشے کے ڈبے اور مرتبان، جن میں بعض ماکولات اور مشروبات قسم کی چیزیں رکھتے، اور ایک عدد لوٹا وغیرہ کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی چیز نظر نہ آتی جو زیبائش اور کمالات سے تعلق رکھتی ہو۔ ایسا کب ہو سکتا تھا جب کہ مولانا ضروریات کے تعلق سے بھی خاصے بے پروا واقع ہوئے تھے۔

میں کبھی کبھی مغرب بعد بہ طور خاص اُن سے ملنے کے ارادے سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ اپنے کمرے کی اندرونی ”کٹیا“ میں، ایک بجھے بجھے سے لیمپ کے ”سائے“ میں ایک میلے سے سال خوردہ گاؤں تکیے پر اپنی دہنی کہنی سے ٹیک لگائے، اپنے شانوں کو جھکائے، کسی زیر تدریس کتاب پر نظر جمائے، مطالعے میں مستغرق ہوتے۔ میں اپنے سلام سے ”کٹیا“ کی خاموشی کو توڑتا ہوا اُن سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا اور وہ سیدھا بیٹھ جاتے، مسکراتے، دل سے دعائیں دیتے، خبر خیریت دریافت کرتے اور بے طرح خوشی کا اظہار کرتے جیسے عرصے کے بعد اُن کا کوئی گراں

قدرتِ حق انھیں مل گیا ہو۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا کہ مولانا سے میں جب بھی ملتا اس اعتماد، خوشی اور ناز کے ملے جلے جذبات سے ملتا جیسے وہ میرے شفیق باپ ہوں۔ مولانا کی طرف سے بھی پیہم پدرانہ شفقت کے معاملے نے مجھے اُن پر خاصاً ”دلیر“ بنا دیا تھا؛ اس لیے میں شوخی اور ظرافت کے پیرائے میں بہت سی ایسی باتیں اُن سے کہہ جاتا تھا، جو اُن کے مقام و مرتبے کے آدمی کے لیے مجھ جیسے خردسال و خرد مقام آدمی کی طرف سے سوے ادب کے خانے میں آسکتی ہیں؛ لیکن وہ ان باتوں سے خوش ہوتے اور بعض دفعہ اپنی چھڑی میرے اوپر خاص انداز میں اٹھالیتے، جیسے وہ سچ مچ میری اچھی طرح خبر لینے والے ہوں۔ اُن کی یہ چھڑی نہ جانے کتنے طلبہ اور اساتذہ دارالعلوم پر جن میں سے اکثر اُن کے شاگرد ہیں، اٹھتی رہتی تھی۔ اُن کے اکثر شاگردوں اور دارالعلوم کے اساتذہ کو اُن کی مرنجا مرنج طبیعت، سادگی، خوش مزاجی، اداے دل برانہ اور اندازِ مومنانہ کی وجہ سے، اُن سے جو بے تکلفی تھی اور خود انھیں اُن سے جو محبت تھی اُس کی بنا پر اکثر اساتذہ انھیں ان کی دعائیں لینے اور اُن کی چھڑی کھانے کے لیے چھیڑتے رہتے اور سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کرنے کی، اُن کی عادت کی وجہ سے، اکثر اُن کی جھڑکی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن سے دعوتِ طعام کی فرمائش کرتے اور پھر کیا تھا، اُن کی مصنوعی غضبناکی کی شاب پر آجانی اور نتیجے میں اُن کا ”عصائے کلیمی“ حرکت میں آجاتا۔ دعوت دیئے جانے سے وہ بے حد ”خوش ہوتے“ اور دعوتِ طلب کیے جانے سے اُسی قدر یا اُس سے کچھ زیادہ ”ناراض“ ہوتے؛ لیکن اُن کی ”خوشی“ اور ”غضبناکی“ دونوں ہی ہم لوگوں کو محبوب اور مطلوب تھی، کہ دونوں سے ہمیں یکساں لطف ملتا تھا۔

اُس کی نفرت بھی عتیق، اُس کی محبت بھی عتیق

قہر بھی اُس کا ہے، اللہ کے بندوں پہ شفیق

مجھے مولانا کے کمرے کے اسباب میں جس چیز پر سب سے زیادہ رحم آتا وہ اُن کا گاؤ تکیہ تھی، میں مولانا سے اکثر کہتا: حضرت! آپ اس گاؤ تکیہ کو (جو بوسیدہ بھی ہے اور

جس کی روئی کثرت استعمال سے پس کر آٹے کی طرح ہو گئی ہے اور آپ کی کہنی اس میں اتنی دھنس جاتی ہے کہ سہارا لینے کا مطلوبہ فائدہ آپ کو یقیناً حاصل نہیں ہو پاتا) کیوں تبدیل نہیں کر لیتے؟ آپ کے لیے کیا چیز مانع ہے؟ آپ تو جس شاگرد سے بھی فرمادیں گے وہ فوراً تعمیل حکم کرے گا اور دیگر اسباب حجرہ بھی تو غالباً از قبیل ہدایا ہی آئی ہوں گی، مولانا یہ سن کر روایتی خفگی کا اظہار کرتے اور اپنی چھڑی کے گول دستے سے میری گردن کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے، میں دائیں بائیں مڑ کر بچ نکلتا۔

مولانا رفیق القلب تھے، نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور بزرگانِ عظام کے تذکرے کے وقت اکثر آب دیدہ ہو جاتے، وہ کسی بات سے جلد متاثر ہو جاتے، اُن کی خفگی اور خوشی میں بال سے زیادہ فاصلہ نہ تھا؛ لیکن یہ دونوں کیفیتیں اُن کی شخصیت میں ایک پر لطف رنگ اور آہنگ کے ساتھ نمودار ہوتی تھیں۔ وہ پاک نفس اور صاف دل تھے۔ اُن کی سادگی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے دارالعلوم کے طلبہ اُن سے کچھ زیادہ ہی گھلے ملے رہتے تھے۔ ہر ایک اُن کی خدمت کر کے اپنے کوسرخ رو سمجھتا تھا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مختلف المشرَب معاصر بزرگانِ دین اور علمائے کبار کے یہاں محبوب رہے۔ دارالعلوم کے اکثر موجودہ اساتذہ کو، جو اُن کے شاگرد ہی تھے ”مولانا فلاں“ نہ کہہ کر پیار اور اعتماد کے وجہ سے اکثر ”فلاں“ ہی کہتے تھے۔ یہ غالباً دارالعلوم میں تنہا اُنھی کی خصوصیت تھی، اساتذہ اُن کے اس طرزِ مخاطب سے نہ صرف یہ کہ شاد ہوتے، بل کہ لطف لیتے اور سعادت محسوس کرتے اور زبانِ حال اور قال سے کہتے کہ ان کے بعد ہمیں اس طرح پکارنے والا اب کوئی نہ ہوگا۔

اُن کی امیدیں قلیل اُن کے مقاصد جلیل

وہ درمیانہ قد تھے، داڑھی اور سر کے بال گھنیرے تھے، جسم متوسط اور نگاہ تیز تھی، بھنویں گھنی، پیشانی درمیانہ، ناک اونچی اور رنگ گہرا گندمی تھا، صاف ستھری بات

پس مرگ زندہ

کرتے اور خوشی یا ناخوشگی کا برملا اظہار کر دیتے تھے، اُن کی دنیاوی تمنائیں قلیل اور اُخروی مقاصد جلیل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی زندگی مؤمنانہ تھی۔

اُن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ اُن کا آخری وقت جب بھی آئے دارالعلوم ہی میں آئے، اساتذہ و طلبہ دارالعلوم ہی اُن کو اپنے ہاتھوں مقبرہ قاسمیہ میں سپرد خاک کریں؛ اسی لیے وہ اپنے وطن بہت کم جایا کرتے تھے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے سکون و آرام کی جو دولت وہ یہاں محسوس کرتے تھے اُن کو وطن میں میسر نہ تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کی یہ مخلصانہ؛ بل کہ عاشقانہ آرزو پوری ہوئی اور طلبہ و اساتذہ دارالعلوم اور پڑوس کے اضلاع کے مدرسوں میں پھیلے ہوئے سیکڑوں؛ بل کہ ہزاروں شاگردوں نے اُنھیں انتہائی عقیدت و محبت سے مقبرہ قاسمیہ میں عظیم ترین علماے دیوبند کے جوار میں، اُن کی آخری آرام گاہ میں اتا دیا۔ ع
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اُن کی سرگرمی حیات کا خلاصہ

اُن کی زندگی کی سرگرمی کا خلاصہ تھا نماز، ذکر الہی، درس، طلبہ و اساتذہ دارالعلوم، خود دارالعلوم، زندگی جینے کے لیے کچھ خورد و نوش، اپنی اولاد کی پرسکون زندگی کے لیے فکر مندی اور ہم نشینوں سے خوش گپیاں۔ ہم نشینوں میں سرفہرست اُن کے دیرینہ رفیق و پڑوسی و ہم صوبہ مولانا مفتی ظفر الدین مقتاحی در بھنگوی مفتی دارالعلوم دیوبند اور مرحوم جامعہ طیبہ دارالعلوم دیوبند کے لائق استاذ مخلص و کرم فرما مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب منوی تھے (۱)۔ اول الذکر نے ہمیشہ عموماً اور مرض الموت کے ایام میں خصوصاً مولانا کی لائق ستائش خدمت کر کے اپنی مخلصانہ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ خدائے کریم اُنھیں اس کا بہترین بدلہ دے اور تمام اُن اساتذہ اور طلبہ کو بھی جو اُن کی معذوری کے دنوں میں

(۱) فات: جمعرات: ۱۹/ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۲۰۰۹ء۔

انسانی، اسلامی اور تلمیذانہ جذبہ و عقیدت کے ساتھ اُن کی تیار داری کر کے اپنے رب کی جزا کے مستحق ہوئے۔

یادوں کے سایے

مجھے مولانا سے پہلی مرتبہ ملاقات کا شرف شوال ۱۳۸۸ھ میں اُس وقت حاصل ہوا جب دارالعلوم دیوبند میں میری طالب علمی کا دوسرا سال تھا۔ میرے ہم خاندان اور ہم قریہ مولانا عمیس اختر کے ہم راہ اُنھی کی تحریک پر ہم دونوں مغرب کی نماز کے بعد مولانا سے ملنے کے لیے اُن کے کمرے میں حاضر ہوئے۔ وہ اُسی روز رمضان المبارک کی تعطیل کلاں گزار کر گھر سے تشریف لائے تھے، ہماری آمد کے وقت وہ اور اُن کے صاحبزادے مولوی احمد حسن قاسمی اور مولوی نجم الحسن قاسمی (جو اُس وقت خُرْد سال تھے) دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا گھر سے تلی ہوئی مچھلی اور روٹیاں لائے ہوئے تھے، وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے بچے ہنوز کھا رہے تھے، اُنھوں نے اپنے خاص انداز میں دونوں بھائیوں کو مچھلی کی مزید ایک ایک یاد دو قاشیں دیتے ہوئے فرمایا ”بس اب اس کے بعد اگر تم لوگوں نے اظہار طمع کیا تو ایک ہی تھپڑ میں دماغ صحیح کر دوں گا“۔ ہم لوگوں کے سلام کی آواز سے مولانا کا ایک ہماری طرف متوجہ ہوئے اور اپنی روایتی جھڑکی کے ساتھ، اپنے وطن کے لہجہ میں فرمایا ”کون ہے رہے؟“، مولوی عمیس کو جانتے تھے، اس لیے ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اُن کو پہچان گئے، البتہ میرے اوپر سوالیہ نگاہ ڈالتے ہوئے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ مولوی عمیس نے تعارف کرایا تو وہ سمجھ گئے کیوں کہ غائبانہ وہ مجھے بھی جانتے تھے۔ سامنے پڑی ہوئی چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پڑوس کے کمرے میں رہنے والے میرے ایک ہم سبق اور ہم ضلع طالب علم مولوی عبداللحان مظفر پوری کو آواز دی اپنے اُسی وطنی لہجے میں ”رے عبداللحان؟“ وہ فوراً ہی حاضر خدمت ہوئے، اُنھیں چار آنے تھمائے (یاد رہے کہ اُس وقت ”آنے“ کا ہی چلن تھا) اور فرمایا ایک آنے کی طوطا چھاپ

چائے پتی، ایک آنے کا دودھ اور ایک آنے کے میرے لیے پان کے پتے لے آؤ۔ حسب الحکم وہ سامان لے کر آئے، تو فرمایا: تمہارے اسٹو میں تیل ہے تو لے آؤ اور چائے تیار کرو۔ چائے بنی اور ہم لوگوں کی خاطر تواضع کی گئی۔

اس کے بعد مولانا کی خدمت میں بار بار حاضری کا موقع ملا؛ لیکن زیادہ گھٹنا ملنا یا اُن کی خدمت کرنا یا دُنہیں؛ کیوں کہ مولانا کے یہاں میرا کوئی سبق بھی نہیں تھا دوسرے اُن کا رعب و دبہہ بھی حجاب رہا۔ اُس وقت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸ھ) کے بعد دارالعلوم کے گوشے گوشے میں، منطق و فلسفہ اور معقولات میں، مولانا کے طاق ہونے کا غلغلہ بلند تھا، مولانا اُس وقت زیادہ بوڑھے بھی نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے معقولات میں دست گاہ رکھنے اور اُس سے دلچسپی لینے والوں میں جو ایک طرح کی ”خودداری“ عموماً ہوا کرتی ہے اس کا تھوڑا بہت اثر اُن پر تھا یا نہیں؛ لیکن اُس کی شہرت طلبہ میں اُس وقت بہت تھی۔ اس بنا پر ہم ایسے کم ہمت طلبہ عموماً اُن سے زیادہ گھٹنے ملنے یا اُن کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے تھے۔

وہ معقولات میں اپنی غیر معمولی دلچسپی اور مہارت کی وجہ سے دارالعلوم میں اُس وقت ”علامہ بہاری“ کے نام سے ہی جانتے جاتے تھے۔ بعد میں ”مولانا بہاری“ یا ”ملا بہاری“ ہمیشہ کے لیے اُن کے نام کا قائم مقام بن گیا، حتیٰ کہ بعض طلبہ سالوں دارالعلوم میں گزارنے کے بعد واپس چلے جاتے اور انھیں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ اُن کا اصلی نام مولانا ”محمد حسین“ ہے۔ گویا منطق کی شہرہ آفاق کتاب ”مسلم العلوم“ کے جلیل القدر مصنف ملا محبت اللہ بن عبد الشکور بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۷۷ء) سے تشبیہ دینے کے لیے انھیں ”ملا بہاری“ کہا جاتا تھا۔

مولانا کی ناچیز سے خفگی اور پھر رضا مندی کا واقعہ

۱۹۶۹ء میں دارالعلوم میں ایک زبردست اسٹرائک ہوئی، راقم الحروف اُس میں

اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد حسین ”ملا بہاری“

کسی طرح بھی شریک نہ تھا؛ کیوں کہ میں کم سن بھی تھا اور میرا علم اور تجربہ بھی کچھ ایسا نہ تھا کہ میں دیگر ”عالی حوصلہ“ طلبہ کا ساتھ دے سکتا؛ لیکن ایک روز میں مدنی گیٹ (دار جدید کا شمالی دروازہ) سے عصر کی نماز کے بعد کچھ ساتھیوں کے ہم راہ تفریح کے لیے نکل رہا تھا، مولانا بھی اپنے بعض رفقا کے ساتھ بہ غرض تفریح نکل رہے تھے۔ اسٹرائک کے تعلق سے اُنھوں نے ہم لوگوں سے کوئی گفتگو کی، میری زبان سے رواروی میں ایک آدھ لفظ ایسا نکل گیا جو مولانا کو اس درجہ ناگوار گزرا کہ عرصے تک وہ مجھ سے چڑتے اور مجھ کو کوستے رہے۔

بالآخر ۱۹۷۷ء میں، جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدرس تھا، مولانا کی رضا مندی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ مشفق محترم مولانا مفتی ظفیر الدین کے خط سے معلوم ہوا کہ مولانا فلاں تاریخ کو بہ راہ لکھنؤ دیوبند سے گھر جا رہے ہیں؛ چوں کہ اس وقت لکھنؤ سے دیوبند تک بڑی لائن اور لکھنؤ سے مظفر پور تک چھوٹی لائن تھی، اس لیے گاڑیوں کی تبدیلی کے لیے مسافروں کو کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن سے ملنے چار باغ اسٹیشن آ گیا۔ حسب توقع مولانا چھوٹی لائن کے پلیٹ فارم پر مطلوبہ گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے، علیک سلیک کے بعد میں نے مولانا سے عفو و درگزر کی درخواست کی، مولانا نے نہ صرف یہ کہ میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیا؛ بل کہ بے پناہ دعائیں دیں اور میرے سر پر دستِ شفقت و برکت پھیرتے ہوئے فرمایا ان شاء اللہ تم ہمیشہ اور ہر جگہ کامیاب رہو گے۔

دارالعلوم دیوبند کی تدریسی زندگی میں

مولانا کا مشورہ اور سکونِ خاطر

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، دارالعلوم میں حالیہ انتظامیہ کے استوار ہونے کے بعد، جب

میں ”الداعی“ کے مدیر اور استاذ دارالعلوم کی حیثیت سے آیا تو ایک آدھ ماہ گزرنے کے بعد

ہی اُس وقت کے غیر مستحکم حالات میں کچھ زیادہ جی نہ لگا اور میں یہاں مستقل ملازمت کے حوالے سے (دارالعلوم سے غیر معمولی؛ بل کہ ناقابلِ بیان عشق و عقیدت کے باوجود) خاصا متردد ہو گیا، اپنے دیرینہ و مخلص کرم فرماؤں میں مولانا کے علاوہ مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس سے اس سلسلے میں مشورہ کرتا۔ میں ایک روز مغرب کے بعد اس اعتماد و یقین کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آج مولانا جو مشورہ بھی دیں گے میں اُسی کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اُس پر عمل کرنے کی سعی کروں گا۔ وہ حسبِ معمول اپنے گاؤں تیکے پر داہنی کہنی ٹیکے ہوئے مجھ کو مطالعہ تھے، میں نے سلام اور مزاج پرسی کے بعد تفصیل سے اپنا مسئلہ اُن کے سامنے رکھا، چند منٹ وہ خاموش رہے جیسے صغریٰ و کبریٰ کو ترتیب دے کر کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہوں، پھر کامل یقین کے ساتھ فرمایا:

”عزیزم! تم یہاں از خود تو آئے نہیں؛ بل کہ بلائے گئے ہو، جس منصب اور ملازمت کا انسان از خود طالب نہیں ہوتا تو خدائی مدد اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ تمہارے لیے خدا کی پسند اور دارالعلوم کے لیے اُس کی طرف سے تمہارا انتخاب ہے، اس لیے تم ہمت کے ساتھ اپنا کام کرتے رہو، ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

میں مرحوم کے پاس سے اٹھا تو میرا دل تردد کی تمام کیفیات اور شکوک و شبہات سے اس طرح صاف تھا، جیسے کسی مومنِ کامل کا دل آلودگی شرک و نفاق سے؛ چنانچہ ایک سو ہو کر اپنے فرائض میں لگ گیا۔

یہاں کی تدریسی زندگی میں رفتہ رفتہ مولانا سے ایسا تعلق خاطر ہو گیا کہ وہ جہاں اپنی تواضع اور ملنساری کی وجہ سے سمجھوں کے لیے محبوب و محترم تھے، وہیں میرے لیے بزرگِ خاندان لگتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں ایک آدھ ماہ کی تاخیر سے حاضر ہوتا تو وہ پدرِ شفیق کی طرح طویل غیر حاضری کا شکوہ کرتے۔ خدائے کریم اُن کو ہر طرح نوازے۔

مولانا کے تعلق سے مہمان خانہ دارالعلوم کا ایک دلچسپ واقعہ

دارالعلوم میں میری طالب علمی کے زمانے میں، ایک مرتبہ خادم قوم و ملت امیر شریعت بہار واڑیہ مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، محرم کی شوریٰ کے موقع سے دارالعلوم کے مہمان خانے میں فروکش تھے۔ مولانا بہاریؒ اور مفتی ظفر الدین مدظلہ (مولانا رحمانی سے اپنے دیرینہ خصوصی تعلق کی بنا پر، اُن کے دارالعلوم میں قیام کے دوران، اُن کی مجلس میں پابندی سے عصر کے بعد حاضر ہونے کے معمول کے مطابق) اُن کے کمرے میں تشریف لائے، بہت سارے طلبہ بھی تھے۔ مولانا رحمانی تھوڑے ہی دنوں قبل حج و زیارت سے مُشرَّف ہو کر دیارِ خدا و حبیب سے تشریف لائے تھے، اُنھوں نے وہاں سے لائی ہوئی عطر کی شیشی حاضرین کی طرف بڑھائی سمجھوں نے ذرا بہت لے کر ایک دوسرے کی طرف بڑھادی، جب وہ مولانا بہاریؒ کے ہاتھ لگی تو اُنھوں نے حق ادا کر دیا، واڑھی، آستین، سینے، دامن، سبھی کچھ مُعطر کر لیے۔ مولانا رحمانی نے بڑے ظریفانہ انداز میں اُن سے شیشی طلب کی اور فرمایا ”مولانا اب واپس کر دیجیے، یہ کڑوا تیل (یعنی سرسوں یا رائی کا تیل) نہیں ہے، ساری مجلس زعفران زار ہو گئی اور ہنتے ہنتے لوگوں کا برا حال ہو گیا۔

مدعوین سے ”شاہی نذرانے“ کی وصولی

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے قدیم شاگردوں کی دارالعلوم آمد کے موقع سے، نیز دیگر واردان دارالعلوم میں سے اپنے تعلق والوں کی بسا اوقات دعوت کرتے، لیکن دسترخوان پر مہمان کے بیٹھنے سے پیشتر اور کبھی کبھی دعوت کی تیاری سے قبل، دعوت دیتے وقت ہی فرماتے کہ بھئی پہلے ”شاہی نذرانہ پیش کرو“ مولانا کا ظریفانہ انداز اور حسن طلب کی تاثیر اور فرمائش کا جھڑکی والا خاص اُسلوب، شاگرد اور غیر شاگرد سبھی

حسب حیثیت بہ خوشی ”نذرانہ“ پیش کر دیتے۔

بعض دفعہ اُن کی دعوت بھی اُن کی عام زندگی کی طرح نہایت سادہ اور بڑی دلچسپ ہوتی: میرے زمانہ طالب علمی میں اُنھوں نے ایک بار مولانا رحمانی اور اُن کے رفقاء کی دعوت کی تو اُس کی فہرست کچھ اِس طرح تیار ہوئی:

”مطبوع کی تین عدد نان، ایک پاؤ کڑے کا گوشت، آدھا کیلو چاول کا

خشک اور پانچ عدد پیاز اور دو عدد نمائز کا سلاڈ“۔

دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کے موقع سے شمالی بہار کے ضلعوں میں خصوصی چندہ کی وصولی کا کام مولانا بہاریؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور مفتی ظفیر الدین صاحبان کے سپرد ہوا۔ مولانا بہاریؒ کے رفقاء سفر بتاتے ہیں کہ بعض دفعہ ہم لوگ ایک ایک روز میں دسیوں گاؤں سے مالیہ کی فراہمی سے فارغ ہو جاتے۔ کسی گاؤں میں مشکل سے ایک آدھ گھنٹہ صرف ہوتا اور ہزاروں کا چندہ ہو جاتا۔ گاؤں کے کسی صاحب و جاہت آدمی کی بیٹھک میں ہم لوگ بیٹھ جاتے اور مولاناؒ کا حکم ہوتا کہ بھئی سارے تو نگروں اور چودھریوں کو جمع کرو۔ جب وہ اکٹھا ہو جاتے تو ایک ایک شخص کو مخاطب کر کے فرماتے:

”آپ اتنے سو، آپ اتنے ہزار، آپ اتنے روپے، بس سولہ منٹ

میں دیدیجیے، ورنہ اِس کے بعد اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو آپ جانیں،

ہمیں نہ کوئی سہ۔ چند منٹ میں ہزاروں روپے نقد آ جاتے۔“

بعض دفعہ کسی گاؤں کا کوئی صاحب حیثیت دعوت کرنی چاہتا یا چائے پلانے کی خواہش کا اظہار کرتا، تو فرماتے ہم آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں بشرطے کہ آپ اتنے ہزار دسترخوان پر بیٹھنے سے پہلے دے دیں۔ کسی جزیں مال دار سے سابقہ ہوتا تو اُس سے مطلوبہ رقم، متعینہ وقت میں حاضر کر دینے کا حکم دینے کے بعد فرماتے:

”آپ دیں یا نہ دیں میں نے اپنی بات کہہ دی۔“

اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد حسین ”ملا بہاری“

مولانا اس طرح کے جملے ایسے لوگوں کو اس طرح کڑک کے ساتھ، تیوری چڑھا کر موثر انداز میں کہتے کہ وہ مطلوبہ رقم دینے میں سکندروں کی تاخیر کو بھی، اپنی دنیا و عقبیٰ کی بربادی کے لیے بہت سارے نامعلوم خطروں کو دعوت دینے کا مترادف سمجھتے اور سارے کام چھوڑ چھاڑ، جہاں سے بن پڑتا روپے حاضر کر دیتے۔
خدا نے پاک اُن کو اپنی کشادہ دہشت میں جگہ دے۔

وفات

وفات سے چند ماہ قبل تک مولانا کی عمومی صحت اچھی تھی اور بڑھاپے کے اُعدا کے سوا الحمد للہ انھیں کوئی تکلیف نہیں تھی؛ لیکن ۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو اُن پر لقوہ کا حملہ ہوا اور جدید و قدیم طریقہ ہائے علاج سے وہ شفا یاب ہو چلے تھے کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۱ء جمعرات کے روز مغرب کی نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہتے تھے کہ یکا یک گر گئے اور کو لھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ایک دو روز بعد مظفر نگر کے ایک ہڈی کے پرائیوٹ ہسپتال میں انھیں داخل کیا گیا؛ لیکن وہ اکثر اوقات بے ہوش رہے، کچھ افاقے کے بعد ۲۷ دسمبر کو اُن کے صاحبزادگان، جو اُن کی تیمارداری کے لیے آئے ہوئے تھے، انھیں دیوبند واپس لے آئے۔ وفات سے تین روز قبل سے اُن پر پھر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر یک شنبہ ۶ رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۹۲ء کو ٹھیک ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر اُس گنجینہ علم و حکمت نے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ موت کے وقت وہ تقریباً ۹۰ سال کے تھے۔ انھوں نے چالیس برس سے زائد عرصے تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دی۔ دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس اُن کا تقرر ۳۱ رجب ۱۳۶۷ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ انھوں نے اس طویل عرصے میں سیکڑوں شاگرد پیدا کیے، جن میں بعض عالمی شہرت یافتہ علماے باکمال بھی ہیں۔

پس مرگ زندہ

خدائے کریم اُن کے درجات بلند فرمائے، اُن کے پس ماندگان اور تمام
شاگردوں اور اہل تعلق کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین
حیاتِ انساں ہے شمعِ صورت، ابھی ہے روشن ابھی فسرده
نہ جانے کتنے چراغِ یوں ہی جلا کریں گے، بجھا کریں گے



یکتاے زمانہ

حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

۱۳۳۹ھ/۱۴۱۵ء = ۱۹۳۰ء/۱۹۹۵ء

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ پر اس راقم نے اردو میں باقاعدہ کتاب ”وہ کوہ کن کی بات“ لکھی تھی، جو الحمد للہ بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی اور پڑھی جا رہی ہے؛ کیوں کہ تحریر کی چاشنی اور صاحبِ سوانح کی ساحرانہ شخصیت دونوں قاری کو دعوتِ خواندگی دیتی رہتی ہیں۔

راقم نے حضرت پر عربی زبان میں بہت مفصل مقالہ بہ عنوان ”الْكَفَرَانَوِيّ ذَلِكِ الْمُعَلِّمُ وَالْإِنْسَانُ وَصَانِعُ الرِّجَالِ وَالتَّارِيخُ“ سپرِ قلم کیا تھا، جو ”الداعی“ کے شمارہ ۱، جلد ۱۹، محرم ۱۴۱۶ھ مطابق جون ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ زیرِ نظر مقالہ بہ راہِ راست اردو میں لکھا گیا تھا، جو نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے، یہ نہ تو عربی سے ترجمہ ہے اور نہ ”وہ کوہ کن کی بات“ سے ماخوذ ہے۔ (امینی)

حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۳۹-۱۴۱۵ھ = ۱۹۳۰-۱۹۹۵ء)

پس مرگ زندہ

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں، مردم گری و افراد سازی میں بے مثال گزرے ہیں۔ بعض فضلا انھیں دارالعلوم کے پیش رو مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی (متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۳۹ء) بن مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۱۲۳۷-۱۳۲۵ھ = ۱۸۳۱-۱۹۰۷ء) کے لیے ”حبیب الرحمن ثانی“ بھی کہتے اور لکھتے ہیں؛ لیکن میری اور میرے جیسے اکثر فضلا و علما کی رائے ہے کہ مولانا کیرانوی افراد سازی میں ہمہ گیریت کی وجہ سے، کسی کے ثانی نہیں؛ بل کہ لا ثانی تھے اور ہر لا ثانی لافانی ہوتا ہے؛ اس لیے وہ الحمد للہ زندہ و تابندہ ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہیں گے۔

خدائی صنعت کی خاص دین

حضرت مولانا کیرانوی کی زندگی پر (شعوری و تعلیمی وقفے سے عملی و تدریسی منزل کے آخری لمحے تک پر) محض طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی، ہر کس و نا کس کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدائی صنعت کی خاص دین تھے۔ خدائے حکیم نے انھیں تعلیم و تربیت کی دنیا میں ممتاز رول کی ادائیگی اور مدرسی ماحول کی ہمہ گیر اصلاح اور انقلاب آفریں عمل کی انجام دہی کے لیے خلق کیا تھا۔ انھوں نے قدیم ماحول میں ہی تعلیمی سفر طے کیا؛ لیکن جدید ترین اداؤں سے جتنے وہ واقف تھے، کہا جاسکتا ہے کہ خاص جدید ماحول کے پروردہ کو بھی شاید اتنی ہمہ گیر و شمر آور واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ بہ یک وقت عبقری معلم، جلیل القدر مربی، بے نظیر مصلح، مفید تر اور انوکھے موضوعات کے مصنف، ہنرمند قلم کار و قلم کارگر، نئے سمنٹ کے صحافی و صحافی ساز، مدبّر عالم، منظم ذمّے دار، لدنی انجینئر و آرکیٹیکٹ، خوش نوا و پر جوش و سحر خیز مقرر اور فن کار و پرکار تعلیم یافتہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ماحول اور زمانے کے رویوں کو بہت دور تک، بہت واضح طور پر دیکھ لیتے تھے؛ اسی لیے کام کا خاکہ بنانے اور اس خاکے میں رنگ بھرنے میں، کسی ابہام کا شکار ہوتے تھے نہ الجھاؤ کا۔

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی

اُن کی تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی فتوحات و اکتسابات کی مَعْنَوِیَّت کو اگر مختصر لفظوں میں سمیٹا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں بے پناہ لینے کی صلاحیت تھی اور اُس سے زیادہ دینے کی، جو لیتا نہیں وہ کیا دے سکتا ہے، ”اُو خود کہ گم است کرارہ بری کند“ ایسے لوگ جو لینے دینے سے نا آشنا اور لا تعلق ہوتے ہیں وہ انسانی معاشرے کے لاخیرے افراد ہوتے ہیں، بے فیض اور گھامڑ۔ ہاں بہت سے لوگ صرف لینا جانتے ہیں، دینا نہیں جانتے، یعنی وہ اخذ و تحصیل کی مثالی لیاقت کی وجہ سے خود تو بڑے فاضل اور فائق بن جاتے ہیں؛ لیکن وہ فیضان نا آشنا رہتے ہیں؛ کیوں کہ وہ دینے کا سلیقہ نہیں سیکھ پاتے؛ لہذا اُن کا ابر سیاہ؛ بل کہ ابر سفید پانی سے لبریز ہونے اور بار بار گرجنے کے باوجود، برسنے سے رہ جاتا ہے۔ راقم الحروف کو علم و فکر کی دنیا کی بہت سی زندہ و مردہ عظیم ہستیوں کا علم ہے، جو اسی قبیل کے تھے۔ دوسری طرف بہت سے مُدَرِّسین و رجال تربیت و دعوت دیتے تو ہیں؛ لیکن بد سلیقگی، پھوہڑ پن اور بے ڈھنگے طریقے سے؛ اسی لیے انسانوں کو اُن سے فائدہ نہیں ہوتا اور لینے والے محروم اور شرم سار رہتے ہیں، ضیاع وقت کے سوا کوئی چیز انھیں ہاتھ نہیں آتی۔ زیادہ تر مُدَرِّسین، مُصلِحین، رجال تربیت اور رُعاۃ اسی زمرے میں آتے ہیں؛ اِس لیے وقت کا مُوَرِّخ اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ گویا وہ اپنی برادری میں ”عوام“ کے درجے میں ہوتے ہیں، تاریخ عوامی سطح کے لوگوں کو گھاس نہیں ڈالتی، وہ چنیدہ و برگزیدہ کو ہی منھ لگاتی ہے۔

معلوم سے مجہول تک رسائی کی غیر معمولی صلاحیت

حضرت مولانا کیرانویؒ نے مکتب، مدرسہ، اساتذہ، زمانہ، ماحول اور تجربے سے اِس سلیقے سے سیکھا کہ اِس سلیقے سے صرف اُنھی کی طرح کے گنے چنے علم و ہنر کے سُنار اور مستری سیکھتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے علم و آگہی کے سرمایے کی لیاقت کے ساتھ ”سرمایہ کاری“ کی اور غیر معمولی ”منافع“ کمائے، چنانچہ معلوم سے مجہول تک رسائی کے جو

دروازے، اُن پروا ہوئے وہ کم سعادت مندوں کے لیے واہوتے ہیں۔ اِس حوالے سے قارئینِ کرام کے لیے، صرف ایک مثال کافی ہوگی: عربی زبان کو زندہ و متحرک اور روزمرہ کے استعمال، نیز لکھنے بولنے کی زبان کی حیثیت سے اُنھوں نے باقاعدہ کسی اُستاد سے نہیں سیکھا؛ بل کہ اُنھوں نے چند خوشے ایک آدھ خرمَن سے اٹھالیے اور اپنی فطری صلاحیت، لینے اور اخذ کرنے کی حیرت انگیز لیاقت سے اور فکری ارتکاز پر بے نظیر طور پر عمل پیرا ہو کر اِس فن کے باکمال؛ بل کہ بے مثال فرد بن کر ابھرے اور دارالعلوم کی فضا میں ہمہ گیر انقلاب کے بانی ثابت ہوئے اور اُس کے حال و مستقبل کو اِس تعلق سے ماضی سے یکسر مختلف بنا دیا۔ اور چوں کہ دینی علوم کے حوالے سے دارالعلوم کو غیر معمولی وقار و اعتبار اور عوامی مقبولیت برصغیر میں حاصل ہے؛ اِس لیے عربی زبان کی ہمہ گیر ترویج و اشاعت کی جو فضا، اِس پورے دیار میں بنی، اُس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی؛ کیوں کہ یہاں جو صد بلند ہوتی ہے، وہ خدا کے فضل سے برصغیر میں سُو بہ سُو پھیل جاتی ہے اور اُس کی (دارالعلوم کی) برگزیدگی کی وجہ سے، وہ صد اِصراف مسموع نہیں رہتی؛ بل کہ معمول بہ ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا جس تعمیری، تخلیقی اور انقلابی ذہن کے ساتھ خلق ہوئے تھے، اُس ذہن کا انسان، کسی فن اور پیشے یا ڈیوٹی کو محض بے جان طریقے سے، روٹینی انداز میں انجام دینے پر بس نہیں کرتا، وہ کوئی بھی کام کرے، اپنے اندازِ کار، روح کی گرمی، فکر کی روشنی، تحن کی بلندی، راے کی پاکیزی، سوچ کے انوکھے پن اور اپنے عام رویے سے گرد و پیش پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ اُس پر چھا جاتا ہے اور بالآخر سارا ماحول اُسی کے پیچھے چلنے اور اُسی کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ کسی تعلیم گاہ میں بہت سے اساتذہ برسرِ عمل ہوتے ہیں؛ لیکن وہ اپنی جامعیت اور افادے کی ہمہ گیری کے بہ قدر ہی، طلبہ کے ذہنوں پر اثر انداز ہو کر اُنھیں اپنے سوچ کے دھارے پر ڈال پاتے ہیں۔ اساتذہ کی بڑی تعداد اور غالب اکثریت محض حرفِ علم کی تلقین کنندہ ہوتی ہے؛ اِسی لیے وہ اپنے

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

مستفیدین کے ذہنوں پر کوئی دیر پا اثر نہیں چھوڑ پاتی اور اُن کی زندگی میں کسی طرح کے انقلاب کا ذریعہ نہیں بنتی۔ ایسے معلمین احترام کا اپنا حصہ پانے کے باوجود، جوانوں کے دل و دماغ پر مُسلط نہیں ہو پاتے۔ یعنی آخر الذکر اول الذکر کو نمونہ عمل نہیں بناتے۔

کتابِ علم کے ساتھ،

کتابِ آدابِ حیات پڑھانے والا عبقری مُعَلِّم

حضرت مولانا کیرانویؒ کا صرف یہی امتیاز نہیں تھا کہ وہ مُتعلِّقہ کتاب یا مضمون کو، مُعاصرین و اقران سے زیادہ بہتر طریقے سے پڑھالیتے تھے اور ترسیل کی سحرانہ صلاحیت کے مالک تھے؛ بل کہ اُن کا یہ بھی عجیب و غریب کمال تھا کہ وہ کتابِ علم و مضمونِ فن کے ساتھ ساتھ کتابِ آدابِ حیات بھی پڑھادیتے تھے۔ طالبِ علم کو اُن کے سبق سے مُتعلِّقہ علم و فن کی مہارت کے ساتھ ساتھ، زندگی کے ہمہ گیر اصول و آداب، نتیجہ خیز داعی کی صفات، کامیاب مُعَلِّم کے کمالات، سچے مسلمان کی ذمے داریوں اور با مقصد انسان کے عزائم کا یہ خوبی نہ صرف علم ہو جاتا تھا؛ بل کہ عملی تربیت بھی ہو جاتی تھی۔ مُعَلِّم کیرانویؒ دیکھنے سننے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، سفر کرنے، ہم سفر بننے، مہمان بننے میزبانی کرنے، ملنے جلنے، ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، اجتماعی زندگی گزارنے، سبق سننے سبق پڑھانے، درجے میں آنے درجے سے جانے، سلام کرنے سلام کا جواب دینے، اصلاح قبول کرنے اصلاح کرنے، غم و خوشی کو برتنے، جلسہ یا میٹنگ کرنے، تقریر کرنے تقریر کو سننے، انتظامی ذمے داریوں کو نبھانے، کسی انجمن، ادارے یا مدرسے کو چلانے، تربیت دینے تربیت پانے، حتیٰ کہ دارالعلوم کے مطبخ سے روٹی لانے، دسترخوان سجانے اور اپنے بدن، کپڑوں اور ماحول کو صاف رکھنے وغیرہ جیسی سیکڑوں چیزوں کے اُصول و ضوابط کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، اُن کی ایسی مشق کرادیتے تھے کہ اُن کی تعلیم کو جذب کرنے والا سعادت مند طالبِ علم، زندگی کے کسی

شعبے میں کبھی بھی اور کسی جگہ بھی نامرا نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا طالب علم کی نشست و برخاست، حرکت و سکون، رفتار و گفتار، طرزِ عمل اور ہر قول و فعل میں اُس کے برتاؤ پر عقابانی نگاہ رکھتے۔ وہ نہ صرف اپنے درجوں کے طلبہ؛ بل کہ دارالعلوم کے سارے طلبہ کو، اپنے ہی طلبہ سمجھتے تھے اور اسی خفیہ سے اُن سے معاملہ بھی کرتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے سبق میں؛ بل کہ دارالعلوم کے کسی بھی طالب علم کی، کسی بھی جگہ، فہمائش سے چوکتے نہ تھے۔ کسی بھی طالب علم کی کج رفتاری اور ناروا گفتاری پر اُس کی قولاً یا فعلاً تادیب ضرور کرتے تھے۔ فعلاً میں تھپڑ رسید کرتے یا ضرب تادیبی کی کوئی بھی شکل اختیار کرتے۔ وہ ہماری طالب علمی اور تدریسی زمانے میں تنہا ایسے فرد تھے کہ دارالعلوم کے ماحول میں زبانی روک ٹوک کے علاوہ، ضرب تادیبی سے بھی کام لیتے تھے، اُن کے رعب داب نیز اُن کی تعلیمی و تربیتی بخشایشوں کی بے پناہی کی وجہ سے، اُنھیں جو برگزیدگی اور احترام حاصل تھا، اُس کی بنا پر کسی بھی سرکش اور بے ادب طالب علم کو بھی، اُن کے خلاف سرکشی کا کوئی رویہ برتنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

وہ لینے سے زیادہ دینے کے فن میں طاق واقع ہوئے تھے۔ کسی معلم کا یہ اعجاز ہوتا ہے کہ جو کچھ اُس نے سیکھا ہے اُس کو بہ آسانی دوسروں کو سکھا دے۔ مولانا کیرانوی کا یہ اعجاز در اعجاز تھا کہ وہ اپنے سیکھے ہوئے سرمایے سے زیادہ اور بہت زیادہ، اپنے سے سیکھنے والوں کو سکھا دیتے تھے اور بہت کم وقت میں اور بڑی سہولت کے ساتھ۔ نیز تعلیم اور اخذ کے لیے وہ تلامذہ میں ایسی صلاحیتیں تخلیق کر دیتے تھے، جن سے اُن کے لیے تعلیم کا عمل آسان اور شوق انگیز ہو جاتا تھا۔ مجھے بہت بار ایسا محسوس ہوا کہ وہ لینے سے ابا کرنے اور تعلیم سے پرہیز کرنے والوں کو بھی لینے کا رسیا اور تعلیم کا خوگر بنادیتے تھے۔ میں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں بعض خدارسیدہ اساتذہ گرامی سے سنا تھا کہ استاذ وہ نہیں جو کتاب اور مضمون پڑھا دے؛ بل کہ استاذ وہ ہے جو مَعْلَقَہ کتاب اور فن سے نہ صرف مُناسِبَت بل کہ عشق بے پناہ پیدا کر دے کہ طلبہ کو مَعْلَقَہ فن سے چین نہ ملے۔ مولانا

کیتاے زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

کیرانویؒ کو میں نے اس معیار پر جتنا تولا انھیں اس سے سوا پایا۔ بعض جہاں دیدہ اہل علم و نظر سے راقم نے سنا تھا: لَا يَكُونُ الْمُعَلِّمُ مُعَلِّمًا حَتَّى يَكُونَ مُلْهَمًا يَعْنِي كَوْنِي أَسَازُ أَسَازِ كَهْلَانِ كَا أَسَى وَتَمَسَّحُ هُوَ تَابِهٌ، جب وہ اُس منزل پر پہنچ جائے کہ اُس کو ”الہام“ ہونے لگے کہ کس مضمون کو کس طرح پڑھائے اور کس اُبھن کو کس طرح دور کرے اور کون سی بات کہاں کہے اور کون سا انداز کہاں اختیار کرے، دراز نفسی سے کب کام لے اور اختصار کا ہتھیار کب استعمال کرے؟ یہ اور اس کے سوا ہزاروں اور لاتعداد مسائل میں وہ ایسا ہنرمند واقع ہو کہ لگتا ہو کہ اُس نے کتاب اور اُس تاذ سے نہیں؛ بل کہ اپنے رب سے بہ راہ راست اخذ کیا ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ میرے علم و مطالعہ و تجربے کے مطابق مُعَاَصِرُ مُعَلِّمِينَ میں مکمل طور پر اسی معیار کے تھے، نہ صرف عجم میں؛ بل کہ عرب میں بھی کوئی اُس تاذ اس حوالے سے اُن کی ٹکڑ کا کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔

میں نے عرب و عجم کے بہت سے تعلیم کدے دیکھے ہیں، بڑے بڑے ماہرین تعلیم سے ملاقات کی ہے، چیدہ علما و مُفَكِّرِينَ سے تبادلہ خیال کیا ہے، بعض اساتذہ عرب سے، اُن کے درجوں میں اور حلقہ ہائے درس میں بیٹھ کر استفادے کا موقع بھی ملا ہے، ہندوستان کے مُتَعَدِّدِ پُرسوز اساتذہ سے میں نے پڑھا ہے، سلیقہ طریقہ سکھانے والے اُس تاذوں کے سامنے زانوئے تعلیم تہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے، سبھوں کے احترام کامل کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ مُعَلِّم کی خِفِّیَّت سے سبھوں سے فائق تھے۔ وہ دراصل مُعَلِّم ہی پیدا کیے گئے تھے، یہی اُن کا اصل جوہر تھا۔ اگر تقدیر الہی سے وہ اسی کے لیے سو ہو جاتے اور دگر لچپیوں نے اُن کے اوقات کار کا، تیاپانچہ، نہ کیا ہوتا اور وہ اس ”طبعی درد“ کے علاوہ دگر بہت سے درد کی پرورش میں نہ لگتے، تو آج کا بَرِ صغیر اُن کی تدریسی برکات اور تعلیمی و تربیتی تخلیقات سے اس طرح بھرا ہوا نظر آتا کہ چتے چتے پر اُن کے فیضان کو محسوس کیا جاسکتا تھا؛ لیکن سرمایہ وقت کی تقسیم کے باوجود، اُنھوں نے جو کچھ کیا اپنی کِفِّیَّت کے اعتبار سے آب دار مونی

کی طرح ممتاز اور دور سے چمکتا ہے۔

سچے اور کام یاب مُعَلِّم کا امتیاز

سچا اور کام یاب مُعَلِّم وہی ہو سکتا ہے جو اپنے نتیجہ عمل کو دیکھ کے اس طرح باغ باغ ہو جیسے کوئی باپ اپنے اکلوتے بچے کی ہنرمندی سے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اس معیار سے میں نے جتنی مرتبہ آنکا، وہ یکتا نظر آئے۔ مرحوم اپنے شاگردوں کی فرزانگی بالخصوص اُن کی علمی ترقی سے حد درجہ خوش ہوتے اور ہر جگہ تذکرہ کرتے، سراہتے، دعائیں دیتے اور فرماتے کہ مجھے اس سے بھی زیادہ تب خوشی ہوگی، جب وہ نہ صرف علمی؛ بل کہ دینی و دنیوی دونوں سطحوں پر شہرت و عزّت اور صلاحیت میں مجھ سے ہزار درجہ بڑھ جائے۔ یہ اُن کے سچے اور مخلص اُستاز ہونے کی دلیل تھی؛ ورنہ مجھے تدریسی زندگی کی راہوں میں بہت سے اُستاز کہے جانے والے، ایسے لوگ بھی ملے جو اپنے مَخدُودوں اور تلامذہ کی ترقی سے بہت نالاں نظر آئے، غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ مَخدُودوں کی ترقی سے اُن کی ترقی رک گئی ہے، یا اُن کے قد چھوٹے ہو گئے ہیں۔

ہمہ گیر عبقریت

حضرت مولانا کیرانوی عبقری مُعَلِّم تو تھے ہی؛ لیکن اُن کی عبقریت ہمہ گیر تھی۔ اُن کے سارے کارناموں میں انوکھے پن کا رنگ انتہائی شوخ تھا۔ وہ سرعت سے سوچتے، سرعت سے منصوبہ بندی کرتے اور بہ عجلت اُس کو عملی جامہ پہنانے کو اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اُن کے مخنّی جسم میں عجیب سا دماغ تھا، جو شعلے کے مانند روشن، شیشے کی طرح شفاف اور سیماب کی طرح بے تاب رہتا تھا۔ شاید وہ کسی لمحہ پرسکون نہ ہوتا تھا، ہمہ دم سوچتا اور خاکے بناتا رہتا تھا؛ اسی لیے انھیں جلدی اور گہری نیند کبھی نہیں آتی تھی، جس کی وجہ سے اُن کی صحّت پر قدرتا منفی اثر پڑتا تھا۔ منفی اثرات کی بے پناہ یلغار

کیتاے زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

سے ہی وہ بہ ظاہر بہ عجلت لقمہ اجل بن گئے، مگر اسباب کے ساتھ ساتھ اُن کی روشنی طبع بھی، اُن کے لیے بکراے جاں ثابت ہوئی۔ دنیا کے زیادہ سوچنے والے دماغ کے حامل لوگ اندر ہی اندر جلتے اور پکھلتے رہتے ہیں اور بالآخر بہ جلد اُن کا وجود تحلیل ہو جاتا ہے۔ مولانا بے چین طبیعت کے مالک تھے، اُن کے وجود کے دُبلے پتلے ڈھانچے میں اُن کا دماغ مشین کی طرح ہمہ وقت متحرک رہتا تھا، حتیٰ کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈتے رہتے اور تعلیم و تربیت کے نئے نئے انداز کی نقشہ گری کرتے رہتے تھے۔ وہ مثلاً تدریس کے دوران درجے میں طلبہ کو ”النادی الادبی“ کے سالانہ جلسے کے چار پانچ خاکے بتاتے، طلبہ اُن کے نرالے پن کی وجہ سے، اُن میں سے ہر ایک کو بہت پسند کرتے؛ لیکن مثلاً اُسی روز ”النادی“ کی رات کی میٹنگ میں دس بارہ اور نرالے اور پہلے خاکوں سے خوب تر خاکے پیش کر کے پوچھتے یہ کیسے رہیں گے؟ طلبہ کہتے: حضرت! یہ تو اُن سے بھی بہ درجہ ہابہتر ہیں، انھی کے مطابق سالانہ جلسے کی تیاری اور تقسیم کار کی جائے تو جلسہ لا جواب ہوگا۔

دفتر تعلیمات یا دفتر اہتمام میں، ناظم تعلیمات یا معاونِ مہتمم کے منصب پر برسرِ عمل رہنے کے زمانے میں کوئی مجلس مشورے کی کسی موضوع پر منعقد کرتے اور مُعَلِّقہ اساتذہ کو پہلے سے ایجنڈہ کی کاپی بھجوادیتے اور اُن سے خواہش کرتے کہ وہ مُعَلِّقہ موضوع پر مسائل کا حل سوچ کے آئیں۔ مجلس ہوتی تو مُعَلِّقہ مدعو حضرات تو غور و فکر کر کے آتے یا نہ آتے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریری طور پر مسئلے کے ہر جزو کے تعلق سے کئی کئی حل لکھ کے بھی لاتے، جو وہ اساتذہ اور مُعَلِّقہ لوگوں کی گفتگو سننے کے بعد، اُن کی طرف سے، خاطر خواہ جوابات پیش نہ کرنے کی صورت میں سناتے اور اُتنے ہی حل انھی مسئلوں کے زبانی بھی بتاتے، جو لکھے ہوئے سے علاحدہ اور اطمینان بخش وحیرت انگیز ہوتے، تو لوگوں کو خوشی بھی ہوتی اور تجلُّب بھی۔

دماغ کے ہمہ وقت مصروف کار اور ذہن کے ہمہ دم مائل بہ تخلیق ہونے کی وجہ سے

پس مرگ زندہ

ہی اُن کے لیے، کسی اچھی کتاب کا مطالعہ مشکل ہوتا تھا، وہ کتاب کے چند ہی صفحے پڑھتے کہ اُن کے دماغ میں مضامین، کتابوں، تدریسی اسباق، تحقیق کے نئے زاویوں اور طلبہ کے علمی، فکری، تربیتی مواعظ کے نئے نئے اور کارآمد خاکے اُبھرنے لگتے اور وہ کاغذ، قلم، پنسل، اسکیل اور ضروری لوازمات لے کر بیٹھ جاتے۔ اگر رات ہوتی، اُس کی پروا نہ کرتے پوری رات اسی اُدھیڑ بن میں رہتے کہ زیر مطالعہ کتاب کی عبارت، مضامین اور طرز نگارش سے کیا کیا فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اُن کے پاس صبح کو پہنچنے والے مُعَلِّقہ لوگوں کو علم ہوتا کہ اُنھوں نے رات بھر میں استفادے کے یہ نقشے مَرْتَب کیے ہیں اور اتنے سارے مضامین لکھ ڈالے ہیں، تو اُنھیں حیرت ہوتی اور اُن کی جان کا ہی پر رحم بھی آتا۔

کوئی مُدّس، طالب علم اور علمی شغل رکھنے والا وارڈ و صادر اُن کے پاس جاتا اور احوال واقعی سنانے کے بعد، اُن سے لکھنے پڑھنے کے حوالے سے مشورہ کرتا، تو مقالہ نویسی، تالیف کتاب اور عام مطالعہ و نگارش کے مُعْتَدِ داتے سلجھے ہوئے اور لائق عمل خاکے اُس کے سامنے پیش کر دیتے، کہ اُس کو دل چاہی مرادل جاتی اور وہ مچلنے لگتا اور سوچتا کہ کب اپنی منزل پر پہنچوں اور فوراً اُن خاکوں کے مطابق کام شروع کر دوں کہ یہ تو بہت آسان، بہت مفید اور بہت مرغوب ثابت ہوگا۔ مولانا صرف ”آوٹ لائن“ ہی نہ بتاتے؛ بل کہ کام کو عبور کرنے کے لیے پوری راہ کے نقوش بھی اُجاگر کر دیتے؛ لہذا راہی عمل بھٹکتا، نہ مَرّز دہوتا، نہ بھٹکنے کے اُنڈیشوں کا شکار ہوتا؛ بل کہ اُس پر سیدھا اور دوڑتا ہوا منزل تک پہنچ جاتا۔

آسانی اور خوش اُسلوبی سے دینے والا داتا

اُن کی عُبْقَرِیَّت کے خانے ہی میں یہ بات بھی آتی ہے کہ وہ لینے والے کو بڑی آسانی سے، بہت جلد اور انتہائی مختصر وقت میں مطلوبہ شے دے دیتے۔ اُن کے پاس دینے کے لیے نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا، دینے کا سلیقہ تھا، عطا کرنے کو بے تاب رہتے

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

تھے؛ لہذا بے غلت تمام، علم و فکر کی بھیک ”بھکاری“ کے ہاتھ میں ہوتی تھی؛ بل کہ بھکاری کے لیے مانگنا بھی شرط نہیں تھا؛ بعض دفعہ وہ ”بے نیاز بھکاری“ کو بھی عطا کر دیتے تھے اور عطیے کی قدر کرنے کا راز بھی باور کرا دیتے تھے۔ میں نے ۳۳-۳۴ سالہ تدریسی زندگی میں اور اُس سے قبل دس سالہ طالب علمی میں، بہت سے مدرسین کو پایا کہ وہ یا تو کچھ دے ہی نہیں پاتے تھے، یا اتنی دیر میں دیتے تھے کہ لینے والا، لینے سے ابا کرنے لگتا تھا، کوئی چیز جب سیدھے ہاتھ سے نہ دی جائے، گھما پھرا کے دی جائے، جیسے دینے والے کو دینے کا ارادہ نہ ہو، تو لینے والا اذہب جاتا ہے اور مطلوبہ شے کی گراں قدری، اُس کے لیے باعث کشش نہیں رہتی؛ بل کہ وہ سوچتا ہے کہ اس کا نہ لینا ہی بہتر ہے۔

یوں تو ہر آدمی منفرد اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی الگ شناخت کے حوالے سے، اپنی ساری کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ، لا جواب ہوتا ہے۔ معمولی ہو یا غیر معمولی، خواندہ ہو یا ناخواندہ، دین دار ہو یا بے دین، مسلم ہو یا غیر مسلم، ہر فرد بشر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے، درحقیقت کوئی انسان دوسرے انسان کا جواب اور اُس کا بدل یا اُس کی نظیر نہیں ہوتا؛ لیکن حضرت مولانا کیرانویؒ کو اپنے نام ”وحید الزماں“ کا جو وافر حصہ قدرت کے خزینے سے ملا تھا، اُس کی مثال آسانی سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ کاش انھوں نے ”مُخَالَفَتِ سَمْتِ“ میں پیرا کی نہ کی ہوتی اور ہوا کا رخ دیکھ کے ہی اپنی کشتی فکر و عمل کو کھیتے، تو آج علمی تحقیقات اور ”انسانی تصنیفات“ کی شکل میں اتنا بڑا ترکہ چھوڑ جاتے کہ لوگوں کے لیے اُس کا سمیٹنا مشکل ہوتا؛ لیکن شاید خالق کائنات کو یہ منظور نہ تھا، غالباً اُس کی یہی مرضی تھی کہ تاریخ دارالعلوم کا یہ بے مثال بشری ہیرا تراش، اتنے ہی ہیرے تراش کے، اپنی دکان بڑھادے اور دنیا کے سوچنے والے انسانوں کو، اس حوالے سے خدا کی حکمت اور قدرت، ہمیشہ حیران رکھے۔

ظاہر و باطن کی یکسانیت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ پکے مومن تھے، اُن کے ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی، اُن کی

پس مرگ زندہ

زبان پر وہی کچھ ہوتا جو دل میں ہوتا تھا۔ نفاق، دوہرے پن اور دورنگی سے بالکل دور تھے۔ ایسے آدمی کی آنت شیطانی نہیں ہوتی؛ لہذا وہ لمبی منصوبہ بندی، مصلحت اندیشی اور مفاد پرستی کی آلودگیوں سے بھی مُبرّا ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس فعل کے لیے جس طرح کی تہ داری، طویل المیعاد منفی سوچ اور بہ ظاہر نرم گفتاری اور بہ باطن سنگ دلی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اُس سے یکسر تہی مایہ ہوتا ہے۔ لہذا ”چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی“ کے نسخے پر عمل کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ زمانہ سازی، ابن الوقتی اور اپنی ذات کے لیے توڑ جوڑ، ہلاک بندی اور مُدّ لہنت، اپنے ضمیر کی مَخَالِفَت اور تَمَلُّق کے ناپاک؛ بل کہ ”نجس عین“ عناصر سے اُس کا خمیر بالکل مُنَزّہ ہوتا ہے؛ اس لیے ایسے مزاج کا آدمی عموماً ”لے دے“ کی پالیسی پر عمل کرنے کی سکت نہیں رکھتا اور ”منافع کی تقسیم“ کے بدلے، کسی بھی شرط پر صلح کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایسا انسان گھرا ہوتا ہے؛ اس لیے وہ ”سچائیوں“ کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کرتا اور وہ مُعاشرے کے کسی ایسے رویے پر (جس کو وہ اپنے نزدیک ”ناروا نا ہم واری“ تصور کرتا ہے) برا فروخت اور سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ وہ دوسرے کے دلوں کو اپنے دل سے ملانے کی ناکام کوشش کرتا ہے؛ لہذا سارے اخلاص کے باوجود نامراد رہتا ہے، پھر وہ جھنجھلاتا ہے، تلملاتا ہے اور غصے سے پھٹ پڑتا ہے، تو لوگ اُس کو غصیلّا اور غیر مَوْ اِزن کا نام دے دیتے ہیں۔ یعنی ردّ عمل کو عمل شمار کر کے اُس کو نہ صرف ناکارہ؛ بل کہ مجرم سمجھ بیٹھتے ہیں؛ حال آں کہ یہ صورت حال اُس کے احساسِ نامرادی و محرومی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان دودھ کا دھلا نہیں ہوتا، ظاہر ہے مولانا بھی اس گِلّے سے مستثنیٰ نہیں تھے؛ کیوں کہ وہ بھی انسان تھے؛ لیکن مولانا کے حوالے سے جو فضیلت و عظمت اور یکتائی و انفرادیت بیان کی گئی ہے، کسی شدید مُعاند کو بھی اُس کے انکار کی بھی جرأت ہوگی، جب وہ سورج کے نصف النہار میں طلوع ہونے کا منکر ہوگا۔

وہ عشق کی طرح بے پرواہ، محبت کی طرح خطر پسند، ایمان کی طرح بے نیاز،

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ
امید کی طرح حقائق، اور اخلاص کی طرح تملق نا آشنا تھے۔ ایسا انسان نایاب نہیں تو
کم یاب ضرور ہوتا ہے۔

ہوئی نہ عام، جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

جامعیت کا فیضان

مولاناؒ نے اپنی جامعیت کی وجہ سے پوری نسل کو ثقافتی، لسانی، تہذیبی، تعلیمی، تربیتی
اور فکری سطح پر جگادیا اور نسل در نسل کی بیداری کا انتظام کر دیا۔ بلاشبہ وہ دارالعلوم کی نشأت
ثانیہ کے بھی بانی تھے۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء کے دارالعلوم کے انقلاب (جو انقلابِ تاریخ
دارالعلوم کا بھی باعث بنا) کا اصل سہرا مولانا کیرانویؒ کے سر جاتا ہے، انھوں نے ہی اس
کی طرح ڈالی۔ وہی اصل سپاہی اور انجام تک لے جانے والے ”کوہ کن“ تھے، موجِ بلا
سے انھیں نے پیچہ آزمائی کی، تپیر سے انھیں نے کھائے، لہریں انھیں سے آکے ٹکرائیں، منجھ
دار میں وہی کودتے اور اچھلتے رہے، ہر مرض کی دوا جٹانے میں انھیں کی ”طبابت“ نے کام
دیا، طعن و تشنیع کا بہ راست محل بھی وہی بنے اور سب سے زیادہ گھائل بھی وہی ہوئے۔ وہ
بڑے مخلص سپاہی تھے، جس محاذ کو سر کرنے کی ٹھان لیتے، سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے، جو
اُن کے سلیم القلب ہونے کی علامت تھی۔ اللہ انھیں سارے مخلصانہ عمل کا بھرپور بدلہ عطا
کرے کہ وہ ہر ایک کے جہد و عمل کی حقیقت سے زیادہ واقف ہے۔

مزاج و سنجیدگی کا توازن

حضرت مولانا کیرانویؒ انتہائی کھلے دماغ کے آدمی تھے، ظریف الطبع، خوش
مزاج، خوش فکر، نکتہ آفریں، جملہ سخ، کشادہ قلب اور فیاض نفس۔ ساتھ ہی وہ حد درجہ
سنجیدہ و باوقار تھے۔ مذاق اور سنجیدگی کے بیچ کا دؤرانیہ اُن کے ہاں بعض دفعہ اتنا مختصر

ہوتا کہ گھلے ملے لوگ اور تلامذہ و مستفیدین انھیں بعض اوقات ایک قالب میں دو بالکل مختلف انسان باور کرتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کوئی مزاحیانہ جملہ استعمال کرتے ہوتے کہ اُسی وقت آن کی آن میں اُن پر کسی ناگزیر احساس کے تحت سنجیدگی طاری ہو جاتی، تو خردوں اور بعض دفعہ ہم عمروں کے لیے بھی، اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی۔ اُس وقت اُن کی سنجیدگی دیدنی ہوتی، اُن کے چہرے پر عجب سی تمکنت چھا جاتی، اُن کی آنکھیں مجلس کے کسی ایک رخ پر جم جاتیں، گہری خاموشی کا ماحول مجلس پر چھا جاتا، اُن کے ہونٹ ایک دوسرے پر اس طرح چپک جاتے جیسے وہ بالکل ہی تبسم نا آشنا ہوں۔ درحقیقت وہ زندگی کے سارے معاملات میں اپنی حد پر رہنے کے قائل تھے۔ حد سے تجاوز اُن کے نزدیک ناروا فعل تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور اساتذہ سے سنا تھا کہ کثرت مزاج سے وقار مجروح ہو جاتا ہے اور آدمی کا رعب داب جاتا رہتا ہے، اس اصول پر عمل کرتے ہوئے بہت سے لوگ از مہد تا لحد اپنے منہ کا زاویہ خراب کیے رہتے ہیں۔ ”اہل نظر“ کہتے ہیں کہ وہ جس دن ہنس پڑیں گے یا تبسم ریز ہوں گے کوئی بڑا واقعہ ضرور رونما ہو جائے گا، ہو سکتا ہے کہ قیامت بھی آجائے!۔ مجھے اپنی زندگی میں صرف مولانا کیرانویؒ ملے جو انتہائی خوش مزاج بھی تھے اور انتہائی سنجیدہ بھی اور دونوں مسئلوں میں اُن کے ہاں غیر معمولی توازن تھا، جس کی وجہ سے اُن کا کبھی وقار مجروح ہوا اور نہ اُن کے اعتبار اور رعب داب میں کمی آئی۔

کام کرنے اور کام لینے میں طاق

انھیں جتنا کام کا سلیقہ تھا، اتنا ہی کام لینے کا سلیقہ تھا۔ سابق پیش کار دارالعلوم بابو جی طاہر (متوفی ۲۸ شعبان ۱۴۲۲ھ = ۱۵ نومبر ۲۰۰۱ء) نے اس راقم سے کئی بار کہا کہ مولانا! میں گورنمنٹ کے محکموں میں کام کر چکا ہوں، اچھے سے اچھے اور خراب سے خراب افسروں سے سابقہ ہوا۔ زندگی کا بڑا دَوْر اِیّہ سرکاری مُکدّمات میں گزرا،

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنی خوش قسمتی سے دارالعلوم سے مجزا، یہاں بھی ہر طرح کے ذمے داروں سے سابقہ پڑا اور پڑتا رہتا ہے۔ میں بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ”افر“ ہونے کی جو صلاحیت حضرت مولانا کیرانویؒ میں ہے، میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ وہ کام اس طرح مرتب شکل میں دیتے ہیں کہ مجھے کام سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ چوں کہ وہ کام لینے کی وہی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس حوالے سے وہ طاق ہیں؛ اس لیے وہ متعلقہ کام کی ”آؤٹ لائن“ اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ یہ خوبی میں نے اب تک کسی میں محسوس نہیں کی۔ اگر مولانا کسی جدید ادارے سے وابستہ ہوتے تو سونے سے تولے جاتے۔ قدیم اداروں میں کام کرنے کے بعد، اُن کی بہت بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ یہاں قدر ناشناسی اور قدر تاشی کے ساتھ ساتھ حرف گیری اور شکوہ سنجی کا بڑا چلن ہے، جس کی وجہ سے کارکردگی کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور حوصلہ ساتھ نہیں دیتا؛ بل کہ سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

اُن کا مزاج تھا کہ وہ مُعینۂ وقت میں بہتر کام کے طالب ہوتے تھے۔ ذمے دار یوں کو پوری کروانے کے حوالے سے، بہ وقت ضرورت، قدرے سخت گیری سے کام لیتے؛ لیکن کام اچھا کرنے پر بڑی شاباشی دیتے۔ کام کی نزاکت اور اُس کو ہنرمندی سے انجام دینے کے بہ قدر، بعض دفعہ اتنی حوصلہ افزائی کرتے کہ کام کرنے والے کا دل اتنا بڑا ہو جاتا کہ اُس کو لگتا کہ وہ اب اُس کے سینے میں اپنی جگہ نہیں سما پارہا۔ ساتھ ہی اَلَاؤنس دلاتے، اپنی طرف سے بھی انعام دیتے اور اقدامی تحریقی کی شکل بھی پیدا کرتے۔ عام ذمے داروں کی عموماً یہ حالت ہوتی ہے کہ خود بھی وہ کام کرنے کے سلیقے سے نابلد ہوتے ہیں اور کام لینے کے فن سے بھی نا آشنا؛ اس لیے بڑے سے بڑا اور اچھے سے اچھا کام کرنے والا بھی، اُن کی طرف سے کسی ثنا کا مستحق نہیں ہوتا، حرف تعریف کی ادائیگی کے لیے، اُن کے سِلے ہوئے ہونٹ کبھی وا نہیں

ہوتے۔ اس سے کام کرنے والوں کا نہ صرف دل ٹوٹتا ہے؛ بل کہ کام کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کا دلولہ سرد پڑ جاتا ہے اور بالآخر گرد ہو جاتا ہے۔ کاش ذمے داروں اور افسران کو یہ بات معلوم ہوتی کی ماتحت لوگوں کو حوصلہ افزائی کے دہ بول سے کتنی خوشی ہوتی ہے اور اُن کے سامنے حوصلہ افزائی کا ایک جملہ کتنی دیر پا اور دور رس اِئرجی کا کپسول ثابت ہوتا ہے۔

کام تو کام کرنے سے ہی آتا ہے

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہت کثرت سے فرماتے تھے کہ کام تو کرنے سے آتا ہے، صرف ارادے سے نہیں آتا۔ وہ اپنے نواآموز فُضلاً؛ بل کہ زیرِ تعلیم طلبہ کو تالیف کُتب، تحریرِ مقالہ اور اِدارتِ رسالہ کی ذمے داری بلا تکلف سونپ دیتے۔ اگر وہ گھبراتے تو بے پناہ حوصلہ افزائی کرتے۔ اُن میں سے کوئی کام کر کے لاتا تو مُسَوِّدے پر ادھر ادھر نظر ڈال کے فرماتے: واہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، بھئی! آپ نے تو تَوَقُّع سے بھی زیادہ اچھا لکھا ہے۔ اب آپ یہ کیجیے کہ اُستاذ، ناقد؛ بل کہ مُعَاوِذ بن کر اس پر نگاہ ڈال لیں۔ آپ اس میں جتنی زیادہ غلطیاں نکالیں گے، میرے نزدیک اُسی درجہ لائق و فائق، قابلِ حوصلہ افزائی اور مُستَحَقِّ قدردانی ثابت ہوں گے اور میں یہ سمجھوں گا کہ آپ واقعی بڑے سے بڑا مشکل تالیفی و تحقیقی کام کر سکتے ہیں۔ اب وہ غلطیاں نکال کے لاتا، تو فرماتے: کیا خوب، بھئی! آپ کی نظر تو بڑی گہری ہے، ان میں سے بعض غلطیوں تک تو میرا ذہن بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا آخری نظر ڈال کر تحریر کو چھپنے کے لیے صادر کر دیتے تھے۔

جمعیتِ علمائے ہند کے ”الکفاح“ میں (جس کے وہ مونس اور چیف ایڈیٹر تھے) اور اُس کے قبل دارالعلوم میں ”النادی“ کے طلبہ کے دیواری رسالوں میں نئے فضلاء اور طلبہ سے کام لیتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سی غلطیاں زبان و قواعِد وغیرہ کی ہوتیں۔

یکتا زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی

لوگ آپ سے اس بات کی شکایت کرتے، تو آپ فرماتے: بھئی! ان غلطیوں سے زمین و آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، دیکھیے دنیا اب بھی قائم ہے۔ انھیں کام کرنے دیجیے، ایک دن بہ جلد ایسا آئے گا کہ آپ کو ان کے کام میں کوئی غلطی نظر نہیں آئے گی۔ کسی بھی میدان کے نئے راہی ضرور ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کام کرنے سے ہی کام میں پختگی آتی ہے، انھیں مایوس کر دیا جائے گا تو تھک ہار کے بیٹھ جائیں گے، پھر لائق آدمی کس طرح تیار ہوں گے؟ آدمی شروع سے لائق نہیں ہوتا، پہلے ”نالائق“ ہوتا ہے، پھر کام کرنے سے لائق ہو جاتا ہے۔

نوجوانوں کی تعمیر میں اُن کا طریقہ کار

نوجوانوں کی تعمیر میں اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ خود اعتمادی کی روح پھونکنے کے ذریعے، زیادہ سے زیادہ کام لیتے تھے۔ وہ طلبہ کی غلطیوں پر کبھی انھیں اس طرح نہیں ٹوکتے تھے جس سے حوصلہ پست ہو۔ اسی طرح طلبہ کو بات ماننے کا بہت عادی بناتے تھے۔ فرماتے تھے ذہانت ثانوی بات ہے، پہلی اور بنیادی صفت طلبہ کی یہ ہے کہ اُن میں اطاعت محض کا جذبہ ہو، جس میں یہ صفت جس درجہ ہوگی اُسی درجہ وہ کام یاب ہوگا اور جو جتنا اس سے تہی دامن ہوگا اُسی قدر نامراد ہوگا۔ جس طالب علم میں شروع سے یہ صفت ہوتی، اُس کی مزید افزائش کا انتظام کرتے اور جس میں نہ ہوتی اُس میں مختلف طریقے سے پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ درجے میں سبق کے دوران طلبہ سے ”ترکیز“ Concentration یعنی متعلقہ مسئلوں اور شرح درس کے تعلق سے ذہنی جماؤ اور بیداری پر بہت زور دیتے تھے؛ کیوں کہ اخذ و تحصیل کی اصل کلید ترکیز ہی ہے۔ ترکیز کی صلاحیت کی بیداری کے لیے بھی بہت سے محركات سے کام لیتے، کبھی یک بہ یک پوچھتے کہ میں کیا کہہ رہا تھا؛ کسی غافل طالب علم پر کوئی ظریفانہ جملہ چست کر دیتے؛

پس مرگ زندہ

کبھی دینی تازگی کا کوئی حکیمانہ عمل اس طرح کرتے کہ عدم تریز کی کوئی گنجائش، کسی کے لیے باقی نہ رہتی۔

ساحرانہ طرزِ تکلم

حضرت مولانا کی ایک بڑی خوبی، اُن کا طرزِ تکلم اور اندازِ مخاطب تھا۔ وہ عام مجلس میں گفتگو کرتے، یا جلسے میں تقریر کرتے، یا طلبہ کو پڑھاتے، یا کسی مسئلے کے تعلق سے اُنھیں سمجھاتے، یا گھر کے لوگوں سے روزمرہ کی گفتگو کرتے؛ اُن کی بات حسو وزائد سے پاک، انتہائی مُرتب، تکیہ کلام کی بیہودگی سے مُبرا ہوتی۔ مخاطب کو ایسا محسوس ہوتا کہ اُنھوں نے سوچ سمجھ کے لکھ کر، رٹ کر یہ گفتگو یا تقریر کی ہے۔ طرزِ ادا میں ٹھہراؤ، جماؤ ہوتا، آواز صاف شفاف اور پر جوش ہوتی۔ مخاطب متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتا تھا؛ بل کہ اکثر دفعہ مرعوب ہو جاتا تھا۔ اگر اُنھیں دارالعلوم کی مُعاصر تاریخ میں اس اندازِ تکلم کا امام قرار دیا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔ ناچیز راف نے اسلاف دارالعلوم کو دیکھا اور سنا نہیں ہے؛ اس لیے حضرت مولانا کیرانویؒ کا کسی سے مؤاذنہ نہیں کر سکتا؛ مگر یہ مجھے کہ مخاطب کو قائل کرنے اور اُس سے اپنی بات منوانے کا جوفن، اللہ نے اُنھیں عطا کیا تھا، اُس میں مُعاصرین میں کوئی اُن کا شریک نہ تھا اور اس وقت تو کوئی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

وہ جب کسی موقع سے دارالعلوم میں کسی جگہ یک بہ یک تقریر شروع کر دیتے، تو طلبہ اپنے کمروں سے اپنی اُسی حالت میں بھاگے چلے آتے، جس میں وہ ہوتے تھے، لگتا تھا کہ طلبہ کے جذبات و خیالات کو اپیل کرنے والی تقریر کے لیے صرف وہی پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے چیتے جی اُن کے سوا طلبہ کو مطمئن کرنے کا کام کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر کسی موقع سے وہ کسی جلسے میں نہ ہوتے اور طلبہ سے متعلق کوئی بات کرنی ضروری ہوتی، تو طلبہ صرف اُنھی کو تلاش کرتے۔

دستِ قدرت کے تراشیدہ

حضرت مولانا کیرانوی نستعلیق، دستِ قدرت کے تراشیدہ انمول پیس Piece لگتے تھے: اُن کا طرزِ پوشش، لباس کی صفائی ستھرائی، رہائش گاہ کی ترتیب، رفتار و گفتار، سچ و جھج، زندگی جینے اور برتنے کے اُن کے سارے آداب و اُصول لائق ستائش اور قابلِ تقلید اور باعثِ ریکارڈ تھے۔ زندگی کے اُن کے بہت سے ضوابط پر ایسا لگتا تھا کہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مُرتبی: حکیم الامتِ مجددِ اَلْمِلَّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ و رَا اللہ مرقدہ (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ = ۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) کی ہدایات کی روشنی پڑی ہو؛ حال آں کہ حضرت کیرانویؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ (۱۲۹۵-۱۳۷۷ھ = ۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) کے شاگرد اور انھیں کے خوشہ چیں تھے۔ حضرت تھانویؒ کو انھوں نے دیکھا نہ اُن سے فیض پایا اور مشاغل کی اُس نوعیت کی وجہ سے، جو اُن کے لیے مُقَدَّر ہوئی، اندازہ یہی ہے کہ حضرت تھانویؒ کی تربیتی کتب: مواعظ و مجالس و ملفوظات وغیرہ کے پڑھنے کا انھیں وقت نہیں ملا ہوگا؛ لیکن اُن کے خاندانی ماحول، والدین کی تربیت، اُن کے شریفانہ گھرانے کی روایت، اساتذہ کرام کی نگاہ کا پلٹ اور اپنی ذات کی تعمیر و تہذیب میں اُن کی محنت پیہم، نے انھیں ایسا تراشا تھا کہ ربِ کریم کے طفیل سے انھیں اپنے ہم عصروں میں یکتائی و اِنْفِرَادِیَّت کا طمعہ امتیاز حاصل تھا، جس پر معاصرین کو رشک تو آتا تھا؛ لیکن انھیں غالباً اُن سے حسد کرنے کی سکت نہیں تھی؛ کیوں کہ دل کی گہرائیوں میں وہ بھی اِس حوالے سے اُن کے استحقاقِ کَلّی کے قائل تھے؛ بل کہ بہت سے شریفِ معاصرین تو زبان سے بھی اِس سچائی کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

جدید و قدیم طبقتوں میں یگانہ

حضرت مولانا علمائے دین کی مجلسوں میں ہی نہیں؛ بل کہ جدید تعلیم یافتہ دانش

پس مرگ زندہ

وروں کی بزم میں بھی اپنی نشست و برخاست سے یگانہ لگتے تھے؛ لیکن بے گانہ اور اجنبی محسوس نہیں ہوتے تھے کہ وہ جدید ترین ”روشن خیالوں“ سے بھی زیادہ جدت آشنا اور تہذیب و تمدن کے نام نہاد دعوے داروں سے کہیں زیادہ جدیدیت کے آداب سے واقف اور حدود و شریعت میں اُن پر عامل تھے۔

حضرت کیرانویؒ اِس دنیا میں نہیں؛ لیکن اُن کی تعلیم و تربیت کی فیض رسانی ان شاء اللہ باقی رہے گی اور آئندہ نسلیں، اِس سے فائدہ اٹھاتی اور اُنھیں دعائیں دیتی رہیں گی۔ ناچیز رافتم نے ”وہ کوہ کن کی بات“ میں اُن کا مختصر مگر جامع خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید معلومات کے لیے اُس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ایک نظر میں

✽ نام: مولانا وحید الزماں بن مولانا مسیح الزماں بن قاضی مولانا محمد اسماعیل بن قاضی مولانا محمد حسین بن قاضی غلام حسین بن قاضی قلندر بخش بن قاضی محمد ظہیر الدین بن قاضی محمد زمان بن قاضی شیخ حسن بن قاضی علی احمد بن قاضی محمد عبدالنبی بن خواجہ قاضی احمد بن خواجہ محمد بن خواجہ نظام بن قاضی شمس الدین بن خواجہ علاء الدین مدنی (وارد ہندوستان در قصبہ ”کیرانہ“ ضلع ”مظفرنگر“ صوبہ ”یوپی“) بن خواجہ ظہیر الدین بن خواجہ قوام الدین بن خواجہ بدر الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ قطب الدین بن خواجہ تاج الدین (اُن کے دولڑکے تھے خواجہ شرف الدین، جو انصاریاں قصبہ ”ابھٹہ پیر زادگان“ ضلع ”سہارنپور“ صوبہ ”یوپی“ کے مؤرخ اعلیٰ تھے، دوسرے خواجہ قطب الدین جو انصاریاں قصبہ ”کیرانہ“ ضلع ”مظفرنگر“ کے جد اعلیٰ تھے) بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ اسماعیل عبداللہ ہراتی بن خواجہ ابو منصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ علی بن خواجہ جعفر بن ابو منصور بن ابوالیوب انصاری: صحابی رسول ﷺ۔

✽ تاریخ پیدائش: ۱۷/ فروری ۱۹۳۰ء (۲۷/ شوال ۱۳۴۹ھ) (See p 35)

✽ مقام پیدائش: قصبہ ”کیرانہ“ ضلع ”مظفرنگر“ صوبہ ”یوپی“۔

ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، دادا، پردادا سب حضرات عالم دین تھے اور آپ کی

یکتاے زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی

داوی، نواب قطب الدین مصنف ”مظاہر حق“ کی نوای تھیں۔

✽ ابتدائی تعلیم: مدرسہ عربیہ جامع مسجد کیرانہ میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں بہ غرض تعلیم حیدر آباد گئے اور ایک سال قیام رہا؛ لیکن تقسیم ہند کی بنا پر تعلیم کا کوئی نظام نہیں بن سکا۔

✽ ۱۹۳۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔

✽ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔

تعلیم کے دوران ممتاز طلبہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ زمانہ تعلیم میں عربی زبان کی اشاعت کے لیے ”سلسلۃ الذرؤس العریۃ“ کے نام سے اسباق لکھ کر آویزاں کرتے تھے اور طلبہ کو مشق بھی کراتے تھے۔ دارالعلوم میں آنے والے عربی مہمانوں کے استقبال اور سپاس نامے وغیرہ لکھنے کا کام آپ ہی انجام دیتے تھے۔ مختلف جلسوں میں عربی مقالے بھی پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے عربی کے تحریری کام بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔ پانچ سال تک تمام کتابوں میں اعلیٰ نمبرات حاصل کیے اور خصوصی انعامات بھی۔ امتیازی حیثیت کی بنا پر دارالعلوم کی جانب سے پندرہ روپے ماہانہ خصوصی وظیفہ بھی جاری کیا گیا۔ زمانہ طالب علمی میں جمعیۃ الطلبہ کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔

✽ فراغت کے بعد مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رئیس الاحرار مرحوم (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) کے پرائیویٹ سکریٹری رہے اور ان کے ساتھ بڑی بڑی سرکاری ضیافتوں میں شریک ہوئے۔

✽ ۱۹۵۶ء میں ۹۱ افراد پر مشتمل ایک سرکاری خیر سگالی وفد (گڈول مشن) سعودی عرب گیا۔ آپ اس میں بہ حیثیت ایک ترجمان ممبر کے شامل تھے۔

✽ سعودی عرب سے واپسی کے بعد محمد احمد کاظمی مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی کتاب ”تقسیم ہند اور مسلمان“ کا ”تقسیم الهند والمسلمون في الجمهورية الهندية“ کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔

✽ اسی زمانے میں مختلف موضوعات پر سات کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: (۱) آخرت کا سفر نامہ (۲) شرعی نماز (۳) انسانیت کا پیغام (۴) اچھا خاوند (۵) اچھی بیوی۔

✽ اسی دوران ”القاموس الجدید“ اردو عربی ڈکشنری کی تکمیل کی۔

✽ ۱۹۵۹ء میں دیوبند میں ”دار الفکر“ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت عربی اور انگریزی زبان کی کلاسیں جاری کی گئیں اور ماہ نامہ ”القاسم“ بھی اسی ادارے سے جاری کیا گیا، جو کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ اسی ادارے سے ”القاموس الجدید“ اردو عربی ڈکشنری پہلی بار شائع ہوئی۔

پس مرگ زندہ

✽ ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت استاذ عربی تقرر ہوا (آپ نے اس کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی؛ بل کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب اور علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ نے از خود تقرر کیا تھا) ایک سال بعد استقلال کے ساتھ درجہ وسطیٰ (ب) میں آپ کا نام درج کیا گیا۔

✽ ۱۹۶۵ء میں سہ ماہی مجلہ ”دعوت الحق“ کا اجرا عمل میں آیا اور آپ کو اس کی ادارت سپرد کی گئی۔

✽ چند سال بعد درجہ وسطیٰ (الف) میں ترقی دی گئی۔

✽ ۱۹۷۵ء میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی اور ۱۹۷۶ء و ۱۹۷۷ء میں عربی زبان و ادب کے ساتھ

حدیث کی دو مشہور کتابوں طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی دیا۔

✽ ”دعوت الحق“ کے بند ہو جانے کے بعد پندرہ روزہ ”الداعی“ (تاسیس جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ

مطابق جون ۱۹۷۶ء) کی سرپرستی کچھ عرصے تک سپرد رہی۔

✽ دارالعلوم میں تدریس کے دوران ”النادی الادبی“ کے نام سے طلبہ کی ایک عربی انجمن قائم کی، جس

سے ہر سال تقریباً تین سو طلبہ وابستہ ہو کر، عربی زبان کی تقریری اور تحریری مشق کرتے تھے۔ اس کے تحت

بہت سے قلمی پرچے بھی نکالے گئے اور اس کے ذریعے طلبہ کو علمی پروگراموں کے ساتھ، انتظامی امور کی بھی

ترتیب دی گئی۔

✽ اسی عرصے میں ”القاموس الجدید“ عربی اردو ڈکشنری اور ”القرآن الواضح“ کے تین حصے اشاعت

پذیر ہوئے۔ واضح رہے کہ القاموس الجدید (اردو عربی اور عربی اردو دونوں) اور ”القرآن الواضح“ کو غیر

معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، آخر الذکر کتاب بہت سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں داخل

نصاب ہے۔

✽ ۱۹۷۷ء میں جمعیت علمائے ہند کے ایک سہ رکنی وفد کی سربراہی کرتے ہوئے متحدہ عربی ممالک

(سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات وغیرہ) کا دورہ کیا۔ ایک طویل عرصے تک آپ جمعیت علمائے

ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور اس کے پندرہ روزہ عربی اخبار ”الکفاح“ کے چیف ایڈیٹر رہے۔ اس کے

علاوہ جمعیت کے تصنیفی شعبے ”مرکز دعوت اسلام“ کے ڈائریکٹر بھی رہے، جو آپ ہی کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا۔

اس شعبے نے متعدد علمی اور اصلاحی کتابیں شائع کیں۔

✽ ۱۹۸۰ء میں اجلاس صد سالہ کے لیے فراہمی مالیات کے سلسلے میں مشرقی یوپی کے اضلاع کا کام

یاب دورہ کیا۔

یکتے زمانہ حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی

✽ اجلاس صد سالہ کی تیاری کے لیے بنائی گئی کمیٹیوں کا آپ کو کنوینر مقرر کیا گیا، نیز دارالعلوم کی تزیین و ترمیم اور تعمیر جدید کا کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ آٹھ ماہ کے عرصے میں دارالعلوم میں ہر چہار جانب بوسیدہ اور اور مرمت طلب عمارتوں کی اصلاح و ترمیم ہوئی اور بے شمار جدید تعمیرات ہوئیں، جیسے قدیم مسجد کا صدر دروازہ، دارالعلوم کے صدر دروازے کی بالائی منزل کی تعمیر، احاطہ کتب خانہ کا دو منزلہ برآمدہ، دفتر تعلیمات، دار جدید کی بالائی منزل کے بہت سے کمرے، دارالحدیث فوقانی کی دائیں اور بائیں جانب دو درس گاہیں اور ان کے سہ طرف برآمدے اور اس طرح کی مختلف تعمیرات۔

✽ اجلاس صد سالہ کے عین موقع پر ذیابیطس کے مرض کی شدت اور شب و روز محنت و شب بیداری کے نتیجے میں شدید بیماری کا حملہ ہوا، جس کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ اسٹیج کا ذمہ دار اور اناؤنسر بھی آپ ہی کو بنایا گیا تھا۔

✽ اجلاس صد سالہ کے اختتام پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے دارالترتیب کی تعمیر اور اس کے نظام کار کو مرتب کر کے چلانے کا کام بھی آپ کے سپرد فرمایا۔ اس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر نے دس لاکھ کی رقم عنایت کی تھی۔ اس کے بعد دارالعلوم کے حالات اندرونی طور پر بگڑنے شروع ہوئے، جس نے رفتہ رفتہ انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔

✽ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم کے دوبارہ کھل جانے کے کچھ عرصے بعد ۱۹۸۳ء میں آپ کو ناظم مجلس تعلیمی بنایا گیا اور اسی سال آپ نے (مارشلس) ری یونین، انگلینڈ، مصر اور پیرس کا سفر کیا۔

✽ ۱۹۸۵ء میں آپ کو معاون مہتمم بنایا گیا۔ اس زمانے میں بہت سی نئی تعمیرات اور دفتری نظام کی اصلاح، طریقہ کار میں پھرتی اور تیز رفتاری اور نظام تعلیم میں پختگی پیدا کرنے جیسی بہت سی نمایاں انتظامی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان کے بعض علاقوں سے مالیات کی فراہمی کا کام بھی کیا۔ پندرہ روزہ ”آئینہ دارالعلوم“ کا اجرا کیا۔

✽ ۱۹۸۷ء میں معاون مہتمم کے عہدے سے استعفادے کر تدریس پر واپس آ گئے۔

✽ دارالعلوم کی انتظامی ذمے داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد، ۱۹۸۸ء میں ”ذوالمؤکلفین“ کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے نے نوجوان فضلاء دارالعلوم کی تصنیفی رفاقت حاصل کی اور نامساعد حالات اور کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود، دو سال کے عرصے میں تقریباً دو درجن کتابیں شائع کیں۔ نیز اسی دور میں سابق ”القاموس الحدید“ اردو عربی اور عربی اردو میں گراں قدر اضافہ کیا۔

پس مرگ زندہ

✽ ۱۹۸۸ء میں دہلی میں منعقد ملی کنونشن میں ”ملتی جمعیۃ علما ے ہند“ کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو بہ اتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

✽ ۱۹۹۰ء میں مجلس شوریٰ نے تدریسی ذمے داریوں سے سبک دوش کر کے آپ کو کنونشن دینا منظور کیا۔

✽ ۱۹۹۰ء میں ہی وزارت حج و اوقاف سعودی عرب کی دعوت پر، حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔

✽ جنوری ۱۹۹۲ء میں وزارت اطلاعات و نشریات کویت کی طرف سے منعقدہ عالمی اسلامی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

✽ اسی سال مرکزی جمعیۃ العلما کے صدر منتخب ہوئے۔

✽ ۱۹۹۳-۱۹۹۴ء میں ایک ضخیم قلموس ”القاموس الوحید“ بڑے سائز کی ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل تالیف فرمائی۔

● اسی دوران مفتی محمد شفیع صاحب کی ”معارف القرآن“ سے اہم علمی و تحقیقی مباحث کو کئی جلدوں میں ”جواہر المعارف“ کے نام سے جمع فرمایا، جس کی ایک جلد چھپ چکی ہے۔

✽ ۱۹۹۴ء میں قرآن پاک کے اردو ترجمے کا آغاز فرمایا۔

✽ ۱۹۹۵ء میں مشکاة شریف سے اخلاق و آداب و معاشرت پر مشتمل حدیثوں کا ایک قیمتی مجموعہ مرتب فرمایا۔

✽ تقریباً تمام ہی عربی ملکوں کا وقتاً فوقتاً دورہ فرمایا اور وہاں کی دعوت پر کانفرنسوں اور مجالس علمی میں شرکت فرمائی۔

✽ بہت سے مدرسوں میں عربی زبان کے شعبوں اور ادبی انجمنوں کے سرپرست رہے۔

✽ اُن کے شاگرد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جامعات و مدارس میں اساتذہ یا جماعتوں اور اداروں کے قائدین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

✽ اُن کے بعض شاگرد برصغیر کے نامور اہل قلم اور عربی و اردو زبان و ادب کے مسلم ادیب اور مصنف کی حیثیت سے اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں۔ (*)



(*) بروز یک شنبہ، اربعہ بدعت ظہر ۲۱/رمضان ۱۴۲۷ھ = ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء (بدراور راست اردو میں لکھا گیا)۔

مؤرخ، محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

۱۳۳۲ھ/۱۹۱۶ء — ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز
خدا کی دین ہے سرمایہٴ غم فرہاد

کئی ماہ سے، مبارک پور اور دیارِ اعظم گڑھ سے آنے جانے والوں کے ذریعے، مسلسل یہ خبر ملتی رہی کہ مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر صاحب مبارک پوری ربین فراش ہیں۔ انھیں ناک میں کوئی تکلیف تھی جس کا آپریشن کرایا تھا۔ آپریشن کی وجہ سے نقاہت و اضمحلال پیدا ہو گیا، جو عرصے تک انھیں اپنی گرفت میں لیے رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہو گئے ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ وہ بخار و غیرہ میں مبتلا ہیں، کم زوری کافی بڑھی ہوئی ہے؛ تا آن کہ یہ خبر صاعقہ اثر سننے کو ملی کہ تحقیق و مطالعہ، تصنیف و تالیف، صحافت و تدریس اور تعلقاتِ عرب و ہند کے صحرائے ناپیدا کنار کاراہی پر شوق؛ بل کہ مجنونِ حوصلہ بہ دوش؛ یک شنبہ ۲۷ صفر ۱۴۱۷ھ = ۱۳ جولائی ۱۹۹۶ء کا دن گزار کر شبِ دو شنبہ: ۲۸/۲/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۵/۷/۱۹۹۶ء کو ٹھیک ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر دارِ فانی سے؛ جو ہم سبھی انسانوں کی سر اے ہے؛ دارِ آخرت کو؛ جو ہم سبھوں کا آخری ٹھکانا ہے؛ سدھار گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

ناقابلِ پُر خلا

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نہ صرف بڑے صغیر، بل کہ اسلامی دنیا کے کثیر التالیف اہل تحقیق مورخوں کی صف میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے؛ جس کا اس دورِ قحط الرجال میں، بہ ظاہرِ حال پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خداے قدیر، ہر چیز پر قادر ہے؛ لیکن عرصے سے یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ میدانِ علم و عمل اور فضل و کمال کا جو یکتاے روزگار بھی رخصت ہو جاتا ہے؛ اُس کی جگہ خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے؛ بالآخر ”کام چلاؤ“ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب نے، طویل و صبر آزا مطالعے پر مبنی گراں مایہ تصنیفات سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا اور عرب و ہند کے تعلقاتِ دیرینہ کے اچھوتے موضوع پر؛ تفصیل، دقیقہ رسی اور جامعیت کے ساتھ عہد بہ عہد کام کیا؛ ہزاروں صفحات پڑھے اور چینی کے منہ سے شکر جمع کرنے کے عمل کے ذریعے، کئی عدد ضخیم کتابیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تصنیف کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا یہ کام علمی دنیا پر؛ رہتی دنیا تک کے لیے لائقِ ہزار شکر ہے؛ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی دیوبندی دہلوی متوفی ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء؛ جنھوں نے اپنے ”ندوۃ المصنفین“ دہلی سے؛ قاضی صاحب کی اہم ترین تاریخی کتابوں کو خصوصی دل چسپی کے ساتھ شائع کیا تھا؛ ”خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان“ کے پیش لفظ میں، بہت ہی خوب صورت اور معنی ریز جملوں میں؛ قاضی صاحب کی محنت اور انتھک تلاش و تحقیق کی داد دی اور لکھا کہ: ”اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے“

اُن کا یہ تاریخی سلسلہ؛ جس میں ”عرب و ہند عہدِ رسالت میں“ ”خلافتِ راشدہ اور ہندوستان“ ”خلافتِ امویہ اور ہندوستان“ ”خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان“

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

اور ”ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں“ سرِ فہرست ہیں؛ بہت مقبول ہوا اور اردو عربی دونوں زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

قاضی صاحب کی شناخت

تحقیق و مطالعہ طلب اور شب و روز کی محنت کی متقاضی تاریخی و اکیڈمک تصانیف کی تالیف؛ قاضی صاحبؒ کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ سرسری مضامین لکھنے پر قادر نہ تھے؛ کیوں کہ وہ سطحی تالیفات و نگارشات کی آلودگیوں سے پاک دامن، ہندوستانی مولفین کے قافلہ قابلِ رشک کی باقیات میں سے تھے۔ اسی وجہ سے اپنی بے سروسامانی، سادگی، شہرت سے دامن کشی اور کاروانِ نعرہ زن سے بیگانہ رہنے کے باوجود؛ عالم گیر شہرت نے، اُن کے قدم چومے اور ہمہ گیر نیک نامی نے اُن کی بلائیں لیں۔ بالخصوص عرب دنیا میں وہ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے دین و ملت؛ جس کے وہ ایک قابلِ افتخار فرزند تھے، کے ساتھ ساتھ، اپنے اُس ملک کے لیے بھی نیک نامی کا ذریعہ بنے؛ جو اب مسلمانوں کے تئیں ناشکری کی تمام حدیں پھلانگتے پرتلا ہوا ہے۔

قابلِ رشک حد تک، اپنے کو بڑا بنانے کا ہنر رکھنے والے

قاضی اطہر مبارک پوریؒ اس بات کی تابِ ناک مثال تھے کہ انسان اپنے آپ کو؛ تنگ دستی و عسرت کے باوجود اور ”چھوٹی جگہ“ میں رہ کر؛ اپنی محنت و جہاں فشانی اور بلند ہمتی کے ذریعے قابلِ رشک حد تک بڑا بنا سکتا ہے۔ اُنھوں نے حقیقی بڑائی، پائے دار نام وری اور قابلِ قدر مقام و مرتبے کے عناصرِ مطلوبہ؛ اپنے چھوٹے سے گم نام مدرسے بہ نام احیاء العلوم مبارک پور اور اپنے محدود ماحول والے ایسے قصبے میں حاصل کر لیے؛ جو مروجہ مفہوم میں ”تہذیب و تمدن کی روشنی“ سے محروم اور کسی ایسی قابلِ ذکر علمی

پس مرگ زندہ

و ثقافتی سرگرمی سے نا آشنا تھا؛ جو عالمِ اسلام کے علمی پایہ تختوں کا امتیاز رہا ہے۔ جیسے حجاز، دمشق، قاہرہ، بغداد، فارس، رباط، دہلی اور دیوبند وغیرہ۔ مکتب کے مرحلے میں اعلیٰ تعلیم تک کے تمام مراحل اُنھوں نے اسی قصبے میں طے کیے۔ صرف ایک سال مدرسہ شاہی مراد آباد میں گزارا، جہاں دورہ حدیث شریف میں شرکت کی اور سند فراغ حاصل کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں:

”میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات، قرب و جوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے صرف ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا۔ اس کے باوجود، حوصلے کی بلندی اور تحصیلِ علم کے ذہن کا حال یہ تھا کہ جامعہ ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سایا رہتا تھا؛ بل کہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی؛ مگر میں نے اپنے ذوق و شوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسے کو جامعہ ازہر، جامع زیتونہ، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ بنالیا اور وطن ہی میں رہ کر، خدا کے فضل و کرم، اساتذہ کی شفقت و محبت اور اپنی محنت و عزیمت سے؛ بہت کچھ حاصل کیا۔ اُس دور میں مجھ پر عجیب علمی سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی۔ ہر وقت بغداد و بخارا، اُندلس و غرناطہ اور عالمِ اسلام کی قدیم مشہور درس گاہوں اور اُن کے اساتذہ و تلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں اُن کی حسنت و برکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔“ (۱)

قاضی صاحب کا علم و فضل اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ علم و ثقافت اور فکر و دعوت کے میدان میں قابلِ ذکر کردار ادا کرنے اور جمینِ تاریخ پر نقشِ دوام چھوڑ جانے کے لائق بننے کے لیے انسان کو، اُس کا ماحول اور وسائل، با یقین اتنا ساتھ

(۱) ”قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک“ از: قاضی اطہر مبارک پوری، ص: ۱۸-۱۹

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

نہیں دیتے؛ جتنا کہ خود اُس کی ہمت و حوصلہ اور مطلوبہ محنت؛ جس کو توفیق الہی اور برکت ربانی کی آمیزش نے مُنَوَّر کر دیا ہو۔

خود اپنے چمکنے کی جس میں قدرت ہو

وہ ذرہ منتظر فیضِ آفتاب نہیں

اُن کی زندگی میں ہمارے اُن نوجوانوں کے لیے سامانِ درس موجود ہے، جو اپنے آپ کو بنانے کے حوالے سے؛ تن آسانی، کم کوشی، کوتاہِ طلبی، عاقبت نااندیشی اور حاصل شدہ موقع، وقت، جگہ اور شخصیات کی تمام تر ناقدری کے ساتھ؛ صرف ”خوب سے خوب تر“ جگہ اور وسائل فراواں کو پالینے کی آرزو اور کوشش میں، عمرِ عزیز اور وقتِ گراں مایہ کا ایک ایسا حصہ ضائع کر دیتے ہیں جس میں یک سوئی، اولوالعزمی اور صبر و قناعت کے ساتھ ہنرمندی کے ذریعے؛ بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر انسان ذوقِ طلب اور شوقِ جستجو سے محروم ہو، تو آبِ حیاوں کے چشمہ بے پناہ پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی واپس آجاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ذرا سی عمر کے دورانیے میں بہت سے مذکورہ قسم کے ”تشنہ کاموں“ کا مشاہدہ کیا ہے اور کر رہا ہے۔

اس حقیقت کا بیان خود قاضی صاحب کی زبان سے سنئے:

”طالبِ علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق و شوق ہو؛ تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا بن سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا۔ مجھے کسی بڑے علمی و تحقیقی اور تربیتی ادارے کی ہوا تک نہیں لگی، نہ کسی بڑی شخصیت کی رہ نمائی حاصل ہو سکی؛ ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی سازگار نہیں تھے؛ اس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے ذوق و شوق، محنت و حوصلہ اور خود سازی کے بل پر؛ وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا

جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے — جیسا کہ ہوتا بھی ہے — کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارے کے سایے میں جگہ ملتی، تو میرا علمی پودا قوتِ نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب و ہوا میں اُسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع میسر نہ آتا۔“ (۱)

ہمت افسردہ نہ ہو، تو منزلوں کا قحط کیا
لے چلیں گے جانبِ پنہاے امکاں، راستے

قاضی صاحب سے دید و شنید

۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ اُن سے لکھنؤ میں شرفِ ملاقات و تعارف حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے بچہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں بھی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء کا شاگرد ہوں۔ قاضی صاحب چوں کہ بے حد خور و نواز تھے، اس لیے یہ سنتے ہی مجھے گلے لگا لیا کہ تم تو میرے استاد بھائی نکلے۔

اُن سے دوسری ملاقات دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اجلاسِ صد سالہ (منعقدہ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر گیٹ پر عرفات نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے اور علیک سلیک کے بعد ایک طرف کو کھڑے ہو کر اپنے ہم سفر دو صاحب زادوں کا تعارف کرایا کہ یہ دونوں دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی۔ میں بے حد متاثر ہوا، اُن کی اس یادداشت سے؛ کیوں کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد بھی مجھے اپنے خانہ خیال میں محفوظ رکھے ہوئے تھے کہ انھیں مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا؛ لیکن اُس سے بھی زیادہ اُن کے اس اخلاقِ کریمانہ سے متاثر ہوا کہ وہ اس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے؛ ورنہ اُن سے بہت کم درجے کے لوگ اپنی ”علمی ساکھ“ کا رعب و دبدبہ قائم رکھنے

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

کے لیے، عموماً چھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کر کے تعارف کرائیے، تو تجاہلِ عارفانہ کے ذریعے اپنی کھوکھلی عظمت کو چلا بخشنے کی کوشش سے نہیں چوکتے۔

پھر دیوبند میں اُن سے بار بار ملنے کی سعادت حاصل رہی؛ جہاں وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر سال میں ایک سے زائد بار تشریف لاتے رہتے تھے کہ انھیں ہندی ملتِ اسلامیہ کی مذہبی زندگی کے جلی عنوان دار العلوم دیوبند سے (وہاں سے رسمی طور پر فارغ نہ ہونے کے باوجود) ایسی محبت و عقیدت تھی، جو بعض دفعہ یہاں کے بہ راہ راست فاضل کو بھی نہیں ہوا کرتی؛ دارالعلوم دیوبند بھی اُن کے ساتھ اپنے ایک فاضلِ باکمال ہی کی طرح عزت و احترام کا معاملہ کرتا تھا۔

ادھر آخری کئی سالوں سے شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی اعزازی سرپرستی قبول کر لینے کے بعد؛ یہاں اُن کی آمد و رفت یقینی بن گئی تھی؛ لیکن علالتِ پیہم کے باعث قریباً ڈیڑھ دو سال سے دارالعلوم تشریف نہیں لاسکے تھے۔ ہم اساتذہ کو انتظار ہی رہا کہ وہ اب آئیں گے اور تب؛ لیکن وہ خود یہاں نہ آ سکے؛ بل کہ عالمِ جاوداں کو چلے جانے کی، اُن کی خبر آئی اور ہم سمجھوں کو اداس و دل فگار کر گئی۔

میدانِ تحقیق و تصنیف و صحافت میں اُن کا شہرہ؛ میرے کانوں سے؛ طالب علمی کی صغیر السن ہی میں آکر آیا تھا اور میرے کان، میری آنکھوں سے پہلے اُن کے عاشق ہو گئے تھے کہ ”الْأَذُنُ تَعْشَقُ قَبْلَ الْعَيْنِ أَحْيَانًا“ بسا اوقات آنکھوں سے پہلے کان عاشق ہو جایا کرتے ہیں۔ ملاقات کے بعد آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اُس کے متعلق خدا کو گواہ بنا کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ کانوں کے سُننے ہوئے سے فزوں تر تھا اور عربی کے مندرجہ ذیل شہرہ آفاق اشعار کا مصداق:

لَقَدْ كَانَتْ مُحَادَثَةُ الرُّكْبَانِ تُخْبِرُنَا عَنْ جَعْفَرِ بْنِ فَلَاحٍ أَطِيبِ الْخَبْرِ
فَلَمَّا التَّقَيْنَا فَلَا وَاللَّهِ مَا سَمِعَتْ أُذُنِي بِأَحْسَنَ مِمَّا قَدْ رَأَى بَصَرِي

یعنی آنے جانے والے قافلوں کے ذریعے جعفر بن فلاح کی مسرت بخش خبریں ملا کرتی تھیں۔ جب ہماری اُن سے ملاقات ہوئی، تو خدا جانتا ہے کہ کانوں نے (پہلے) اُس سے بہتر نہیں سنا جو کہ آنکھوں نے (بعد میں) مشاہدہ کیا۔ لیکن بہت سے ”جعفر بن فلاح“ ایسے ہیں کہ اُن کے متعلق جو کچھ دور سے سنا جاتا ہے، قریب کا مشاہدہ اُس کی تکذیب کر دیتا ہے۔

قاضی صاحبؒ کے متعلق میں نے اپنا یہ تاثر بہ طورِ خاص اِس لیے ریکارڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ ”بڑوں“ کے متعلق دور سے سنے ہوئے آوازے سے پیدا شدہ اعتقاد کو قریب کا تجربہ مسمار کر دیتا ہے اور زبانِ حال و قال سے کہنا پڑتا ہے کہ ”أَنْ تَسْمَعَ بِالْمُعَيَّدِي خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ“ یعنی دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔

چہرے مہرے سے، علم و تحقیق کی پھوٹی روشنی

قاضی صاحبؒ کو دیکھ کر اُن کے چہرے مہرے سے علم و فکر کی بوباس اور اُن کے خدو و خال سے طویل تحقیق و مطالعے کا سراغ مل جاتا تھا۔ اللہ نے اُنھیں طالبِ علم پیدا کیا تھا۔ میں جب بھی یہاں دارالعلوم کے مہمان خانے میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا، میں نے اُنھیں کچھ پڑھتے یا کچھ لکھتے ہوئے پایا۔

وہ؛ تکلف، تصنع اور بناوٹ سے ہر زاویے سے پاک تھے۔ لباس و پوشاک، رہن سہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں اُنھیں تصنع سے نفرت تھی۔ وہ تحریر و تصنیف میں بھی تکلف سے بری تھے؛ اسی لیے اُن کی تحریر میں بے ساختگی، سلاست، اختصار، قدرتی باغ کا جمال، خود رو سبزے کی بہار، راست تعبیر کی شیرینی اور آسان پسندی کی نمکینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ وہ عصرِ حاضر کے قلم کاروں کی طرح؛ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی روش پر چل کر؛ معانی سے زیادہ عبارت کی طولانی، الفاظ کے اسراف بے جا اور اُن کے بناؤ سنگار پر توجہ نہیں دیتے تھے؛ بل کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ
گودا ہی گودا ہوتا؛ چھلکا تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت میں بھی بے تکلف تھے۔ اُن سے پہلی ملاقات بھی پرانی اور بار بار کی ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ ہر ملنے والے کو ایسا لگتا کہ برسوں سے اُن سے جان پہچان ہے؛ بل کہ وہ اُس کو اُس کے بزرگ خاندان یا فرد خاندان محسوس ہوتے۔ اپنی بے ساختہ گفتگو، شیریں کلامی، سادگی، مہر آمیز برتاؤ، شفقت شعاری اور انسیت ریزیتسم سے ملنے جلنے والوں کے دل میں گھر کر جاتے تھے۔

فقرِ غیور کی صنعت گری

وہ علمائے قدیم کی مبارک نسل سے تعلق رکھتے تھے؛ جن کا شعار قناعت پسندی ہوا کرتا تھا؛ چنانچہ زندگی کے کسی دور میں مادیت کی دل فریبی نے اُنھیں مسحور نہیں کیا۔ بمبئی ایسے رنگ و نور کے شہر اور دولت و ثروت کی ریل پیل والے ماحول میں؛ بل کہ آسائشِ حیات کے متلاطم سمندر میں رہ کر بھی اپنے دامنِ علم کو تر ہونے سے بجائے رکھا اور یک سوئی کے ساتھ دادِ تحقیق دینے اور بے مثال تصنیفات کی تیاری اور علمی مشاغل میں اپنے کو منہمک کیے رکھا۔ اُن کی اکثر اہم تصانیف اسی شہر پرشور میں اُن کے قلم سے ڈھلئیں۔

قاضی صاحبؒ خود فرماتے ہیں:

”بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود؛ میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا۔ بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو، شکرِ یے کے ساتھ واپس کر دیا۔ تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسے کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا؛ وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہو سکا اور الحمد للہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کیا، جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اُس سے دولت

کمانی جاتی ہے۔“ (۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم ”کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو“ کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے؛ اُن کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں ”مرکز علمی“ کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دورِ شباب گزارا۔ میں نے بڑے بڑے عقیدت مندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے، شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلے میں بور یہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے یہی خواہ اور مخلص بزرگ و احباب اس معاملے میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقل مند سمجھتا تھا؛ بل کہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

”بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علم گش شہر ہے، جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا؛ اس لیے میں نے دولت و ثروت کے اس ”اندرونِ قعر دریا“ میں تیس سال سے زائد ”تختِ بند“ ہونے کے باوجود، اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود؛ عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر، عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔“ (۲)

اب نئی نسل کو کس طرح سمجھایا جائے کہ قناعت کتنی بڑی دولت ہے؛ بل کہ کلیدِ دولت ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے، انسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دولت مند رہتا ہے اور اس سے عاری ہونے کے صورت میں خزانہ قارون اور دولتِ فرعون و نمرود کی

(۱) حوالہ سابق، ص: ۳۶

(۲) حوالہ سابق، ص: ۵۱-۵۲

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

فراوانی کے باوجود مفلس بے مایہ رہتا ہے۔ عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہ دی ہے:
مَا كُلُّ مَا فَوْقَ الْبَسِيطَةِ كَافِيًا فَإِذَا قِنَعْتُ ؛ فَكُلُّ شَيْءٍ كَافِيًا
یعنی اگر انسان قناعت پسند ہے تو کوئی بھی چیز اُس کے لیے کافی ہے اور اگر ایسا
نہیں ہے تو پھر روئے زمین کی تمام چیزیں اُس کے لیے ناکافی ہیں۔

قناعت کے ہتھیار کے ذریعے دنیا کے تمام مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے؛ بل کہ
قناعت پیشہ افراد کے نزدیک دنیا کا کوئی ”مسئلہ“ مسئلہ نہیں ہوتا؛ اسی لیے وہ تمام مسائل
اور الجھنوں سے یک سو ہو کر صرف اپنے عظیم اور شریفانہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں
جٹ جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی مساعی جلیلہ کے نتیجے میں، انسانی برادری کو
سعادت و سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ دورِ آخر میں ہمارے
اکابر دیوبند بھی قناعت کی مثال تھے۔ اُن کی قناعت کے قلعے کو منعمان دہرا اپنی کسی
کوشش کے ذریعے فتح نہ کر سکے اور اُن خدا مستوں کی زبان حال، سرخ روئی سے یہ
شعر پڑھتی رہی:

اپنی سی چال چل کے رہے منعمان دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

اسی قناعت پسندی اور فقرِ غیور کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند اور اُس کی
جدوجہد کی شکل میں، برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی طاقت و تحریک کی بنا اس طور پر
اُستوار کی کہ اُس کا شجرہ طوبی، روزِ اوّل سے ہنوز سرسبز و شاداب ہے اور کسی بھی موسم
میں برگ و بار لانے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

قاضی صاحبؒ نے قناعت کا درس بچپن ہی سے لینا شروع کر دیا تھا؛ اپنے گھر میں
اور اپنے معاشرے میں، جس میں اُس وقت لوگ قناعت پسندی و کفایت شعاری اور سادگی
کی فطرت پر جنم لیتے تھے اور ان عناصر سے مرکب زندگی جینے میں ایسی راحت و سکون
محسوس کرتے تھے، جو اب وسائلِ زندگی سے بھرے پُرے اس دور میں؛ کسی انسان کو

نصیب نہیں۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”طالبِ علمی کا پورا دورِ عُسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔ کھانے، پینے اور پہننے میں کفایتِ شعاری اور سادگی ہی رہی۔ اُس وقت آج کل کی طرح معاش و معیشت میں فراوانی و فراخی نہیں تھی۔ عام طور پر لوگ روکھی پھیک کی زندگی کے عادی تھے؛ اس تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا؛ بل کہ سب لوگ اُسی زندگی پر راضی و خوش رہا کرتے تھے۔ اُس میں بڑی خیر و برکت تھی۔ میں بھی ہر معاملے میں اپنے ذوق و شوق کے مطابق سامانِ مہیا کر لیا کرتا تھا اور کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا۔“ (۱)

عاشقِ علم و مطالعہ

قاضی صاحبِ علم کے سچے عاشق تھے۔ انھیں جھوٹی شہرت اور وقتی نام وری سے بے پرواہ کر، علم میں مشقت آمیز و صبر آزماتِ سفرِ دراز میں بے پناہ لذت ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ نسلِ نو اس لذت سے نا آشنا محض ہوتی جا رہی ہے؛ اسی لیے اُس کی تخلیقات اور نتائجِ مطالعہ و تصنیفات میں گہرائی اور دقتِ نظر کا دور دور تک پتہ نہیں؛ بل کہ سطحیت ہی اُس کی شناخت بن گئی ہے۔ اس لیے کہ علم و تحقیق کی راہ میں قاضی صاحب، اُن کے بعض ہم عصر اور اُن کے اکثر پیش رو جس طرح ”مکارہ“ (ناپسندیدہ چیزیں یعنی مصائب و تکالیف) کو برداشت کرنے؛ بل کہ انھیں شیریں سمجھنے کے عادی تھے؛ یہ صفتِ نسلِ نو میں معدوم ہو گئی ہے اور لگتا ہے کہ ماؤں نے اب سابقہ نسل کے لوگوں کو جتنا چھوڑ دیا ہے:

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

فروغ شمع جواب ہے؛ رہے گی رہتی دنیا تک

مگر محفل تو پروانوں سے خالی؛ ہوتی جاتی ہے

شمع علم تو جلتی رہے گی؛ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ اُس پر نثار ہونے والے

پروانے اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

علم کے ساتھ اُن کے عشق و خلوص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنی کتاب کا ذاتی طور پر نہ تو حقوق طبع محفوظ کرایا، نہ ہی معاوضے کی بات کی، نہ رائٹس لی؛ بل کہ خدمتِ علم کے جذبے سے کتابیں لکھیں اور اسی جذبے سے مختلف ناشرین کو، اُن کی طباعت و اشاعت کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ناشرین نے (جو کہ عموماً نامعقول اور ناخدا ترس ہوتے ہیں) اپنے لیے ”جملہ حقوق طبع بہ حق ناشر محفوظ ہیں“ کے ساتھ اُن کی کتابیں چھاپیں۔ اس عمومی اجازت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کتابیں عموماً مُتَمَدَّ اول اور مُبَسَّر رہتی ہیں، جب کہ ”حقوق طبع بہ حق مؤلف محفوظ“ والی کتابیں عموماً مؤلف کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، نایاب ہو جاتی ہیں؛ نیز اُن کے ورثہ کے آپسی اختلاف کی آماج گاہ بن کر، اہل علم کے لیے باعثِ اذیت و افسوس بن جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی کوئی کتاب، اسی لیے نایاب نہیں ہوتی کہ اُنھوں نے محض خدمتِ دین و علم و عقیدہ و ملت کی خاطر، کتابیں لکھیں اور ہر ایک کو چھاپنے کی عام اجازت دے دی۔

سادگی، تواضع، بے تکلفی، قناعت شعاری، مہنساری، شفقت آمیز برتاؤ، نرم خوئی، علمی انہماک، مطالعہ و تصنیف میں محویت، دنیا کی لذتوں اور مادیت کے سحر سے مکمل آزادی اور شہرت سے نفرت وغیرہ؛ قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔

قاضی صاحب کا سراپا

قاضی صاحب؛ میانہ قد، قدرے کشادہ جبیں، متوازن الجسم، گندم گول رنگ،

پس مرگ زندہ

گھنی داڑھی والے، قوی الحافظہ، ذہین اور اپنے ملنے جلنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رکھنے والے آدمی تھے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے شروع ہی میں بینائی کم زور ہو گئی تھی؛ اس لیے بہت پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ استعمال کرتے تھے۔ نہایت خوددار آدمی تھے۔ زندگی اور انسانوں سے بہت پر امید رہا کرتے تھے۔ وقت کے قدر داں تھے؛ جو ایک سچے خادم علم کا ممتاز خاصہ ہوا کرتا ہے۔ دنیوی غموں سے آزاد اور علمی مشاغل کے غلام تھے۔ ترفع اور خود پسندی سے کوئی مناسبت نہیں تھی، البتہ خود سازی پر اُن کی توجہ ہمیشہ مرکوز رہی۔ بہت سے اہل علم و قلم کی طرح اپنی تعریف آپ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی دوسروں کو حقیر و کم رتبہ سمجھتے تھے۔ دوسروں سے بات چیت کرتے وقت پر سکون رہتے۔ طلبہ اور اہل علم سے بے حد محبت کرتے اور متکبروں اور انایت شعاروں سے حد سے زیادہ نفرت کرتے تھے خواہ وہ کسی قدر وقامت کے ہوں۔

ناچیز کے نام قاضی صاحب کا گرامی نامہ

۱۳۱۵ھ / ۱۹۹۵ء میں، جب راقم السطور نے، حضرت الاستاذ مربی کبیر حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی کے انتقال کے چند ہی ماہ بعد، اُن پر اپنی تاثراتی کاوش ”وہ کوہ کن کی بات...“ شائع کی اور حضرت قاضی صاحب کو اُس کا ایک نسخہ بذریعہ ڈاک بھیجا، تو اُنھوں نے کتاب پڑھ کر مندرجہ ذیل مکتوب ارسال فرمایا، جو اس ناچیز نووارد بساط تالیف کے لیے بڑا حوصلہ افزا ثابت ہوا:

باسمہ تعالیٰ

مبارک پور

۲۶ ربیع الآخر ۱۴۱۶ھ

عزیز گرامی مولانا نور عالم امینی صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

خدا کرے مزاج گرامی بہ عافیت ہو، آپ کی مرسلہ کتاب ”وہ کون کن کی بات“ اور لفافہ دونوں ملے، یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔

کتاب اس قدر دلچسپ اور موثر انداز میں لکھی گئی ہے کہ ملتے ہی ہاتھ میں لیا تو ختم کر کے ہی رکھا، اس میں نہ انشائیہ ہے، نہ سوانحی خاکہ ہے اور نہ ہی سوانح عمری ہے؛ بل کہ اس میں مختصر ہونے کے باوجود سب کچھ ہے، آپ نے اپنے علمی مربی اور اُستاد مولانا وحید الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متفرق حالات کو، جس عقیدت و محبت اور سلیقہ مندی سے مرتب کیا اُس کا ظہور کتاب کی سطر سطر سے ہوتا ہے، انداز بیان اور طرز تحریر نے کتاب کو علمی اور ادبی بنادیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی، جہد مسلسل سے عبارت تھی اور مردم سازی، مردم شناسی، تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور تنظیم میں وہ کس قدر کام یاب تھے، یہ آپ کی سعادت مندی ہے کہ قلیل عرصے میں اپنے محسن و مربی استاذ کے حالات کو نہایت والہانہ اور سبق آموز انداز میں لکھ کر، اُن کے علمی و ادبی کارناموں سے اہل علم کو روشناس کرایا ہے، ان شاء اللہ یہ کتاب ہمارے مدارس کے اُساتذہ و تلامذہ کے لیے، مشعلِ راہ ہوگی اور وہ اس سے بہت کچھ حاصل کریں گے۔

آپ نے یہ اچھا کیا کہ مولانا مرحوم کے، جن تلامذہ و متعلقین کے نام کتاب میں آئے، اُن کا تذکرہ حاشیہ میں کر دیا، یہ بھی بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم و قلم میں برکت عطا فرمائے۔

والسلام

قاضی اطہر مبارک پوری

سوانحی خاکہ

❁ ولادت اور نام و نسب: قاضی صاحبؒ کی ولادت بہ روز یک شنبہ: ۳۰ رجب ۱۳۳۳ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۱۶ء صبح پانچ بجے ”مبارک پور“ ضلع ”اعظم گڑھ“ میں ہوئی۔ اُن کے جد اعلیٰ: سلطان نصیر الدین ہمایوں (۹۱۳-۹۶۳ھ = ۱۵۰۸-۱۵۵۶ء) کے عہد سلطنت میں؛ کڑا مانک

پس مرگ زندہ

پور سے، راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوری متوفی ۱۲ شوال ۹۶۵ھ بانی ”مبارک پور“ کے ہم راہ: ”مبارک پور“ آجے تھے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں اسی زمانے سے نیابت قضا کا عہدہ چلا آ رہا تھا۔ اسی مناسبت سے انھیں اور اُن کے تمام اہل خاندان کو ”قاضی“ کے سابقے کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ (۱)

قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ نے اُن کا نام ”عبدالحفیظ“ رکھا تھا؛ لیکن وہ قلمی و علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

مولانا عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری بن شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی۔ اُن کے والد شیخ حاجی محمد حسن نے ۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ میں وفات پائی۔

● حصول تعلیم: قاضی صاحب نے قاعدۂ بغدادی، ناظرہ قرآن شریف اور اردو وغیرہ کی ابتدائی تعلیم؛ اُس زمانے کے بابرکت رواج کے مطابق محلے کے خانگی مکتب میں حاصل کی۔ اُس کے بعد جب کہ وہ قرآن پاک کا تیسرا پارہ ناظرہ پڑھ رہے تھے؛ مدرسہ ”احیاء العلوم“ مبارک پور میں داخل ہوئے۔ اسی مدرسہ میں قرآن پاک ختم کیا؛ پھر اردو فارسی کی تعلیم پندرہ سال کی عمر تک بقول اُن کے (۲) کھیل کود حاصل کی۔

صفر ۱۳۵۰ھ سے شعبان ۱۳۵۹ھ کے دوران؛ درس نظامی میں پڑھائے جانے والے تمام علوم و فنون کی تحصیل؛ مدرسہ احیاء العلوم ہی میں کی۔ البتہ شوال ۱۳۵۸ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ کا یک سالہ تعلیمی زمانہ؛ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں گزرا، جہاں انھوں نے دورۂ حدیث شریف میں؛ مولانا سید فخر الدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی متوفی ۱۳۹۵ھ ایسے اساتذہ یگانہ سے فیض پایا۔ درمیان میں ۱۳۵۴ھ میں بھی، انھوں نے جامعہ قاسمیہ میں داخلہ لیا تھا؛ لیکن ناگزیر اسباب کی بنا پر صرف دو ماہ

(۱) ”قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک“ مؤلفہ: قاضی اطہر مبارک پوری، مطبوعہ مکتبہ صوت القرآن، دیوبند، سنہ

طباعنت نہ وارد ص: ۹-۱۰ (ترمیم و اختصار کے ساتھ)

(۱) حوالہ سابق ص: ۱۲

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

بعد مبارک پور واپس ہو گئے تھے۔

مدرسہ ”احیاء العلوم“ میں جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، اُن میں قابل ذکر یہ ہیں: مولانا مفتی محمد ثلثین مبارک پوری متوفی ۱۴۰۴ھ، مولانا محمد شکر اللہ مبارک پوری متوفی ۱۳۶۱ھ، مولانا بشیر احمد مبارک پوری متوفی ۱۴۰۴ھ، مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری اور اُن کے اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری متوفی ۱۳۸۷ھ۔

اپنی مختصر خودنوشت سوانح حیات میں، انھوں نے ”مبارک پور“ اور قرب وجوار میں اُن کے زمانے میں موجود، اُن علما اور اہل کمال کے نام گنائے ہیں، جن کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ کر، اُن کے اندر علمی حوصلہ بیدار ہوا اور اُن سے کسی نہ کسی طرح راہ نمائی ملی۔ اُن میں سر فہرست اُن کے جد محترم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۱۳۵۹ھ ہیں؛ جو تبحر عالم، مدرس، مصنف، ادیب، طبیب، حاذق اور عربی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ دوسرے مولانا عبد الرحمن مبارک پوریؒ صاحب ”تحفۃ الاحوذی“ متوفی ۱۳۵۳ھ تیسرے مولانا عبد السلام مبارک پوری مصنف ”سیرۃ البخاری“ متوفی ۱۳۴۳ھ۔ (۱)

نیز علوم و فنون کی پچاسوں اُن اہمات الکتب کے نام بھی لیے ہیں، جنہیں انھوں نے عاریتاً خرید کر پڑھیں اور اُن کے ذریعے، اپنی علمی صلاحیت کو پختہ کیا اور ثقافتی اثاثے کو وسعت دی، جس کے طفیل علمی دنیا میں دھوم مچا دینے والی تصنیفات اُن کے قلم سے نکلیں۔ (۲)

اُن کی علمی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ طالب علمی کے اولین دور سے ہی، جب کہ وہ عسرت کی زندگی گزار رہے تھے؛ درسی کتابوں کے علاوہ، بہت سی غیر درسی مطبوعات و مخطوطات خریدیں اور جو نایاب تھیں انھیں اپنے قلم سے نقل کر لیں کہ اُس زمانے میں آج کی طرح فوٹو اسٹیٹ کی کوئی سہولت نہ تھی۔ انھوں نے اپنی مختصر آپ بیتی میں خریدی ہوئی کتابوں کی فہرست، اُس زمانے میں اُن کی قیمتیں اور اکثر کتابوں کی تاریخ خرید، نیز نقل کی ہوئی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ (۳)

✽ انشا اور مضمون نگاری کا ذوق: مضمون نگاری کا شوق اُن کے اندر، اپنے

(۱) حوالہ سابق، ص: ۱۳-۱۶

(۲) حوالہ سابق، ص: ۲۳-۲۴

(۳) حوالہ سابق، ص: ۲۷-۳۲

نانا مولانا احمد حسین متوفی ۱۳۵۹ھ کی صحبت سے پیدا ہوا؛ جن کے ذاتی کتب خانے میں علم و فن کی بے بہا کتابیں، کثرت سے موجود تھیں اور انھیں تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا مذاق تھا۔ مطالعہ و کتب بینی کے رسیا تھے۔ اُن کی نشست کے کمرے میں، ہر چہار جانب کتابیں مطالعہ کے لیے چٹائی پر پٹھری رہتی تھیں۔ قاضی صاحب کو چوں کہ لکھنے پڑھنے کا خدا داد شوق تھا؛ اس لیے اُن کی تربیت اور طریق مطالعہ و تصنیف سے، اپنے شوق کو ہمیز کیا؛ لیکن باقاعدہ راہ نمائی انھوں نے کسی سے حاصل نہیں کی؛ بل کہ اس سلسلے میں صرف اُن کے ذوق اور خود اعتمادی نے، اُن کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ فرماتے ہیں:

”معلومات کی فراہمی، اُن کی ترتیب اور اسلوب نگارش وغیرہ میں چوں کہ کسی کی راہ نمائی حاصل نہ ہو سکی؛ اس لیے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا؛ ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابلِ اشاعت ہوا کہ نہیں؟ مگر جب بغیر کسی حک و اضافے کے چھپ جاتا، تو حوصلے میں نئی جان آ جاتی اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا۔“ (۱)

انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ انھیں مضمون نگار بنانے اور تصنیف و تالیف کے لیے حوصلہ دینے میں؛ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ مراد آباد سے رسالہ ”قائد“ نکالتے تھے۔ اتفاق سے ۱۳۵۷ھ میں ”احیاء العلوم“ مبارک پور کی جمعیتہ الطلبہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ اس موقع سے مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کو عبد الحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری: شاعر اور مضمون نگار کا تعارف ہوا اور انھوں نے قاضی صاحب کو رسالہ ”قائد“ میں مضمون لکھنے کی دعوت دی؛ چنانچہ مستقل طور پر رسالہ ”قائد“ میں اُن کے مضامین اور اشعار چھپنے لگے۔ شاعری اور مضمون نگاری کا تسلسل تالیف و تصنیف پر منتج ہوا اور انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں پانچ کتابیں لکھ ڈالیں؛ دو عربی میں اور تین اردو میں۔

✽ شاعری: قاضی صاحب ایک قادر الکلام اور برجستہ گو شاعر تھے، شاعری میں کوئی استاذ نہ تھا، طالب علمی ہی کے زمانے میں آپ کی نظمیں ”الفرقان“ بریلی ۱۳۵۷ھ رسالہ ”قائد“

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

مراد آباد ۱۳۵۷ھ میں شائع ہونے لگیں، بعد میں لاہور کے اخبار ”زم زم“، اخبار ”مسلمان“، اخبار ”کوثر“ وغیرہ میں بہ کثرت اشعار چھپے اور یہی بہ سلسلہ صحافت امرتسر، لاہور اور بمبئی جانے کا سبب بنے، شاہ نامہ کے طرز پر اصحاب صفہ کے نام سے منظوم رسالہ ۲۲۵، اشعار پر مشتمل لکھا، جسے ۱۳۵۹ھ میں شباب کمپنی بمبئی نے طبع کرنے کے لیے لیا؛ مگر گم ہو گیا، بعد میں جب حالات نے، اُن کو صحافی اور مصنف بنادیا، تو شاعری ترک کر دی۔

آپ کے اشعار کا مجموعہ ”مئے طہور“ کے نام سے اپریل ۲۰۰۶ء میں، قاضی اطہر اکیڈمی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی سے شائع ہو چکا ہے۔
”بہارِ مدینہ“ کے عنوان سے اُن کی ایک نعت کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

نعت

بہارِ مدینہ

نظر آرہا ہے، دیارِ مدینہ دیارِ محمد ، جوارِ مدینہ
مرا دامنِ آرزو بھر رہا ہے ثمر بار ہے ، شاخِ سارِ مدینہ
برستے ہیں جلوے نگاہوں میں اپنی کہ سرمہ بنا ہے ، غبارِ مدینہ
قطاریں بھجوروں کی ، راہِ اُحد میں ہے کیا دل رُبا ، کوہِ سارِ مدینہ
سرِ شامِ گنبد کے نوری کلس پر ہے جنت سے بڑھ کر، بہارِ مدینہ
مجھے حاجتِ رنگ و بو، کس لیے ہو کھٹکتا ہے جب دل میں، خارِ مدینہ
اُن کی سب سے پہلی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں، جو ”اُسرار“ کے عنوان سے
”زم زم“ لاہور میں ۱۵ ستمبر ۱۹۴۰ء کو چھپی تھی۔

خلوت بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ
بے خودی خودی میں ڈوب برّ قلندری سمجھ
آہِ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دو جہاں
سازِ شکستہ پر نہ جا ، رازِ شکستگی سمجھ
ساحلِ اضطراب کیا؟ موجِ سکون میں ڈوب جا
عشق کو برملا نہ کر ، عظمتِ عاشقی سمجھ

پس مرگ زندہ
 عشق ہے بے خبر نہ سو، نخل سکوں کی چھاؤں میں
 بے خودی حواس کو، فرصت آگہی سمجھ
 اُن کی ایک نظم کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

اعلانِ آزادی

کھنچا آتا ہے خود میری طرف دامنِ آزادی
 قفس میں کر رہا ہوں بیٹھ کر سامانِ آزادی
 نظر آتے ہیں مجھ کو، ہر طرف آزاد نظارے
 بہ اندازِ جلا آنکھوں میں ہیں ارمانِ آزادی
 یہ کیا ہے زندگی؟ ہر نفس وقفِ غلامی ہے
 کوئی پوچھے شہیدانِ وطن سے شانِ آزادی
 کوئی صیاد کے حلقہ نشینوں کو خبر کر دے
 قفس کی تیلیوں میں ہو گیا اعلانِ آزادی
 ان کی ایک دوسری نظم کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں:
 ”ترانہ مجاہد“

ہم مردِ مجاہد دنیا میں دو روز کی راحت کیا جانیں
 تکلیف و مصیبت کے خوگر آرام و راحت کیا جانیں
 ہم ایک خدا کے قائل ہیں، ہم اپنے نبی کے تابع ہیں
 ہم غیر کا سجدہ کیا جانیں، ہم اور کی طاعت کیا جانیں
 کچھ لوگ عدو کی گھاتوں میں، کچھ لوگ خدا کی باتوں میں
 غزوات کی خونیں راتوں میں، ہم نیند کی لذت کیا جانیں
 آغوشِ وفا میں سوتے ہیں، شمشیر کے ٹھنڈے سائے میں
 لیلاے شہادت کے شیدا، سلمیٰ کی محبت کیا جانیں
 رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد کے مشاغل:

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

● از شوال ۱۳۵۹ھ تا ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء، مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اس دوران شباب کمپنی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورنی) کے لیے؛ سید جمال الدین افغانی (۱۲۵۴-۱۳۱۴ھ / ۱۸۳۹-۱۸۹۷ء) کے دو عربی رسالوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

● ۲۷ نومبر ۱۹۴۲ء تا ۱۲ جنوری ۱۹۴۵ء؛ مرکز تنظیم اہل سنت ”امر تسر“ سے منسلک رہے۔ اس دوران ردّ شیعیت و قادیانیت میں مضامین لکھے، لکھوائے اور چھپوائے۔

● ۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء تا یکم جون ۱۹۴۶ء ”زم زم“ کمپنی لمیٹڈ لاہور سے منسلک رہے۔ اس عرصے میں ساڑھے نو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔

● قیام لاہور کے دوران قاضی صاحب کے والد صاحب حج کو گئے؛ تو شوال ۱۳۶۶ھ تا صفر ۱۳۶۷ھ (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء) مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عارضی مدرسہ کی۔

● ۱۷ جنوری ۱۹۴۷ء سے روزہ ”زم زم“ روزنامہ ہو گیا، تو اُس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط متونی ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء کے زیر تربیت اُس سے وابستہ ہو کر صحافت سیکھی۔ تقسیم ملک سے کچھ دنوں پہلے، دونوں (مولانا محمد عثمان فارقلیط اور قاضی صاحبؒ) اس ارادے سے اپنے وطن آ گئے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد، لاہور واپس آ جائیں گے؛ لیکن حالات کی ستم ظریفی کے دراز تر ہو جانے کی وجہ سے، اُن کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

● ۱۹۴۸ء کے آغاز میں بہرائچ سے مفت روزہ ”انصار“ نکالا؛ جو حکومت کے عتاب کی وجہ سے، آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

● شوال ۱۳۶۷ھ تا شعبان ۱۳۶۸ھ؛ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیمی خدمت انجام دی۔

● جمعہ ۲۸ رذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق نومبر ۱۹۴۹ء کو وہ بمبئی وارد ہوئے، جو اُن کے علمی سفر کی آخری منزل تھی اور جہاں انھوں نے چالیس سال سے زائد مدت تک قیام کر کے اہم علمی، ثقافتی اور صحافتی کارنامے انجام دیے۔

● بمبئی میں انھوں نے شروع میں دفتر جمعیتہ علماء صوبہ بمبئی میں افتا کے اور دیگر تحریری کام کیے۔ پھر روزنامہ ”جمہوریت“ میں نائب مدیر رہے۔

پس مرگ زندہ

● ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک یعنی چالیس سال سے زائد مدت تک روزنامہ ”انقلاب“ میں ”جواہر القرآن“ اور ”احوال و معارف“ کے عنوان سے علمی، دینی، سیاسی اور تاریخی مضامین لکھتے رہے۔

● ۱۹۵۲ء میں جب انجمن خدام النبی کی طرف سے ماہ نامہ ”ہفت روزہ“ ”البلاغ“ نکلتا شروع ہوا، تو دونوں کی ادارت میں کام کرنے لگے۔ ہفت روزہ ”البلاغ“ تو کچھ ماہ بعد بند ہو گیا؛ لیکن ماہ نامہ ”البلاغ“ پچیس سال تک اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔

● ۱۲ نومبر ۱۹۶۰ء سے دس سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات و اخلاق کی تعلیم دی؛ نیز اسی دوران دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں جزوقتی مدرسہ کی۔

● ۱۹۵۱ء میں بیھونڈی میں ”مفتاح العلوم“ کی بنا ڈالی جو ہنوز سرگرم عمل ہے۔

✽ اردو تصانیف

۱- عرب و ہند عہد رسالت میں ۲- خلافت راشدہ اور ہندوستان ۳- خلافت امویہ اور ہندوستان ۴- خلافت عباسیہ اور ہندوستان ۵- ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۶- اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۷- آثار و معارف ۸- دیارِ یورپ میں علم و علما ۹- آثار و اخبار ۱۰- مختصر سوانح ائمہ اربعہ ۱۱- تدوین سیر و مغازی ۱۲- خیر القرون کی درس گاہیں اور اُن کا نظام تعلیم و تربیت ۱۳- خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات ۱۴- معارف القرآن ۱۵- علی و حسین ۱۶- طبقات الحجاج ۱۷- تذکرہ علمائے مبارک پور ۱۸- تعلیمی و تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں ۱۹- افادات حسن بصری ۲۰- اسلامی نظام زندگی ۲۱- حج کے بعد ۲۲- مسلمان ۲۳- اسلامی شادی ۲۴- قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔

✽ عربی تصنیفات

۲۵- رجال السنند والہند ۲۶- العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابة والتابعین ۲۷- الہند فی عہد العباسیین ۲۸- الحکومات العربیة فی الہند ۲۹- خیر الزاد فی بانث سعاد ۳۰- مرآة العلم۔

قابل ذکر ہے کہ کتاب نمبر ① اور نمبر ⑤ کے ترجمے بھی عربی زبان میں قاہرہ سے چھپ چکے ہیں۔ دونوں ترجمے دو مصری عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری اور عبدالعزیز عبدالجلیل عزت کے قلم سے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اظمہر مبارک پوری

عربی میں تحقیق و تفسیر

۳۱- جواهر الأصول في علم حديث الرسول لأبي الفيض محمد بن محمد بن علي الحنفي الفارسي ۳۲- تاريخ أسماء الثقات لابن شاهين البغدادي ۳۳- ديوان أحمد؛ جو اُن کے نانا مولانا احمد حسین کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے۔ قاضی صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

● علمی و دینی اسفار: قاضی صاحب نے پانچ حج کیے۔ پہلا حج ۱۳۷۵ھ میں، دوسرا ۱۳۸۵ھ میں، تیسرا ۱۳۹۳ھ میں، چوتھا ۱۳۹۷ھ میں، پانچواں ۱۴۰۲ھ میں۔

چوتھے حج ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۶ء کے بعد انھوں نے بلاؤ عرب و افریقہ کا علمی و ثقافتی دورہ کیا۔ وہاں کے ممتاز علما سے ملے، کتب خانوں سے استفادہ کیا، نادر کتابوں کی معلومات حاصل کیں اور عالم اسلام کے ایک معتبر ہتھیے کے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے قریب سے واقف ہوئے۔ جن ملکوں اور شہروں میں گئے؛ اُن کے نام اور اسفار کی تفصیل، انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دی ہے۔

اعزازی نشانات و انعامات

● مارچ ۱۹۸۴ء میں ”تنظیم فکر و نظر“ سکھر کی دعوت پر سندھی ادبی میلے میں شرکت کی۔ اس موقع سے انھیں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق (ش ۳ محرم ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء بہ روز چہار شنبہ) کے ہاتھوں تنظیم کا اعزازی نشان، سندھ کی روایتی چادر اور ٹوپی دی گئی۔

● ۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد، پاکستان میں منعقدہ تیسری عالمی کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں مدعو ہوئے اور شرکت کی۔ اس موقع سے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے انھیں ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلیٰ اور ایک جمائل شریف تحفے میں دیا۔

● اگست ۱۹۸۶ء میں ”تنظیم فکر و نظر“ سندھ نے قاضی صاحب کی اپنے ہاں کی چھپی ہوئی کتابوں کی رسم اجراء میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے، انھیں دعوت دی۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت میں، تاج محل ہوٹل کراچی میں ایک شان دار و پروقار جلسہ ہوا؛ جس میں چوٹی کے پاکستانی اہل علم و قلم و ادب و ماہرین قانون و ماہرین تعلیم و تربیت نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

● ۱۵ اگست ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی زبان اور علمی و تحقیقی کارناموں کے پیش نظر؛ توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپے نقد سالانہ تاحیات کی پیش کش کی گئی۔

۱۹۸۸ء میں یہ رقم دس ہزار کردی گئی تھی۔

❁ وہ ادارے جن کے ممبر یا سرپرست رہے

۱۔ معتمد انجمن تعمیرات ادب مزنگ، لاہور ۲۔ مشیر علمی ادارہ ”التراث العربی“ کویت

۳۔ صدر جمعیت علماء مہاراشٹر بمبئی ۴۔ صدر دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر ۵۔ رکن انجمن خدام النبی

بمبئی ۶۔ رکن رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی۔

مذکورہ بالا اداروں سے ماضی میں تعلق رہا تھا اور ان سے وابستہ رہ کر مفوضہ ذمہ داریاں انجام

دی تھیں، جب کہ مندرجہ ذیل اداروں سے تاحین حیات وابستہ رہے:

۷۔ رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ۸۔ سرپرست ”شیخ الہند اکیڈمی“ دارالعلوم دیوبند

۹۔ اعزازی رفیق ”دارالمصنفین“ اعظم گڑھ ۱۰۔ اعزازی مدیر ماہ نامہ ”برہان“ دہلی ۱۱۔ رکن مجلس شوری

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۲۔ رکن مجلس شوری تاج المساجد بھوپال ۱۳۔ رکن مجلس شوری جامعہ

اشرفیہ نیا بھوپور (بہار)۔ (۱)

❁ پس ماندگان: مولانا قاضی اطہر کی پہلی شادی مولوی نعمت اللہ مبارک پوری (متوفی

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، جو مولانا قاضی اطہر صاحب کے فارسی

میں اُستاد بھی تھے۔ کسی وجہ سے ایک دوبارہ ہی کی رخصتی کے بعد علاحدگی ہو گئی۔ دوسری شادی

محترمہ سائرہ بنت محمد یعقوب صاحب ساکن ”ولید پور“ ضلع ”مئو“ کے ساتھ ہوئی۔ قاضی صاحب

کی تمام اولاد انھی محترمہ کے بطن سے ہوئی۔ ”سائرہ“ کی پرورش و پرداخت اُن کے نانا حافظ محمد

زاہد ساکن ”محمد آباد گوہنہ“ ضلع ”مئو“ کے زیر تربیت ہوئی تھی۔ حافظ محمد زاہد مرحوم اپنے وقت کے

اچھے حافظوں میں گنے جاتے تھے۔ بڑے نیک، متقی، پرہیزگار اور سادہ مزاج قسم کے بزرگ

تھے۔ اُن کے بیٹے مولوی حکیم محمد اکبر صاحب (متوفی ۲۰۰۳ء) مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے،

درس نظامی کے فارغ التحصیل تھے، لکھنؤ سے فن طب کی سند بھی حاصل کی تھی۔ حکیم صاحب اپنے

وطن ”محمد آباد گوہنہ“ میں آخری عمر تک مطب کر کے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے ہیں۔ اُن کی

(۱) یہ تمام معلومات قاضی صاحب کی کتاب ”قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک“ سے ماخوذ ہیں۔ البتہ پس ماندگان کے

باب کی اکثر معلومات ”مئے طہور“ ”مجموعہ کلام قاضی اطہر مبارک پوری“، ”مزیتہ“ مولانا قمرالامان مبارک پوری،

کے ابتدائے سے بالفاظِ مختصر آئی گئیں ہیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ
طبابت کی بنیاد، جلب منفعت نہیں، خلق خدا کی خدمت کا تصور تھی۔

قاضی صاحب کی حرم محترم ”سائرۃ“ بنت محمد یعقوب پابند صوم و صلاۃ ہونے کے ساتھ، کثرت تلاوت سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ قاضی صاحب کی والدہ مکرمہ کی طرح انھوں نے بھی، اپنے گھر پر بچوں کے لیے کتب کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور وہ محلہ کے بچوں کو نہایت انشراح قلبی کے ساتھ، قرآن مجید کی تعلیم اور دینی تربیت دیتی تھیں۔ انھیں دوبار حج بیت اللہ شریف کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار ہوائی جہاز سے اپنے فرزند اکبر مولانا خالد کمال (ولادت یکم دسمبر ۱۹۳۸ء) — وفات ۵ دسمبر ۱۹۹۹ء (۱) کے ہم راہ اس مقدس سفر پر نکلیں۔ دنیا سے اُن کے جانے کی ادا بھی بڑی مبارک تھی: وہ اپنے میکے ”ولید پور“ اپنی بہن کو سفر حج کے مبارک موقع پر الوداع کہنے کے لیے گئی تھیں۔ بہن کو رات گزار کر صبح میں سفر حج پر نکلتا تھا۔ انھوں نے نماز عشا ادا کرتے ہوئے مُصلّے پر ہی بے ہوشی اختیار کر لی اور صبح ہوتے ہوئے، بہن کے حج پر جانے سے پہلے ہی یکم ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء جہانِ آب و گل کو الوداع کہتے ہوئے خود سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

❁ اولاد و احفاد: مولانا قاضی اطہر مبارک پوری دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے۔ مولانا مرحوم کی چھ اولاد ذکور اور دو اولادِ اناث تھی۔ مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے۔ مولانا نے علم و دین داری کی جو روایات آگے بڑھائیں، اُن کی اولاد میں بھی تعلیم و تعلم اور دین و دیانت کی وہ وراثت پروان چڑھی اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحبِ صلاحیت ہوئے؛ بلکہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گزر کر احفاد تک بھی آگیا ہے اور ”اِس خانہ ہمہ آفتاب است“ کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

اُن کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال تھے، یکم دسمبر ۱۹۳۸ء اُن کی تاریخِ ولادت ہے، بڑے ذہین و فطین اور خوش مزاج تھے۔ ابتدائی اُردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ ”احیاء العلوم“ مبارک پور میں حاصل کی۔ اِس کے بعد دو سال تک دارالعلوم دیوبند میں رہے اور دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے ۱۹۵۸ء میں سند فراغ حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مدرسہ ”احیاء العلوم“ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر مدرسہ ”مفتاح العلوم“ بھیونڈی میں درس و تدریس پر مامور ہوئے۔ جس کو آپ کے والد مرحوم نے ۱۹۵۱ء/ ۱۳۷۱ھ میں قائم فرمایا تھا۔ اِسی دوران آپ کی خدا داد صلاحیت و قابلیت سے

(۱) یہ ۵ دسمبر کی تاریخ ہندوستان کے اعتبار سے ہے؛ ورنہ نیوزی لینڈ میں جہاں ان کا انتقال ہوا، ۶ دسمبر کی تاریخ تھی۔

پس مرگ زندہ

مختار ہو کر حکومتِ مصر کے قونصل جنرل عبدالمعتم النجار نے مشہور عالمی درس گاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفہ پر داخلے کے لیے زور دیا؛ لیکن مولانا قاضی اطہر، اسلامی تہذیب و ثقافت کی اقدار پر دل و جان قربان کیے ہوئے تھے، انھیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت پہنچ رہی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے عموماً اسلامی لباس و تہذیب سے عاری اور بے ریش ہوا کرتے تھے اور اپنے رہن سہن میں یہود و نصاریٰ کا نمونہ بن جاتے تھے؛ اس لیے وہاں بھیجنے میں مولانا کو سخت تکذّر و تاثر ملتا تھا؛ مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو علمی و فنی کمالات اور دینی حمیت میں اضافے کے لیے انشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اپنے فرزند کا داخلہ کرادیا۔ ۵۵ برس تک لائق اساتذہ سے علم دین کی تکمیل کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں مدینہ یونیورسٹی کے ”کلیۃ الشریعہ“ سے فارغ ہوئے اور حکومتِ سعودی عرب کی وزارتِ اسلامی امور کی طرف سے گھانا (مغربی افریقہ) میں مبعوث بنا کر، دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مامور کیے گئے۔ مولانا خالد کمال کی علمی و دینی، اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں نے مغربی افریقہ کی قومی و دینی زندگی میں بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اُن کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر حج سے روکا۔ مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے انگریزی میں ”اطہر“ کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی جاری کیا۔ سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کر دیا، جہاں وہ اپنی وفات ۵ دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسرِ کار رہے۔ آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

مولانا خالد کمال عربی زبان پر قدرت کے ساتھ، علومِ اسلامی میں بھی کافی درک رکھتے تھے۔ نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے، اُس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی، اس کی تعمیر و تزیین کے لیے، مولانا نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔

مولانا خالد کمال میں بڑی خوبیاں تھیں: وہ ادیب و شاعر بھی تھے۔ طالبِ علمی ہی کے زمانے میں، انھیں اپنے والد صاحب کی طرح قرطاس و قلم کی امانت حاصل ہو گئی تھی۔ اُن کے مضامین نظم و نثر جو ”البلاغ“ اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، اُن سے، اُن کی علمیت اور ادبیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا بڑی ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنادینے والی طبیعت کے مالک تھے۔ انھیں اداروں

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

کو ترقی دینے اور ان اداروں کو قوم مسلم کے لیے، کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔

مولانا خالد کمال نے دعوت و تبلیغ اور دوسری دینی و ملی مصروفیات کی وجہ سے فرصت کار بہت کم پائی؛ اس لیے صلاحیتوں کے باوجود ان کی ادیبانہ و شاعرانہ شان کا اظہار بہت کم ہو پایا، مولانا قاضی اطہر کو، اُن سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، وہ اکثر محسوس کرتے تھے کہ تکمیل تعلیم کے بعد وہ تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کی فتوحاتِ قلمی کا دائرہ بہت وسیع ہوگا؛ مگر دوسری علمی تگ و دو نے انہیں علم و قلم کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ پھر بھی مولانا خالد کمال نے نثر و نظم میں جو سرمایہ چھوڑا ہے، اُس سے اُن کی علمیت و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سفرناموں کے علاوہ مقالہ نگاری اور شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے تھے۔ اُن کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور اُن کا شعری مزاج بہت شایستہ تھا۔

اُن کی ایک نعت شریف بہ طور نمونہ کلام، ذیل میں درج کی جا رہی ہے:

یہ کیا کم سارے عالم پر، چرا احسان ہے ساقی
نہ جائے تشنہ لب کوئی، چرا اعلان ہے ساقی
نہ بدلا ہے نہ بدلے گا، کبھی دستور محفل کا
مرا کیا؟ ساری دنیا کا، یہی ایمان ہے ساقی
وفاداری کی رسمیں حل ہیں، تیری بزمِ رنگیں میں
ہر اک میکش بہ ذات خود، ترا سلمان ہے ساقی
ترے در سے کوئی سائل، تہی داماں نہیں اٹھا
جرے جود و سخا پر، عقل کل حیران ہے ساقی
تری بزمِ محبت کی، یہ یکسانی تعالیٰ اللہ
نہ کوئی اجنبی ہے، نہ کوئی انجان ہے ساقی
امیری میں بھی راحت ہے، فقری میں بھی تسکین ہے
غلامی کا تری نسخہ، بہت آسان ہے ساقی

پس مرگ زندہ

خوشی پر بھی وہ رقصاں ہے، الم پر بھی وہ خنداں ہے
گدائے کوچہ غم کی، نرالی شان ہے ساقی
گراں گزرے تو کیوں گزرے؟ کسی کی عقل و فطرت پر
موافق عقل و فطرت کے، ترا فرمان ہے ساقی
تری بستی میں مدفن ہو، ترے کوچے میں دم نکلے
تری قربت کا خالد کو، بڑا ارمان ہے ساقی

مولانا خالد کمال کو ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵ دسمبر ۱۹۹۹ء کو نیوزی لینڈ میں غریب
الوطنی کی موت آئی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

مولانا خالد کمال کے ایک لڑکے ”فوزان طارق“ ہیں اور باقی پانچ لڑکیاں ہیں۔ مولانا کی
تمام اولاد دُعا کائن زندگی گزار رہی ہے اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہے، اُن کا وطن آنا جانا رہا
کرتا ہے۔

”فوزان طارق“ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ ”احیاء العلوم“ مبارک پور میں ہوئی۔ پھر نیوزی
لینڈ میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اور عربی پڑھنے کے لیے قاہرہ بھی گئے۔ فوزان طارق
اس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغہ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے دوسرے صاحب زادے قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب
تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۳۱ء / ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے۔ اُنھوں نے مدرسہ
احیاء العلوم مبارک پور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم پی انٹر کالج سے ۱۹۶۰ء میں
ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں ادیب ماہر، ۱۹۶۲ء میں ادیب
کامل کی سندیں حاصل کیں۔ پھر دینی و مذہبی تعلیم کے لیے، مدرسہ احیاء العلوم، مبارک پور میں
داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم منو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ دو مرتبہ
شرف حج بیت اللہ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحدثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دارالعلوم
دیوبند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سند حدیث سے نوازا۔ قاضی ظفر مسعود کی علمی
و دینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز تھے۔ اُنھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے
خاص تعلق خاطر تھا۔ مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ تھا۔ مبارک پور میں لڑکیوں کی

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

پہلی انگریزی درس گاہ ”انصار گرلس انٹر کالج“ کے بانیوں میں سے تھے۔ (۱) اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل کر چکے تھے۔ انھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب از بر تھے اور ان کے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریے ترتیب دیے تھے، جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہتر فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں نواواد کی ابویت کا شرف بخشا تھا، جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان سلمہ ہیں۔ ان کی ولادت ۱۱ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی۔ ان کی ابتدائی اردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور ایشیا کی شاہ آفاق درس گاہ دارالعلوم دیوبند سے، انھوں نے فراغت پائی۔ گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے خاندان کی دیکھ ریکھ کر رہے ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارک پوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۳ء) ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم احیاء العلوم میں پانے کے بعد، ایک سال کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں سے سند فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں ”کلیۃ الدعوة و اصول الدین“ سے تعلیم کی تکمیل کی، اس کے بعد حکومت سعودیہ عربیہ کی طرف سے مبلغ مدرس کا امتیاز دے کر ”گھانا“ مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے۔ وہاں اہل و عیال کے ساتھ چودہ برس رہ کر قوم و ملت کی اہم خدمات سر انجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں حکومت سعودیہ نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیجا، یہاں کے مختلف مدارس میں انھوں نے تعلیم دی۔ اس وقت دارالعلوم حسین آباد ”انجان شہید“ ضلع اعظم گڑھ میں مدرس ہیں۔ انھیں چھ مرتبہ حج کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ اپنے والد مورخ مبارک پوری کے علمی و دینی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیے، دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف افراد و اداروں سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو گئے ہیں، ان کی اشاعت ثانی اور جو کتابیں منتظر اشاعت ہیں ان کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی

(۱) افسوس ہے کہ قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب بھی بہ روز جمعرات ۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۹ء کو راہی ملک بقا ہو گئے۔

تنگ و دود میں اپنا وقت عزیز صرف کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی حلیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے، مولانا قاضی سلمان مبشر کے عقد میں مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کی صاحبزادی ہیں، جن کے لطن سے پانچ اولاد ہے، تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔

مولانا سلمان مبشر کے بڑے صاحبزادے قاضی فیصل ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ”گھانا“ مغربی افریقہ میں حاصل کی، پھر ۱۹۸۸ء میں اپنے تایا مولانا خالد کمال کے سایہ شفقت میں رہ کر نیوزی لینڈ میں تعلیمی مراحل طے کیے اور بی ایس سی کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر کے، اُسی شعبے میں ملازمت کر لی۔ وکٹوریہ یونیورسٹی ولنگٹن سے کمپنی نے، انھیں اپنی نئی برانچ سڈنی ”آسٹریلیا“ میں کارمنصبی کی انجام دہی کے لیے بھیج دیا، جہاں اب تک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ برسرِ کار ہیں۔

دوسرے صاحبزادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم ”گھانا“ میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ یہاں ۲۰۰۳ء میں ایم۔ اے۔ ویسٹ ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا اور مڈل کے مستحق ہوئے، اس وقت سڈنی ”آسٹریلیا“ میں بہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم مقیم ہیں۔

تیسرے لڑکے قاضی ریان احمد ہیں جنھوں نے ”گھانا“ میں پڑھنے کے بعد ہندوستان کے مختلف اداروں میں تعلیم حاصل کی اور اس وقت ”لمبورن“ آسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ) ہیں۔ جنھوں نے مدرسہ ”احیاء العلوم“ سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی۔ اے، کیا۔ اس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا، اس وقت ”انصار گریس انٹر کالج“ میں امورِ مَفَوَّضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی پرورش و پرداخت میں آٹھ بچے ہیں، جن میں ۲ ذکور اور ۶ اناث ہیں۔ اُن کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ ”احیاء العلوم“ میں ہوئی اور سند فراغ ”مظاہر العلوم“ سہارن پور سے حاصل کی، پھر ”مرکز المعارف“ بمبئی سے انگریزی زبان دانی کا کورس بھی مکمل کیا۔

امۃ الرحمن ام سلمہ (پ: یکم مارچ ۱۹۴۸ء/۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ جو اپنے نانہالی رشتے میں ”محمد آباد گوہنہ“ ضلع ”سوا“ کے رہنے والے ماسٹر مصباح

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر مبارک پوریؒ

الدین محمد رافع سے منسوب ہیں۔ اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ ماسٹر مصباح الدین مولانا قاضی اطہر کی حرم محترمہ کے ماموں زاد ہیں۔ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی، ایس، سی، کر کے گورکھ پور یونیورسٹی سے ایم، ایس، سی، کیا۔ ۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج ”فیروز آباد“ میں بائیلوجی کے لکچرار ہوئے، یہیں ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مع اہل و عیال ”فیروز آباد“ میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے نواسے سعد الدین نے ”فیروز آباد“ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فیضِ درس اٹھایا۔ اُس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کورس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ”نیوزی لینڈ“ گئے۔ تکمیلِ تعلیم کر کے، وہیں ایک سرکاری ہسپتال میں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (پ: ۵ شعبان ۱۳۷۹ھ) ماسٹر رضوان احمد علیگ نوادہ، مبارک پور کے عقدِ نکاح میں ہیں۔ جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کے نواسے ہیں۔ انھوں نے مبارک پور میں تحصیلِ علم کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی راہ لی اور وہاں رہ کر بی، اے، کیا۔ اُس کے بعد ملکِ سعود یونیورسٹی ریاض سعودی عربیہ میں تکمیلِ درس کی، یہ سلسلہ تجارتِ بمبئی میں قیام ہے۔ اُن کی چھ اولاد میں چار اولادِ ذرینہ اور دو اولادِ اناث ہے۔ اُن کے بڑے لڑکے صفوان ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم مبارک پور میں ہوئی انٹر فیروز آباد سے کیا۔ اس کے بعد بمبئی میں الکٹرک انجینئرنگ کا کورس کیا، دوسرے لڑکے شبیان ہیں انھوں نے مبارک پور میں تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی کالج اعظم گڑھ سے انٹر کیا۔ اس کے بعد برہان پور (ایم۔ پی) میں بی، یو، ایم، ایس، کا میڈیکل کورس کیا۔ (*)

(*) تاریخ عربیہ تحریر چہار شنبہ: ۱۲ بجے دن ۱۴ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۹۶ء، جو ”الداعی“ کے شمارہ ۳۰، جلد ۲۰، ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق اگست ۱۹۹۶ء میں ”کلمۃ العدد“ یعنی ادارے کی جگہ، پر یہ عنوان ”المؤرخ الإسلامی الہندی الشہیر القاضی اطہر المبارک پوری فی ذمۃ اللہ“ شائع ہوئی، نیز ماہ نامہ ”الفیصل“ ریاض سعودی عربیہ کے شمارہ ۳۰، ۲۸ صفر ۱۴۲۱ھ مطابق مئی - جون ۲۰۰۰ء کے گوشہ ”اعلام“ میں ص: ۹۶-۱۰۰ پر شائع ہوئی۔ اردو تحریر یہ قلم خود چہار شنبہ: ۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۹۹۶ء جو ہندوستان کے مختلف کثیر الاشاعت رسالوں میں شائع ہوئی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ)

۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء — ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

آخری مفتی

ہماری طالب علمی کے زمانے میں، طلبہ دارالعلوم کی زبان پر اکثر یہ جملہ رہا کرتا تھا کہ آخری مہتمم (یعنی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب) آخری شیخ الحدیث (یعنی حضرت مولانا سید فخر الدین احمد ہاپوڑی ثم المراد آبادی) اور آخری مفتی (یعنی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی) کا زمانہ دیکھ لو۔ اب دارالعلوم میں ان کے بعد، ان کی جگہ پر، جو بھی آئے گا، وہ ہرگز ان کے برابر نہ ہوگا۔

اور واقعی وہی ہوا جو چیدہ خلق خدا یعنی مہمانانِ رسولؐ طلبہ دارالعلوم کی زبان سے اکثر سننے کو ملتا تھا کہ دارالعلوم میں مذکورہ بالا عظیم ہستیوں کی جگہ پر جو حضرات آئے یا آتے رہے، وہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود، ان کا جواب اور ان کے ہم پلہ نہیں تھے۔

عظیم سلف کے عظیم خلف

مفتی محمود حسن صاحبؒ میں، اپنے عظیم اسلاف و مشائخ و فقہاء و علما کی طرح،

(*) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی جاوید اشرف قاسمی مدھے پوری، رجب ۱۴۱۷ھ/نومبر ۱۹۹۶ء۔

پس مرگ زندہ

استحضارِ علمی، سرعتِ انتقالِ دہنی، فقہی بصیرت، اجتہادی صلاحیت، اصول و فروع کی تطبیق کی لیاقت، سابقہ نظرًا و اشباہ پر، نئے مسائل کے قیاس کی وہ مہارتِ تامہ پائی جاتی تھی، جو کسی عبقری مفتی اور فرعی اجتہاد کا عمل انجام دینے کی وہی لیاقت والے مجتہد کی شان ہوا کرتی ہے۔

ساتھ ہی وہ اپنے اکابر ہی کی طرح دینی غیرت و استقامت، عقائدی صلابت، احسانی کیفیت اور تعلق مع اللہ کے باب میں بھی مثالی عالم کے اعلیٰ رتبے پر فائز تھے۔ اخلاص و احتساب اور سلوک و عرفان کے حوالے سے بھی، وہ دارالعلوم کے اُستادہ و مشائخ کے معاشرے میں ایسا لگتا ہے کہ ”خاتم العارفین الصادقین“ تھے۔ اُن کے ایسا بلند پایہ صاحبِ نسبت شیخ و مربی کو دیکھنے کے لیے، نہ صرف طلبہ و اُستادہ و متعلقین دارالعلوم کو؛ بل کہ ساری ہندی ملت کو، نہیں معلوم کہ کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ذیل کا شعر بہت گھس پٹ جانے کے باوجود حقیقت بیانی کے لیے، اپنا جواب نہیں رکھتا:

ہزاروں سال نرگس، اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ و ز پیدا

علم و عمل کی صحیح جامعیت

مفتی صاحبؒ کے وجود سے، دارالعلوم کے ماحول میں علم و عمل کی صحیح جامعیت کا رنگ کسی نہ کسی درجے میں قائم تھا اور ہر آنے جانے والے کو، بالخصوص جس میں دینی شعور اور اسلامی آگہی و ادراک کی خوب پائی جاتی تھی، یہ محسوس ہوتا تھا کہ دارالعلوم کے ماحول کے خاکستر میں ابھی ایسی چنگاری باقی ہے، جو فقرِ غیور اور عشقِ جسور کے آتشِ فروزاں کا رنگ اختیار کر لینے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے؛ لیکن اُن کی وفات کے بعد، دارالعلوم کے دورِ دیوار ہر کہ و مہ کو بے رونق سے لگتے ہیں۔ مفتی صاحبؒ کی صحبت میں بیٹھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسلاف کے علم و عمل کے حقیقی وارث کا رنگ و ڈھنگ ابھی

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن لکھنویؒ

اس مے خانہ علم و عرفان میں الحمد للہ کسی درجے میں قائم ہے۔

اُن کی وفات کے بعد ہی نہیں؛ بل کہ اُن کے آخری سفرِ افریقہ، جو اُن کی وفات پر منج ہوا، کے دوران ہی مجھ جیسے بے شعور اور فراست و بصیرت سے یکسر عاری انسان کو بھی دل کی گہرائیوں میں چھتہ مسجد، اُس کے سامنے کی سڑک اور دارالعلوم کے ماحول میں ایک طرح کی ناقابلِ توجیہ تاریکی کا احساس ہونے لگا تھا اور دل کے خاموش گوشوں میں یہ آواز سنائی دیتی تھی کہ شاید اب یہ مردِ خدا دوبارہ اپنی دید سے ہم لوگوں کو لذتِ یاب نہیں کرے گا اور وہی ہوا جو دل نے کہا۔ زندگی کا اپنا ذاتی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ دل کی آواز بہت بار سچی ثابت ہوتی ہے۔

مسجد چھتہ کا سونا پن

مسجد چھتہ اب بھی قائم ہے، اُس کا قاسمی حجرہ اب بھی باقی ہے، اُس کے دروہام اب بھی نمازیوں کی سجدہ ریزیوں سے منور ہیں؛ لیکن وہ روحانی روشنی، وہ عرفانی کرنیں اور وہ احتسابی کیف جس سے اُس کا گوشہ گوشہ معمور تھا، دور دور تک نظر نہیں آتا۔ میں افریقی منزلِ قدیم سے (جہاں میری اور متعدد اُساتذہ کی اپنے بچوں کے ساتھ رہائش ہے) دارالعلوم آتے جاتے ہوئے روزانہ مسجد چھتہ کے سامنے کی سڑک سے گزرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ، ان گلیوں کی تاریکیوں میں محسوس طور پر اضافہ ہوتا جاتا ہے:

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں

شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی

دامن سے اب معاملہ چشمِ تر کہاں

حرفِ علم کے آشناؤں کی اب بھی کوئی کمی نہیں (اور آئندہ بھی نہیں ہوگی)؛ لیکن

پس مرگ زندہ

عرفانِ حقیقت، یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبتِ فاتحِ عالم کے دُرِ نایاب سے، اُن کے صدف کی آغوش، ہم جیسوں کو تو بہت خالی نظر آتی ہے؛ اس لیے اُن کی ذات سے، تمام برکاتِ علم و حکمت کے باوجود، وہ روشنیاں نہیں پھیل پاتیں، جن سے عالمِ رنگ و بو کے بیاباں کی حقیقی تاریکی کا فور ہوا کرتی ہے:

گماں آباد ہستی میں، یقینِ مردِ مسلمان کا

بیاباں کی شبِ تاریک میں، قدیلِ رہبانی

جس کو دنیاے آب و گل میں آنے کی بیماری لاحق ہو گئی ہے، اُسے ایک نہ ایک دن ضرور نا پید ہو جانا ہے؛ لیکن جو لوگ حبِ الہی اور عشقِ نبوی سے اپنے دل کو مُنَوَّز اور اپنے وجود کو روشن کر جاتے ہیں، وہ موت کے بعد بھی پائندہ رہتے ہیں:

تو محبت کو لازوال بنا

زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

دوشنبہ اور سہ شنبہ مورخہ ۱۷-۱۸ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ (ہندوستانی کیلنڈر کے مطابق): ۱۹-۲۰ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ (جنوبی افریقہ کی تقویم کے مطابق) مطابق ۳-۲ ستمبر ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب تھی کہ اچانک احاطہ دارالعلوم دیوبند کے بیچ میں واقع مسجدِ قدیم کے مناروں پر نصب لاؤڈ اسپیکر کے ہارن گونج اٹھے اور اس افسوس ناک خبر وفات کا اعلان کیا گیا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کا جنوبی افریقہ کے شہر ”جوہانس برگ“ میں انتقال ہو گیا، جہاں آپ ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ء سے مقیم تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

غم و الم کا ہمہ گیر سایہ

نصفِ شب کے وقت یہ روحِ فرساخبر وفات ہم پر بجلی بن کر گری اور ہم گھبرائے

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

ہوے جاگ اٹھے، آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں؛ لیکن اس اطلاع سے نیند یکسر کافور ہو گئی؛ کیوں کہ ایک ایسی بزرگ ہستی کے کھونے کا غم ہمارے لیے دل گداز ہو رہا تھا، جو گہرے علم، اپنے رب کے لیے مخلصانہ عمل اور اپنے غیر معمولی اصلاح کے ساتھ ساتھ بہت سے بندگانِ خدا کی اصلاح کا ذریعہ تھی۔

سہ شنبہ مورخہ ۱۸ ربیع الثانی کی پوپھی، صبح تڑکے ہی دارالعلوم کے طلبہ اور بہت سے اساتذہ کرام اور اہل دیوبند کی بھیڑ چھتہ مسجد میں جمع ہو گئی۔ یہ سبھی لوگ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی بیماری اور وفات کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے۔ دارالعلوم میں تعلیمی تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔ پورے شہر کے مسلمان اور دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ پورے دن حضرت مرحوم کے لیے مغفرت و بخشش، رفع درجات اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کیے جانے کی دعائیں کرتے رہے۔ احاطہ دارالعلوم میں منعقدہ جلسہ تعزیت میں کئی ایک اساتذہ دارالعلوم، خصوصاً شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب اعظمی مدظلہ اور مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ نے، حضرت مرحوم کی سیرت و شخصیت پر اپنی تقریروں میں روشنی ڈالی اور حضرت مرحوم کے کارناموں اور علم و فضل، دعوت و تبلیغ اور اصلاح و ارشاد کے میدانوں میں ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ایک واضح نقشہ پیش کیا۔ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ نے بھی اس وفات حسرت آیات پر اپنے شدید رنج و الم کا اظہار فرمایا، جس کی بنا پر مسلمانوں کو اور خصوصاً دارالعلوم کو ناقابلِ تلاقی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ پورے بڑے ہند میں عموماً اور ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے اسلامی مدارس و جامعات میں خصوصاً تعزیتی اور دعائیہ جلسے منعقد ہوئے، جب کہ دنیا کے گوشے گوشے سے بے شمار تعزیتی پیغامات موصول ہوئے۔

دارالعلوم پر حزن و ملال کی خیمہ زنی

دیوبند شہر اور دارالعلوم پر بالعموم اور چھتہ مسجد کے قرب و جوار پر بالخصوص غموں

کا بادل چھایا ہوا تھا؛ (۱) کیوں کہ اسی مسجد کے ایک کمرے میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ سے برابر زندگی کے آخری لمحوں تک قیام رہا۔ اس مسجد کے کمروں کو یہ شرف حاصل ہے کہ پرانے زمانے سے ہی ہمیشہ وہ اللہ کے نیک و صالح بندوں کی فرودگاہ رہے ہیں، مثلاً حاجی عابد حسین صاحب (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء) جنھوں نے سب سے پہلے دارالعلوم کے قیام کے لیے بہ روزِ جمعہ ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء چندے کی تحریک کی اور چندے اکٹھے بھی کیے، اُن کا بھی اسی مسجد کے ایک کمرے میں تقریباً ساٹھ سال تک مسلسل قیام رہا اور تیس سال تک اُن کی تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہیں ہوئی، اسی طرح دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کا جب بھی دیوبند آنا ہوتا، لازماً چھتہ مسجد کے کمروں میں ہی قیام فرماتے۔

یہ مسجد اخیر سالوں میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت و تلاوت اور ذکرِ خدا سے ہر دم آباد رہی اور اُس کی فضا ذوقِ عبادت سے سرشار اور عشقِ الہی میں مست بندگانِ خدا کی عبادت و تلاوت سے ہر لحظہ معمور رہی۔ یہ لوگ حضرت مفتی صاحب مرحوم کے پاس برابر آتے اور ساتھ رہتے تھے اور اُن کی معیت میں دن رات گزار کر زہد و صلاح اور شوقِ آخرت کا درس لیتے، آستانہ رب پر جبہ سائی کے آداب سیکھتے اور لذتِ احتساب اور سرورِ احسان و اخلاص کی تعلیم پاتے تھے۔ جب حضرت مرحوم موجود ہوتے، تو لوگ ٹوٹے پڑتے اور مسجد نمازیوں سے بھر جاتی۔ یہ لوگ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے میں خشوع و خضوع، قلبی استحضار اور سکونِ دل کی جو کیفیت محسوس کرتے تھے، وہ آپ کی عدم موجودگی میں انھیں میسر نہیں آتی تھی۔ حضرت مفتی

(۱) یہ مسجد چھتہ دارالعلوم کی تین مسجدوں میں شامل ہے۔ یہ مسجد شہنشاہ ”محمد تعلق“ متوفی ۵۲ھ/۱۳۵۱ء کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ اسی مسجد میں دارالعلوم دیوبند نے محرم ۱۲۸۳ھ میں ایک انار کے درخت کے نیچے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہ مسجد دارالعلوم کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

صاحب مرحوم اگر رمضان، چھتہ مسجد میں گزارتے، اعتکاف فرماتے اور ذکر و عبادت اور تلاوت و ریاضت کے لیے راتوں کو جاگتے، تو مسجد کی رونق اور بہار دیکھنے کے قابل ہوتی۔ سیکڑوں علما و صالحین اور طلبہ آپ کے ساتھ اعتکاف میں ہوتے۔ بسا اوقات حضرت مرحوم، مجتہدین و معتقدین کے اصرار پر دیوبند کے علاوہ کسی اور شہر میں، یا ہندوستان کے باہر کسی دوسرے ملک میں رمضان گزارتے، تو مسجد زبانِ حال سے نمازیوں کی قَلْبِ تعداد کی شکایت کرتی نظر آتی۔

اور اراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد

حضرت مرحوم کا ۹۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا؛ اس لیے کہ آپ کی تاریخ ولادت ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء ہے۔ گویا آپ نے نسبتاً عمرِ دراز پائی؛ کیوں کہ لوگ عموماً ۶۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہی جیتے ہیں۔

لیکن بڑے حضرات، جنہیں لوگ ”وقتِ ضرورت“ — اور اُن کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی — شبِ تاریک میں چودھویں رات کے چاند کی طرح تلاش کرتے ہیں، اُن کی موت بڑی ہی دل گداز اور روح فرسا ہوتی ہے، جس سے انسانوں کے جگر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں اور انھیں ایک دائمی حزن و ملال اور لازوال قلق و اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ کیفیت اُس وقت اور بھی فزوں ہو جاتی ہے، جب ایسی شخصیات دنیا سے اٹھ جاتی ہیں، جن کے خلا کا صحیح طور پر، پُر ہونا محال اور انھیں جیسا جانشین ملنا ناممکن نظر آتا ہے؛ اس لیے کہ یہ شخصیتیں طویل قربانیوں اور پیہم سینہ سوزیوں کی پیداوار ہوتی ہیں، جن سے گزرنا صرف توفیقِ یافتہ اور اہلِ قسمت حضرات ہی کے حوصلے کی بات ہے۔ یہ حضرات زندگی کے عیش و عشرت، جسمانی و مادی خواہشات اور بہت سی آرزوؤں و تمناؤں اور مرغوبات و من پسند اشیاء کی قربانیوں کے بعد تیار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تحصیلِ علم اور اُس کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ

برداشت کرنے کے لیے شدید مجاہدوں سے گزرتے ہیں، نفس کی تہذیب و اصلاح کے لیے، ہر طرح کی جدوجہد کام میں لاتے ہیں؛ تاکہ نفس کو زہد و تقویٰ، سادگی و قناعت اور عبادت و مجاہدہ کی ڈگر پر ڈال دیں اور مصائب و آلام پر صبر، جملہ لایعنی کاموں سے اجتناب، خواہشات نفسانی کی مخالفت اور ناپسندیدہ امور کی بجا آوری پر ابھاریں اور برا بیچتے کریں۔ وہ اپنے اندر ہمہ گیر علم اور مسلسل عمل کی صلاحیت پیدا کرنے اور اپنی زندگی کے تمام لمحات کو رضاے الہی کے کاموں سے آباد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اسلام کی تبلیغ و دعوت، باطل سے نبرد آزمائی، بندگان خدا کے حالات کی اصلاح اور دلوں کی شمع کو ایمان و یقین، عشق الہی اور خلوص عمل کی چنگاری سے بھڑکا دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے اور ہر آن اُمت میں یہ شعور بیدار کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے لیے اتنی ہی محنت کام میں لائے، جتنا اسے یہاں جینا ہے اور اپنی آخرت سنوارنے کے لیے اُسی قدر زیادہ کوشش صرف کرے، جتنا اُسے وہاں رہنا ہے، مختصر اُیہ کہ شیطان جب خدائے بزرگ برتر کے احکام و نواہی کے نفاذ میں آڑے آتا ہے، تو یہ حضرات اُس سے پنجہ آزمائی کے لیے فوراً کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُنھی نیک بخت افراد میں شامل تھے۔ افسوس کہ دن بہ دن اُن جیسے حضرات کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، یہ لوگ دنیا سے گزر جاتے ہیں اور اپنے پیچھے علم و عمل کی ”صحیح جامعیت“ میں اپنی نظیریں نہیں چھوڑتے۔ صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں، جن کا علم و عمل باہم مخالف اور متضاد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلامی مزاج کے قطعاً مخالف ہے؛ اس لیے کہ اسلام اپنے فرزندوں کو ایک ہمہ گیر، کامل و مکمل اور علم و عمل دونوں سے بنے ہوئے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ عمل سے خالی علم اور علم سے محروم عمل دونوں ہی شر انگیز فساد کا ذریعہ ہیں، جس میں صاحب معاملہ تو مبتلا ہوتا ہی ہے، وہ بھی نہیں بچتا، جو اس سے دور رہتا ہے۔

خاندان اور نشوونما

مفتی صاحب شجرہ طیبہ کی ایک شاخ تھے اور قرآن کریم میں خدائے پاک نے صراحت فرمائی ہے کہ باپ کی نیکی اُس کی اولاد کے لیے سود بخش ثابت ہوتی ہے۔

وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا مِّنْ أَسْوَافِ الْإِنسَانِ، پوری آیت اس طرح ہے:

﴿وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ

كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا

وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ﴾ (کہف/۸۲)

اور وہ جو دیوار تھی، سود و یتیم لڑکوں کی تھی اس شہر میں، اور اُس کے نیچے اُن

کا مال گڑا تھا اور اُن کا باپ نیک تھا، پھر تیرے رب نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ

جائیں اور اپنا گڑا ہوا مال نکالیں، تیرے رب کی مہربانی سے۔

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفتی صاحب مرحوم نے اپنے والد ماجد کے صلاح و تقویٰ

سے بھرپور حصہ پایا، یا دوسرے الفاظ میں: اللہ پاک نے انھیں والدِ گرامی کے صلاح و

تقویٰ کی بہ دولت خوب نفع پہنچایا اور اُن کے ساتھ لطف و رحمت کا معاملہ فرما کر

انھیں خوش بخت اور ایک مفتی عالم دین بنا دیا۔

مفتی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا حامد حسن لنگوہیؒ (متوفی ۲۱ محرم ۱۳۷۱ھ

مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء، جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم تھے، پھر

دارالعلوم کے صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے) کے شاگرد اور عالم باعمل،

مجاہد جلیل اور برصغیر ہند میں شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور حضرت مولانا حسین احمد

مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) کے ساتھی تھے۔

مولانا حامد حسین صاحب کو اُن کے اُستاد حضرت شیخ الہندؒ نے ”نہہور“ ضلع ”بجنور“

صوبہ اتر پردیش میں مدرس بنا کر بھیجا۔ آپ وہاں زندگی بھر بچوں کو دینی علوم پڑھاتے اور اُن کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے، اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے، آپ انھیں دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور بھیج دیتے۔ اُس شہر کو آپ نے کبھی چھوڑنا گوارا نہ کیا، تا اُس کہ وہیں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں سپرد خاک کر دیے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اُن کے مرض وفات نے شدت اختیار کی، تو فرزند رشید مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے درخواست کی کہ وطن آ جائیں؛ تاکہ وہ اور دیگر افراد خاندان اچھے طریقے پر اُن کی تیمارداری کر سکیں؛ لیکن انھوں نے یہ کہتے ہوئے بات رد کر دی کہ کل قیامت کے دن اگر میرے استاذ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ ”میں نے ایک مدرسہ تیرے حوالے کیا تھا؛ لیکن تو اسے چھوڑ کر اپنے وطن چلا گیا“، تو میں کیا جواب دوں گا؟

مولانا حامد حسن نیک و صالح، عشق الہی سے سرشار، حلال و حرام کی بہت زیادہ تمیز کرنے والے، عمل و ترک عمل دونوں میں رضاے الہی کے جو یا، سامان دنیا کے سلسلے میں زاہد و قانع اور متاع آخرت کے مشتاق تھے۔ امورِ تعلیم و تربیت کی انجام دہی کے ساتھ، شہر کی جامع مسجد میں امامت بھی کیا کرتے تھے؛ لیکن اہل شہر کے شدید اصرار کے باوجود اس کا کوئی وظیفہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار اُن کا شدید اصرار ہوا، تو فرمایا: اگر آپ حضرات اس سلسلے میں مجھ پر دباؤ ڈالنے سے باز نہیں آئیں گے، تو میں امامت سے کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ مولانا کے صاحب زادے مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا: ابا جان! اگر آپ اپنے لیے یہ مباح معاوضہ قبول ہی فرمائیں، تو کیا حرج ہے؟ مولانا نے فرمایا: ”میں علم تو بیچتا ہی رہا، کیا اب اپنی نمازیں بیچنے پر بھی اتر آؤں؟“

مولانا حامد حسن صاحب دعوتیں کھانے پر راضی نہیں ہوتے تھے اور اگر کوئی تیار کھانا اُن کے پاس بھیج ہی دیتا، تو پڑوس میں کسی بھوکے شخص کو ہدیہ کر دیتے۔ انھیں کسی بھی طرح سے لوگوں سے خدمت لینا بالکل پسند نہ تھا، وہ صرف لوگوں کی ہی خدمت

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن لنگوہیؒ

کرنا پسند کرتے تھے۔ اپنے احتیاط کے سلسلے میں وہ یہاں تک پہنچے ہوئے تھے کہ وضو کرتے وقت مسجد کے لوٹوں کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے تھے اور اپنا لوٹا اس مقصد سے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے دادا حاجی خلیل احمد صاحبؒ بھی اتباع سنت اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے شدید اہتمام میں مشہور و معروف تھے۔ وہ ہمیشہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (پانی دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اُن سے تربیت دین اور تزکیہ قلب کی تعلیم پاتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد انھوں نے اپنا رشتہ حضرت العلام مولانا رشید احمد لنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) سے قائم کر لیا اور اُن کی صحبت اختیار کی۔ آپ نہایت رفیق القلب اور اللہ کے حضور بہت زیادہ رونے والے تھے، خلوت بہت پسند تھی، اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے ہوئے مرشد کبیر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (دارالعلوم کی بانی جماعت اہل اللہ کے روحانی مربی، متوفی و مدفون مقبرہ معلّٰۃ مکہ مکرمہ ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کے پرسوز اور رقت انگیز اشعار گنگناتے تھے۔

اسی نیک و صالح باپ اور صاحب ورع و تقویٰ دادا کے گھر مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا اور دونوں بزرگوں کی پسندیدہ صفات اور نیک خصوصیات اُن میں منتقل ہوئیں۔ انھیں صالح تربیت اور نشوونما ملی۔ بچپن سے ہی انھوں نے اپنے اوقات کو قیمتی سمجھا اور انھیں سنبھال سنبھال کر خرچ کیا، اپنے لیے فائدہ بخش کاموں میں استعمال کیا اور بے سود کاموں سے دور رکھا۔ انھی چیزوں کی برکت تھی کہ ذی استعداد عالم اور ژرف نگاہ فقیہ بن کر نکلے۔ آپ نے جو علوم پڑھے تھے، اُن پر آپ کی غائرانہ نظر تھی اور اُن کا پورا پورا استحضار تھا۔ اس میں بہت کچھ دخل اُن کی صلاح و تقویٰ کے آمیزے سے تیار شدہ ذکاوت و ذہانت اور بارگاہ ایزدی سے عطا کردہ محنت کا تھا۔

مفتی صاحب مرحوم کی ولادت شہ جمعہ، مورخہ ۸ یا ۹ جمادی الثانی (۱۳۲۵ھ)

پس مرگ زندہ

۱۹۰۷ء کو شہر ”گنگوہ“ ضلع ”سہارن پور“ میں ہوئی۔ جب آپ کچھ باشعور ہوئے، تو آپ کے والد ماجد نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائپوری (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء-۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء) سے درخواست کی کہ آپ کی بسم اللہ کرا دیں اور آپ کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمادیں۔ یہ رسم ہندوستان کے نیک اور شریف گھرانوں میں رائج رہی ہے۔

تعلیم و تربیت

مفتی صاحب مرحوم نے ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں حاصل کی، جو شہر ”گنگوہ“ کے محلہ ”بہاء الدین“ میں مولانا حامد حسن صاحب کے گھر کے پاس، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صاحبزادی کے مکان کی بیٹھک میں قائم تھا، استاذ ایک نابینا بزرگ حافظ کریم بخش تھے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اُن کے پاس ہی قرآن کریم حفظ کیا، البتہ آخر قرآن سے سترہ سطریں باقی تھیں کہ حافظ کریم بخش کو اللہ کا بلاوا آ گیا، اس کے بعد مفتی صاحب نے جامع مسجد گنگوہ کے امام و مدرّس حافظ عبدالکریم صاحب کے پاس جا کر حفظ قرآن پاک کی تکمیل کی۔

فارسی، اردو اور عربی کی مبادیات و قواعد اولاً مولانا فخر الدین گنگوہی (شاگرد مولانا مظہر نانوتوی متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء) سے گنگوہ میں، مولانا امتیاز حسین صاحب سے اور اپنے والد ماجد مولانا حامد حسن صاحب سے ”نہنور“ میں ہی پڑھے، پھر سہارن پور چلے آئے، جہاں ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مشہور مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور پورے سات سال وہاں مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور یہاں کبارِ آساتذہ سے علوم شرعیہ کی تحصیل فرمائی۔ بالخصوص عالم باعمل، مجاہد جلیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھی، پھر اُسی سال یعنی ۱۳۵۰ھ میں دوبارہ مظاہر علوم سہارن پور

چلے گئے، جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ بمقام مدینہ منورہ) بن حضرت مولانا محمد تکی کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء) سے سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی اور حضرت مولانا عبدالرحمن کیمیل پوری رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ مظاہر علوم سے سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور دوسرے اساتذہ کرام سے دوسری کتب احادیث پڑھیں۔

تدریس و افتاء اور تربیت و دعوت کے میدانوں میں

مفتی صاحب مرحوم کے کارہائے نمایاں

مفتی صاحب مرحوم ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں بیس روپے ماہ وار پر مظاہر علوم میں مفتی کے عہدے کے لیے متعین کیے گئے اور ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء تک مفتی اور بعد میں مندرجہ کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ آپ نے اُس وقت فقہ و تفسیر اور بلاغت کی چند کتابیں پڑھائیں۔ پھر اُسی سال یعنی ۱۳۷۳ھ کے ماہ ربیع الاول میں اتر پردیش کے بڑے تجارتی شہر ”کانپور“ کے مدرسہ ”جامع العلوم“ میں منتقل ہو گئے۔ اللہ پاک نے آپ کی موجودگی میں مدرسہ اور شہر میں خوب خیر و برکت عطا فرمائی۔ مدرسے میں آپ کی نسبت کے طفیل نمایاں ترقی ہوئی اور شہر ”کانپور“ تو آپ کی سرگرمیوں کا خاص مرکز بنا رہا۔ آپ نے ”کانپور“ اور قرب و جوار کے علاقوں میں بدعات و خرافات کا پوری جواں مردی سے مقابلہ کیا اور فرق باطلہ کے مقابلے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں؛ چنانچہ اُن سے مناظرے کیے اور خود اُن کی کمین گاہوں میں اُن کا تعاقب کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے عقائد کی تصحیح اور انھیں کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات سے واقف اور آگاہ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہونے دیا۔ آپ نے مختلف اسلامی مضامین کی تدریس کے سلسلے میں پوری محنت صرف کر ڈالی؛ چنانچہ روزانہ ۱۲ مضامین پڑھاتے تھے، جب کہ مختلف قریبی اور دور دراز علاقوں سے مدرسے میں

بھیجے گئے سوالات کے جوابات اور افتا کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد تھی، مدرسے کے کتب خانہ، دارالاقامہ اور مطبخ کی نظامت کے فرائض بھی آپ ہی انجام دیتے تھے، ساتھ ہی آپ کو مختلف عوامی علاقوں سے بہ راہ راست رابطہ بھی رکھنا پڑتا تھا؛ تاکہ اُن میں مدرسے کا اثر و رسوخ پھیلے اور عقائد کو بدعات و خرافات اور اوہام و خیالات سے پاک کرنے کے سلسلے میں اُس اثر و رسوخ کو استعمال کیا جائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کانپور اور اُس کے اطراف و نواح کے علاقے، پرانے زمانے سے ہی بدعات و خرافات کا ڈھ تھے۔ اس سے پہلے بھی یہاں ایک عظیم مصلح، داعی اسلام، بدعات و خرافات اور قبر پرستی کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے والی اور عقائد کو آلودگیوں سے پاک صاف کرنے کا بیڑا اٹھانے والی شخصیت نے ان حالات سے نبرد آزمانی کی تھی، میری مراد مرنبی کبیر، مردِ جلیل حضرت علامہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی ذاتِ گرامی سے ہے، جنہیں برصغیر ہند میں ”حکیم الائمہ“ کے لقب سے جانا جاتا ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ لقب اُن کی مصلحانہ شخصیت کے بالکل عین مطابق ہے۔ حضرت تھانوی ”کانپور“ میں ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء سے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء تک مسلسل تقریباً ۱۴ سال رہے اور یہ ایک بے مثال مُعلِّم، بے نظیر داعی اور عظیم مصلح کے فرائض انجام دیے اور برابر غیر اسلامی رسوم و رواج سے پوری قوت کے ساتھ نبرد آزما اور کتاب و سنت کی گہری تعلیمات سے ماخوذ عقائدِ صحیحہ کی نشر و اشاعت کے لیے ہر طرح سرگرم عمل رہے۔

اُن کے بعد مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ یہاں فروکش ہوئے اور ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء سے ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء تک تقریباً ۱۵ سال اُن کا قیام رہا۔ اس دوران حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مسلسل اُسی مہم کو انجام دیا، جس کا بیڑا اُن کے سلفِ عظیم حضرت تھانویؒ اٹھا چکے تھے۔ اُن دونوں حضرات کی انتھک جدوجہد اور کوششوں سے ”کانپور“ اور اُس کے اطراف کے گاؤں میں بڑی حد تک کتاب و سنت کی روشنیاں پھیل گئیں اور بدعات و خرافات کی

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

طاقتیں کم زور پڑ گئیں، جب کہ اُن مبارک مساعی سے پہلے یہ طاقتیں اِن علاقوں میں کھلے بندوں چوکڑیاں بھرتی اور دندانائی پھرتی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کے کارنامے

سابق صدر شعبہ افتادارالعلوم دیوبند مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ (متوفی ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء سے ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء تک کے عرصے میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے؛ لیکن جب سن رسیدہ ہو گئے اور مرض نے شدت اختیار کر لی، تو دارالعلوم نے پوری جدوجہد کے ساتھ اُن کے قائم مقام کی تلاش شروع کر دی، بالآخر نظیر انتخاب حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ پر پڑی۔ چنانچہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مجاہد جلیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے فرزند اکبر مولانا سید اسعد صاحب مدنی حال ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند (۱) نے آپ سے اصرار کیا اور خود آپ کے بزرگ اور محترم استاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ نے بھی حکم فرمایا کہ وہ دارالعلوم میں صدر مفتی کا عہدہ قبول کر لیں۔ دراصل حضرت مفتی صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ مدرسہ جامع العلوم ”کانپور“ میں ہی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں؛ کیوں کہ آپ نے وہاں رہ کر کتاب و سنت کے علوم اور دین و دعوت کی خدمت کے لیے، اپنی تمام تر جدوجہد اور توانائیاں صرف کی تھیں اور اس طویل عرصے کے بعد اپنی انتھک مساعی کو بار آور بنانے کے لیے زمین کو ہم وار کیا تھا؛ لیکن اِن اکابر علما کے حکموں کے سامنے انھیں سر تسلیم خم کرنا پڑا اور انھوں نے ۲۶ رجادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ/۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شعبہ افتادارالعلوم دیوبند میں اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ دارالعلوم نے آپ کو صدر مفتی کی حیثیت سے بلایا تھا؛ لیکن آپ نے فرط تواضع سے یہ قانونی

(۱) بہ وقت ترتیب ایں مضمون برائے اشاعت بہ شکل کتاب متوفی بدروز دوشنبہ ۷/محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶/فروری ۲۰۰۶ء۔

منصبِ صدارت اپنے رفیقِ کار حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم (۱) کے سپرد کر دیا اور خود شعبے میں ایک فرد کی حیثیت سے کام کرنے پر ہی رضا مند ہو سکے۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) سابق صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچے اور اُس عمر کی کمزوریاں اور عوارض انھیں زیادہ محسوس ہوئے، تو انھوں نے مفتی محمود حسن صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ میری جگہ بخاری شریف کی جلد ثانی پڑھائیں۔ شروع میں مفتی صاحب مرحوم نے یہ درخواست یہ سمجھتے ہوئے قبول نہیں فرمائی کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں؛ لیکن جب مولانا فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ کا اصرار ہوا، تو آپ نے ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں یہ عظیم ذمہ داری بھی انجام دینی شروع کر دی۔ جس سال حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، آپ نے صحیح بخاری کی دونوں جلدوں کا درس دیا۔ جو لوگ حضرت شیخ الہندؒ اور محدث کبیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء) جیسے یگانہ روزگار اساتذہ حدیث کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی کی علم حدیث میں مہارت، علوم شرعیہ میں ژرف نگاہی اور عقلی و نقلی علوم کے وسیع مطالعہ کا حال جانتے ہیں، وہ حضرت مولانا کی جگہ، أصح الكتب بعد کتاب اللہ بخاری کی تدریس کے لیے کسی کے اقدام کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں؛ لیکن مفتی صاحب مرحوم کو کسی نزاکتِ حال کا سامنا نہیں ہوا، اور اُن کے اسباقِ طلبہ دورہ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کے لیے جامع اور تسلی بخش رہے، جس کا سبب علوم شرعیہ کا وسیع مطالعہ، اُن پر کامل دست گاہ اور اُن کی وہ ذہانت و ذکاوت تھی، جس کا رشتہ صلاح و تقویٰ اور سیرتِ نبی ﷺ سے مستفاد اخلاقِ حسنہ سے مجوا ہوا تھا۔

لیکن مفتی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی کی وفات کے

(۱) بہ وقتِ اشاعتِ این مضمون بہ شکل کتاب ۱۳۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔ وفات: شبِ شنبہ و یک شنبہ: ۲۰-۲۱/ ذی

قعدہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۲۶-۲۷ فروری ۲۰۰۰ء۔

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

بعد ذمہ داروں کے سامنے اس خدمت کی مسلسل انجام دہی سے معذرت ظاہر فرمادی، انھوں نے اُن کے سامنے واضح فرمادیا وہ صرف مولانا فخر الدین صاحبؒ کی شدید خواہش پر اور اُن کی سن رسیدگی اور ضعف کا لحاظ کرتے ہوئے آج تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے ہیں۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کی بہ حالی کے بعد بھی آپ نے ذمہ داروں کے اصرار پر کبھی کبھی بعض کتب حدیث بالخصوص سنن نسائی کا درس دیا۔

دارالعلوم میں رہائش

مفتی صاحب مرحوم اپنی ذمہ داری سنبھالنے لیے جب دارالعلوم تشریف لائے، تو شروع میں مہمان خانہ دارالعلوم میں فروکش ہوئے، پھر وہاں سے دارالعلوم کی مسجد قدیم کے ایک کمرے میں آگئے یہ کمرہ مسجد کے اُس دروازے سے متصل ہے، جو سڑک پر کھلتا ہے اور مہمان خانے کے دروازے کے عین مقابل میں واقع ہے۔ اس سے پہلے حضرت مولانا محمد اعزاز علی امرہوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) جو ”شیخ الادب والفقہ“ کے لقب سے جانے جاتے ہیں کا بھی اسی کمرے میں قیام رہا ہے۔ اخیر میں حضرت مفتی صاحب مرحوم ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۷۱ء کو یہاں سے منتقل ہو کر مسجد چھتہ کے شمالی جانب کے کمرے میں آگئے۔ یہ وہی کمرہ ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے بانی مجتبیٰ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ اپنی دیوبند میں آمد اور اقامت کے وقت ہمیشہ قیام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمانے میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خواہش و رغبت کا فرما تھی۔ حضرت مفتی صاحب وفات تک مسلسل اسی کمرے میں قیام پذیر رہے۔

علمی کارنامے

مفتی صاحب مرحوم کی مشغولیات بے پناہ تھیں، تدریس، افتاء، دعوت و تبلیغ اور

اصلاح و ارشاد کی مسلسل مصروفیت کے ساتھ ساتھ تخریب کن فرقوں سے مقابلہ آرائی اور فساد انگیز جماعتوں سے نبرد آزما کی پیہم سرگرمیاں بھی رہا کرتی تھیں، ان متنوع اعمال و مصروفیات نے موقع ہی نہیں دیا کہ مفتی صاحب مرحوم بہ قلم خود کوئی کتاب لکھیں؛ البتہ آپ کے اہل مجلس، مستفیدین اور تربیت پانے والوں میں جو ذی استعداد علما تھے، انھوں نے آپ کے نتائج افکار، خلاصہ تحقیقات، اور ساتھ ہی آپ کے فتاویٰ، رسائل و خطوط اور ملفوظات کی تدوین و ترتیب کا گراں بہا کام انجام دیا اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

● فتاویٰ بڑی تقطیع پر ۱۸ جلدوں میں ہیں، تمام جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۷۷۱۳ سات ہزار سات سو تیرہ ہیں۔ یہ فتاویٰ بہت بڑا علمی سرچشمہ اور گراں قیمت سرمایہ شمار کیے جاتے ہیں۔ علما و مفتیان کرام اور فقہاء و محدثین کو اس ذخیرے سے اُس وقت بڑی مدد ملتی ہے، جب ان پر مسائل و قضایا اور استفتا کی یورش ہوتی ہے، یا وہ علمی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فتاویٰ برصغیر ہند میں بہت زیادہ متداول ہیں۔

● اس کے بعد دوسری اہم اور خاصے کی چیز ان کی مجالس کی گفتگو کا مجموعہ ہے، جسے ”ملفوظات فقیہ الامت“ کے نام سے مرتب کیا گیا ہے، اسے متوسط تقطیع پر دس جلدوں میں منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۱۸۴ (گیارہ سو چوراسی) ہے۔ اس مجموعے میں آپ علمی نکتے، معاشرتی مسائل، فکری نوادرات، دعوتی افکار، صالح تربیت کے اصول، شعور آفرینی کے مناہج و اسالیب، اصلاح و ارشاد کے طریقے، دعوتی خیالات، باطل مذاہب کے بانیوں اور اہل بدعت و ہوا پرستوں پر ٹھوس اعتراضات اور بہت سے اسلامی فرقوں اور جماعتوں کے ہاں پائی جانے والی فکری غلطیوں کی طرف ظریفانہ اشارے اور ان کے دل چسپ محاسبے: یہ سب کچھ بھرپور مقدار میں پائیں گے۔

● تیسری اہم اور یادگار چیز ان رسائل و خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

مُخْلِصِین و مُجْتَبِین اور حصولِ تربیت کا رشتہ رکھنے والوں کے نام لکھے ہیں، اُن میں علمائے کرام، تعلیم یافتہ حضرات اور مختلف عوامی طبقات کے لوگ شامل ہیں۔ اس مجموعے کا نام ”مکتوباتِ فقیہ الامت“ ہے، یہ چھوٹی تقطیع پر تین جلدوں میں ہے، جن کے مجموعی صفحات ۵۸۴ (پانچ سو چوراسی) ہیں۔ ان رسائل کا بڑا حصہ دعوتی اور اصلاحی امور پر مشتمل ہے، جن سے قاری کا نفس سنورتا اور اُس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے پڑھنے سے آخرت کی یاد اور عقبی کی فکر اُس کے دل میں جگمگ پاتی ہے۔ یہ خطوط، اس فانی دنیا اور اس کی ڈھلتی چھاؤں پر مر مٹنے سے زیادہ اپنی عاقبت پر توجہ دینے پر ابھارتے ہیں۔

● اس کے بعد حضرت مفتی صاحب مرحوم کے مواعظ و خطبات کا مجموعہ بڑا مفید اور گراں قدر سرمایہ ہے، جسے متوسط تقطیع پر ۹ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۱۲۸ (گیارہ سو اٹھائیس) ہے۔ یہ مجموعہ بھی مفتی صاحب مرحوم کے دعوتی رجحانات کا عکاس ہے اور اُن کی اصلاحی سرگرمیوں کا نمائندہ ہے، جن میں ایک داعی کی بے قراری و بے چینی ہے، عالمِ باعمل کے خیالات و افکار کا نور ہے اور عشقِ الہی سے سرشار اور ذوقِ نیم شبی سے سرمست عبادت گزار بندے کے تجربات و مشاہدات کی تجلّی ہے، چنانچہ یہ مواعظ بہت فائدہ مند، نہایت اثر انگیز اور دلوں میں فوراً اتر جانے والے ہیں، ان کا مطالعہ ہر ایسے مسلمان کے لیے نفع بخش ہے، جو دنیا کی بہ جائے اپنے دین کی بگڑی بنانا چاہتا ہے اور فانی زندگی کو چھوڑ کر حیاتِ جاوداں کی بہتری اور وہاں کی سرخ روئی کا خواہاں ہے۔

اسی طرح مختلف کتابوں میں، مختلف عنوانوں کے تحت، آپ کے مزید علمی و دعوتی افادات جمع کیے گئے ہیں، جن میں سے اہم کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں:

- ۱۔ مسلکِ علمائے دیوبند اور محبتِ رسول ۲۔ مراحلِ علم و علم نافع ۳۔ جواہرِ علمیہ
- ۴۔ یومی معمولات و اُوراد ۵۔ اسبابِ لعنت کی چھل حدیث ۶۔ اسبابِ غضب اور چھل حدیث ۷۔ حدود و اختلاف ۸۔ آسان فرائض ۹۔ ارمغانِ اہل دل ۱۰۔ جنوبی افریقہ میں

تکوین نذر

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی دعوتی خدمات (۲ جلدیں) ۱۱- سرکاری سودی قرضے
۱۲- رفع یدین ۱۳- حقیقت حج ۱۴- وصف شیخ (اپنے اُستاد اور مربی شیخ الحدیث حضرت
مولانا زکریا کاندھلویؒ کے سلسلے میں مفتی صاحبؒ کے تاثرات) ۱۵- شوریٰ و اہتمام
۱۶- مجموعہ اشعار مفتی صاحب مرحوم ۱۷- اسباب مصائب اور اُن علاج۔

اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں ہیں جو ابھی زیر ترتیب ہیں، یہ سبھی کتابیں اردو
زبان میں ہیں اور مفتی صاحب مرحوم کی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں عمیق علم،
وسعت مطالعہ، سلامتِ فہم، استقامتِ فکر، اعتدالِ نظر، فیصلے میں توازن اور کسی نتیجے تک
پہنچنے میں غور و فکر، یہ تمام اوصاف، صاف صاف جھلکتے ہیں۔ ساتھ ہی اخلاص
و احتساب اور بندوں کی اصلاح و تربیت کی روح اُن علمی افادات کے لفظ لفظ میں
دورٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ادبی و شاعرانہ ذوق

مفتی صاحبؒ اپنی باوقار علمی و دینی و تربیتی شخصیت کے ساتھ، خوش فکر شاعر بھی
تھے، اُنھوں نے یہ فن کسی استاذ سے نہیں؛ بل کہ اپنی فطری صلاحیت اور موزوں طبیعت
سے حاصل کیا تھا، وہ اکثر برجستہ شعر کہتے، جس میں زبان کی صفائی و سلاست کے ساتھ،
علم و فکر کے آب دار موتی لفظ لفظ سے ڈمکتے ہوئے محسوس ہوتے۔ حمد و نعت، دینی حقائق،
سلوک و معرفت اور اصلاح و تربیت کے مختلف الجہات موضوعات پر آپ نے جو اشعار
و قافیاں کہے ہیں، اُن سے آپ کا مکمل دیوان تشکیل پا کر زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

علمی، اصلاحی اور دعوتی اسفار

مفتی صاحب مرحوم نے مختلف اسلامی ممالک کے دورے اور اسفار کیے اور اُن
میں آپ کا طویل و مختصر مطابق پروگرام قیام رہا، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی، حج و عمرہ کے

اسفار کے موقع سے بارہا زیارت کی۔ اپنے مخلصین اور معتقدین کی دعوت پر پاکستان اور بنگلہ دیش بارہا جانا ہوا اور بسا اوقات اُن کی خواہش پر وہاں طویل قیام کیا اور رمضان المبارک کے مہینے گزارے، اسی طرح افریقہ بھی آپ کی خاص بیرونی اقامت گاہ تھا، یہاں دعوتی، اصلاحی اور تربیتی اُمور کی انجام دہی کے لیے کتنے ہی مرتبہ لمبی مدتوں تک قیام رہا، جن ممالک کے آپ نے اسفار کیے، اُن میں برطانیہ، امریکہ، کناڈا، ری یونین، زامباوے، زمبیا، موریشش اور وہ دوسرے ممالک ہیں، جہاں ہندوپاک کے مسلمان بستے ہیں۔ وہاں بہت سے آپ کے دست گرفتہ اور آپ سے دینی اصلاحی تربیت کے لیے تعلق رکھنے والے رہتے ہیں، اللہ نے انھیں آپ کے وجود سے نفع پہنچایا اور دیگر علما و مشائخ دیوبند کی کوششوں اور مفتی صاحب مرحوم کی مبارک جدوجہد کے طفیل اُن ممالک میں عظیم دینی کام یا بیاں سامنے آئیں اور کئی تعلیمی و تربیتی ادارے قائم ہوئے، جو مسلم نسل کی تعلیم اور اصول دین کے مطابق تربیت کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں اور اُسے اُن اسلحوں سے مسلح کر رہے ہیں، جن سے وہ خدا بے زار مادیت کی لہر کو روک سکے اور مغربی ممالک میں، جنھوں نے ہدایت ربانی سے منھ موڑ کر سائنس کے دعاوی پر آمنا و صدقنا کہا؛ ٹھانھیں مارتی ہوئی تہذیبی برائیوں کے طوفان میں اپنے اور دوسروں کے دین و ایمان کو محفوظ رکھ سکے۔

نسب اور گھریلو علمی و دینی حالات

مفتی صاحب مرحوم کا نسب صحابی رسول ﷺ سیدنا ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، جنھوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی پہلی بار مدینہ تشریف آوری پر ضیافت کا شرف حاصل کیا۔ مفتی صاحب مرحوم کا نسب حسب ذیل ہے:

(حضرت مولانا مفتی) محمود حسن بن مولانا حامد حسن بن الحاج قاضی خلیل احمد بن ولی محمد بن قلندر بخش بن محمد اعلیٰ بن غلام رسول بن عبد الحمید بن قاضی محمد فاضل بن قاضی

جمیل احمد بن قاضی خلیل محمد بن قاضی ولی محمد بن قاضی محمد کبیر بن قاضی امین بن خواجہ فرید بن خواجہ شاہ بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاء الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ بدا بن خواجہ عبد الحمید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ اسماعیل بن خواجہ شیخ الاسلام عبد اللہ ہروی بن خواجہ ابو منصور محمد بلخی بن جعفر بن ابو معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابو منصور مت (صامت؟) (انصاری ہروی تابعی بن ابو ایوب خالد خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ)۔ ۲۶۱۴ see

اس نسب کا شجرہ ہندوستان کے بہت سے ایسے شریف علمی گھرانوں میں موجود ہے، جن کا نسب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے؛ لیکن اس میں اختلال و انقطاع کا قوی احتمال ہے اور اہل علم بھی اس کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں، خصوصاً حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد و اتحاد اور پھر ان کی اولاد و اتحاد سے متعلق فوقانی فہرست میں؛ لیکن اس کے باوجود یہ بات محقق ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نسب اُسی طرح عظیم صحابی رسول سے جاملتا ہے، جس طرح مرتبی جلیل، فقیہ نبیل اور محدث بے مثل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور علما فرنگی محل لکھنؤ اور دوسرے علما و مشائخ کرام کا نسب اُن تک پہنچتا ہے۔

آپ کے والد ماجد مولانا حامد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فاضل دارالعلوم دیوبند کے تین بھائی تھے:

محمد یامین، منشی سعید احمد اور قاضی یسین۔

مفتی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا حامد حسن صاحب نے آپ کا نکاح، آپ کے چچا قاضی یسین کی صاحبزادی سے کیا، جن سے دولڑکے ہوئے، پہلے عبد الرحمن، جو مردہ پیدا ہوئے اور دوسرے عبد الرحیم، جن کی بچپن ہی میں وفات ہوئی؛

پس مرگ زندہ

مفتی صاحب مرحوم کی ایک پھوپھی بھی تھیں، جن کا نام حلیمہ تھا۔ اُن کے شوہر محلہ بہاء الدین“ گنگوہہ کے ہی رہنے والے تھے۔ اس محلے میں بہت پرانے زمانے سے اُن کے آباؤ اجداد بستے آرہے تھے۔ ان پھوپھی محترمہ کے ایک لڑکا تھا، جن کا نام ”الطاف الرشید“ تھا۔ یہ انتقال مکانی کر کے پاکستان چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اگر انسان اپنے کردار و عمل میں پستہ قد ہو، تو صرف نسب اُسے رفعت و اقبال نہیں بخش سکتا۔

خداے پاک کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ﴾ (احزاب: ۱۳) ترجمہ: تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مُعَزَّز، تم میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہیں۔

مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے ہی خوش بخت تھے کہ انھیں نسبِ عالی کے ساتھ عملِ صالح، اور علومِ شرعیہ میں کامل دست گاہ کے ساتھ دلِ دردمند اور قلبِ ارجمند عطا ہوا۔ ہزاروں خلقت میں آپ کو محبوبیت و مقبولیت ملی، بندوں کی یہ محبت بتاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی آپ محبوب تھے؛ اس لیے کہ خداے پاک ہی سب سے پہلے کسی بندے سے محبت کرتا ہے اور پھر اُس کی محبت اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

صحت و تن دُرستی

مفتی صاحب مرحوم کی بچپن سے صحت اچھی تھی؛ البتہ وقفے وقفے سے انھیں دورانِ سر لاحق ہوتا رہتا تھا؛ چنانچہ صغرِ سنی ہی کا واقعہ ہے کہ آپ کے حفظِ کلامِ پاک کے استاذ حافظ عبد الکریم صاحب امام جامع مسجد گنگوہہ، جن کے پاس آپ نے قرآن کریم کے حفظ و دور کی تکمیل کی، آپ سے بہ حالتِ قیام قرآن کریم کا ایک متعینہ حصہ سنتے تھے، تو آپ کبھی کبھی دورانِ سر کے لاحق ہو جانے کی بنا پر گر پڑتے تھے۔

لیکن جب نگاہ کم زور پڑ گئی اور ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں کلکتہ میں آنکھوں کا آپریشن ہوا، پھر دوبارہ لندن میں دہنی آنکھ کا آپریشن ہوا، جس کی بینائی بعد میں جاتی رہی اور اب آپ صرف بائیں آنکھ سے ہی کچھ دیکھ سکتے تھے، اس کے بعد مختلف جسمانی عوارض سے دوچار رہنے لگے۔ ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء میں آپ کے دل کا آپریشن ہوا اور دل کی حرکتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے مشین لگا دی گئی؛ تاکہ دل، مطلوبہ شکل میں صحیح صحیح کام کرے۔ ایک بار آپ کو کھانسی ہو گئی اور مہینوں ختم نہیں ہوئی۔ آپ نے خادم مولانا محمد ابراہیم صاحب افریقی سے کہا: لگتا ہے کہ اسی کھانسی میں میری زندگی تمام ہو جائے گی؛ لیکن آپ کے معالج خاص اسی دوران ہندوستان آئے اور آپ کا علاج کیا، جس سے یہ مرض بڑی حد تک ختم ہو گیا، اس کے بعد پہلے کی طرح یہ تکلیف بھی باقی نہیں رہی۔ کئی سالوں سے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے کہ ایک بار اچانک دورانِ سراحق ہو گیا اور گر پڑے، جس سے ران سے اوپر کی ہڈی میں کچھ شکن آ گئی اور اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گئی۔ اکسرے کرنے کے بعد آپ کو دہلی لے جا کر ڈاکٹروں کو دکھایا گیا اور علاج ہونے لگا؛ لیکن جب تھوڑے دنوں کے بعد ڈاکٹر عبدالحی امریکہ سے آئے، تو انھوں نے دوبارہ اکسرے کرانے کا مشورہ دیا۔ اکسرے کے بعد معلوم ہوا کہ آج تک جو علاج ہوتا رہا، اُس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر دوسرے آپریشن کی رائے دی۔ الحمد للہ کہ یہ دوسرا آپریشن کامیاب رہا اور بڑی حد تک آپ کی صحت بہ حال ہو گئی۔

ایک عرصے کے بعد آپ کے خادم خاص مولانا محمد ابراہیم افریقی، طبی معائنے کے لیے آپ کو دہلی لے گئے، دہلی میں نظام ہضم میں اختلال در آیا اور ڈاکٹروں کے لیے اس کی تہ تک پہنچنا بڑا مشکل ہو گیا، چنانچہ دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل کیے گئے اور ہفتوں علاج جاری رہا۔ اس مرض کا آپ کے حافظے پر بڑا اثر پڑا اور اکثر اوقات آپ پر بے ہوشی طاری رہنے لگی۔ دیوبند واپسی کے بعد بھی یہ صورتِ حال ختم نہیں ہوئی؛ لیکن

اس حالت میں بھی اگر افاقہ ہوتا، تو آپ لوگوں کے سوالات اور سلاموں کا جواب صحیح طور پر دیتے تھے، حتیٰ کہ الفاظ کی صحت ادا کی اور ان کی ترتیب بھی نہیں بدلتی تھی اور جب بے ہوشی اور غفلت ہوتی، تو ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔

اس مرض کے بعد بینائی بالکل ختم ہو گئی، حضرت مرحوم کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کوئی چیز ہے؛ لیکن اُسے واضح اور متعین شکل میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح قوتِ سماعت بھی متاثر ہو گئی تھی اور اخیر عمر میں تو صحیح طور پر کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وفات حسرت آیات

حضرت مرحوم نے اپنے محبین کی دعوت پر ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ کو دہلی سے ”جوبانس برگ“ جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور اپنے خادم خاص جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب افریقی (۱) کے پرانے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں حضرت مرحوم برابر صحت یاب ہوتے رہے اور اپنے مصاحبین اور مستفیدین کے ساتھ دیر تک بیٹھنے بھی لگے۔ آپ انھیں علمی معلومات، دعوتی نصائح اور اصلاحی مواعظ سے فیض یاب فرماتے، ساتھ ہی عبادتوں میں پہلے کی طرح ہی مجاہدہ فرماتے۔ آپ نے یہاں کئی علمی اور تبلیغی دورے کیے، جن کے دوران وہاں کے مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں، اجتماعات میں تقریریں کیں، لوگوں کے پاس بیٹھے اور علمائے کرام اور دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے والے افراد سے ملے۔

لیکن حضرت مرحوم کو اس سے پہلے سے ہی گردے میں تکلیف کی شکایت تھی۔ دراصل گردے اور مثانے کی درمیانی نالی میں غدود پیدا ہو گیا تھا اور اخیر میں بڑھ کر مثانے

(۱) آپ کے یہ خادم خاص سفر و حضر، ہندو بیرون ہند، دیوبند اور ہندوستان کے دیگر شہروں کے اسفار میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے اللہ انھیں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے، وہ اس وقت آپ کے اجل خلفا میں ہیں؛ بل کہ ان کے درمیان انھیں ارفع مقام حاصل ہے۔

تک پھیل گیا تھا۔ آپ کے دونوں معالج خاص: ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا امریکی اور ڈاکٹر محمد لہر نے ڈاکٹر محمد خان کی شرکت و تعاون سے غدد و کما کام یاب آپریشن کیا، پھر ہر ہفتے نالی کی صفائی کی جاتی رہی۔ آخری عمل صفائی سے پہلے ہی خد ام نے ”ڈربن“ کا سفر ترتیب دے دیا، اس سفر کے بعد کے متعلق طے تھا کہ آپ ”ہرارے“ جائیں گے، جہاں آپ اپنی نواسی سے اور ”ہرارے“ کے مدارس کے علما و دعاۃ سے ملنا چاہتے تھے اور پھر ”ملاوی“ کے مدارس اور ”چیپٹا“ میں مولانا عبد الرحیم مقل کے مدرسے میں تشریف لے جانا تھا، اُس کے بعد ”فرانس“ کے ایک جزیرے ”ری یونین“ میں مسجد مولانا بدر عالم کا افتتاح فرمانا تھا، ان سب مشاغل کے بعد ہندوستان آتے ہوئے حرمین شریفین کی زیارت اور عمرے کی ادائیگی، اور مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنے کا پروگرام تھا اور ماہ ستمبر ۱۹۹۶ء میں ہندوستان واپسی کا ارادہ تھا۔

لیکن سفر ”ڈربن“ کے دوران ہی کھانسی لاحق ہو گئی اور وہاں سے ”جوہانس برگ“ لوٹتے ہوئے شدت اختیار کر گئی، ڈاکٹر محمد لہر مسلسل آپ کے علاج میں مشغول رہے۔ ”ڈربن“ سے واپسی کے بعد حضرت مرحوم اپنے خادم خاص مولانا محمد ابراہیم صاحب کے بھائی صاحب کے نئے مکان میں مقیم ہوئے۔ فالج کے حملے کی وجہ سے جو چیز بھی آپ کھاتے یا پیتے، سانس کی نالی کے ذریعے پھینک دینے کی طرف آ جاتی تھی۔ معین اُسے آلات سے صاف کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس دوران کبھی آپ کی حالت اچھی ہو جاتی اور کبھی بیماری بہت زیادہ بڑھ جاتی۔ ۲۷-۲۸ اگست ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب میں مرض بہت زیادہ شدت اختیار کر گیا؛ اس لیے آپ ”جوہانس برگ“ کے پارک لین کلینک کے ہسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں داخل کیے گئے، آپ کے معالج خاص ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا بھی آ گئے۔ فالج کی وجہ سے غذا کا معدے تک پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا، ڈاکٹروں نے غذا پہنچانے کی ایک نالی بہ راہ راست معدے سے جوڑ دینا مناسب سمجھا، چنانچہ انھیں محسوس ہوا کہ صحت اچھی ہو رہی ہے؛ لیکن ۲ ستمبر ۱۹۹۶ء کی شام کو اچانک

صحت میں نہایت اضمحلال اور شدید ضعف در آیا اور آپ کی روح جوارِ رحمت میں چلی گئی۔ اس وقت (جنوبی افریقہ کے وقت سے ۲-۳ ستمبر ۱۹۹۶ء: دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ اِنَاللّٰہ وَاِنَا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ہزاروں محبّین آپ کو کاندھوں پر ہسپتال سے لائے اور ”نیوٹاؤن“ کے مدرسے میں آپ کو غسل دینے کے بعد تجھیز و تکفین سے فارغ ہوئے۔ رات بارہ بجے کے قریب آپ کی نعش مبارک مولانا محمد ابراہیم کے گھر میں رکھی گئی۔ اس دوران بے شمار علمائے کرام، مخلصین و محبّین اور مدارس افریقہ کے ذمہ دار حضرات آتے رہے؛ تاکہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کریں اور کاندھادے کر آخری قیام گام تک پہنچا سکیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہم علمائے دیوبند، جن کا شیوہ توفیقِ خداوندی سے، شریعتِ اسلامی اور سنتِ نبوی کی کامل پیروی ہے، جنازوں کو آخری مستقر تک پہنچانے میں جلدی کرتے ہیں؛ لیکن حضرت مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین کے سلسلے میں قانونی عذر کی بنا پر تھوڑی تاخیر ہو گئی۔ افریقی قانون کی رو سے سرکاری کاروائیوں کی تکمیل کے بغیر راتوں کو قبر کھودنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے لوگ منتظر رہے، جب سرکاری دفاتر کھلنے کا وقت ہوا، تو اُن کے لیے ضروری کارروائیوں سے نمٹنا ممکن ہوا۔ نہایت تیزی کے ساتھ ان سب امور سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے ساڑھے نو بجے دن میں (افریقی وقت سے) مولانا محمد ابراہیم صاحب کے گھر سے جنازہ اٹھایا، جو لوگ جنازے کے ساتھ تھے، اُن کی گاڑیوں کی لائن گھر سے مقبرے تک لگی ہوئی تھی، جب کہ مقبرہ تقریباً ۵ کیلومیٹر کی مسافت پر واقع تھا۔ آپ کی نمازِ جنازہ میں شریک افراد کی تعداد کا اندازہ پندرہ ہزار کے قریب ہے۔ نمازِ جنازہ کی امامت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب بنارسی رکنِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے فرمائی۔ مولانا، حضرت مفتی صاحب مرحوم کی عیادت کے

لیے افریقہ تشریف لے گئے تھے۔ ساڑھے دس بجے دن میں (افریقہ وقت سے) ”ایزابرگ“ کے قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً۔

انسانیت و عبودیت کا پیکر

شروع زندگی سے ہی مفتی صاحب مرحوم کا کھانا پینا اور رہنا سہنا بہت ہی سادہ اور معمولی تھا، حتیٰ کہ صرف دو پہر یا رات کا کھانا کھاتے تھے، دنوں ایک ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں اپنا دو پہر یا رات کا کھانا مدر سے کے کسی ضرورت مند کو ہبہ کر دیتے تھے۔ اسی طرح مدرس ہونے کے بعد بھی انھوں نے، دو پہر اور رات کے کھانے ایک ساتھ نہیں کھائے؛ البتہ جب اصلاح و تربیت کے لیے، اُن کے پاس مہمانوں کی آمد زیادہ ہونے لگی، جن میں علما و مشائخ، طلبہ، جدید تعلیم یافتہ حضرات اور مختلف عوامی طبقات کے لوگ ہوتے تھے، تو آپ خوش اخلاقی، دل داری، اعزاز و اکرام کے پیش نظر، اُن کے ساتھ کھانے پر مجبور ہوئے؛ تاکہ مہمان کی عزت و احترام کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک کی پیروی اور اس بارے میں آپ ﷺ کے احکام کی اطاعت و فرماں برداری کا ثواب ملے۔

مفتی صاحب مرحوم دارالعلوم کی تنخواہ قبول نہیں کرتے تھے، اس سلسلے میں اُن کا معمول تھا کہ تنخواہ میں کچھ اپنے پاس سے ملا کر دارالعلوم کو ہی لوٹا دیتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم حلیم و بردبار، خوش اخلاق و نرم خوا اور علما و طلبہ سے محبت رکھنے والے تھے، اپنی مجالس میں اپنے اسلاف، شیوخ و اساتذہ، صلحا و مریدین، ائمہ و مجتہدین اور فقہاء و محدثین کا بہت زیادہ تذکرہ فرماتے اور کثرت سے اُن کے ایمان آفریں اور شوق پرور قصے، حکایات اور واقعات سناتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم، دیوبند کے بہت سے علما و مشائخ کی طرح بہت زیادہ قوی الحافظ تھے، چنانچہ علوم و فنون کی مختلف کتابوں کی عبارتیں آپ کو حفظ تھیں، آپ انھیں

زبانی پڑھ ڈالتے تھے، پڑھے ہوئے فنون کے بہت سے مسائل چھوٹی چھوٹی جزئیات اور باریک تفصیلات، حیرت انگیز حد تک متحضر تھے۔

۱۹۶۷ء کا دارالعلوم کے زمانہ طالب علمی کا واقعہ ہے کہ مجھے ایک مسئلہ بہت دشوار لگا، میں نے طلبہ کی زبانی مفتی صاحب مرحوم کی علمی یادداشتوں کے بارے میں سن رکھا تھا، میں نے اُن سے ہی پوچھ لینا مناسب سمجھا، چناں چہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا، جو مسجد قدیم کے اُس دروازے سے متصل تھا، جولپ سڑک اور مہمان خانے کے دروازے کے سامنے ہے۔ میں نے سلام کرنے کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اُن کے سامنے شرح وقایہ کا وہ صفحہ کھولا جس میں مجھے اشکال درپیش تھا، اُنھوں نے چند ثانیوں میں ہی اُس کی وضاحت فرمادی اور متعلقہ مسئلے کو اصول فقہ کے ایک کلیے میں تبدیل فرمادیا، جسے اُصول الشاشی کے مصنف نے بہت اچھے اور واضح انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے میرے سامنے زبانی کتاب کی عبارت پڑھی اور فرمایا:

”اُصول الشاشی سے رجوع کر لیجیے، وہاں آپ کو فلاں بحث اور فلاں صفحے

میں، یہ مسئلہ خوب مفصل مل جائے گا، اس پر حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے۔“

ان کے متحضر علم اور قوی حافظے کا یہ عالم دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کمرے آیا اور ”اُصول الشاشی“ کے صفحات پلٹے جیسا کہ اُنھوں نے بتایا تھا، وہاں مجھے وہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ مل گیا۔

مفتی صاحب مرحوم ذکاوت و ذہانت کا پیکر تھے، آپ کے فتاویٰ، ملفوظات اور ہنگامی مسائل کے سلسلے میں آپ کے پاس بیٹھنے والے اور آپ سے فتویٰ لینے والے لوگوں کے سوالات کے برجستہ اور مناسب جوابات اس بات کی کھلی شہادت ہیں۔ آپ کی ذہانت کے قصے علما اور طلبہ میں بہت زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم نہایت بدیہ گو اور فصیح الکلام تھے۔ خصم کو لا جواب کر دینے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، مقابل

فریق کو اپنی باتوں سے اچھی طرح مطمئن کر دیتے تھے، سائل کا تسلی بخش جواب دیتے، کسی بات کو تشنہ نہ چھوڑتے اور شکوک و شبہات گزیدہ شخص کو ایمان و یقین کی دولت بے بہا عطا کرتے، مبتدعین سے نبرد آزمائی، باطل پسندوں سے مناظرہ اور لمبی باتیں بنانے والے، لیکن اعمال کے سرمایے سے یکسر خالی اور تہی دست گم راہ اسلامی فرقوں کے خدا بےزار و بے دین لوگوں کے تعاقب نے، حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ان صلاحیتوں کو جلا بخش دیا تھا۔

یہ صلاحیتیں آپ کے لیے افتا کی ذمہ داریوں اور فقہی فیصلوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے میں معاون ثابت ہوئیں اور ان کے طفیل آپ کے لیے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کے مباحث سے متعلق علمی مسائل کی تہ تک بہت جلد پہنچ جانے میں آسانی ہوتی تھی۔

انہی خصوصیات کی بنا پر آپ مطلوبہ حد تک دارالعلوم جیسے عظیم اسلامی ادارے میں (جسے یہ خصوصیت و فضیلت حاصل ہے کہ برصغیر ہند کے مسلم عوام جتنا اعتماد و بھروسہ اُس کے فتاویٰ اور فقہی فیصلوں پر کرتے ہیں، اس قدر کسی دوسرے ادارے کے فتاویٰ پر نہیں کرتے اور تمام دینی مسائل میں جو مرجعیت اور مرکزیت اسے حاصل ہے، وہ کسی دوسرے ادارے کو حاصل نہیں) صدر مفتی کا منصب سنبھالنے کے اہل اور لائق تھے۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے علما درشت کلامی اور معاملات میں بے اعتدالی کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اختلاط میں سخت گوئی اور کم گوئی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کا یہ رویہ عزت و احترام کا سبب اور ہیبت و وقار کا باعث بنے گا، اس بنا پر وہ مزاح و دل لگی اور اُن تمام باتوں سے بچنے کی بے انتہا کوشش کرتے ہیں، جن سے دل میں سرور و کیف پیدا ہو، فکر میں نشاط و شگفتگی کی لہر دوڑ جاتی اور خیالات میں تازگی و رعنائی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے؛ لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم حد درجہ ظریف اور نہایت ہی خوش طبع انسان تھے، الفاظ اور جملوں کی نشست و برخاست، عمدہ

یا خراب تراش خراش، حسین یا قتیب معانی، قریب یا بعید دلائلوں، حقیقی یا مجازی مرادوں اور شیریں یا تلخ ادایکوں سے نکتے تراشتے اور انوکھی باتیں پیدا کرتے، لطیف اشارات اور خوش کن کنایوں سے مجلس میں سماں بندھ جاتا۔

سراپا

آپ کا قد دراز، رنگت سپید، جسم دبلا، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی، پلکیں لمبی اور باریک، ڈاڑھی اور سر کے بال گھنے اور بالکل سفید تھے۔ روشن چہرہ، شگفتہ رو، متبسم ہونٹ والے تھے، فقر و مساکین کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک برتتے، علماء، طلبہ اور اہل تعلق حضرات کا بہت زیادہ پاس و لحاظ فرماتے، آپ پاک دامن اور نظافت پسند تھے، لوگوں پر پھینٹیں اڑانے سے اپنی زبان محفوظ رکھتے، گم راہ فرقوں کا بڑا تعاقب فرماتے، تمام معاملات میں دور بینی سے کام لیتے، ہر وقت راضی بہ رضا، شکایاتِ زمانہ سے گریزاں، تھوڑے مال اور اُمیدوں پر قانع اور عبادات و اعمال کے وافر ذخیرے کے مشتاق و متمنی رہے، اپنے پروردگار پر بہت زیادہ بھروسہ اور اس کے بندوں پر بہت زیادہ اعتماد تھا، شریفانہ عادات و اطوار اور عمدہ اخلاق و کردار کے مالک اور بہت ہی حلیم الطبع انسان تھے، انھیں فکر صرف خدا سے اپنے رشتہ و تعلق کی اصلاح کی تھی، بندگانِ خدا کو اپنی تمام چیزوں: مال و زر، علم و فضل، صلاح و تقویٰ، مواعظ و نصائح اور تربیت و اصلاح سے نفع پہنچایا۔ آپ بلا استثناء سبھوں کے نزدیک محبوب تھے، آپ کی مجلس، علم و ذکر کی مجلس ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے نیک بندوں جیسی رحمت برساے، آپ کو اپنی جنت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ جگہ عطا کرے اور علم و دین اور اسلام و اہل اسلام کی جو بے بہا خدمت انجام دی، اُس کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، آپ کے رشتہ دار و اقارب اور تمام محبین کو صبر و شکیبائی کی توفیق دے اور ہمیں آپ کی جدائی کے اجر

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ

سے فیض یاب کرے اور آپ کے بعد کسی آزمائش میں نہ ڈالے، ہمیں آپ کے علم سے حصہ عطا فرمائے اور آپ کے جیسے قول و فعل اور علم و عمل کی توفیق بخشے۔ بلاشبہ خدا کی ذات ہی حافظ و نگہبان اور ہر چیز پر قادر ہے۔

صَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّم عَلٰی سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا وَمَوْلَانَا عَبْدَهٗ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِينَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱)

مختصر سوانحی خاکہ

✽ اسم گرامی: محمود حسن۔

✽ تاریخ ولادت: ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء۔

✽ جائے ولادت: محلہ بہاء الدین، قصبہ گنگوہ، ضلع سہارن پور، یوپی۔

✽ والد ماجد کا نام: مولانا حامد حسن۔

✽ ابتدائی تعلیم: مکتب قصبہ گنگوہ اور جامع مسجد گنگوہ میں۔

✽ عربی مبادیات: ”نہو“، ضلع ”بجنور“ میں اپنے والد صاحب سے۔

✽ عربی و شرعی علوم: مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور و دارالعلوم دیوبند میں۔

✽ تدریس: اولاً مدرسہ مظاہر علوم میں، ۱۳۵۱ھ سے ۱۳۷۳ھ تک، اُس کے بعد مدرسہ جامع العلوم

”کانپور“ میں ۱۳۸۵ھ تک۔ ۲۶/جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ء سے آخری زندگی تک دارالعلوم دیوبند میں

مفتی اعظم رہے۔ ۱۳۸۸ھ میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے حکم پر،

اُن کی وفات ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء تک صحیح بخاری شریف جلد ثانی کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

✽ دارالعلوم دیوبند میں آپ کا قیام اوائل رمضان ۱۳۹۱ھ تک مسجد قدیم کے احاطے کے اُس کمرے میں

رہا، جو مہمان خانے کے گیٹ کے سامنے کے مسجد کے گیٹ پر واقع ہے۔ ۲۰/رمضان ۱۳۹۱ھ کو آپ مسجد

چھتہ کے شمالی جانب کے اُس کمرے میں آگئے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے بانی امام محمد قاسم نانوتویؒ کا

(۱) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۵، جلد ۲۰، جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ = اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

قیام رہا کرتا تھا۔

✽ آپ کے فتاویٰ ۸ جلدوں میں ۷۷۳ صفحات میں چھپ چکے ہیں، جو بہت مقبول و مستند اول اور علما کے لیے علمی و فقہی مرجع ہیں۔

✽ آپ کے علمی و فکری نتائج کو علما و مستفیدین نے مختلف موضوعات پر شائع کیا ہے، اُن کتابوں کی تعداد بیس (۲۰) کے قریب ہے۔

✽ آپ نے دنیا کے بیش تر ممالک کا اصلاحی و دعوتی دورہ کیا اور وہاں طویل و مختصر قیام فرمایا۔

✽ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

✽ آپ کی وفات جنوبی افریقہ کے شہر ”جوہانس برگ“ میں ۲-۳ ستمبر ۱۹۹۶ء مطابق ۱۹-۲۰ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کی درمیانی شب میں وہاں کے وقت کے مطابق ساڑھے سات بجے واقع ہوئی، دو شنبے ۳ ستمبر ۲۰ ربیع الثانی کو تقریباً ۹ بجے وہاں کے وقت کے مطابق تدفین عمل میں آئی۔



علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ حلبی شامیؒ

۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء — ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء

جو ذکر کی گرمی سے، شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

شبِ دوشنبہ ۱۰/۹/۱۴۱۷ھ (بہ حساب ہندوستانی جنتری) ۱۰/۱۰/۱۴۱۷ھ (بہ حساب سعودی جنتری) مطابق ۲۱/۷/۱۹۹۷ء، ٹھیک ۱۲ بجے (بہ وقت ہندوستان) دس بجے (بہ وقت سعودی عرب) مطالعے کی کتاب کو میز پر ڈال اور الارم گھڑی بغل میں رکھ میں بستر پر دراز ہوا ہی چاہتا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے رسیور ہاتھ میں لیا تو معلوم ہوا کہ ریاض سے ایک قاسمی دوست کا فون ہے، انھوں نے علیک سلیک کے بعد جب یہ کہا کہ میں تمھیں ایک اندوہ ناک خبر سنانے جا رہا ہوں، تو راقم نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہوئے اُن سے عرض کیا ”بتائیں“ انھوں نے کہا آج ہی یعنی یک شنبہ ۲۱/۷/۱۹۹۷ء بہ وقت فجر، ریاض کے ہسپتال ”مُسْتَشْفٰی الْمَلِکِ فِیَصَلُ التَّخَضُّصِی“ میں علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رکنِ اساسی ”رابطہ عالمِ اسلامی“ اور سابق نگرانِ اعلیٰ ”اخوان المسلمین“ سیریا نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ابھی ذرا دیر پہلے مسجد نبوی میں اُن کی نمازِ جنازہ ہوئی ہے اور جنت البقیع میں سپردِ خاک ہوئے ہیں۔ کافی دیر تک اِنَّا لِلّٰہِ... کا ورد کرتا اور اپنے کپتے کو تسلی دیتا رہا۔ نگاہوں کے سامنے علم و عمل کی برکات سے مُمَوِّز اُن کے روشن چہرے کی تصویر پھر گئی اور اُن کی

دید و شنید کا پورا دورِ اَبَیہ سامنے آ گیا۔

ہمارے دوست کی مہربانی سے اُن کے عالمِ جاودانی کو سدھار جانے کی خبر فوراً مل گئی، خدا اُنھیں بھی خوش رکھے؛ لیکن دل پر غم و اندوہ کی فضا نے جس طرح ڈیرا ڈالا اور اُس وقت سے اب تک قلب و جگر کی جو کیفیت ہے اُسے خداے علیم ہی جانتا ہے، اُسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ رنج و الم کی یہ کیفیت برصغیر کے صرف چند ہی علمائے ربانین اور عالمِ اسلام کے انگلیوں پر شمار کیے جانے والے مُفکرین و اُدبائے مخلصین کی وفات پر ہی محسوس ہوئی تھی۔ میرا ایمان ہے کہ دل فگاری کی اسی کیفیت سے عالمِ اسلام و عالمِ عرب میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً وہ ہزاروں علما دوچار ہوئے ہوں گے، جنھیں اُن سے اُن کی للہیت اور اُن کے غیر معمولی علم و فضل کی وجہ سے اُسی طرح کی محبت و عقیدت تھی جیسی عہدِ قریب کے برصغیر کے خدا رسیدہ و محبت پسند علماے عالی مقام و مشائخِ ذی احترام سے۔

علم و عمل میں بے نظیر عالم

اس دورِ آخر میں شیخ عبدالفتاح ابو غندہ ایسے عالم باعمل، مُجدِّث دیدہ و ور اور فقیہ نبض آشناے شریعتِ مطہرہ کی نظیر عالمِ عرب و اسلام میں کم ہی ملے گی؛ بل کہ صحیح یہ ہے کہ وہ بے مثال تھے۔ اُن کی علمی بے پناہی کے ساتھ اُن کے ذوقِ عبادت و شوقِ طاعت اور عملی ہمہ گیری میں بالخصوص عالمِ عرب میں، اس وقت شاید ہی کوئی اُن کا ہم پلہ رہا ہو، ہر چند کہ بعض حلقوں کو شاید یہ بات ناگوار گزرے، جو اپنے مکتبہ فکر کے خول سے باہر دیکھنے کا حوصلہ نہیں جٹا پاتے۔

میں نے عالمِ اسلام کو جہاں تک دیکھا اور سنا ہے تو میں نے یہ پایا ہے کہ وہاں علامہ کبیر، مُجدِّثِ جلیل، مُفکرِ دور اندیش، مفتیِ باخبر، قاضیِ بالصیرت کی کوئی کمی نہیں۔ البتہ وہاں ایسے انسانوں کی بے شک کمی ہے جو اپنے علمی و عملی منصب کے معیار پر

سیرت و کردار اور عمل و اخلاق کے اعتبار سے پورے اُترتے ہوں۔ وسیع علمی و دقیقہ انظری کے ساتھ ساتھ بہت سارا، پیہم اور مربوط عمل؛ یہی وہ امتیاز ہے جو علامہ عبدالفتاح ابوعدّہ کو اپنے بہت سے اقران سے جدا کرتا ہے، اُن اقران سے جن کے اَسما و القاب، شکل و صورت، گُلاہ ہائے بلند، زبان ہائے فصاحت ریز و قلم ہائے سیل صفت سے ایسی شوکت و عظمت برتی ہے کہ صرف ہم ایسے خُردوں ہی کا نہیں بہت سے بزرگوں کا بھی مَرغوبیت کے مارے بُرا حال ہو جاتا ہے۔

پھر یہ کہ علم کے اعتبار سے بھی وہ صرف ایک دُفن کے غَوّاص نہیں تھے؛ بل کہ سلفِ صالحین اور علمائے مُتَقَدِّمین کی طرح بہت سارے علوم کے شناور تھے۔ علومِ قرآن و حدیث، فقہ و اُصولِ فقہ، اَسما و اَلزّجَال اور تاریخ و غیرہ میں اُن کی اُسْتَاذِیَّت تو مُسَلَّم تھی ہی؛ لیکن وہ عَرَبِیَّت: صرف نحو، معانی و بیان، علم العرُوض و القوافی، فنِ اِنشاد و نثر نگاری، منطق و فلسفہ اور علمِ اِنفَس کے بھی صاحبِ نظر عالم اور ماہرِ مُصَنِّف تھے۔

انہی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے، وہ ساری دُنیاے عرب و اسلام میں ہزاروں علما و طلبہ و علم دوست لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تھے۔ وہ دُنیاے علم کا ایک تاب ناک ترین ستارہ، ایک مُعْتَبَرِ علامت اور حلقہٴ فُہْمَا و مُجَدِّثِین و علما و زاهدین کا گوہرِ شب تاب تھے۔

علم کا ایسا رسیا اور اُسے ہر ممکن طریقے سے حاصل کرنے اور ہمہ وقت اُس میں لگا رہنے والا، نیز اپنے سے سن و سال میں چھوٹے اور تجربہ و آگہی میں کم تر سے بھی فیض یاب ہونے کا حوصلہ رکھنے والا، میں نے اُن کے ایسا کسی اور کو کیوں دیکھا ہوگا، اپنے سے بڑے سے اکتساب کا تو ذکر ہی کیا۔

اسی شوقِ طلب کی وجہ سے اُن کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد ۱۲۰ (ایک سو بیس) تک پہنچتی ہے، اُن میں سے اکثر کا تعلق اُن کے مادرِ وطن حلب و دمشق پھر قاہرہ و مصر، مغربِ عربی اور بَرصغیر سے ہے، جہاں کے علما کے وہ بے حد دل دادہ و مُعْتَقِد رہے تھے اور زندہ و مردہ دونوں قسم کے علما سے اُنھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

علمائے ہند سے ربط و تعلق

وفات یافتہ علما میں وہ امام عالی مقام احمد بن عبد الرحیم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۲۰۳ھ / ۱۷۹۳ء) علامہ عبدالحی فرنگی محلی (۱۲۶۴ - ۱۳۰۴ھ / ۱۸۴۸ء) سے بہت عقیدت رکھتے تھے، ثانی الذکر کی بہت سی کتابوں کو اپنی تحقیق و تجسس کے ساتھ عالم عرب سے شائع کیا اور علمائے عرب کو اُن سے مُتعارف ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچایا۔

ان دونوں بزرگوں کے بعد وہ محدثِ عمقری علامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ (۱۲۹۲ - ۱۳۵۲ھ / ۱۸۷۵ - ۱۹۳۳ء) کے حد درجہ قدرداں تھے۔ اُن کی میراثِ علمی سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے اور اپنے عرب دوستوں کو اس علمی خزانے سے اپنا حصہ پانے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔ علامہ کی ایک سے زیادہ کتابوں کو ایڈٹ کر کے بیروت وغیرہ سے شائع کیا تھا۔

پھر علامہ کشمیری کے تلمیذ بابر مولانا بدر عالم میرٹھی (۱۳۱۶ - ۱۳۸۵ھ / ۱۸۹۸ - ۱۹۶۵ء) نیز محدثِ کبیر مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب ”اعلاء السنن“ (۱۳۱۰ - ۱۳۹۴ھ / ۱۸۹۲ - ۱۹۷۴ء) جن کی ”اعلاء السنن“ پر اُن کا فاضلانہ مُقدّمہ، علمِ حدیث میں اُن کی دست گاہ کی روشن دلیل ہے۔ نیز مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی پاکستانی (۱۳۱۴ - ۱۳۹۶ھ / ۱۸۹۶ - ۱۹۷۶ء) اور علامہ کشمیری کے شاگرد رشید اور اُن کے علمی تر کے کے مُدَوِّن و ناشر محدثِ کبیر مولانا محمد یوسف بنوری صاحب ”معارف السنن“ (۱۳۲۶ - ۱۳۹۷ھ / ۱۹۰۸ - ۱۹۷۷ء) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (۱۳۱۵ - ۱۴۰۲ھ / ۱۸۹۷ - ۱۹۸۲ء) اور آخر میں برصغیر کے محدث و محقق مولانا حبیب الرحمن اعظمی (۱۳۱۹ - ۱۴۱۲ھ / ۱۹۰۱ - ۱۹۹۲ء) کے نہ صرف قائل تھے؛ بل کہ اُن میں سے جنھیں پایا اُن کی صحبت اور علمی خزانے اور جنھیں نہیں پایا اُن کی تصنیفات سے علمی دقیقہ

علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غندہ حلبی شامیؒ

رسی و گوہر باری سیکھی اور علما و طلبہ کو انھیں حرز جاں بنالینے کی تلقین کی۔

برصغیر کے خطیب بے بدل اور اسلام کے لسان ناطق مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۵-۱۴۰۳ء/۱۸۹۷-۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مشہور مفکر و داعی و مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء/۰۰۰۰/۰۰۰۰) سے انھیں حد درجہ قلبی انس، فکری ہم آہنگی، روحانی یکسانیت اور مسلکی یگانگت تھی۔

علامہ ابو غندہ نے ائمہ سلف کی کتابوں پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ علمائے ہند کی تصنیفات و تالیفات کو بھی اپنی علمی توجہ کا مرکز بنایا، چنانچہ وقتِ نظر کے ساتھ عصری اسلوب میں انھیں ایڈٹ کیا، اُن پر حاشیہ نویسی کی اور انھیں عالمِ عرب کے مکتوبات سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ شائع کروایا۔ اس طرح علمائے عرب کو اُن سے مطلع ہونے اور اُن سے علمی پیاس بجھانے کی راہ ہم وار ہوئی، مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے بعض ہندی علما کو بھی ہمارے اکابر کی بہت سی تصنیفات کا علم تب ہوا جب شیخ ابو غندہ نے اُن کی علمی اہمیت کو اجاگر کیا اور انھیں روشنی میں لائے۔ افسوس ہے کہ علمائے برصغیر کو اُن کی قدر و قیمت کے ساتھ جاننے والا، دنیاے عرب میں شیخ ابو غندہ کی قد و قامت کا اب کوئی عالم نہیں رہا۔

دارالعلوم دیوبند اور اُس کے مشائخ سے عقیدت

وہ دارالعلوم دیوبند کی ہمہ گیر علمی و دینی خدمات کے بڑے مداح اور وکیل تھے۔ علم و دین و اخلاص کے حوالے سے، بانیانِ دارالعلوم کے مقام و مرتبے کو خوب خوب جانتے تھے اور اس دیار میں اسلامی حکومت و شوکت کے زوال کے بعد اسلامی وجود کی بالعموم اور دینی علوم و دین اسلام کی بالخصوص، حفاظت کے سلسلے میں اُن کے کردار کی

(۱) اس تحریر کے عربی اور اردو میں لکھے جانے کے وقت حیات تھے۔ بہ روز جمعہ: ۲۲/رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱/

دسمبر ۱۹۹۹ء کو ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

آگئی، اس طرح رکھتے تھے کہ اب کسی عربی عالم سے موجودہ حالات کے چوکھٹے میں شاید ہی امید کی جاسکے۔ وہ دیوبند کئی مرتبہ آئے اور اپنی حسین یادوں اور عطربیز تاثرات کا اپنی گل ریز زبان میں اظہار کیا۔ وہ دارالعلوم میں اپنے کو موجود پا کر قلبی اطمینان اور روحانی سکون محسوس کرتے جیسے پچھلی کو سازگار پانی مل گیا ہو، اُن کی دارالعلوم آمد کے وقت حُدام دارالعلوم کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے کسی سلف کی محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں؛ اس لیے کہ انھیں دیوبند سے ہر طرح مسلکی و دعوتی اتفاق و امتزاج تھا۔

علمی ہمہ گیری

علامہ ابو نعیمہ کو فقہ حنفی پر عبور تھا جس کے وہ مُتَّبِع بھی تھے، نیز فقہ شافعی اور دیگر اسلامی مذاہب کی فقہ پر بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اصول فقہ، اصول حدیث، فہم اسماء الرجال اور حدیث کے متناوِسند اور وائیہ ودرائیہ ماہر تھے۔ ساری زندگی ان فنون کے پڑھنے پڑھانے، نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ان فنون پر اپنی تالیفات اور سلف کی تصنیفات کی تحقیقات و تعلیقات کے ذریعے، عصر حاضر کے علما و طلبہ کے لیے استفادے کو آسان بنادیا۔ اُن کی تصنیفات اور تحقیقات دونوں میں وہ بالغ نظری، جَامِعِیَّت اور وَسْعَتِ فکری ہے جس کا سرچشمہ ہمہ وقتی مطالعہ، بے تکان کتب بینی، کشادہ قلبی اور علم النفس کی غَوّاصی ہے، جس میں اُنھوں نے دو سال تک ماہرانہ بصیرت پیدا کی تھی؛ اسی لیے اُن کی تصنیفات و تحقیقات؛ بل کہ محاضرات و خطابات میں اُس طرح کا موازنہ و محاکمہ ہوا کرتا ہے جس کی بنیاد، علم النفس پر قائم ہوتی ہے۔

اُن کے علمی کام کی تعداد ساٹھ سے مُتجاوِز ہے (۱) جس کا دو تہائی، حدیث رسول اللہ اور اُس کے متعلقات کے موضوع پر ہے اور ایک تہائی کا تعلق فقہ اور دیگر اسلامی موضوعات سے ہے۔ استاذ عبدالوہاب بن ابراہیم ابوسلیمان نے صحیح کہا ہے کہ:

(۱) اہم تصنیفات و تحقیقات کی ایک فہرست مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

”علامہ عبدالفتاح ابوعدہ کے مطالعوں میں، حدیث اور اُس کے علوم کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ اس معزز علمی میدان میں اُنھوں نے اسلامی لائبریری کو پختہ تصنیفات سے مالا مال کیا ہے۔ بعض موضوعات پر قلم اٹھانے والے وہ پہلے مصنف ہیں۔ اُن کی تالیفات اپنی خصوصیات، نقطہ ہائے نظر، اغراض و مقاصد، تنوع، مشمولات کی خوبیوں اور اسلوب نگارش و طرزِ مخاطب کی سحر کاری کے اعتبار سے ممتاز مکتبہ فکر کی نمائندہ ہیں۔ یہ تصنیفات عقل و خرد کو اپیل کرتی ہیں۔ اُن کی بنیاد ٹھوس علمی اصولوں پر ہے، جن کو اخلاص و تواضع نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ تصنیفات علامہ کی شخصیت کا آئینہ، اُن کی ذہنیت کی دلیل اور اُن کی اُس روحانی شفافیت کی عکاس ہیں جس کے طفیل اُنھوں نے علمی دنیا کو تاب ناک خیالات اور بے مثال فوائد و حصولِ یابیوں سے نوازا ہے۔“ (۱)

علامہ کی ایک اور خصوصیت

اُن کی ایک اور خصوصیت بھی تھی، جو اُن کے، اور دیگر علمائے معاصرین کے درمیان خطِ فاصل قائم کرتی ہے۔ وہ یہ کہ اُنھیں عربی زبان اور متعلقہ علوم و فنون پر بھی عبور تھا۔ عربی کی شرو و نظم کا اتنا بڑا سرمایہ اُنھیں محفوظ تھا کہ اس پختگی کے ساتھ بعض پیشہ ور اُدبا و اہل قلم کو بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ عربی زبان کے مُفردات و لغات اُس کے نظائر و شواہد کے ساتھ، قواعدِ صرف و نحو اختلافِ مذاہب کے ساتھ اور مسائلِ بلاغت اُس کے دلائل کے ساتھ یاد تھے۔

استاذ محمد عوامہ نے (جو شیخ ابوعدہ کے ارشد تلامذہ میں ہیں) اپنے ایک مضمون میں ایک دلچسپ حکایت نقل کی ہے جس سے اس فن کے حوالے سے علامہ کی عظمت پر

(۱) مضمون بر علامہ ابوعدہ از استاذ عبدالوہاب بن ابراہیم ابوسلمان، عکاظ، جدہ، شمارہ سہ شنبہ، ۱۸/شوال ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۵ فروری ۱۹۹۷ء۔

روشنی پڑتی ہے:

”... ثانوی مرحلے کے پہلے سال میں، جب ہم طالب علم تھے، تو ہمارے ایک استاذ نے بیان کیا کہ کچھ لوگوں کے ساتھ وہ دمشق گئے، وہاں ایک مدرس کے سبق میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے ایک لفظ کے تلفظ یا اعراب (مجھے یاد نہیں رہا) کے متعلق انھیں اشکال ہوا۔ مدرس صاحب نے ایک طالب علم سے کہا کہ ”القاموس المحیط“^(۱) لے آؤ تو ہمارے استاذ نے جو اس واقعے کے راوی ہیں اُن سے فرمایا کہ: قاموس لانے کی کیا ضرورت ہے، یہ رہے شیخ عبدالفتاح ابوغندہ جو قاموس گویا ہیں، آپ جو چاہیں معلوم کر لیں۔“^(۲)

استاذ محمد عوامہ نے اس واقعے کے درج کرنے کے بعد یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ ہمارے مذکورہ استاذ شیخ ابوغندہ کے ہم خیال نہیں تھے؛ بل کہ انھیں اُن سے خدا واسطے کا بیر تھا اس کے باوجود ہوا وہی کہ جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔

بات یہ ہے کہ علامہ نے حصول علم کے لیے شمع کی طرح جلنے اور پروانے کی طرح نچھاور ہونے کا سلیقہ، سلف ہی کی طرح سیکھا تھا، جو خدا کی توفیق اور اُس کے لطفِ خاص کے بغیر ممکن نہیں، اسی لیے انھیں علمی دنیا میں وہ نام و مقام حاصل ہوا، جو معاصرین میں کم لوگوں کے حصے میں آیا۔ استاذ محمد عوامہ نے اُن کی علمی پیاس کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ سپردِ قلم کیا ہے:

”علامہ ابوغندہ کے نو جوان اُستادوں میں ایک تھے شیخ محمد سلیمانی رحمۃ

اللہ علیہ، انھیں ایک مرتبہ کچھ دنوں کے لیے سفر درپیش ہوا۔ انھوں نے سبق کا

(۱) علامہ ابو طاهر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (۷۳۰ھ — ۸۱۷ھ / ۱۳۲۹ — ۱۴۱۴ء) کی مشہور عربی لغت، جس کی علامہ مرتضیٰ زبیدی (۱۱۳۵ — ۱۲۴۰ھ / ۱۷۳۲ — ۱۷۹۰ء) نے ”تاج العروس من جواهر القاموس“ کے نام سے شرح لکھی تھی جو عربی زبان کی مشہور آفاق لغات میں سے ایک ہے اور اپنے خصائص کے اعتبار سے فائق۔

(۲) مضمون شیخ محمد عوامہ بر علامہ ابوغندہ، شائع شدہ روزنامہ عکاظ، جدہ، سعودی عرب، شمارہ سہ شنبہ ۱۱/۱۰/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۸/۲/۱۹۹۷ء۔

علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ حلبی شامیؒ

نافع مناسب نہیں سمجھا؛ اس لیے اپنے شاگرد ابو غدہ کو مدرسہ خسرویہ^(۱) میں قائم مقام کر گئے۔ انھوں نے استاذ کی قائم مقامی کا حق ادا کر دیا۔ جب شیخ سلقینی سفر سے واپس آئے، تو طلبہ نے اُن سے پوچھا کہ: حضرت! کیا شیخ عبدالفتاح ابو غدہ آپ کے شاگرد ہیں تو سلقینی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے تواضع کے ساتھ فرمایا کہ: ہاں کبھی ہوا کرتے تھے؛ لیکن اب میں اُن کا شاگرد ہوں۔ میں انھیں نحو میں شرح اُجرومیہ پڑھایا کرتا تھا اور وہ فن کی اونچے درجے کی کتاب ”معنی اللیب“ سے مطالعہ کر کے آیا کرتے تھے۔“^(۲)

نوادِرِ کتب کے حصول کا شوقِ بے پناہ اور

اس سلسلے کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات

ذوقِ علم کے نتیجے میں انھیں کتابوں سے غایت درجہ محبت تھی، جو ایک سچے طالب علم کی پختہ علامت ہے۔ نوادِرِ کتب کے حصول، مخطوطات و مطبوعات کی ذخیرہ اندوزی کے لیے ہر طرح سے کوشاں رہتے۔ اس سلسلے میں وقت، مال، محنت اور بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔ بعض کتابوں کے مقدموں میں انھوں نے اس سلسلے کے بعض واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر ممدُرس علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”التصریح بما تَوَاتَرَ فِي نزول المسيح“ کو انھوں نے کس محنت و جستجو کے بعد پایا اور پھر اُس کو اپنی تحقیقِ انیق کے ساتھ عالمِ عربی سے شائع کیا، اس کا واقعہ خود انھی کی زبانی سنئے:

(۱) شہر ”حلب“ کے اس مدرسے میں شیخ ابو غدہ نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اب یہ ”مدرسہ ثانویہ شریعہ“ کے نام سے معروف ہے۔

(۲) شیخ محمد عوامہ کا مذکورہ مضمون۔

”... یہ کتاب جو قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، اس کا حصول میری زندگی کی اہم آرزو تھا؛ لیکن اس آرزو کا پانا میرے لیے دشوار ثابت ہوا۔ میں مسلسل پندرہ سال سے اس کے ہندوستانی نسخے کے حصول کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ مصر میں جو کتابوں کا ملک ہے اپنے چھ سالہ قیام کے دوران میں نے اس کی جستجو کی۔ پھر میں نے اسے مکہ و مدینہ اور بغداد نیز دیگر عربی ملکوں کے کتب خانوں میں ڈھونڈا؛ لیکن نہیں ملی، ہندوپاک کے بعض علمائے گرامی سے میں نے درخواست کی کہ وہ اپنے ہاں کا چھپا ہوا، اس کتاب کا کوئی نسخہ فراہم کر دیں، انھوں نے قابلِ شکر کوششیں کیں؛ لیکن انھیں بھی نہیں ملی۔

چوں کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور اپنے مصنف کی امامت کے حوالے سے منفرد ہے اس لیے ۱۳۴۴ھ میں طبع ہونے کے ساتھ ہی علماء و طلبہ نے اسے اُچک لیا اور بعد میں اس کے کسی نسخے کا حصول مشکل ہو گیا۔ خدا نے جب ہندوپاک کے سفر کا موقع دیا، میں نے وہاں کی لائبریریاں دیکھیں، وہاں اس کی تلاش میں سعی کی؛ لیکن دستِ یاب نہ ہو سکی۔ ہندوستان سے میں پاکستان آ گیا، کراچی میں قیام رہا، وہاں علامہ و محقق جلیل القدر مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی پاکستانی (۱) سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا بڑا اکرم ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا اپنا محفوظہ اور خاص نسخہ مجھے عنایت فرمایا اور خواہش کی کہ عالمِ عربی میں یہ کتاب ضرور چھپ جائے۔ میں نے اپنے سفرِ واپسی شنبہ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ سے قبل یہ ہدیہ شکرِیے اور قدردانی کے ساتھ قبول کیا۔“ (۲)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”فتح باب العنایہ“ کو بھی انھوں نے اپنے مقدمے اور تحقیقات کے ساتھ شائع کیا، لیکن اس کے حصول کے لیے انھوں نے کس طرح ملکوں، شہروں اور

(۱) ولادت: ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۶۹ء، وفات: ۱۱ شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔ (ایضیٰ)

(۲) کتاب مذکور: ج ۳-۲۔ ۱۸۹۶

گلیوں کی خاک چھانی۔ اُنھی کے قلم کی زبانی سنئے:

”تکمیلِ تعلیم کے لیے میں نے مصر میں چھ سال گزارے، جس جس کتب خانے میں گمان ہوتا کہ یہ کتاب وہاں موجود ہوگی، میں وہاں جاتا اور اس کے متعلق معلوم کرتا رہا؛ لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہ چل سکا۔

اپنے شہر ”حلب“ واپسی پر بھی میں نے ہر اُس شہر میں اس کی پیہم تلاش جاری رکھی، جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا اور تمام مکتبات میں اس کتاب کو ڈھونڈتا رہا، جن میں قدم رکھنے کی نوبت آئی۔ حتیٰ کہ ایک جان کار کتب فروش یعنی شیخ حمدی سفرجلانی دمشقی رحمۃ اللہ علیہ سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب ”روس“ کے شہر ”کازان“ میں چھپی تھی؛ لیکن وہ اس وقت کبریٰ تاحمر سے زیادہ نادر الوجود ہے اور یہ کہ ساری زندگی میں اس کتاب کا، صرف ایک نسخہ اُن کے پاس آیا تھا، جو اُنھوں نے ناقابلِ یقین حد تک اونچی قیمت میں علامہ کوثریؒ کو فروخت کیا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ کتاب کس شہر میں طبع ہوئی تھی؛ لیکن ساتھ ہی اس کے حصول کے حوالے سے میں ناامید سا ہو گیا۔

خدا نے ۱۳۷۶ھ میں جب اپنے گھر کے حج کی توفیق دی اور مکہ مکرمہ کی زیارت سے شرف یاب ہوا، تو میں گھوم گھوم کر وہاں کے مکتبات میں اس کتاب کا اتا پتا معلوم کرتا رہا کہ شاید اُس دیار سے شہرِ حرام مکہ مکرمہ کو ہجرت کنندہ کسی صاحب کے ساتھ یہاں آئی ہو؛ لیکن میں ناکام رہا۔

خداے کریم کی عنایت سے میں مکہ مکرمہ کے ایک معمولی سے بازار کے ایک گوشے میں ایک کتب فروش کی دوکان پر جا پہنچا، یعنی شیخ مصطفیٰ بن محمد شلقطی کی دوکان پر۔ میں نے اُن سے کچھ کتابیں خریدیں اور مایوسانہ احساس کے ساتھ میں نے اُن سے بھی اس کتاب کو دریافت کیا؛ تو اُنھوں نے بتایا کہ دو ہفتے قبل میرے پاس اس کا ایک نسخہ تھا، جو مجھے بعض بخاریوں کے ترکے سے حاصل ہوئی تھی، میں نے اچھی قیمت پر ”طاش قند“ کے ایک

پس مرگ زندہ

بخاری عالم کو بیچ دی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں؛ لیکن انھوں نے کتاب کا سراپا اس طرح بیان کر دیا کہ مجھے کتاب کے سلسلے میں، اُن کی جان کاری کا یقین ہو گیا اور میں نے باور کر لیا کہ یقیناً یہ مطلوبہ کتاب ہی ہے، جس کی تلاش میں میں زمانہ دراز سے سرگرداں رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اس کتاب کو خریدنے والے عالم طاش قندی کون ہیں؟ تو انھوں نے انھیں یاد کرنے کی کوشش کے بعد، اُن کا نام شیخ عنایت اللہ طاش قندی بتایا۔ میں نے اُن کی رہائش گاہ، محلِ عمل یا ملاقات گاہ کے متعلق پوچھا، تو لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں نے کہا تو پھر کس طرح اُن کا پتا معلوم ہوگا؟

کہنے لگے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی،^(۱)

اس کے بعد علامہ نے لکھا ہے کہ میں مکہ مکرمہ کی گلیوں میں چکر لگاتا رہا، تا آں کہ شیخ عنایت اللہ سے خدا نے ملاقات کرا دی اور میں نے یہ کتاب اُن سے حاصل کر لی۔ علامہ کو گراں قدر کتابوں کے حصول کا اتنا شوق ہوتا کہ وہ بعض کتابوں کے لیے منت مانتے تھے کہ اگر فلاں کتاب مل گئی، تو اتنی رکعتیں نماز خدا کے لیے پڑھوں گا۔^(۲) وہ لکھتے ہیں کہ ایک کتاب کو خریدنے کے لیے میرے پاس روپے نہیں تھے، تو میں نے اپنے والد سے ورثے میں آئے ہوئے ایک قیمتی سامان کو بیچ دیا۔^(۳) وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

”اہلِ علم کی زندگی میں کتاب کو وہ مقام حاصل ہے جو روح کو جسم میں

اور صحت مندی کو جان میں“۔^(۴)

(۱) کتاب مذکور، جلد ۱، ص ۸-۹۔

(۲) کتاب ”صفحات من صبر العلماء“ ص: ۲۷۹۔

(۳) حوالہ سابق۔

(۴) حوالہ سابق، ص: ۲۵۶۔

جس کے شعلے نے جلا، سیکڑوں فانوس دیے

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ اتنے بہت سارے اور بے شمار علما و طلبہ کی آنکھوں میں نہ بستے اور دلوں میں نہ سماتے، اگر وہ محض علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع علامہ ہوتے، یا وہ صرف بڑے محقق و مصنف ہوتے، یا زمانہ دراز تک درس دینے والے کام یاب ترین اُستاز ہوتے، یا عالم اسلام کے چپے چپے کی سیر کرنے والے اور جہاں دیدہ ہوتے۔ علم دوست و کمال پرستوں کی نگاہ میں جس چیز نے انہیں اتنا محبوب و مطاع بنا دیا تھا، وہ صحیح معنی میں اُن کی علمی و عملی جامعیت تھی کہ کتاب و سنت کے علوم کے دیدہ ور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شیریں اخلاقی، تواضع پسندی، اخلاص و وسیع الظرفی اور انسیت مزاجی و ملنساری اُن کا شیوہ و شعار اور اُسوۂ و کردار رہی تھی؛ جس کی وجہ سے اُن کے پاس بیٹھنے، اُن کو سننے اور اُن سے ملنے والے کا دل کھنچتا تھا اور تادم زندگی اُن کا اسیرِ محبت ہو جایا کرتا تھا۔

میں نے پایا ہے اُسے اشکِ سحر گاہی میں
جس درِ نایاب سے خالی ہے صدف کی آغوش

وہ آنکھوں میں بسے ہوئے اور دلوں میں بچھے ہوئے تھے؛ اُن کا تواضع؛ اُن کی نرم خوئی و دل جوئی؛ اُن کی شرم گیس و ذہانت ریز نگاہیں؛ اُن کی جبینِ سجدہ پیشہ؛ یادِ الہی سے تر اُن کی زبانِ ادب شناس؛ اُن کی شریں گفتاری؛ باوقار چال؛ حبِ الہی سے معمور سینہ، تشبیتِ خدا سے لبریز دل؛ دعائے سحر گاہی و نالہ ہائے نیم شبی اور ربِ شکور کے سامنے مسلسل گریہ و زاری، نیز آنسوؤں کی پاکیزہ و نورانی جھری سے نہائی ہوئی اُن کی فراخِ عربی آنکھیں؛ اُن کی سرخ و سپید شامی شبیہ؛ اُن کا سدول مؤازن اور نفیس عربی جسم؛ پھلوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح ہر چھوٹے بڑے انسان کے لیے، اُن کی خمیدہ جبینی و خندہ روئی؛ مجلسِ درس و تقریر میں اور ہمہ وقت اُن کی گل بار و عطر افشاں

پس مرگ زندہ

زبان اور کلیوں کی طرح تبسم ریز ہونٹوں سے نکلتی ہوئی رس گھولتے ہوئے سبک خرام الفاظوں کی موتی کی سی لڑی؛ ہمیشہ یاد رہے گی۔

کچھ حسین یادوں کے اُجالے

میں گرم تھا اور میرا مُتْرَجم سرد!

۳۱ اکتوبر تا ۳ نومبر ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء لکھنؤ کا پچاسی سالہ جشن منعقد ہوا، ۲۴ نومبر کی شب میں شیخ ابوعدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی، حدیث و سیرت و مغازی کے گہرے مطالعے سے تراشیدہ، عمیق فکرِ اسلامی سے ڈھلی ہوئی، اسلامی درد اور دینی ولولوں میں بسی ہوئی اور معانی و بلاغت سے رو لی ہوئی، اُن کی زبان کا ترجمہ ایک ندوی فاضل کر رہے تھے۔ شیخ ہر چند کہ عربی نژاد تھے؛ لیکن علمائے برصغیر سے، کثرتِ ارتباط و افادہ و استفادہ اور اس دیار میں بار بار کی آمد و رفت کی وجہ سے، اردو زبان کو کما حقہ نہ سمجھنے کے باوجود، یہ سمجھ جاتے تھے کہ مُتْرَجم سے فلاں بات رہ گئی اور فلاں خیال اپنی تہ داری کے ساتھ ادا نہیں ہو سکا، یا جوش و جذبے کی گل کاری اور افکار و خیالات کی نزاکتوں کا احاطہ نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں اُن کی عالمانہ حسن اور محمد ثناء ذہانت بھی اُن کی راہ نمائی کرتی۔ اُن کا قیام دیگر عربی مہمانوں کے ساتھ دریاے گو متی کے کنارے ”حضرت محل“ پارک کے پہلو میں واقع ”اودھ کلارک“ ہوٹل میں تھا۔ ۲ نومبر کی صبح کو مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی مدظلہ اُستاذ حدیث و فقہ و تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور راقم الحروف اُن سے ملنے گئے۔ اُن کی عالمانہ گفتگو و ظریفانہ و ادیبانہ گل افشانی سے فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اسی دوران اُن کی شب کی تقریر کا تذکرہ چل نکلا، تو نہایت بلیغ جملے میں ترجمے کی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”کُنْتُ حَارًّا وَكَانَ مُتْرَجِمِي بَارِدًا“ یعنی میں گرم تھا اور میرا مُتْرَجم سرد۔

میں کم و بیش پندرہ روز کی شبانہ روز کی، اُن کی مجلس درس و محاضرات و تقریر میں شریک رہا ہوں، وہ اگر حدیث پاک، یا اصول حدیث، یا کسی موضوع پر درس دیتے، تو وہ زیر بحث آنے والے دیگر علوم و فنون پر ایسی فاضلانہ، چشم کشا اور سیر حاصل گفتگو کرتے کہ سننے والے کو محسوس ہوتا کہ شیخ کا اصل موضوع یہی علوم ہیں اور انہی پر انھیں دست گاہ حاصل ہے۔ اُن کے درس و محاضرے میں بیٹھ کر ایسا لگتا کہ ہم ایک ایسے خوش سلیقہ گلستاں میں بیٹھے محوِ نظارہ ہیں، جس میں ہر طرح کے خوش نما و دل ربا پھول اپنی جاں فزا خوشبوؤں کے ساتھ، قلب و نگاہ کی آسودگی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ علمائے سلف اور ائمہ کرام کی نیز دور آخر میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ کی مجالس درس کا تذکرہ سنا اور پڑھا تو تھا؛ لیکن آنکھوں نے اُن کی تصویر شیخ ابو غندہ ہی کے درس و تقریر میں دیکھی۔

علمی کمال اور دینی جمال کی بادِ بہاری

۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں، جب کہ راقم الحروف ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاذِ زبانِ عربی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا؛ مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ^(۱) کی دعوت پر، شیخ ابو غندہ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ندوے تشریف لائے۔ جمعرات ۲۶ / جمادی الاخریٰ تا منگل ۹ / رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۳ / مئی تا ۲۵ / جون ۱۹۷۹ء ندوہ ہی میں اُن کا قیام رہا۔ ذمہ داروں کے اصرارِ مسلسل کے باوجود، انھوں نے شہر کے کسی ہوٹل میں قیام گوارا نہ کیا؛ بل کہ عام ہندوستانی مدرّسین کی طرح مئی جون کی شدید گرمی میں وہ اُس وقت کے سادے مہمان خانے میں، جہاں اُس زمانے میں ضروری سامانِ راحت بھی دستِ یاب نہیں تھے، علم و علما کے درمیان اور دینی فضا

(۱) اور بہ وقتِ اشاعتِ کتاب در ۱۴۳۱ھ / ۲۰۱۰ء رحمتہ اللہ علیہ کیوں کہ ۲۲ / رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۹ء کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

میں قیام کو بہ اصرار ترجیح دیا۔

اُس موقع سے فخر ہند محمدؑ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نور اللہ مرقدہ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء — ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) سے بھی یہاں تشریف لانے اور قیام فرمانے کی گزارش کی گئی تھی جو انھوں نے ازراہ نوازش قبول فرما کر شیخ ابوعدہ کے ساتھ طویل قیام فرمایا۔ علم و فضل اور حدیث و اسماء الرجال کے ان دونوں شہ بازوں کے قرآن السعدین اور اجتماعی قیام کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ علم و کمال کی مینہ برس رہی ہے۔ ہر طرف علم و فن کی باتیں، علمائے سلف کے قصے، حدیث و اسماء الرجال کے تذکرے، علمی نکتے اور لطیفے، مطالعہ و کتب بینی کے مشغلے؛ ان دونوں بزرگوں کے ہمہ وقت کے علمی و مذاکرتی انہماک کی وجہ سے، اس طرح قائم ہو گئے تھے، جیسے علم و فکر کا موسم بہار آ گیا ہو، یا فیضان علمی و بخشش آگہی کی باد بہاری چلنے لگی ہو۔

صبح سے ۱۲ بجے تک کے ہمہ روزہ درس میں، اکثر حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ^(۱) اور ندوے کے اونچے درجے کے طلبہ کے علاوہ زیادہ تر اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ شیخ ابوعدہ (جو دن میں اصولی حدیث اور بہ طور خاص شروط ائمہ خمسہ: بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کا درس دیتے اور رات میں اکثر کوئی عام علمی محاضرہ القافرماتے) کا ابر علم برستا تو ایک ساتھ گوہر زبان و بیان اور علم و آگہی کا یاقوت و مرجان لٹا جاتا اور سامعین کا دامن ایک ہی نشست میں کفِ باغ بان اور دامن گل فروش سے زیادہ بھر پور نظر آنے لگتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے اپنی ڈائری سے ایک پیرا گراف نقل کر دیا جائے، جو راقم نے آج سے کم و بیش ۱۸ سال قبل (۲) شب یک شنبہ: ۲۹/۶/۱۳۹۹ھ مطابق ۲۷/۵/۱۹۷۹ء کو شیخ ابوعدہ کے درس کی ایک نشست میں شرکت کے بعد لکھا تھا۔

(۱) اور اب بہ وقت اشاعت کتاب در ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء — ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء)

(۲) یعنی بہ وقت کتب مضمون در عربی زبان۔

”ابھی ابھی محدث کبیر علامہ جلیل شیخ عبدالفتاح ابوعدہ استاذ شریعت اسلامی کالج امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کے محاضرے اور درس میں شرکت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر واپس ہوا ہوں۔ شیخ علم و عمل کی جامعیت، سچے مومن کی تواضع، انکساری، بے نفسی اور رقتِ قلب کے اعتبار سے نہ صرف عالمِ عرب؛ بل کہ عالمِ اسلام کی بے نظیر شخصیت ہیں۔ ہر چند کہ اُن کا درس دراصل، اصولی حدیث اور شروطِ ائمہؒ نمسہ کے موضوع پر ہوا کرتا ہے؛ لیکن وہ فقہ و تفسیر، ادب و لغت، نحو و صرف، قراءت و تجوید، حکمتِ بیانی، طلاقتِ لسانی، لطیف اشاروں اور ماہرانہ رموز و نکات کا جامع ہوا کرتا ہے؛ جس سے درس دہندہ کی سلیقہ مندی، کثرتِ علم، وسعتِ مطالعہ، ژرف نگاہی، پختہ مغز، طولِ تجربہ، فکر و فن سے گہری مناسبت اور اپنے موضوع پر دیرینہ ادھیڑ بن کے ساتھ ساتھ، راہِ اکتسابِ علم میں اُس کی شبِ بیداری اور شمعِ شعاری و پروانہ مزاجی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نیز اُن کی ذہانت، قوتِ حافظہ، کثرتِ محفوظات، طلبہ و مستفیدین کے سامنے مواد و مضامین پیش کرنے کے حوالے سے، اُن کی فنِ کاری اور چابک دستی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان سب چیزوں پر مستزاد اُن کی شریں بیانی، شگفتہ سخن، فصاحتِ بیانی، بلاغتِ شناسی، حاضر جوابی اور ادب و ظرافت کے عناصر سے مرکب اُن کی وہ زبان ہے، جس کے سامنے بہت سے پیشہ ور عربی ادیبوں اور خطیبوں کی صنعتِ کاری ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ عرصہ نو سال سے میں ندوے میں مدرس ہوں، لیکن اب تک میں نے آنے جانے والے کسی عربی ادیب و خطیب کی زبان میں وہ چاشنی، سلاست، نہر کی روانی، الفاظ کی شوکت، تعبیر کی لذت، طرزِ ادا کی نزاکت، جملوں کی حلاوت نہیں دیکھی جو میں ابوعدہ کے یہاں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں۔ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندوں میں سے، جسے چاہتا ہے، اتنی بہت سی خوبیوں سے نواز دیتا ہے۔ اُن کا درس، سنجیدگی

ومزاح کا بھی حسین مخلوط ہوا کرتا ہے، علمائے سلف کے مسرت بخش لطیفوں سے مجلس درس کو زعفران زار بنائے رکھتے ہیں؛ لیکن ساتھ ہی جب بھی کسی عالم باکمال، زابدِ اَدَب، محدثِ جلیل، فقیہِ با بصیرت کا تذکرہ کرتے ہیں، یا اُن کے حصولِ علم کی داستان اُن کی زبان پر آ جاتی ہے، یا راہِ علم میں بھوک پیاس سے بے پروا ہو کر اور راستے کی درازی و خطرناکی سے بے خوف ہو کر اُن کے سفر کرنے کا حال سناتے ہیں، یا اُن کے بے نظیرِ اخلاص، اپنے خدا اور اُس کے رسول سے اُن کی محبت و فتانیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، تو وہ بار بار آبِ دیدہ و بے قابو ہو جاتے ہیں اور کئی کئی منٹ تک سلسلہٴ درس منقطع ہو جاتا ہے۔

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں، وہ آنسو

کرتی ہے چمک جن کی، ستاروں کو عرقناک

ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ اخلاص و وفا، رقتِ قلب، علم و عمل، بے نفسی و خاکساری، حیا و خجالت، ایمان و یقین، گدازی و نرم خوئی، دینی صلابت اور ایمانی حرارت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں، یہ خصائل اب کبریتِ احمر کی طرح خواص و علما میں بھی کم یاب ہیں۔ عوام و جہلا کا کیا ذکر۔

منگل ۹/ رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۵/ جون ۱۹۷۹ء کو آٹھ بجے صبح، لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر انھیں طلبہ و اساتذہ کی بڑی تعداد نے، جس خلوص و محبت و عقیدت کے ساتھ رخصت کیا تھا، اُس کی ہلکی سی جھلک میں نے اپنی ڈائری میں بہ روز جمعہ ۱۲/ ۷/ ۱۳۹۹ھ مطابق ۸/ جون ۱۹۷۹ء کو ریکارڈ کر لیا تھا۔ اُس کی چند سطریں نذرِ ناظرین کر رہا ہوں:

”۹/ رجب بہ روز منگل، لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر عالمِ جلیل، مومنِ مخلص

اور محدث و محقق عبدالفتاح بن محمد بن بشیر ابو غدہ حلبی (ولادت: ۱۹۱۷ء) کو با چشم

ہائے نرم و بادل ہائے پر غم طلبہ و اساتذہ کے جم غفیر نے الوداع کہا، بعض طلبہ و فور

جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، بڑی مشکل سے انھیں دلاسا دلایا

جاسکا۔ یہاں اپنی نو سالہ مدرسے کے دوران، میں نے پچاسوں علما و فضلاء کو استقبال والوداع کہتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن کسی کے تئیں یہ والہانہ عقیدت و محبت دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہاں ۱۲-۱۳ روزہ قیام کے دوران طلبہ و اساتذہ نے جہاں اُن کے گونا گوں علم و آگہی اور فکر و نظر سے استفادہ کیا، وہیں لاشعوری طور پر اُن کی روحانیت و ربانیت کے شیعہ و جام سے بھی فیض یاب ہوئے۔ ایمان و اخلاص اور ہمت و عزیمت پر سان چڑھی، دلوں کا زنگ دور ہوا، عقل و خرد کو پاکیزگی ملی۔ کتب بینی، مطالعہ و علم کو شوق، شب و روز علمی انہماک اور افادے و استفادے کے بغیر کسی لمحے کے ضیاع سے گریز اور تمام اوقات لیل و نہار کو علمی مباحثے، سوالات کے جوابات، علمی مسائل کی کھود کرید، کسی حاشیے کی تحقیق، کسی مغالطے کی تصحیح، کسی مضمون کی تیاری و تسوید میں، اُن کی عجیب و غریب مصروفیت سے (جس کا قصہ ہم دور آخر میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت حکیم الامت تھانویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، علامہ سید سلمان ندویؒ وغیرہ کے متعلق سنتے آئے تھے) ایسا لگتا تھا کہ علم کا سوتی عکاظ اور فکر و نظر کا ذوالجہد و مجاز قائم ہو گیا ہے اور امام ابو حنیفہ و امام شافعی ایسے امام عظیم کے شاگرد یا شاگرد کے شاگرد نے تعلیم و تدریس کی بساط بچھا دی ہے۔“

ہندوستان میں علم کا شجر سایہ دار

۱۲۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء میں راقم الحروف کو ۵-۶ مہینے ریاض و حجاز میں قیام اور حرمین شریفین کی زیارت کی اولین مرتبہ سعادت حاصل ہوئی، جس کا عنوان جامعۃ الملک سعود ریاض میں عربی زبان کی تدریس کے سلسلے کے ایک پروگرام میں شرکت کرنا تھا۔ اس موقع سے جہاں متحدہ دعوادباے عرب سے شرف ملاقات و تعارف حاصل ہوا وہیں علامہ ابو غدہ سے بھی ایک روز تا دیر اکساب فیض کی فرصت ملی۔

راقم الحروف نے اس ملاقات کا تذکرہ اپنے سفرنامے بہ عنوان ”تین مہینے سعودی عرب اور جوارِ حرمین میں“ کی ساتویں قسط شائع شدہ ”الداعی“ مورخہ ۴-۱۹ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۰-۲۵ دسمبر ۱۹۸۳ء میں مختصر طور پر کیا تھا۔ اُس کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

”فہم جمعہ و شنبہ ۲۹ رجب و یکم شعبان ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۲-۱۳ مئی ۱۹۸۳ء کو چند احباب کے ساتھ علامہ شیخ عبدالفتاح ابودنہ استاذ (کلیۃ اصول الدین) جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، سے اُن کی قیام گاہ واقع میدانِ دُخنہ ریاض میں شرفِ ملاقات و استفادہ حاصل ہوا۔ شیخ، علمائے ہند کے بڑے قدرداں اور علومِ کتاب و سنت میں اُن کی گیرائی و گہرائی کے اور اسلامی علوم میں اُن کے متفردانہ رسوخ کے بے حد قائل ہیں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ علامہ عبدالحی فرنگی محلی، علامہ محمد انور شاہ کشمیری، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا بدر عالم میرٹھی وغیرہ کے بالخصوص بڑے مداح ہیں اور اُن کے علمی ترکے سے استفادے کا پیہم تعلق رکھتے ہیں۔ دیوبند اور اُس کے مکتب فکر کو ہندی مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اسی لیے جیسے ہی مجلس جمعی شیخ نے دارالعلوم دیوبند کا احوال معلوم کرنا شروع کر دیا اور فرمایا کہ یہ ہندوستان میں ”علم کا شجر سایہ دار“ ہے اس نے فکرِ اسلامی اور ثقافتِ دینی کی بے حساب خدمت کی ہے، ہم اس کی بقا و ترقی اور مزید فیض رسانی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ شیخ نے طلبہ و اساتذہ کی تعداد، نئی تعمیرات اور کتب خانے میں موجود مخطوطات کی نئی فہرست کی تیاری کی بابت معلوم کیا۔ جب ہم نے یہ کہا کہ ہم لوگ اور اساتذہ و طلبہ دارالعلوم آپ سے حد درجہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں، تو فرمایا کہ مجھے دارالعلوم سے ناقابلِ بیان محبت ہے اور میں تو اُس کے علما و مشائخ کا خوشہ چیں رہا ہوں۔ اس موقع سے شیخ نے اپنی ایک غلط فہمی کا اظہار فرمایا کہ آپ کے ہاں عربی زبان و ادب کے ایک

فاضل ہیں، میں اُن کا بہت مدّاح ہوں؛ لیکن معلوم ہوا ہے کہ وہ دارالعلوم کو چھوڑ کر سعودی سفارت خانے میں منتقل ہو گئے ہیں، اُن کا نام مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ہے، عرض کیا گیا کہ شیخ! آپ کو اس سے غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ اُن کے بھائی مولانا عمید الزماں کیرانوی عرصے سے وہاں ملازم ہیں اور نام کے تشابہ اور کیرانوی کے اشتراک سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا۔ فرمایا الحمد للہ! مجھے اس غلط فہمی سے بے حد تکلیف تھی، وہ بڑے ذہین، قادر الکلام اور عربی کے باصلاحیت اہل قلم ہیں، انھیں دارالعلوم ہی میں رہنا چاہیے، ہندوستان واپسی پر انھیں میرا سلام ضرور پہنچا دیجیے۔

مولانا بدر عالم میرٹھی اور ایک عرب بدو کا واقعہ

اس موقع سے شیخ نے اپنی تحقیق کے ساتھ طبع شدہ ابن قیم الجوزیہ متوفی ۷۵۱ھ کی کتاب ”المنار المنیف فی الصحیح والضعیف“ حقیر کو ہدیہ کی۔ ناچیز نے اُن سے ہدیے کے الفاظ اپنے قلم سے تحریر فرمادینے کی درخواست کی تو انھوں نے صحیح اور مکمل نام معلوم کیا۔ راقم نے (نور عالم خلیل الایمنی) بتایا تو گراں قدر دعا دی کہ خدا آپ کو ہدایت کا نور اور تاریکیوں کو کافور کرنے والا بنائے۔ پھر ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ آپ لوگ علامہ بدر عالم میرٹھی کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہ دارالعلوم کے ایک ذی علم فاضل اور ہندوستان کے کبار علما میں تھے۔ ایک روز وہ مسجد نبوی میں مؤابہہ شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عربی بدو آیا، اُس نے صلاۃ و سلام کے بعد اُن کو سلام کیا اور اُن سے متعارف ہونا چاہا اور بدویانہ لہجے میں پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ آپ نے ”بدر عالم“ بتایا تو اُس نے ناز و اعتماد کے عجیب و غریب ایمان افروز و محبت فروز لہجے میں کہا: ”میں تم بدر عالم (دنیا کا ماہ تمام) نہیں ہو سکتے، دنیا کا ماہ تمام اور بدر عالم تو یہ ہیں۔ اُس نے حضور اکرم ﷺ کی قبر اطہر کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مولانا بدر عالم پر اس کا خفیہ حقیقت جملے سے جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ دیر تک سر دھنتے اور واہ واہ کرتے رہے۔

از دل خیزد، بردل ریزد

۲۹-۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو دارالعلوم حیدر آباد میں ”حدیث و سیرت نبوی“ کے موضوع پر عالمی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی اُس میں یہ راقم بھی مدعو تھا، اُس میں امام حرم شیخ عبدالرحمن السدیس اور دیگر عربی وفود کے ساتھ، ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے شیخ ابوغدہ بھی تشریف لا کر مجلس کی رونق و وقار کا سبب بنے، ایک نشست میں سیرت نبوی کے موضوع پر اُن کی پر مغز و برجستہ تقریر ہوئی، عربی زبان کو سمجھنے اور نہ سمجھنے والے دونوں طرح کے سامعین، مقرر کے حسن بیان، فصاحت و بلاغت کے عطر و عنبر سے دھلی ہوئی اور حب نبوی سے منور زبان سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اُن کی تقریر برجستہ اور اچانک ہوگی ورنہ ٹیپ کرنے کا انتظام ضرور کرتا۔ تقریر کے بعد اُن سے ملنے کو بڑھا، میں نے علیک سلیک کے بعد شیخ سے پوچھا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچان سکے ہوں گے فرمایا: وَمَنِ الَّذِي لَا يَعْرِفُكَ مِنَ الْمُتَقَفِّينَ الَّذِينَ يُتَابِعُونَ الدَّاعِيَ ”الداعی“ کو پابندی سے پڑھنے والا کون لکھا پڑھا آدمی ہوگا جو آپ کو نہ جانے؟ پھر اپنے ساتھ ہی اپنی قیام گاہ پر چلنے کا حکم فرمایا، اس طرح اپنے کئی احباب کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اُن کی بزم منور سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا۔

۲۳-۲۶ صفر ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۹-۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو دارالعلوم دیوبند نے عالمی مؤتمر برائے تحفظ ختم نبوت کے انعقاد کا فیصلہ کیا، تو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اُس وقت کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (اور بعد میں دگر سرکاری و نیم سرکاری عہدوں کے حامل) کو مؤتمر کے افتتاح کے لیے اور علامہ ابوغدہ کو اُس کی صدارت کے لیے مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے راقم الحروف نے دیگر

علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غندہ حلبی شامیؒ

اور بھی عرب فضلا کو خطوط لکھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہ خوشی دعوت کو قبول فرمایا؛ لیکن سابقہ مشاغل کی وجہ سے ۳۱ اکتوبر کی نشست میں رونق افروز ہو سکے اور گراں قدر خطاب سے جلسے کی معتبریت میں اضافہ فرمایا۔ اُن کی مکمل تقریر اور دارالعلوم کی طرف سے اُن کو دیے گئے سپاس نامے کا متن ”الداعی“ کے خصوصی شمارہ ”ختم نبوت“ مورخہ ۱۰-۲۵ نومبر ۱۰-۲۵ دسمبر ۱۹۸۶ء کے مشترکہ شمارہ میں پڑھا جاسکتا ہے۔

شیخ ابو غندہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی پہلے سے طے شدہ ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے شریکِ موتمر نہ ہو سکے، جس کا اظہار اُنھوں نے مہتمم صاحب کے نام معذرت نامے میں کیا تھا، اُن کا یہ مکتوبِ گرامی اُن کی تقریر ہی کی طرح اُن کی شگفتہ نگاری اور اُن کی انشا و تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو ترجمے میں چوں کہ اُس کی خوبیوں کو مکما حقہ منتقل نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اُسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔ ”الداعی“ کے مذکورہ ختم نبوت نمبر میں اُس کا مکمل عربی متن محفوظ ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

رابطہ عالم اسلامی کی تیسری عمومی اسلامی کانفرنس

اور لازوال مُقَدَّس و بابرکت یادیں

حیدرآباد کی ملاقات کے بعد طویل عرصے تک شیخ کی زیارت سے محروم رہا، تا آن کہ ۱۸-۲۲ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱-۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رابطہ عالم اسلامی نے مکہ مکرمہ میں تیسری عمومی اسلامی کانفرنس منعقد کی، جس میں دنیا کے سات سو سے زیادہ علما و مفکرین اور اہل علم و صحافت مدعو تھے، ہندوستان سے بھی مدعوین کی ایک قابلِ لحاظ فہرست تھی، جن میں سر فہرست رابطہ کے رکن تاسیسی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱) تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ افراد میں رافع الحروف اور

(۱) اور اب بہ وقتِ اشاعتِ مضمون بہ شکلِ کتاب رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ (۱) بھی مدعو تھے۔

رابطے نے مہمانوں کے قیام کے لیے ہوٹل انٹرکانٹینینٹل (جس کے قاعة التضامن الاسلامی میں موتمر کے تمام پروگرام ہوئے) جو حرم سے خاصے فاصلے پر ہے، نیز فندق البجادین میں انتظام کیا تھا، آخر الذکر ہوٹل حرم پاک سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو حرم پاک سے متصل اسی ہوٹل میں جگہ ملی، جس سے کعبۃ اللہ کا بار بار طواف اور حرم میں بیچ وقتہ نماز کی ادائیگی میں سہولت رہی، فالحمد لله علی ذلک۔

اتفاق سے اسی ہوٹل میں شیخ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ کی فردگاہ بھی تھی اور موتمر گاہ آتے جاتے ہوئے اکثر ایک ہی بس یا کار میں جگہ مل جاتی تھی، میرے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات تھی کہ خدا کے اس مقدس ترین شہر اور خانۂ خدا کے پڑوس میں ہونے والی اس کانفرنس کے طفیل میں بڑے بڑے علما و دانشوروں کے ساتھ ساتھ، شیخ ابو نعیم ایسے علامہ یگانہ و خدا رسیدہ اور محبت رسول و عاشق علم و علما کی طویل صحبت اور پیہم ملاقاتوں کی فرصت نصیب رہی۔ حسن اتفاق سے ہوٹل میں ان کا اور میرا کمرہ ایک ہی منزل پر واقع تھے؛ اس لیے ان کی فرصت کے اوقات میں بھی اپنے بعض احباب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے بحر علم و کمال کی موج ہائے بے پناہ کا تماشا ہی سہی، دیکھ کر دل کو فرحت اور دماغ کو لطف ملتا۔

حیف کہ اس کے بعد شیخ سے کبھی ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی، کئی بار، ریاض جانا ہوا؛ لیکن میری حاضری کے وقت وہ اتفاقاً وہاں موجود نہ ہوتے کسی علمی اور ضروری سفر پر ہوتے۔

(۲) اور اب یہ وقت اشاعت مضمون بہ شکل کتاب رحمۃ اللہ علیہ؛ اس لیے کہ بہ روز دو شنبہ: ۷ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶ فروری ۲۰۰۶ء کو انتقال فرما گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ) کا برابر اصرار رہا اور ہم اساتذہ دارالعلوم کی خواہش بے پناہ بھی کہ شیخ کو دارالعلوم میں کسی موقع سے ایک دو ماہ کے لیے بلایا جائے؛ تاکہ طلبہ واساتذہ اُن سے استفادہ کر کے اپنے مشائخ و اکابر سے فیض یاب ہونے کی یاد تازہ کر سکیں؛ لیکن ہم لوگ یہ سوچتے ہی رہے، آج کل کرتے کرتے وقت بہت آگے نکل گیا اور شیخ کی عمر عزیز کا قافلہ سبک خرام رواں دواں اپنی منزل کو جا لیا۔ وقت کس کا انتظار کرتا ہے؟ اور لیل و نہار کی گردش کس کے لیے تھمتی ہے؟ رہے نام اللہ کا۔

خدا انھیں صلحا و تقیاً اور اپنے برگزیدہ انبیاء کے ساتھ جنت الفردوس کا مکیں بنائے اور اُن کے تمام اعزاز و اقربا، تلامذہ و محبین، متعارفین و متعلقین اور اُن کے لیے دعا کنندہ کو صبر جمیل دے اور اجر جزیل سے نوازے۔ اے خدا ہم تجھی سے سہارا لیتے اور تیری طرف رجوع ہوتے ہیں اور تیری ہی حضور میں ہمیں جانا ہے۔ خدا کا درود و سلام اور رحمت و برکت نازل ہو ہمارے حضرت، ہمارے نبی، ہمارے شفیع محمد پر، اُن کی آل و اولاد پر اور اُن کے تمام اصحاب پر۔ ساری تعریفیں صرف سارے جہان کے پالن ہار کے لیے ہے۔

مختصر سوانحی خاکہ

✽ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ بن محمد بن بشیر بن حسن، ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء میں ”سیریا“ یعنی ملک ”شام“ کے شمالی شہر ”حلب“ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب صحابی رسول خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اُن کے خاندان میں مکتوبہ شکل میں شجرہ نسب محفوظ ہے۔ ”حلب“ کے علما و مشائخ سے کسب علم کیا، خصوصاً مدرسہ خسرویہ عثمانیہ میں جو اس وقت ”مدرسہ ثانویہ شرعیہ“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں سے ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں فارغ ہوئے۔ پھر مدینہ علم و ثقافت ”قاہرہ“ کا

پس مرگ زندہ

رخ کیا اور ”جامعہ ازہر“ سے ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء میں علوم شرعیہ میں سند فراغ حاصل کی اور وہیں سے ۱۳۶۸ھ/۱۹۵۰ء میں کلیۃ اللغۃ العربیہ سے اصولی تدریس میں اختصاص کی سند حاصل کی۔

✽ شیخ کے بعض تلامذہ نے لکھا ہے کہ اُن کی روحانی تشکیل و تعمیر میں جن صاحبِ تاثیر علما کا بہ طور خاص حصہ رہا ہے اُن میں علامہ وفیقہ و مرنی شیخ عیسیٰ بیانوی حلبی متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء مدفن بہ جنت البقیع مدینہ منورہ، علامہ و محدث و مؤرخ و ادیب شیخ محمد راغب طبّاخ حلبی متوفی ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء اور فقیہ و لغوی علامہ مُصطفیٰ الرّقا حلبی مدظلہ (۱) سرفہرست رہے ہیں۔

✽ ”جامعہ ازہر“ میں علامہ ابوعدہ نے ایسے یگانہ روزگار علما و مشائخ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، جن کی نظیر اب ”جامعہ ازہر“ میں یا دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ اُن میں قابل ذکر فیلسوف اسلام شیخ یوسف دجوی متوفی ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۳ء اور شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، محدث جلیل علامہ احمد محمد شا کر متوفی ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء اور علامہ و اصولی و لغوی شیخ الازہر محمد الخضر حسین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، ہیں۔

✽ قاہرہ میں جس شخصیت نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا اور جس کا اُن کے اوپر سب سے زیادہ رنگ چڑھا اور جس کی محبت و عقیدت اُن کے دل میں گھر کر گئی اور زندگی بھر اُس کے سحر میں گرفتار اور اُس کے فکر و نظر کے قدح خوار رہے وہ امام وقت، علامہ زماں، محدث دوراں محمد زاہد الکوثری متوفی ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء کی شخصیت تھی۔ علامہ کوثری بھی علامہ ابوعدہ کی ذہانت، ذوق مطالعہ، شوق طلب اور جنون جستجو سے بہت متاثر تھے، حتیٰ کہ اگر حاضری میں زیادہ ناغہ کرتے، تو انھیں شاق گزرتا اور اس سلسلے میں انھیں متنبہ کرتے۔

✽ علامہ ابوعدہ کی زندگی و حالات کا مطالعہ کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علامہ کے ہاں جو علمی شئوع تھا، تحصیل علم میں زندگی بھر جواں نہا، لگن اور جاں سوزی رہی تھی، وہ اُن کے اندر علامہ کوثری ہی کی صحبت اور نفسِ گرم کی تاثیر تھی؛ کیوں کہ کوثری بہت سارے علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔

✽ مصر میں علامہ نے میر کارواں امام حسن البنا شہید (ش ۱۹۴۹ء) کی نگہ بلند، بخن دل

(۱) اور اب بہ وقت اشاعتِ مضمون بہ شکل کتاب در ۱۳۳۱ھ/۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ: وفات بہ روز شنبہ: ۳ جولائی ۱۹۹۹ء مطابق ۱۹ ربیع الاول بہ تقویم عربی، ۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ بہ تقویم ہجریہ صغیر۔

نواز اور جان پر سوز سے رنجت سفر حاصل کیا، اُن کی اخوان المسلمون کے فکر و نظر کو اپنایا اور تادمِ زندگی، عالمِ عرب کی نشأتِ ثانیہ کی اس سب سے بڑی اور طاقت ور ذی تاثیر جماعت و تحریک کے اعلیٰ قائدین میں اُن کا شمار رہا اور اپنے ملک کے اخوانیوں کو نازک وقتوں میں نہ صرف سہارا دیا؛ بل کہ اُن کے قلب و عقل کو اپنے شرِ رُحْلہٗ محبت سے نئی زندگی بخشی۔

✽ مصر سے توشہٗ علم و آگہی اور زادِ عشق و مستی و نظرِ حکیمانہ، گفتارِ دل برانہ اور کردارِ فاتحانہ کے ساتھ، اپنے وطن ”سیریا“ واپس آئے تو وہ یہاں کے اخوانیوں کی دعوتی، فکری اور تحریکی زبان اور اُن کے جذبات و احساسات کے ترجمان بن گئے۔ اُن کی علمی گیرائی و گہرائی، فرزانگی، وسعتِ قلبی، روشن ضمیری، حق گوئی و بے باکی، اندیشہٗ شایں صفت اور سوز و تب و تاب کی وجہ سے اخوانی اُن کے گرد اکٹھا ہو گئے اور وہ اُن کے بجا و ماویٰ بن گئے۔ باوجودِ کہ وہ شہیدِ علم تھے اور علمی، دعوتی اور تصنیفی و مطالعاتی اشغال اُن کا اوڑھنا بچھونا تھے؛ لیکن وقت کی نزاکت نے انھیں کئی مرتبہ اخوان کی انتظامی ذمہ داریوں کو اٹھانے پر بھی مجبور کیا؛ لیکن جلد ہی کسی لائق فرد کے سپرد کر کے سکندری پر، قلندری کو ترجیح دیتے رہے۔ ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء میں ایک مرتبہ پھر انھیں ”سیریا“ کی اخوان کا مرکزِ اقب عام بننا پڑا؛ لیکن ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء میں انھوں نے ڈاکٹر حسن ہویدی کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔

✽ اخوان پسندی اور اخوانیوں کے ساتھ اسلام و مسلمانوں کے مسائل کو اٹھانے اور سیریا (شام) جیسے خاص اسلامی و عربی ملک میں احکامِ اسلام کی پامالی کے خلاف آواز بلند کرنے کی وجہ سے ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء میں انھیں دعاۃ و مفکرین کی ایک (طبی) جماعت کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور ”تدمر“ کے صحرائی جیل میں وہ گیارہ (۱۱) ماہ تک قید رہے؛ لیکن ۵ جون ۱۹۶۷ء مطابق ۲۶ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ کے اَلیَمِے کے بعد (جس میں اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور بیت المقدس نیز دریائے اردن کے مغربی کنارے اور صحرائے سینا پر، اسرائیل کے قبضے کا وہ حادثہٗ جاں کاہ پیش آیا، جس کا زخم اب ناسور بن چکا ہے اور ذلت و رسوائی کا جو تسلسل ہنوز جاری ہے وہ اسی غیرت شکن حمیت سوز شکست کی دین ہے) انھیں اور اُن کے ساتھ قیدِ علما و مفکرین کو رہائی نصیب ہوئی تھی۔ (۱)

(۱) اخوان المسلمون، سیریا کا تعزیتی بیان، المجتمع کویت، شمارہ ۱۸/۱۰/۱۴۱۷ھ مطابق ۲۵/۲/۱۹۹۷ء۔

پس مرگ زندہ

✽ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں انھیں سیریائی پارلیامنٹ کا ممبر منتخب کیا گیا، جو گویا سیریائی عوام کی طرف سے اُن کے حق میں خراجِ محبت تھا۔ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء میں ”سیریا“ کی وزارتِ معارف کی طرف سے منعقدہ مسابقتِ مدرسینِ تربیتِ اسلامی میں حصہ لیا اور تمام شرکاء میں نمبر ایک رہے۔ ”حلب“ کے مدارس ثانویہ میں ۱۱ سال تک تربیتِ اسلامی کا مضمون پڑھایا نیز اُس مضمون کی درسی کتابوں کی تیاری میں سرگرم طور پر حصہ لیا؛ اسی کے ساتھ ساتھ تربیتِ ائمہ و دعاۃ کے مدرسے موسوم بہ ”مدرسہ شعبانیہ“ اور ”ثانویہ شرعیہ“ یعنی سابق مدرسہ خسرویہ (جہاں انھوں نے خود بھی تعلیم حاصل کی تھی) میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر انھیں دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ کا استاذ منتخب کیا گیا، جہاں تین سال تک اُصول فقہ، فقہ حنفی، فقہ مذاہب اربعہ کے مضامین پڑھائے اور ”معجم فقہ المحلی لابن حزم“ کی تکمیل کی، جسے دمشق یونیورسٹی نے دو جلدوں میں شائع کیا۔

✽ اِس کے بعد وہ ۲۳ سال ریاضِ سعودی عرب کی دونوں اہم جامعات میں تدریسی خدمات پر مامور رہے، چنانچہ ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء تا ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء جامعہ اسلامیہ امام محمد بن سعود میں اور ۱۴۰۸ھ تا ۱۴۱۱ھ/۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۱ء جامعۃ الملک سعود میں وہ حدیث شریف کے پروفیسر (استاذ) رہے۔ اِس مدت میں ہزاروں طلبہ نے اُن کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کی۔ بعض حلقوں کی طرف سے اُن کے حنفی و اخوانی مذاق و مزاج اور زاہدانہ و صوفیانہ فکر و نظر کی وجہ سے اذیت رسانی کا ارتکاب بھی کیا گیا؛ لیکن علمائے سلفِ صالحین کی طرح انھوں نے صبر و احتساب سے کام لیا اور مذکورہ حلقے کے جدال پسند و نقاش پیشہ و تنگ نظری شعار و سلامت روی بیزار علما کی طرح کبھی انتقامی کارروائی کی نہیں سوچی؛ بل کہ اپنا معاملہ صرف اپنے ربِّ شکور کے سپرد کر کے یک سو ہو گئے اور اپنے کردار، اپنے علمی مقام، اپنی گراں مایہ و بے نظیر علمی و دینی خدمات کو خدا اور خلقِ خدا کے روبرو شہادتِ ناطقہ رہنے دیا۔

علامہ کی اہم تالیفات و تحقیقات

تصنیف کردہ کتابیں

۴ ایڈیشن

۱- صفحات من صبر العلماء علی شدائد العلم والتحصيل

- ۲- العلماء العزّاب الذی آثروا العلم علی الزواج
- ۳- قيمة الزمن عند العلماء
- ۴- الرسول المعلم وأساليبه في التعليم
- ۵- لمحات من تاريخ السنة وعلوم الحديث
- ۶- أمراء المؤمنين في الحديث
- ۷- الإسناد من الدين ومعه : صفحة مشرقة من تاريخ سماع الحديث عند المحدثين
- ۸- السنّة النبویة وبيان مدلولها الشرعي
- ۹- تحقيق اسمي الصحيحين واسم جامع الترمذي
- ۱۰- منهج السلف في السؤال عن العلم وفي تعليم ما يقع ومالم يقع
- ۱۱- من أدب الإسلام
- ۱۲- نماذج من رسائل أئمة السلف وأدبهم العلمي
- ۱۳- كلمات في كشف أباطيل وافتراءات
- ۱۴- مسألة خلق القرآن وأثرها في صفوف الرواة والمحدثين وكتب الجرح والتعديل

تحقیق کردہ کتابیں

- ۱- الرفع والتكميل في الجرح والتعديل
 - ۲- الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة
 - ۳- تحفة الأخبار بإحياء سنة سيد الأبرار
 - ۴- نخبة الأنظار على تحفة الأخبار
 - ۵- المنار المنيف في الصحيح والضعيف
 - ۶- المصنوع في معرفة الحديث الموضوع
 - ۷- قواعد في علوم الحديث
- علامہ عبدالحی فرنگی محلی ۳ ایڈیشن
- علامہ فرنگی محلی ۲ ایڈیشن
- علامہ فرنگی محلی
- علامہ فرنگی محلی
- امام ابن قیم جوزیہ ۵ ایڈیشن
- ملا علی قاری ۳ ایڈیشن
- شیخ ظفر احمد تھانوی ۶ ایڈیشن

- ۵ ایڈیشن تاج الدین بکی ۸- قاعدة في الجرح والتعديل
- ۴ ایڈیشن حافظ سخاوی ۹- المتكلمون في الرجال
- ۲ ایڈیشن حافظ ذہبی ۱۰- ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل
- ۲ ایڈیشن حافظ ذہبی ۱۱- الموقظة في علم مصطلح الحديث
- ابن الحسنی ۱۲- قفر الأثر في صفو علم الأثر
- حافظ بیدي ۱۳- لغة الأريب في مصطلح آثار الحبيب
- ۱۴- جواب الحافظ المنذري عن أسئلة في الجرح والتعديل
- شیخ طاہر جزائری ۱۵- توجيه النظر إلى أصول الأثر
- علامہ فرنگی بکلی ۱۶- ظفر الأماني في شرح مختصر الجرجاني
- الغبنی ۱۷- كشف الالتباس عما أورده الإمام البخاري على بعض الناس
- مولانا نعمانی ۱۸- مكانة الإمام أبي حنيفة في الحديث
- علامہ جزائری ۱۹- التبيان لبعض المباحث المتعلقة بالقرآن
- علامہ احمد شاکر ۲۰- تصحيح الكتب وصنع الفهارس المعجمة
- علامہ میدانی ۲۱- تحفة النساك في فضل السواك
- ابوزید قیروانی ۲۲- العقيدة الإسلامية التي ينشأ عليها الصغار
- شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۲۳- الحلال والحرام وبعض قواعدهما في المعاملات المالية
- امام حارث محاسبی ۲۴- رسالة المسترشدين
- علامہ محمد انور شاہ کشمیری ۲۵- التصريح بما تواتر في نزول المسيح
- ۲ ایڈیشن ۲۶- الإحكام في تمييز الفتاوى عن الأحكام وتصرفات القاضي والإمام
- امام قرانی ۲۷- الترقيم وعلاماته
- احمد زکی پاشا

- ۲۸- سباحة الفكر بالجهر بالذكر علامہ فرنگی محلی
- ۲۹- قصيدة "عنوان الحكم" لأبي الفتح البستي
- ۳۰- رسالة الألفة بين المسلمين امام ابن تيمية
- ۳۱- إقامة الحجّة على أن الإكثار من التعبد علامہ فرنگی محلی
- ليس بدعة
- ۳۲- فتح باب العناية بشرح كتاب النقاية
- "فقه حنفی" ملا علی قاری
- ۳۳- فقه أهل العراق وحديثهم علامہ زاہد کوثری
- ۳۴- خلاصة تهذيب الكلام في أسماء الرجال حافظ خزرجی (۱)



(۱) عربی تحریر شائع شدہ "الداعی" عربی، شمارہ ۱۱، جلد ۲۰، ذی قعدہ - ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق اپریل ۱۹۹۷ء، کالم "کلمۃ العدد/ ادارۃ" اردو تحریر بہ قلم خود، شائع شدہ "ترجمان دارالعلوم" نئی دہلی، و "ندائے شامی" مراد آباد، و "اخبار مشرق" کلکتہ وغیرہ۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء — ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

رفتید و لے نہ از دلِ ما

دوشنبہ ۲۷/۱۲/۱۴۱۷ھ مطابق ۵/۱۲/۱۹۹۷ء کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے، شہر مظفر پور سے، میں نے دیوبند میں اپنے اہل خانہ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ آج ”ویشالی اکسپریس“ سے دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، اِنْ شَاءَ اللہ کل علی الصبح دہلی اور دہلی سے ایک بجے چھوٹنے والی لدھیانہ سپر فاسٹ سے، ساڑھے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچ جاؤں گا۔ ریسپور ہاتھ سے رکھنے سے پہلے، میں نے یوں ہی چلتے چلاتے پوچھ لیا کہ اور کوئی قابل ذکر بات تو نہیں؟ تو اہلیہ نے بتایا کہ ہاں، لکھنؤ میں کوئی مولانا منظور نعمانی تھے، اُن کا آج شب میں وہاں کے کسی نرسنگ ہوم میں ۸ بج کر ۳۴ منٹ پر انتقال ہو گیا ہے، دارالعلوم کے مناہروں سے آج رات سے ہی بار بار اُن کی وفات کی خبر دی جا رہی ہے، اِس وقت دارالعلوم میں ایصالِ ثواب اور تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے۔
میں نے ”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ“ پڑھتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہاتھ سے

ریسور رکھ دیا۔ سوچنے لگا کہ ان کے لیے تو ”کوئی مولانا منظور نعمانی تھے“ جن کا انتقال ہو گیا ہے؛ لیکن میرے لیے اور تمام ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ کتنا بڑا سانحہ ہے؟! کتنے بڑے، کتنے مشہور، مولانا کا انتقال ہو گیا ہے؟ کیسا دیا بجھ گیا ہے اور کتنی تاریکی بڑھ گئی ہے؟ میں اُس غیر مسلم ”ایس ٹی ڈی“ والے کے یہاں خاصی دیر تک اسی سوچ میں کھویا، ایک طرف کو پڑی ہوئی بیچ پر بلا ارادہ بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ میرے گاؤں کے دو ایک صاحبان جو تھے، وہ میرے اُلَمِ آمیز تاثرات کو پڑھنے کے لیے میرے چہرے پر بار بار سوالیہ نظریں ڈال رہے تھے؛ پھر انھوں نے یہ کہہ میری خاموشی توڑ دی کہ ان صاحب (ایس ٹی ڈی والے) کا حساب تو چکا دیجیے اور ہاں: اب ہمیں اسٹیشن کی راہ لینی چاہیے، دیگر ہم سفر شدت سے انتظار کر رہے ہوں گے۔

سفر کی حالت میں ایک ایسے زبردست عالمِ باعمل و مفکرِ باکمال کے انتقال پر ملال کی اچانک خبر سے (جن سے دیرینہ و گونا گوں تعلقات کی بنا پر ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ایک شفیق باپ اور ہم درد مری ہیں) دل کو جو دھچکا لگا اُس کو الفاظ میں کیوں کر بیان کیا جائے؟ مظفر پور سے دہلی اور دہلی سے دیوبند تک کا سفر ذہنی سکنتی و قلبی شکستگی کے ساتھ ہوا۔ دہلی میں اردو اخباروں کی تلاش رہی کہ دیکھیں اُن میں مولانا نعمانی کی وفات کے حوالے سے آج کیا چھپا ہے؟ ”ہمارے ایک عزیز ۶ مئی ۱۹۹۷ء کا قومی آواز لے آئے۔ اُس میں صفحہ اول پر نمایاں سرخی کے ساتھ دارالعلوم میں ہونے والے کل کے تعزیتی جلسے کی مختصر روداد کے ساتھ یہ خبر تھی کہ دارالعلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ دارالعلوم کے دو ایک اساتذہ کے ساتھ، مولانا نعمانی کے اعزاز سے تعزیت کے لیے ۶ مئی کو ہی لکھنؤ روانہ ہو گئے ہیں۔

یہ سوچ سوچ کر غم اور دوبالا ہو جاتا کہ اپنی خوبیوں کے اعتبار سے ایسے عالمِ یگانہ و مصنفِ بے بدل سے ہماری ملت جو محروم ہو گئی ہے، تو اُس کا اب کیا ہوگا؟ مولانا نعمانی جیسا عالم (جس نے اپنی تابناک علمی و قلمی خدمات سے ملت کا دامن بھر دیا ہو؛ جس کی

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

شخصیتِ خداے پاک کی توفیقِ خاص کی دین ہو؛ بہت سے علمائے ربانین کی دعاؤں اور تمناؤں کا ثمرہ ہو؛ جس کو سال ہا سال کی ریاضت و مجاہدے، فکر و نظر کی پلچل اور سعی و عمل کی تابانی نے تراشا ہو (ملت کو اب کیوں کر نصیب ہو سکتا ہے؟۔ ادھر چند سالوں کے دوران پرانی نسل کے وہ سارے علماء، جو ہند میں سرمایہ ملت کی نگہ بانی اور جسمِ اسلامی کو خونِ تازہ کی فراہمی کی معززانہ ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے؛ یکے بعد دیگرے ہمیں بے سہارا کرتے چلے گئے۔ آزادی کے بعد کے روز بہ روز پیچیدہ تر ہوتے جا رہے حالات میں، ان بزرگوں کا وجود اس دیار کے مسلمانوں کے لیے ”قتیلِ رہبانی“ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ نازک حالات کی بے رحم تاریکیوں میں انہی کی فکری فیض بخشی کے طفیل راہِ صواب کی راہ نمائی حاصل کر لیتے اور بہت مرتبہ سر پر آئے ہوئے خطروں سے نہ صرف دھراور سر کو بچالے جانے کا جتن کرتے رہے؛ بل کہ فکر و نظر اور عقیدہ و شناخت کی شہِ رگ کو ہر قسم کے خراش سے بھی محفوظ کیے رہے۔

مولانا نعمانی کی عظمت

مولانا نعمانیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایسے علمائے نام دار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو عالم میں انتخاب اور علم و عمل کے آفتاب و ماہ تاب تھے۔ علم و عمل کی جامعیت کے اعتبار سے اس وقت ان کی نظیر نہ صرف برصغیر میں؛ بل کہ پوری دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آج علم کی ”سرکشی“ اور معلومات کی ”دھماکہ خیزی“ و ”رستاخیزی“ کا دور ہے۔ عقل نے قلب کے خلاف اور علم نے عشق کے خلاف ”مسلح“ کام یاب اور افسوس ناک ”بغاوت“ کر رکھی ہے۔ ”زبانِ ہوش مند“ ”دل روشن“ پر غلبہ پایا چاہتی ہے اور مادیت اپنے تمام کڑ و فر کے ساتھ روحانیت سے برسرِ پیکار ہے۔ سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ بہت سی جگہ اور بہت سی مرتبہ اول الذکر، ثانی الذکر پر اُسی کی شکل و صورت میں حملہ آور ہوتی رہتی ہے؛ اس طرح ”من کی دنیا“ کے مخلصوں اور ”تن کی

پس مرگ زندہ

دنیا“ کے اہل کاروں میں بہت سے ظاہر بینوں کے لیے فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن مولانا نعمانی نے، جن برگزیدہ علمائے یگانہ سے کسب فیض کیا، اُن کی اخلاص و للہیت کی قسم کھائی جاسکتی ہے؛ وہ بلاشبہ صحابہ صفات تھے۔ دنیا کے موجودہ چوکھٹے میں اُن کی نظیر تو کیا کوئی تصویر بھی نظر نہیں آتی۔ جو اُن کے پروردہ، اُن سے فیض یافتہ اور اُن کی خوبیوں میں رچے بسے ہوئے تھے؛ وہ بھی ایک ایک کر کے چلے گئے۔

مولانا نے جس دور میں دارالعلوم دیوبند میں علم حاصل کیا اُس وقت تک اُس کی یہ خصوصیت بڑی حد تک باقی تھی کہ نہ صرف اُس کے اساتذہ و طلبہ؛ بل کہ اکثر ملازمین و دربان تک لذتِ سحر خیزی و تہجد گزاری و گریہِ خلوت سے واقف ہوا کرتے تھے۔ لالہ زار ان مشرق میں جو دانش کدے اور تعلیم گاہیں؛ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ یا بعد میں قائم ہوئیں اور ہو رہی ہیں، اُن کے درمیان دارالعلوم کا یہ امتیاز (اُس پر گزر جانے والے تمام طوفانوں کے باوجود) قائم ہے کہ وہ گفتار کی بجائے کردار کا ”غازی“ ہے۔ ربِ کریم سے دعا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اُس کو، اپنے اس امتیاز پر باقی رہنے کی توفیق بخشے؛ بل کہ اُس کو یہ توفیق بھی ارزانی کرے کہ وہ اس حوالے سے اپنے عہدِ کہن کی طرف پوری آبِ تاب کے ساتھ لوٹ جائے۔

دیوبند میں مولانا نعمانی کے اساتذہ میں سرفہرست محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۳ء) تھے۔ علامہ کشمیریؒ کو اُن کے ربِّ حکیم نے ورع و تقویٰ کے ساتھ قوتِ حافظہ اور ذکاوت کی وہ دولت دی تھی جو ہمارے کبارِ محدثین اور علمائے مجتہدین کا طرہ امتیاز رہے ہیں۔ عصرِ حاضر میں تو کیا خود اُن کے ہم عصروں میں اُن کی نظیر عرب و عجم میں شاید ہی موجود رہی ہو۔ بڑے سے بڑا عالم، زیادہ سے زیادہ معلومات کا حافظ اور مطالعہ میں گیرائی و گہرائی کا حامل ہوتا ہے اور اسی قبیل کے عالم کو ”علامہ“ کہہ دیا جاتا ہے۔ علامہ کشمیریؒ نہ صرف اسلامی علوم و فنون کے حافظِ یگانہ اور راویِ باورایت تھے؛ بل کہ ”يَتَفَجَّرُ الْعِلْمُ مِنْ جَوَانِبِهِ“ (یعنی علوم کے سوتے اُن سے ابلتے تھے) کا صحیح مصداق تھے۔ اُن کے درازِ قامت، ہم عصروں اور عالی رتبہ بزرگوں نے بھی

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

اُن کی علمی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کا ادنیٰ شاگرد بھی آج کے ”محقق“ سے بڑا محقق اور علم و مطالعے کے حوالے سے، اُس سے کہیں زیادہ معرفت آگاہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کو اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں یہ معلوم نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۷۶۱ھ/ ۱۷۶۲ء) کے بعد کے ہندوستان میں کسی جلیل القدر صاحبِ تدریس عالم کے تمام شاگردوں کو اپنے اُستاز پر، اس درجہ ناز و افتخار و اعتماد ہو جس درجہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے بادہ کشانِ علم و عمل شاگردوں کو اُن پر رہا ہے۔ مولانا نعمانیؒ اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے شائع ہونے والی اپنی آخری کتاب ”تحدیثِ نعمت“ یعنی اپنی خودنوشت میں فرماتے ہیں:

”یوں تو اُس وقت (یعنی مولانا نعمانیؒ کی دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں) دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ میں بھی، صاحبِ مقام تھے؛ لیکن اُن میں اُس وقت کے صدر المدرسین و شیخ الحدیث اُستازنا العلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا۔ جنھوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودہویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی مُتَحَرِّر عالم ہو سکتا ہے۔ اُن کی علمی جلالت کا کچھ اندازہ، اُن کے معاصر اور قرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) کی اس شہادت سے کیا جاسکتا ہے، جو انھوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف ”فتح المہم شرح صحیح مسلم“ میں ایک جگہ، اِن الفاظ میں ادا کی ہے:

”الشَّيْخُ النَّفِيُّ النَّفِيُّ، الَّذِي لَمْ تَرَ
الْعَيْنُ مِثْلَهُ، وَلَمْ يَرَ هُوَ مِثْلَ نَفْسِهِ:
وَلَوْ كَانَ فِي سَالِفِ الزَّمَانِ، لَكَانَ لَهُ
شَأْنٌ فِي طَبَقَةِ أَهْلِ الْعِلْمِ عَظِيمٌ“
وہ صاحبِ تقویٰ اور پاک سیرت شیخ جس کی
کوئی دوسری مثال لوگوں کی آنکھوں نے نہیں
دیکھی اور خود اُس نے بھی اپنی کوئی مثال نہیں
دیکھی اور اگر وہ پچھلے دور میں ہوئے ہوتے تو
طبقہ اہل علم میں اُن کی بڑی عظیم شان ہوتی۔
(ج: ۱، ص: ۳۳۵)

”اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا یہ ملفوظ مشہور و معروف ہے اور غالباً حضرت کے ملفوظات کے کسی مجموعے میں طبع بھی ہو چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ (اُن کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے)۔“

”جن اصحاب نظر نے ممدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا، اُن سب کا احساس یہی ہوگا کہ وہ علوم دین کے بحرِ زخار اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے اُن خاصانِ خدا میں سے تھے؛ جن کی مِنْ جَانِبِ اللہ منکرات و معصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے۔ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین و جمیل اور معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ کہ اُنھیں: ”اِنَّ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ کَرِيْمٌ“ (۱)

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں صرف دو سال گزارے (۱۳۳۳-۱۳۳۵ھ) یعنی موقوف علیہ میں داخلہ لیا اور دورہ حدیث شریف سے فراغت کے بعد پھر عمل کی دنیا میں آ گئے؛ لیکن اُنھوں نے اپنی خوش قسمتی سے اُن دونوں سالوں کو خوب اچھی طرح وصول کیا، لمحے لمحے سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی گراں مائیگی کے مکمل احساس کے ساتھ دارالعلوم کی علم ریز، روحانیت خیز، اخلاص بیز اور زہد و اتقا سے لب ریز فضاے مسعود

(۱) ”تحدیثِ نعت“ از مولانا محمد منظور نعمانی، ص: ۳۳-۳۴، پہلا ایڈیشن: اپریل ۱۹۹۷ء ناشر: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد لکھنؤ۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے علمی مقام و مرتبے کا فاضلانہ و عالمانہ، ادیبانہ و مفکرانہ اور چشم کشا اور تفصیلی تجزیہ، اُن کے ایک مایہ ناز شاگرد: صاحبِ علم قلم اور جامع عقل و عشق، فاضلِ اجل مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء) کی کتاب ”احاطۃ دارالعلوم میں بیٹے ہوئے دن“ میں پڑھیے، جو ابھی حال ہی میں دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ دیکھیے ص ۷۸ سے ص ۱۳۸ تک)

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے اپنے علم و فکر کی جھولی بھرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا؛ چنانچہ اُن کے استاذِ عظیمِ امام العصر علامہ کشمیریؒ نے بھی شاگرد کی محنت کی داد دی اور شاگرد بھی سالانہ امتحان میں امتیازی نمبرات سے کام یاب رہا۔
مولانا نعمانیؒ فرماتے ہیں:

”دارالعلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور دو سال ۱۳۴۳ھ تا ۱۳۴۵ھ رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارتِ تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذِ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۷۱ سال بعد دورہ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔

تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اُس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لیے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا؛ اس لیے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لیے وقت بڑھوایا تھا) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا۔“ (۱)

جامعیت کا راز

دارالعلوم دیوبند کی تاب ناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے

(۱) ”تحدیثِ نعمت“ ص: ۳۰۔

تھے؛ بل کہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص و احتساب، ورع و تقویٰ، زہد و صلاح، جذبہٴ اصلاح، دین کی تڑپ، دعوت و پیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالتِ زار کا غم، اسلام کے حوضِ صافی کو گدلا کرنے کی کسی کوشش کی سوچنے والے کے خلاف ننگی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر دینے کی عزیمت کا بادۂ تیز و تند پی کر مست بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ، محض حاملِ علم، یا خشک عالم، یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم معذودہ کی تلاش میں صرف دردِ در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تنِ خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تنگ و دوپر، اپنی علمی و فکری ”مینا کاری“ یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کر دینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا؛ کیوں کہ اُس نے یہ ”سبق“ ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیغِ جگر دار و تلوار بے نیام لے کر نکلتا اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبدالعزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرف سے انھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (صاحب تفسیر مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھا دیجیے۔

روح پدرم شاد، کہ بہ استاد مرا گفت:

کہ فرزند مرا، عشق بیا موز و دگر ہیچ!

(خدائے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ انھوں نے میرے استاذ

سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھا دیجیے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر و سوانح کا طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامع صفات و کمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی و مفکر آسانی سے اور چند روز میں پیدا

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

نہیں ہو جاتا، اُس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا کردار ادا کرتے ہیں: وقت کا عنصر، محنت، توفیق الہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعاہائے نیم شبی، والدین کی آہ سحرگاہی، سیاسی و اجتماعی صورتِ حال، سازگار اور معتدل یا سخت فضا اور امید افزا یا جگر خراش حالات، علما و صلحا کی صحبت، علوم جو اُس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اُس کی زندگی کی گاڑی متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اُس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم و الم یا خواب و آرزو، جو اُس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رُفقا جو راہِ عمل اور سفرِ حیات میں اُس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اُس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنہوں نے اُس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگا دیے اور وہ صلاحیتیں مطلوبہ معیار پر سرگرم عمل ہو گئیں، اُس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اُس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں: یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدرتِ مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی ان سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا، اُن کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی ”صوفی“ اُن کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ ”صوفی احمد حسین“ کے نام سے معروف تھے۔ (۱)

اُن کے والد ”گیارہویں“ اور ”بارہویں“ شریف کے قائل ہونے کے باوجود، اپنے بیٹے کی دینی تعلیم کے لیے بے حد تڑپ رکھتے تھے اور اُس کو اچھے سے اچھا عالمِ دین بنانے کے لیے، ہر طرح کی دوا اور دعا کرتے رہتے تھے۔ (۲) اپنے خصوصی اعتقادات کے باوجود خدا کی توفیق سے انہیں یقین تھا کہ دین کی اچھی تعلیم، دیوبندی مکتبِ فکر کے

(۱) بڑھے ”تحدیثِ نعت“ ص: ۲۵-۲۹۔

(۲) دیکھیے ”تحدیثِ نعت“ ص: ۲۲-۲۳۔

پس مرگ زندہ

مدرسوں ہی میں ہوتی ہے؛ چنانچہ اپنے بیٹے کو شروع سے ہی انھیں مدرسوں میں تعلیم دلائی اور پھر دیوبند بھیج دیا۔ فرزند ارجمند کے یہاں داخلہ لینے کی برکت سے اُن کے اعتقادات بھی شدہ شدہ درست ہو گئے۔

دین کی ہمہ جہت خدمت کی راہ پر

ذکر کیا جا چکا ہے کہ دیوبند میں مولانا نعمانیؒ کی طالب علمی کا زمانہ، دیوبند کے سنہرے دور کا تسلسل تھا؛ اس لیے اُس کی فضاؤں اور ہواؤں میں مجازی جلال و جمال اور دینی باغ و بہار کی کارفرمائی تھی۔ اُس ماحول کا پروردہ امت کے ہر فرد کی دوا اور ملت کے ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا تھا۔

وہ دیوبند سے نکلے تو صرف دو تین سال تک اپنے وطن ”سنجھل“ اور اپنے ضلع کے قصبہ امروہہ میں تدریس کا کام کر سکے۔ اُس کے بعد دین کے درد سے معمور اُن کے قلب و فطر نے انھیں مدرسے کی محدود دنیا سے، خدمتِ دین کے وسیع تر میدانوں میں ڈال دیا۔ (۱)

انھوں نے اسلام و جاہلیت کے مابین جاری معرکوں کی نئی سمتوں، نئی حسیت اور رویوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ مغربی تہذیب کی شیشہ سازی، مکر بازی اور سحر کاری دیکھی اور دوسری طرف نسل نو کی اسلامی تہذیب کے حوالے سے ”بیزاری“ کی حد تک پہنچی ہوئی ”بے اعتمادی“ دیکھی۔ انگریزی سامراج کے ہاتھوں ہندو مسلم دشمنی کے کاشت کردہ بیج کو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتے ہوئے دیکھا۔ سیاسی تحریکات کی ہمہ ہی، ملک کی آزادی اور پھر اُس کی تقسیم، اور تقسیم کے دوران، اور اُس کے بعد کے دل فگار فسادات دیکھے۔ خونِ مسلم کی ارزانی دیکھی، خواتینِ مسلم کی بے آبروئی دیکھی، میراثِ خلیل کی پامالی دیکھی، نبوتِ محمدی پر قادیانیت کی ناکام یلغار دیکھی اور عقیدہ صحیحہ پر بدعتوں اور خرافات کی شیخو بازی دیکھی۔ عقلِ نو کا مطالعہ کیا تو پایا کہ اُس کو اسلامی

(۱) دیکھئے ”تحدیثِ نبوت“ ص: ۳۷-۳۹۔

داعی مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

تعلیمات کے سلسلے میں آسودگی اور یکسوئی نہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا کہ اس ملک میں سیکولرزم کے پردے میں اسلام پر، اُس کی تعلیمات و عقائد پر، تہذیب اسلام پر اور اسلامی شناخت پر؛ منظم، بھرپور اور پیہم حملے کے منصوبہ بند تیاری ہے۔ سیکولرزم کی فریب کاری اور عملی دنیا میں اُس کی تباہ کاری کا مشاہدہ کیا، وہ سیکولرزم جس کو اکثریت کا بڑا طبقہ یکسر مسترد کر چکا ہے اور ایک چھوٹا سا طبقہ اُس کو ”ہندوازم“ کے معنی میں لینے، اور ہندو مذہب کی ساری دیومالائی تہذیب و ثقافت و تعلیمات کو ملک کے تمام باشندوں پر تھوپ دینے کو ہی اصل سیکولرزم کہتا ہے؛ جس کو کبھی وہ ”قومی دھارا“ کا نام بھی دیتا رہتا ہے۔ جو انان مسلم کو دیکھا کہ وہ (خلافت عثمانیہ کے زوال اور اکثر اسلامی ملکوں پر سامراجی قبضے اور اب وہاں سامراجی فکر و فلسفے و طریقہ حکومت و تہذیب مغرب کے عمل دخل اور وہاں کے تمام امور کی رگ جاں کے پنجہ مغرب میں آ جانے کے بعد) احساس کمتری، ذہنی جھٹکے اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ جب کہ انگریزی و عصری تعلیم یافتہ مسلم طبقہ، مغربی طرز زندگی کا دلدادہ، اور حرف بہ حرف اُس کی تقلید کا داعی اور عامل ہے اور اسی میں ساری دینی و دنیوی ترقیوں کا راز پوشیدہ دیکھتا ہے؛ اپنی اس رائے سے مخالفت رکھنے والوں کو ”قدامت پسند“، ”تنگ نظر“ اور ”تاریک خیال“ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتا ہے۔

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اُس نے

بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

اُنھوں نے یہ سب کچھ صلاحیت و ذہانت کی نگاہ سے دیکھا، قلب حساس سے مشاہدہ کیا، غیرتِ مومن سے مطالعہ کیا، ایمان و یقین سے تجزیہ کیا اور اپنی خدا داد صلاحیتوں اور حاصل کردہ لیاقتوں سے دین و ملت کی بہتری کے لیے زندگی بھر، سرگرم عمل رہنے کے لیے کمر کس لیا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کی توفیق اور اُس کے نتیجے میں حسن انتخاب و عمل کی بہترین مثال ہے۔ وہ صحیح معنی میں وقت کے مطلوبہ ”اسلامی سپاہی“ تھے۔

پس مرگ زندہ

انھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے فتنوں کا خوب خوب مقابلہ کیا۔ خارجی فتنوں میں آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک کا فتنہ پیش پیش تھا اور داخلی فتنوں میں قادیانیت تو تھی ہی جس کے مبلغ و مناظر فرنگی شیشہ گروں سے ”نفس“ مانگ کر لاتے اور وارثان میراثِ خلیل و محمد ﷺ سے اُن کا سرمایہ دین و ایمان چھین لینے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دوسری طرف بریلوی شرک و بدعت نے اُس وقت کے خاص حالات میں (۱) سر اٹھا رکھا تھا۔ مولانا نے ان سارے فتنوں کا زبان و قلم دونوں سے مقابلہ کیا۔ بریلویوں سے بہ طورِ خاص مُعْتَدِے مناظرے کیے۔ ہر مناظرے میں انھیں یا تو منہ کی کھانی پڑی یا مولانا کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں انھیں عافیت نظر آئی۔ (۲) اور قادیانیوں اور آریائیوں کی بھی اچھی طرح خبر لی۔ ان باطل فرقوں اور قبوریوں کا مولانا نے جس طرح مقابلہ کیا، حق یہ ہے کہ اس کی بنا پر علمائے دیوبند میں اس سلسلے میں وہ صفِ اول کے علما میں شمار ہوتے ہیں۔ بدعت کے سلسلے میں مولانا کا کام شاید حضرت مولانا گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء) کے بعد علمائے دیوبند میں بہت زیادہ روشن ہے۔

الفرقان: دینی خدمت کا مضبوط اور بے مثال پلیٹ فارم

محرم ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں خاص بریلی سے ”الفرقان“ جاری کیا؛ تاکہ اہل بدعت کی خود ان کے مرکز ”بریلی“ ہی میں سرکوبی کی جاسکے۔ شروع شروع میں الفرقان پر اپنے اولین مقاصد کے تحت مناظرے اور بحث و مباحثے کا رنگ غالب رہا؛ لیکن بعد میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ/

(۱) ان خاص حالات کی تفصیل مولانا نعمانیؒ کی کتاب ”تحدیثِ نعت“ میں ص: ۳۷ پر پڑھے۔

(۲) ان مناظروں کی کچھ تفصیل ”تحدیثِ نعت“ ص: ۴۰-۶۰ میں پڑھے۔ نیز مولانا نعمانیؒ کی کتاب ”دیوبند بریلی کے اختلاف و نزاع پر فیصلہ کن مناظرہ“ پڑھے۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۱۹۴۳ء) اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر راے پوری (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) سے عبید بن جریج کے بعد اُس کا رنگ، دعوتی، فکری، علمی اور پیغامی بن گیا۔

”الفرقان“ مولانا کا ایک مستقل کارنامہ ہے۔ اُس کے ذریعے اُنھوں نے جس طرح ٹھوس بنیادوں پر دین و دعوت کی خدمت کی، بندگانِ خدا کی راہنمائی کی، قلب و ذہن کو سلجھے ہوئے اسلوب میں روحانی خوراک پہنچائی، متردد ذہنوں کو تشفی بخشی، ”عقل مندوں“ کو مطمئن کیا، بھٹکے ہوئے آہو کے پھر سوائے حرمِ آنے کا راستہ ہم وار کیا اور ہندی مسلمانوں کے پیش آمدہ مسائل و مشکلات پر جس طرح صحیح اور بروقت رائے دی؛ یہ سبھی کچھ ایک مستقل تحریر؛ بل کہ تحلیل و تجزیے کا عنوان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاید وہ ابید ہی کسی دینی رسالے نے، انٹی لمبی عمر پائی ہوگی اور اہل حق کی نگاہ میں اُس کو وہ اعتبار و وقار حاصل ہوا ہوگا جو ”الفرقان“ کو حاصل رہا ہے۔

”الفرقان“ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو مولانا شفیق الرحمن سنبھلی جیسا شاندار صحافی اور مایہ ناز اسلامی اہل قلم دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سنبھلی کی تشکیل و تعمیر میں جہاں اُن کے والد بزرگوار اور صاحب ”الفرقان“ مولانا نعمانی کی کمیساگری کو دخل ہے، وہیں ”الفرقان“ کے بابرکت پلیٹ فارم کو بھی اور مولانا نعمانی کے چھوٹے صاحب زادے مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی ندوی تو اپنے قلم کے حوالے سے تمام تر ”الفرقان“ ہی کی دین ہیں۔

مولانا کی خود متعّد تصانیف ”الفرقان“ ہی کے صفحات پر تیار ہوئیں، نیز اس پلیٹ فارم سے دیگر کئی اہل قلم کی گراں قدر تصنیفات تیار ہوئیں، جن میں مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ”الفرقان“ کے متعدد خصوصی اور تحقیقی شمارے، شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۷۶۷ھ/۱۷۶۲ء) اور مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) پھر مولانا محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) وغیرہم پر

پس مرگ زندہ

شائع ہوئے، جنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دینی و علمی شخصیات پر اس طرح کے خصوصی نمبرات نکالنے کی طرح غالباً اردو رسالوں میں سب سے پہلے ”الفرقان“ ہی نے ڈالی۔ اب تو علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات پر رسالوں کے آئے دن نمبرات نکلتے لگے ہیں۔

اُس زمانے کا ایک زبردست فتنہ ”خاکسار“ تحریک کا فتنہ بھی تھا، جس کے بانی عنایت اللہ خاں (ولادت لاہور، ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء وفات لاہور، ۲ اگست ۱۹۶۳ء) نام کے ایک صاحب تھے جو ”علامہ مشرقی“ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے دین و عقیدے کے لیے ایک بڑی آزمائش بن گئی تھی۔ مولانا نے اس کا بھی بھرپور مقابلہ کیا۔ اپنے قلم سے مسلسل اس کا ابطال کرتے رہے اور ”الفرقان“ کی چھٹی جلد ۱۳۵۸ھ کے تین شماروں پر مشتمل ایک خاص نمبر اسی تحریک کے بارے میں نکالا، جو سارا کا سارا مولانا ہی کی تحریر پر مشتمل تھا۔ (۱)

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان کے مخصوص حالات، برطانوی سامراجی حکومت کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ، اور ہندوستانوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات دیے جانے سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی اور آئندہ ہندوستان کا نقشہ اور اُس نقشے میں مسلمانوں کی جو جگہ متعین ہونے لگی تھی، اُس کے پیش نظر اہل نظر و اہل قلم پڑھا لکھا مسلمانوں کا طبقہ خاصا فکر مند ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کی اُس نقشے میں کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس طرح کے سوالات پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۲۰ شوال ۱۳۹۹ھ/۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء) سرفہرست تھے۔ مولانا نعمانی حساس دل اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ مودودی صاحبؒ کی طاقت و تحریروں میں بہ ظاہر مسلمانوں کے درد کا درماں دیکھ کر، وہ اُن سے متاثر ہو گئے۔ قصہ طویل ہے وہ جماعت اسلامی کی اولین شکل

(۱) پڑھیے ”تحدیثِ نعت“ ص: ۷۱-۷۷۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(جو تحریک دارالاسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی) اور پھر دوسری شکل (جو شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق اگست ۱۹۴۱ء میں ”جماعت اسلامی“ ہی کے نام سے بنی) کی تعمیر میں نہ صرف شریک رہے؛ بل کہ اُس کے داعی، قائد؛ بل کہ مولانا مودودی سے زیادہ زور وکیل رہے؛ لیکن خدا کی توفیق، کتاب و سنت کی شناوری، دیوبند کی تعلیم و تربیت، علمائے صالحین کی صحبت وغیرہ کی وجہ سے مزاج کی سلامت روی نے شروع دن سے ہی انھیں مولانا مودودی کے پُر شکوہ ظاہر اور پوشیدہ باطن میں اختلاف اور اُن کے قول و عمل کی دوری نے انھیں اُن سے مطمئن ہونے نہیں دیا اور بالآخر وہ شعبان ۱۳۶۱ھ مطابق جولائی - اگست ۱۹۴۲ء میں اُن سے دل برداشتہ ہو کر اپنے وطن ”سنجھل“ آ گئے۔ اُس کے ایک دو ماہ بعد مولانا مودودیؒ نے دہلی میں اپنی جماعت کی شوری کا کوئی اجلاس رکھا، جس میں اُن کے اصرار پر مولانا نعمانی نے شرکت کی؛ لیکن وہ عملی اور قلبی طور پر علاحدہ ہو چکے تھے۔ ۵-۶ ماہ کے بعد ”الفرقان“ ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں مولانا نے جماعت سے اپنی باقاعدہ علاحدگی کا اعلان بھی کر دیا۔ (۱)

مولانا نعمانی تحدیثِ نعمت میں لکھتے ہیں:

”یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اس کے ذریعے اس بندے پر خیر کثیر کا دروازہ کھلا اور پھر جب اس بندے کے قدم اولاً اُس راہ کی طرف اٹھ گئے جواب اُس کے نزدیک فکر و نظر کی ایک غلطی تھی؛ یعنی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر قیادت

(۱) اس سارے قصبے کی باقاعدہ تفصیل اور اس کا پس منظر جاننے کے لیے، مولانا نعمانی کی مستقل تصنیف ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ پڑھنا چاہیے، جو ہندی مسلمانوں کے ۵۰-۵۵ سالہ عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اور شروع سے ہی مولانا نعمانی کی دینی و فکری، اسلامی حیثیت اور بلند دعوں و پر زور دہشور قلم کے باوجود کھوکھلے داعیوں اور طریقہ سلف سے ہٹے ہوئے قائدین و مفکرین کی مزاج آشنائی کی دور میں صلاحیت کی ایک ٹھوس دلیل بھی۔

پس مرگ زندہ

”جماعتِ اسلامی“ کی تاسیس؛ تب بھی توفیقِ الہی میری دست گیری کے لیے مہربان ہوئی اور بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میرے قدم واپس ہوں اور اگر چہ لے پاؤں واپسی کا یہ مرحلہ نفسیاتی طور پر بڑا ہی سخت تھا؛ اس لیے کہ اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا؛ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی؛ مگر بس ایک مختصر سی کشمکش کے بعد اللہ نے میرے لیے یہ واپسی کا فیصلہ بھی آسان کیا اور علاحدگی اختیار کرنے کے بعد اس کا بہ قدر ضرورت اعلان بھی ”الفرقان“ کے صفحات میں کر دیا اور بلاشبہ یہ میرے مالک کا میرے اوپر بڑا احسان تھا کہ واپسی کے اس فیصلے میں دنیا کی شرم دامن گیر نہ ہو سکی۔“ (۱)

مولانا شاہ عبدالقادر راے پوریؒ اور مولانا شاہ محمد الیاس کاندھلویؒ سے وابستگی کے بعد، اُن کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کے وہ اور اُن کے رفیقِ دیرینہ و شریکِ دعوت و فکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۲) شارح و ترجمان و وکیل بن گئے۔ ان دونوں کی کوششوں سے بڑھے لکھے طبقے میں بہ طور خاص دعوت کے کام کا وقار بڑھا۔ مولانا الیاسؒ کی دعوت میں قلم اور پروپیگنڈے کو کسی قسم کا عمل دخل نہیں تھا، وہ کام پر زور دیتے تھے، بات سے بالکل بیجانب تھا؛ لیکن یہ دونوں حضرات چوں کہ اہل قلم بھی تھے، اس لیے دعوت کے کام کو قلم انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے قلم سے ہزاروں بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچا۔ مولانا نعمانیؒ ایک طاقت ور اور معتبر رسالے کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے رسالے کو بڑی حد تک اس کے لیے مسخر کر دیا۔
مولانا فرماتے ہیں:

(۱) تحدیثِ نعمت، ص: ۷۹۔

(۲) وفات: بہ روز جمعہ ۲۳/رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

”حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی نقل و حرکت سے تعلق رکھتا تھا۔ قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یا نہ ہونے کے برابر تھا؛ مگر میری ذات کے ساتھ ”الفرقان“ ایسا جڑا ہوا تھا کہ کسی علمی، دینی اور اصلاحی خدمت کی میں توفیق پاؤں اور ”الفرقان“ اس سے الگ الگ رہے، اس کا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب ”الفرقان“ کی بھی اصل دعوت یہی ہوگئی۔“ (۱)

مولانا الیاسؒ کو اس عاجز راقم نے دیکھا نہیں، صرف کتابوں میں پڑھا اور مولانا نعمانیؒ، مولانا علی میاں ندویؒ اور ان جیسے بزرگوں سے سنا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سنا اُس سے ان کے سلسلے میں یہ اعتقاد جازم ہو گیا کہ وہ دین کے حوالے سے کچھ صحابہ جیسی ہی تڑپ رکھتے تھے، مسلمانوں کی حالت زار پر دل کباب ہو گیا تھا، دین کے لیے تڑپنا، اُسی کو اپنا غم اول و آخر بنالینا، اُس کی دعوت کو عام مسلمانوں تک پہنچا دینے کے لیے اُسی طرح بے چین رہنا، جیسے انگاروں پر لوٹنے والا رہا کرتا ہے اور مسلمانوں کو مسلمان بنادینے کی فکر میں، روز و شب گھلنا، پگھلنا اور اپنے خدا سے اس کام کو آسان بنادینے کے لیے، رور و کر تنہائی میں آروز کرنا اور دعا ہائے سحر گاہی میں اسی موضوع پر، اُس سے مناجات کرنا اور خدا کے ہر بندے سے منت و سماجت کرنا کہ وہ اسی غم کو اوڑھ لے: ایسی خصوصیات ہیں جو دین کے سابلین اولین داعیوں کا وجہ امتیاز تھیں۔

چنانچہ مولانا الیاسؒ سے جو بھی لگا، جڑا، متاثر ہوا اور ان کی صحبت میں بیٹھا ان کی دعوت و تبلیغ میں شریک ہوا، وہ مولاناؒ کے درد سے حصہ پانے سے محروم نہیں رہا۔ مولانا نعمانیؒ علما کی صف میں ایسے خوش نصیب لوگوں میں سرفہرست افراد میں تھے۔

چنانچہ ان کی تحریر و تقریر کا رنگ و آہنگ ہی نہیں ان کا تانا و بانا اور ان کا باطن بھی تبدیل ہو گیا، برکت کا نور، عشق کی لپٹ، پیغام محمدیؐ کی محبت کی تپش، ایمان کی

(۱) ”تحدیثِ نعت“ ص: ۸۰-۸۱۔

پس مرگ زندہ

حرارت، یقین کی صلابت اور دل حساس کا با مقصد درد و مقدس غم؛ تحریر و تقریر کے لفظ لفظ؛ بل کہ حرف حرف سے پھوٹنے لگا۔ مولانا نعمانی اور اُن جیسے ”الیاسی بزرگوں“ کی اُس زمانے اور اُس کے بعد کی تحریر میں ایک کرنٹ ہے، ایک عجیب سی محبوبیت ہے، ایک خاص قسم کا جادو ہے، جلے ہوئے دل کی خوش بو ہے، محبوبِ اعظم محمد ﷺ کی محبت کی جاں فزا مہک ہے۔

ملی سرگرمیوں میں قائدانہ رول

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ مولانا الیاس اور اُن کی دعوت سے مربوط ہو کر دین و ملت کی تمام سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے؛ بل کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کے حل، اُن کی باعزت زندگی، اور دینی شناخت کی برقراری کے لیے قائدانہ رول ادا کیا اور قلم و زبان اور تنگ و دو کے ذریعے متعدد تحریکوں، سرگرمیوں، اور کوششوں میں عملی اور فعال حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل میں پیش پیش رہے، جس کا تخیل اس سے پہلے قاضی عدیل عباسی (متوفی ۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء = ۱۳ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ) نے پیش کیا تھا اور وہ اپنے ضلع بستی کے حدود میں اس تخیل کو اچھے ڈھنگ سے برپا بھی کر چکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ رسالہ ”ندائے ملت“ کی تاسیس میں اور ۹/ اگست ۱۹۶۳ء کو مجلس مشاورت کی تعمیر میں حصہ لیا، جس کی دعوت ایک بڑے ملی و سیاسی قائد ڈاکٹر سید محمود (متوفی ۱۹۷۱ء) نے دی تھی۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں قائدانہ رول ادا کیا، جس کی حثیت اولین اُن کی اور دیگر علمائے دیوبند (جن میں مولانا سید منت اللہ رحمانی سابق امیر شریعت بہار و اڑیسہ متوفی ۱۴۱۱ھ = ۱۹۹۱ء) سر فہرست تھے) کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ اجلاس بابت مارچ ۱۹۷۲ء میں رکھی جا چکی تھی اور تمام علمائے ہند کے اتفاق رائے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب (متوفی ۱۴۰۳ھ = ۱۹۸۳ء) کو بورڈ کا صدر اور مولانا سید منت اللہ رحمانی کو اس

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

کاسکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس بورڈ نے اُس وقت سے اب تک مسلمانوں کی دینی شناخت کی بقا کی لڑائی جس کام یابی سے لڑی ہے، اس کی توفیق مسلمانوں کی کسی تحریک کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۱۳۶۳ھ = ۱۹۴۳ء میں اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنائے گئے اور اُس وقت سے تا دمِ حیات اُس کے سرگرم ممبر رہے۔ ہمیشہ اُن کی عالمانہ، فاضلانہ اور حکیمانہ رائے کو وزن کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اور گزشتہ اور حالیہ انتظامیہ دونوں کے دور میں اُنھوں نے ذمہ داروں کو اپنی گراں قدر رائے، جہاں بیٹی، دور رس اور گہرے تجربات سے نہ صرف فائدہ پہنچایا؛ بل کہ مربیانہ راہ نمائی کی۔

اُن کی علمی و دینی و دعوتی شخصیت کی بنا پر ۱۹۶۵ء میں اُنھیں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا رکن تاسیسی منتخب کیا گیا اور تا دمِ زندگی وہ اِس منصب پر فائز رہے۔ اسی طرح تاحیات وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے بھی رکن رہے۔ ہر جگہ اُن کی رائے کا وزن محسوس کیا گیا۔

قلمی خدمات

دعوتی و دینی و ملی میدانوں میں سرگرم کاررہتے ہوئے، مولاناؒ نے مختلف اسلامی موضوعات پر گراں قدر تصنیفات اور تحریروں سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا۔ اسلامی موضوعات پر ہندوستان؛ بل کہ برصغیر میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں؛ لیکن دو باتوں کی بنا پر مولاناؒ اپنے معاصرین اہل قلم میں لاثانی نظر آتے ہیں:

۱۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے سحر میں گرفتار، مادی طریق فکر و سیاست و فلسفہ پر ایمان رکھنے والی اسلامی تعلیمات سے بے زار یا بے گانہ اور تشکیک میں مبتلا نسل نو کو؛ مدلل، مکمل اور اُس کی عقل و خرد و قلب و نگاہ کو متاثر کرنے والے زود ہضم اسلوب میں؛ اسلامی تعلیمات اور دینی حقائق کو پیش کرنے کے

حوالے سے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا کام منفرد اور جداگانہ ہے۔ وہ اس سلسلے میں جتنے کام یاب اور خدائے کریم کی طرف سے جس قدر توفیق یافتہ ہیں، کم ہی اہل علم و قلم کو یہ سعادت ملی ہوگی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱) فرماتے ہیں:

”جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے، یہ کام (یعنی دینی تعلیمات و حقائق کو عصر حاضر کے ذہن و تقاضے کو سامنے رکھ کر، پیش کرنے کا کام) پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہو گیا ہے، کہ ذرا سی غفلت، کسی رجحان کے غلبے، یا ذہنی ردِ عمل کے نتیجے میں؛ دین کی تفہیم، زمانے کے اثرات سے متاثر، روح اور مقاصدِ دین سے دور اور رائج الوقت اور مقبول زمانہ فلسفوں، تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے، جس نے ایک طرف دین کا علم، اُس کے ماہرِ آساندہ اور علمائے راسخین سے حاصل کیا ہو؛ کتاب و سنت سے بہ راہِ راست استفادے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو؛ تعلیم کے ساتھ علمائے راسخین کی صحبت بھی پائی ہو؛ پھر اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کے مختلف حلقوں میں رہا ہو؛ اُن کے حالات و خیالات سے واقف ہو؛ اُس نے زندگی کسی خیالی دنیا، علمی حصار یا ”دینی جزیرے“ میں نہ گزاری ہو؛ اہل حرفہ سے لے کر دانش وروں اور علما و واعظین سے لے کر سیاسی میدان میں کام کرنے والوں تک سے اُس کا اختلاط و نشست و برخاست رہی ہو؛ پھر وہ (وہی یا اکتسابی طریقے پر) دقیق مسائل کو سہل اور عام طریقے پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے پر قادر ہو؛ اس سب کے علاوہ اُس کے اندر اخلاص، سوزِ دروں اور دعوت کا طاق و جذبہ بھی پایا جاتا ہو؛ کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

(۱) اور اب کتاب کی تیاری و طباعت کے وقت رحمۃ اللہ علیہ۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

... مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ”الفرقان“ نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اٹھایا۔“ (۱)

۲- میرے علم میں نہیں کہ کسی اہل علم و قلم نے، عصر حاضر میں رکاکت یا عامیانہ پن اور سطحیت سے بچتے ہوئے اتنی عام فہم زبان میں، اسلام کی دعوت و تعلیمات کو عصر حاضر کے مطابق پیش کیا ہو؛ جس کو پڑھ کر علماء و تعلیم یافتہ بھی بے مزہ نہ ہوں، اُکتائیں نہیں اور عوام پڑھیں تو ایک ایک لفظ اُن کے دل میں اُترتا چلا جائے؛ جس میں ادبی چاشنی تو مکمل طور پر پائی جاتی ہو؛ لیکن الفاظ کی بے جا شوکت و سرکشی اور ترکیب کی ”کوہِ پیائی“ اور ”ہمالیائی اونچائی“ سے بچا گیا ہو اور پڑھنے والے کو ایسا لگے کہ لکھنے والے نے ہر لفظ کو محسوس کر کے لکھا ہے، ہر جملے کو پیمائش اور تول کے بعد ہی، عبارت میں برقرار رہنے دیا ہو اور جیسے عوام و خواص کی میننگ بلا کر، اُس میں پڑھ کر، اُنھیں سنا کر اور اُن کی سمجھ میں آ جانے کی اُن کی طرف سے تصدیقِ کامل کے بعد ہی، تحریر کو چھپنے اور شائع کرنے کی اجازت دی ہو۔ مولانا کے پاس دینی حقائق و تعلیمات کی عصری ترجمانی کے لیے ”سہلِ ممتنع“ کا جو اسلوب اُن کی تمام تحریروں میں کارفرما ہے اور اُن کی نگارشات کی شناخت بن گیا ہے؛ میرے محدود مطالعے میں علماء کے ہاں، خواجہ الطاف حسین حالی (متوفی ۱۳۳۳ھ = ۱۹۱۵ء) کے بعد نظر نہیں آتا؛ گو کہ حالی کا میدان ادبی و سوانحی رہا تھا اسلامی موضوعات پر (شعری قالب میں ”مسدسِ حالی“ کے علاوہ) اُنھوں نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اس حوالے سے مولانا کا بے حد معتقد ہوں، مجھے اس سلسلے میں ذاتی اور ذوقی تجربہ رہا ہے۔ میں یہ بات اُن گنت مجلسوں میں کہتا رہا ہوں، نئے فضلا اور طلبہ مدارس کو مولانا کی تحریروں کو پڑھنے اور اُن کی ”سہلِ ممتنع“ اردو کو دینی

(۲) مقدمہ ”دین و شریعت“ ص: ۱۶، تیرہواں ایڈیشن ۱۹۹۴ء، الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ۔

پس مرگ زندہ

دعوتِ اسلامی حقائق کی شرح و ترجمانی کے لیے اپنانے کی دعوت دیتا رہا ہوں۔ (۱)

مولانا کی تحریری خوبی کی جان کاری کی تقریب

یادش بخیر کہ سب سے پہلے میرے لیے مولانا کی اس خوبی کی جان کاری کی راہ بے ساختہ طور پر ہند میں عربی زبان کو بہت سے عربوں سے بہتر، زندہ تر اور پابندہ تر اسلوب میں لکھنے والے: مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی شب جمعرات ۱۸ رجب ۱۳۹۹ھ = ۱۴ جون ۱۹۷۹ء، بن مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی متوفی ۷ مئی ۱۹۶۱ء = ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ برادرِ بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۲) بانی و سابق مدیر ”البعث الاسلامی“ (دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان عربی ماہ نامہ) نے ہم وار کیا۔

صفر ۱۳۹۵ھ = مارچ ۱۹۷۵ء میں ایک روز عصر کے بعد، مولانا نعمانی کی کتاب ”دین و شریعت“ سے علاحدہ کردہ ایک مضمون، میری طرف بڑھاتے ہوئے مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے کہا کہ بھی! البعث کا تازہ شمارہ تیار ہے، دو ایک مضمون کی کمی رہ گئی ہے، تم اس مضمون کی آج رات میں تعریب کر دو، تو شمارہ وقت پر آ سکتا ہے۔ میں سخت نزلے اور اُس کے اثر سے بخار میں مبتلا تھا۔ نزلے کی حالت میں

(۱) مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک کتابچہ ہے ”انسانیت زندہ ہے“ یہ چار حسب ذیل مضامین کا مجموعہ ہے (میں بھول نہیں سکتا: ۱۹۳۶ء کے ایک فرقہ وارانہ فساد کی یاد: ۱۹۴۷ء - ۱۹۴۸ء کے خونی دور کا ایک سفر؛ دشمن دوست اور پتھر موم کیسے ہو جاتا ہے؟ ایک قرآنی آیت کا عملی تجربہ) راقم الحروف نے اسے بلا مبالغہ بیسیوں بار پڑھا ہوگا، جب بھی وہ مشاغل نہ آتا جاتا ہے اور ذہن و فکر کو باؤ سے آزاد کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کتابچے کو ضرور پڑھ جاتا ہے۔ راقم اس کو مولانا کے حسن نگارش، ادبی چاشنی کے ساتھ سادگی، سادگی کے ساتھ پرکاری و دل کشی اور واقعہ نگاری؛ بل کہ موجودہ زبان میں ”افسانہ نگاری“ (ہر چند کہ اصطلاحی افسانے میں حقائق نگاری کم ہی ہوتی ہے) کا قابل تقلید اسلوب سمجھتا ہوں ہے یہ ناچیز نہ جانے کتنی مرتبہ طلبہ عربی زبان سے اس کے متعدد مضامین یا اُن کے بعض حصوں کا اردو سے عربی میں تعلیماتِ ترجمہ کروا رہا ہے کہ میری نگاہ میں مولانا کی زبان کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنا جتنا آسان ہے، شاید ہی کسی کی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ اس درجہ آسان ہو۔

(۲) اور اب یہ وقت اشاعتِ مضمون بہ شکل کتاب درمئی ۲۰۱۰ء = جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ، رحمۃ اللہ علیہ۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ
کوشش کے باوجود لکھنے پڑھنے کے لیے ذہن تیار نہیں ہوتا؛ اس لیے میں نے اُن سے
ایک دور و ز بعد کا وعدہ کیا۔

لیکن رات کو بستر پر لیٹے لیٹے خیال آیا کہ ذرا اس مضمون پر یوں ہی ایک نظر تو
ڈال لوں؛ کیوں کہ کسی مضمون کا اجمالی خاکہ ذہن میں مُرسم ہو جانے کے بعد اُس کی
تعریف میں قدرے آسانی ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل مولاناؒ کی کسی تحریر کا ترجمہ کرنے کا
سابقہ نہیں پڑا تھا؛ بل کہ اُن کی کسی کتاب کو بھی غور سے پڑھنا یاد نہیں۔ ”الفرقان“ میں
اُن کی نگارشات پر سرسری نظر بھی کبھی ڈال لینے کا اتفاق ہوا تھا، زبان کی خوبی و خرابی پر
غور کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

حال آں کہ ذہن خاصا بجھا ہوا تھا، نزلے کی وجہ سے ایک طرح کی کبیدگی بھی تھی؛
لیکن اللہ جانتا ہے کہ مولاناؒ کی یہ تحریر مجھے اتنی ہلکی معلوم ہوئی کہ لیٹے لیٹے ہی اُسے اُسی
وقت عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں جملے کو ذرا سا اشارہ کرتا اور وہ عربی کا قالب
اوڑھ لیتا، بڑی آسانی سے ایک اردو تعبیر، عربی کا لباس جمیل پہن لیتی۔ ایک گھنٹے کے
اندر ہی متوسط سائز کے چھ صفحات اردو سے عربی میں ہو گئے۔ مجھے زندگی میں بلا مبالغہ
ہزاروں صفحات اردو سے عربی میں کرنے پڑے ہیں؛ لیکن اس مضمون کی تعریف میں
طبیعت میں جو فرحت و انبساط اور خوش گوار لذت محسوس ہوئی، وہ اب تک کسی مضمون کی
تعریف کے حوالے سے یاد نہیں۔ (۱)

(۱) یہ مضمون ”دین و شریعت“ ص ۹۵-۱۰۰ سے ماخوذ تھا۔ اس کا عنوان تھا ”آں حضرت کا ایک دوسرا زندہ تاریخی
معجزہ“ آگے ایک دوسرا بی عنوان تھا ”ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ“۔ میرا عربی ترجمہ ”البعث
الاسلامی“ کے شمارہ (۱۰) جلد (۱۹) بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ مطابق جون ۱۹۷۵ء میں یہ عنوان ”معجزة حجة
خالدة من معجزات محمد رسول الله ﷺ“ شائع ہوا تھا۔ اُس کے شروع کے حصے کو حذف کر کے راقم
الحروف نے ”الداعی“ کے شمارہ (۳) جلد (۶) بابت ۸ صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۸۲ء یہ عنوان ”مکالمۃ
طریفة فی اثبات معجزات النبی ﷺ“ دوبارہ شائع کیا تھا۔
اس مضمون میں مولانا نعمانیؒ نے اپنے خوب صورت اور دلچسپ اسلوب میں وہ مکالمے نقل کیے ہیں، »»

مولانا کی زبان میں یہ خوبی کیوں ہے؟

صبح ہوتے ہی مولاناؒ کے مضمون کی سادگی اور صحیح اردو تعبیرات و بندشوں کے حوالے سے، میں اپنے اس رات والے تاثر کو فجر کی نماز کے بعد ہی اپنے کئی ایک احباب اور بزرگوں سے ذکر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن میں سرفہرست مولاناؒ کے قریبی عزیز مولانا محمد عارف سنبھلی (۱) اور اُن کے ہم وطن نامور عالم مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذانِ دارالعلوم ندوۃ العلماء تھے۔ اُسی وقت ہم لوگوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ آج عصر کے بعد (جو مولاناؒ کے عمومی ملاقات کا وقت ہے) اُن کے نئے مکان واقع ”نظیر آباد“ لکھنؤ میں اُن سے ملنے جائیں گے اور اپنے اس تاثر کا اظہار کر کے اُن سے زبان کی اس سادگی، اُس میں روزمرہ کے اس خوب صورت استعمال اور عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر دلچسپ ہونے کی وجہ معلوم کریں گے۔

اتفاق سے آج عصر کے بعد ملنے والوں کی تعداد بھی کم تھی، دیگر حضرات کو جلدی فارغ اور رخصت کر کے مولاناؒ نے ہم لوگوں کو اندر کے ملاقاتی کمرے میں بلوایا۔ خبر خیریت کے تبادلے کے بعد، میں نے اپنے رات والے تاثر کا اظہار کیا، تو اُنھوں نے جو بات کہی وہ جہاں اُن کی انتہائی تواضع کی غماز تھی، وہیں اُن بنیادی عناصر کی طرف مشیر بھی تھی، جن کی وجہ سے اُن کی زبان میں سادگی کے ساتھ بے پناہ حسن ہوا کرتا ہے اور اتنی عام فہم ہونے کے باوجود شیرینی و سلاست سے بھی بھرپور ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہم درد متکلم ایک ایک لفظ کو میٹھے شربت میں گھول کر پلاتا جا رہا ہے۔

» » جو اُن کے ایک حقیقی چچا نے نیاز محمد خاں فتحپوری ایڈیٹر ”نگار“ (متو ۱۹۶۶ء) جو منکرینِ معجزات میں سے ایک تھے، کے ساتھ کیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے اُنھیں کہنا چاہیے کہ معجزات کے سلسلے میں کم از کم اُس وقت تو قائل ہی کر لیا تھا۔

(۱) وفات: پیر روز جمعہ ۱۲/۵/۱۴۲۷ھ مطابق ۶/۶/۲۰۰۶ء۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ بھئی! بات یہ ہے کہ میرے پاس زیادہ الفاظ اور مثر ادب تعبیروں کی بہتات نہیں، میرے پاس محدود الفاظ ہیں میں انھیں کو بولتا اور انھیں میں لکھتا ہوں، محدود تعبیریں اور جملے ہیں انھیں کو بہ وقت ضرورت گھر میں اور پھر جمع میں استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس اگر بہت سارے الفاظ ہوتے، طرح طرح کی تعبیریں ہوتیں، جملوں کی بندشوں کی متعدد شکلیں ہوتیں، تو یقیناً میرے اسلوب میں اسی طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی جو بامکمال اور قادر الکلام مقررین و مصنفین کے ہاں نظر آتی ہے۔!۔

مولاناؒ نے بہت صحیح بات کہہ دی تھی کہ کثرت الفاظ و تعبیرات، عبارت کو بوجھل اور مضامین کو پیچیدہ کر دیتی ہے۔

لیکن مولانا کے ہاں ایک خوبی اور ہے۔ وہ یہ کہ جملوں کی بندش، زبان کے قاعدے سے اتنی صحیح ہوتی ہے کہ بعض دفعہ ”وردی پوش“ ادیب، روایتی اہل قلم اور زبان کے ”جاگیر دار“ اور ٹھیکے دار“ کے ہاں بھی نہیں ہوتی۔

یقیناً مولاناؒ نے یہ زبان خدا کی توفیق کے بعد، بندگان خدا کی حقیقی خدمت اور اُن کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے، بالاِ ارادہ حاصل کی اور اپنائی تھی۔

فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

مثل خورشیدِ سحر، فکر کی تابانی میں!
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

مولاناؒ کی بعض تصنیفات کی اہمیت

انھوں نے اسی مفید ترین اسلوب میں بہت سی تصانیف کیں۔ اُن کی بعض تصنیفات تو اردو کی چند مشہور ترین اور بہت بکنے والی کتابوں میں آتی ہیں۔ جیسے ”اسلام کیا ہے؟“ جس کا اس وقت ۱۴۱۸ھ = ۱۹۹۷ء میں چالیسواں قانونی ایڈیشن میرے سامنے ہے، جب کہ غیر قانونی ایڈیشنوں کا کوئی شمار نہیں۔ اس کتاب کا دنیا کی

پس مرگ زندہ

متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا اُن تراجم کے بھی کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی، ہندی، گجراتی، کنڑی وغیرہ زبانوں کے ترجمے بہت مشہور ہوئے۔

یہ کتاب سادہ زبان میں اسلام کو پیش کرتی ہے۔ پڑھے اور بے پڑھے دونوں کے لیے اس کے مشمولات کو سمجھنا آسان ہے۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو اس سے فائدہ ہوا۔

اس موضوع پر پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اُن کی کتاب ”دین و شریعت“ ہے، جو اُس سے زیادہ مبسوط ہے اور جس کا مقصد یہ قول مولاناؒ ہے کہ ”اسلامی اصول و تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہدِ حاضر کے شکوک و شبہات اور اہل زلیغ و ضلال کے مغالطات و تحریفات کی بھی صفائی ہو اور اُس کے ذریعے، علم و واقفیت کے ساتھ دین و شریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین و اعتماد اور سلفِ صالحین کے اختیار کیے ہوئے مسلکِ اہل سنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل ہوتا جائے“۔ (۱)

یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی، اس وقت ۱۹۹۷ء میں اس کا تیسرا ہواں قانونی ایڈیشن میرے ہاتھ میں ہے۔

اس وقت اس مضمون میں مولانا کی کتابوں پر تبصرہ و تعارف مقصود نہیں، یقیناً بہت سے اہل قلم اس کو اپنا موضوع بنائیں گے۔ (۲) لیکن مولانا کی ایک اہم کتاب کے تذکرے کے لیے یہ حقیر قلم بے تاب ہے۔ وہ ”معارف الحدیث“ ہے جو بڑے سائز پر سات ضخیم جلدوں میں ہے اور ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ (۳)

(۱) دین و شریعت، ص: ۲۱-۲۲۔

(۲) اس مضمون کے آخر میں مولانا کی اہم کتابوں کی ایک فہرست دی جا رہی ہے۔

(۳) اس کتاب کی آٹھویں جلد کی تالیف بھی مولاناؒ نے شروع فرمادی تھی۔ معذور یوں کی وجہ سے جب اُن کے لیے اس کی تکمیل ممکن نہ رہی، تو یہ ذمہ داری اپنے برادرِ زادے اور داماد مولانا محمد زکریا سنہجلی قاسمی اُستاذِ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سپرد کر دی، اس مضمون کی یہ شکل کتابِ اشاعت سے دو تین سال قبل یہ حصہ اُن کے ذریعے پایہ تکمیل کو پہنچ کر زیرِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ جزاء اللہ خیراً۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

یہ کتاب محض اردو میں حدیث کی کتابوں میں اضافے کے لیے، حدیث کا ایک مجموعہ نہیں؛ بل کہ زمانے کے حالات و تقاضے کے مطابق وقتِ نظر سے حدیثوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مولانا کا عام فہم اور شیریں ترجمہ، نیز دل کش و روح پرور تشریح نے کتاب کو ہر مسلمان کی ضرورت بنا دیا ہے۔ حال آں کہ یہ کتاب اصلاحی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں میں مسلمانوں کو رسولِ مقبول ﷺ کی بات اور عمل سے راہ نمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے؛ لیکن مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ حدیث پاک کی بہت سی تعبیروں کا صحیح اردو ترجمہ نیز بعض دقیق علمی بحثوں کی گرہیں، اس کتاب میں جس آسانی سے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں، بہت کم جگہ یہ چیز نظر آئی۔

مولانا کی پہلی زیارت اور پھر باقاعدہ زیارت و تعارف

مولانا کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں سب سے پہلے دہلی میں صرف دیکھا، ملاقات نہیں کر سکا۔ وہ ندوۃ المصطفین کی عمارت سے اور مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۴۰۴ھ = ۱۹۸۴ء) کے ہاں سے نکل رہے تھے اور میں جامع مسجد دہلی کے سامنے میاں محل والے چوراہے پر کھڑا تھا وہ ٹیکسی کرنا چاہتے تھے، اُن کے ساتھ اور بھی دو ایک عالم تھے۔ ہمارے ایک دوست نے جو مولانا کو جانتے تھے، اشارہ کیا کہ یہ دیکھو یہ تو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ہیں۔

ملاقات کا موقع تب ملا جب اپنے عظیم استاذ، سرِ اِپا شفقت و شرافت: مؤرخ اسلام و نامور اہل قلم مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ ثم الدہلوی شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی (متوفی ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء) کے حکم سے، ۱۹۷۲ء کے اوائل میں، مخدوم گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱) کے عنایت نامے کی رو سے، اُن سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ گیا۔ پھر مولانا ندوی کے حکم سے اور حضرت الاستاذ کی اجازت سے، کچھ دنوں

(۱) اور اب یہ وقتِ اشاعتِ ایں مضمون یہ شکل کتاب، رحمۃ اللہ علیہ

اُن کی خدمت میں رہا، اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہو گیا۔
 مولانا نعمانی کا قیام اُس وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے مرکز واقع کچھری روڈ کی مسجد کے کمروں میں تھا، وہیں اُن کا دفتر ”الفرقان“ بھی تھا۔
 مولانا ندوی اُن دنوں اپنی لکھنؤ آمد اور قیام کے دوران اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے اُس وقت کے مہمان خانے میں ضرورت کے مطابق ہی نزول فرماتے تھے۔
 مولانا ندویؒ کے ساتھ یہاں آمد و رفت کی وجہ سے یہیں مولانا نعمانی سے متعارف ہوا؛ یہیں اُن کی علمی عظمت اور دعوتی اہمیت کا اندازہ ہوا، یہیں ”الفرقان“ سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، اس سے پہلے صرف نام سنا ہوگا؛ یہیں اُن کے فرزند اکبر مولانا عتیق الرحمن سنبھلی سے دید و شنید ہوئی، پھر معلوم ہوا کہ وہ مولانا محمد عثمان فارقلیط (متوفی ۱۹۷۲ء) سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ ”الجمعیۃ“ کے بعد اردو کے زبردست اسلامی صحافی ہیں؛ یہیں مولانا نعمانیؒ اور مولانا ندوی کے حلقہ بگوش پڑھے لکھے بہت سے اُن حضرات سے، تعارف کا اعزاز حاصل ہوا، جو دینی و ملی اور دعوتی کاموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

راقم کی، اسلام کے دو سچے سپاہیوں کی صحبت سے بہرہ مندی

یہ بڑے خوب صورت، پر بہار اور بارونق دن تھے، اُن کا نقش لازوال میرے حافظے کی لوح پر اپنے دل کش منظر ناموں کے ساتھ ثبت ہے۔ میں دعوت و فکرِ اسلامی کے دو مخلص خادموں، رسول اللہ ﷺ کے دو عاشقوں اور اسلام کے دو سچے سپاہیوں کو ایک ہی مجلس اور ایک ہی جلسے میں موجود پاتا تھا۔ دونوں اپنی باتوں، اپنی تقریروں اور اپنی نصیحتوں سے دلوں کی بھٹیاں گرماتے، جذبات کو سلگاتے، اسلامی شعور و وجدان پر سان چڑھاتے اور حاضرین کو حُبِ نبوی اور عشقِ الہی کا جام پلاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عاشقِ رسول مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ = ۱۹۵۶ء) مولانا عبدالباری ندوی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) اور مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۱۳۹۹ھ (= ۱۹۷۸ء) کے بعد، دو یا دو سے زائد عظیم درجے کے مشہور عالموں کے درمیان ایسی محبت، یگانگت، فکر و نظر کی مناسبت، اور ایسی اخوت جو گویا خون کے رشتے سے مضبوط تر ہو (جو ساٹھ سال: ۱۹۳۸ء - ۱۹۹۷ء کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہو) جذبات و خیالات کی ایسی ہم آہنگی، ایک دوسرے کی ایسی رعایت و پاس داری، ایک دوسرے سے ملاقات و مشورے کا اتنا اہتمام اور مسلمانوں کے درد کی دوا ایک ساتھ مل جل کر ڈھونڈنے کی ایسی مثال؛ میں نے اپنے ناقص مطالعے میں تو نہیں پڑھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ”رفیق محترم“ ہی لکھتے اور بولتے تھے۔ دعا ہے کہ خدائے کریم دونوں کو وہاں اپنی جنت الفردوس میں بھی رفیق بنائے۔ ایک ”رفیق محترم“ کے چلے جانے سے (۱) دوسرے رفیق کو (۲) فراق کی تلخی اور ہجر کی جواذیت محسوس ہو رہی ہے، تو خدا اُسے اس کا بھی بہترین بدلہ و عمر دراز دے۔

میں ندوۃ العلماء میں کم و بیش دس سال مدرس رہا، اس دوران مولانا نعمانیؒ کی عظمت، دینی علوم میں رسوخ، قلم کی برجستگی و سادگی، دین و ملت کے لیے اُن کی ہمہ وجوہ خدمات، اور دعوت کے میدان میں اُن کی بھرپور تگ و دو کی معرفت بڑھتی رہی۔ اُن کی خدمت میں کبھی تنہا اور کبھی ہم عمروں اور بزرگوں کے ساتھ اُن گنت مرتبہ جانے اور فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔ کچھری روڈ سے نظیر آباد اپنے ذاتی خرید کردہ مکان میں منتقل ہو جانے سے، ہم لوگوں کو آمد و رفت میں زیادہ سہولت محسوس ہونے لگی کہ یہ نسبتاً زیادہ قریب تھا اور امین آباد کے چوراہے پر واقع ہونے کی وجہ سے گزرگاہ پر بھی۔

لیکن بار بار اور جلدی جلدی ملاقات و استفادے کی ایک دوسری صورت کئی سال بعد یہ پیدا ہوئی کہ اُنھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک طالب علم کے

(۱) مراد اس سے حضرت مولانا نعمانیؒ ہیں۔

(۲) مراد اس سے حضرت مولانا ندویؒ ہیں، جو خود بھی اس مضمون کے کتاب کی شکل میں چھپنے سے کئی سال قبل، رحمتہ اللہ علیہ ہو چکے ہیں۔

پس مرگ زندہ

استفسار پر، ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء میں اپنی کتاب ”شیخ محمد عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علمائے حق پر اُس کے اثرات“ لکھی۔ پھر ۱۹۷۹ء میں راقم الحروف کو اُسے عربی میں ترجمہ کرنے کی سعادت بخشی اور مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقد شدہ دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ سے کچھ پہلے ”الدَعَايَاتُ الْمُكْتَفَةُ ضِدَّ الشَّيْخِ مُحَمَّدَ بْنِ عَبْدِ الْوَهَّابِ وَتَأْتِيُهَا عَلَى الْعُلَمَاءِ ذَوِي الْعَقِيدَةِ الصَّحِيحَةِ فِي الْهِنْدِ“ کے نام سے ندوۃ العلماء کے پریس سے چھپی۔ (۱)

اس کتاب کے عربی ترجمے کی تکمیل سے چند ماہ قبل حضرت مولانا نعمانیؒ کو یہ خیال ہوا تھا کہ عربوں کے لیے یہ کتاب دوسرے انداز میں، مزید مؤثر طور پر لکھی جائے؛ چنانچہ ایک خط میں انھوں نے ناچیز کو، جو انھوں نے میرے گھر کے پتے (ہر پوریشی، اورانی، مظفر پور، بہار) پر بھیجا تھا، تحریر فرمایا:

۶ مئی ۱۹۸۰ء

برادر مکرم مولانا نور عالم صاحب! زید مجدک

سلام و رحمت۔ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ کتاب کے صفحہ ۸۰ سے صفحہ ۱۴۴ تک جو مضامین ہیں، اُن میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ اُن کا ترجمہ کر لیں۔

لیکن بعد میں؛ میں نے مزید غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پوری کتاب ہندوستان و پاکستان ہی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ بعض چیزیں جو یہاں کے ذہنوں کے لیے بہت مؤثر ہو سکتی ہیں، وہ عربوں کے لیے بالکل مؤثر نہ ہوں گی؛ اس لیے اب میں نے طے کیا ہے کہ میں عربوں کے ذہن کو سامنے رکھ کر، اس سر نو ایک چیز لکھوں اور اُس میں کچھ چیزوں کا اضافہ کروں۔

(۱) یہ کتاب عربی اور اردو: دونوں زبانوں میں، الفرقان بک ڈپو، ۳۱ نیا گاہوں مغربی، نظیر آباد، کھنٹو سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

گذشتہ رات مغرب و عشا کے درمیان مولانا علی میاں تشریف لائے تھے، اُن سے اس سلسلے میں بات ہوئی، اُنھوں نے میرے خیال سے پورا اتفاق کیا۔ اب آپ ترجمے کا کام فی الحال نہ کریں، اب میں عربی ایڈیشن کے لیے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اُس میں دیر لگے گی۔ رات مولانا علی میاں نے بتایا کہ آپ ان شاء اللہ جلد ہی ”راے بریلی“ تشریف لائیں گے، پھر تو ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

لیکن میں نے چوں کہ کتاب کے اکثر حصے کا ترجمہ کر لیا تھا؛ اس لیے ذہن میں آیا کہ اُس کو تو مکمل کر ہی لیا جائے، حضرت مولانا اگر بعد میں کچھ لکھیں گے، تو اُس کی تعریف بھی ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ مولانا کو کتاب از سر نو لکھنے کی فرصت نہیں مل سکی اور جزوی ترمیم کے ساتھ سابقہ کتاب ہی کا عربی ترجمہ چھپا اور وہی عربوں میں تقسیم ہوا۔

مولانا سے مزید ربط و تعلق

پھر خدائے پاک کی توفیق سے اور اپنے استاذ و مربی، برصغیر میں عربی زبان کے استاذِ یگانہ، مدرسی زندگی کے دورِ آخر کے مربیِ عبقری: مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کے حکم سے مرکزِ علوم نبوت دارالعلوم دیوبند میں نصفِ شوال ۱۴۰۲ھ = نصف اگست ۱۹۸۲ء، میں ”الداعی“ کے مدیر اور استاذِ ادبِ عربی کی حیثیت سے یہاں آ گیا؛ تو یہ میری سعادت مندی تھی کہ مُتَعَدِّد اسباب کی بنا پر مولانا سے ربط و تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔

اُس وقت دارالعلوم میں نئی انتظامیہ کی استواری کا عمل جاری تھا؛ اس لیے قدرتی طور پر یہاں حالات غیر مستحکم سے تھے۔ ہم جیسے یک سو طبیعت آدمی کو ان حالات میں

پس مرگ زندہ

ایک طرح کی بے چینی یا کم از کم بے کیفی سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں مولاناؒ سے کئی بار بزرگانہ و مربیانہ مشورے کا طالب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے مشورے نے تاریکی میں روشنی کا کام دیا۔ ہمارا رب انھیں بہت نوازے۔

ایک عریضے میں، ناچیز نے نئی انتظامیہ کی استواری کے بعد کی غیر استحکامی کیفیت، اُتھل پتھل کے حالات، صورت حال کی بے کیفی وغیرہ کو حضرت مولاناؒ کے سامنے تفصیل سے بیان کیا اور لکھنے پڑھنے کے لیے موجودہ حالات میں ماحول کی ناسازگاری اور اپنی پرسکون طبیعت کے اُچاٹ اُچاٹ سی رہنے کی بات بیان کی، تو حضرت نے مندرجہ ذیل والا نامہ تحریر فرمایا:

۱۷/۱۲/۱۴۰۲ھ

برادرِ مکرم! اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْنَا وَاِلَيْكُمْ سَلام ورحمت

آپ کا مفصل عنایت نامہ ملا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اس تفصیل سے لکھ دیا۔ مجھے اس صورت حال کا اندازہ ہے، مگر اجمالی۔ گذشتہ ۱۰-۱۵ سال سے وہاں جو حال رہا ہے، اُس کے نتیجے میں یہی ہونا چاہیے۔

میرے بھائی! سب کی جڑ بنیاد، آخرت کی طرف سے بے فکری اور غفلت ہے۔ ہمارے بس میں تو اپنا دل بھی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ مُقَلِّبُ الْقُلُوب کی رحمت ہی سے امید کی جاسکتی ہے، ہمارا فرض امکانی تدبیر و سعی اور إلحاح و تضرع کے ساتھ دعا ہے، اِس کے بعد بس ”وَأَفْوِضْ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ“۔ میرا سفر اگر بہت مشکل نہ ہوتا، تو مجھے بار بار جانا چاہیے تھا، وہاں دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں کے سامنے بھی روتا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں بھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہر مہینے کسی ربانی مخلص شخصیت کو ضرور بلایا جائے۔ غالباً سوائے اِس کے کہ حضرت مفتی محمود صاحب کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے، ابھی اِس سلسلے میں کچھ اور نہیں ہو سکا ہے۔ جو ذمے دار ہیں وہ بیچارے بہت سے الجھاؤں میں بھی

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ہیں، عبوری دور چل رہا ہے۔ آپ کی تجاویز مثبت اور قابلِ توجہ ہیں (۱)۔ اس وقت صرف اتنا ہی عرض کروں گا، باقی ان شاء اللہ عند التلاقی۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا اُن دنوں سخت علیل تھے؛ لیکن یہ ناچیز جب بھی کوئی عریضہ ارسال کرتا تو تمام معذوریوں کے باوجود عموماً اپنے قلم سے ہی جواب تحریر فرماتے۔ اُنھی دنوں کا یہ (فیل) والا نامہ بھی ہے:

ذیلی

۲۰ نومبر ۱۹۸۲ء

برادرِ مکرم! زید مجدکم سلام ورحمت

اگلے ہفتے مجلس شوریٰ کے جلسے میں شرکت کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ حاضری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مقدّر و مؤیّر فرمائے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ”الداعی“ میں ترجمے کے لیے آپ نے ”انسانیت زندہ ہے“ کا کس بنیاد پر انتخاب کیا؟ اگر کتب خانے میں نسخہ ہو تو ان شاء اللہ، میرے ساتھ آجائے گا۔

”الداعی“ کے پہلے شمارے کا آنا تو سچا دُمیاں سے معلوم ہوا تھا، دوسرا بھی آیا ہوگا۔ مجھے اہتمام اور شوق سے اُس کو دیکھنا چاہیے؛ لیکن اب میں نے اپنے کو مطالعہ سے معذور قرار دے لیا ہے۔

عالمِ عربی کا مسئلہ بلاشبہ قابلِ فکر ہے۔

اس وقت صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں، ایسا حال ہے کہ یہ سطریں

(۱) میں نے حضرت کو لکھا تھا کہ آپ انتظامیہ سے کہیں کہ حضرت مفتی محمود صاحب سے باقاعدہ دارالعلوم میں قیام کرنے کی درخواست کرے اور کم از کم ہر ماہ مولانا صدیق احمد باندوی اور مولانا شاہ ابراہیم کی پند و نصیحت کا بھی انتظام کرے۔

پس مرگ زندہ

مشکل سے لکھی ہیں، مختصر نویسی کے لیے مکرر معذرت خواہ ہوں۔

دعا کا محتاج و طالب دعا ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

اس کے چار پانچ دن بعد ہی، دوسرا والا نامہ ارسال ہوا، جس کا متن درج

ذیل ہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۲ء

برادر مکرم! زید مکرم، سلام و رحمت

آپ کا ایک اخلاص نامہ ملا تھا، میری طبیعت خراب تھی، مختصر جواب لکھ دیا تھا، ملا ہوگا۔ کبھی کبھی بلڈ پریشر بہت بڑھ جاتا ہے؛ اس وجہ سے میں نے دفتر میں کھلوادیا ہے کہ اخبارات و رسائل میرے پاس نہ بھیجے جائیں، پڑھنے کا مرض ہے اور وہ مضر ہوتا ہے۔

آپ کو خط لکھنے کے بعد ”الداعی“ کے بارے میں سجاد میاں (۱) سے دریافت کیا تھا، انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دونوں شمارے بہت کامیاب ہیں اور معیار سابق کے لحاظ سے بہت بلند ہیں۔ یہی توقع تھی۔

شورلی میں شرکت کی نیت ہے، اللہ تعالیٰ مقدر و ميسر فرمائے۔

دعا گو اور دعا کا طالب ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

”الداعی“ کی ذمہ داری لینے کے بعد، میں نے طے کیا کہ اس کو کسی نہ کسی

(۱) صاحب زادہ خرد مولا نانعمانی: عالم صالح حضرت مولا ناسخا و نعمانی مدظلہ العالی فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و فاضل مدینہ یونیورسٹی و مشہور اہل قلم و داعی الی اللہ۔

داعی ہفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

درجے میں داعی رہنا چاہیے اور ایسے دعوتی و فکری مضامین ہر شمارے میں آنے چاہئیں جن میں اسلامی تعلیمات و حقائق کو نئے ذہن کے مطابق پیش کیا گیا ہو۔ فرزندِ ان دیوبند نے، جو بھرپور اگر اس مایہ اسلامی کتب خانہ تیار کر دیا ہے، میں نے اس مقصد کی خاطر اس پر ایک نگاہ ڈالی، تو باوجودے کہ یہ تصنیفات و نگارشات اپنی جگہ گراں بہا، بے مثال اور تمام علم و فن کی جامع ہیں؛ لیکن مجھے اس بحر میں وہ درِ مطلوب زیادہ آسانی سے نہیں مل سکا، جس کا میں متلاشی تھا یعنی یہ کہ دعوتی و فکری بات آسان زبان میں اور موجودہ ذہن کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہو۔ بالآخر مولانا کی ”دین و شریعت“، قرآن آپ سے کیا کہتا ہے، ”معارف الحدیث“ الفرقان کی فائلوں میں اُن کے مضامین اور اُن کے تقریری مجموعوں سے ہی اس سلسلے میں فائدہ اٹھایا جاسکا۔

مولانا نعمانیؒ جہاں دینی علوم کے بڑے غواص تھے، عظیم داعی الی اللہ اور شریعت و طریقت کی جامعیت کا نمونہ تھے، وہیں انتہائی زیرک، دنیوی معاملات سے باخبر، انسانی فطرت کے تجربہ کار اور انسانی معاشرے کی پیچیدگیوں نیز دینی کہے جانے والے ماحول کی تہ سے ابھرنے والی خرابیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ ناچیز نے ”الداعی“ میں اُن کے مضامین کی تعریف کر کے موقع بہ موقع انھیں چھاپنا شروع کیا، تو حضرتؒ نے مندرجہ ذیل مکتوب ارسال فرمایا، جس سے اُن کی زیرکی اور انسانی طبائع کے اُن کے گہرے مطالعے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس خط سے دارالعلوم سے ان کی بے پایاں محبت اور اُس کی خیر خواہی کے جذبات کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے:

۳۱ جنوری ۱۹۸۴ء

برادرِ مکرم! زیدِ مجدکم، سلام و رحمت

خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں، مہینہ سے بھی زیادہ مدت سے، آپ کو خط لکھنے کا دل میں تقاضا ہوتا تھا؛ لیکن خرابیِ صحت کی وجہ سے بس اُسی وقت خطوط وغیرہ لکھنے کی نوبت آتی ہے جب ضرورت کا احساس مجبور کر دیتا ہے۔

ایک بات تو یہ لکھنا چاہتا تھا کہ آپ ”الداعی“ میں اکثر میرے نام سے کوئی مضمون شائع فرماتے ہیں، جو میری کسی تحریر کی تعریف ہوتی ہے، مجھے اس سے خوش اور ممنون ہونا چاہیے؛ لیکن میں اس کو آپ کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی مناسب نہیں سمجھتا، کبھی کبھی کوئی چیز آجائے، جیسے دوسرے حضرات کی بھی آتی ہے تو مضائقہ نہیں؛ لیکن اکثر شماروں میں آنا ٹھیک نہیں، لوگ آپ کے بارے میں بھی بدگمانی کریں گے اور میرے بارے میں بھی، جس سے بچنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ لکھنا چاہتا تھا کہ گذشتہ مجلس شوریٰ منعقدہ لکھنؤ میں پہلے دن مولانا علی میاں صدر تھے، میں بہت تھوڑی دیر کے لیے شریک ہوسکا تھا، عرب ممالک کے لیے وفود سے متعلق تجویز کے سلسلے میں، مولانا علی میاں نے ایک مفید مشورہ دیتے ہوئے موجودہ ”الداعی“ کی تعریف کی اور فرمایا کہ اُس کے ذریعے عرب ممالک میں دارالعلوم کا اچھا تعارف ہو سکتا ہے اور مہتمم صاحب سے فرمایا کہ اس وقت تو میں باہر جا رہا ہوں، سفر سے واپسی پر ایک دن کے لیے آپ تشریف لے آئیں تو میں وفود کے وہاں فضا بنانے کے سلسلے میں تفصیلی مشورہ دوں گا اور خواص کے پتے لکھوا دوں گا، جن کو ”الداعی“ بھیجا جائے اور اُن سے رابطہ قائم کیا جائے۔

میرے دل میں تقاضا تھا کہ آپ کو مولانا کی اس گفتگو کی اطلاع دوں۔ اس کے بعد میں نے مہتمم صاحب کو ایک دفعہ لکھا تھا کہ آپ اس کام کے سلسلے میں جب لکھنؤ تشریف لائیں، تو مولانا نور عالم صاحب کو بھی ضرور ساتھ لے کر آئیں۔

اس سلسلے میں آپ مولانا مرغوب الرحمن صاحب کو میرا یہ پیغام پہنچادیں کہ مولانا علی میاں بمبئی وغیرہ کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں، سنا ہے کہ یہ سفر ۲-۳ ہفتے کا ہوگا؛ اس لیے اس سفر سے واپسی سے پہلے، اس کام کے

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

سلسلے میں لکھنؤ کے سفر کا ارادہ نہ فرمائیں۔ میں مہتمم صاحب کو بہ راہ راست بھی لکھوں گا، احتیاطاً آپ کو بھی لکھ دیا ہے۔ ڈاک کا نظام بہت خراب ہے۔

پچھلے دنوں جو ہنگامہ دارالعلوم میں ہوا، (۱) میں چاہتا ہوں کہ آپ پوری

(۱) اس سے اشارہ مولوی عثمان سہارنپوری صدر جمعیۃ الطلہ دارالعلوم دیوبند اور اُس کے رفقا کی طرف سے، دارالعلوم میں کیے گئے ناگتہ بہ ہنگامے کی طرف ہے۔ جمعیۃ الطلہ کی بہ حالی اُن مدعوں میں سے ایک تھی، جن کی بنیاد پر دارالعلوم میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی کی قیادت اور مولانا سید اسعد مدنیؒ کی سرپرستی میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی انتظامیہ کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی، جس کے نتیجے میں، اُن کی انتظامیہ برخاست اور نئی انتظامیہ بہ حال ہوئی، جس نے ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء کو باقاعدہ انتخاب کے ذریعے، مولوی عثمان سہارنپوری کو جمعیۃ الطلہ کا صدر، مولوی ثناء الہدیٰ (اور اب مولانا مفتی ثناء الہدیٰ نائب ناظم امارت شریعہ بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ) کو جنرل سکریٹری چنا اور اُن کے تحت بہت سے ارکان و ذمے داران جمعیۃ الطلہ متعین ہوئے۔

ان میں سے اکثر طلبہ چوں کہ کمپ دارالعلوم کے توسط سے، دارالعلوم پر نئی انتظامیہ کے ذریعے ۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء کی رات میں ۲ بج کر ۴۵ منٹ پر قبضہ کرنے اور سابق انتظامیہ کے دارالعلوم کے احاطے کے اندر موجود لوگوں کو بھگا دینے میں شریک تھے؛ اس لیے یہ طلبہ اپنے کو دارالعلوم کا مالک سمجھ بیٹھے تھے، نوجوانی کی ناسمجھی اور بے جا جوش کی وجہ سے حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ سے، جو دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کے قیام اور انقلاب کے اصل روح رواں تھے، اپنی خواہش کے مطابق اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرنا چاہتے تھے، جو انتظام و قانون کی رو سے خود مولانا کے بھی بس میں نہ تھی۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء کی رات میں دارالحدیث تھتانی میں، جمعیۃ الطلہ کا جو باقاعدہ اجلاس ہوا، جس میں طلبہ جمعیۃ مولانا کو اُن کے گھر سے دو لہجے کی طرح لے کے آئے اور اُن کی مدح و ثنا میں دو تین طلبہ نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی، اُس موقع سے بھی حضرت الاستاذؒ نے اُن طلبہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے کمپ میں آپ سے جتنے وعدے کیے تھے، وہ پورے نہیں کر سکتا اور نہ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ پورے ہو جائیں گے۔“

لیکن یہ طلبہ دن بدن اپنی شوخی و گفتار و کردار کے مظاہرے میں اضافہ کرتے رہے، کچھ دگر و حید الزماں مخالف طاقتوں کا آگے کار بھی بن گئے اور حضرت الاستاذ کے ساتھ بے ادبی کی تمام حدوں کو پار کرتے ہوئے شبہ ۱۱ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کی رات میں، جب حضرت دارالحدیث تھتانی میں طلبہ کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کر رہے تھے، دوسری منزل کی گیلریوں سے، حضرت پرائڈے اور ٹائمر وغیرہ « «

پس مرگ زندہ

تفصیل کے ساتھ اُس کی روداد اور موجودہ صورتِ حال اور امکانات لکھیں اور

» » برسائے، اسی اثنا میں منصوبے کے تحت صدر گیٹ پر واقع جزیرہ روم (اُس وقت دارالعلوم میں یہ واحد جزیرہ تھا) میں جا کر جزیرہ کو بند کر دیا اور دروم پر تالا ڈال دیا اور ایک کاغذ پر یہ لکھ کے لٹکادیا کہ جو اس کو کھولنے کی کوشش کرے گا، اُس کو قتل کر دیا جائے گا۔ دارالعلوم کی بجلی لائن لوہے کی زنجیر ڈال کر اڑادی گئی اور پورا دارالعلوم تاریکی میں ڈوب گیا۔

دارالعلوم نے، ان طلبہ کے خلاف سخت اور مناسب کارروائی کرتے ہوئے، ان کا ہمیشہ کے لیے دارالعلوم سے اخراج کر دیا۔ یہ کارروائی سوار ۱۳/ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹/دسمبر ۱۹۸۳ء کو عمل میں آئی۔

یہ نخرج طلبہ اور شرارت پر اُتر آئے، بعض شرارت پسند عناصر کی معاونت سے یہ بدھ: ۱۵/ربیع الاول ۱۴۰۴ھ = ۲۱/دسمبر ۱۹۸۳ء کو ظہر بعد ۲ بج کر ۷ منٹ پر دارالعلوم کے جنوبی دروازہ معروف بہ ”معراج گیٹ“ سے دارالعلوم کے دارجید کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ طلبہ بند قوں لاشیوں، سریوں اور پتھروں سے مسلح تھے، کچھ ہتھ گولے بھی ان کے پاس تھے جنہیں انھوں نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دہشت پھیلانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ شرارتی طلبہ اور اُن کے ہم نوا شہری دارجید میں تیزی سے ہر طرف پھیل گئے، طلبہ پر کنکروں، پتھروں اور اینٹ کے ٹکڑوں سے حملہ شروع کر دیا، بند قوں کی آواز سے ماحول میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا، طلبہ نے اپنے کمروں کے دروازے بند کر لیے جنہیں ان مفسدوں نے توڑنا شروع کیا، دارالعلوم کے سبھی دروازے بھی مفسدین نے اندر سے بند کر لیے اور مسجد قدیم کے مائک پر قبضہ کر کے، اُس پر اپنی فتح کا اعلان شروع کر دیا؛ لیکن جلد ہی طلبہ و اساتذہ نے انھیں قبضے میں کر لیا، مولانا معراج الحق نے مولوی عثمان سہارن پوری کی کمر پر اپنے ڈنڈے کو اس زور سے مارا کہ وہ فوراً بیہوش سا ہو گیا، مولانا سید ارشد مدنی دارالعلوم کے دارجید کے جنوب غربی حصے کے ایک کمرے کی ایک کم زور کھڑکی کو توڑ کے اپنی بند قوں کے ساتھ آگئے، پھر جلد ہی کایا پلٹ گئی اور ۱۴ مفسد طلبہ کو پکڑ لیا گیا، طلبہ نے انھیں بری طرح زد و کوب کیا؛ لیکن اساتذہ اور انتظامیہ کے لوگوں نے پچالیا؛ ورنہ اگر کسی کی موت ہو جاتی تو حالات کا رخ بدل جاتا اور مفسدین کا مقصد پورا ہو جاتا۔

طلبہ مفسدین نے، شرانگیز لوگوں کی پشت پناہی سے دارالعلوم سے بہ حفاظت بچ نکلنے کے بعد، دارالعلوم پر مقدمہ بھی قائم کر دیا کہ ہم اپنا سامان لانے دارالعلوم گئے تھے، تو اساتذہ و طلبہ ہمارے قتل کے درپے ہوئے اور ہم پر جان لیوا حملہ کیا۔

قابل ذکر ہے کہ مولوی عثمان سہارن پوری بعد میں مسلم یونیورسٹی کی جامعہ طیبہ کے طالب علم ہوئے اور اپنی قیادت کی لیاقت کی وجہ سے جس پر مولانا کبیر انوٹی نے سان چڑھا کی تھی، وہاں کی جمعیۃ الطلبہ کے صدر منتخب ہوئے، ۲۰۰۵ء میں وہ ملائم سنگھ کی سماج وادی پارٹی کی طرف سے یو پی سنی وقف بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔ حضرت مولانا نعمانیؒ کے مکتوب گرامی میں انھی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ
آئندہ جب کوئی غیر معمولی واقعہ ہو تو مجھے مطلع کرنے کی زحمت کیا کریں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

شیعیت کے موضوع پر مولاناؒ کی زندہ جاوید تصنیف

”امام آیت اللہ روح اللہ خمینیؒ“ (متوفی ۴/ جون ۱۹۸۹ء = ۲۹/ شوال ۱۴۰۹ھ)
نام کے ایرانی شیعہ اثنا عشری عالم نے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی طاقت و رشاہی کا
تختہ الٹ کر اپنے عقیدے کے مطابق ۱۳۹۹ھ = ۱۹۷۹ء میں وہاں ”اسلامی حکومت“
قائم کی، تو نہ صرف شیعہ دنیا نے آسمان سر پر اٹھالیا؛ بل کہ وہ سنی العقیدہ مسلمان خصوصاً
نوجوان جو ایک خاص قسم کی سطحی اسلامی تحریک سے متاثر، ”حکومت الہیہ“ یا ”خلافت علیٰ
منہاج النبوة“ کے قیام کے لیے نام نہاد کوشش اور مطلوبہ عمل و اخلاص کے بغیر محض
کھوکھلے نعروں سے مسحور اور اس سلسلے کے لڑپیچ کے ”منشیات“ سے سرشار تھے، خمینی کے
عقیدے، صحابہ کرام پر اُس کے سب و شتم، ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم پر بہ طور خاص
اُس کے لعن طعن اور ایسی الزام تراشی جو کسی نہایت ہی ضال، فاسق، اور بدکردار جماعت
کے لیے بھی نہیں کی جاتی (۱) سے بالکل صرف نظر کرتے ہوئے؛ اُس کو ایک صحیح، مطلوبہ
اور مثالی حکومت اسلامی کا بانی، اسلامی انقلاب کا داعی و مؤسس اور قابل تقلید قائد سمجھنے،
سمجھانے اور پوری دنیا میں اُس کا بول بالا کرنے کے لیے زبان، قلم، اور ذرائع ابلاغ کی
ایسی پر زور طاقت صرف کرنی شروع کر دی اور خمینی سے عقیدت و محبت کے اظہار میں
یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے کہ اُس کے خلاف کوئی حرف تنقید زبان سے نکالنے والا اُن
کے نزدیک گویا اتحاد اسلامی کا مخالف، حکومت اسلامی کا دشمن، مسلمانوں کے انتشار کا
داعی اور غلبہ فکری اسلامی و عروج اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والا بن گیا۔

(۱) پڑھیے خمینی کی کتاب ”کشف الاسرار“ بہ زبان فارسی، ص ۱۱۰-۱۱۳۔

پس مرگ زندہ

اس صورتِ حال سے صحیح العقیدہ علمائے دین بے چین ہو گئے؛ کیوں کہ فسادِ عقیدہ کے ساتھ کسی طرح کی ”اسلامی حکومت“ کا قیام اور اس سلسلے کی دعوت و تحریک محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں قابلِ قبول نہیں۔ خدائے ذوالجلال کسی کٹر و فتر، کسی مغربی طاقت کو لکار دینے، کسی بڑی طاقت کے لیے مشکلات پیدا کر دینے سے متاثر و ”مرعوب“ نہیں ہوتا۔ اُس کے نزدیک اصل یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے، اُس کی اُلُوہیت کو چیلنج کرنے کی تمام ظاہری و باطنی شکلوں سے بچا جائے، اُسی کو سارے کارخانے کا حاکم و مالکِ مطلق جانا مانا جائے۔

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اُس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

ان علمائے حق میں سرفہرست مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا قلم بدعت، قادیانیت اور دیگر باطل فرقوں کے مقابلے میں شرر بار رہ چکا تھا۔ مولانا نے اپنے امراض، پیرانہ سالی، کم زوری: ساری چیزوں سے بے نیاز ہو کر شیعیت کا، اُس کی تاریخ کا، اُس کے قدیم مآخذ کا اور جدید مراجع کا نیز خمینی کی تصنیفات و تحریرات کا گہرائی و گہرائی سے مطالعہ کیا۔

اور بہ قول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ: (۱)

”اس مطالعے نے اُن کے ضعیف اور بیماریوں سے زار و زار جسم میں ایک نئی حرکت و قوت اور فکر و مطالعے کی ایک نئی صلاحیت پیدا کر دی۔ انھوں نے اس محنت و انہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ بارہا اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہل تعلق کو اس بارے میں فکر و تشویش لاحق ہوئی؛ لیکن مولانا اپنی افتادِ طبع اور

(۱) وفات: بہروز جمعہ ۲۲/ رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس فکر سے باز نہیں رکھ سکے۔ (۱)

مولاناؒ نے اس مذہب کا معروضی، متکلمانہ و عالمانہ و مؤرخانہ جائزہ لیا، جس کے نتیجے میں اُن کی محققانہ کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ معرض وجود میں آئی جو مذہب شیعہ کی مکمل تاریخ، اُس کے عقائد اور کتاب و سنت کی روشنی میں اُس کے عقائد سے اخذ کردہ نتائج کا اتنا جامع مرقع بن گئی ہے جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ شیعیت کا یہ جدید ترین اور بہترین مطالعہ ہے جو کسی بھی پڑھے لکھے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولاناؒ نے جس وقت اس کتاب کو بالا قسط لکھا اور ”الفرقان“ کے صفحات پر شائع کرنا شروع کیا، اُسی وقت میرے جی میں آیا کہ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ کے لیے عموماً اور اس وقت خصوصاً، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عرب دنیا بھی تشیع کے فتنے، اُس کی تحریف کاری اور جسم اسلامی میں اُس کے سرطانی عمل سے واقف ہو۔ نیز خمینی کی اپنے سلف کی شدید پیروی، صحابہ کرام سے اُس کی اور اُس کے سلف کی بیزاری، تبراً، سب و شتم، اور دل گداز الزامات کی چارج شیٹ سے واقف ہو۔ پھر ”حکومت اسلامیہ“ کا بھرم بھی اُس کے سامنے کھل جائے اور عالم اسلام کے نعرہ باز نوجوانوں پر اُس کا جو غلبہ چلا ہوا ہے، اُس کے ٹوٹنے کی راہ ہم وار ہو۔

یہ سوچ کر میں نے اُسے عربی قالب میں ”الداعی“ میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس موقع سے قدرتی طور پر مولاناؒ کی بے پناہ توجہات سے سرفراز رہا۔ وہ اپنے خطوط کے ذریعے جہاں دعائیں دیتے، حوصلہ بڑھاتے؛ وہیں کسی جگہ عبارت کو حذف کر دینے، یا اُس کی تعبیر بدل دینے، یا پیرا گراف کے اضافے اور مزید حوالوں کی نشان دہی کرتے۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ انھیں دنوں مولانا نعمانیؒ سے پہلے اُن کے صاحب زادہ گرامی اردو کے ادیب و مشہور اسلامی اہل قلم مولانا عتیق الرحمن سنہجلی مدظلہ

(۱) ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“، ص: ۱۶، ساتواں ایڈیشن؛ الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، یوپی۔

پس مرگ زندہ

العالی کے مضامین خمینی اور اُن کے انقلاب کے حوالے سے ”الفرقان“ میں چھپے، جن میں سے بعض قسطوں کا راقم نے ”الداعی“ میں عربی میں ترجمہ کیا، پھر مولانا نعمائی کے مضامین اس موضوع پر بالاقساط ”الفرقان“ میں چھپنے شروع ہوئے۔ اُس وقت ناچیز کے دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا تھا کہ عربی زبان میں مفصل اور مرتب طور پر کوئی کتاب خمینی صاحب اور اُن کے انقلاب ایران کے حوالے سے لکھی جائے؛ تاکہ عربوں کو صحیح صورتِ حال کی جان کاری ہو۔ اس سلسلے میں، راقم نے مولانا نعمائی سے مشورہ کیا تھا، جس کا حضرت نے نہ صرف مثبت جواب دیا؛ بل کہ حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ، بعض مراجع کی بھی نشان دہی فرمائی۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک مکتوب مندرجہ ذیل تھا جس میں اور بھی بہت سی باتیں تھیں:

۱۲/۱۲/۱۴۰۲ھ

برادر عزیز و کرم! أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْنَا وَإِلَيْكُمْ، سلام و رحمت
عنایت نامہ مورخہ ۱۲/۱۲/۱۴۰۲ھ، عید سے پہلے ہی مل گیا تھا، اُس سے معلوم ہوا کہ میرا عریضہ آپ کو بعد میں مل گیا۔

اس وقت صرف اِتنا عرض کرنا ہے کہ آپ نے جو کتاب ایرانی انقلاب اور خمینی سے متعلق مُرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے، اُس میں تبدیلی ہرگز نہ کریں، وہ مستقل کتاب ہوگی اور اِنْ شاء اللہ بہت مفید اور موثر رہے گی۔

آپ اُس میں مولوی عتیق الرحمن کے مضمون سے اور میرے اُن مضامین سے کام لیں گے، جو ”الفرقان“ میں ۳ قسطوں میں شائع ہو چکے ہیں، آخری قسط ماہ رواں کے شمارے میں شائع ہوئی ہے، وہ ایک ہفتہ پہلے روانہ ہو چکا ہے، پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے مآخذ سے جولیا جاسکے۔

میرے پاس ”کَشْفُ الْأَسْرَارِ“ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے، ضخیم کتاب ہے، تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کی ہے۔ میں نے تو صرف ایک بحث دیکھ کر اپنا کام پورا کر لیا، پوری کتاب کے مطالعے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میرا خیال

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ہے کہ آپ اگر اس کا مطالعہ فرمائیں گے تو اور بہت کچھ آپ کو مل جائے گا۔ اگر چاہیں تو اس مقصد سے دو تین دن وقت نکال کے لکھنؤ آجائیے۔

آپ میری طرف سے اور میرے اس خط کے حوالے سے، مہتمم صاحب سے کہہ سکتے ہیں کہ ”کشف الاسرار“ اور ”الحکومة الاسلامیة“ کا نسخہ دارالعلوم کے کتب خانے میں رہنا ضروری ہے۔ یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور ان دونوں کتابوں کے ملنے کی بہ ظاہر امید نہیں، صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی فوٹو کاپی لی لی جائے۔

میرے پاس ”الحکومة الاسلامیة“ کا نسخہ ذاتی نہیں ہے، مولانا علی میاں کا ہے، انھوں نے ایران جانے والے ایک صاحب کے ذریعے ایران سے منگوایا ہے۔

بہر حال آپ مناسب سمجھیں تو میری طرف سے مہتمم صاحب سے یہ کہہ سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بھی لکھنؤ کا سفر کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کی نوعیت یہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ تو یہی ہے جو ”الفرقان“ کی تین قسطوں میں آگیا۔ اس کا تعلق اصلاً صرف انقلاب ایران اور ”خمینی“ کی شخصیت سے ہے، اگرچہ اس میں شیعیت کا بھی خاصا تعارف ہو گیا ہے۔ یہ کتاب کے تقریباً اسی صفحات پر آیا ہے، اس کے آگے شیعیت پر جو میں نے بہ راہ راست لکھا ہے وہ قریباً دو سو صفحات پر ہے۔ وہ دراصل الگ مستقل کتاب ہے؛ لیکن میں نے ان دونوں کو ایک کر دینا اس لیے مناسب سمجھا ہے کہ اس طرح شیعیت والا حصہ بھی لوگوں کی نظر سے گزر جائے گا، جس کو میں ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا عبد اللہ عباس (۱) اگر کر سکے تو ان کو پوری ہی کتاب ترجمہ کرنا

(۱) مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و جامعہ ام القری مکہ مکرمہ و بعدہ معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ وفات: بروز یک شنبہ: یکم جنوری ۲۰۰۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ بہ تقویم سعودی عربیہ ۲۹/۲ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ بہ حساب تقویم برصغیر ہندوپاک۔

پس مرگ زندہ

ہے؛ لیکن آپریشن کے بعد سے اُن کا کوئی خط نہیں ملا ہے۔ خدا کرے بہ عافیت ہوں اور وہ یہ کام کر سکیں۔

اُنھوں نے پہلی قسط کا ترجمہ کر کے بھیج دیا تھا۔ بعد کے دور سالے اگر اُن کو ملے ہوں گے، تو آپریشن کے بعد ملے ہوں گے۔ اُنھوں نے مارچ اپریل کے مشترکہ شمارے میں مضمون پڑھ کر خود ہی مجھے لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کروں، میں نے اُن کو لکھ دیا تھا کہ مجھے بڑی خوشی ہوگی، اس کے بعد اُنھوں نے شروع کر دیا اور پہلی قسط کا ترجمہ کر کے بھیج دیا۔

مکرر یہ کہ آپ نے جس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا ہے، اُس کو ضرور لکھیں یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ اس پر مختلف لوگوں کو لکھنا چاہیے۔

میرا حال یہ ہے کہ بلڈ پریشر اکثر بڑھا رہا ہے اور ضعف کی رفتار بھی اب تیز ہے۔ بس یہی دعا ہے: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمْرِي آخِرَهُ، وَخَيْرَ عَمَلِي خَوَاتِيمَهُ، وَخَيْرَ أَيَّامِي يَوْمَ الْفَلَاحِ فِيهِ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ يَا أَكْرَمَ الْأَكْرَمِينَ .“

آپ سے بھی دعا کا طالب اور آپ کے لیے دعا گو ہوں۔

اپنی بدخطی اور اُس کے ساتھ زونوئیسی کی کوشش کے لیے، معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۹ محرم ۱۴۰۵ھ

برادرِ محترم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام مسنون خدا کرے ہر طرح بہ عافیت ہو، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مولانا عبد اللہ عباس ندوی اس کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ وہ آپریشن سے صحت یاب ہو کر

یہاں لکھنؤ آئے تھے، قریباً دو ہفتے رہے۔

کتاب کا جو حصہ ”الفرقان“ کی تین اشاعتوں میں آچکا ہے، اُس کا ترجمہ تو انھوں نے مکمل کر کے حوالے کر دیا، اب آگے کتاب کا کر رہے ہیں اور اُن کا ارادہ جلد ہی چند ہفتوں ہی میں اس کو مکمل کر دینے کا ہے اور پھر میں چاہوں گا کہ یہیں لکھنؤ میں وہ جلد ہی چھپ بھی جائے۔

آپ جو کتاب لکھنے کا ارادہ فرما رہے تھے، اُس کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ اُس میں اگر میرے مضامین کا حوالہ دینا ہو تو ”الفرقان“ کا نہیں؛ بل کہ کتاب ہی کا دیا جائے اور اس کے لیے عربی ایڈیشن کی تیاری کا انتظار کیا جائے۔ اصل اردو کتاب کی کتابت بفضلہ تعالیٰ ہو گئی ہے، طباعت ہی کا مرحلہ باقی ہے۔ قریباً تین سو صفحات ہو گئے۔ میں اس حال میں بالکل نہیں ہوں کہ محنت کا کوئی کام کر سکوں۔ یہ کام بس اللہ تعالیٰ نے کرا دیا؛ فَلَهُ الْحَمْدُ وَلَهُ الشُّكْرُ۔

ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ ”الداعی“ میں میرے مضامین کا جو عربی ترجمہ آیا ہے، میں نے تو اُس کی صرف ایک قسط دیکھی تھی اور میں اس کا مبصر نہیں ہوں؛ لیکن سجاد میاں نے بتلایا کہ ترجمہ غالباً آپ کا نہیں ہے، کسی شاگرد سے کرایا ہوگا۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ترجمہ آپ کی اصلاح و تہذیب کا محتاج ہے؛ لیکن آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں، وہ تو خود آپ کی مستقل تصنیف ہوگی اور اُس کو تو آپ نے خود ہی لکھا ہوگا۔

میں اس حال میں ہوں کہ اس مجلس شوریٰ میں بہ ظاہر شریک نہیں ہو سکوں گا۔ مہتمم صاحب کو اس کی اطلاع بھی دے دی ہے؛ لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے سفر کے لائق کر دیا، تو ان شاء اللہ حاضری ہوگی۔ دعا گو اور دعا کا محتاج ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

کسی وجہ سے مولانا عبداللہ عباس ندویؒ، مولانا نعمانیؒ کی کتاب ”ایرانی انقلاب،

پس مرگ زندہ

امام خمینی اور شیعیت“ کی اولین قسطوں کا، جو ”الفرقان“ میں شروع شروع میں شائع ہوئی تھیں، ترجمہ کرنے کے بعد مکمل کتاب کا ترجمہ نہ کر سکے، تو مولانا نعمانیؒ نے اس ناچیز کو بھی اس کے ترجمے کا حکم فرمایا، اس سلسلے میں حذف و اضافے کے تعلق سے یاد کر قسم کی ہدایات دینے کے لیے بہت سے خطوط لکھے، جن میں سے اکثر خطوط حسب سابق اپنے قلم سے تحریر فرمائے، شاید ایک آدھ ہی خط آپ نے صاحب زادہ محترم مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی مدظلہ یا نواسہ مولانا یحییٰ نعمانی کے ذریعے املا کرائے، میں ان میں سے چند اہم خطوط کو اس لیے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ وہ تاریخی حیثیت کے بھی ہیں اور وقت کے ایک منفرد عالم دین و داعی الی اللہ کی علمی و فکری یادگار بھی، جن سے ہر اہل علم و قلم کو فائدہ اٹھانے اور تاریخ و سوانح نگاری میں ان شاء اللہ آسانی ہوگی۔

ایک خط مرسلہ ۱۹۸۴/۴/۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:

برادر عزیز و مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام و رحمت
خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں اور آنکھ کی تکلیف سے نجات مل چکی
ہو۔ آپ جیسے آدمی کا آنکھ کی تکلیف میں مبتلا ہونا، بڑی فکر کا مسئلہ ہے۔ اللہ
تعالیٰ کامل صحت و شفاء عطا فرمائے۔

مولانا علی میاں سے شیخ عبداللہ الانصاری (۱) کے بارے میں، میں نے
آپ کی بات پہنچادی تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے اُن سے اس وقت ایک مسئلے
میں شرمندگی ہے، اس لیے فی الحال میں انھیں خط لکھنا مناسب نہیں سمجھتا، جب
یہ مانع باقی نہیں رہے گا تو ان شاء اللہ لکھ دوں گا۔ میں نے تفصیل دریافت کرنا
ضروری نہیں سمجھا۔

(۱) راقم نے چاہا تھا کہ شیخ عبداللہ الانصاری ”الداعی“ کی معقول مدد کے لیے، اپنی حکومت قطر سے سفارش فرمادیں
تو رسالے کو ڈیپولپ کرنے میں مدد ملے گی۔ شیخ، قطر کے بڑے اور ذی رسوخ عالم و داعی تھے۔ وہ اور امور مذہبی
کے ذمے دار اعلیٰ بھی تھے۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

میں نے آپ کو لکھا تھا سفر (۱) سے پہلے، آپ ایک دفعہ لکھنؤ آسکیں، جیسا کہ آپ نے ارادہ ظاہر کیا تھا، تو میں ایک خط شیخ ابن باز (۲) کو خود بھی آپ ہی سے لکھاؤں گا، اُس کا تعلق دارالعلوم سے نہ ہوگا؛ لیکن وہ ان شاء اللہ آپ کے مقصد کے لیے خاص طور سے مفید ہوگا۔ اس کے باوجود اگر آپ کے پاس وقت میں گنجائش نہ ہو تو اصرار نہیں۔

اس خط کے ساتھ ہی ”الفرقان“ کا تازہ شمارہ آپ کے لیے، مولانا مرغوب الرحمن کے پاس بھیجا جا رہا ہے، اُن کے خط میں بھی لکھ دیا ہے کہ وہ آپ کو پہنچوادیں اور رسالے پر اسی لیے آپ کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اُس میں ایرانی انقلاب اور ”خمینی“ کے بارے میں جو مضمون ہے، آپ اُس کا اہتمام سے عربی میں ترجمہ فرمائیں۔ ”الداعی“ میں بھی شائع ہوتا رہے اور میں اُس کو کتابی شکل میں شائع کرانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ اصل کتاب کا ابتدائی حصہ ہے، جیسا کہ اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔
دعا گو اور دعا کا طالب۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

مولانا کی خواہش تھی کہ کتاب عربی میں شائع ہو کر، بعض اُن نئے عربوں کے لیے چشم کشا ہو، جو کسی بھی نئے نعرے سے، نوجوانانِ عجم کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی، مخمور

(۱) مراد اس سے وہ سفر ہے جو راقم نے اواخر اپریل ۱۹۸۴ء میں عمرہ کے لیے کیا تھا، اور جدہ اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ و ریاض میں طویل قیام کا موقع ملا تھا۔

(۲) شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، سعودی عرب کے اپنے دور کے سب سے بڑے مقبول و محبوب صالح عالم و خدا ترس بزرگ، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے، اُس کے قیام کے وقت سے عرصے تک وائس چانسلر رہے، پھر سپریم کلائٹس کے صدر اور ادارہٴ دعوت و قضا و افتا کے رئیس عام کے عہدے پر موت تک فائز رہے۔ اُن کی وفات بدروز جمعرات، ۲۶ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء کو ہوئی۔

پس مرگ زندہ

ہو جاتے ہیں اور پھر صحیح بات اُن کے ذہن کے کسی خانے میں جگہ نہیں لے پاتی۔

راقم الحروف یہ عربی ترجمہ مکمل ہی کیا چاہتا تھا کہ ایک روز اچانک رجسٹرڈ ڈاک سے مولانا نعمانی ہی کی طرف سے، اسی کتاب کے عربی ترجمے کا چھپا ہوا ایک نسخہ مجھے ملا، میں نے پیکٹ چاک کیا تو اُس کے سرورق پر ”الثَّوْرَةُ الْإِسْرَائِيلِيَّةُ فِي مِيزَانِ الْإِسْلَامِ“ اور مُترجم کا نام ”الدكتور سمير عبد الحميد ابراهيم“ (۱) لکھا ہوا تھا۔ چوں کہ مترجم عربی نژاد ہیں؛ اِس لیے اُن کے ادبی، علمی کمال کے اعتراف کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ وہ اُس وقت تک اردو الفاظ کے مابین دقیق فرق اور مختلف اردو تعبیرات کی نزاکتوں پر عبور حاصل نہیں کر سکے تھے؛ چنانچہ ترجمے میں خاصے نقائص راہ پا گئے تھے، بہت سی جگہ افکار و خیالات اپنی کیفیات کے ساتھ عربی میں منتقل نہیں ہو سکے تھے، کہیں کہیں مطلب بھی بدل گیا تھا۔ مولانا ذہین ترین علما میں تھے؛ اِس لیے اُنھیں یہ بات گراں گزری اور اُن کا اصرار رہا کہ راقم اپنے قلم سے ترجمے کی تکمیل کر دے؛ تاکہ کتاب صحیح شکل میں عربوں کے سامنے آ سکے، لیکن ایک عربی کے قلم سے ترجمے کے شائع و ذائع ہو جانے کے بعد، مجھے اب اپنے ترجمے کی تکمیل ”تھکیل حاصل“ سی محسوس ہوئی اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اطاعت کے بھرپور جذبے کے باوجود، میں اِس کے لیے اپنے کو تیار نہ کر سکا۔

(۱) یہ ڈاکٹر سمیر عبد الحمید ابراهيم ایک مصری فاضل اور جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض میں استاذ ہیں۔ عرصے تک پاکستان رہ کر اردو زبان محض اِس لیے سیکھی ہے تاکہ اسلامی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر سکیں۔ کئی اہم اسلامی اردو کتابیں اُن کی تعریب کردہ عالم عربی سے چھپ چکی ہیں، جن میں مولانا نعمانیؒ کی اِس کتاب کے علاوہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ تم الہا کستانی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) کی کتاب ”مقام صحابہ“ کا عربی ترجمہ بھی میری نظر سے گزر چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں اُن کی ایک محققانہ اور ضخیم کتاب ”الفاظ العربیة فی اللغة الأردیة“ آئی ہے، جس کی جمع و تالیف میں جہاں اُنھوں نے بہت سی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے؛ وہیں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی (متوفی ۱۴۱۵ھ = ۱۹۹۵ء) کی ”القاموس الجدید“ اردو سے عربی، عربی سے اردو اور ”القاموس الاصطلاحی“ وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے اور مراجع کے طور پر اُن کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ مشہور اسلامی اہل قلم ڈاکٹر عبد الحلیم عویس کے دوستوں میں ہیں، ڈاکٹر عویس چند سال پہلے تک جامعۃ الامام محمد، ریاض میں استاذ تھے، میں اُن کی مجلس میں ڈاکٹر سمیر صاحب سے مل چکا ہوں۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ
 اس سلسلے میں بھی حضرت مولانا نعمانیؒ نے ناچیز کو ایک سے زائد خطوط لکھے، وہ
 سب تو محفوظ نہیں رہ سکے؛ لیکن اُن میں سے ایک خط یہ تھا:

۶/ شوال ۱۴۱۲ھ

برادر مکرم و محترم جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب! زید لطفکم،

سلام و رحمت

خدا کرے آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں، میرا اندازہ ہے کہ جب تک میرا
 یہ عریضہ دفتر ”الداعی“ پہنچے گا آپ ماہ مبارک کی تعطیل وطن میں گزار کے واپس
 آ جائیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میری کتاب ”ایرانی انقلاب، خمینی اور شیعیت“ جب
 ”الفرقان“ میں قسط وار شائع ہوئی تھی، تو آپ نے ازراہ عنایت ”الداعی“ میں
 اُس کو عربی میں منتقل کر کے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ خیال آتا ہے غالباً دو تین
 قسطیں ”الداعی“ میں شائع ہوئی تھیں۔

مصر کے عبدالحلیم عولیس صاحب نے پوری کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا
 اور میری اجازت سے خود ہی اُس کا ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا۔ یاد آیا کہ وہ کتاب
 آپ کی نظر سے گزر چکی ہے۔

اب اصل کتاب، کافی اضافوں کے ساتھ، شائع کرانے کا ارادہ ہے۔
 اردو ایڈیشن کا کام بفضلہ تعالیٰ مکمل ہو چکا ہے۔ عربی ایڈیشن کی بھی تیاری کا ارادہ
 ہے۔ میں نے اب تک مصری ایڈیشن پر کہیں کہیں نظر ڈال لی تھی۔ اندازہ ہوا تھا
 کہ ترجمے میں نقائص ہیں، غلطیاں بھی ہیں۔ آج پہلے دن اُس کو شروع سے
 پڑھوا کر سنا، اندازہ ہوا کہ نقائص اور غلطیوں کے بارے میں جو پہلا اندازہ تھا،
 غلطیاں اُس سے زیادہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ”الداعی“ میں اُس کے ابتدائی حصے
 کا جو ترجمہ شائع ہوا تھا، اُس کو لے لیا جائے۔ آپ زحمت فرمائیں اور جن شماروں

پس مرگ زندہ

میں وہ شائع ہوا تھا، وہ رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کرادیں، ذرا جلد ہی۔
 دلی تمنا ہے کہ اردو اور عربی ایڈیشن میری زندگی ہی میں شائع ہو جائیں۔
 اس سلسلے میں اگر آپ کو کوئی زحمت دینی ہوگی، تو بعد میں عرض کروں گا۔
 میرا حال یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ زندہ ہوں؛ لیکن اللہ کی عطا فرمائی ہوئی
 قوتیں ایک خاص رفتار سے، رخصت ہو رہی ہیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ دارالعلوم
 کے خاص تعلق رکھنے والے حضرات اساتذہ سے، جن میں آپ کا ایک خاص
 درجہ ہے، الوداعی ملاقات کی غرض سے حاضری کی توفیق مل جائے۔
 اپنے حال کو دیکھتے ہوئے کچھ زیادہ امید نہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت
 اور رحمت پر نگاہ رکھتے ہوئے، مایوسی بھی نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم
 سے مُقَدَّر فرمادے۔

دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں۔

والسلام
 محمد منظور نعمانی
 بہ قلم یحییٰ نعمانی

عشق جسور و فقر غیور کی جلوہ گری

مولانا نعمانی کی تمام تصنیفات، نگارشات، اور علمی و دعوتی کاموں میں جو برکت
 نظر آتی ہے، ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے، ایسی کشش ہے جس کا سرچشمہ محض
 الفاظ کا حسن، تعبیرات کا جمال، ترکیب کی خوبی، بیان کی رعنائی، طرزِ ادا کی زیبائی، نہیں
 ہو سکتی۔ خصوصاً جب ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ اُن کے ہاں الفاظ کے بناؤ سنگار، اور تراش
 و تراش پر بالارادہ زور نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کے باوجود اُن کی چھوٹی بڑی تمام تصنیفات
 بے حد مقبول ہیں۔ اُن کے تراجم بہت مُتَدَوَّل ہیں۔ اُن کے ذریعے ہزاروں بندگانِ
 خدا کو دین کے جاننے، سمجھنے، اور اُس کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اُن

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی تالیفات اور مطبوعہ تقریریں عام مسلمانوں کے لیے، دین سمجھنے کے حوالے سے ایک عام اور ناگزیر ضرورت بن گئی ہیں: یہ سبھی چیزیں وہ ہیں جو ایک بندہ خدا، ایک مقبول بارگاہ الہی، ایک ایسے عالم ہی کی تصنیفات و اعمال میں ہو سکتی ہیں جس کو توفیق الہی کی دولت، خدا کے صالح بندوں کی صحبت، خاصان خدا کی تربیت، مقبولانِ بارگاہ الہی کی توجہات سے سرفرازی اور اُن کی خصوصی دعاؤں سے بہرہ یابی حاصل رہی ہو۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر

کوئی عالم، مصنف، اہل قلم، داعی، فقیہ، محدث، قائدِ دینی، مصلحِ اجتماعی، بل کہ ادیب، شاعر اور فن کار؛ خواہ کتنا ہی قد نکال لے؛ وہ محض علم و اطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت و ذکاوت، عقل و عبقریت، دور نگاہی و روشن خیالی کے سہارے؛ اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحر کاری، قدر افزائی و پسندیدگی کی جاذبیت پیدا نہیں کر سکتا؛ اگر اُس کے کام کا خمیر خونِ جگر، نورِ تقویٰ، تب و تابِ اخلاص، بے تابیِ عشقِ رسول، سرشاریِ محبتِ الہی، لذتِ سحر خیزی، ذوقِ عبادت اور شوقِ ریاضت سے نہ اٹھا ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو صاحبِ عمل کے لیے اور خلقِ خدا کے لیے، ذریعہ فائدہ رسانی اور باعثِ حیاتِ جاودانی بنا دیتی ہے۔

واقف ہوا گر لذتِ بیداری شب سے

اوپنی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار

مولانا نعمانی نے رائے پور (ضلع سہارن پور) کی خانقاہ اور مولانا محمد الیاسؒ کی صحبت و دعوت سے محبت کا جامِ آتشیں نوش کیا تھا؛ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے نفسِ گرم سے تاثیر حاصل کی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۳۹ھ = ۱۹۲۰ء) کی زیارت سے فیض پایا تھا؛ عارف باللہ مفتی عزیز الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۳۷ھ = ۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۲۸ھ

(۱۹۲۹ء) حکیم الامت حضرت تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ = ۱۹۴۳ء) شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء) شاہ وصی اللہ فتح پوری گورکھپوری ثم الالہ آبادیؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ = ۱۹۸۲ء) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ (متوفی ۱۴۰۱ھ = ۱۹۸۱ء) کی صحبت و معیت و علمی استفادے اور روحانی استفادے کے حوالے سے قدحِ خوار رہے تھے اور اُن کی مومنانہ نگاہ سے اپنی ”تقدیر بدلوانے“ میں مدد ملی تھی۔ محمد عربیؐ کی مدنی ہاشمی قرشیؒ کے ان عاشقانِ پاک طینت و نیک سیرت سے، سلیقہٴ عشق و محبت اور دین کے لیے جینے مرنے کا ذوق حاصل کیا تھا؛ اسی لیے اُن کی تحریر میں جولہٴ گفتار اور گرمیِ کردار ہے، وہ ہر عام و خاص کو متاثر کرتی اور گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اللہ نے اُن کی مقبولیت کا نظارہ ہم لوگوں کو اس طرح دکھا دیا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ کے مجمع نے، اُن کی نماز جنازہ ادا کی اور سخت دھوپ میں ۸ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے لکھنؤ کے ”بیش باغ“ قبرستان میں اُن کی آخری آرام گاہ تک انھیں رخصت کیا۔

مولانا کی چند خصوصیات

● مولانا ذہین اور قوی الحافظ تھے، انھیں درسی کتابوں کی عبارتیں، فقہ کے متون اور بہت سی احادیثِ زبانی یاد تھیں۔ بہ وقتِ ضرورت بالفاظِ زبانی، پڑھ جاتے تھے۔ کسی عالم کی گفتگو کو عرصے کے بعد بھی انھیں کے الفاظ میں لکھ اور بول لیتے تھے۔ (۱) واقعات و حالات کو بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیان کرنے پر بھی انھیں عجیب سی قدرت تھی، اپنے ملنے والوں کو عرصے کے بعد بھی دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ سال ہا سال سے

(۱) ”تحذیرِ نعمت“ میں ص: ۱۳۹ سے ۱۸۶ تک، حضرت تھانویؒ کی خدمتِ اقدس میں اپنی بار بار کی حاضریوں کے ضمن میں بہت سے مسائل پر حضرت کے ساتھ تبادلہٴ خیال اور گزارشات کے اپنے الفاظ اور حضرت تھانویؒ کے جوابات کے متون مولانا نے اکثر جگہ سال ہا سال کے بعد، اپنے حافظے کی مدد سے لکھے ہیں اور اکثر جگہ فرمایا ہے کہ جہاں تک یاد پڑتا ہے اصل الفاظ یہی تھے۔

داعی مقلد اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

بیماری اور کم زوری کے باوجود موت سے ذرا پہلے تک بھی، اُن کا حافظہ اور دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث و فقہ کے ساتھ، اُن کے مسلسل اور طویل اشتغال کی یہ برکت تھی۔ فقہاء اور محدثین عموماً قوی الحافظہ اور ذہین ہوتے ہیں؛ کیوں کہ قوتِ حافظہ خدائی روشنی ہے، جس سے صالحین کو سرفراز کیا جاتا ہے۔ امام شافعی کا زبان زردِ خاص و عام قطعہ ہے کہ ”میں نے اپنے استاذ حضرت وکیعؒ سے اپنے حافظے کی کم زوری کی شکایت کی تو آپ نے مجھے معاصی سے اجتناب کی تلقین کی کہ قوتِ حافظہ نورِ الہی ہے جو کسی عاصی کو نہیں دیا جاتا“ (۱)۔

● ذہانت کی بنا پر مولانا مسائل کی تہوں اور اُن کے ممکنہ گوشوں تک بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے، پھر جلد ہی اُن کے مناسب حل تک بھی اُن کی رسائی ہو جاتی تھی۔

● وہ صائب الرائے اور دور بین بھی تھے، طویل تجربات، سمجھ داری، زمانے کے نرم گرم سے مسلسل سابقہ اور زندگی کے دراز سفر نے انھیں یہ صفت عطا کی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ حساس مسائل اور ملک و ملت کے نازک معاملات میں بڑے بڑے علما و قائدین، اُن سے رجوع کرتے اور اُن کی رائے معلوم کر کے اُسی پر عمل کرتے تھے۔

● حالاتِ حاضرہ اور تقاضا ہائے زمانہ پر اُن کی گہری نگاہ تھی؛ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس مسئلے کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے اور دعوتِ دین کو عوام و خواص میں مقبول بنانے کے لیے، اس وقت کن پتھروں اور روڑوں کو ہٹانے کی فی الفور ضرورت ہے اور انھیں کس طرح ہٹایا جانا چاہیے۔ مغربی تہذیب کے نشے سے چور اور عصری تعلیم سے مخمور ذہنِ نو کو کس طرح مخاطب کیا جائے؟ خوب جانتے تھے ”عصری حسیت“ کے ماہر تھے اور حضرت علی بن ابی طالب کَرَّمَ اللہ وَجْہُہ کے حکیمانہ مقولہ

(۱) وہ قطعہ یہ ہے:

شَكُوتٌ إِلَى وَجْهِ سَوْءٍ حَفِظْتِي
فَأَرْشَدَنِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي
فَلِإِنَّ الْعِلْمَ نُورٌ مِّنْ إِلَهِي
وَنُورُ اللَّهِ لَا يُهْدِي لِعَاصِي

”كَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِمْ اَتْرِيدُونَ اَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ“ (لوگوں سے اُن کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ وہ نادانی سے اللہ و رسول کی بات کی تکذیب نہ کریں) پر اچھی طرح غمل کرنا جانتے تھے۔ اُن کی تمام تحریریں اور تقریریں اس کی شاہدِ عدل ہیں۔

● علمی مباحث ہوں، یا فرق و مذاہب، یا نظریات و رجحانات: اُن کے درمیان موازنہ اور تجزیہ ایسا کرتے کہ بڑے بڑے مدعی تحقیق کو بھی ششبی ہو جاتی اور ہر پڑھے لکھے کو اُن کی رائے دل لگتی بات محسوس ہوتی۔ باطل فرق و مذاہب اور دعوات و تحریکات، اُن کے مزاج و مذاق، اُن کے منشاے زلیغ و ضلال و طریقہٴ اضلال پر، اُن کی نگاہ ہمہ گیر تھی۔

● وہ انظہارِ حق میں بھی جبری واقع ہوئے تھے، اس سلسلے میں واقعی کسی ملامت کرنے والے کی ملامت، دوستوں کی ناراضگی اور اپنوں کے بُرا ماننے کی پروا نہ کرتے تھے، بشرطے کہ انھیں یقین ہو جائے کہ فلاں بات حق ہے، ضمیر کا یہی تقاضا ہے اور اللہ رب العزت کے نزدیک یہی پسندیدہ ہے۔ وہ پرانے کپڑوں کی طرح تبدیلیِ رائے سے بھی مکمل گریزاں تھے۔

● وہ رقیق القلب، بہ جلد آبدیدہ ہو جانے والے اور بہت گریہ کنناں تھے۔ حضور ﷺ آپ کے صحابہؓ اور صلحائے امتؓ کے تذکرے سے روئے بغیر گزرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ اپنے تمام اساتذہ و مشائخ کی یک ساں قدر کرتے تھے اور اُن کے اختصاص کے گوشوں میں اُن سبھوں سے استفادے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ہر چند کہ انھیں علامہ کشمیری، شیخ عبدالقادر راءے پوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور شیخ الحدیث زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے زیادہ مناسبت تھی اور انھیں سے زیادہ اکتسابِ فیض بھی کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے عشق

وہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے عاشقِ صادق، اُس کے مسلک کے سرگرم ترجمان،

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

بدعت و قبوریت کے لیے شمشیرِ برہنہ اور ہمارے علما کی صف میں اس سلسلے میں زیادہ واضح موقف رکھتے تھے۔ دارالعلوم سے اُن کا عشق ایک احسان مند کا اپنے محسن کے احسان اور اپنے منعم کی بخششوں کی قدر دانی سے عبارت تھا۔ وہ زندگی بھر اُس کے آتشِ عشق میں جلتے اور اُس کی محبت کی شرابِ صبحی و غبوقی پیتے رہے۔ جب تک کسی طرح بھی دیوبند آنے کی سکت باقی رہی، مجلسِ شوریٰ میں بلا ناغہ شرکت کی؛ لیکن جب طرح طرح کے امراض و اعذار نے چلنے پھرنے سے مجبور کر دیا، تو ہمیشہ اُن کی تمنا رہی کہ کاش وہ ایک مرتبہ دارالعلوم آجائیں، دارالعلوم کے در و دیوار پر ایک نگاہ کسی طرح ڈال لیں، طلبہ و اساتذہ سے آخری دفعہ ملاقات کر لیں، مجلسِ شوریٰ کے ارکان اور ذمہ داران میں حیات اپنے دوستوں کو الوداع کہہ لیں۔ دو ایک مرتبہ عشق نے جب زیادہ ستایا، تو اپنے کئی اعزّہ کے سہارے وہیل چیر پر بیٹھ کر نہ جانے کتنی مشقتوں سے ریل گاڑی کے ذریعے سفر کر کے دارالعلوم پہنچے۔

وہ آخر دم تک دارالعلوم کے اہم معاملات میں ذمہ داروں کو مشورے دیتے رہے، خصوصاً دارالعلوم کے موجودہ مہتمم مردِ صالح حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی کو، جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک مربی بزرگ اور سرپرست کو کھو کر بڑی تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف مولانا نعمانیؒ کے اس عاجز کے نام مکتوبات میں سے چند اُن خطوط کو یہاں نقل کر دے، جن سے جہاں اس کم ترین کے ساتھ اُن کی غیر معمولی شفقت و محبت کا انداز ہوتا ہے، وہیں دارالعلوم کے ساتھ اُن کے عشق بے پناہ کی بھی عکاسی ہوتی ہے، انھیں پڑھ کر قاری کو محسوس ہوگا کہ وہ ہر وقت اور ہر طرح دارالعلوم کی خیر خواہی اور بھلائی کی سوچتے رہتے تھے اور وہ دارالعلوم کے بچے اور مخلصِ فرزند تھے، جس کو دارالعلوم کے کام و مقام اور کردار کی بصیرت مندانہ آگہی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی بقاء، برصغیر میں ملتِ اسلامیہ کی اپنے تمام تشخصات کے ساتھ بقاء کا سب سے بڑا اور طاقت ور ذریعہ ہے:

۱۱ جنوری ۱۹۸۳ء

برادر مکرم! زید مجد مکرم سلام و رحمت

دسمبر کے غالباً آخری عشرے میں ”الداعی“ کا وہ شمارہ آیا تھا، جس میں آپ نے مدیر ”المجتمع“ (۱) کے نام مولانا علی میاں کا مکتوب شائع کیا تھا۔ میں نے اُس شمارے کا اکثر حصہ پڑھا تھا اور جی خوش ہوا تھا اور آپ کو خط لکھا تھا، جس میں جہاں تک یاد ہے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کو ”دین و شریعت“ اور ”انسانیت زندہ ہے“ بھیجنے کا ارادہ ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ شیخ الحدیث نمبر آپ کو نہیں ملا، تو وہ بھی ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

آپ کا خط نہ آنے سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو میرا وہ خط آپ کو نہیں ملا، یا آپ نے لکھا ہو تو وہ مجھے نہیں ملا۔ کئی ہفتوں سے ڈاک کا نظام نہایت ہی خراب ہے۔

بہر حال آج دفتر والوں نے بتایا ہے کہ وہ دونوں کتابیں اور میرا خط بہ نام شیخ محمد علی الحارکان (۲) امین عام ”رابطہ عالم اسلامی“ کی فوٹو کاپی آپ کو رجسٹرڈ روانہ کر رہے ہیں۔

میں نے آپ کو لکھا تھا کہ ”المجتمع“ میں جب پہلی دفعہ دارالعلوم

(۱) ہفت روزہ ”المجتمع“ عربی جو کویت کی ”جمعية الإصلاح الاجتماعي“ کا ترجمان ہے اور اب بھی پابندی سے شائع ہوتا ہے، اُس میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کے تعلق سے، اُس وقت بعض نامناسب باتیں شائع ہوئی تھیں۔ مولانا علی میاں نے رسالے کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے، اُس کے مدیر کو خط لکھا تھا۔

(۲) محمد علی الحارکان ۱۳۹۶ھ میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے، جس پر اپنی وفات ۸ رمضان ۱۴۰۳ھ تک برقرار رہے۔ وہ مدینہ منورہ میں ۱۳۳۳ھ = ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے، مدرسہ علوم شرعیہ (جس کو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی نے مدینہ منورہ میں قائم کیا تھا) میں ۷ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور ساری دینی تعلیم اسی میں اور مسجد نبوی میں حاصل کی۔ ۱۳۵۲ھ سے مسجد نبوی میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ ۱۳۵۶ھ میں ”العلماء“ اور ”جدہ“ کے قاضی رہے، وہ بعد میں وزیر پرنسپل بھی رہے۔ وہ بڑے عالم، انتہائی متواضع اور اچھے منتظم تھے۔

داعی ہنکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

سے متعلق وہ مضمون شائع ہوا تھا، جس پر مولانا علی میاں کا فوٹو دیا گیا تھا، تو اُس کو دیکھ کر اور غالباً رجب ۱۴۰۲ھ کے ”البلاغ“ (۱) کے انتہائی زہریلے مضمون کو بھی دیکھ کر شیخ ”حرکان“ نے مجھے بھی استفساری خط لکھا تھا، اُس کا جواب میں نے تفصیل سے سجاد میاں سلمہ سے لکھوایا تھا، یہ اُس کی فوٹو کا پی ہے جو آپ کو بھیجی جا رہی ہے، آپ اِس کو ”الداعی“ میں شائع کر سکتے ہیں۔ مولانا علی میاں کا جو مکتوب آپ نے شائع کیا ہے، اُس کی فوٹو کا پی بھی میرے پاس تھی، وہ بھی ساتھ میں رکھ دی گئی ہے۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

گذشتہ مہینے مولانا وحید الزماں صاحب (۲) کا عنایت نامہ ملا تھا کہ مجھے آپ کا خط مل گیا ہے، اِن شاء اللہ اگلے مہینے لکھنؤ آنے کی کوشش کروں گا؛ لیکن اگلا مہینہ جنوری شروع ہوا تو اپنے ساتھ ایسی سر دلہر لے کر آیا کہ ایسے میں بس اشد ضروری وہی کام کیے جاسکتے ہیں جو لحاف میں بیٹھ کر کیے جاسکتے ہوں۔ امید ہے کہ موسم کے معتدل ہونے پر مولانا موصوف سے ملاقات ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اُن کو کامل ہمت و توانائی عطا فرمائے اور دارالعلوم کو اُن کی صلاحیتوں اور قیمتی وجود سے نفع پہنچائے۔ دارالعلوم کا بڑا قابل فکر مسئلہ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کی جو اصل میراث تھی: اخلاص و تقویٰ اُس سے ہم خالی ہو گئے ہیں اور بہت ہی پست قسم کے جذبات و اغراض نے ہم پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں خود اپنا جائزہ لیتا ہوں تو میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی نہیں ہے، وہ مُردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔

اعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ يَبْصِرُ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت سے

(۱) ہفت روزہ ”البلاغ“ عربی زبان میں کویت سے نکلتا ہے، اُس میں اُس وقت دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

(۲) متوفی: ۱۴۱۵ھ = ۱۹۹۵ء

پس مرگ زندہ

دارالعلوم کو وہی بناوے جو اُس کو ہونا چاہیے۔ یہ عاجز دعا گو اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

فروری ۱۹۸۳ء، ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ میں اس عاجز کو پہلی بار سعودی عرب جانے اور حرمین شریفین کی زیارت و عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ جامعۃ الملک سعود ریاض میں غیر عربوں کو عربی زبان کی تدریس کا کام کرنے والے اساتذہ کے لیے، وہاں تین ماہ کے مختصر ٹریننگ کورس میں حاضری، اس سعادت کے حصول کی تقریب بنی۔ وہاں قیام کے دوران اندازہ ہوا کہ عالم عربی میں دارالعلوم کے تعارف کی شدید ضرورت ہے؛ کیوں کہ یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی دارالعلوم سے شاید و باید ہی واقف ہے۔ اس خواہش کا اظہار ایک عریضے میں حضرت مولانا نعمانی سے تفصیل سے کیا گیا اور سعودی عرب کے لیے بہ طور خاص ایک موقر وفد بھیجے جانے کی بات کہی گئی، جس میں مولانا حبیب الرحمن عظمیٰ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) مولانا اکبر آبادی (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء - ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء)، حضرت الاستاذ مولانا کیرانوی (۱۳۳۹ھ/۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء) وغیرہ کے شامل ہونے کی نشان دہی کی گئی، مولانا نعمانی نے اُس کے جواب میں یہ مکتوب جامعۃ الملک سعود کے اُس وقت کے معہد اللغة العربیة کے پتے: پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷۴، ریاض، نزد وزارت دفاع، مطار اسٹریٹ پر ارسال فرمایا۔

از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء

برادرِ مکرم! زید مجدکم، سلام و رحمت

قریباً ایک مہینہ ہو گیا ہوگا، آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا تھا، اُس میں سب سے اہم بات وفد دارالعلوم کی عرب ممالک کے دورے سے متعلق

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس بارے میں مولانا مرغوب الرحمن صاحب سے گفتگو کر کے آپ کو متعین جواب لکھ سکوں، گذشتہ مہینے سے اُن کی آمد کا انتظار تھا؛ لیکن وہ اب آسکے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن کی طبیعت ناساز چل رہی ہے اور آپ نے بھی لکھا ہے اور میں بھی اُن کی شرکت ضروری سمجھتا ہوں۔ اُن کے علاوہ مولانا اکبر آبادی کو ہندوستان کے خاص شہروں کے دورے پر جانا ہے، اُس کے بعد رمضان سے پہلے وقت نہیں رہتا۔ بہ ظاہر اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو عرب ممالک کا دورہ آئندہ سال ہی ہو سکے گا۔ آپ بھی غالباً کو قریب ہی آنے والے ہوں گے۔ امید ہے کہ آپ کا یہ قیام خود آپ کے لیے بھی اور دارالعلوم اور جماعت کے لیے بھی مفید ہوگا۔ اب بفضلہ تعالیٰ اس حال میں ہوں کہ ضروری خطوط خود ہی لکھتا ہوں، اگرچہ مختصر ہی لکھ سکتا ہوں۔ آپ سے بھی مختصر نویسی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی دل میں خاص جگہ ہے۔ خدا کرے کہ آپ حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت حاصل کر چکے ہوں۔ دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

۶/شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء بہ روز یک شنبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات کا واقعہ پیش آیا، جس نے پوری جماعتِ دیوبند کو شکستہ کر کے رکھ دیا، اس موقع سے مولانا نعمانیؒ نے مندرجہ ذیل مکتوب ناچیز کے نام ارسال فرمایا، جس سے دارالعلوم کے تعلق سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی اور حکیم الاسلامؒ سے اُن کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے:

لکھنؤ، ۹/شوال ۱۴۰۳ھ

پس مرگ زندہ

برادر عزیز و مکرم! زید مجدکم، سلام و رحمت

عنایت نامہ ماہ مبارک کے عشرہ اخیر میں بل گیا تھا، میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان دنوں میں جو خطوط آئیں گے، اُن کا جواب یا اطلاع: رسید بعد عید ہی دے سکوں گا۔ ڈاک کا ڈھیر ہے، جس کو دیکھ کے بھی ڈر لگتا ہے، چھو بھی نہیں سکا ہوں۔

اس وقت آپ کو صرف اطلاع: رسید دے رہا ہوں۔ جو کچھ آپ نے لکھا تھا، اُس پر زبانی ہی بات ہو سکے گی، جب بھی اللہ موقع دے۔ (۱) قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا حادثہ، میرے لیے بہت رنج و دکھ کا باعث ہوا، کاش ہم اب سے دو سال پہلے اٹھا لیے گئے ہوتے لَئِنِّي مِتُّ قَبْلُ وَكُنْتُ نَسِيسًا مِّنْهُمْ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَاعْفُ عَنْهُ۔

یہ عریضہ ایسے وقت ملے گا کہ دارالعلوم کھل چکا ہوگا، اس وقت وہاں کی جو صورت حال ہے، خاص کر قاری صاحب کے حادثے کے بعد جو فضا ہے اور جو ہو رہا ہے، وہ مجھ کو ضرور لکھ دیجیے۔ میں یہ زحمت صرف آپ ہی کو دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مختصر مختصر جملوں میں حتی الوسع پوری صورت حال لکھ دینے کی کوشش کیجیے۔ میں منتظر رہوں گا۔ حتی الوسع جلدی ہی۔

میں ان شاء اللہ اپنے احساسات ”الفرقان“ میں لکھنے کی کوشش کروں گا، جو امید ہے کہ ۱۰-۱۲ دن میں شائع ہو جائے گا۔ ڈاک کا آخری وقت ہے، انتہائی عجلت میں یہ سطریں گھسیٹ رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

حکیم الاسلام کی وفات کے بعد دارالعلوم اور دیوبند کی صورت حال ناچیز نے

(۱) میں نے دارالعلوم کے احوال اور نئی انتظامیہ کے مکمل طور پر قدم نہ بجا پانے کی وجہ سے رسائی، آپسی اختلاف اور اپنی الجھنوں اور دلی بے کفی کا تذکرہ، مولانا کے نام اپنے عریضے میں کیا تھا، مولانا نے اُسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

داعی مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ
تفصیل سے حضرت مولانا نعمانیؒ کو لکھی، تو اُن کا مندرجہ ذیل جواب آیا:
”دکھنؤ، ۱۹/ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ = ۳۰/ جولائی ۱۹۸۳ء

برادرِ مکرم و محترم! اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ وَاِلَيْنَا، سلام و رحمت
آپ کا مفصل مکتوب مورخہ ۲۷/۷/۱۹۸۲ء آج مل گیا، بڑی غیر معمولی
سی بات ہے، آج کل یہاں ڈاک کا حال اتنا خراب ہے کہ دیوبند اور دوسرے
بعض قریبی مقامات کے خطوط دو دو ہفتے میں ملتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، آپ نے بڑی تفصیل سے صورتِ حال
لکھ دی، مجھے اس کے معلوم کرنے کی بڑی ضرورت تھی، اس وقت ان سطروں
کے ذریعے، صرف اطلاع: رسید لکھ رہا ہوں؛ تاکہ آپ کو اطمینان ہو۔

آپ کی نظر سے مئی، رجب کا شمارہ نہیں گزرا، اُس میں غازی احمد
صاحب اور اُن کی آپ بیتی ”من الظلمات اِلی النور“ کا تعارف کرایا تھا۔
اُس میں، میں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ ملک کی تقسیم سے پہلے ایک طالبِ علم
کی حیثیت سے قریباً ڈیڑھ سال اپنے دارالعلوم میں بھی رہے ہیں۔ (۱)

مجھے تو اُن کے بارے میں شک و شبہ ہوتا؛ لیکن اُنھوں نے کتاب
میں جن حضرات کا ذکر کیا ہے، اُن میں کئی ایک میرے دوستوں میں ہیں اور
حیات ہیں۔ اس سلسلہ ”منتخبات“ کی دوسری قسط اگست کے شمارے میں
آ رہی ہے، جو ان شاء اللہ اس ہفتے میں روانہ ہو جائے گا۔

کتاب کی اشاعت کا بھی ارادہ ہے۔ میں نے اُن کو لکھ بھی دیا ہے۔

(۱) راقمِ سطور نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کر کے ”الداعی“ میں قسط وار شائع کیا، بعد میں یہ عربی ترجمہ راقم کے
کرم فرماؤ اکثر عبدالحلیم عویس مصری، سابق استاذ جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، نے ریاض کے ایک مکتبے اور اپنے
مکتبہ ”دار الصحوۃ“ قاہرہ کے اشتراک سے بڑے اہتمام سے شائع کیا، جس کا نام اُنھوں نے ”مَنَاسِدُ شَاہِدِ
هِنْدُوْسِيٍّ اِغْتَنَقَ الْاِسْلَامَ“ رکھا۔

پس مرگ زندہ

میری اُن کی اب خط کتابت ہے۔ بڑی غیر معمولی شخصیت کا انکشاف ہوا۔ اسلام لانے کے بعد اُنھوں نے عربی شروع کی اور ہمارے قدیم مدرسوں کے طرز پر پورا وقت صرف کر کے درس نظامی کی تکمیل کی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی، فاضل اور پھر بی اے، ایم اے بھی کیا۔

اگست ہی کے شمارے میں مرحوم مہتمم صاحب (قاری محمد طیبؒ) کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے۔ خدا کرے جلد ہی روانہ ہو جائے اور جلد ہی آپ کو بھی مل جائے۔ پریس میں ہے، غالباً کل یا پرسوں چھپ جائے گا۔ مگر یہ کہ آپ کی اس زحمت کشی سے کہ پوری تفصیل سے صورت حال لکھ دی بڑی خوشی ہوئی۔ جَزَاكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ آگے کے لیے بھی مُکَلَّف کر رہا ہوں کہ کوئی خاص بات قابلِ اِطّلاع ہو تو، مطلع کرنے کی زحمت فرمایا کریں۔ خدا کرے ہر طرح عافیت ہو اور اس عاجز کو بھی عافیت نصیب کرے۔

دعا گو اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

دارالعلوم کے سلسلے میں دردمندی و فکر مندی، مولانا نعمانیؒ کا علمائے معاصرین میں امتیازی وصف تھا؛ اسی لیے اپنی معذوری، شدید کم زوری اور بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے اُعدا کی وجہ سے جب وہ مجلس شوریٰ میں شرکت سے اپنے کو معذور سمجھنے لگے، تو اُنھوں نے اُرکان و ذمے دارانِ دارالعلوم سے شوریٰ کی رکنیت سے سبک دوش کر دینے کی درخواست دی، جو اُنھوں نے اُن کے دارالعلوم سے بے پناہ تعلق کی وجہ سے منظور نہیں کی۔ ایک مکتوب میں مولانا نے اس راقم کو لکھا:

”از لکھنؤ، ۶ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

برادر عزیز و مکرم! زید مجدکم، سلام و رحمت

عنایت نامہ مؤرخہ ۲۹ رزی الحجہ ۱۴۰۶ھ موصول ہوا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ کو واپسی میں تاخیر ہوگئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ وہ کتاب (۱) اب تک بھی کہیں سے نہیں آسکی ہے، اُس کے دو چار نسخے آجائیں، تو ان شاء اللہ ایک نسخہ آپ کو ضرور بھیجوں گا۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اب اکثر صفر میں ہوتی ہے، میں امید نہیں کرتا کہ شرکت کے لیے سفر کر سکوں گا، شاید آپ کو مولانا وحید الزماں صاحب کے ذریعے، یا کسی اور ذریعے سے معلوم ہوا ہو، گذشتہ مجلس شوریٰ منعقدہ شعبان میں، میں نے اصرار سے حضرات ارکان کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اب میں سفر کے لائق نہیں رہا، ایسی صورت میں رکنیت کی جگہ گھیرے رہنا میں صحیح نہیں سمجھتا؛ اس لیے میرا استعفا قبول فرمایا جائے، ممکن خدمت سے ان شاء اللہ دریغ نہ ہوگا؛ لیکن قبول نہیں فرمایا گیا۔ بہر حال اس حال میں ہوں کہ شرکت کا امکان بہت کم ہے۔ فی الحقیقت اب میں سفر سے معذور ہو گیا ہوں۔ معذوری اور ضعف کے علاوہ اب گھٹنوں میں بھی تکلیف ہوگئی ہے۔

دعا گو اور دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی

بہ قلم محمد ضیاء الرحمن

سعودی عرب کے ایک سفر کے دوران راقم کو شدید کم زوری، بہت پیاس اور بار بار پیریشاب کا تقاضا ہونے، نیز ہونٹ وغیرہ کے خشک رہنے اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے

(۱) مراد اس سے مولانا کی کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ کا عربی ترجمہ ہے جو ڈاکٹر سمیر عبد الحمید البرہیم مصری استاذ جلد۱ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض نے، ڈاکٹر عبد الحلیم عیسیٰ مصری استاذ جلد۲ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے ایما پر کیا تھا، اور آخر الذکر نے اپنے تجارتی ادارے ”دار الصحوۃ، القاہرہ“ سے شائع کیا تھا۔

پس مرگ زندہ

سائنس لینے میں پریشانی کا احساس ہوا۔ ہندوستان واپسی پر راقم نے سب سے پہلے اس صورت حال کا تذکرہ اپنے مشفق و مربی استاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی سے کیا، انھوں نے سنتے ہی فرمایا کہ یہ تو شکر کے مرض کی علامتیں ہیں، تم فوراً دہلی جاؤ اور جہاں میں شکر کے عوارض کے تئیں ڈاکٹر سے علاج و مشورہ کرتا ہوں، وہاں اس کا ٹسٹ کراؤ۔ راقم نے اُن کے حکم کے مطابق جیون نرسنگ ہوم، مہارانی باغ، دہلی میں ڈاکٹروں سے رجوع کیا، ٹسٹ کے بعد شکر ہی کا مرض ثابت ہوا۔ بہت تشویش ہوئی، راقم نے دوا کے ساتھ ساتھ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے دعا کی درخواست کے لیے عریضے لکھے، جن میں حضرت مولانا نعمانی ”سرفہرست تھے، حضرت کا اس سلسلے میں یہ شفقت نامہ شرفِ صدور لایا:

۱۳ ستمبر ۱۹۸۷ء

بردارِ مکرم و محترم جناب مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام

ورحمۃ

تاروقت پر مل گیا تھا، بل کی ڈاک سے ۱۳ محرم ۱۴۰۷ھ کا لکھا ہوا عنایت نامہ ملا، اسے پڑھ کر آپ کے بارے میں فکر و تشویش پیدا ہو گئی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں، آپ پر کسی کام کا بار نہیں ڈالا جاسکتا؛ بل کہ دارالعلوم کا جو کام آپ سے متعلق ہے، اُن میں بھی آپ کو تخفیف کرنی پڑے گی، یہی سنا ہے کہ اس مرض میں جسمانی اور دماغی آرام و سکون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ امید ہے کہ پورے اہتمام سے آپ علاج کر رہے ہوں گے۔ یہ عاجز دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد ہی شفاء عطا فرمائے۔

اب سے قریباً بیس سال پہلے پیشاب اور خون کے ٹسٹ سے میرے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا، علاج بھی اہتمام سے کیا، پرہیز بھی بہت سخت رہا۔ یاد آتا ہے کہ چھ مہینے تک کسی قسم کا میٹھا استعمال نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

فضل فرمایا اور مرض کا اثر نہیں رہا۔

بہ ظاہر ابھی مرض کا آغاز ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی کثرت
ہو جائے گا۔ خود بھی دعا کا اہتمام فرمائیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی دعا کے اہتمام کی
برابر توفیق عطا فرمائے اور اپنے کرم سے قبول فرمائے۔ یہ عاجز خود بھی دعا کا
محتاج و طالب ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

راقم کے ایک عریضے کے جواب میں حضرتؒ نے جو مکتوب ارسال فرمایا، اُس سے
جہاں اس ناچیز کے ساتھ، اُن کی حد درجہ محبت و شفقت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اُن کی
للہیت، انابت الی اللہ، آخرت کے لیے تیاری اور اپنے رب سے انتہائی اچھی حالت
میں جاننے کی اُن کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے، اسی کے ساتھ دارالعلوم سے اُن کے
غیر معمولی قلبی تعلق کا بھی عندیہ ملتا ہے:

۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

برادر محترم و مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام و رحمت
خدا کرے آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں۔ اخلاص نامہ کل ملا، اب سے
کئی مہینے پہلے ایک عنایت نامہ ملا تھا؛ لیکن اُس میں اطلاع تھی کہ آپ غالباً باہر
کے سفر پر جا رہے ہیں؛ اس لیے میں اُس کا جواب نہیں لکھا سکا، حال آں کہ دل
میں داعیہ تھا کہ آپ کو جواب لکھا دوں۔

آپ نے حال دریافت کیا ہے، عمر کے ساتھ قدرتی طور پر ضعف بڑھ رہا
ہے۔ بفضلہ تعالیٰ کوئی خاص بڑی اذیت نہیں ہے۔ آپ کے لیے دعا کرتا ہوں
کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے فضل سے اور آخرت میں اپنی رحمت سے نوازے۔ خود
دعاؤں کا سخت محتاج ہوں۔ اب سب سے بڑی حاجت یہ ہے کہ زندگی

پس مرگ زندہ

کے جودن باقی ہیں، ایمان، اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر اور سیئات و معاصیات سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ، پورے ہو جائیں۔ حسن خاتمہ نصیب ہو اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادے۔

یاد آتا ہے کہ آپ نے کئی مہینے پہلے والے اپنے خط میں، کوئی خاص بات کرنے یا لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ (۱) اگر دل میں کوئی داعیہ ہو تو بے تکلف تحریر فرمادیں۔ ویسے اب میں اس حال میں ہوں کہ اس کی کوئی امید نہیں ہے کہ جلسہ شوریٰ میں شرکت کے لیے سفر کر سکوں، اس سے پہلے جب آخری دفعہ حاضر ہوا تھا تو اصرار کے ساتھ ارکان شوریٰ: اپنے رفقا سے عرض کیا تھا کہ اب میں سفر سے بالکل معذور ہو چکا ہوں، ایسی حالت میں، میں اپنے لیے درست نہیں سمجھتا کہ رکعت کی جگہ گھیرے رہوں، معذور سمجھ کر استعفا قبول فرمایا جائے؛ لیکن اُن حضرات نے، اُس کو منظور نہیں فرمایا، اسی پہ اصرار کیا کہ رکعت کا تعلق برقرار ہے، آنا نہ ہو سکے تو آپ معذور ہیں۔ اگرچہ میں اپنے حق میں اس کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا؛ لیکن میرے اختیار میں، اتنا ہی تھا کہ میں نے لکھ کر دے دیا اور زبانی بھی اصرار کیا۔ قلبی تعلق اور فکر و دعا میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اب اگر کبھی وطن کی طرف آپ کا سفر ہو، تو بہ شرط امکان و سہولت لکھنؤ اُتر کر ملاقات فرمائیں؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دارِ آخرت میں اپنے جوارِ رحمت میں ہمیں آپ کو جمع فرمادے۔ اُس کی رحمت سے یہی امید ہے۔

اس کی شکایت ہے کہ آپ نے جوابی لفافہ بھیجا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد منظور نعمانی

(۱) حضرت مولانا کو قافو قنادار العلوم کی بھلائی کی خاطر بعض تجویزیں اور دارالعلوم کے تازہ حالات کی روشنی میں بعض آرا لکھا کرتا تھا، اس طرح کی کوئی بات، راقم نے لکھنے کے لیے اشارہ کیا ہوگا کہ بعد کے کسی عریضے میں لکھوں گا۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ناچیز کے ایک عریضے کے جواب میں مولاناؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا، اُس سے عیاں ہے کہ انھیں ہر وقت دارالعلوم کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور عمر کے آخری مرحلے میں اپنی معذوری کے بعد شوریٰ میں شریک نہ ہو پانے کا بہت افسوس تھا، انھیں ہمیشہ یہ تمنا رہتی تھی کہ کسی طرح دارالعلوم پہنچ کر اُس کی شوریٰ کے کسی جلسے میں شریک ہوں اور اپنے رفقا سے الوداعی ملاقات کر کے دارالعلوم کے حوالے سے انھیں آخری وصیت کر سکیں؛ لیکن اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور جب تک ہوش میں رہے، خطوط کے ذریعے بعض تجویزوں کی ترسیل ہی پر اکتفا کرتے رہے:

از طرف حضرت مولانا نعمانی دامت برکاتہم

لکھنؤ، ۱۱ جنوری ۱۹۹۲ء

برادرِ مکرم و محترم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب! زید محمد

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ میرے عریضے کے جواب میں، کل موصول ہوا۔ آپ نے جو صورتِ حال لکھی ہے، معلوم کر کے افسوس ہوا۔ یہ معلوم کر کے ایک درجے میں خوشی ہوئی کہ آپ کو بھی اِس بوڑھے کی طرح اِس تغیر پر رنج و ملال ہے۔ خود اپنے بارے میں غور کیا تو محسوس ہوا کہ ہم بھی کسی نہ کسی درجے میں، اسی میں مُلَوّث ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اپنی تطہیر کی فکر کریں۔

معلوم ہوا کہ چند ہی روز پہلے دارالعلوم کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ ہوا تھا، اُس میں طے کیا گیا ہے کہ گذشتہ سالوں کے فارغین کی دستار بندی کا جلسہ، جو برابر ٹلتا رہا ہے، اِس سال شعبان میں تین سال کے فارغ طلبہ کی دستار بندی کا اجلاس کر لیا جائے، اُس سے ایک دو دن پہلے شوریٰ کا بھی اجلاس ہوگا۔ میں بہ ظاہر اِس حال میں نہیں ہوں کہ شعبان میں سفر کے قابل ہو سکوں۔ اِس کے باوجود دل میں تمنا ہے اور دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے

پس مرگ زندہ

مجھے سفر کے لائق کر دے، تو اس موقع پر دارالعلوم پھنچ سکوں اور اپنی علمی برادری سے کچھ الوداعی باتیں کر سکوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو امید ہے کہ نیت کے ثواب سے محروم نہ رہوں گا۔ آپ بھی دعا فرمائیں۔

والسلام

بہ قلم یحییٰ نعمانی

خداے پاک انھیں اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے جوار میں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اُن کے تمام اَعْرَاضِ مُتَعَارِفِین، رُفَقَا، دعا گو اور مُجْتَہِدِین و مُتَعَقِّدِین کو صبر جمیل و اَجْرِ جزیل سے نوازے۔ آمین۔

مولانا محمد منظور نعمانی ایک نظر میں

✽ اسم گرامی: (مولانا) محمد منظور نعمانی

✽ ولادت: ۱۸ اشوال ۱۳۳۳ھ مطابق: ۱۸ نومبر ۱۹۰۵ء

✽ جائے پیدائش: سنہیل، ضلع مراد آباد، یوپی

✽ ابتدائی تعلیم: سنہیل، و مدرسہ عبدالرب، دہلی

✽ متوسطات: دارالعلوم مئو ناتھ بھجن، یوپی

✽ اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم دیوبند، یہاں وہ ۱۳۴۳ھ میں داخل ہوئے اور دو سال تعلیم حاصل کی ۱۳۴۵ھ میں فارغ ہوئے، دورہ حدیث شریف میں سارے طلبہ میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

✽ تدریسی خدمات: دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۳ سال ”امروہہ“ ضلع مراد آباد، حال ضلع ”جپی نگر“ یوپی کے مدرسہ چلہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، اُس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۴ سال شیخ الحدیث رہے۔

✽ الفرقان کا اجرا: ۱۳۵۳ھ = ۱۹۳۴ء میں بریلی سے ”الفرقان“ رسالہ ماہ وار جاری کیا۔ (شرع شروع میں رسالے کا رنگ منظراتی تھا، ۱۹۴۲ء = ۱۳۶۱ھ سے یہ ایک علمی اور دینی دعوتی رسالے میں تبدیل ہو گیا۔

داعی مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

✽ تبلیغی جماعت سے وابستگی: ۱۳۳۳ھ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی و دعوتی تحریک سے وابستگی اختیار کی جو موت تک باقی رہی۔

✽ مجلس شوریٰ دارالعلوم کی رکنیت: ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور وفات تک اِس منصب پر فائز رہے۔

✽ رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ: رابطہ عالم اسلامی کے قیام کے چند سال بعد سے ہی ۱۹۶۵ء سے تاسیسی رکن رہے۔

✽ رکن مجلس منظمہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ: اِسی کے ساتھ وہ تاحیات دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شوریٰ کے بھی رکن رہے۔

✽ راہِ سلوک: حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا عبدالقادر راے پوریؒ کے ممتاز خلفا اور اہل دل بزرگوں میں تھے۔

✽ شانِ امتیاز: مولانا دیوبند کے ممتاز فضلا اور علامہ کشمیریؒ کے نمایاں شاگردوں میں تھے، اُنھوں نے تقریر و تحریر کے ذریعے اہل بدعت، قادیانیوں اور باطل تحریکوں کے نمائندوں سے بڑے بڑے مناظرے کیے۔ اُن کی زبان اور علم دونوں میں بے انتہا سادگی اور سہلِ منتفع کا رنگ غالب تھا، اُنھوں نے جو تحریر و تالیفی اثاثہ چھوڑا ہے، وہ علمی و فکری و دعوتی سرمایے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اتنی آسان، شستہ، برجستہ، سادہ؛ لیکن زبان و ادب کے اسلوب پر مکمل اُترنے والی زبان میں، اُن کے ہم عصر علمائے دیوبند میں سے کسی کا اتنا سارا علمی و دینی، فقہی و دعوتی کام نظر نہیں آتا۔

اُنھوں نے اپنے قلم و زبان سے پوری نسل کو متاثر کیا ہے، کسی مؤرخ، اہل قلم، اور علمی و ادبی، فکری و دعوتی کام کا جائزہ لینے والے کے لیے، اُنھیں ممتاز مقام دیے بغیر چارہ کار نہیں۔

✽ وفات: یک شنبہ و دو شنبہ: ۲۶-۲۷ رذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۳-۵ مئی ۱۹۹۷ء کی درمیانی شب میں تقریباً ۸۰ بجے اُنھوں نے لکھنؤ میں جانِ جانِ آفریں کے سپرد کی۔

✽ مولانا کی اہم تالیفات

۱- اسلام کیا ہے؟ ۲- دین و شریعت ۳- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ ۴- معارف الحدیث ۷ جلدیں ۵- اَلْفِیۃُ الْحَدِیث (عربی زبان میں، جو دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے) ۶- نماز کی حقیقت ۷- ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت ۸- کلمہ طیبہ کی حقیقت ۹-

پس مرگ زندہ

برکاتِ رمضان ۱۰- حج کیسے کریں؟ ۱۱- تذکرہ مجدد الف ثانی ۱۲- حضرت شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہل بدعت کے الزامات ۱۳- ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ۱۴- قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ۱۵- قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ۱۶- بَوَارِقُ الْغَيْبِ عَلٰی مَنْ يَدْعِي لَغَيْرِ اللَّهِ عِلْمَ الْغَيْبِ: مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ ۱۷- دیوبند و بریلی کے اختلاف و نزاع پر فیصلہ کن مناظرہ ۱۸- نزولِ مسیح کے سلسلے میں قولِ صحیح ۱۹- سیفِ ایمانی برفرقہ رضا خانی ۲۰- تحریک ”خاکسار“ کتاب و سنت کی روشنی میں ۲۱- تصوف کیا ہے؟ ۲۲- مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا مؤقف ۲۳- شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علمائے حق پر اُس کے اثرات ۲۴- دینی مدارس کے طلبہ سے: آپ کون ہیں، کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟ ۲۵- کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت ۲۶- مسئلہ حیات النبی کی حقیقت ۲۷- تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات ۲۸- عقیدہ علم غیب ۲۹- نماز اور خطبہ کی زبان ۳۰- انسانیت زندہ ہے ۳۱- میری طالب علمی ۳۲- قرب الہی کے دور استے ۳۳- تحدیثِ نعمت: کتابِ زندگی کے کچھ صفحات۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الدامی“ عربی شمارہ ۲، جلد ۲۱، صفر ۱۴۱۸ھ = جون - جولائی ۱۹۹۷ء - اردو تحریر: بہ قلم خود ۱۸ بجے صبح شنبہ ۳ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ = ۵ اگست ۱۹۹۷ء۔

داعی الی اللہ

مولانا محمد عمر پالن پوری^(*)

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۹ء — ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء

جلس، خصوصیت
نقطہ پر کارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عظیم سلف کے عظیم خلف

داعی اسلام و بانی تبلیغی تحریک و ترجمانِ دین حنیف حضرت مولانا محمد الیاس صاحبِ قدس سرہ (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء) اور اُن کے عظیم صاحبِ زادے و سچے جانشین حضرت مولانا محمد یوسف صاحبِ کاندھلوی (متوفی ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء، مؤلف کتاب ”حیات الصحابہ“ کی زیارت کا شرف راقم الحروف کو حاصل نہیں؛ کیوں کہ اول الذکر کی وفات، راقم کی پیدائش (۱۲/۱۲/۱۹۵۲ء) سے دس سال قبل واقع ہوئی اور ثانی الذکر کی رحلت کے وقت، اُس کا بچپنا تھا؛ اِس لیے وہ ان داعیوں کو دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکا۔

البتہ شعور کی زندگی میں ان دونوں شخصیات کے تعلق سے، سننے اور پڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔ ان کا صلاح و تقویٰ، دعوت و تبلیغ میں فنائیت، مسلمانوں کی ناگفتہ بہ دینی

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی جاوید اشرف مدھے پوری قاسمی، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۹۷ء تک و اضافہ بہ وقت اشاعت اِس مضمون بہ شکل کتاب ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء، بہ قلم مضمون نگار۔

حالت پر اُن کی بے قراری، سوزِ دروں اور وارفتگی، اور امتِ مسلمہ کو محض دنیاوی تکلفات و اہتمامات اور توہمات سے ہٹا کر، از سر نو دین کی راہ اور آخرت کی فکر پر لگانے کے، اُن کے عجیب و غریب؛ لیکن سچے واقعات، کثرت سے، باوثوق ذرائع و معتبر اشخاص اور سچی زبانوں سے سننے میں آئے۔ جس کے بعد یہ یقین کرنا پڑا کہ یہ دونوں حضرات امت کے لیے خدا کی دین تھے، اُن کو خاص اسی لیے بنایا اور مامور کیا تھا کہ وہ غفلت میں مست، اس امت کو بیدار کریں۔ امت کو دین کی ڈگر پر لگانے، ایمان کی بہار لانے، فنایت کی حد تک، اللہ سے تعلق اور لو لگانے اور بہ قول شاعر مشرق علامہ اقبال: بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے جانے کے باب میں، ان کو جو درک حاصل تھا، وہ انھی کا حصہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ انھیں قدرت نے اپنے دستِ خاص سے، ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا تھا؛ تاکہ یہ پوری امت کے دل میں اس بات کا شعور و احساس پیدا کریں کہ اُسے از سر نو، اپنے دل پر قلعی اور اپنے ایمان کی بیٹری چارج کرانے کی ضرورت ہے، اپنی اور پھر دوسروں کی اصلاح اور دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اس میں دقیقہ بھر تاخیر کی گئی تو یہ امت ذلت و خواری کی اُس پستی میں گر جائے گی، جس سے نکلنا شاید کبھی نصیب نہ ہو۔ ہاں یہی پاکیزہ احساس امت کے دل میں پیدا اور بیدار کرنا، ان کی زندگی کا اولین و آخری مقصد تھا، جس کو ان کی ذاتِ بابرکات سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ان حضرات کی مجلسیں اور اجتماعات تیر بہ ہدف ثابت ہوتے، دلوں سے نکلنے والی، تسنیم و کوثر سے دھلی ہوئی، سادہ باتیں، دلوں تک اپنا راستہ بنا لیتیں اور رگ و پے میں سرایت کر جاتیں، ان کی تقریروں میں بجلی کی تاثیر اور پارس کی خاصیت تھی کہ کوئی ہو، کہیں کا ہو، انھیں سنا نہیں کہ کندن بن گیا۔

الحاصل اسوۂ نبوی میں ڈھلے ہوئے اور دستِ نبوی کے بہ راہِ راست پروردہ صحابہ کرامؓ اور اُن کے بعد ائمہ عظام اور مشائخ و مصلحین امت کے نقشِ قدم پر چلنے والے

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالن پوریؒ

ان حضرات کو، گو دیکھنے کا موقع نہیں ملا؛ لیکن سننے اور پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ البتہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے شاگرد رشید، پیکر زہد و تقویٰ مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ (جن کے متعلق یہاں اظہارِ تاثر مقصود ہے) کو دیکھنے، سننے، برتنے اور اُن کی صحبت میں بعض دفعہ بیٹھنے کا شرف راقم کو حاصل ہے۔ وقتاً فوقتاً اُن کی مجلسوں میں شرکت کے ذریعے، ایمان کوتاہ کرنے اور ”اجلسُ نَوْمٍ سَاعَةً“ کی سعادت سے سرفراز ہونے کا کئی دفعہ موقع ملا ہے۔

مولانا کی پہلی پُر درد تقریر کی سماعت اور اُس کی لذت و حلاوت

زمانہ طالب علمی کا واقعہ ہے، ۱۹۷۱ء کی کوئی شام تھی، اپنے رفیق درس مولانا محمد برہان صاحب مرزا پوری، سہارن پوری پروفیسر طبیبہ کالج جے پور کے ساتھ، مرکزِ جماعت تبلیغ، بنگلہ والی مسجد بستی نظام الدین اولیا، نئی دہلی، کے ارادے سے نکلا، پہنچے تو مغرب کی نماز تیار تھی، نماز ختم ہوتے ہی، ایک صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا: حضرات! سنن و نوافل کے بعد تشریف رکھیے، ان شاء اللہ، دین و ایمان کی باتیں ہوں گی۔

سنتوں کے بعد، ہم اپنی جگہ پر جمے بیٹھے رہے اور دوسرے حضرات بھی، جو اس شام، ایک بڑی تعداد میں شریکِ نماز تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ جمعرات کی شام کو، اہل دہلی، بہ طورِ خاص یہاں آکر، وعظ و نصیحت سنتے اور اپنے ایمان و یقین کو جلا بخشتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد، ایک نحیف الجشہ بزرگ، ایمان و یقین کی شادابی، اور تازگی کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ غیر معمولی شخص، ایک معمولی کرسی پر، جو قبل از آمد اُن کے لیے رکھ دی گئی تھی، جلوہ افروز ہوئے۔ بیٹھتے ہی سلام کیا، حاضرین کے جواب سے، مسجد کی روحانی فضا گونج اٹھی اور ایمان و یقین کی بھینی بھینی خوش بو، اُس کو معطر کرنے لگی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد جیسے یادوں کے ذخیرے، یا تجربات کے خزانے میں، کچھ تلاش کر رہے ہوں، چند آیاتِ قرآنی تلاوت کی۔ اللہ اکبر! یاد دل کش، دل آویز، جیسے یہ آیت پہلی بار

کانوں میں پڑی ہو، اُس تلاوت سے خوف و خشیت، امید و بیم، اِنابت اللہ، اور سوزِ دروں کی تیر خوش بو پھوٹ رہی تھی۔

تقریر شروع ہوئی، لہجہ نرم، آواز قدرے پست تھی؛ لیکن لمحہ بہ لمحہ بلند سے بلند ہوتی گئی، پھر گھن گرج، ایمان و اہل ایمان کو پکار، باطل اور اہل باطل کو لٹکار، جیسے ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہو؛ دلوں کو ہلا کر رکھ دیا، مجمع پر ایک سناٹا طاری تھا، ہر شخص سانس روکے گوشِ برا آواز تھا کہ مبادا کوئی لفظ دل و کان میں پڑنے سے قبل ہوا کے دوش پر اڑ جائے۔ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ، وَوَجَلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ کا سماں بندھ گیا، ہر لفظ ہیرے جواہرات سے زیادہ گراں، آتشِ فروزاں سے زیادہ پرسوز، درد و کرب سے لبریز، درِ یتیم سے زیادہ صاف ستھرا، تختِ طاؤس سے زیادہ قیمتی، اخلاص و وفا سے دھلا ہوا، احتساب و للہیت سے تاباں، خونِ جگر سے رنگیں، بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل کی بے چینی اور کرب و سوز، الفاظ و عبارات کے جامے میں تبدیل ہو رہا ہے، اور اخلاص و محبت کا بے پایاں جذبہ، لشکرِ جرار بن کر، کفر و شرک کے اڈوں، فطرت سے بغاوت و سرکشی کے مراکز، خدا سے دشمنی اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کی کمین گاہوں پر حملہ آور ہونے کو ہے۔

یہ الفاظ و عبارات، رستے زخموں کا مرہم اور روحانی و قلبی مریضوں کے لیے تریاق کا کام کر رہے تھے، شکوک و شبہات کی تاریکی، اُن کی ایمان افروز و دل دوز تقریر کے بعد، شکست خوردہ لشکر کی ٹکڑیوں کی طرح پراگندہ و پریشان نظر آتی تھی، اور اُن کی شیر و شہد جیسی تقریر، جسم و جاں میں اس طور پر نفوذ کرتی، جیسے اچھا خیال، یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے۔

جس کو دیکھیے اُشک بار، ماضی پر حسرت و ندامت کے آنسو بہا رہا ہے، اور مستقبل کو نیر و تاباں بنانے اور نیک اعمال کا ذخیرہ آخرت اکٹھا کرنے کا عہد و پیمان دل ہی دل میں کر رہا ہے۔

خدا گواہ ہے کہ اپنی ۱۷-۱۸ سالہ عمر میں، میں نے اب تک اتنی اثر انگیز، اور لخت لخت کو مست و مسرور کرنے والی تقریریں سنی تھی اور جس طرح کا جذب و محویت اُن کی تقریر میں محسوس کی، کسی اور کی تقریر میں کبھی نہیں کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد ہر جمعرات کو بنگلے والی مسجد، منزل مقصود ہوتی، مرحوم کی سحر انگیز، اور کرب و الم سے لبریز تقریر سننے اور اس وقت کی مختصر سی عمر کے بہ قدر، مستفید ہونے کی خاطر پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک قائم رہا۔

جنت و دوزخ کی حقیقت کو

ایمان آفروز انداز میں بیان کرنے والا مقرر

مارچ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے وسیع و عریض صحن میں، ایک عظیم تبلیغی اجتماع ہوا، ہزاروں کا مجمع تھا، اجتماع کو امیر جماعت حضرت مولانا انعام الحسنؒ (متوفی ۱۰ محرم ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۹۵ء) اور دوسرے عمائدین جماعت نے خطاب کیا؛ لیکن حاضرین، مرحوم کی تقریر سے جس قدر محظوظ اور متاثر تھے، کسی اور سے نہیں، مختلف مجلسوں میں مرحوم نے تقریر کی؛ لیکن سامعین کی پیاس بڑھتی گئی۔

ایک تقریر کا موضوع اب تک یاد ہے اور بھلایا بھی نہیں جاسکتا؛ ثواب و عقاب، نیکی و بدی، قیامت قائم ہونا، میزان، حساب و کتاب، نیک کا جنت میں، اور بدوں کا جہنم میں داخلہ، اول الذکر کے لیے موعودہ نعمتوں کی بارش، اور مؤخر الذکر کا مصائب و آلام، عذاب و عقاب کا سامنا کرنا، اہل جہنم کا احتجاج ابلیس کے پاس جانا، اپنی گمراہی، بغاوت و سرکشی کا الزام اُس کے سر دینا، احتجاجی جلوس کے سامنے ابلیس کی تقریر اور اُن کو دنداں شکن جواب دینا وغیرہ مختلف آیات قرآنیہ میں یہ مضامین بکھرے پڑے ہیں، موصوف نے اُن کو ایک لڑی میں پرو کر، اس انداز سے پیش کیا کہ قیامت کا حقیقی منظر آنکھوں کے سامنے بھر گیا، ایسا لگتا تھا کہ خطیب آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔

مرحوم نے اس موقع پر سورہ ابراہیم کی ۲۱، ۲۲ اور سورہ اعراف کی ۲۸ سے ۵۱ تک آیتیں تلاوت کیں جو اب تک کانوں میں گونج رہی ہیں، جیسے کل کی بات ہو! تین گھنٹے تک یہ تقریر جاری رہی، بیس ہزار سامعین شہرِ خموشاں بنے سنتے رہے، ایسا پرسکون و پر کیف منظر کہ اللہ اکبر، بیان سے باہر ہے، ایک سوئی بھی گرجائے تو آواز سنائی دے۔

دلوں کو تسنیم و کوثر سے دھل دینے، معصیت سے پاک کر دینے والی، موقع و محل کے لحاظ سے نہایت مناسب اور جامع تقریر، جس میں وہ سب کچھ تھا، جو سامعین کو سننے، سنتے رہنے، رونے، اور اُس کے مضمون پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ فصاحت و بلاغت کی چاشنی، حکمت و دانائی کی چمک دمک اور مہک، دل دوزی و دل آسائی اور ایسی اثر انگیزی، جس کا سرچشمہ، مقرر کا از خود باعمل ہونا، اپنی تقریر کے ہر ہر حصے کو زندگی کا جزو بنانے والا ہونا اور قول سے قبل عمل سے اس کا داعی ہونا تھا۔ ایسا عالمانہ، ووالہانہ انداز، ایسا ایمان و یقین، جس نے ہر کسی کو یہ احساس دلادیا کہ جیسے وہ جنت، اس کی نعمتوں، نوازشوں، جہنم، اس کی سزاؤں، بلاؤں، تپتے انگاروں، دہکتی آگ، اور ہلاکت و فلاکت کو دیکھ رہا ہو، جنت و جہنم اُس کی نظر تخیل اور مشاہدہ کے سامنے ہو۔

حسن بیان کی ساحری و یقین افروزی

آپ نے بار بار دیکھا ہوگا کہ ایک مقرر کو، اپنی بات کا ایمان و یقین نہیں ہوتا، اُس کے قول و عمل میں یکسانیت نہیں ہوتی، اُس کے عمل کا لہادہ اُس کے قول سے تنگ ہوتا ہے، اُس کی باتیں دل سے نہیں بل کہ صرف زبان سے نکلی ہوتی ہیں، اُس کے سینے میں خوف و بیم کی چنگاری، یا امید کی کوئی کرن نہیں ہوتی، جو روح کو تڑپا اور قلب کو گرمادے۔ اپنی خداداد تقریری صلاحیت و تاثیر، مخاطب کے ذہن و دماغ کی رعایت کے ساتھ بات کہنے کے حکیمانہ اصول و ضابطے، کی مکمل پابندی، سامعین کا اُن کی تقریروں

کے دوران کھونٹے کی طرح گر جانا، مقرر کی پیشانی سے اُن کی نگاہوں کا بندھ جانا، اُس کی ہر رائے سے مکمل اتفاق، اُس کی ہر بات کو ٹوٹ کر چاہنے، اپنانے اور برتنے کا جذبہ جیسے وہ مقرر کی اپنی بات نہیں؛ بل کہ خود اُن کے ضمیر کی آواز، اور اُن کے قلب کی پکار ہو، وہ اُس کو سننے کی تاک اور گھات میں تھے اور تقریریں کر لوٹے تو اپنے آپ کو شرم و ندامت کے آنسو سے دھل کر، توبہ و استغفار کی توفیق کے ساتھ، ایک سچے، یکے، مخلص باوفا مسلمان کی زندگی گزارنے کا عزم لے کر، ایسی زندگی جس کی بنیاد: تقویٰ، طہارت، عبادت اور تلاوت و ذکر پر ہو؛ اس جیسی خوبیوں، اور خصوصیات کی بہ دولت، مرحوم، جماعت تبلیغ کے روح رواں، بے قرار دل، اور صحیح ترجمان تھے۔ اسلامی معاشرے میں صلاح و فلاح کی ختم ریزی کرتے، پوری انسانیت کو، سعادت، نیک بختی کا راستہ دکھاتے، خیر و برکت عام کرتے، انسانوں کا رشتہ غیروں سے توڑ کر، اپنے خدا سے جوڑتے، اور دیکھتے ہی دیکھتے، اُن کی مخلصانہ کوششوں کا یہ باغ نمود پاتا، برگ و بار لاتا، مسجدوں میں نمازیوں کی بھیڑ جیسے شب براءت یا روزہ کے ایام ہوں، جن علاقوں تک دعوت و تبلیغ کا کام اور نام پہنچتا وہاں اخلاقی، معاشرتی گندگیوں، خامیوں، اور خرابیوں میں محسوس طور پر کمی نظر آتی، شرک و بدعت سے وہ علاقے پاک ہو جاتے، خرافات کا ریلہاں رک جاتا، اسلامی اخوت، ہم دردی اور انسانیت اُن کا امتیاز بن جاتا، اتحاد و اتفاق، سکون و اعتماد، قناعت و توکل، اور کارِ خیر میں تعاون کی لہر پورے علاقے میں دوڑ جاتی۔

مرحوم کی رحلت، جماعت تبلیغ کا ناقابل تلافی خسارہ ہے، وہ جماعت کے اُن عمائدین کی آخری کڑی تھے، جن میں گہرا علم، راسا عقل، تبلیغی حکمت و ہوش مندی، مطلوبہ دعوتی توازن جیسے وہ تمام دوسرے عناصر موجود تھے جن کے سبب جماعت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی اور نہ صرف مغربی ممالک کے اسلامی حلقے، صلاح و فلاح، اور دین کی راہ پر گام زن ہوئے؛ بل کہ بہت سے تعلیم یافتہ مغربی یہود و نصاریٰ حلقہ

دارالعلوم دیوبند میں تبلیغی سرگرمیوں کی کثرت اور مولانا کے ایمان پرور بیانات

۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے، دارالعلوم دیوبند نے انتظامی کروٹ لی، نئی انتظامیہ استوار ہوئی، نئے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکاتہم، آئے، دارالعلوم کا نیا دور شروع ہوا، حالات معمول پر آ گئے، تو حضرت مہتمم صاحب نے طلبہ دارالعلوم کو دعوت و تبلیغ کی طرف متوجہ کرنا چاہا، یہ تجویز عمائدین جماعت تبلیغ کے سامنے پیش کی گئی، تو انھوں نے بہ صد شکر، اس دعوت پر لبیک کہا، جس کے بعد سے دارالعلوم کی چہار دیواری، تبلیغی سرگرمیوں کا میدان بن گئی، اور یہ طے ہوا کہ مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری مرحوم سال میں ایک دو بار، دارالعلوم تشریف لائیں گے، چنانچہ تاحیات مرحوم نے اس عہد کو پورا کیا، دارالعلوم تشریف لاتے، اساتذہ و طلبہ کی الگ الگ مجلسیں ہوتیں، عمومی جلسہ ہوتا، تقریر ہوتی، تشکیل ہوتی، طلبہ جماعت کے کاموں میں لگتے، جماعت میں نکلتے، طلبہ و اساتذہ یک ساں لطف و دلچسپی کے ساتھ، مشک و گلاب میں دھلی ہوئی، اخلاص و وفا میں بسی ہوئی اُن کی باتوں کو سنتے، حرز جاں بناتے، زندگی سنوارتے، دل کی دنیا روشن کرتے۔ کتنے ہی طلبہ کی زندگیوں میں صالح انقلاب آیا، حال کی اصلاح اور مستقبل کو روشن بنانے کی دھن سوار ہو گئی، انھیں ذکر و عبادت و تلاوت کی حلاوت ملی، رات کی تہائیوں میں، اپنے پیدا کرنے والے سے مناجات کرنے، گریہ و زاری اور تہجد کی نمازوں کی توفیق سے بہرہ ور ہوئے اور اس کے عادی ہو گئے۔

جماعت سے وابستہ طلبہ میں عموماً، بے کراں تواضع، حسنِ ادب، سچی خدمت کا جذبہ محسوس ہوا، یہ طلبہ ہم دردی کے پیکر ہوتے، دوسروں کے دکھ درد کو تقسیم کرنے کا پاکیزہ جذبہ، مریض کی عیادت، دوسروں کا غم غلط کرنے میں بازی لے جانے کی لگن،

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالن پوریؒ

امت مسلمہ کے رنج و الم؛ امیدوں اور آرزوؤں میں شریک ہونے، اس پر خود کو قربان کر دینے کی اُمتِگ، حقوق کی ادائیگی میں فنائیت، وارثانِ علومِ نبوت کی شان کے مخالف ہر قول و عمل سے گریز؛ یہ اور اس جیسی دوسری پاکیزہ، اعلیٰ اسلامی صفات و اقدار و روایات اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری محسوس ہوتی تھی؛ جو جماعتِ تبلیغ سے صحیح طور پر وابستہ حضرات کا طرہٴ امتیاز اور نصب العین ہے۔

مرحوم کا ایک مشہور مقولہ تھا (جس کو وہ اکثر مجلسوں اور اجتماعات میں دہراتے تھے) کہ جدوجہد میں فنا ہو جاؤ، آخری سانس تک اس میں لگے رہو! — مرحوم جو کہتے، اُس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے تھے۔ وہ اپنے اس مقولے کی سچی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ عملی تصویر واقعتاً انھوں نے خود کو زندگی کے آخری سانس تک، دعوت و تبلیغ کے لیے وقف رکھا۔

مرض الموت

۲۱/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۹/ اپریل ۱۹۹۷ء کی بات ہے، مرحوم سفرِ حج سے، مرکز تبلیغ نظام الدین واپس آ کر اپنے دینی مشاغل اور اذکار و عبادات میں لگ چکے تھے، ادھر دوسالوں سے قسم قسم کے امراض نے، ان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، جس کا شنجہ رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جا رہا تھا، ایک معمولی عارضہ کی بنا پر، اسپتال لے جائے گئے، چند گھنٹوں کے ضروری علاج و معالجے کے بعد گھر آنے کی اجازت مل گئی، اور واپس مسجد نظام الدین آ گئے۔

چند روز بعد اپنے آبائی گاؤں ”گھٹامن“ ضلع ”پالن پور“ گجرات تشریف لے گئے اور ایک سہ روزہ تبلیغی اجتماع میں شرکت فرمائی، واپسی میں طبیعت میں نشاط محسوس کر کے، انھوں نے اپنے ضروری مشاغل، ذکر و اذکار، نماز و عبادات، تبلیغی و فود سے ملاقاتیں، مشورے اور فجر کے بعد مرکز کی مسجد میں معمول کی تقریر شروع کر دی۔
۱۰/ محرم کی صبح کو مرحوم نے ایک تقریر کی، اُس دن کی مناسبت سے اسلامی تاریخ کے

پس مرگ زندہ

اہم عبرت ناک واقعات پر روشنی ڈالی۔ بہ حیثیت مسلمان ایک شخص کو کیا کرنا، یا کس چیز سے بچنا چاہیے، نیز جائز و ناجائز عبادات و اعمال، بدعت و حرام سب کی وضاحت فرمائی۔

۱۲ محرم ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۹۷ء کا دن تھا، مرحوم کو مدراس (جنوبی ہند) کے ایک بڑے تبلیغی اجتماع میں، وفد کے ساتھ شرکت کرنی تھی، پروگرام یہ تھا کہ گنج ڈھنڈوارہ (ضلع ایٹہ، اتر پردیش) ہوتے ہوئے، وہاں پہنچ جائیں گے، رات ہی سے گاڑی تیار رکھی گئی کہ تڑکے نکل سکیں۔ نماز فجر کے بعد ہلکا سانا شستہ فرمایا اور فوری روانگی کا حکم دیا، تاکہ وہاں کے لوگوں کو انتظار کی گھڑیاں گننے کی ضرورت نہ پڑے، چند افراد کا یہ قافلہ، مرکز کی مسجد سے چلا، خورجہ (ضلع بلند شہر، اتر پردیش کا مشہور صنعتی شہر) پہنچنے سے قبل طبیعت دیگر گوں ہو گئی، اسی حالت میں خورجہ پہنچے۔ نڈھال و بے تواں۔ یہاں رفقہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ سفر روک کر مولانا کو دہلی واپس لے چلیں، حالات کچھ ایسے ہی تھے، سفر حج سے واپسی کے بعد عارضہ کے وقت جس اسپتال میں داخل کیے گئے تھے، اُس کے ڈاکٹر سے فون پر رابطہ قائم کیا گیا، اُس نے فوری طور پر دہلی واپس لانے کی وصیت کی۔ رفقہ سفر کا بیان ہے کہ خورجہ سے دہلی تک کے سفر میں مولانا ذکر الہی میں رطب اللسان رہے، ادعیہ ماثورہ کا ورد جاری رہا۔

دہلی پہنچ کر، اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں داخل کیا گیا، مکمل طبی جانچ کے بعد، علاج شروع ہوا، دوانے اپنا فوری اثر دکھایا، شام تک طبیعت بہ حال ہو گئی، مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ بہ جلد (نظام الدین واپس چلیں؛ لیکن ایک مسلم ڈاکٹر کے ایما پر رات اسپتال میں گزرنی پڑی۔

وفات

۱۳ محرم ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۹۹۷ء گیارہ بجے دن میں بہ عافیت مرکز آ گئے،

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالن پوری

وہاں سے روانگی کے وقت مرحوم نے رفقا کو ظہر کی نماز کی تیاری کا حکم دیا۔ رات بھر اصرار رہا کہ مرکز میں پہنچتے ہی اُن کو غسل دیا جائے، تاکہ سکونِ قلب کے ساتھ نماز ادا کر سکیں۔ اور ادا و اذکار جاری رکھتے ہوئے، نظام الدین پہنچے، اُس بندہ خدا کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ایک لمحہ بھی خدا کی یاد کے بغیر گزر جائے!

گیارہ بج کر دس منٹ پر اپنے کمرے میں داخل ہوئے، عقیدت مندوں اور احباب کے ایک جم غفیر کو، شوق و محبت کے جذبات کے ساتھ موجِ انتظار پایا، ۱۲ بج کر ۳۵ منٹ پر اچانک سانس اکھڑنے لگا، پہنچتے پہنچتے وہ سب کچھ ہو چکا تھا جس کا اندیشہ تھا، مرحوم اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

رحمتِ الہی زبانِ حال سے یہ کہہ رہی تھی: یَاٰیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ○ اَرْجِعِیْ اِلَی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَۃً ○ فَاَدْخِلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ○ وَاَدْخِلِیْ جَنَّتِیْ ○
شام تک نظام الدین کے گلی کوچوں میں، دہلی اور دور نزدیک سے آنے والوں کا ایک انسانی سیلاب نظر آتا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، نمازِ عشا کے معا بعد، مرکز سے قریب مقبرہ ہمایوں سے متصل میدان میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں ہزار ہا ہزار خلقِ خدا نے شرکت کی، مقبرہ ”پنج پیراں“ میں، مرحوم کا جسدِ خاکی دفن کیا گیا، اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اُن پر اپنی رحمتوں، نوازشوں، اور بخششوں کی بارش کرے، اُن کی پیہم جدوجہد، انتھک سعی کا اپنے شایانِ شان جزا دے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

افسوس کہ علم و فہم کی جامع، عمائدینِ جماعتِ تبلیغ کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ یہ صرف جماعت کا رونا نہیں؛ بل کہ ہندوستان کے کسی ثقافتی، تعلیمی، دعوتی اور تربیتی ادارے پر نظر ڈالیے، تو یہی الم ناک صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ باصلاحیت و مطلوبہ شخصیتیں (جو جہدِ مسلسل، سعیِ پیہم، جامع صالحِ تربیت، اور ثقافت و تعلیم کی بھٹی میں تپ کر کندن کے مانند چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں) گزرتی جاتی ہیں اور اپنے پیچھے ایسا خلا

پس مرگ زندہ

چھوڑ جاتی ہیں جو پڑھتا نظر نہیں آتا، جگہ خالی رہتی ہے، ذمہ داروں کو مستقبل کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، ہر چیز کو ہر وقت بلا سبب پیدا کر سکتا اور اسی سے کچھ امید قائم ہے، اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق، عزائم میں بلندی، حوصلے میں توانائی و طاقت عطا کرے۔

مرحوم، اپنی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب، ہر ایک کو روتا چھوڑ گئے، اُن کی موت پر واقعہً رویا گیا، بہت رویا گیا، خون کے آنسو۔ زبانی، خطوط، تار، فون اور جملہ ذرائع و وسائل سے تعزیتی پیغامات موصول ہوئے۔

امام و خطیب و ناظم اعلیٰ امور مسجد حرام جناب شیخ محمد عبداللہ السبیل نے مرحوم کے صاحب زادے حضرت مولانا محمد یونس صاحب کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

”آپ کے والد مولانا محمد عمر صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، ہم، آپ کی، اہل خانہ، اعزاء و اقارب، اور مشائخ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے ڈھانک لے۔ جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، سب کو صبر جمیل کی توفیق دے، وہ بڑا سننے والا، قبول کرنے والا ہے۔“

اسی طرح امام و خطیب مسجد حرام شیخ عبدالرحمن السدیس صاحب نے فون پر مولانا محمد یونس سے تعزیت اور صبر کی دعا کی۔

مختصر سوانحی نقوش

✽ وفات کے وقت مرحوم ۶۸ سال کے تھے، بیس بار حج و زیارت سے مشرف ہوئے بیرون ملک کے ۸۱ سفر کیے، اندرون ہند کے اسفار کی تعداد ناقابل شمار ہے۔
✽ حرمین شریفین اور سعودی عرب کے مختلف شہروں کے علاوہ مرحوم نے جن ممالک کا دورہ کیا، اُن کے نام یہ ہیں:

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالن پوریؒ

بیت المقدس، بحرین، دبئی، ابوظہبی، لبنان، شام، کویت، مصر، اردن، قطر، الجزائر، تونس، مغرب اقصیٰ، ترکی، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، فرانس، اسپین، امریکا، کناڈا، کینیا، زامبیا، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، ری یونین، موریشس، آسٹریلیا، فیجی، سنگاپور، انڈونیشیا، ملائیشیا، تھائی لینڈ، فلپین، سوڈان، پاکستان، بنگلہ دیش، اورروم وغیرہ۔

تبلیغی ضرورتوں کے پیش نظر بعض ممالک کے بار بار اسفار ہوئے۔

✽ مرحوم کے پس ماندگان میں پانچ صاحب زادے: مولانا محمد یونس، مولانا محمد عمر، مولانا محمد یوسف، مولانا محمد صہیب، مولانا سلمان، ایک صاحب زادی اور بیوہ ہیں، اللہ انھیں صبر جمیل کی توفیق دے۔

✽ مرحوم کا خاندان ایک زمانہ سے بمبئی میں مقیم ہے، گھریلوں کے پرزوں کی تجارت مشغلہ تھا، یہیں مرحوم ۱۱-۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۵-۱۶ ستمبر ۱۹۲۹ء بہ روز اتوار و دو شنبہ کی درمیانی شب میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد ماجد جناب وزیر الدین صاحب چل بسے، یتیمی کا بوجھ، ان کے دوش ناتواں پر آ پڑا، والدہ محترمہ نے بڑی تن دہی اور جگر سوزی کے ساتھ پرورش کی، ۲۵ سال کی عمر میں ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کو بوڑھی ماں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔

✽ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد، مرحوم نے بمبئی کے سرکاری اسکول مدرسہ حنیفہ میں ۱۱ ربیٰ قعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۳۹ء کو داخلہ لیا، جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ مطابق جولائی ۱۹۴۲ء میں گرمی کی چھٹی گزارنے، اپنے آبائی وطن ”گھٹامن“ پالن پور تشریف لائے اور گھر والوں کے ایما پر، دنیوی تعلیم کی بساط لپیٹ کر، دینی تعلیم کا رخ کیا، ۶ شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو دینی تعلیم کا آغاز کیا۔

✽ دو سال کے دوران ابتدائی اور ثانوی درجات کی کتابیں پڑھ کر، اعلیٰ تعلیم کے لیے از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۳۶۳ھ مطابق مارچ ۱۹۴۴ء میں داخل ہوئے؛ لیکن ایک ناگہانی مرض نے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق اگست ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم سے چلے گئے۔ صحت یابی کے بعد، گھر والوں نے کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ترغیب دی؛ تاکہ بوڑھی ماں کا بوجھ ہلکا ہو سکے، جو اب تک گھر کا خرچ سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ دور مرحوم پر بڑی تنگی کا گزر رہا تھا، چنانچہ بمبئی کی ایک مسجد میں امام و خطیب بن گئے اور کئی سال تک اس پر فائز رہے۔

✽ اتفاقاً مرکزِ جماعتِ تبلیغ دہلی کی ایک جماعت نے بمبئی کا دورہ کیا اور گھوم پھر کر وہ اسی مسجد میں پہنچ گئی، جہاں مرحوم مامور تھے، وہ جماعت کے مؤثر دعوتی انداز و اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے،

چنانچہ اس میں شامل ہو کر، اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا، اُس وقت جماعتِ تبلیغ کے سربراہ اعلیٰ حضرت مولانا محمد یوسف تھے، مرحوم کی تبلیغی سرگرمیوں پر مولانا کی گہری نظر تھی اور اُن کی نگاہ بصیرت نے، اُن کی پیشانی پر نبوغ و عبقریت کے عیاں نقوش پڑھ لیے اور جب اُن کو علم ہوا کہ بیماری کے سبب دارالعلوم چھوڑ دیا تھا اور فضیلت نہ کر سکے تھے، تو دوبارہ داخل ہو کر فراغت حاصل کرنے کا مشورہ دیا، دارالعلوم کو خیر باد کہے دس سال گزر چکے تھے۔ اس طویل انقطاع کے بعد موصوف نے دوبارہ شوال ۱۳۷۴ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء میں، دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم، جس وقت، جتنا وقت ملتا، جماعت میں اور اُس کی سرگرمیوں میں صرف کرتے، جماعت سے وابستگی قوی تر ہوتی رہی۔

✽ فراغت کے بعد، دعوت و تبلیغ کے ہو کر رہ گئے۔ اُن پر امیر جماعت حضرت مولانا محمد یوسف کی نظر خاص تھی۔ انھی کے دامنِ تربیت میں میں جگہ پائی، پلے، بڑھے، پروان چڑھے، جن کی دعوتی حکمتِ عملی و قوی کا ایک بڑا حصہ جذب کیا، اُن کی مجلسوں اور تقریروں میں صفِ اول میں نظر آتے، جس کی وجہ سے مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم کی خوبیاں اور خصوصیات بڑی حد تک اُن میں رچ بس گئی تھیں، جس نے اُن کو ایک بے مثال خطیب اور ہوش مند داعی اسلام بنادیا تھا، جہاں کہیں تبلیغی مجلس، یا اجتماع ہوتا، حاضرین دل و جان سے اُن کے دیدار اور اُن کی تقریر سننے کے لیے بے قرار رہتے۔ کسی جگہ نہ ہوتے، تو خلا محسوس ہوتا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا ندھلوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کر ۵۵ منٹ پر بروز جمعہ ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو پاکستان میں رحلت فرما گئے، جہاں ایک تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے جانا ہوا تھا، اس کے بعد، مرکز میں فجر کے بعد والی یومیہ تقریر کی ذمہ داری مولانا مرحوم کے حصے میں آئی اور تاحینِ حیات مرحوم نے اس ذمہ داری کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا، یومیہ فجر کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک تقریر فرماتے؛ لیکن امراض کے شدید حملے کے بعد اعضا مضطرب ہو گئے تو نصف گھنٹے، یا اس سے بھی کم گفتگو فرماتے۔

✽ مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ تواضع، انکسار، حلم اور جو دو سخا کے پیکر، علم و علما دوست، اُن کے بڑے قدرداں تھے، طلبہ پر خصوصی شفقت و توجہ اُن کی طبیعتِ ثانیہ تھی، انھیں اخلاقی اور مادی مدد دیتے اور دعائیں لیتے، فقرا، مساکین، تنگ دستوں اور بیواؤں کی بڑی خبر گیری کرتے، خود اور دوسروں کے ذریعے

سے بھی اُن کے حالات معلوم کرتے رہتے، وہ اُن کے لیے عطیہ ہائے فطرت کے مثل تھے۔ ہوا، پانی، اور روشنی کی طرح عام وازاں۔ اُن پر جان چھڑکتے، کسی کے یہاں رنج و الم کا موقع ہوتا تو سب سے پہلے حاضر ہوتے، بھاگے بھاگے پھر رہے ہوتے، اُن کو کھانا کھانا، حسب ضرورت سامان دینا، اُن کی مزید ضرورتوں کو نظر میں رکھنا، اُن کی فکر کرنا، اپنے سراوڑھ لیتے۔ بڑے چھوٹے ہر ایک کی خدمت، یک ساں احساس لذت و مسرت اور تن وہی سے کرتے، مکافات اور معاوضہ لینے کا احساس، شاید اُن کے اندر پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا، (لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا) کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

✽ مرحوم کا مخلصانہ طرز عمل اور احسان، فقرائے ہند کے ساتھ خاص نہ تھا، بیرون ہند خصوصاً پاکستان و بنگلہ دیش کے بہت سے ضرورت مند حضرات اُن کے احسان مند ہیں۔ ہر جگہ مرحوم نے اپنے افراد مقرر کر رکھے تھے، جو اُن کے حالات کی خبر رکھتے اور مرحوم کو مطلع کرتے، مرحوم کی روانہ کردہ امداد اُن تک پہنچاتے۔ اُن کی وفات سے کتنے لوگ، بے کس و بے سہارا ہو گئے۔

✽ اُن کی توجہ کا ایک اہم پہلو مریض کی عیادت ہے، خود بھی کرتے، دوستوں اور احباب کو بھی اس کی تلقین و تاکید کرتے کہ یہ سنت ہے، اور باعث اجر و ثواب — اُن کے یہاں ہر کام کو اپنے وقت پر انجام دینے کا بڑا اہتمام ملتا ہے، سستی، کاہلی اور ارضاعت وقت کے نام سے وہ واقف نہ تھے۔

✽ فقہ، حدیث اور حیات صحابہ کے مطالعہ کے رسیا تھے، شب بیداری اور تہجد کے پابند تھے۔ سفر، حضر، مرض، صحت میں کبھی بھی، اس معمول میں معمولی فرق بھی نہ آتا۔ سنت نبوی کا اتنا پابند کم دیکھنے میں آیا، اگر کوئی سنت چھوٹ جاتی، تو حسرت و افسوس کے مارے بے حال ہو جاتے تھے، احباب و رفقا کو حکم تھا کہ ہر چھوٹی بڑی سنت کی یاد دہانی کراتے رہیں۔

✽ طبیعت میں بلا کی مہمان نوازی تھی، اگر کسی وجہ سے اس کا موقع نہ ہوتا، تو مہمان کو کچھ روپے نقد دے دیتے، جیسا کہ اکابر علمائے ہند، مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کا معمول تھا۔

✽ میانہ مائل بہ پستی قد، بڑا ساسر، پھیری ہلکی داڑھی، کشادہ پیشانی، گٹھے اعضاء، گندی کھلتا ہوا رنگ، صلاح و تقویٰ کے سبب تاباں و روشن چہرہ، شب بیداری اور خوف خداوندی سے معمور آنکھیں، جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

✽ مرحوم نے مختلف حیثیتوں سے، بہت زیادہ مشکل حالات میں اور زیادہ مدت تک دین کی خدمت

پس مرگ زندہ

کی: امام و خطیب مسجد، طالب علم، جماعت تبلیغ کے ایک عام فرد اور اعلیٰ سربراہ۔ انھوں نے جو دینی خدمات جن سطحوں پر، جن پہلوؤں سے اور جس پیمانہ پر انجام دیں، کام یابی ملی اور قابل رشک کام یابی۔ مسلمان جس ناگفتہ بہ دینی و معاشرتی حالات اور مذہب سے دوری کے شکار تھے، اگر بہ فضل خداوندی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے جماعت تبلیغ کی بنیاد اور حضرت مولانا محمد یوسف اور مولانا مرحوم نے اس کی توسیع و تنظیم نہ کی ہوتی تو مسلمانوں میں جو دینی جذبہ اور مذہبی رنگ و آہنگ موجود ہے، شاید دیکھنے میں نہ آتا۔

✽ مرحوم اُن لوگوں میں تھے، جن کو اہل علم و تقویٰ، اعزاد و اقارب، جلد بھولیں گے، نہ بھولنا گوارا کریں گے، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

مرحوم کے تئیں اپنا یہی کچھ عقیدہ ہے جس کا سطور بالا میں اظہار کیا گیا۔ حقیقت کا علم، اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور نہ ہی اُس کو معلوم کرنے کی کوئی سبیل ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، مغفرت کی بارش برسائے، جنت کا اعلیٰ مقام عطا کرے اور اہل و عیال و اعزاد و اقارب کو صبر جمیل کی توفیق دے، آمین یا رب العالمین (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداغی“ عربی شمارہ ۴، جلد ۲۱، ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ = اگست - ستمبر ۱۹۹۷ء۔

عارف باللہ حضرت مولانا

قاری سید صدیق احمد باندویؒ

1418 - 1341 = 1997 - 1923

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ کی ۲۳ ویں اور اگست ۱۹۹۷ء کی ۲۸ ویں تاریخ تھی۔ پنجشنبہ کا دن اور چاشت کا وقت تھا، گھڑی تقریباً سوا دس بج رہی تھی، مشہور عالم ربانی اور صاحبِ زہد و تقویٰ شیخ طریقت حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ، ایک دن پہلے دماغ پر فالج کا حملہ ہونے اور رگِ دماغ پھٹ جانے کی وجہ سے، لکھنؤ کے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں زیرِ علاج تھے کہ اُن کی روحِ فقیسِ عضری سے پرواز کر کے، جوارِ رحمت میں چلی گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

خبر وفات بجلی کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور مسلمانوں کو زبردست اور ناقابلِ بیان غم و اندوہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت مرحوم اگرچہ دین و دعوت، تعلیم و تربیت اور خدمتِ خلق کی بے پناہ اور پیہم مشغولیتوں کی راہ میں، صحت و تندرستی کی طرف سے بے پروائی برتنے کی بنا پر مختلف بیماریوں کا شکار تھے؛ لیکن ایسی کوئی خطرناک یا پرانی بیماری نہیں تھی، جس کی بنا پر اُن کے عقیدت مند اور متعارفین پہلے سے ذہنی طور پر اس بات کے لیے آمادہ اور تیار ہوتے کہ کسی بھی لمحے، انھیں حضرت کے

(۱) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی جاوید اشرف مدھے پوری قادیان، رجب ۱۴۱۸ھ مطابق نومبر ۱۹۹۷ء۔

انتقال کی غم ناک خبر سنی پڑے گی؛ چنانچہ اُن کی خبر وفات واقعی ایک اَلْم انگیز ناگہانی حادثہ تھی، جس نے اِس وسیع ملک کے تمام مسلمانوں اور دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کام کرنے والوں کو بالخصوص اور تمام مسلمانانِ عالم کو بالعموم جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

بے پناہ مقبولیت و محبوبیت

خداے پاک نے اِس اخیر زمانے میں اسلامی ہند میں، جس طرح کی ہمہ گیر و عمومی مقبولیت و محبوبیت حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کو عطا فرمائی تھی، اُس کی نظیر نہیں ملتی؛ حتیٰ کہ بہت سے غیر مسلم بھی آپ کی وفات پر غموں میں ڈوب گئے؛ اِس لیے کہ انھیں آپ کی ذات میں، صلاح و تقویٰ اور خیر و برکت کا ایک ایسا انسان نظر آیا، جس نے مذہب اور رنگ و نسل کی تفریق سے بالاتر ہو کر، خود کو انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جو کوئی بھی آپ سے متعارف ہوتا، دیکھ کر ہو یا سن کر، آپ کی ذات کے تئیں ایک عجیب گرویدگی اپنے دل میں پاتا، جسے لفظوں کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ جس کا بھی تھوڑا یا بہت آپ سے تعلق تھا، اُس نے محسوس کیا کہ ایک مبارک سایہ اُس کے سر سے اٹھ گیا ہے اور شفقت و ہم دردی کی ایک مضبوط بیساکھی اُس سے چھین لی گئی ہے، جو زندگی کے نشیب و فراز میں اُس کا سہارا بنتی تھی۔ اپنی جگہ ہر ایک کو یہ اَلْم انگیز احساس ستانے لگا کہ وہ اُن کی وفات سے، اپنے دکھ درد میں شریک ایک مہربان دل سے محروم ہو گیا ہے، اُس کا وہ بازو شل ہو چکا ہے، جس کی قوت و طاقت اُس کے حوصلے کو مہمیز کرتی تھی، ایک ایسی شریف زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے، جو ہمہ وقت ہر کسی کے پاس اُس کی سفارش کے لیے تیار رہتی تھی۔ واقعاً اُن کا دل ساری دنیا کا غم خوار و دردمند اور اُن کی ذات ہر ایک کا مسیحا تھی۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

امتیازی اوصاف

حضرت قاری صاحب محض ایک عالم دین ہی نہ تھے، کہ جسے صرف کتاب و سنت کا گہرا اور وسیع علم ہو، تعلیم و تربیت میں یدِ طولیٰ حاصل ہو اور صلاح و تقویٰ، زہد و امانت، اخلاص و پاک نفسی سے حصّہ وافر پایا ہو اور بس! وہ یہ سب کچھ تو تھے ہی؛ لیکن اور بھی بہت کچھ تھے۔ انھوں نے طالبِ علمی کے زمانے سے ہی ایک مسافر کی سی زندگی گزاری۔ سادگی اور کفایت شعاری، اُن کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئی تھی، جیسے گلاب میں خوشبو اور تاروں میں روشنی۔ فرط تواضع اُن کا حسن اور انکارِ ذات اُن کی آرایشِ خودی تھی۔ آپ اُن پاکیزہ اخلاقِ نبوی - علی صاحبہا أحسن الصلاة وَاُزْکی التسلیم - کے مکمل نمائندے تھے، جن کے سحر نے کتنے دشمنوں کو دوست، اور کتنے خوں خواروں اور جا بروں کو مہربان و دردمند بنا دیا تھا۔

حضرت قاری صاحب مرحوم، اُس مطلوبہ اور خدا داد صلاحیت سے مالا مال داعیِ اسلام کا بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ تھے، جو سخت ضرورت کے وقت اللہ کی طرف سے منتخب ہو کر آتا ہے اور جو اپنے پروردگار، اپنے دین اور اپنے نبی کی سنتِ مطہرہ کی طرف دعوت کے لیے صرف لسانی صلاحیتوں سے کام لینے پر اکتفا نہیں کرتا؛ بل کہ خود اُس کا وافر علم و فضل، غیر معمولی تواضع و انکساری، پاکیزہ سیرت، مثالی زندگی، بے نظیر حلم و بردباری، سچی انسانیت، اپنے ہم جنس انسانوں کے تئیں اخوت و ہم دردی، بلند اخلاقی وغیرہ ساری چیزیں سرِ پایا دعوت بن جاتی ہیں؛ کیوں کہ اُن کا پرتو، دین و مذہب، نظرِ پات و عقائد، ذوق و رجحان اور عمروں کے اختلاف کے باوصف تمام لوگوں پر پڑتا اور اُنھیں اپنا شیدائی بنا لیتا ہے۔ چنانچہ کتنے ہی اخلاقی بے راہ روی کے شکار تھے، جن کے دلوں کی دنیا حضرت قاری صاحبؒ کی ایک مختصر سی ایمان پرور صحبت نے، یکسر بدل ڈالی۔ کتنے ہی ڈاکو، راہ زن اور جرائم پیشہ لوگ تھے، جن کی دہشتِ ظلمت میں بھٹکتی

پس مرگ زندہ

ہوئی زندگیوں کا رخ آپ کی ایک ملاقات کے طفیل یکسر بدل گیا اور انہوں نے اپنے غلط پیشے سے تائب ہو کر، پاکیزہ زندگی اختیار کر لی۔ تعصب و نفرت کی چہار دیواری میں بند کتنے ہی غیر مسلم، جنہیں ایک بار آپ کی زیارت نصیب ہو گئی؛ مسلمانوں کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھنے لگے۔ آپ کے طفیل ہی، مختلف طبقوں کے غیر مسلموں کا اسلام سے حسن ظن قائم ہوا اور وہ یہ کہ اٹھے کہ: کہ اسلام وہی ہے، جسے ہم فرشتہ صفت انسان: ”ہتھورا والے بابا“ کی زندگی میں چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، تو اُس کی بہتری کا کیا پوچھنا اور اُس کی خوبیوں کا کیا کہنا! یہ اعتراف اس لیے تھا کہ حضرت باندوئی، محض قاری قرآن نہیں؛ بل کہ سراپا قرآن تھے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

جہد مسلسل اور سفرِ پیہم

حضرت قاری صاحب دینی و تعلیمی اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے پیش نظر، برابر سفر میں رہتے تھے۔ قریبی علاقوں اور ملک کے گوشے گوشے کا بہت زیادہ دورہ ہوتا۔ ہر سفر کے بعد دوسرا سفر، ہر دورے کے بعد دوسرا دورہ اور ہر دوسرے کے بعد تیسرا، غرض ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ حضرت مرحوم بڑے جلسوں میں جانے سے کتراتے اور احتراز برتتے تھے؛ لیکن دیہاتوں اور گاؤں میں، جہاں جانے کے لیے سہولیات میسر نہ ہوں اور وہاں آرام و راحت کا کوئی نظم نہ ہو، چھوٹے چھوٹے جلسوں میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے اور مقبولیت کا یہ عالم کہ لوگ جیسے ہی آپ کا نام سنتے، مشتاقانہ چل پڑتے اور پھر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہی دکھائی پڑتا۔ باندہ کے چاروں طرف وسیع خطہ اراضی پر پھیلے ہوئے اضلاع کے علاقوں میں آپ کے سفروں کا واقعہ تو حیرت انگیز ہے۔ اُن میں آپ کا اس قدر بار بار آنا جانا ہوا کہ ہر چھوٹا بڑا، بچہ

بوڑھا، مرد عورت، مسلم غیر مسلم؛ حتیٰ کہ بسوں، ٹرکوں اور ٹرینوں کے ڈرائیور بھی آپ کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ آپ لوگوں کے گھروں میں پہنچتے، انھیں دین کی باتیں بتاتے، اسلام کی تعلیم سے آگاہ کرتے، اخلاق نبوی سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے کی ترغیب دیتے، دین و اخلاق، صلاح و تقویٰ اور خیر و اصلاح کی راہ اپنانے کا جذبہ پیدا کرتے۔ بسا اوقات ان سفروں کا مقصد کسی کی دعوت و اصرار پر، تقریب شادی میں شرکت کر کے اُس کا دل خوش کرنا یا دو فریقوں میں صلح صفائی اور اخوت و محبت کی تخم کاری ہوتا۔ عموماً دور افتادہ، پس ماندہ، سہولیات سے خالی دیہاتوں میں، جہاں جاتے ہوئے مشہور دعا و مبلغین گھبراتے اور پیچھے ہٹتے ہیں، وہاں کے جلسوں میں، اگر دعوت آتی، تو ضرور شرکت فرماتے۔ شہروں کے اجلاس میں بھی جانا ہوتا، لیکن کم، وہ بھی اُس وقت، جب کہ اُس کا دار و مدار آپ ہی پر ہوتا۔ کسی تعلیمی اجتماع اور علمی سیمینار میں، دعوت قبول کرنے پر ہی تشریف لے جاتے۔ سفر کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ ضرورت پڑی، تو پیدل ہی چل پڑے، بھیڑ بھاڑ والی عام بسوں میں سوار ہو گئے، پنجرہ یا اکسپریس کسی بھی ٹرین سے سفر کر لیا۔ پہلے سے کوئی رزرویشن نہیں ہوتا تھا۔ سامان سے لدی ہوئی ٹرک گاڑیاں ملیں، تو اُسی میں بیٹھ کر، منزل تک پہنچ گئے۔ اُن ٹیکسیوں سے بھی راستہ طے کر لینے سے گریز نہیں کرتے، جن میں سوار یوں کو اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بٹھایا جاتا ہے کہ الامان! گویا وہ انسان نہیں، سیمینٹ یا چاول یا اور کسی چیز کی بوریاں ہوں۔

کثرتِ اسفار میں کم ہی لوگ آپ کی نظیر ہو سکتے تھے۔ کسی بھی عالمِ دین نے آپ سے زیادہ گاؤں اور شہروں کا بار بار دورہ اور سفر نہیں کیا ہوگا۔ مختلف جماعتوں، اداروں، مذاہب اور زندگی کے اُن گنت شعبوں سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے اور آنکھوں میں بساتے تھے، چوں کہ آپ نے اُن کے لیے اپنا دل فرشِ راہ کر دیا تھا اور آپ اپنی بلندیوں کے باوجود، اُن کے متواضع خادم تھے اور اُن کے لیے ایک ایسے سادہ دل اور مخلص انسان تھے کہ کوئی بھی شخص، پہلے سے وقت

لیے بغیر، جس وقت چاہے، اُس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا، مل سکتا تھا اور اُس کے پاس بلا کسی روک ٹوک کے جاسکتا تھا۔ پہلے سے کسی طرح کے نظم و انتظام کا مسئلہ اور کسی نفسیاتی احتیاط اور ذہنی تیاری کی ضرورت نہ ہوتی تھی، جیسا کہ عموماً کسی بڑے عالم یا مشہور داعی سے ملاقات کے لیے، ان دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بلاریب حضرت مرحوم آفتاب عالم تاب تھے، جس کی قوت بخش کرنیں، فقیروں کی جھونپڑیوں اور امیروں کی کٹھیوں پر برابر برابر پڑتی ہیں اور جس کی حیات افزا شعاعیں میدانوں اور پہاڑوں سب کو یکساں طور پر روشن کرتی ہیں۔ آپ کی فیض رساں ذات، پانی اور ہوا کی طرح انسانوں کی ضرورت تھی کہ ہر کوئی اُس کا محتاج ہوتا اور کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے بغیر اُسے حاصل کرتا ہے؛ لیکن اب ع ”کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے“ ہر کچھ تو زندانی تقدیر ہے:

نغمہ بلبل ہو، یا آواز خاموش ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

مقبولیت عامہ کا نمونہ

حضرت قاریؒ صاحب اُس مقبولیت عامہ کا نمونہ تھے، جو خدا اپنے کسی بندے کو اُس وقت عطا فرماتا ہے، جب اُس سے محبت کرتا ہے؛ چنانچہ آسمان میں، اُس کے فرشتے اُسے محبوب رکھتے ہیں اور زمین پر اُس کے بندے، اُسے دلوں میں بساتے اور پلکوں پہ بٹھاتے ہیں۔ ربِّ کائنات نے کچھ ایسی ہی مقبولیت و محبوبیت حضرت قاری صاحبؒ کو عطا فرمائی تھی؛ چنانچہ آپ کی نماز جنازہ میں لا تعداد خلقت کا ہجوم تھا۔ کچھ شہروں کی بس یونیوں کی طرف سے تو اعلان کر دیا گیا کہ اُن کی بسیں حضرتؒ کے جنازے میں شرکت کے لیے ”تھورا“ جانے والوں کو مفت لے جائیں گی۔ بہت سے ٹیکسی ڈرائیوروں نے، جن میں غیر مسلم بھی تھے؛ جنازے میں شرکت کے لیے جانے

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوئیؒ

والوں کو بلا کر ایہ ”ہتھورا“ پہنچا دیا۔ اُن گنت عینی شاہدین کا بیان ہے کہ: کئی کلو میٹر تک صرف وہ بسیں، ٹرک، ٹیکسیاں اور کاریں ہی نظر آرہی تھیں، جن پر جنازے میں شرکت کے لیے، غم خوار جوق در جوق آئے تھے؛ جب کہ اُن کی بڑی تعداد پیدل چل کر ہی ”ہتھورا“ آئی تھی۔ کیا شانِ محبوبیت ہے! اللہ اکبر

حضرت قاری صاحبؒ کی ذاتِ گرامی ایک چلتا پھرتا دعوتی و اصلاحی مدرسہ تھی۔ جہاں بھی فروکش ہوتے، علم و فضل اور دعوت و دین کی روشنیاں بکھیرتے، اُن کی شگفتہ روئی و خندہ پیشانی اور ہر انسان سے کھلے دل کے ساتھ اور مسکرا کر ملنا، دیکھنے والوں کے دل میں جگہ بنالیتا اور وہ آپ سے محبت کرنے پر کچھ مجبور سے ہو جاتے۔

بلاے جاں ہے غالب! اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اُسفار کے حوالے سے معمول

سفروں اور دوروں میں آپ کا یہ معمول بن گیا تھا کہ جس دینی و دعوتی مقصد سے جانا ہوتا، اُس کے پورا ہوتے ہی فوراً اپنی قیام گاہ ”ہتھورا“ لوٹ آتے، خواہ رات کا وقت ہو، یا شام کا، یا صبح کا اور جاڑے کے دن ہوں یا گرمی کے، موسم کی حرارت یا خنکی کی پروا کرتے اور نہ لوٹنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار۔ جیسا کہ عام علما و دُعا کا شیوہ ہے؛ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود، آپ نہایت پابندی کے ساتھ اسباق پڑھاتے اور مقررہ وقت پر درسی کتابیں ختم کر دیتے۔ آپ دعوت و عبادت کے ذوق کے ساتھ ساتھ، درس و تدریس کا بھی پورا پورا مذاق رکھتے تھے؛ ورنہ عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ کام یاب داعی، کام یاب مدرس نہیں ہوتا اور زاہد و متقی اور آہِ سحر گاہی سے بہرہ یاب آدمی، ذوقِ تدریس سے ہی دامن ہوتا ہے اور دعوتی مشن سے اچھی طرح عہدہ برآ نہیں ہو پاتا۔ حضرت مرحوم کتاب و سنت میں مہارت اور اُن کی گہری سمجھ اور فہم و ادراک سے

ہلال تھے۔ ساتھ ہی بڑے صغیر ہند کے اسلامی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم و فنون میں بھی اعلیٰ استعداد اور لیاقت رکھتے تھے۔ ان بوقلموں صفات و خصوصیات اور متضاد خوبیوں کی بنا پر حقیقتاً آپ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ آپ کی شخصیت ایک ایسا گل ہزار رنگ تھی، جس کا ہر جلوہ رنگ آنکھوں کو بھاتا اور دل کو سرور بخشتا ہے۔

قاری صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسے کی خصوصیت

حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے گاؤں ”ہتھورا“ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو ان کی مبارک کوششوں اور جدوجہد سے ہندوستان کے چند گئے چنے بڑے اسلامی مدارس میں شمار ہونے لگا۔ انھوں نے روزِ اول سے ہی مختلف عربی و اسلامی علوم: حدیثِ پاک اور فقہ، تفسیر وغیرہ کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو، ناظرہ و حفظ و تجوید و قرأت اور ہر لحاظ سے قرآنِ کریم کی معیاری تعلیم پر پورا زور دیا۔ یہ مدرسہ آپ کی ذاتِ بابرکات کی جلوہ افروزی اور خصوصی طور پر آپ سے نسبت رکھنے کے طفیل، اسلامی تعلیمات کے مطابق، طلبہ کی عملی تربیت کے لحاظ سے مشہور و ممتاز رہا ہے؛ چنانچہ وہاں سے دارالعلوم دیوبند یا ہندوستان کے دوسرے بڑے مدارس میں داخلے کے لیے آنے والے طلبہ اور اسی طرح وہاں کے فارغین، اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، حسنِ سیرت و اخلاق سے پہچانے جاتے؛ حتیٰ کہ اس مدرسے میں تعلیم پانا ہی، طالبِ علم کے پاکیزہ اخلاق ہونے کی علامت ہوتی تھی۔

عموماً انسان اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اور بیماری کے وقت، بیٹوں اور قرابت داروں کے متعلق ہی کچھ وصیت کرتا ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ جب علاج کے لیے لکھنؤ لے جائے جا رہے تھے۔ یہ عشاءِ بعد کا وقت اور آپ کی زندگی کی آخری رات تھی۔ آپ نے صرف مدرسے کے سلسلے میں وصیت فرمائی اور باندہ شہر میں اپنے پاس موجود لوگوں سے کہا: ”مدرسے میں کام کرنے والے سبھی لوگوں کو میرا آخری سلام پہنچا دو اور کہہ

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ
دو کہ مدرسے کا خیال رکھیں اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو اہتمام سے انجام دیں۔“

وفات

۲۲ ربیع الثانی مطابق ۲۷ اگست کو عصر کے وقت، یعنی وفات سے ایک دن سے بھی کچھ کم پہلے، آپ پر فالج کا حملہ ہوا؛ لیکن خدا کی شان! آپ کی زبان مبارک پر برابر اللہ کا ذکر جاری رہا۔ ذکر خدا سے تر ہلکی ہلکی آواز سنائی بھی دے رہی تھی۔ خشیتِ الہی اور ذکرِ خداوندی کے عالم میں موت، اللہ تبارک و تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند اور محبوب ہے اور ایسی موت اِنْ شَاءَ اللہ نیک انجام کی علامت اور خاتمہ بالخیر کی دلیل ہے؛ چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

إِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ أَنْ تَمُوتَ وَلِسَانَكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ. (۱)
(اللہ پاک کو سب سے زیادہ یہ عمل محبوب ہے کہ تمہیں اس عالم میں موت آئے کہ تمہاری زبان ذکرِ الہی سے تر ہو)

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ کو، ٹیلیفون کے ذریعے، ساڑھے دس بجے، یعنی وفات کے چند منٹوں کے بعد، دارالعلوم دیوبند میں جیسے ہی انتقال کی خبر ملی، پورے ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اساتذہ، طلبہ، ذمہ داران، خصوصاً مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکاتہم، حزن و غم کی تصویر بن گئے۔ دارالعلوم دیوبند میں نمازِ ظہر کے بعد ایک دعائیہ مجلس منعقد ہوئی، جس میں تمام طلبہ و اساتذہ، حضرت مہتمم صاحب اور نائب مہتمم حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب دامت برکاتہم (۲) نے شرکت فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند کے اُستاذِ حدیث اور نیک و صالح عالم: حضرت مولانا عبدالحق

(۱) (طبرانی و بیہقی)

(۲) اور اب یہ وقتِ اشاعتِ این مضمون بہ شکلِ کتاب ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ، وفات: جمعرات ۱۹ صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۴ فروری ۲۰۱۰ء۔

پس مرگ زندہ

صاحب اعظمی دامت برکاتہ نے مجلس کو خطاب کرتے ہوئے، قرآن کریم کی آیات: ”كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ“ (جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے) اور ”كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ“ (ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے) تلاوت فرمائیں اور حضرت قاری صاحب کو بارگاہ ایزدی سے عطا کردہ محبوبیت عامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”آپ جہاں بھی جاتے، لوگ محبت و اشتیاق میں پروانہ وار ٹوٹ پڑتے۔ ایمان و تقویٰ، صلاح و خیر، شب بیداری و آہ نیم شبی اور رات کے ستائے میں، جب کہ پورا عالم سو رہا ہو، ہڈت قیام کا نور اُن کے چہرے پر جگمگاتا تھا۔ اسی بنا پر سارے لوگ، حتیٰ کہ بہت سے غیر مسلم بھی آپ کی نورانی اور پیاری صورت دیکھنے کے مشتاق رہتے تھے۔

حضرت مولانا نے فرمایا: کسی نہ کسی دن ہر ایک کی زندگی کا سفر ختم ہو جائے گا؛ لیکن خوش نصیب لوگ وہ ہیں کہ جب دنیا سے جاتے ہیں، تو لوگ انھیں روتے ہوئے ڈھونڈتے اور تلاش کرتے ہیں اور پانی کی مچھلیاں تک بھی اُن سے محبت کرتی ہیں۔ ایسے لوگ خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمیں بھی اُنھی جیسا بننا چاہیے اور اُن کے طور طریقوں پر چلنے اور اُن کے اخلاق و عادات کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں اُن لوگوں کی روش اختیار نہ کرنی چاہیے کہ جب مرتے ہیں، تو کوئی آنکھ اُن پر رونے والی نہیں ہوتی۔ اُن کا جینا مرنا سب برابر ہوتا ہے۔

یہ مجلس مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکاتہم کی دعا پر ختم ہوئی۔

مختصر حالاتِ زندگی

آپ کی ولادت بدروز جمعہ ۱۱ شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۹۴۳ء اپنے گاؤں ”ہتھورا“ ضلع باندہ اتر پردیش میں ہوئی۔ یہ تاریخ ولادت، مظاہر علوم کے داخلے فارم میں درج شدہ سنہ پیدائش کے مطابق ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام ”سید احمد“ ہے آپ کا اسم گرامی (مولانا قاری) سید صدیق احمد بن سید احمد بن

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی

سید عبدالرحمن ہے۔ سلسلہ نسب سید قاضی محمد داؤد (جو سلطان شہاب الدین محمد غوری کے زمانے میں عراق کے شہر ”واسط“ سے ۶۱۱ھ میں ہندوستان وارد ہوئے تھے) کے واسطے سے امام زین العابدین بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

پورا سلسلہ نسب قاضی محمد داؤد تک اس طرح ہے: صدیق احمد بن سید احمد بن قاری عبد الرحمن بن ولی محمد بن سر مست علی بن وہاب علی بن یاد اللہ بن جان محمد بن روح اللہ بن عنایت علی بن مد علی بن دیوان غلام مصطفیٰ بن محمد منصور بن قاضی محمد داؤد۔

تعلیم و سلوک و معرفت: آپ نے گاؤں ہی میں اپنے دادا قاری عبدالرحمن صاحب تلمیذ قاری عبد الرحمن صاحب محدث پانی پتی سے ابتدائی تعلیم مکمل کی اور کلام پاک حفظ کیا۔ دادا کی وفات کے بعد حفظ قرآن کی تکمیل اپنے ماموں سید امین الدین صاحب سے کی اور انھی سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر آپ ”کانپور“ آگئے اور یہاں کئی ایک اساتذہ سے عربی و فارسی مبادیات کی تعلیم پائی۔ پھر یہاں سے پانی پت چلے گئے اور وہاں شرح جامی (بحث فعل) تک کے درجے کی مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ قراءت سبعہ کی تعلیم بھی آپ نے یہیں حاصل کی۔

شوال ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں مشہور تعلیم گاہ جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا۔ یہ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب قدس سرہ کی نظامت کا دور تھا اور صدر المدرسین حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب کامل پوری تھے۔ سلم العلوم اور کنز الدقائق کے درجے سے، دورہ حدیث تک آپ نے مظاہر علوم میں تعلیم پائی اور ۱۳۶۳ھ میں یہاں سے فارغ ہوئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ نے درمیان سال میں مظاہر علوم سے آکر ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ کو مدرسہ شاہی میں داخلہ لیا اور اُس سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ آخرین وغیرہ پڑھیں۔ مدرسہ شاہی کے رجسٹر نمبرات امتحان شعبان ۱۳۶۲ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امتحان میں آپ نے مشکوٰۃ شریف میں کل نمبر ۵۰ میں سے ۵۱ اور ہدایہ آخرین میں ۵۰ نمبرات حاصل فرمائے (۱)۔ آئندہ سال مظاہر علوم میں پھر دورہ حدیث میں داخل ہوئے؛ لیکن سہ ماہی امتحان

(۱) واضح ہو کہ مدارس اسلامیہ میں پہلے آخری نمبرات (۱۰۰) نہیں؛ بل کہ (۵۰) ہی ہوا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تو شعبان ۱۳۳۰ھ مطابق جولائی - اگست ۲۰۰۹ء کے سالانہ امتحان تک آخری نمبرات (۵۰) ہی تھے، البتہ امتحان سالانہ شعبان ۱۳۳۱ھ مطابق جولائی - اگست ۲۰۱۰ء سے مجلس شوریٰ نے آخری نمبر (۱۰۰) کر دیے ہیں، جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں یہ تبدیلی کئی سال پہلے رو بہ عمل آ چکی ہے۔

پس مرگ زندہ

دے کے مدرسہ عالیہ فتح پوری مسجد دہلی آگئے اور یہیں دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ اُس وقت فتح پوری میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) استاذ حدیث تھے۔ مظاہر علوم میں آپ نے بخاری جلد اول اور ابوداؤد، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے، بخاری جلد ثانی مولانا عبد اللطیف صاحبؒ سے، مسلم شریف مولانا منظور احمد صاحبؒ سے، ترمذی، شمائل ترمذی اور طحاوی مولانا عبد الرحمن صاحبؒ کامل پوری سے، نسائی مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے پڑھی۔

حضرت قاری صاحبؒ، مظاہر علوم کے ایام طلب علمی میں، ہمیشہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ آپ اُن کے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کے دل دادہ تھے۔ تزکیہ و احسان اور سلوک و طریقت کے منازل اُن ہی کی نگرانی میں طے کیے اور آستانہ رب پر جہرہ سائی کے طور طریقے اُنھی سے سیکھے۔ اُنھوں نے ۱۳۷۶ھ میں آپ کو خلافت و اجازت کے خلعت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے وصال کے بعد، وقت کے نامور علماء و مشائخ سے سلسلہ زیارت و استفادہ و مشورہ جاری رکھا، جن میں حضرت تھانویؒ کے خلفا مولانا شاہ وصی اللہ آبادیؒ، مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوریؒ، مولانا شاہ ابرار الحق ہر دویؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ اور مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ سرفہرست ہیں۔

✽ تدریسی زندگی: فراغت کے بعد تدریسی زندگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند ماہ گونڈہ مدرسہ فرقانیہ اور چند سال فتح پور مدرسہ اسلامیہ میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ اُسی زمانے میں علاقے میں فتنہ ارتداد اُٹھ کھڑا ہوا۔ حفاظتِ دین کے جذبے نے تقاضا کیا کہ اس فتنے کا قلع قمع کرنے کے لیے کمر بستہ ہوں۔ چنانچہ آپ نے ”فتح پور“ چھوڑ دیا اور فتنے کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دن رات کی جدوجہد اور سعی، خدا کے فضل سے مقبول ہوئی اور فتنہ فرو ہو گیا، جو لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے تھے، از سر نو اسلام کے دامن میں آ گئے۔

✽ ازدواجی زندگی: ۱۹۶۶ء میں آپ رخصتہ از دواج میں منسلک ہوئے، آپ کے دس لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں: ۶ لڑکیاں اور ۴ لڑکے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بچپن میں فوت ہو گئے۔ باقی تین صاحب زادے، صاحب علم و کمال ہیں اور تدریسی و دعوتی و تربیتی کاموں میں اپنے عظیم والد کی جانشینی فرما رہے ہیں، جن میں سب سے بڑے مولانا سید حبیب احمد مظاہری، دوسرے مولانا قاری سید نجیب احمد قاسمی اور تیسرے مولانا قاری حبیب احمد مظاہری ہیں۔ چاروں صاحب زادیاں بھی متزوج اور صاحب اولاد ہیں۔

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی

✽ مدرسے کا قیام: آپ نے علاقے کی بددینی، لوگوں کی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت، بدعت و جہالت کی پھیلی ہوئی تاریکی، کفر و الحاد اور ارتداد کے روز افزوں حملوں اور علاقے میں اسلامی تعلیمی ادارے کے عدم موجودگی کو دیکھتے ہوئے، اپنے گاؤں ”تھورا“ میں ایک مدرسہ ”جامعہ عربیہ اسلامیہ“ کی بنیاد رکھی۔ حال آں کہ اس کی راہ میں مشکلات کے سیلاب آتے رہے؛ لیکن آپ نے خونِ جگر سے، اُسے پروان چڑھایا اور مکتب کی منزل سے ترقی دے کر ہندوستان کی ایک اہم اسلامی درس گاہ بنا دیا۔ مدرسے اور لوگ بھی قائم کرتے ہیں؛ لیکن طوفانوں میں شمع جلانا اور زمینِ سنگلاخ میں سنبُل پیدا کر لینا، ہر ایک کا کام نہیں۔ آپ نے اس مدرسے کے قیام کے علاوہ، دور دراز کے گاؤں میں بھی دینی تعلیم کے لیے بہت سے مکاتب قائم کیے۔

آپ نے بندوں کی اصلاح، نیز بدعت و جہالت اور مسلم معاشرے میں پھیلے ہوئے ہندو اند رسوم و رواج کے قلع قمع کے لیے، اپنی پوری کوشش صرف کر دی اور پیغامِ اسلام کی اشاعت، خدمتِ خلق، تزکیہٴ اخلاق اور اسلامی و عربی علوم کی تعلیم و تدریس میں اپنی تمام تر توانائیاں لگا دیں۔ دعوتی و تربیتی ذمے دار یوں کی انجام دہی کے لیے باصلاحیت جماعتیں پیدا کر دیں۔ آپ کی پوری زندگی، جد و جہد، حرکت مسلسل اور گردشِ پیہم سے عبارت تھی۔ ہر سفر کا اختتام، دوسرے سفر کا آغاز ہوتا تھا۔ بقول عربی شاعر:

مَا بَ مِنْ سَفَرٍ إِلَّا إِلَى سَفَرٍ

(وہ ایک سفر سے واپس آ کر دوسرا سفر ضرور شروع کر دیتا ہے)

بارہا ایسا ہوتا کہ سفروں اور دوروں سے رات کے اخیر حصے میں مدرسہ واپسی ہوتی، طلبہ کو اٹھاتے اور وضو کے بعد درس گاہ میں اکٹھا ہو جانے کا اعلان کر دیتے؛ پھر انھیں حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر علوم میں سے، جو اُس وقت پڑھانا چاہتے، پڑھاتے۔ مکان کا نام و نشان ہوتا اور نہ کسی طرح کی اکتاہٹ کا احساس، بیماری کی شکایت ہوتی اور نہ تھوڑی دیر سستا لینے کی خواہش، بس یوں سمجھیے کہ اُن کی پوری زندگی، مجاہدانہ تگ و دو، جنبشِ مسلسل، نشاطِ جاوداں اور جہادِ پیہم کا نام تھی۔ اقبال کا یہ تخیل آپ کی زندگی میں حقیقت بن گیا تھا:

سفرِ زندگی کے لیے، برگ و ساز

سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

✽ تالیفات: آپ کی متحرک زندگی، قلمی اشتغال کا موقع نہیں دیتی تھی؛ لیکن آپ نے تصنیف

وتالیف کا صاف سحر اذوق پایا تھا۔ بے پناہ مشغولیتوں کے باوجود، جو قلمی سرمایہ آپ کی یادگار ہے، وہ اس بات کا شدید عدل ہے۔ ذیل میں چند تصنیفات کے نام درج ہیں:

- ۱۔ تسہیل التجدید ۲۔ احکام میت ۳۔ آداب المعلمین والمُتعلِّمین ۴۔ تسہیل المنطق ۵۔ حق نما ۶۔ فضائل نکاح ۷۔ تسہیل الصرف ۸۔ إسعاد الفقہوم شرح سلم العلوم ۹۔ تسہیل الخو ۱۰۔ فضائل علم ۱۱۔ قواعد فارسی ۱۲۔ سیرت نبوی پر سنن کی ترتیب سے واقعات کا بیان ۱۳۔ نماز کے موضوع پر ایک عمدہ کتابچہ ۱۴۔ منظوم مجموعہ کلام ۱۵۔ تسہیل السامی شرح ”شرح جامی“۔

✽ قاری صاحب اور شاعری: قاری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں علمی و عملی صفات سے نوازا تھا، جن میں ذہن و فکر کی موزونیت، طہائیت قلب، سکون دل، خاص نعمت تھی، جو انھیں خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی؛ اسی لیے وہ اعلیٰ پایے کے عارف باللہ اور ٹھوس علم والے عالم اور بے پناہ فیضان والے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ، باکمال شاعر بھی تھے، انھوں نے حمد و نعت، واردات قلب، دعوت دین، فکر اسلامی وغیرہ موضوعات پر جو اشعار کہے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں، جن میں انتہائی سادگی کے ساتھ، انتہائی پرکاری ہے اور الفاظ کی بے ساختگی کے ساتھ دل کا درد ہے، جو لفظ لفظ سے مپٹتا ہے اور قاری کو دل کی دولت سے مالا مال کر جاتا ہے، اُن کے اشعار میں روانی اور آمدا رنگ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو علما و صوفیاء کے یہاں اُسی وقت نظر آتا ہے، جب زبان پر گرفت کے ساتھ دردِ دل کی دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار کے مجموعے ”کلام ثاقب“ اور ”فیضان صدیق“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اُن دونوں سے پہلے ”گل دستہ ذوق“ اور ”صہبائے مدینہ“ کے نام سے بھی دو مجموعے شائع ہوئے تھے، جن میں دیگر حضرات کا کلام بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

اُن کی ایک نعت کا عنوان ہے ”مدینہ کی جدائی“ یہ نعت بہت مشہور ہے۔ یہاں دو ایک نعتوں اور دیگر اشعار کے کچھ نمونے پیش ہیں:

﴿مدینہ کی جدائی﴾

کسی مجلس میں جب نعتِ شبِ عالم سناتے ہیں
فضائیں رقص کرتی ہیں، فرشتے جھوم جاتے ہیں
شبِ معراج میں ختمِ رسل کا مرتبہ دیکھو
جہاں کوئی نہیں پہنچا، وہاں تک آپ جاتے ہیں

کوئی اعجاز تو دیکھے مرے قرآنِ ناطق کا
 لقب اُمی ہے؛ لیکن علم کا دریا بہاتے ہیں
 اُترتے ہیں فرشتے آسمان سے پاسبانی کو
 چرانے بکریاں صحرا میں جب سرکار جاتے ہیں
 پلٹ آتا ہے سورج ڈوب کر حکمِ رسالت سے
 اشارے سے اُسے جب سرورِ عالم ہلاتے ہیں
 یہ ہے شانِ نبوت، چاند ہو جاتا ہے دو ٹکڑے
 شہ کون و مکاں جب ہاتھ کی انگلی ہلاتے ہیں
 اُبل پڑتا ہے چشمہ بن کے برتن میں جو تھا پانی
 شہ دیں انگلیاں جب ہاتھ کی اُس میں لگاتے ہیں
 لگا لیتے ہیں ہم سرمہ سمجھ کر آنکھ میں اپنی
 مدینے پاک کی جس وقت بھی ہم خاک پاتے ہیں
 مدینے کی جدائی اب بہت ہی شاق ہے ثاقب
 نہ جانے کب تلک مولیٰ مجھے طیبہ ہلاتے ہیں

﴿تمننا ے مدینہ﴾

تمننا ہے کہ گل زارِ مدینہ اب وطن ہوتا
 وہاں کے گلشنوں میں کوئی اپنا بھی چمن ہوتا
 بسر اب زندگی اپنی دیارِ قدس میں ہوتی
 وہیں جیتا وہیں مرتا، وہیں گور و کفن ہوتا
 میسرِ بال و پر ہوتے تو میں اُڑ کر پہنچ جاتا
 زہے قسمت کہ اپنا آشیاں اُن کا چمن ہوتا
 نمازوں میں انہی کے درپہ میں کرتا جبین سائی
 تلاوت کا ترنم اور جنت کا چمن ہوتا

پس مرگ زندہ

مقدر سے رسائی اُن کے در تک کاش ہو جاتی
متارِ جاں، ثارِ روضہ شاہِ زمن ہوتا
کبھی کچھ ہے مگر جب وہ نہیں، کچھ بھی نہیں حاصل
وہیں ہوتا جہاں اے کاش وہ جلوہ گلن ہوتا
خدا شاہد کہ ہم سارے جہاں پر حکم راں ہوتے
رسولِ پاک کی سنت اگر اپنا چلن ہوتا
تمنا ہے کہ کتنی عمر اُن کے آستانے پر
عنایتِ جلوہ گر ہوتی، کرم سایہ گلن ہوتا
خوش قسمت کہ ہوتا کوچہ محبوب میں مسکن
انہی کی راہ میں قربان اپنا جان و تن ہوتا
یہی ہے آرزو ثاقب، یہی اپنی تمنا ہے
کہ پیوندِ بقیعِ پاک، اپنا بھی بدن ہوتا

﴿خفتہ انگلیں﴾

تمنا ہے کہ اب کوئی جگہ ایسی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے ہوتے، یاد اُن کی دل نشیں ہوتی
وہاں رہتا جہاں پر، عالمِ آہ و فغاں ہوتا
وہاں بستا جہاں اشکوں سے تر، اپنی جہیں ہوتی
وہ مے خانے کہ جن میں سیکڑوں متانے، رہتے تھے
وہ سب سونے پڑے ہیں، اُن کی آبادی نہیں ہوتی
نہ ساقی اُن کا باقی ہے، نہ دورِ جام باقی ہے
کہیں پینے بھی جاتے ہیں، تو سیرابی نہیں ہوتی
غموں سے زندگی اپنی، بہت دو چار رہتی ہے
کسی دن بھی نہیں، خوش خاطر اندوہ گیس میری

مجھے مجرم بنانے کی جو اسکیمیں بناتے ہیں
 کبھی تقصیر پر ، اپنی نظر اُن کی نہیں ہوتی
 مرا بس جرم اتنا ہے کہ مومن اور مسلم ہوں
 حقیقت میں جو مجرم ہیں ، گرفت اُن کی نہیں ہوتی
 معافی مانگنے کو مانگ لوں سو بار میں لیکن
 کوئی تقصیر تو میری کہیں ، اے ہم نشیں ہوتی
 وفاداری کی میری کاش ، اُن کو قدر ہو جاتی
 کبھی تو مرجھا کہتے ، کبھی تو آفریں ہوتی
 بدوں حبِ نبی انسان ، جو دنیا میں رہتے ہیں
 مکمل زندگی اُن کی ، کسی حالت ، نہیں ہوتی
 نبی کی راہ سے ہٹ کر ، جو اپنی راہ چلتے ہیں
 کبھی توفیق اُن کو ، خیر کی جانب نہیں ہوتی
 پیہر کی شریعت سے ، کبھی جب قوم ٹہتی ہے
 خدا کی رحمت و نصرت ، اُسے حاصل نہیں ہوتی
 پہنچ سکتا نہیں ، وہ منزل مقصود تک ہرگز
 عنایتِ شیخِ کامل کی ، جسے حاصل نہیں ہوتی
 قیامت میں ہے وعدہ دید کا ، لیکن قیامت ہے
 دلِ مضطر کی خواہش ہے ، ابھی ہوتی یہیں ہوتی
 مدینہ پاک تک ، میری رسائی کاش ہو جاتی
 بتاؤں کیا کہ میری زندگی ، کیسی حسین ہوتی
 زیارت کے لیے ، در پر مری جب حاضری ہوتی
 میں سجدہ ریز ہوتا ، خاک آلودہ جیہیں ہوتی

پس مرگ زندہ

نظر جس وقت پڑتی، روضہ اقدس کی جالی پر
نگاہ اولیں اپنی، نگاہ واپس ہوتی

بڑی حسرت ہے ثاقب کی کہ رہتا وہ مدینے میں

سپر و خاک جب ہوتا، مدینے کی زمیں ہوتی

✽ عہدے و مناصب: حضرت قاری صاحب مختلف بڑی اسلامی درس گاہوں اور مدارس کے معزز رکن مجلس شوری تھے، جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ الرشاد بنکی، ضلع بارہ بنکی اور دوسرے جامعات و مدارس ہیں؛ جب کہ غیر رسمی شکل میں بے شمار مدارس اُن کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ ان سب مدارس کے ذمہ دار حضرات اُن سے مشورہ اور راہ نمائیاں حاصل کرتے، اُن کی رائے کے آگے سر تسلیم خم کر دینا باعث سعادت سمجھتے اور اُن کے مشوروں و تجویزوں کی قدر کرتے۔ ہندوستان کے مسلمان عوام اُن کی راہ میں اپنی آنکھیں، اپنا قلب و جگر، متاع روح و جاں سب کچھ بچھا ڈالتے تھے؛ چنانچہ جب کسی مدرسے کو امداد دینے کے سلسلے میں آپ کا دل مطمئن ہوتا اور مسلم عوام کو اُس مدرسے کے لیے، دست تعاون بڑھانے کا مشورہ دیتے، تو اُنھیں اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بس اُن کا فرمان صداقت کی علامت ہوتا تھا۔

ایک عجیب سی دلکشی تھی، بے مثال ہر دل عزیز کی تھی اور ناقابل بیان سحر طرازی تھی، اُن کی شخصیت میں۔ بزرگ بہت دیکھے اور سنے؛ لیکن سیرت رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی سراپا رحمت اور فی الفور مانوس ہو جانے اور مانوس کر لینے والی شخصیت، اپنی مختصر سی زندگی میں ”مولانا حافظ قاری سید صدیق احمد باندوی“ رحمۃ اللہ علیہ کی دیکھی، ایک ہی نظر میں آنکھوں میں بس جانے اور دل میں سما جانے والی شخصیت: ع

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا

خداے پاک اپنی رحمتوں کی بارش اُن پر برسائے، اُن کی قبر کو بہشتی جہرہ کہ بنائے، اُنھیں اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، اپنے نیک اور فخلص بندوں سا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، انبیا و صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ اٹھائے۔ اُن کے اہل خانہ، رشتہ دار و اقارب، متعارفین و محبین اور اُنھیں بھلائی کے ساتھ یاد کرنے والوں کو صبر و حکیمانہ عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“، عربی شمارہ ۶، جلد ۲۱، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ = اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی^۲

لذیذ یادیں اور عزیز باتیں (*)

۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء — ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
انگوشت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

راقم الحروف کو علم و فضل، صلاح و تقویٰ اور شہرت و ناموری رکھنے والے بہت سے مشاہیر پر لکھنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ مشاہیر پر لکھنا آسان بھی ہے اور اُن پر لکھنے کی ہر ایسے شخص کو خواہش ہوتی ہے، جو تحریری صلاحیت اور حسنِ بیان اور تصنیف و تالیف پر قدرت رکھتا ہو؛ بل کہ مشاہیر پر قلم اُٹھانے کے لیے، بعض دفعہ ہر کس و ناکس کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے، خواہ اُس کے پاس تحریری صلاحیت یا خوبی بیان نام کی کوئی چیز نہ ہو؛ اس لیے کہ مشاہیر کا تذکرہ بسا اوقات تذکرہ کنندہ کی شہرت اور معاشرے میں اُس کی عمدہ ساکھ کا سبب ہوتا ہے اور کون ہے جو پاکیزہ شہرت اور نیک نامی کا خواہاں نہ ہو؟ مزید برآں مشاہیر پر لکھنے اور بولنے کے لیے، اکثر و بیشتر مواد کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اُن کے حوالے سے گفتگو کا میدان اس قدر کشادہ ہوتا ہے کہ کسی مقرر یا مضمون نگار کے لیے کسی تنگی کا کوئی شکوہ بھی ہو سکتا ہے، جب خود اُس کے قدم جواب دے جائیں۔

(۱) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی ثناء اللہ قاسمی مظفر پوری، شائع شدہ در سالہ ”دارالعلوم“ شمارہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ مطابق

محض علم اور علمی بڑائی، عمل کے بغیر کوئی چیز نہیں

لیکن میں آج کی صحبت میں ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں جو نہ عالم تھے، نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہ کوئی گریجویٹ، نہ روایتی معنی میں کوئی ”شیخ“ اور نہ ہی آج کے انسانی معاشرے میں متعارف اصطلاح میں ”بزرگ ہستی“ علم کی عظمت و برتری، بحث و تحقیق کی اہمیت، آگہی و معرفت کے سمندر میں غوطہ زنی کی قدر و قیمت، انکشافات اور دریافتِ معلومات کے حصول اور اس راہ میں بھوک و پیاس سے بے نیاز رہ کر آفتاب کے برف کو پگھلا دینے کی طرح، ارادے کو گھلا دینے والی مشقتوں اور تکلیفوں کو سہ کر، پیہم سفر کرتے رہنے کے مقام و مرتبے کے مکمل اعتراف کے ساتھ، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض علم اور علمی بڑائی و کمال آگہی کوئی چیز نہیں، جب تک کہ ایک اہل علم کو، علم کے کردار کو مکمل کرنے اور اُس کے مشن کو انجام تک پہنچانے والی چیز میسر نہ ہو، یعنی جب تک صداقت و امانت، زندگی کے فرائض کے حوالے سے سچی پیہم، حقوق و واجبات کی ادائیگی، عہد و پیمان پر کاربندی اور اپنے بھائیوں یعنی معاشرہ انسانی کے افراد سے خندہ روئی و نرم خوئی، دل جوئی و کشادہ نظری اور فراخ دلی اور مختصر لفظوں میں انسانی خصائل اور خدائی اخلاق کے ساتھ برتاؤ کرنے کا عادی نہ ہو۔

نسبتاً گم نام؛ لیکن انتہائی نیک نام

آج مجھے ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنی ہے جو نسبتاً گم نام رہا؛ لیکن ہندوستان کی مشہور اور عظیم و قدیم جامعہ اسلامیہ ”دارالعلوم دیوبند“ میں مسلسل ۶۳ سال تک (از شوال ۱۳۵۵ھ مطابق نومبر - دسمبر ۱۹۳۶ء تا شوال ۱۴۱۸ھ مطابق جنوری ۱۹۹۸ء) دفتر تعلیمات کے محرر پھر منشی اور پیش کار کی حیثیت سے، اپنے کام کے دوران یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اسلامی اخلاق کا پابند مسلمان، اپنے رب کا شکر گزار نیک بندہ،

خادم خلق خدا اور بہت سے علماء و تعلیم یافتہ حضرات سے بھی فائق اور تحقیق و مطالعہ میں مشغول رہنے والے بے شمار لوگوں کے لیے قابل رشک تھا۔ وہ امانت دار، محتج، مخلص، ثواب کی نیت سے کام کرنے والا اور صبر و رضا کی خوبیوں سے متصف، اپنی ذمہ داریوں کا مکمل احساس رکھنے والے ملازم کا قابل تقلید نمونہ تھا؛ خداے ذوالجلال نے سچ فرمایا ہے۔ ”إِنَّ خَيْرَ مَنْ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ“ (۱) ترجمہ: کیوں کہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط ہو اور امانت دار بھی ہو۔ (تھانوی)

دارالعلوم سے وابستگی

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ ۲۲ سال ہی کی عمر میں، یعنی ۷ شوال ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۳۶ء سے دفتر تعلیمات میں محررِ اجیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے اُن کا سنہ ولادت ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء ہے۔ ۶ ربی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۳۷ء کو باضابطہ ملازم کی حیثیت سے محرر منتخب ہوئے۔ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے محرر کے عہدے پر انھیں مستقل کر دیا اور مجلس شوریٰ ہی نے ۵ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۵ جون ۱۹۶۵ء کو انھیں ترقی دے کر، اُسی دفتر کا منشی (پیش کار) بنادیا، تا آں کہ مجلس عاملہ نے ۲۹-۳۰ شوال ۱۴۱۸ھ کے اپنے اجلاس میں اُن کے فاج کاشکار ہو جانے اور نقل و حرکت سے معذور ہو جانے کے بعد، آغاز ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء سے انھیں پینشن دے دی۔

اس طرح دارالعلوم میں اُن کی خدمت کے طویل زمانے کا دور ختم ہو گیا، جیسا کہ عمریں ختم ہو جاتی ہیں، خواہ کتنی ہی لمبی ہوں اور دنیا کو بھی ایک دن ختم ہو جانا ہے خواہ جتنے بھی دن آباد رہے۔

اعلیٰ پایے کا انسان

موصوف صرف اسکول کے سکنڈری پاس تھے، کسی مدرسے میں علما سے تعلیم حاصل کیانہ کسی شیخ مربی سے تربیت پائی اور نہ ہی علما کے اُن خصوصی آداب سے واقف ہو سکے تھے، جن سے مدرسے کے ماحول میں زندگی گزارنے والوں کو آشنا ہونے اور ایک خاص ذوق و رنگ میں ڈھل جانے کا موقع ملتا ہے۔

لیکن آپ حیرت زدہ ہوں گے جب میں آپ سے یہ کہوں کہ اُن کی ملازمت کے اس طویل عرصے میں، جو اکثر و بیشتر بہت سے افراد کی عمروں کا عرصہ ہوتا ہے، کسی شخص کو نہ اُن سے تکلیف پہنچی، نہ کسی چھوٹے بڑے کو اُن سے پریشانی کا احساس ہوا، نہ کسی ذمے دار کو کبھی اُن سے شکایت کا موقع ملا، نہ اُن سے اعلیٰ یا ادنیٰ کارندوں کو اکتاہٹ محسوس ہوئی اور نہ کسی نے انھیں کسی خیانت یا فریب دہی، یا کسی ایسے معاملے میں جو قریب یا دور سے مرآت کے خلاف ہو تہمت دی۔

حال آں کہ وہ ایسی جگہ پر کام کرتے تھے کہ کام کے پورے اوقات؛ بل کہ اُن کی خدمت کے طویل عرصے میں، انھیں سینکڑوں آدمیوں سے ملتے رہنا ہوتا تھا، یعنی ایسے طلبہ سے جن میں اگر شریف، شایستہ، نیک، باعزت اور پاکیزہ خاندان سے آئے ہوتے ہیں، تو بعض غیر شایستہ بھی ہوتے ہیں، جنھیں تعلیم و تربیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا؛ بل کہ بعض دفعہ انھیں اتنی بھی شُدد بد نہیں ہوتی کہ وہ انسان اور بے زبان جانور میں امتیاز کر سکیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تحصیل علم اور نشوونما کی منزل میں ہوتے ہیں، مزید برآں یہ کہ اُن میں جوانی کا جوش، بچپن کی ناکہجی، نوعمری کی تیزی اور بچوں کی وہ جلد بازی ہوتی ہے، جس کی بنیاد نہ کسی باشعور سوچ، جس سلیم اور روشن ضمیری پر ہوتی ہے نہ کسی پختہ تجربے پر کہ وہ اپنے لیے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے لیے محض مفید ثابت ہوں اور ضرر رساں یا تکلیف دہ مٹی پہلوؤں سے اپنے کو اور دوسروں کو بچا سکیں۔

نیز ایسے علماء و اساتذہ سے انھیں سابقہ پڑا، جن میں ایک طرف متقی و پرہیزگار، بردبار و مخلص، اُسوۂ رسول ﷺ کے پیرو، متواضع اور خدا سے ڈرنے والے ہوتے تھے۔ جیسا کہ اُن میں دوسری طرف بعض ایسے بھی ہوتے تھے، جنھیں اپنی عقل و فکر اور علم و فہم پر ناز ہوا کرتا تھا، انھیں اپنی رائے و شخصیت پر بے جا اعتماد کا ضرورت سے زیادہ احساس ہوتا تھا، اُن میں جلد غصہ ہونے والے، بڑے حساس بھی ہوتے تھے اور اپنے آپ کو بے جا اہمیت دینے والے بھی، ہر وقت ناک و بھوٹ چڑھانے والے، ہر عمل سے پیشانی پر بل لانے والے، اپنا حق پورا پورا وصول کرنے والے اور دوسروں کا حق کم دینے والے بھی ہوتے تھے۔

بہر حال طلبہ و اساتذہ، پڑھنے اور بڑھانے والے سب کے سب انسان ہی ہوتے ہیں اور کون ابنِ آدم ہے جس سے غلطی سرزد نہ ہو؟ انسان خواہ کتنی ہی رفعت و بلندی کو پہنچ جائے فرشتہ نہیں بن سکتا کہ اُس سے خطا و نسیان کا صدور نہ ہو، یہی اللہ کی حکمت و مشیت ہے۔ ایک انسان محض علم کا لبادہ اوڑھ لینے سے فرشتہ معصوم نہیں ہو جاتا؛ بل کہ حسبِ عادت وہ نقائص و فضائل سے مُرکَّب، خیر و شر اور صلاح و فساد کا مجموعہ ہی رہتا ہے۔ بسا اوقات بعض انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت و توفیق سے اتنی ترقی کر جاتے ہیں کہ فرشتوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہو جاتے ہیں اور بعض اتنی پستی میں چلے جاتے ہیں کہ شیطان بھی اُن سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔

وفات

دارالعلوم کے اس معاشرے اور طلبہ و اساتذہ سے کھپا کھپ بھری اس جگہ میں منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی، رحمۃ اللہ علیہ نے (جو مرض فاج میں ایک سال نو ماہ از دی الحجۃ ۱۴۱۷ھ تا رمضان ۱۴۱۹ھ گزار کر ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء جمعہ کی صبح چار بجے ربِّ حقیقی سے جا ملے) ۶۳ سال ملازمت کی اور ایسے تمام اوصاف کا

نمونہ چھوڑ گئے، جن سے ہر مسلمان ملازم اور مومن کار گزار کو آراستہ ہونا چاہیے، یعنی پختہ کاری، محنت، اوقات کی پابندی، نظام و قوانین پر کار بندی اور کام کو انجام تک پہنچانا خواہ وقت مقررہ کے علاوہ گھنٹوں مزید کام کرنا پڑے۔ اس طریقے پر وہ ایک دن، دو دن، چند ہفتے، چند مہینے یا چند سالوں ہی کار بند نہیں رہے؛ بل کہ اپنی ملازمت کے پورے عرصے میں اُن کا یہی معمول رہا۔

منشی عزیز کا کمال

ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا بہ خوبی علم ہے کہ ایسے منصب پر کام کرنا جہاں مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو، پھر اتنے لمبے عرصے تک! انتہائی نازک کام ہے، طبعی طور پر اس طرح کے ملازم سے اگر کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں، تو کچھ لوگ ناراض؛ اس لیے کہ معاشرے کے ہر فرد کی رضا مندی ایک ناقابل حصول مقصد ہے۔ طلبہ کے معاشرے سے، خصوصاً دفتر تعلیمات کی پیچیدگیوں سے واقف کار کو، یہ بات بہ خوبی معلوم ہے کہ ایک ایسا ملازم جس کے ہاتھ میں، طلبہ و اساتذہ سب کے انتظامی امور کی باگ ڈور ہو، اگر ایک شخص کو خوش کرنا چاہے گا، تو یقینی طور پر دوسرے کو ناراض کرنا پڑے گا؛ اس لیے کہ بسا اوقات ایسے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں کہ بعض مراجعت کنندگان کو ذمہ داران یا منشی کی طرف سے کیے گئے فیصلے سے ضرور شکایت ہوتی ہے۔

لیکن منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ، جنہیں اللہ تعالیٰ نے خوش اسلوبی و تواضع اور نرم خوئی سے نوازا تھا، ہر شخص کے ساتھ اس طرح پیش آتے رہے کہ کسی کو خفگی کا موقع نہیں ملا؛ بل کہ سبھوں کے دل اُن سے اتنے شاداں و فرحاں رہے کہ اُن کے دل اور زبان سے اُن کے لیے دعائیں نکلیں۔

اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری مخلوق کی دعاؤں کو اُن کے حق میں واقعی قبولیت سے نوازا کہ اپنے جوار رحمت میں انھیں بلانے کے لیے، مبارک دن یعنی روز جمعہ کا اور اُس

مبارک مہینے کا انتخاب کیا، جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں بعد نماز جمعہ دسیوں ہزار لوگوں نے اُن کی نمازہ جنازہ پڑھی، دارالعلوم کے کبار مشائخ کے علاوہ کسی کی نمازہ جنازہ میں اتنی بڑی تعداد نے شرکت نہیں کی ہوگی، کیوں کہ دیوبند کی دسیوں مساجد میں جمعہ ادا کرنے والوں نے اس جنازے میں شرکت کی اور اُن کی آخری آرام گاہ ”مزار قاسمی“ تک انھیں رخصت کیا۔

منشی عزیز اور لذیذ یادیں

یادش بخیر کہ دارالعلوم میں داخلے کے لیے، میں ۶ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم کے احاطے میں ”باب قاسم“ نامی صدر گیٹ سے داخل ہوا، جب کہ فجر کی اذان اُس کے میناروں سے گونج رہی تھی، میرے ہم راہ میرے تعلیمی سفر کی بیشتر منزلوں کے ہم سفر برادر مولانا مجیب الرحمن راے پوری قاسمی اور برادر معظم جناب مولانا اولیس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۶/۳/۱۳۱۹ھ مطابق ۲۵/۹/۱۹۹۸ء) کے برادر اصغر مولانا عمیس اختر راے پوری تھے۔

میں احاطہ دفتر سے گزر کر، دفتر اہتمام کے نیچے والے دروازے سے داخل ہو کر احاطہ مولسری میں جا نکلا، پھر دائیں جانب یعنی شمال مغرب کا رخ کیا، دارالحدیث اور درس گاہوں کے درمیانی راستے سے گزرا، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کشادہ پارک ہے جس سے مختلف راستے پھوٹ رہے ہیں، یہ پارک دار جدید (یعنی دارالعلوم کا مشہور دار الاقامہ) کا صحن ہے، بعد ازاں شمال کی جانب مدنی گیٹ کی طرف گیا اور اُس گیٹ کے پچھم والے زینے سے پہلی منزل پر چڑھ گیا، مغرب کا رخ کیے کمروں سے گزر رہا تھا، تا آن کہ جنوب کی طرف کو ایک دو قدم مڑا اور سہ پایہ زینے سے ایک کمرے میں داخل ہوا جس کا نمبر اُس وقت ۳ تھا اور یہیں میں نے رحمت سفر کھول دیا، اس سفر میں ہمارے بھائی عمیس اختر کی رہ نمائی رہی جو دارالعلوم کے قدیم طالب علم تھے اور انھوں نے ہی

رات کے وقت ”سہارن پور“ اسٹیشن آکر ہمارا استقبال کیا اور دیوبند لے جا کر ہمیں اپنے کمرے میں اتارا۔

دارالعلوم کی بھاری بھر کم دیواروں والی عمارت، کافی دور تک بہت سی عمارتوں کے پھیلاؤ اور پہاڑ کی سی اونچائی و بلندی اور پر شکوہ قلعے کی شان و شوکت نے، مجھے مرعوب کر دیا تھا؛ کیوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسے مدرسے کو کیوں دیکھا ہوگا، جو غریب مسلمانوں کے چندے سے دین کی خدمت اور کتاب و سنت کو زندہ کرنے میں شہرت کے حوالے سے اس کا کسی بھی طرح ہم پلہ ہو۔

ہم نے فجر کی نماز دارالعلوم کی قدیم مسجد میں ادا کی، آنے جانے میں ایک دوسرے راستے سے گزرے، جو دوسری پر شکوہ عمارتوں سے گزر رہا تھا، اب میری وہ مرعوبیت اور دو چند ہو گئی جو دوستوں، استاذہ کرام اور آنے جانے والے بے شمار لوگوں کی زبانی اُس کے متعلق سن کر میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

منشی عزیز سے پہلی ملاقات

تقریباً ساڑھے سات بجے صبح دفتر کھلنے کا وقت ہوا، ہم امتحان داخلہ کی ابتدائی کاروائیاں انجام دینے کے خاطر، بھائی عمیس اختر صاحب کے ہم راہ دفتر گئے، اُس زمانے میں تقریری امتحان ہوا کرتا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دفتر میں سامنے میانہ قد، وجیمہ اشکل اور حلیم و کریم ایک بزرگ ہیں، جو ہر آنے جانے والے سے زمیں کی سی خاک ساری سے ملتے ہیں۔ اُن سے ملتے ہی قلب پر چھائی دہشت و ہیبت اور امتحان داخلہ اور اُس کے حوالے سے پیش آنے والی مشکل صورت حال کا خوف جاتا رہا۔ یہ بزرگ سنجیدگی و بشارت کے جامع، متواضع، ہر ملنے والے کی طرف مکمل توجہ دینے والے تھے۔ دفتر تعلیمات سے نکلتے ہوئے ہم نے بھائی عمیس سے پوچھا: یہ بزرگ کون ہیں؟ اُنھوں نے بتایا: اس دفتر کے منشی محمد عزیز ہیں۔

اس پہلی ہی ملاقات میں منشی محمد عزیز نے میرے دل میں ایک ایسا شیریں، خوش گوار اور راسخ نقشہ جما دیا اور میرے دماغ میں ایسا پاکیزہ دائمی چھاپ چھوڑ دیا، جو اس پل بھر کی ملاقات کے وقت سے ہنوز مٹا نہیں ہے اور ان شاء اللہ کبھی نہیں مٹ سکتا، ایسا تاثر جس کی برکت سے غیر شعوری طور پر مجھے یقین سا ہو گیا کہ آئندہ چند دنوں کے دوران ہونے والے امتحان داخلہ میں کامیاب ہو جاؤں گا اور میرا امدادی داخلہ بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ واقعی وہی کچھ ہوا، جو میرے جی میں اس خوش گوار اور بشارت آمیز تاثر کی وجہ سے آ رہا تھا کہ میرا اور میرے رفیق برادر م محیب الرحمن کا تمام سہولتوں کے ساتھ داخلہ ہو گیا۔

۱۶/۱۰/۱۳۸۷ھ مطابق ۱۶/۱۲/۱۹۶۷ء کو دارالعلوم میں داخلے کی کارروائیاں مکمل ہو گئیں، خوف و ہراس کا احساس جاتا رہا، ناامیدی آمیز رعب ختم ہو گیا، کیوں کہ تاب ناک یقین حاصل ہو چکا تھا اور پرفیکٹ سرور سے قلب و جگر مؤثر ہو گیا تھا، جس کا اثر چہرے پر نمایاں تھا۔

منشی محمد عزیز کی انفرادیت

تعلیمی زندگی میں منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اُن گنت بار ملنے کا اتفاق ہوا، ہر دفعہ میرے دل میں اُن کی محبت و قدر افزائی کے جذبات مزید پروان چڑھتے گئے؛ اس لیے کہ میں نے انھیں ایک سچے مسلمان کے اوصاف و اخلاق کا نمونہ دیکھا اور برتا۔ یعنی حسن کارکردگی، ہر آدمی کا احترام، حسن عمل، فرض شناسی اور معاشرۂ انسانی کے سارے افراد کو سمو لینے والی خوش طبعی، جس کی وجہ سے سبھی لوگ اُن کے لیے دل اور آنکھیں بچھانے لگتے۔ انھوں نے اپنی شیریں معاملگی کی وجہ سے اپنے سے نیچے کے سارے ملازمین کی رضامندی اور اپنے سے اوپر کے تمام ذمہ داروں کی خوش نودی حاصل کر لی تھی، اُن میں ایسی اعلیٰ ظرفی تھی کہ حسبِ موقع اپنے سے نیچے کے ملازمین

پس مرگ زندہ

اور رفقائے کار کی ذمّے داری کو انجام دینے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

تقریباً ۱۳ سال تک (از ۱۳۸۹ھ تا ۱۴۰۲ھ تک) یہ راقم الحروف دارالعلوم کے حوالے سے ہجر گاہ میں رہا، جہاں ہمیشہ دارالعلوم کے لیے وارفتہ رہا، ہر وقت حتیٰ کہ اپنے مادر وطن میں بھی دارالعلوم کی یاد ستاتی رہی اور ہمہ وقت خیالوں میں دارالعلوم ہی سمایا رہا، اُس کی درو دیوار اُس کی عمارتوں، میدانوں، اُس کے راستوں، پارکوں اور اُس کے دفاتر و کتب خانے کی یاد آتی رہی۔ دارالعلوم کے اساتذہ، وہاں کے ملازمین جن میں سرفہرست منشی محمد عزیزؒ تھے، کی یادوں میں وقت گزرتا رہا۔

رمضان ۱۴۰۲ھ جون ۱۹۸۲ء کو ہمارے اور ہماری ہم عصر نسل کے استاذ، مربی جلیل، عربی زبان کے معلم مثالی و استاذ لا یتانی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۵ء) کا خط ملا، جس میں انھوں نے دارالعلوم کی خدمت کے لیے، ناچیز کے انتخاب کی خوش خبری دی تھی، خط پڑھتے ہی ایسا لگا کہ دخول جنت کا پروانہ مل گیا ہے۔

نصف شوال ۱۴۰۲ھ مطابق نصف اگست ۱۹۸۲ء کو شوق کے پروں سے اور یوں کہنا چاہیے کہ گویا محبت و اعتقاد کے اگلے اور پچھلے بازوؤں کے ذریعے اڑتا ہوا میں دارالعلوم آیا اور مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق استاذ اور ”الداعی“ کے مدیر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگا۔

دارالعلوم کی تدریسی زندگی میں منشی محمد عزیزؒ سے پہلی ملاقات

حسن اتفاق کہ طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم سے جانے کے بعد جب میں استاذ کی حیثیت سے یہاں واپس آیا، تو منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اُسی منصب پر کام کرتے ہوئے پایا، جس پر وہ میری طالب علمی کے زمانے میں فائز تھے، میں نے دیکھا کہ وہ اُسی طرح نیک نام اور حسن شہرت کے حامل ہیں، عوام؛ بل کہ علما اور راہِ خدا میں

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی

لگے ہوئے طلبہ کی حسبِ سابق دعائیں لے رہے ہیں؛ وہی جاں فشانی، وہی تن وہی اور وہی رات و دن ایک کر دینے والی محنت، جس میں روٹنی وقت عمل اور خارج وقت میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا، حال آں کہ اب عمر زیادہ ہو چکی تھی، قوی کم زور ہو چکے تھے، اعصاب جواب دے رہے تھے، سن رسیدگی نے انگ انگ کو کم زور کر دیا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور پورے وجود سے اُن کے لیے دعائیں کیں۔

منشی محمد عزیز کی انسان نوازی

دارالعلوم میں آنے کے بعد سے ہوا یہ کہ اول احساسِ ذمہ داری کی اپنی افتاد کی وجہ سے، دوم: انشا و ادب کی تدریسی خدمت انجام دینے کے ساتھ بھرپور صحافتی عمل کے مزاج کے تقاضے کی بنا پر، سوم: بد قسمتی سے مختلف بیماریوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے، راقم کو مجبور ہونا پڑا کہ صرف اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دائرے میں اپنے کو محصور کر لے۔ لوگوں سے بڑی حد تک قطعِ تعلق کر لے اور مدرسوں کے ماحول میں کام کرنے والے اکثر بھائیوں کے طرزِ عمل کے برخلاف کہ وہ تعلقات پیدا کرنے اور تعلقات کی پختہ کاری میں خاصا وقت صرف کرتے رہتے ہیں (کہ بعض دفعہ یہ تعلقات اس مادی اور وسائل کی دنیا میں مفید بھی ہوتے ہیں) یہ ناچیز تعلقات سازی اور تعلقات داری سے بالکل پرہیز کرنے پر مجبور ہوا۔

چنانچہ اس طرح میرا دفترِ تعلیمات میں بھی آنا جانا کم ہو گیا اور یہ صورت ہو گئی کہ بغیر سخت ضرورت کے دفتر میں آنے جانے کے لیے، وقت نکالنا مشکل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے منشی محمد عزیزؒ کو جو ہمیشہ میرا احوال دریافت کرتے رہتے، اگر میں ایک دو ماہ تک اُن کی نظر سے اوجھل رہتا، تو بسا اوقات دریافتِ حال کے لیے، اپنے دفتر کے کسی دفتر دار کو میرے پاس ضرور بھیجتے، جب بھی اپنی ضرورت کے لیے اُن کے پاس کسی کو بھیجتا تو فوراً خوش خلقی کے ساتھ ضرورت پوری کر دیتے، وہ خداے

بزرگ و برتر خوب جانتا ہے جس نے میرے دل میں اُن کی بے پناہ محبت پیدا کر دی ہے کہ میرے دل کے تمام گوشے؛ بل کہ میرا وجود اُن کی زندگی میں بھی اُن کے لیے دعاؤں اور ثنا خوانی میں رطب اللسان رہا کرتا تھا۔ دفتر تعلیمات میں منشی محمد عزیزؒ کی موجودگی، ہر اُس ضرورت کی تکمیل کی جو مجھے یا کسی اُستاز یا کسی عزیز طالب علم کو پیش آتی، ضمانت ہوتی تھی؛ بل کہ اُن کی موجودگی ہمیشہ کامیابی اور بھلائی کی بشارت ہوا کرتی تھی۔

اُن کی یہ صفت بہت ساری صفات کی جامع تھی، کتنی بار مجھے آرزو ہوئی کہ کاش میں اُن کی اس صفت پر بہت سی نام نہاد نیکیوں، روایتی تقویٰ، مصنوعی ”بزرگی“ فخر گزیدہ علم و فضل اور غرور آمیز عبادت گزاری کو قربان کر سکتا۔

حال آں کہ وہ خود اس پہلو سے بھی اپنے ربِّ کریم کی طرف سے باتوفیق تھے؛ چنانچہ نماز باجماعت کی پابندی کے ساتھ، وہ تہجد گزار اور شب بیدار بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جن اخلاق و صفات کے حامل تھے اُن کا سرچشمہ درحقیقت اُن کی گہری دین داری، سچا تقویٰ اور دین و شریعت کی مکلف پابندی تھا۔

دارالعلوم کی عظمت کا راز

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کو اللہ تعالیٰ نے جو عظمت دی ہے (جس کی نظیر اس دیار کے دگر کسی ادارے یا یونیورسٹی میں نہیں ملتی) اور جو عوامی مقبولیت دی ہے، جس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی، ان دونوں باتوں کی بنیاد درحقیقت منشی محمد عزیزؒ جیسے مخلصین ہی ہیں، اُن مخلصین میں سرفہرست خود دارالعلوم کے بانیان و مشائخ اور یہاں کے اہل دل و فضلا ہیں، خدائے بزرگ و برتر کی یہ حکمت رہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی زمانے میں بھی مخلصین سے خالی نہیں رہا۔ ہر چند کہ آج عصر حاضر میں اُن کا تناسب قابل افسوس حد تک کم ہو گیا ہے، دارالعلوم کا دور ماضی میں ایسا تھا کہ دربان تک فرض نماز تو درکنار تہجد و نوافل کے بھی پابند رہے ہیں۔

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی

یہی وہ بنیادی قدر و قیمت ہے جس کی وجہ سے دارالعلوم کو لازوال و بے مثال وقار و اعتبار ملا ہے اور اس ملک کی اسلامی تاریخ کے حراب میں کھڑے ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

مرض الموت اور دارالعلوم سے عشق کا مظہر

ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق اپریل ۱۹۹۷ء میں دارالعلوم کی طرف سے قانونی چھٹی کے موقع سے منشی محمد عزیز پر فالج کا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے وہ نقل و حرکت سے محروم ہو گئے، بالآخر گھر بیٹھنا پڑا، اس بیماری اور اس سے رونما ہونے والی تکالیف میں بھی، اپنے پروردگار سے خوش، صابر و شاکر اور اُس کے فیصلے کو ذریعہ ثواب سمجھتے رہے؛ لیکن ہمیشہ دارالعلوم کے مشتاق رہے، جہاں انھوں نے ایسی محبت و اخلاص کے ساتھ اپنی عمر بتادی، جس کی مثال کبار مشائخ کے علاوہ شاید وہاں ہی ملتی ہے۔ اُن کے بڑے صاحب زادے جناب محمد حبیب صدیقی (منیجر مسلم فنڈ دیوبند و چیرمین نگر پالیکا دیوبند) اور چھوٹے صاحب زادے محمد ایاز صدیقی نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ منشی جی یام مرض میں بھی، ہم لوگوں سے اصرار کرتے رہے کہ میرے لیے کام فراہم کرو، اس لیے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر تم لوگ مجھے کسی طرح دفتر تعلیمات پہنچا دو، تو میں وہاں بیٹھ کر کام انجام دے سکتا ہوں۔ جب ایک روز اُن کا اصرار طول پکڑ گیا، تو انھیں (Wheel chair) ”وہیل چیئر“ پر بیٹھا کر دارالعلوم کے احاطے میں لے گیا اور احاطہ مولسری سے اُن کے دفتر کو جانے والے زینے کے پاس رکا کر اُن سے پوچھا: ابوجان! آپ اس زینے پر کس طرح چڑھ سکتے ہیں، جب کہ آپ میں نقل و حرکت کی بھی طاقت نہیں؟ ہم لوگ انھیں چند منٹ وہاں رکائے رہے، انھوں نے دارالعلوم کے وسیع و عریض احاطے اور در دیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، پھر ہم لوگ انھیں واپس لے آئے۔

بے نظیر خادم دارالعلوم

جب منشی محمد عزیزؒ کو فالج کے مرض نے رہین خانہ بنادیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بیماری، اُن سے اُسی وقت جدا ہوگی جب وہ خود ہی اس دنیا سے جدا ہو جائیں گے، تو میرے دل نے پوری طاقت سے کہا: دارالعلوم ان شاء اللہ قائم رہے گا، اور اپنے مشائخ کبار، علمائے ربانین اور مخلص خدام کے جانے کے بعد جس طرح اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے، جب تک خدا کو منظور ہوگا اُس کی گاڑی اسی طرح چلتی رہے گی، اُس کا دفتر تعلیمات بھی باقی رہے گا جہاں منشی جی کام کیا کرتے تھے اور اُن کی جگہ کوئی دوسرا بھی آجائے گا اور زندگی کا پہیا اسی طرح گھومتا رہے گا؛ لیکن اس دفتر میں منشی محمد عزیزؒ جیسے منشی کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی، دوسرے سینکڑوں منشی اُن کی قائم مقامی نہیں کر سکیں گے۔

میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں (خدا گواہ) اس سے میرا مقصد کسی بھائی کی قدر و منزلت گھٹانا نہیں، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ہر خیر کی توفیق دے اور اچھے پیش رو کا سچا جانشین بنائے۔ منشی محمد عزیزؒ کی حیات ہی میں اُن کے دفتر تعلیمات چھوڑ دینے کے بعد، اسی طرح اُن کی وفات کے بعد مجھے دفتر تعلیمات میں کئی متعلقہ ضرورتیں پیش آئیں، جن کے حوالے سے وہ بہت شدت سے یاد آئے اور اُن کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ میں یہ تب کہہ رہا ہوں جب کہ وہ اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں جا چکے ہیں، خدا ہی اُن کے چھپے اور کھلے کو بہتر جانتا ہے۔ یقیناً وہ انھیں پورا پورا بدلہ دے گا اور میں یہ تب کہہ رہا ہوں کہ جب اُن سے میں کسی بدلے کی توقع نہیں کر سکتا؛ بل کہ یہ محض ضمیر کی آواز کا اظہار ہے۔

منشی محمد عزیزؒ دو دوسروں سے جو چیز ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کام کو، خصوصاً اس دارالعلوم میں کام کرنے کو، جس کی بنیاد روز اول سے ہی تقویٰ پر ہے، کسب معاش کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے ایک جذبے اور شوق کی تسکین، نیز خوش نودی الہی کے حصول کا

دارالعلوم کی خدمت اُن کے نزدیک خدا کی عبادت

اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ دارالعلوم کی ملازمت ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے اپنی نیت و محنت اور کوشش کے بہ قدر بندہ اپنے پروردگار سے قریب ہوتا رہتا ہے، وہ اپنے تمام تصرفات و معاملات میں اسی اصول پر چلتے تھے اور اسی نظریے کو بنیاد بنایا کرتے تھے۔ اصول کی صحت اور نظریے کی سچائی، ہمیشہ کام کی صورت حال، کردار کے طرز، کارکردگی کی کیفیت اور معاملے کے طریقے کو یکسر بدل دیا کرتی ہے، اسی لیے منشی جی، فرائض منصبی کی تمام اخلاقیات میں اپنے تمام ہم عصروں سے بالکل مختلف تھے۔

منشی محمد عزیز کے حوالے سے، دارالعلوم کے بڑوں کا اعترافِ کمال

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد، اُن کے سلسلے میں جب یہ چند سطریں لکھنی چاہیں، تو میں نے سوچا کہ دارالعلوم کے محافظ خانے میں اُن کی خاص فائل پر ایک نظر ڈال لوں، ہو سکتا ہے کہ کوئی کام کی بات مل جائے اور یہ سطریں اس مطالعے کے نتیجے میں گراں قدر بن جائیں۔ مذکورہ فائل پر نظر ڈالنے سے اُن کی مَعْدُو در خواستوں پر کبار اولیاء اللہ کے قلم سے لکھی ہوئی، طویل طویل سفارشوں پر مجھے چنداں تعجب نہیں ہوا، جن میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعجاز علی امر و ہوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۴ء) سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، عالم باعمل، مجاہد اسلام، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، شیخ التفسیر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، دیوبندی، پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء) سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی

۱۳۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید اختر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند جیسے اساطین علم و فضل اور علمائے ربانین بھی ہیں۔

شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ کی شہادت

جہاں تک شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے تو جیسا کہ سبھوں کو معلوم ہے کہ بلا ضرورت کی مدح سرائی سے بالکلیہ اجتناب کے حوالے سے مشہور رہے ہیں؛ اس کے باوجود، انھوں نے اپنی متعدد سفارشات میں منشی جیؒ کی حسن کارکردگی، محنت اور جاں فشانی سے اپنے فرائض انجام دینے کی بھرپور تعریف کی ہے، چنانچہ ایک سفارش میں فرماتے ہیں:

”..... لیکن مجھ کو اس کا اعتراف ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب نے

نا تجربہ کار (۱) ہونے کے باوجود، تمام فرائض کو سمجھا اور جہاں تک مجھ کو علم ہے

اپنی ضروریات کو بھی فرائض متعلقہ کے مقابلے میں بالائے طاق رکھا اور حیرت

انگیز محنت کے ساتھ، تمام کاموں کو سنبھالا، تعلیمات کے کسی کام سے کسی وقت

انکار تو کیا، چہرے پر شکن بھی نہ ڈالی (۲).....“

(۱) پیش نظر رہے کہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، منشی محمد عزیز صاحب کے متعلق اپنے ان

تاثرات کا اظہار دفتر تعلیمات میں ایئر محرر کی حیثیت سے، اُن کے صرف تقریباً ایک ماہ تک کام کرنے کے بعد

ہی فرما رہے ہیں اور ابھی وہ باقاعدہ محرر کی حیثیت سے یہاں ملازم نہیں ہوئے ہیں۔

(۲) یہ سفارش ۱۳۱۳ھ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو تحریر ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ نے استاذ اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے ۴۶ سال مادری دارالعلوم دیوبند

میں خدمت کی یعنی ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۷۰ھ تک۔ نظام الاوقات و اوقات کی پابندی اور درس گاہوں میں بروقت

تشریف لانے کے سلسلے میں، ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کی تاریخ میں طلبہ کے سلسلے میں شفقت،

فرائض منصبی میں انتہاک اور پیداہشی طور پر مدرس ہونے کے حوالے سے وہ بے نظیر تھے۔ دارالعلوم «»

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی

اُس وقت کے ضروری حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد مزید فرماتے ہیں:
چوں کہ مذکورہ بالا قسم کے طلبہ کے متعلق اہتمام یا صدارت
 اہتمام سے تاکیدِ احکام آتے تھے، میں فوراً ہی منشی محمد عزیز صاحبؒ سے کہتا
 تھا اور وہ فوراً کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور شعبہ جات متعلقہ میں ڈھونڈ
 کر فارم کاپتہ لگا لیتے تھے: اس وجہ سے اُن کا اکثر حصہ، اسی دوڑ دھوپ میں
 گزرتا تھا اور فرائض متعلقہ کے لیے رات کا وقت رہ جاتا تھا، اس کے علاوہ
 جس روز سے اُنھوں نے کام شروع کیا ہے، جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، کسی
 جمعہ کی تعطیل اُن کو نصیب نہ ہوئی، اس سے فزوں تر ایک اور بات یہ ہے کہ
 اس گزربڑ میں بھی منشی صاحب موصوف نے طلبہ دارالعلوم سے، جن میں ہر قسم
 اور ہر مزاج کے طالب علم ہیں درستی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی جس کی عام
 شکایت رہی ہے (۱).....“

شیخ الادب کی دوسری شہادت

۱۰/۸/۱۳۵۸ھ کو منشی جیؒ نے ناظم تعلیمات کے ذریعے، حضرت مہتمم صاحب کی

»» اور برصغیر کے مدارس اسلامیہ میں داخل اکثر کتب فقہ و ادب و شعر پر اُن کے گراں قدر حواشی ہیں، جن کا ہر
 طالب علم اور مدرس، کتب فنی میں احسان مند ہے۔ اُنھوں نے ۲۳ کھنڈے کے اوقات کو اپنے خدا، اُس کے بندوں
 اور خود اپنے اہل خانہ کے درمیان بڑی وقتِ نظری سے تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ کم خوردن و کم گفتن و کم گفتن کے صحیح
 مصداق تھے، ان کا شاید ہی کوئی لمحہ مرضی خدا کے علاوہ کہیں اور صرف ہوا ہوگا۔

(۱) اِس سفارش پر ۲۴ رُذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں اُس وقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد
 عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اُس وقت جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل میں مدرس تھے منظوری دی۔
میرے نزدیک مولانا محمد اعجاز علی صاحب کی رائے کے موافق منشی محمد عزیز کا تقرر مناسب ہے۔“

علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۳۶ھ کے عرصے میں دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام
 دی اور ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۶۲ھ کے عرصے میں صدر مہتمم کے عہدے پر فائز رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم عقیق،
 وسیع مطالعہ اور گہری فکر کے ساتھ قلم و زبان کی دولت بے پناہ سے نوازا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل ہی وہ پاکستان منتقل
 ہو گئے تھے۔ ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔

خدمت میں درخواست پیش کی، جس میں انھوں نے اس حوالے سے اپنی تنخواہ میں اضافے کی مانگ کی تھی کہ وہ چار سالوں سے کام کرتے چلے آ رہے ہیں اور کافی تنگ دست (۱) اور کثیر العیال ہیں۔ یہ اضافہ اُن کے دلی اطمینان کا موجب بن کر، ذمہ داریوں میں پورے طور پر مشغول رہنے میں معاون ثابت ہوگا! چنانچہ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعجاز علیؒ نے ۱۰/۱۰/۱۳۵۸ھ کو اس درخواست پر پرزور سفارش لکھی، جس میں انھوں نے منشی جیؒ کے امانت دار، بااعتماد اور سختی ہونے کی ان لفظوں میں شہادت دی:

”احقر طبعی طور پر سفارش کرنے سے بچتا رہتا ہے اور حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ دخل در معقولات نہ کرے۔

”اس وقت درخواست دہندہ کے حالات عرض کرنے ہیں، تاکہ اُن کو سن کر صحیح نتیجہ حاصل ہو سکے، منشی محمد عزیز صاحب نے دفتر تعلیمات کا بار، بالکل اٹھا لیا ہے، وہ اپنی ذاتی ضرورتوں پر تعلیمات کی ضرورتوں کو مُقَدَّم

(۱) قرآن پاک میں آیت نمبر ۸۲ سورہ کہف میں اُس گرتی ہوئی دیوار کے حوالے سے، جسے حضرت خضر علیہ السلام نے کھڑی کر دی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ جب اس گاؤں والوں نے ہم بھوکوں کو کھانا تک نہیں کھلایا، تو آپ نے بلا اجرت یہ کام کیوں کر دیا؟ جواباً حضرت خضر کی زبان میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا. فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ.“

ترجمہ: اور یہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے ہیں اور اس دیوار کے نیچے، اُن کا کچھ مال مدفون تھا (جو اُن کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور اُن کا باپ (جو مر گیا ہے) ایک نیک آدمی تھا سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دینیہ نکال لیں اور (یہ سارے کام یہ الہام الہی کیے ہیں) (حضرت تھانویؒ)

یہ آیت صراحتاً بتاتی ہے کہ باپ کی نگرانی، اپنی اولاد کے لیے باعثِ منفعت اور رحمتِ الہی کے متوجہ ہونے کا محرک ہوا کرتی ہے۔

یہاں مجھے کہنے دیجئے کہ منشی محمد عزیزؒ کی نیکی، قناعت اور دارالعلوم کی مخلصانہ خدمت نے، انھیں اور اُن کی اولاد کو مادی نفع بھی پہنچایا، چنانچہ اُن کے دونوں لڑکے مولانا محمد حبیب صدیقی اور محمد ایاز صدیقی ماشاء اللہ، اقتصادی طور پر خوش حال ہیں۔ اول الذکر کو تو خدا نے معاشرتی وجاہت و عزت سے بھی نوازا ہے۔

کرتے ہیں، تعلیمات کے کام میں نہ رات کا خیال ہے نہ دن کا، اس کے ساتھ ہی ساتھ، نہایت امین اور معتمد علیہ ہیں۔ سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات ذمہ داری کے کام میں اور دائرۂ اہتمام سے مخفی نہیں کہ اس سے پہلے کارکن رشوت ستانی میں بدنام ہوتے رہے، لیکن بھگت اللہ اس وقت تک درخواست دہندہ پہ اس قسم کا کوئی حرف نہیں آیا، مجھ کو تمام ذمہ داری کے کاموں میں اُن پر پورا اعتماد ہے، کام کی تعداد سے قطع نظر کی جائے تب بھی تعلیمات کا بہت سا کام، اُن کے ذمے ہے۔ تو اگر کسی کی خدمت قابلِ قدر دانی ہے تو منشی محمد عزیز صاحب اس کے اور بھی مستحق ہیں۔“

(دستخط) محمد اعجاز علی غفرلہ

۱۰ ارشوال ۱۳۵۸ھ

حضرت مدنی (۱) رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سفارش کی اس طرح تالیف و تصدیق فرمائی:

(۱) عالم ربانی، مجاہد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ سال ہاسال مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا۔ ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث منتخب ہوئے، اس عہدے پر اپنی وفات مؤرخہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء تک فائز رہے۔ اس سے قبل وہ اپنے عظیم استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء) کے ساتھ لائٹا کے جزیرے میں سالوں قید رہے، اس کے علاوہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے اہم ستون کی حیثیت سے تاریخ میں آپ کا نام ثبت ہے۔ آپ ہی کے برادر حقیقی مولانا سید احمد فیض آبادی (متوفی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء) نے جو آپ ہی کے ساتھ ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے تھے، مجرم (۱۳۴۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۱ء میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی شریف کے باب جبریل سے متصل، مدرسہ علوم شرعیہ قائم فرمایا، جس نے دینار رسول ﷺ میں اُس تک دینی کے زمانے میں علم و آگہی کی روشنی پھیلانی اور وہاں سے بڑے بڑے علماء، فقہاء اور ادا پدید آئے۔ جن میں سعودی عرب کے اداء کے قائد و نقیب اور باوقار و گراں مایہ ادبی رسالے ”المہمل“ کے بانی و مدیر شیخ عبد القدوس بن القاسم الانصاری (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۶ء- ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) قابل ذکر ہیں، جنہوں نے مولانا سید احمد فیض آبادی پر اپنے پر بہار و گوہر ادا بی قلم سے باقاعدہ کتاب ”بناء العلم فی الحجاز السید أحمد الفیض آبادی“ کے عنوان سے سپرد قلم کی۔

یہ مدرسہ شاہ فہد بن العزیز (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۲ء- ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) کے زمانے میں مسجد نبوی کی وسعت کاری کے حالیہ عمل کے دوران قبا کے راستے پر منتقل ہو گیا ہے۔ اب اس کارنگ و آہنگ بھی بدل گیا ہے، رہے نام اللہ کا۔

”میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں“^۱

(دستخط) نگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دارالعلوم دیوبند کے اُس وقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ۵ محرم ۱۳۵۹ھ کو اپنے حکم نامے کے ذریعے، جو انھوں نے درخواست کے حاشیے پر تحریر فرمائی تھی (۱) اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (۲) (متوفی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) نے بھی اسی حاشیے پر تحریر کردہ اپنے فیصلے میں (۳) تین ماہ بعد دوبارہ درخواست دینے کا اشارہ فرمایا، چنانچہ منشی محمد عزیزؒ نے ۳/۴/۱۳۵۹ھ کو حسب الحکم

(۱) جس کے الفاظ یہ تھے:

”سردست گریڈ کے سلسلے میں جملہ ملازمین کو ترقی دی جا رہی ہے اسی پر اکتفا کیا جائے، خصوصی ترقی کے متعلق تین ماہ بعد یاد دہانی کی جائے۔“

شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

۵ محرم ۱۳۵۹ھ

(۲) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بن حافظ مولانا محمد احمد بن امام محمد قاسم نانوتویؒ، بانیان دارالعلوم کے سرخیل حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ محرم ۱۳۱۵ھ میں مولود ہوئے (۱۳۷۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، ۱۳۳۷ھ تا ۱۳۳۳ھ کے عرصے میں دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۳۳ھ میں نائب مہتمم ہوئے اور ۱۳۳۸ھ میں عہدہ اہتمام کو رونق بخشی اور ۱۴۰۱ھ تک اس عہدہ جلیلہ کے لیے باعث عزت و افتخار رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے نظیر تقریری صلاحیت اور حسن بیان سے نوازا تھا، جس کے ذریعے صحیح عقیدے کی اشاعت، باطل فرقوں اور مذاہب کی تردید اور دنیا کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کے نام، کام اور مقام کو عام کرنے کا کام لیا۔ عالم اسلام کے مختلف اطراف و اکناف کے علاوہ، برصغیر کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور قصبہ ہوگا، جو ان کی شیریں بیانی، قادر الکلامی، حاضر جوابی اور بلبل نوائی سے محفوظ نہ ہوا ہوگا۔ ۸۸ سال کی عمر میں ۶ رشتوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۷ جولائی ۱۹۸۳ء بروز یک شنبہ انتقال فرمایا اور مزار قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

(۳) جس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

”غالباً گریڈ کی ترقیات جاری نہ ہونے کی وجہ سے، یہ درخواست خصوصی طور پر کی گئی ہے۔ اجراءے گریڈ کے موانع اگر ان کی خصوصی ترقی میں مانع نہ ہوں، تو میرے نزدیک منشی محمد عزیزؒ واقعی طور پر مستحق ہیں.....“

محمد طیب غفرلہ

۱۳۵۸/۱۱/۱۷ھ

شیخ الادب کی تیسری شہادت

اس درخواست کو بھی حضرت شیخ الادبؒ نے ایک مؤثر تصدیق کی ذریعے، تقویت بخشی، جس میں آپ نے سابقہ تصدیق کی باتیں دہرائیں اور منشی جی کے دیگر باریک خصائل کا بھی تذکرہ فرمایا:

”میں ذاتی تعلقات کی بنا پر سفارش کرنے کو ہمیشہ برا سمجھتا رہا ہوں اور طبعی خواہش ہے کہ کارکنوں کی ہمت افزائی اس صورت میں ہو کہ وہ کام کریں۔

منشی محمد عزیز صاحب محرم تعلیمات کے متعلق میں ایک دفعہ نہیں، کئی بار عرض کر چکا ہوں، مجھ کو اُن کا تجربہ کئی سال سے ہے، یہ ہر کام میں جفاکش، شب و روز کام کرنے والے کسی کام میں حیلے بہانہ نہ کرنے والے کارکن ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ کہ پورے معتمد علیہ ہیں۔

فرائض متعلقہ ہی میں نہیں: بل کہ تعلیمات کے زوائد امور میں بھی، انھوں نے ہمیشہ پوری سعی سے کام لیا اور یہ بھی قابل عرض ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب اُس جگہ پر مامور ہیں جس جگہ پر اُن کے سابقین سے طلبہ کے ہمیشہ جھگڑے قیصے رہا کرتے تھے، روزانہ نہیں تو ہفتے دو ہفتے میں ضرور کوئی قابل مداخلت جھگڑا پیش آجاتا تھا؛ لیکن کئی سال کی ملازمت میں ایک دفعہ بھی طلبہ سے اُن کی کوئی خلش پیدا نہیں ہوئی۔

مجھ کو یقین ہے کہ میں نے اس گزارش میں ایک لفظ بھی واقعیت سے زائد نہیں کہا ہے۔“

محمد اعزاز علی غفرلہ

۴ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

شیخ الاسلام کی شہادت

اسی تاریخ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس سفارش کی ان الفاظ میں
تائید کی کہ:

”مجھ کو مولانا اعزاز علی صاحب کی تحریر سے اتفاق ہے، نیز یہ بھی خیال
کرنا ضروری ہے کہ مجلس علمی کے تمام کاموں کو اُن کے ذمے کیا گیا ہے۔“
نگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے
۱۷/۵/۱۳۵۹ھ کو اُن کے حسن کارکردگی کو سراہتے ہوئے، تنخواہ میں ایک روپے کے
إضافے کی منظوری دی۔ (۱)

شیخ الادب کی چوتھی شہادت

۱۷ محرم ۱۳۶۱ھ کو منشی محمد عزیزؒ نے، حضرت مہتمم صاحب کی خدمت عالیہ میں
درخواست پیش کی کہ طویل خدمتوں اور بہت سی ضرورتوں کے پیش نظر، اُن کی تنخواہ میں
إضافہ فرمایا جائے۔

(۱) منظوری کے الفاظ یہ تھے:

”چوں کہ منشی محمد عزیز صاحب کی کارکردگی قابل اطمینان ہے اور اُن کے کاموں میں إضافة بھی ہوا ہے؛
اس لیے ایک روپے ماہ وار کی ترقی یکم جمادی الاول ۱۳۵۹ھ سے منظور ہے، شعبہ جات متعلقہ میں
اطلاعات جاری کردی جائیں۔

محمد طیب غفرلہ، مہتمم دارالعلوم

۱۷/۵/۱۳۵۹ھ

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی

چنانچہ شیخ الادب حضرت مولانا اعجاز علیؒ نے اس پر ایک گراں قدر سفارش لکھی اور اُن کی پر خلوص محنتوں اور مثالی کارکردگی کو یوں مختصر اُبیان فرمایا:

حضرت والا!

”منشی محمد عزیز صاحب کی اُن تھک مساعی سے، میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، دیانت، احتیاط، اطاعت اور تمام امور ضروریہ کی انجام دہی کے اوصاف، اُن میں علی وجہ الکمال موجود ہیں، میں نے اُن کے حالات آں حضرت سے زبانی بھی عرض کیے ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے خدام والا بھی اُن کے حسن خدمت سے ناواقف نہیں ہیں؛ اس لیے میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ اُن کی درخواست کے سلسلے میں اُن کی معتد بہ ہمت افزائی فرمائی جاوے، اُن کے متعلق زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، میں امیدوار ہوں کہ اُن کی درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا جاوے گا۔“

محمد اعجاز علی غفرلہ

۲۲ محرم ۱۳۶۱ھ

حضرت حکیم الاسلام نے اس درخواست کو، حسن توجہ سے نوازا اور ۱۶/۲/۱۳۶۱ھ کو ایک گریڈ خصوصی ترقی کی منظوری فرمائی۔ (۱)

میرا مقصد ان سطروں میں اُن ساری تحریری اور زبانی سفارشوں اور رپوٹوں کو جمع کرنا نہیں ہے، جن کا اظہار دارالعلوم کے نام و زبزرگان دین، منشی محمد عزیزؒ کی ملازمت کے تمام دورانیے میں کرتے رہے تھے۔

(۱) منظوری کے الفاظ یوں تھے:

”حسب سفارش تعلیمات ایک گریڈ خصوصی ترقی یکم صفر ۱۳۶۱ھ سے جاری کیا جاتا ہے دفاتر متعلقہ کو

محمد طیب غفرلہ

اطلاع دے دی جائے۔

۱۶/۲/۱۳۶۱ھ

ناظم تعلیمات مولانا سید اختر حسین کی شہادت

چنانچہ اب میں حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی (۱) رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) جو دارالعلوم میں میری طالب علمی کے وقت ناظم تعلیمات تھے، کے قلم سے کی گئی ایک سفارش پراکتفا کرتا ہوں، جو انھوں نے منشی جی کی اُس درخواست پر لکھا تھا، جو انھوں نے حضرات ممبرانِ مجلس شوری دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں پیش کار کے عہدے پر ترقی دیے جانے کے لیے، دی تھی کہ وہ عرصہ دراز سے محرر کی جگہ کام کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا سید اختر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سفارش میں پر زور الفاظ میں فرمایا:

”منشی محمد عزیز صاحب محترم راول تعلیمات کی درخواست ترقی پیش ہے، بغیر کسی ادنی رکاوٹ کے عرض ہے کہ ہر دور میں اُن پر لا اعتماد کیا جاتا رہا ہے، میں بھی اُن پر پورا اعتماد رکھتا ہوں اور یہ ہر دور میں پیش کاری کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب بھی دے رہے ہیں؛ اس لیے پر زور سفارش کرتا ہوں کہ اُن کو پیش کاری کا گریڈ عطا فرما کر ممنون فرمایا جاوے۔“ فقط والسلام

سید اختر حسین

۱۳۸۳/۷/۲۶ھ

منشی محمد عزیزؒ کے جن صفات حمیدہ کی کبار علمائے ربانین نے تعریف کی ہے، اُن کی نہ صرف ہمارے زمانے میں؛ بل کہ ہر زمانے میں قدر کی جاتی رہی ہے۔ جب میں

(۱) حضرت مولانا سید اختر حسین بن مولانا سید اصغر حسین دیوبندی شوال ۱۳۳۳ھ مطابق اپریل ۱۹۲۵ء سے اپنی وفات یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء تک دارالعلوم میں استاذ رہے، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (متوفی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۷ء) کی وفات کے بعد سے، اپنی وفات تک ناظم تعلیمات بھی رہے نیز مولانا بشیر احمد خان متوفی ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء کی وفات کے بعد کچھ دنوں کے لیے نائب مہتمم کے فرائض بھی انجام دیے۔

مولانا سید اختر حسین دیوبندی کے باشندے، دارالعلوم کے ممتاز عالم اور علامہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کے شاگردوں میں تھے۔

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی

دارالعلوم کے محافظ خانے میں رکھے ہوئے اُن کے ذاتی کارناموں کے فائل میں، اُن کے سلسلے میں ان سفارشوں کو پڑھا، تو خوشی سے اچھل پڑا؛ کیوں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: کہ منشی جی کے ان مکارم اخلاق و حسن کارکردگی کا صرف میں اور معاصرین ہی قائل نہ تھے، بل کہ اُن کی ان خوبیوں کے اللہ تعالیٰ کے نیک اور پرہیزگار بندے بھی قائل رہے ہیں، جن میں سرفہرست شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعجاز علیؒ ہیں، جو کسی کی بے جا تعریف میں مبالغہ آرائی سے بھرپور احتیاط اور اجتناب کئی میں ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ نیک لوگوں جیسا برتاؤ کرے، جنت علیا میں اپنے مقفی بندوں کے ساتھ داخل کرے اور اُن کے اہل و عیال، اقارب و رشتہ دار اور اُن کے متبیین و متعارفین کو صبر و سکون عطا کرے۔ و آخر دعونا ان الحمد لله رب العالمین۔

مختصر سوانحی خاکہ

نام محمد عزیز صدیقی، تاریخ پیدائش ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء، تعلیم ہائی اسکول تک، دارالعلوم دیوبند میں ملازمت ۶۳ سال تک یعنی از شوال ۱۳۵۵ھ/نومبر-دسمبر ۱۹۳۶ء تا شوال ۱۴۱۸ھ/جنوری ۱۹۹۸ء۔ محرر ایچر دفتر تعلیمات ۷/شوال ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۳۶ء۔ ۶/رمزی الحجۃ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۳۷ء کو باقاعدہ محرر تعلیمات۔ ۱۷/جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء کو استقلال ملازمت دی گئی۔ ۵/ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۵ جون ۱۹۶۵ء کو پیش کار/منشی تعلیمات کے منصب پر بحال ہوئے۔ ۱۸/رمزی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء کو مجلس عاملہ منعقدہ ۲۹-۳۰/شوال ۱۴۱۸ھ نے فاج زدہ ہونے کے بعد، انھیں پنشن دے دی، مرض فاج لُج میں ایک سال نو ماہ گزار کر بروز جمعہ صبح ۴ بجے ۱۹/رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۸ جنوری ۱۹۹۹ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (*)



(*) تاریخ تحریر عربی ساڑھے دس بجے صبح، بروز جمعہ ۱۸/شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۹۹ء، شائع شدہ ”الداغی“ عربی شمارہ ۱۲، جلد ۲۲، ذی الحجۃ ۱۴۱۹ھ = اپریل ۱۹۹۹ء۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء — ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء

خاکِ ونوری نہاد، بندہٗ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دل بے نیاز

حضرت مولانا علی میاںؒ نے شہرت و عزت، مقبولیت و محبوبیت اور اپنے علمی و فکری، ادبی و قلمی کارناموں اور تبلیغی و دعوتی اور تعلیمی و تربیتی بخششوں اور گفتارِ دلبرانہ، کردارِ مومنانہ، جذبِ قلندرانہ، ذوقِ خدائی و لذتِ آشنائی، مولانا صفاقی و ندائے آفاقی، ذہنِ ہندی اور نطقِ اعرابی کے اکتسابات سے دنیا کے گوشے گوشے کو، اس طرح بھر دیا تھا کہ اُن کے حسنِ بسیار اور شیوہٗ ہزار کے سامنے الفاظ و تعبیرات کا سرمایہ، ایک قلم کار کی مکمل دست گیری نہیں کر پاتا۔ اُن کی خوبیوں کا جھوم اُن پر خامہ فرسائی کرنے والے کو ششدر کر دیتا ہے کہ وہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے کہ متنوع کمالات میں سے ہر کمال کا کرشمہ، دامنِ دل و قلم و زبان کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ ”جا ایس جاست“۔

رَبِّ شکور کے ہاں اُن کی مقبولیت کی دلیل

تعلیم و تربیت کی توفیق پانے والا شاید ہی کوئی ایسا مسلمان؛ بل کہ انسان ہوگا جس کے دل میں عظمت و شہرت کے آخری مقام بلند تک پہنچنے کی خواہش چٹکیاں نہ لیتی ہو اور اس آروز کی تکمیل کے لیے اپنی سی کوشش کرنے سے باز رہتا ہو۔ ہر سلیم الطبع

انسان یہی چاہتا ہے کہ رزقِ حلال کی طرف سے اطمینان کے ساتھ، خدا اور خلقِ خدا کی نگاہ میں اُس کو اعتبار و وقار ملے اور دنیا میں سرخ رُو اور عقبیٰ میں بھی بامراد ثابت ہو؛ لیکن کم ایسے سعادت مند ہوتے ہیں، جنہیں اپنی اس دنیا کی زندگی میں حینِ حیات اُس قدر اور اُس تسلسل کے ساتھ عزت و احترام کا خراج ملا ہو، جو مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو ملا، کیا خاص اور کیا عام اور کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا عرب اور کیا عجم: معاشرے کے ہر طبقے اور دنیا کی ہر سمت میں اُن پر محبت اور مقبولیت کی موسلا دھار بارش ہوئی جو (حدیثِ پاک کی روشنی میں) ربِّ شکور کے ہاں، اُن کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ موت بھی ایسی قابلِ رشک پائی کہ شاید و باید کسی کو نصیب ہوتی ہے، جمعہ کا دن، آخری عشرہٴ رمضان، روزہ رکھے ہوئے، خطِ بخوانے اور غسل فرمانے کے بعد سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ أَجْرٍ كَرِيمٍ (آپ اُس کو بخشش اور معززانہ بدلے کی خوش خبری دے دیجیے) کی آیت پر لبِ خاموش اور دلِ گویا ہو جاتا ہے اور نفسِ مطمئنہ اور پاک روح، خاکی ڈھانچے کو چھوڑ اپنے رب کی اُرد پر داز کر جاتی ہے اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ جاتا ہے۔

خداے کریم کی خاص صنعت

خداے پاک کی توفیق سے مولانا علی میاں کو شروع سے ہی ایسے اسباب و عناصر مُیسر آئے، جن کی وجہ سے انہیں وہی کچھ ہونا تھا جو وہ ہوئے۔ اُن کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ربِّ کریم نے انہیں خاص طور پر تیار کیا تھا اور ملت و اُمت کے حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے موجودہ دائرے میں، اُن کے فکر و عمل کی تابانی، علم و قلم کی ضیاء پاشی اور سرگرمی مسلسل کی از حد ضرورت تھی۔

خاندانی عظمت

۱۔ انہیں خاندانی عظمت و عزیمت ملی کہ وہ سلالہٴ نبوت سے تعلق رکھتے تھے، وہ

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

سرزمین ہند میں صحیح النسب سادات کے خانوادے میں پیدا ہوئے (۱)۔ تقویٰ، زہد اور اسلام کی سربلندی کے لیے، سرفروشانہ جدوجہد کی تاب ناک وراثت اُن کے حصے میں آئی۔ اُن کا حسی خاندان جس کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ حسی رائے بریلوی (۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء-۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء) ہیں، ہمیشہ سے ظاہری و باطنی اخلاق و عادات، اسلامی روایات اور دین و دعوت کے لیے قربانیاں دینے میں ممتاز رہا ہے (۲)۔ امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ علم اللہ حسی کے پوتے میر محمد معین کے نام ایک خط میں انھیں مندرجہ ذیل القاب سے یاد کیا ہے:

”سیادت و نجابت مآب، عزیز القدر، سلالة الکرام، میر سید معین سلمہ

اللہ تعالیٰ“

اور پھر اُن کے خاندان کے امتیازات پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھا ہے:

”آپ کے اسلاف کرام نے جو کچھ پایا ہے ہمت عالیہ سے پایا ہے... فقیر کا اعتقاد ہے کہ حضرت شاہ علم اللہ کی اولاد میں ہمت عالی اس وقت تک

(۱) مولانا علی میاں اپنی خود نوشت سوانح ”کاروان زندگی“ میں تحریر فرماتے ہیں:

”اس خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت غلو اور مبالغہ کی حد تک کی ہے... اس خاندان نے ہمیشہ سادات ہی میں یا کبھی کبھی معروف النسب شیوخ میں رشتہ کرنا ضروری سمجھا اور اگر کبھی کسی نے کھلے طریقے پر کسی غیر کفو سے شادی کر لی تو خاندان نے اگرچہ اُس کو برادری میں شامل رکھا اور اخوت و مساوات کا معاملہ کیا؛ لیکن مصاہرت اور ازدواجی تعلقات منقطع کر لیے اور نسب نامہ میں اس فرد خاندان کے نام کے ساتھ اس اصول سے انحراف کی نشان دہی کر دی (ملاحظہ ہو ”سیرۃ السادات“ از مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی) اور یہ بات خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ معلوم رہی۔“ (کاروان زندگی، ج: ۱، ص: ۲۱، طبع اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء مکتبہ اسلام گون روڈ، بکھنؤ)

(۲) مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

”خاندانی تذکرے اور انساب کی تفصیلی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اس کے اکثر تاریخی عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیت دینی اور جذبہ جہاد ہے... اس خاندان کی تاریخ میں بار بار ان اولوالعزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا اور شہادت سے سرخ رو ہوئے۔“ (حوالہ بالا، ص: ۲۳)

پس مرگ زندہ

موجود ہے... سید اور سنی ہونا جو کہ نوادر میں سے ایک نادر شے ہے، حضرت سید

موصوف کے خاندان میں ہم نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے... (۱)

دورِ آخر میں مولانا علی میاں کے جد امجد امام سید احمد بن عرفان شہید کارزارِ بالا کوٹ

(۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء-۱۲۳۶ھ/۱۸۳۱ء) نے احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے باب

میں جو محیر العقول مساعی انجام دیں اور جس طرح اپنے پاکیزہ خون سے عزیمت کی تاریخ

رقم کی، اُس کو ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اُن کے بعد کے ہمارے تمام

علمائے صادقین اور بزرگانِ دین، اپنی اپنی توفیق کے مطابق اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے

سرفروشی کی تمنا کی پرورش اور دعوت و عزیمت کا سبق انھی کے جہد و عمل سے حاصل

کرتے رہے ہیں۔ (۲)

لذتِ سحرگاہی سے آشنا والدین

۲- علم و عمل کے جامع، دعائے نیم شبی اور لذتِ سحرگاہی سے آشنا والدین اور بہ

قول ادیب بے مثال اور مُفسِّرِ باکمال مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) باپ۔ یعنی مولانا سید عبدالحی حسنی صاحب ”زنہ الخواطر“ و ”گل

رعنا“ (۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء-۱۳۳۱ھ/۱۹۲۳ء) اور بھائی۔ یعنی برادرِ اکبر سید عبدالحی حسنی

(۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) کے از تلامذہ شیخ الہند۔ دونوں نور علی نور، پاک صاف

(۱) نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ج: ۱، ص: ۳۰۳-۳۰۴، مرتبہ حضرت شاہ عبد الرحیم پھلتی، شرح

و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی، طبع اول ۱۳۱۹ھ، پھلت، مظفر نگر (یوپی)

(۲) مولانا کاروان زندگی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”ایک مرتبہ مسجد (تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین، نئی دہلی) کے بالائی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں

(حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی دہلوی کے) صاحب زادہ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام

رہتا تھا، مولانا (محمد الیاس) چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی

بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ”مولانا! ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں“

(کاروان زندگی، ج: ۱، ص: ۲۸۱)

کیتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

طاہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے (۱) کی گود میں پلنے بڑھنے اور تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

روشن دل و روشن دماغ اُستادہ کرام

۳۔ نیز متنوع العلم، روشن دل و روشن دماغ، وسیع النظر، سلیم الطبع اور معتدل الخیالی اُستادہ کرام کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کی توفیق ملی، جن میں علامہ خلیل عرب بن محمد انصاری یمانی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء - ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی (جن کا تقریر ندوۃ العلماء میں ۱۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا) مولانا حیدر حسن خاں ٹوکی (۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۳ء - ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء)، مولانا عبدالحی فاروقی لکھنوی، مولانا احمد علی لاہوری (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء - ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۲ء) اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء - ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۲ء) سابق صدر مدرس و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علی امرہوی (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء - ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۳ء) شامل ہیں۔ انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی (۲) کے علاوہ ایک طرف اسلامی علوم و فنون کے ماہرین اور دوسری طرف عصری ثقافتوں کے اصحاب کمال سے استفادہ کیا اور انگریزی زبان بھی اتنی حاصل کر لی کہ مغربی مصنفین اور مستشرقین کی اسلامی موضوعات سے متعلق کتابوں کا بہ راہ راست

(۱) ”معاصرین“ از مولانا عبدالمجید ریاضی، مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، ص: ۱۲۷۔

(۲) ۱۹۲۷ء میں انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں مولانا خلیل عرب کے اصرار پر داخلہ لیا، جو وہاں شعبہ عربی کے اُستاد تھے اور ۱۹۲۹ء میں فاضل ادب عربی کی ڈگری لی، اس سلسلے میں مولانا ۱۵-۱۶ سال کی اپنی نوعری کی قابل رشک دینی غیرت اور اسلامی حیثیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”دسمبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسنا (Convocation) میں گورنر یو پی ”سر مالکم ہیلی“ نے سندیں تقسیم کیں... اور یہ ستم ظریفی میری زندگی میں پیش آکر رہی کہ عربی ادب اور زبان کی سند ایک انگریز حاکم اور دشمن اسلام قوم کے فرد سے لی جائے“ ”کاروان زندگی“ ج: ۱، ص: ۱۰۵۔

مطالعہ اُن کے لیے آسان ہو گیا۔ (۱)

ان اساتذہ کرام کی صحبت سے، اُنھوں نے اس طرح فائدہ اٹھایا، جیسے شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس چوتی اور خالص، شفا بخش اور شفاف شہد میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ متنوع ثقافتوں کی وجہ سے اُن کے قلب و دماغ نے، اُن کے موروثی اعتدال اور توازن پر رہنے کی صفت کو مزید جلا بخشا۔

اصحابِ عزیمت و استقامتِ صالحی و داعیانِ اسلام کی صحبت

۴۔ مولانا کو مؤجدین، عاشقانِ نبی ﷺ، اصحابِ استقامت و عزیمت اور رہبانِ باللیل اور فرسانِ بالنہار، انسانیت پر ترس کھانے والے اور اُمت کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے، انگاروں پر لوٹنے والے مربیان اور داعیانِ اسلام کی پُر تاثیر اور طویل صحبتیں میسر آئیں۔ اُن داعیوں اور مریضوں میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ انیسیر مولانا احمد علی لاہوری، بانی دینی دعوت و تبلیغی تحریک مولانا محمد الیاس کاندھلوی (۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء - ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء) مولانا عبدالقادر رائے پوری (اندازاً ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء - ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء - ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) سرفہرست ہیں۔

(۱) مولانا نے کسی اسکول کالج میں داخلہ لیے بغیر اپنے خاندان کے بعض انگریزی واد حضرات اور انگریزی کے دیگر ماہرین سے استفادہ کیا، بعد میں اس میں انھیں خاصا انتہاک ہو گیا اور انٹر میڈیٹ کے معیار کی کتابوں کو حل کرنے اور امتحان میں بیٹھنے کے ارادے کا اُن کی والدہ محترمہ خیر النساء بہتر صاحبہ کو علم ہوا، تو انھوں نے درمندانہ خط کے ذریعے انھیں اس ارادے سے باز رہنے اور انگریزی تعلیم سے، یکسر دست کش ہو جانے کا مشورہ دیا، جس میں والدہ نے انھیں لکھا کہ:

”علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضا مندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو، تو اُن مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزاردی، اُن کے مرتبے کیا تھے؟ علی! اگر میرے سوا اولادیں ہوتیں، تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں، تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحبِ اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یا رب العالمین“ (ذکر خیر ص: ۵۳، کاروان زندگی، ج: ۱، ص: ۱۲۲-۱۲۳)۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

حضرت مدنیؒ سے نہ صرف اُن کے برادر بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی، ارادت کا تعلق رکھتے تھے؛ بل کہ اُن کی صاحب زادیاں وغیرہ بھی اُن کے دست گرفتوں میں تھیں۔ اسی لیے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں، حضرت مدنیؒ کے کسی پروگرام میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ تشریف آوری کے موقع سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے برادرِ خرد مولانا علی میاں کو اُن کے حوالے کیا اور دیوبند میں، اُن کی خدمت سے مستفید ہونے اور اُن کے درس بخاری و ترمذی شریف میں شرکت کا حکم کیا۔ ماہ ربیع الاول سے رجب کے اواخر تک مولانا نے دیوبند میں نہ صرف حضرت مدنیؒ کی شبیوں کی گدازی، دن کی پیش اور دل کی خلش سے فائدہ اٹھایا؛ بل کہ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعجاز علیؒ سے دیگر طلبہ دارالعلوم کے ساتھ ملا علی قاری (۱۰۱۳ھ/۱۶۰۶ء) کی مشہور کتاب ”شرح نقایہ“ بھی پڑھی۔ نیز ذابھیل سے علامہ محمد انور شاہ (متوفی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) کی اُس دوران دو ایک مرتبہ دیوبند تشریف آوری کے موقع کو غنیمت جان کر، اُن کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے رہے، نیز دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا قاری اصغر علیؒ سے حفص کی روایت کے مطابق قراءت و تجوید بھی پڑھی (۱)۔ حضرت مدنیؒ کی صحبت و تعلیم سے مولانا علی میاںؒ نے حمیت اور عزیمت کا سبق سیکھا، حوصلہ مندی، سخاوت اور انکساری و عاجزی کا عملی نمونہ دیکھا اور اسے جذب کیا (۲)۔ اُن کی عزیمت اور مجاہدے سے بھرپور زندگی نے خاک

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ”کاروانِ زندگی“، ج: ۱، ص: ۱۲۸-۱۳۲۔

(۲) مولاناؒ پرانے چراغؒ میں فرماتے ہیں: ”میری کوتاہ نظر میں دو صفیں آپ کی (یعنی حضرت مدنیؒ کی) زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے: ایک عزیمت دوسرے حمیت“ (پرانے چراغؒ، ج: ۱، ص: ۱۰۵-۱۰۶، طبع سوم ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء مکتبہ فردوس لکھنؤ)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ”ہم نے اہل بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جواہرات پڑھے ہیں، اُن کا پرتو مولاناؒ کی زندگی اور اُن کے بعض معاصرین کبار کے اخلاق میں پایا ہے“ (حوالہ بالا، ص: ۱۱۳)۔

مزید فرماتے ہیں: ”اس اتفاقِ طبع کے ساتھ (یعنی شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور اُن کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی عادت کی وجہ سے) جب مولانا (مدنیؒ) کو دیکھا، انسانیت و آدمیت، شرافت و سیادت اور اخلاق و کردار کی بڑی باندی پر پایا“ (ص: ۱۰۹)۔

ساری وجاں سپاری، انسانی خدمت کے جذبے سے سرشاری اور اسلام کے لیے ہر طرح کی جاں نثاری کا حوصلہ بخشا اور نہ صرف ضیافت و مہماں نوازی کی نبوی موروثی صفات کو ہمیز کیا؛ بل کہ مہمانوں کا ”غلام“ بن جانے کا ذوق دیا۔ (۱)

مولانا احمد علی لاہوریؒ سے نہ صرف تفسیر پڑھی؛ بل کہ شاہ ولی اللہؒ کی ”حجة اللہ البالغہ“ بھی پڑھی اور اُن کی صحبت میں ایک عمر کے تک باقاعدہ قلب و نگاہ کو موزگی بھی کیا، اُن کی صحبت میں خدا طلبی کا ذوق پیدا ہوا، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت نے دل میں جگہ لی، ذوق و رجحان پر سان چڑھی، راست روی کی دولت ملی اور تعلق مع اللہ کے لیے بے قراری کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے، اُن کی دم سازی و عیسیٰ نفسی نے اخلاص و عقیدے کو حقیقت کیا اور عملی و فکری زندگی کو ایک نئی سمتِ سفر دی۔ (۲)

مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی صحبتِ کیمیا اثر نے، انھیں دین کے لیے تڑپنا پھڑکنا سکھایا، اتباعِ سنت، انابتِ الی اللہ کا ذوق، استقامت و عبادت کا شوق، ایمان و احتساب کی کیفیت سے سرشاری، مقصد کا عشق، درد کی دوا اور دردِ دوا، مسلمانوں کے

(۱) پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۱۱۳-۱۱۴۔

(۲) مولانا خود ایمان کو تازہ کرنے والی کیفیت اور روحانی لذت کے ساتھ رقم طراز ہیں:

”میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی، جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین، شیرانوہ دروازہ، لاہور سے نیاز حاصل ہوا۔ میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں، جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے، بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا: پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اُس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچایا۔

”اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو، میری زندگی اچھی یا بری بہ ہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا۔ خدا شناسی اور خدا رسی، راہ یابی اور راست روی، تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا“ (پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۱۳۳-۱۳۵)۔

میکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

دینی تنزل کا جامع احساس اور دعوت و تبلیغ کا بے پناہ ولولہ دیا اور نشانِ منزلِ جاناں سے باخبر کیا (۱)۔ اُن سے تعلقِ قلب و نگاہ کی دولت نے خود مولانا کے بقول، انھیں اس صلاحیت سے بہرہ ور کیا کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ:

”ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرزِ فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جن میں سے ایک کا سرچشمہ ذہانت، مطالعہ، وسعتِ علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورتِ حال کا ردِ عمل ہوتا ہے اور دوسرے کا سرچشمہ، کثرتِ عبادت و انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبیر، سیرتِ نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتہاد اور ہدایتِ ربانی ہوتی ہے“۔ (۲)

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی صحبت اور تربیت اور تزکیے سے اس احساس کی دولت ملی کہ مادیت کے بحرِ ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، ایک ایسا جزیرہ بھی ہے، جہاں ذکر و فکر کے علاوہ کوئی شے موضوعِ گفتگو اور مشغلہ زندگی نہیں، وہاں بے نظیر فنائیت و بے نفسی کا درس حاصل ہوا اور شفقتِ مادری جیسی شفقت ملی اور دل کی انگلی ٹھھی کو گرم رکھنے کی کلید حاصل ہوئی۔ (۳)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا کا تعلق گویا اپنے شیخ مولانا عبدالقادر ہی جیسا رہا۔ مؤخر الذکر کی وفات کے بعد تو گویا اول الذکر ہی اُن کے شیخ و مربی کے درجے میں رہے، اُن کی متعدد عربی کتابوں پر مقدمے لکھے، سہارنپور کا بار بار سفر کیا اور جگر سوزی، علم و عمل کی جامعیت، عبادت و ریاضت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے مبارک اور مسلسل مشغلے سے بھرپور زندگی سے

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ”حضرت مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت“ باب ہفتم و ہشتم، ص: ۱۹۶-۳۲۸، مطبوعہ ادارہ اشاعتِ دینیات، حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔

(۲) پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۲۸۳۔

(۳) پڑھیے: ص: ۳۵۲-۳۵۳، کاروانِ زندگی، ج: ۱، نیز ”سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ“، بقلم مولانا علی میاں ندویؒ۔

اثر پذیر ہوئے۔ شیخ کے ساتھ اُن کا یہ تعلق وقت کے ساتھ اور بڑھتا گیا، چنانچہ جب تک وہ حیات رہے، زندگی کے اہم مسائل میں، اُن سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا؛ کیوں کہ مولانا کا یہ عقیدہ و عمل تھا کہ زندگی کی وادی پر خار میں کسی روشن دل، بیدار مغز مردِ مومن کی راہ نمائی کے حصار ہی میں سفر کرنا چاہیے، ورنہ حالات کے ٹکیلے کانٹوں سے دامن کے اُلجھ جانے کا یقینی خطرہ موجود رہتا ہے۔ محض علم و مطالعے اور ذہانت و فراست کے ذریعے جو لوگ، سمتِ سفر کا تعین کرتے ہیں، وہ اکثر کعبہ نہ پہنچ کر ”ترکستان“ کو نکل جاتے ہیں اور اُن کی عقل و خرد اور فکر و نظر کا جگر لہو لہان اور ایمان و عقیدے کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ایک صبر آزمایا طالب اور جہاں دیدہ و نرم و گرم چسیدہ ہونے اور بے شمار انسانوں کا مطالعہ کرنے، دیکھنے اور تجربہ کرنے کی وجہ سے، وہ اس حقیقت سے سب سے زیادہ واقف تھے۔

شاعرِ اسلام علامہ اقبال سے تاثر و عقیدت

۵- ہمالیے کی چوٹی؛ بل کہ آسمان کی بلندی سے اسلام کی عظمت، مسلمانوں کی رفعت؛ عرب کے ریگزاروں، صحرائِ نشینوں، سفر نصیب و صحرا گرد بدویوں؛ اور خبر میں، نظر میں اذانِ سحر میں یکتائے کائنات غازیوں اور پُر اسرار بندوں اور مومن کے مقامِ بلند اور کائنات میں اُس کی سیادت و قیادت کا پرسوز و سحر خیز و یقین ریز و ولولہ انگیز اسلوب اور اونچے سروں اور اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی کی بے مثل لے میں گیت گانے والے اور ”محمد عربی سے ہے عالم عربی“ کا لازوال و مسرت و تازگی و توانائی بخش ترانہ سنانے والے اور فرنگیوں کے فسادِ قلب و نظر، مغربی تہذیب کی لادینیت، اُس کے مادہ پرستانہ مزاج، مغرب کی خود پسند قومیت اور جانب دارانہ وطنیت، سینہ بے نور میں محروم تسلی دل، تہذیبِ جواں مرگ کی حرکتِ مذہبوحی؛ کی بے باکانہ، باغیانہ اور غیرت مندانہ دھجیاں اڑانے والے اور آشیانہ تہذیبِ مغرب کا خود اُس کی بے تاب بھلیوں سے بیکاری

وعریانی و مے خواری و افلاس کی بے طرح فتوحات کی وجہ سے، یقینی خطرے میں گھر جانے کی بصیرت مندانہ خبر دینے والے، شاعر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور اُن کے فکر و فن کے لافانی اثاثے سے مناسبت، محبت، اور اُس میں جینے اُس کو جذب کرنے اور اُس کو عالم عرب کے ایوان ہائے حکومت اور عشرت کدوں کے تن آساں قائدین اور مغربی تہذیب و تمدن کی بخششوں کی زرق برق روشنیوں سے مرعوب عرب کے خواص و عوام تک پہنچانے کی مولانا علی میاںؒ کو توفیق ملی۔

مولانا علی میاں نے بلاشبہ اقبال کے حقیقت پسندانہ اور گہری بصیرت سے ترشے ہوئے اشعار؛ اُن کے صورتِ اسرافیل، اُن کے بالِ جبریل اور اُن کی ضربِ کلیم؛ اُن کی آواز، انداز و امتیاز سے اپنے کو نتیجہ خیز طور پر ہم آہنگ کر لیا تھا۔ ولایتِ عشق کے قائد و سپاہی اور سپاہی ساز اور دیارِ مہر و وفا کے راہی و راہ نما اقبال نے اُنھیں حرم میں بغاوتِ خرد سے آمدہ خطرے کے مقابلے کے لیے عشق و محبت کی سپاہِ تازہ کی تیاری کا پیغام دیا، جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے، مولانا علی میاںؒ نے پوری زندگی وقف کر دی۔ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم آنے اور شہر کے خوگر کو وسعتِ صحرا سے ہم کنار ہونے کی پیہم دعوت دیتے رہنے کے لیے اپنے قول و عمل، سیرت و اخلاق، نشست و برخاست، دعوت و ملاقات، سیاحت و اسفار اور قلم و زبان کی ساری توانائیاں جس حوصلے، ولولے اور دوام کے ساتھ مولانا علی میاںؒ نے صرف کیں، اُسے محض توفیقِ الہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے شعری و تخلیقی سرمایے نے مولانا کی عقل و فکر، دماغ و نظر کے بند کھول دیے، اسلام کی ابدی حقیقتوں کی ترجمانی کے لیے طاقت و رواج و انگیز، اثر آفریں و شعلہ یار و پر جوش تعبیریں دیں، جن سے تنِ مردہ میں زندگی کی بے انتہا طاقت و رَو و دوڑ جاتی ہے اور جمود و گراں خوئی کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اُس شاعر بے بدل کے سوز و ساز اور درد و گداز نے، عقل کے مقابلے میں عشق کی طاقت و عظمت، اور تازہ کاری و معجز نمائی اور لاتعداد حصولِ یابیوں اور فتحِ مند یوں کی قدر

وقیمت پر ایمان تازہ کیا اور ساتھ ہی عقل کی زیاں کاریوں، ریابازیوں اور مکاریوں کا علاج، عشق و محبت کی یقینی طور پر اور ہر حال میں شافی و کافی رہنے والی دوا کو بتا کر، مکی خفتہ گان کو بیدار کرنے کی راہ پر تاحین حیات، محو سفر رہنے کا یارادیا۔

اقبال کے فکر و فن اور شعر و ادب کو مولاناؒ نے اپنے خوابوں کا ترجمان، دل کی زبان، جذبات و محسوسات کا بیان اور فکر و عقیدے کی لسان پایا، چنانچہ انھوں نے اُسے پسند کیا، اپنایا اور اپنے تعبیری و تفکیری اثاثے اور تخلیقی و تعمیری، دعوتی و تبلیغی اور علمی و ادبی سرمایے کا اُس کو خوب صورت، معنی آفریں، خیال افروز، حوصلہ آگیز، مشک بار اور عطربیز حصہ بنالیا اور اپنی تحریر و تقریر میں اُس کو اس طرح سمولیا، ”برگ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم“ اُسلوب اور اُسلوبیات کا ایک طالب علم آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولاناؒ کی زبان و قلم اور سوچنے اور کہنے کو اقبال کے شعر و فکر نے، غیر معمولی خوبی سے، غیر معمولی حد تک متاثر کیا ہے۔

مولاناؒ نے اقبال کو بے حساب کیوں چاہا اور اُن سے ٹوٹ کر کیوں محبت کی؟ مولانا کے قلم سے اس کی لذت انگیز حکایت کا، ایک ٹکڑا آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے:

”اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے۔ انسان بہت خود میں و خود پسند واقع ہوا ہے، اُس کی محبت اور نفرت، تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اُس کی ذات ہی ہوتی ہے؛ اس لیے اُسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے، جو اُس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اُس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنے کو اس کلیے سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلامِ اقبال کو عام طور پر اسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اُترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں؛ بل کہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

سب سے بڑی چیز، جو مجھے اُن کے فن کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسن امتزاج، اُن کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا اُن کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں اُنھی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اُس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تحریک کائنات اور تعمیرِ انفس و آفاق کے لیے اُبھارتا ہے؛ جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے؛ جو محمد ﷺ کی عظمت اور اُن کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ، کامرکز، وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں؛ ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی ماڈی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں؛ وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گزشتہ کے لیے، سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت اور اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔ (۱)

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعیوں کی تحریروں کی تاثیر

۶۔ اسی کے ساتھ معنوی طور پر کتب و اشخاص کے واسطے سے، شیخ حسن البنا مصریؒ

(۱۳۳۳ھ/۱۹۰۶ء-۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء) کی سیف و قلم کی جامع دعوت، جمال الدین افغانیؒ

(۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء-۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) کی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی حوصلہ انگیز منصوبہ

بندیوں کی حرارت خیز داستانوں اور غلام ہندوستان اور عالمِ اسلام میں، خدا کی حکمت

(۱) ”نقوشِ اقبال“ بہ قلم مولانا علی میاں ندوی، ص: ۳۳-۳۴، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، چھٹا

ایڈیشن ۱۳۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

وقدرت و مشیت سے، دور آخر میں پیدا ہونے والے، حوصلہ شعار و اخلاص پیکر قائدین و عمائدین کی حرکت و عمل نے بھی مولانا کے حساس دل، اثر پذیر طبیعت اور اخذ و استنباط کی صلاحیت سے بھرپور ذہن اور اکتسابی استعداد کے حامل قلم کو نتیجہ خیز حد تک متاثر کیا اور انھیں اُن ساری خوبیوں سے مالا مال کیا، جو کسی زوال آمادہ امت، اور سرِ کلیم و خلیل کو اپنی اذنانوں سے فاش کرنے کے وظیفے سے، وقتی طور پر لاتعلق ہو کر خوابیدہ ہو جانے والی، ملت اور لاقانونیت و ”مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری“ میں سرمست اور اخلاق و اقدار، و دین و مروت کے خلاف بغاوت کے نشے سے بدمست معاشرے کو بیدار کرنے اور راہِ مستقیم پر لانے والے داعی میں، خداے قدیر اپنی مرضی سے، وقت کی آندھیوں کا رخ موڑنے کے لیے، ہمہ وقت جہد و عمل کی لذت سے سرشار رہنے کی خاطر پیدا کر دیا کرتا ہے۔

فراسِتِ ایمانی و لذتِ قرآنی، نورِ بصیرت و دینی عزیمت، اخلاقی برہان و عملی قوت کے حامل، راز ہائے شریعت و طریقت سے باخبر اور حالات و زمانے کے اشارات پر وسیع و عمیق نظر رکھنے والے علمائے ربانی نے، مولانا علی میاں کے سلسلے میں اُن کے عنفوانِ عمر سے جو بشارتیں دی تھیں، جو توقعات وابستہ کیے تھے، جن بلند الفاظ سے انھیں یاد کیا تھا اور عرب و عجم کے نامور علماء و ادبا و مفکرین نے، اُن کی عظمت و امتیاز کے جس طرح گیت گائے تھے؛ مولانا کے علمی و فکری و ادبی اور قیادتی و اجتماعی کارناموں کو دیکھ کر، دنیا نے تصدیق کیا کہ اتنے سارے علماء و مشائخ کا اندازہ اُن کے سلسلے میں اتنا صحیح ثابت ہوا، جتنا شاید کسی بڑے سے بڑے سائنس دان کا اندازہ تجرباتی علوم اور برق و بخارات کے سلسلے میں بھی صحیح نہیں ہوتا، جب کہ ثانی الذکر اندازہ محسوسات و مشاہدات کی روشنی میں لگایا جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو اپنی وقتِ نظری، ذہانت اور علمی گیرائی و گہرائی کے لیے، شہرتِ عام رکھتے تھے، مولانا علی میاں کے ایک خط کے جواب میں جو انھوں نے (حضرت تھانویؒ نے) انھیں اُس وقت لکھا تھا، جب اُن کی عمر صرف ۱۹ سال

لیکھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسنؒ

کی تھی، انھیں ”مجمع الکمالات“ لکھا تھا۔ (۱)

شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اپنے شاگرد مولانا علی میاںؒ کو ایک خط میں ”بکترم المقام مولوی ابوالحسن صاحب“ لکھ کر ”بَارَكَ اللهُ فِي إِخْلَاصِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ“ کی دعا دے کر گویا مولاناؒ کے اخلاص اور حسنِ عمل کی گواہی دیتے ہیں۔ (۲)

ایک دوسرے خط میں مولاناؒ کو لکھتے ہیں:

”چوں کہ آپ میرے ہیں؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو؛ وہ میرے لیے باعثِ صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (۳) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے، اُسی طرح؛ بل کہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر، اُس سے زیادہ خوشی و سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔ اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور موجودہ دو فتن میں تمام مصائب و آلام سے مامون رکھے۔ آمین یا اللہ العالمین“۔ (۴)

ایک دوسرے مکتوب میں انھیں تحریر فرماتے ہیں:

”آپ کی ہر کام یابی سے جتنا میرے دل میں سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے، غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جسے، اُس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لیے بارگاہِ الہی میں ملتا جلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے اور اپنی مرضی کے مطابق، عمر بھر اشاعتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔“ (۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی دعائیں اور تمنائیں مولانا علی میاںؒ کے سلسلے میں، بارگاہِ ایزدی میں حرف بہ حرف مقبول نہیں ہوئیں۔

(۱) پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۱۲۳۔ (۲) مکتوبات شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ، ص: ۵۱۔

(۳) شیخ التفسیر کے فرزند اکبر۔ (۴) پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۱۶۱۔

(۵) حوالہ بالا، ص: ۱۶۲۔

پس مرگ زندہ

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے، اپنی زندگی کی ایک آخری مجلس میں مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا:

”مولانا! میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں، آپ کی کیا تعریف کروں؟

تعریف کرنا محبت کا اوجھا پن ہے۔“ (۱)

ایک مکتوب میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ مولانا کو لکھتے ہیں:

”مخدومی و محترمی حضرت سید صاحب! دامت برکاتہم، السلام علیکم

ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

...آں محترم کی توجہات عالیہ سے، تبلیغ کو جس قدر نفع پہنچا ہے، اب تک

لگنے والوں میں کسی سے نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مقدس توجہات کو، اس

طرف اور زائد مبذول فرمائے...“ (۲)

ایک دوسرے خط میں مولانا کو ان القاب سے یاد کرتے ہیں:

”مخدوم و مکرم معظم محترم سلالۃ خاندان نبوت اَقَامَنَا اللہُ وَاِیَّاکُمْ

لَا غَلَاءَ کَلِمَتِہِ وَاِحْیَاءُ سُنَنِ نَبِیِّہِ۔“

پھر آگے لکھتے ہیں:

”بہ خدمت عالی عمدۃ الامال والامانی مکرم محترم حضرت سید صاحب“ (۳)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”میری امیدوں اور تمناؤں کی ودیعت گاہ محترم سلالۃ خاندان نبوت“ (۴)

ہے کوئی جس کو، ان آرزوؤں اور توقعات اور دعاؤں کے لفظ لفظ، بارگاہِ استجاب

میں قبول ہونے میں ذرہ برابر شک کرنے کی جرأت ہو۔

(۱) کاروانِ زندگی، ج: ۱، ص: ۲۸۶۔

(۲) مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ص: ۸۱۔

(۳) حوالہ بالا، ص: ۸۔ (۴) حوالہ بالا، ص: ۷۱۔

صلحائے زمانہ کی توقعات کے سچے مصداق

مجھے یہاں مولاناؒ کے سلسلے میں تمام بڑوں کی دعاؤں و توقعات، کا احاطہ مقصود نہیں کہ قارئین کے لیے گراں چشم اور اکتاہٹ کا باعث ہو سکتا ہے، ورنہ عالم عرب کے بڑے بڑے علما و اُدبا اور عالم اسلام کے باکمال اہل علم و قلم کی لاتعداد عقیدت مندانہ و الہانہ شہادتیں، ڈھیر ساری مولاناؒ کی اپنی لکھی ہوئی اور اُن کے سلسلے میں دوسروں کی تصنیف کردہ کتابوں میں موجود ہیں، اُنھیں اپنی جگہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن یہاں صرف ایک بشارت بہ شکل خواب، جو خود اُن کی عالمہ و صالحہ و عابدہ و نیک خوالدہ کی ہے، کو نقل کرنے کے لیے قلم بے تاب نظر آتا ہے، لہذا اُس کو درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں اُن کی والدہ محترمہ سیدہ خیر النساء صاحبہ (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) کی شادی، اُن کے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے ساتھ ہونے کی بات چل رہی تھی، اُنھی دنوں اُن نیک بخت و سعادت نصیب خاتون نے، جو بشارت آمیز خواب دیکھا، اُس کا قصہ خود وہ اپنے قلم سے یوں لکھتی ہیں:

”ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اُس مالک کریم، رحمن و رحیم کی عنایت و مہربانی سے، ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کر سکی، منہ سے نکلتا دشوار تھا اور اُس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنی دیکھے، تو خوشی سے پھول گئی اور تمام فکر و غم بھول گئی، اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر رشک کرتا اور والد محترم، تو خوشی میں رونے لگے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ: سو کسی کو نہیں معلوم جو چھپا دھرا ہے، اُن کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک،

بدلہ اُس کا جو کرتے تھے۔“ (۱)

کوئی حد ہے مولاناؒ کے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کی، اپنے والدین کے لیے، اپنے اہل خاندان کے لیے، اپنے مربی برادرِ اکبر کے لیے، اپنے اساتذہ کے لیے، اپنے مربیوں اور شیوخ کے لیے، اپنے متعارفین و محبین و دعا گوئیوں کے لیے اور اُن تمام مسلمانوں اور انسانوں کے لیے، جنہیں اُن کی تحریر و تقریر، اُن کی صحبت و مجالست، اُن کی ملاقات و زیارت، اُن سے عقیدت و محبت، اُن کے سلوک و کردار، اُن کے اخلاق و کردار کے گہر آب دار، اور اُن کی حبِ نبوی اور اسلام پر فدا ہونے کی کیفیت، اُن کی مسلسل و حرکتِ پیہم و سچی بے کراں سے بھرپور زندگی و بندگی، جاں سوزی و تابندگی سے، کسی نہ کسی شکل میں فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہا ہے، یا رہے گا۔

پر خلوص تحریر و تقریر کی جادوگری و اثر انگیزی

میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے، الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ و معلومات کی گم نام اور تاریک سرنگوں میں، بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے، بہت سے لوگوں کا علم ہے؛ لیکن دل کی اتھاہ گہرائیوں سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تحریر و تقریر کے لفظ لفظ نہیں، حرف حرف پر اور ہر زیر و بم پر خلوص کا جو حسن، ایمان و یقین کی جو مہر تابی، دردِ دل کی جولڈت، انسانوں سے محبت کا جو جمال، اعلیٰ کلمۃ اللہ کا جو جلال، صدائے حق کی جو دل نوازی، اور سوزِ دروں کی جو تمازت اور فقرِ غیور و زہد پر نور کی، جو جاذبیت و حرارت، میں نے مولانا علی میاںؒ کے ہاں محسوس کی ہے، وہ میرے محدود علم و مطالعے میں، اُن میں سے کسی کے ہاں اس

(۱) ”الدعاء والقدّر“ مصنفہ سیدہ خیر النساء بہتر والدہ ماجدہ مولانا علی میاں ندویؒ، ص: ۲۳۳۔ حوالہ ”کاروانِ زندگی“

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

بھر پور کیفیت اور طرزِ خاص کے ساتھ، نہیں ملتی۔

میں نے عربی میں — اور اُن کی عربی اردو دونوں یکساں طور پر روحانیت اور ایمان و یقین میں ڈھلی ہوئی اور قلب و جگر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں — مولانا کی ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ ”کاروانِ مدینہ“ ”جب ایمان کی بہار آئی“ کو بالخصوص اور اُن کی دیگر کتابوں اور دعوتی و فکری کتابچوں کو بالعموم، ایک سے زائد بار پڑھا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ بعض دفعہ دفورِ جوش و جذبات کی وجہ سے مجھے ایسا لگا کہ میرا سینہ چاک ہو جائے گا، چناں چہ میں بیٹھا ہوتا، تو کھڑا ہو جاتا اور کھڑا ہوتا تو ٹھہلنے لگتا، نہ معلوم کتنی مرتبہ آنکھوں کو غسلِ صحت ملی، اور عصیاں شعار و توبہ شکن دل پر قلعی ہوئی۔ میرے جیسے سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے بندگانِ خدا ہوں گے، جنہیں مولاناؒ کی تحریر و تقریر سے اس مبارک کیفیت کا توشہ ملا ہوگا اور اِنْ شَاءَ اللہ ملتا رہے گا۔ آخر کوئی توبات ہے کہ عرب کے بڑے بڑے شاہانِ قلم و زبان، اپنا اپنا تاج شہنشاہی، مولانا کے قدموں میں ڈال کر عقیدت کا خراج ادا کر کے، ناقابلِ بیان فرحت و انبساط محسوس کرتے رہے ہیں۔

وہ خلوص کے جادو سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے، مجلسوں اور کانفرنسوں پر چھا جاتے تھے۔ میں نے بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ بعض بڑی کانفرنسوں میں، جہاں دنیاے عرب و اسلام کے چیدہ و برگزیدہ افراد جمع ہوتے تھے اور درِ دل کے بیان کے لیے، بعض دفعہ الفاظ و تعبیرات کے ذخیرے اُن کا ساتھ نہ دیتے اور وہ اپنی پسند کی کسی بھرپور تعبیر کی تلاش میں الجھ جاتے، تب بھی مجمع پر سکینت طاری رہتی اور سارا مجمع اُن کے دل کی جلن کو الفاظ کی چھین میں محسوس کرتا۔

مولانا علی میاںؒ، ایسے مجمع الکملات تھے، جن میں سے ہر کمالِ انسان کے بڑا بننے کے لیے کافی ہوتا ہے اور اگر یہ سب کسی میں جمع ہو جائیں، تو مرمومن اور انسانِ کامل بننے کی ممکنہ صفات و صلاحیتوں کا حامل بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ سب کسی

میں جمع ہو جائیں، تو وہ علی میاں تشکیل پاتا ہے۔
برصغیر کے، اُن کے ہم عصروں میں بعضوں کو بیرون ملک شہرت تو اُن کی ایسی مل گئی؛ لیکن کسی کے ہاں علمی غرور و خود سری تھی، تو کسی میں فکری کجی، چناں چہ کسی کو بھی شہرت و عزت کے افتخار، عمل کی درخشندی سے حرماں نصیبی، توازن کے فقدان اور پھر خلوص، خلق خدا کی بے لوث اور بے انتہا محبت کی کمی کی وجہ سے، عظمت و محبوبیت کا وہ اعلیٰ و ارفع مقام عطا نہیں ہوا، جو مولانا کا طرہ امتیاز ہے۔

بے مثال خاک ساری و منکسر المرءاجی

مولانا علی میاںؒ کی یہ بڑائی بھی سمجھوں پر بھاری ہے کہ تمام بڑوں کی محبت، عوام و خواص کے اعتقاد، پوری دنیا میں اُن کے ہر آن بڑھتے رہنے والے احترام اور شہرت کے آسمان پر پہنچ جانے کے باوجود، وہ علمی افتخار کا شکار ہوئے نہ زہد و ریاضت کے غرور سے شکست کھا سکے؛ بل کہ وہ جیسے جیسے دنیا والوں کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہوتے گئے، اُن کی خاک ساری میں ایسا محسوس اضافہ ہوتا گیا، جسے کور چشموں کو بھی محسوس کرنا پڑا اور جس کی گواہی دنیا کے ہر اُس انسان نے دی، جس کو کسی طور اُن سے سابقہ ہوا۔

علم و فکر کی راہ سے بھی دین کی خدمت اور دعوت کا عمل انجام دیا جاسکتا ہے اور دیا جاتا ہے اور مولانا علی میاںؒ اس میدان کے بھی کم یاب شہسوار تھے؛ لیکن بہتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ علم و قلم کے لیے یک سو ہو جاتے ہیں، اُس کے پیچ و خم میں اتنے اُلجھے رہتے، مطالعہ و معلومات کے گرداب میں مسلسل اس طرح پھنسے رہتے اور لکھنے پڑھنے کی دنیا کی لذت انگیز و طرب خیز تنہائی اور تصنیف و تالیف کے ”عشرت کدو“ کی آرام و راحت کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ ملک و ملت کے مسائل، قیادت و دعوت اور اجتماعی خدمت اور اُمت کے درد و اَلَم میں شرکت کرنے کی، انھیں فرصت نہیں مل پاتی، یا اُس کے لائق ہی نہیں رہ جاتے؛ لیکن مولاناؒ نے علم و قلم کی شہسواری کے باوصف، دنیا

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

کے چپے چپے کا جس طرح سفر کیا، ملکوں ملکوں جس طرح گئے، قریہ قریہ اور کوہ کوہ جس طرح پھرے، گوشے گوشے میں جس طرح ایمان و یقین کی صدا لگائی، عرب و عجم کو جس طرح محمدی پیغام کے ذریعے جھوڑا، مغربی تہذیب کی فسون کاری کا جس طرح پردہ چاک کیا، درد و محبت کی جس طرح مینہ برسائی، معاشرے کے قلب پر جس طرح دستک دی، اہل اسلام کو جس طرح صورتِ خورشید بننے کا درس دیا، ہر نوع کی بولہبیوں کے خلاف جس طرح گرے برے اور پنچہ آزمائی کی، باطل کو لٹکارا، شب پرستوں کو رگیدا، وطن کی خدمت کا حق ادا کیا اور اپنے وطن میں مسلمانوں کے مسائل اور انھیں مسلمان جیتے رہنے کے حق کی بحالی کے لیے، جس طرح خداوندانِ حکومت سے پنچہ آزمائی کی، انسانیت اور آدمیت کا جو سبق باشندگانِ وطن کو دیا، تہذیب و تمدن کی جو سوغات اُن میں تقسیم کی — اور جس طرح باہمہ و بے ہمہ رہے، اُس کی مثال، اُن لوگوں میں کوئی پیش نہیں کر سکتا، جنہیں ہماری نسل نے دیکھا اور برتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں راقمِ آٹم نے کم و بیش دس سال گزارے، میں نے اُن کے شب و روز دیکھے، اُن میں ظاہر و باطن کی ایسی یکسانیت دیکھی، جس کا میں نے اتنے طویل عرصے تک، کسی عالم میں مشاہدہ نہیں کیا؛ کیوں کہ کسی عالم کے ساتھ، اتنے طویل عرصے تک مجھے رہنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔

مولانا علی میاںؒ رحم دلی، انسیت اور انسانیت کا پیکر مجسم تھے، ایسا لگتا تھا کہ اُن کا باطن صرف اعلیٰ انسانی صفات سے سنوارا گیا ہے۔ سنگ دلی، سخت گیری، سخت روی اور تلخ گوئی سے وہ نا آشنائے محض تھے۔ حسد، کینہ، بغض، چشمک، نام و نمود کی خواہش اور دوسروں کو دبا کر آگے بڑھ جانے جیسے امراض، جن سے علما کا مٹزہ ہونا باعثِ تعجب ہوا کرتا ہے، سے اُن کے خمیر کو کوئی واسطہ نہ تھا۔

وہ خلوص و وفا کی تصویر تھے، اُن کے چہرے بشرے سے معصومیت اُبلتی تھی، اندر کا فرشتہ صفت انسان باہر بھی جلوہ گر نظر آتا تھا، وہ کسی سے کسی قول و فعل یا کسی جنبش کے

ذریعے، کسی طرح کا انتقام لینے کی صلاحیت سے بالکل عاری تھے۔ اُن کے کسی ہم نشین یا کسی دوست اور دشمن کو اُن کی طرف سے کسی رویے کے ذریعے، کسی طرح کی ایذا رسانی کا کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوتا تھا۔

اُن کی جلوت و خلوت کا میں باریک بینی سے عرصہ دس سال تک مُشاہدِ رہا ہوں، اُنھوں نے — خدا شاہد ہے — ماں کے ایسی شفقت اور باپ کے ایسی مہربانی دی، بہت دفعہ ایسا لگا کہ میں اُن کے دل کے آئینے میں اپنی تصویر مجسم دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے کشادہ دل میں لگتا تھا کہ مجھے سمالیں گے۔ میں ایک دور افتادہ، بے مایہ و بے ہنر انسان اُن کے ہاں دہلی سے بہ حیثیت مہمان وارد ہوا تھا؛ لیکن اُنھوں نے اپنی گھنیری چھاؤں سے نکلنے نہیں دیا، اپنے پاس روک لیا اور بالآخر مجھے اپنے ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بنالیا۔ یہ داستان بھی بڑی خوب صورت ہے جو دراز نویسی کی متقاضی ہے، جس کو میں کسی اور مناسب موقع کے لیے (شاید اپنی خودنوشت کے لیے) اٹھا رکھتا ہوں۔ اُنھوں نے وہاں کی زندگی میں اور وہاں سے آنے کے بعد، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زمانے میں، میرے وطن ہر پوریشی، اُڑائی، مظفر پور، بہار اور پھر دارالعلوم دیوبند میرے آسنے کے بعد بھی، مجھے موقع بہ موقع بیسیوں مکتوب تحریر فرمائے، جن سے اُن کی شرافتِ نفسی، نجابتِ علمی اور فکری رویے (کہ انسان کی عام تحریریں، بالخصوص خطوط و مکتوبات ان سب چیزوں کا بہ طورِ خاس آئینہ دار ہوتے ہیں) کے ساتھ ساتھ، ناچیز کے ساتھ اُن کی بے پناہ محبت، پر خلوص شفقت اور حقیقی پدرانہ سلوک کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ میں طوالت کے خوف سے صرف چند خطوط کے اندراج پر اکتفا کرتا ہوں:

اپنی مشہور درسی تالیف ”مختارات“ کی نئی طباعت سے پہلے، مولانا نے اُس پر نظر ثانی اور تصحیح کا کام ناچیز کے ذمے فرمایا، اس ذمے داری کی تکمیل کے بعد راقم نے مولانا کے پاس، اُس کے اغلاط کی فہرست، صفحات اور سطروں کی تعیین کے ساتھ بھیجی، تو

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

انھوں نے اپنے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی سے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں، راقم کے نام یہ مکتوب ارسال فرمایا:

عزیز گرامی مولوی نور عالم سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔
”مقنّات“ کا صحت نامہ دیکھا، آپ کی تمام تصحیحات سے اتفاق ہے، واقعی
”بالشرح الغریب“ غلط ہے، ”بشرح الغریب“ ہونا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے
کہ ہمارے ہاں آپ جیسے لوگ بھی ہیں، جن کی نظر اب ایسی باریک ہو گئی ہے کہ
اُن پر تصحیح کے بارے میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ آپ کا ترجمہ (۱) ابھی دیکھنا نہیں
شروع کیا ہے، ان شاء اللہ وہ بھی حسب توقع ہوگا۔ محمد میاں (۲) بہت تعریف
کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے۔ کسی دن موقع ہو تو ”رائے
بریلی“ بھی آجائیے گا۔

والسلام

ابوالحسن علی ندوی

۹ مارچ ۱۹۷۹ء

رمضان ۱۳۹۶ھ / ستمبر ۱۹۷۶ء میں، یہ راقم چھٹی میں اپنے گھر پر تھا، جہاں سے
کوئی عریضہ خبر خیریت معلوم کرنے کے لیے، مولانا کو لکھا ہوگا، اس کے جواب میں،
آپ نے یہ مکتوب ارسال فرمایا:

(۱) مراد اُن کی تالیف ”عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح“ کے عربی ترجمے سے ہے، جو راقم نے ”التفسیر

السیاسی للإسلام“ کے نام سے کیا تھا جو کئی بار ہندوستان اور بیرون ملک چھپ چکا ہے۔

(۲) مولانا محمد احسنی بن مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی برادرزادہ اکبر مولانا علی میاں، سابق ایڈیٹر و مؤسس ”البعث

الإسلامی“ عربی ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

رائے بریلی

۲۱/رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

عزیز گرامی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ملا، آپ کی بہ خیر رسی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ قصبات اور دیہاتوں کا ماحول تقریباً ہر جگہ ویسا ہی ہے، جیسا آپ نے لکھا ہے، لا ماشاء اللہ؛ لیکن اُن لوگوں کا آپ پر حق ہے: آپ اپنے زمانہ قیام میں وہاں دعوت و تذکیر کی کوئی ایسی بنیاد ڈال آئیں، جس سے اُن لوگوں کو ہدایت ہو، شاید کچھ لوگ راستے پر لگ جائیں۔ ایک آسان صورت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اپنے بچوں کو دینی مدارس میں بھیجے پر آمادہ کر دیں، شاید اُن میں سے کوئی داعی پیدا ہو جائے۔

خیال تھا کہ ”قصص البنیین“ کا چوتھا حصہ اس سال نصاب میں داخل ہو جائے گا؛ لیکن ابھی تک آپ شروع بھی نہیں کر سکے ہیں (۱)۔ اگر آپ شوال میں جلد آجائیں اور آخری شوال تک اُس کی کتابت مکمل ہو جائے تو وہ جلد بلاک سے چھپ سکتا ہے۔

سیرت کے مَنُفَعِے کی ٹائپنگ تیزی سے ہو رہی ہے، آپ کی جاں فشانی برابر یاد رہتی ہے (۲)۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ عطا فرمائے۔ مولانا محمد منظور صاحب سخت علیل ہو گئے ہیں، اُن کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔ اور سب خیریت ہے۔

(۱) اُن دنوں راقم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران جہاں دیگر تحریری کام کیا کرتا تھا، مولانا کی کئی کتابوں کی خط نسخ میں کتابت کی سعادت بھی حاصل کی تھی، خصوصاً ”قصص البنیین لئلا یفقد“ کے کئی حصے میں نے اپنے قلم سے خوش خط لکھے، جو مکتبہ ندویہ نے شائع کیے، مولانا کے مکتوب میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) اِس کتاب کی تمبیس کے لیے مولانا نے ایک ماہ کے لیے راقم کو اپنے وطن تکیہ کلاں، رائے بریلی بلوایا تھا، الگ سے اسنو اور چائے کا نظم کر دیا تھا، انھیں کسی کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ راقم چائے بہت اچھی پیتا ہے، اِسی لیے الگ سے بھائی عبدالرزاق (خادم خاص مولانا) کے ذریعے دودھ، لیچن گرین لیمل چائے کا پیکٹ ←

والسلام
دعا گو: ابوالحسن علی
۷ ستمبر ۱۹۷۶ء

رمضان ۱۴۰۲ھ میں راقم کو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا خط ملا کہ ”الذاعی“ کی ادارت اور تدریسی خدمات کے لیے، دارالعلوم دیوبند نے تمہیں منتخب کر لیا ہے؛ اس لیے شوال ۱۴۰۲ھ کے نصف سے پہلے تم دارالعلوم پہنچ جاؤ۔ دارالعلوم سے ناقابل بیان عقیدت و محبت، نیز حضرت الاستاذ کے حکم کی وجہ سے میں دارالعلوم نہ آنے اور اُس کے انتخاب کو مسترد کر دینے کی جرأت نہ کر سکا اور ۱۵ شوال کو میں دارالعلوم حاضر ہو گیا؛ لیکن فحالت کی وجہ سے، مولانا علی میاں کو اس کی اطلاع دینے اور اُن سے اس حوالے سے مشورہ کرنے کی ہمت جُٹا نہیں سکا، مولانا کو جب اس کا علم ہوا، تو انھوں نے یہ مکتوب ارسال فرمایا، جو اُن کی غیر معمولی کریم النفسی اور وسعتِ ظرفی کی غماز ہے:

عزیز گرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ وبارک فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج ۱۰ رذی قعدہ کو، آپ کا ۲ رذی قعدہ کا لکھا ہوا خط، عین حالت انتظار و اشتیاق میں ملا۔ میں کئی روز سے آپ کو خود خط لکھنا چاہتا تھا؛ مگر تردد تھا کہ کہاں لکھوں؟ مجھے مجلسِ شوریٰ ہی میں اس پیش کش کا علم ہو گیا تھا اور میں نے ذمے داروں کے پوچھنے پر کہا تھا کہ ہمارے یہاں مولوی سعید الرحمنؒ، رابع اور واضح (۱) کے بعد اُنھی کا درجہ ہے اور وہاں

→ میرے لیے منگو کے مہمان خانے کے ایک کمرے میں رکھوا دیا تھا اور میری دلجوئی کے لیے، ناشتے کے دو ایک گھنٹے کے بعد فرماتے: مولوی نور صاحب! آپ کی چائے نہیں بنی، ورنہ میں بھی پیتا، ایسا اس لیے فرماتے کہ میں ضرور چائے کی اپنی خواہش کو تسکین دوں۔ اللہ اُن کی اس انسان نوازی کا بھر پور بدلہ اُنھیں عطا فرمائے۔

(۱) مولانا ڈاکٹر سعید الرحمنؒ اعظمی ندوی حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ چیف ایڈیٹر رسالہ ”البعث الاسلامی“ عربی۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، بشیرہ زادہ مولانا علی میاں، حال ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ مولانا واضح رشید ندوی برادرِ خرد مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ایڈیٹر ”البعث الاسلامی“ و ”الرائد“ و استاذ و معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

بھی مولوی وحید الزماں کے بعد وہ سب پر فائق ہیں؛ لیکن تعلق کی بنا پر مجھے ہلکی سی شکایت پیدا ہوئی تھی کہ سارا معاملہ بالا ہی بالا طے ہو گیا اور مجھے بعد میں خبر ہوئی؛ لیکن آپ کی مجبوریوں میں میرے پیش نظر تھیں؛ اس لیے میں نے آپ کی طرف سے خود ہی معذرت کر لی۔ آپ کے خط نے اُس اثر کو زائل کر دیا اور میری شکایت جاتی رہی۔

مولوی تقی عثمانی صاحب کی کتاب پر، جس کا آپ نے ترجمہ کیا ہے (۱)، میں نے مقدمہ لکھ دیا ہے، ایک نقل اُن کو بھیج دی ہے، ایک نقل آپ کے دیکھنے کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ آپ ان شاء اللہ دیکھ کر خوش ہوں گے، مبسوط مقدمہ آ گیا ہے۔ اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں؛ تاکہ جلد آپ کو خط مل جائے۔

والسلام

دعا گو: ابو الحسن علی

۱۰ ارزی قعدہ ۱۴۰۲ھ

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا قیام جب دیوبند کے ”گدی واڑہ“ محلے میں تھا، تو وہاں کی قدیم بوسیدہ مسجد کو، جس میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی پنج وقتہ نمازیں ادا فرمایا کرتے تھے، شہید کر کے از سر نو تعمیر کرنے کی سوچی، انھی دنوں حضرت کے علم میں آیا کہ ”رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ“ کی طرف سے کوئی رقم مسجد وغیرہ کی تعمیر کے لیے سعودی سفارت خانے نئی دہلی میں آئی ہوئی ہے، اگر مولانا علی میاںؒ سفارش فرمادیں گے، تو اس مسجد کی ضرورت کے مطابق، اس میں سے مدد مل سکتی ہے، اس سلسلے میں حضرت نے مجھے واسطہ بنایا کہ تمہارا مولاناؒ سے گہرا تعلق ہے، تم اس سلسلے میں اُن سے کہو، میں نے اس کے لیے عریضہ لکھا تو مولاناؒ کا یہ جواب موصول ہوا:

(۱) مراد ”عیسائیت کیا ہے؟“ سے ہے، جس کا ترجمہ راقم نے ”ماہی المسیحیہ؟“ کے نام سے کیا تھا۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

۱۹۸۲/۱۲/۱۴ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۲ء وقت پر مل گیا، اس کے بعد مصلیٰ مولانا وحید الزماں صاحب کے بھیجے ہوئے مولوی صاحب پہنچے، اُن کو ”رابع“ کے پاس بھیج دیا؛ تاکہ وہ اُن کو طریقہ کار بتا دیں۔ ان شاء اللہ اگر رابطہ کی طرف سے دریافت کیا گیا، تو تصدیق و ترکیے کے الفاظ لکھ دیے جائیں گے۔

ہمارا خط مولانا کے نام بہ راہ راست نہیں پہنچتا؛ اس لیے آپ کی وساطت سے یہ خط لکھتا ہوں۔ میرا سلام بھی پہنچا دیجیے اور یاد آوری کا شکریہ۔ میں ۲۳ دسمبر سے ۱۵ جنوری تک باہر رہوں گا، آپ کی کامیابی اور سکون خاطر کے ساتھ کام کرنے کی دعا کرتا ہوں۔

والسلام

دعا گو: ابوالحسن علی

دیوبند آنے کے بعد، راقم کی اس خواہش میں اضافہ ہوتا گیا کہ مولانا کی عام تحریروں اور علمی و فکری و دعوتی نگارشات سے فائدہ اٹھایا جائے؛ کیوں کہ دوری کے بعد قرب و اتصال کا یہی بہترین ذریعہ تھا۔ ایک عریضے میں، راقم نے مولانا سے، اُن کی بعض تازہ شائع شدہ کتابوں کی خواہش ظاہر کی، تو آپ نے اُس کے جواب میں لکھا:

عزیز مکرم! حفظہ اللہ و رعاه

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء کا خط مل گیا تھا؛ مگر میں دو ہفتے ایسی بجزانی کیفیت میں رہا کہ ڈاک بھی نہیں پڑھ سکا۔ آپ کی یاد آتی ہے، ۲۰ نومبر کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ لکھنؤ میں ہے، اگر اُس سے پہلے کوئی جانے والا ملا تو حصہ پنجم (۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی یا مولانا

(۱) مراد تاریخ دعوت و عزیمت کا حصہ پنجم ہے۔

پس مرگ زندہ

مرغوب الرحمن کے حوالے کر دوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو ”کاروان زندگی“ کی دوسری جلد بھی اور ”تاریخ ندوة العلماء“ بھی۔ وطن جاتے ہوئے کبھی دو ایک دن کے لیے راستے میں اتر جایا کیجیے۔ ”رسائل الأعلام“ کے نام سے ستر خطوط کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے، جو مشاہیر عالم عربی کے ہمارے نام ہیں۔ آپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

والسلام
مخلص: ابوالحسن علی

۱۹۸۴/۱۱/۶ء

اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اواخر میں دارالعلوم دیوبند میں پہلی عالمی ختم نبوت کانفرنس ہوئی، جس میں مولاناؒ نے شرکت فرمائی اور قادیانیت کے موضوع پر انتہائی پر مغز تقریر کی، جس کا عربی ترجمہ راقم نے ”الداعی“ میں شائع کیا، جب یہ شمارہ مولاناؒ کو موصول ہوا، تو اُس میں اپنی تقریر کا عربی ترجمہ اچانک دیکھ کر، انھیں بے حد خوشی ہوئی اور انھوں نے ناچیز کو یہ شفقت بھرا خط لکھا:

دہلی

۸ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

عزیز گرامی! زید توفیقہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ بہ خیریت ہوں گے، اکتوبر کی آخری تاریخوں میں مجلس شوریٰ اور قادیانیت کے بارے میں مؤتمر کے انعقاد کے موقع پر، دیوبند جانا ہوا تھا اور دو دن رہنا ہوا تھا؛ مگر اتفاق سے آپ دہلی گئے ہوئے تھے، آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، آپ کا سلام پہنچا تھا۔ اب ”الداعی“ کا تازہ پرچہ دیکھ کر آپ کو خط لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، ہم سمجھتے تھے کہ ہماری تقریر بالکل نظر انداز کر دی گئی، ”آئینہ دارالعلوم“ میں بھی محض ایک

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

اشارہ تھا، یہ بھی اطمینان نہیں تھا کہ اُس کا کیسٹ محفوظ ہے؛ لیکن ”الدرعی“ کا سہ پرچہ پڑھ کی بہت خوشی ہوئی، آپ نے حسب توقع اور حسب سابق اُس کا بہت کام یاب اور شریک ترجمہ کیا ہے اور پوری تقریر اپنی صحیح روح اور طاقت کے ساتھ عربی میں آگئی ہے، ہم نے اس کو دیکھنا شروع کر دیا ہے، جہاں کسی اجمال کی قدرے تفصیل یا مغربی فضلا کے اعتراف و شہادت کی اصل عبارتوں کے نقل کرنے کی ضرورت تھی اور ارتجالی تقریر میں اپنے الفاظ کے ساتھ نہیں کی جاسکتی تھی، اُن کو اُن کے اصل ماخذ سے نقل کر کے، اس میں اضافہ کر رہے ہیں، ان شاء اللہ تکمیل کے بعد وہ مستقلاً رسالہ کی شکل میں مجلس کی طرف سے شائع ہو جائے گی اور مترجم اور ناقل کی حیثیت سے آپ کا نام ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اس کو پسند کریں گے اور اس کی اجازت دیں گے۔ اب آپ کو یہ تکلیف دینا ہے کہ اردو کا کیسٹ یا تو آپ محفوظ طریقے پر رابع سلمہ یا مولوی سعید الرحمن وغیرہ کو بھیجوادیں یا اُس کو تحریر میں منتقل کروا کے بھیجوادیں؛ اس لیے کہ ہمارے پاس اُس تقریر کا کوئی کیسٹ نہیں ہے؛ اس لیے آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔ آج ہی ہم بمبئی روانہ ہو رہے ہیں، ۲۰-۲۵ دسمبر تک ان شاء اللہ واپسی ہوگی، اگر آپ بمبئی کے پتے پر جواب دینا چاہیں تو وہ یہ ہے:

معرفت حاجی غلام محمد صاحب

Bombay Andhra Transport

113, Bhandari street, Bombay-3

والسلام

مخلص: ابوالحسن علی

۱۱ دسمبر ۱۹۸۶ء

راقم نے مولانا کی خواہش کے مطابق اردو تقریر کو قلم بند کر کے بھیجا اور ساتھ ہی

پس مرگ زندہ

کیسٹ بھی بھیج دی، تو آپ نے یہ مکتوب ارسال فرمایا:

۱۹۸۷/۱۲/۲ء

عزیز گرامی قدر! زید توفیقہ وسعادۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کی پہلی توجہ و عنایت کا شکریہ ادا نہیں کر سکا تھا کہ اردو تقریر قلم بند کی ہوئی اور کیسٹ مل گئے۔ میں نے نظر ثانی کر لی، آپ کی محنت کی داد دی۔ ”تعمیر حیات“ میں بھی شائع ہوگی اور مجلس کی طرف سے علاحدہ بھی۔ عربی تقریر نظر ثانی کے بعد نائپ کروا کر ”المجتمع“ کویت کو بھیج رہا ہوں، مجلس کی طرف سے بھی ان شاء اللہ شائع ہوگی۔ مجلس کو ہدایت کردوں گا کہ کوئی جانے والا ہو، تو آپ کو بھیج دیں۔ ”المسلمون في الهند“ کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔

والسلام

ابوالحسن علی

دیوبند میں مجھے ایک مرتبہ مولانا کی شدید علالت کا علم ہوا، تو میں نے انہیں دریافت حال اور مزاج پرسی کے لیے خط لکھا، تو آپ نے بمبئی سے یہ شفقت نامہ ارسال فرمایا:

بمبئی

عزیز گرامی قدر مولوی نور عالم خلیل الامینی صاحب / حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۹/۱۲/۸۷ قعدہ کا لکھا ہوا خط لکھنؤ اُس وقت ملا جب میں دہلی بمبئی کے لیے پابہ رکاب تھا۔ ۲۰/۱۲/۸۷ رمضان المبارک سے علالت کا سلسلہ ہے، خون کی بہت کمی بتائی جاتی ہے اور ضعف بہت زیادہ ہے اور بھی شکایات ہیں۔ آپ کے فکر و تردد اور احوال پرسی سے مسرت اور تقویت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و قوت عطا فرمائے اور تادیر آپ سے علمی و دینی خدمت کا کام لے۔ کل ہی بمبئی پہنچا ہوں، دو ہفتے کے قریب قیام کا

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

ارادہ ہے۔ خدا کرے یہ قیام راس آئے اور یہاں سے بہتر حالت میں اپنے
مستقر پر واپسی ہو۔

والسلام

دعا گو و دعا جو

ابوالحسن علی

۲۰/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

مولاناؒ کے کسی قریبی عزیز کے انتقال کی اطلاع ملی، تو راقم نے انھیں تعزیتی خط لکھا اور
غم غلط کرنے کے لیے جو سمجھ میں آیا وہ لکھا، تو مولاناؒ نے مندرجہ ذیل والا نامہ ارسال فرمایا:

۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

محبت عزیز و مکرم مولوی نور عالم صاحب امینی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا تعزیت نامہ مورخہ ۲۲/ جمادی
الاولیٰ کل ہی پرسوں پہنچا، جو عین توقع کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے
خیر دے۔ مولانا مرغوب الرحمن صاحب کا گرامی نامہ بھی ملا، میں نے اُن کو
شکریہ اور مزاج پرسی کا خط لکھا ہے، آپ بھی دعائے مغفرت اور بہ آسانی جو کچھ
ایصالِ ثواب ہو سکے کریں۔

اس سے خوشی ہوئی کہ آپ کو ہمارے دونوں رسالے مل گئے۔ ”فی
مسیرۃ الحیۃ“ کی دوسری جلد بیروت میں تقریباً مکمل ہو گئی ہے؛ مگر وہاں
کے حالات ایسے ہیں کہ ابھی وہ ناشر کے پاس نہیں پہنچی ہوگی، ان شاء اللہ
آئے گی، تو ایک نسخہ آپ کو ضرور بھیج جائے گا۔

دعا ہے کہ آپ کے پاؤں کی تکلیف ٹھیک ہو جائے اور کوئی پیچیدگی اور
طوالت نہ پیدا ہو۔ واقعی آپ سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی، کبھی کبھی دو

پس مرگ زندہ

چار دن کے لیے ادھر آ جایا کیجیے۔
والسلام
دعا گو محتاج دعا
ابوالحسن علی ندوی
۲۸ دسمبر ۱۹۸۹ء

مولانا نے اپنا رسالہ ”ترشید الصحوة الإسلامية“ بھیجا، راقم نے اُس کی
رسید ارسال کی، تو اُن کا یہ جواب مرحمت ہوا:
لکھنؤ: ۱۶ شعبان ۱۴۱۱ھ

محبت عزیز و کرم! زید توفیقہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۲۲ فروری کا خط عین حالتِ
انتظار، بل کہ اشتیاق میں ملا، مجھے رسالے کے پہنچنے کی اطلاع کا انتظار تھا اور
آپ کے تاخر کا، خط پڑھ کر خوش ہوئی۔ مزید چند عربی، اردو کے رسائل اور
کتابچے بھیجوا رہا ہوں، ایک نئی کتاب ”قصص من التاريخ الاسلامي“
بھی بھیجی جا رہی ہے، امید ہے کہ آپ پسند کریں گے۔

مسئلہ معلوم میں (۱) ”الداعی“ آپ کی ادارت میں جو کردار ادا کر رہا
ہے، اس سے بڑی خوشی اور اطمینان ہے۔ امید ہے کہ آپ کے مضامین اور
تحریریں، ملک کے دینی اور تعلیمی حلقے میں چشم کشا ثابت ہوں گے۔ اگر ایسا نہ
ہوتا تو سمجھا جاتا کہ یہ تنہا ندوہ کے لوگوں کا تقرر داوَر ”بدعت“ ہے۔

۳ مارچ کو اس سلسلے میں ”جمعية المثقفين المسلمين“ کی
طرف سے جو جلسہ ہوا، اُس کی روداد اور ہماری تقریر کا خلاصہ ۴ مارچ کے

(۱) اشارہ خلیج کے اُس بحران کی طرف ہے، جو عراق کے کویت پر حملے اور قبضے سے پیدا ہوا تھا اور پھر اُس کے بہانے
امریکہ نے خلیجی خطوں میں اپنی عسکری و اقتصادی موجودگی کو یقینی اور پایدار بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا کھیل از اول
تا آخر امریکہ ہی نے کھیلا اور کھیل رہا ہے۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

”قومی آواز“ میں شائع ہوا ہے، اس کو ضرور پڑھیے گا، اُس میں آپ کو بہت توار بھی محسوس ہوگا۔

عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ افسوس ہے کہ میں اپنی علالت اور نقل و حرکت کی معذوری کی بنا پر شورئی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں گے۔

والسلام
ابوالحسن علی

انسان مگر فرشتہ

مولانا علی میاں بہ ہر کیف بشر تھے جس سے غلطی اور بھول چوک کا امکان بہ ہر کیف باقی رہتا ہے؛ لیکن بشر کی شکل میں فرشتہ ہونے کی زیادہ سے زیادہ خوبی میں نے اُنھی میں دیکھی ہے۔ اُن کی معصومیت کی قسم تو نہیں کھائی جاسکتی؛ لیکن جن بزرگوں کو میں نے دیکھا یا برتا ہے (اُن سب کے احترام اور اُن کے لیے دعائے خیر کے باوجود) میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ انسانیت و شرافت، مروت و انیسیت، توازن و فروتنی، سادگی و بے نفسی، دنیا کے مال و منال سے بے رغبتی اور بڑی سے بڑی قیمت پر نہ بکنے کی صفت میں، اُن سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ میں نے کم و بیش ۱۰ سال کی مدت مولاناؒ کی خدمت اور ندوۃ العلماء کی تدریس میں گزارا ہے، جس کا شاید آدھا حصہ مولاناؒ کے ساتھ، مولاناؒ کے پاس اور اُن کی خدمت میں گزارا ہے، اُن کے تصنیفی و تالیفی کام میں اُن کا ہاتھ بٹانے کی سعادت سے بہرہ ور رہا ہوں، اُنھوں نے کبھی کسی کام کو کیوں کیا؟ کیوں نہیں کیا؟ نہیں کہا، وہ اپنی مؤمنی صورت، اداے دل نوازی، شیریں گفتاری، نرم خوئی و دل جوئی سے، دل میں گھر کر جاتے تھے، وہ ہر طرح سے صرف انسان لگتے تھے، کروفر، شان و شوک اور ٹیپ ٹاپ سے اُن کی ذات، اُن کا آشیانہ، اُن کا خور و نوش، اُن

کی زندگی کا ہر لمحہ بالکل مُبرّ تھا۔ وہاں دربانوں کا ہجوم تھا نہ پہرہ داروں کی سختی، نہ خُدا امانِ جفاکیش کی دھڑکن۔

بعض ایسے محروم توفیق و سعادت لوگ بھی نظر آئے (اور کیوں نہ نظر آتے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے ناقدین و معاندین بھی تو اسی زمین پر بستے ہیں، تو انسان چاہے جتنا بڑا ہو جائے وہ حرف گیری کرنے والوں کی زد سے نہیں بچ سکتا کہ بھنگیوں کی نظر صرف گندگیوں کی تلاش میں رہتی ہے) جو مولانا علی میاںؒ کی سلامت روی اور توازن و اعتدال کو، اُن کی کم زوری گردانتے تھے؛ بل کہ مدائنت سے تعبیر کرتے تھے، کہ وہ کسی مسئلے میں صاف لفظوں میں دو ٹوک رائے قائم نہیں کرتے؛ لیکن انھیں کیا معلوم کہ یہ مولانا کی کم زوری نہیں؛ بل کہ بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ مخالف سے مخالف فرد اور جماعت کے لیے، زبان اور قلم کو آخری حد تک جانے دینا تو درکنار، کسی طرح کی آلودگی سے ہمیشہ پاک رکھتے تھے۔ اُن کی خوبی تھی کہ وہ دل خراش اور مروت کو جراحت پہنچانے والے کسی بھی حرف و صوت سے بہر حال گریزاں رہے؛ اسی وجہ سے مخالف و موافق دونوں قسم کے لوگ ملکی و ملی مسائل میں، اُن پر حد درجہ متفق تھے، مسلم و غیر مسلم دونوں ہی اُن کی عظمت کا دم بھرتے تھے، صلح جوئی اور نرم روی، اُن کا سب سے بڑا ہتھیار تھی، انھوں نے قلم و زبان سے اشتعال انگیز کوئی بات لکھی نہ کہی؛ اسی لیے ہر طبقے اور ہر مذہب و رجحان کے لوگوں کے نزدیک وہ غیر معمولی طور پر مُتفق علیہ تھے۔

ہر پڑھا لکھا شہرت و عظمت و احترام کا خواہاں تو ہوتا ہے؛ لیکن وہ اُس کردار و سلوک پر کار بند نہیں ہو پاتا، جو مولانا علی میاںؒ کو ہر دل عزیز ی دے گیا۔ (۶)

(۶) اصل تحریر در عربی شائع شدہ ”الداغی“ خصوصی شمارہ بر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ۱۱-۱۲، جلد ۳۳: ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ مطابق فروری۔ مارچ ۲۰۰۰ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود، شائع شدہ پندرہ روزہ تعمیر حیات دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۰ جنوری ۲۰۰۱ء۔

سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: علی ابوالحسن بن عبدالحی بن فخرالدین الحسنی۔ سلسلہ نسب عبداللہ الاشتر بن محمد و انفس الزکیۃ بن عبداللہ کھض بن الحسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے جا ملتا ہے۔

✽ تاریخ پیدائش: ۶ محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء۔

✽ جاے پیدائش و وطن: دائرۂ شاہ علم اللہ الحسنی معروف بہ نکیہ کلاں جو رائے بریلی کے مغربی جانب ایک مضافاتی گاؤں ہے۔

✽ تعلیم و تربیت

قرآن پاک ناظرہ اور اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ صاحبہ کی نگرانی میں پڑھیں، جس وقت اُن کے والد محترم مؤرخ و مصنف مولانا عبدالحیؒ کا ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا، تو وہ نو سال کے تھے؛ اس لیے اُن کی تمام تربیت و تعلیم و تربیت اُن کی والدہ محترمہ اور اُن کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالحی حسنی کی سرپرستی میں انجام پائی، جو اُن سے عمر میں بیس سال بڑے تھے۔ تعلیم کے دوران مولانا نے حدیث، تفسیر اور ادب کے علوم کی تحصیل میں خصوصی دل چسپی لی۔ عربی ادب میں اُن کے دو اہم استاذ رہے تھے: ایک شیخ غلیل بن محمد انصاری یمانی دوسرے شیخ تقی الدین ہلائی مراکشی۔ اردو ادب میں مولانا نے اپنے خاندان کے بعض محترم عزیزوں بالخصوص مولانا ابوالخیر صاحب برقؒ سے استفادہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں داخل ہوئے اور عربی زبان و ادب میں فاضل ادب کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء-۱۹۳۰ء کے عرصے میں انھوں نے انگریزی زبان کی استعداد بہم پہنچائی۔ ۱۹۲۹ء/۱۳۴۷ھ میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے مراحل طے کیے۔ حدیث شریف کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی سے حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ھ میں انھوں نے مزید استفادے کے لیے کئی ماہ دارالعلوم دیوبند میں قیام فرمایا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھیں، انھوں نے اس موقع سے فقہ میں شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعجاز علیؒ سے استفادہ کیا اور حفص کی روایت کے مطابق قاری اصغر علیؒ سے فہرہ تجوید میں فائدہ اٹھایا، تفسیر انھوں نے اپنے عہد کے مشہور صاحب طرز استاذ تفسیر حضرت مولانا محمد علی لاہوری سے لاہور جا کر پڑھی۔

عملی اور دعوتی زندگی

۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر و حدیث اور ادب عربی کے استاذ منتخب ہوئے۔ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں انھوں نے پورے برصغیر کا دورہ کیا اور اسلام کی دعوت اور اسلام کے فروغ کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے متعلق معلومات حاصل کیں، اس کی روشنی میں دعوتی و دینی مقصد کے لیے کام کرنے کی راہ منتخب کی۔ اس سلسلے میں جہاں دین کے مختلف داعیوں اور مربیوں سے ملاقات ہوئی، وہیں وقت کے اسلامی افکار شاعر ڈاکٹر محمد اقبال سے بھی ہوئی۔ انھوں نے حضرت مولانا عبد القادر راے پوری اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے ملاقات کی اور اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے لیے، اُن سے خصوصی تعلق پیدا کیا، اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک دعوت و اصلاح کو قریب سے سمجھنے کا انھیں موقع ملا، انھوں نے اس تحریک کی اہمیت کو گہرائی سے محسوس کیا اور اُس میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مولانا محمد الیاس کی خصوصی توجہات انھیں حاصل ہوئیں، نیز جلیل القدر عالم و شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے، عفوان شباب سے ہی تعلق قائم ہو گیا، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، مولانا نے انھیں اپنے مربی اور سرپرست کی حیثیت میں رکھا۔

وفات

اپنے وطن تکیہ کلاں، رائے بریلی میں، بہ روز جمعہ ۱۱ رجب ۵۵ کر ۵۵ منٹ پر بہ تاریخ ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ = ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ تدفین در احاطہ خاص براے تدفین اہل خاندان نزد مسجد، جانب مشرق، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

اہم تالیفات

اُن کی چھوٹی بڑی عربی تالیفات کی تعداد ۱۹۹ اور چھوٹی بڑی اردو تصنیفات کی تعداد ۳۰۴ ہے۔ اُن کی مشہور عربی تصنیف ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ ہے جو ۱۹۳۹ء میں مصر کے ایک موقر ادارے کی طرف سے شائع ہوئی اور بے پناہ مقبول ہوئی، یہ اہم علمی کام انھوں نے اُس وقت انجام دیا جب اُن کی عمر صرف ۳۲-۳۳ سال کی تھی۔ یہ کتاب بالخصوص عربوں کے لیے، اتنی مؤثر اور مقبول ثابت ہوئی کہ عربوں نے اسے بیسویں صدی کی ممتاز ترین تصنیفات میں سے ایک شمار کیا، چنانچہ کوئی اسلام پسند عربی، طالب علم سے لے کر استاذ کے طبقے تک، ایسا نہیں رہا جس نے کتاب کو

یکتائے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

پڑھانہ ہوا اور اُس کی اہمیت کو محسوس نہ کیا ہو۔ مولانا کی بعد میں کیے بعد دیگرے بہت سی کتابیں اردو اور عربی نیز انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہوئیں؛ لیکن عالم عربی میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم یہی کتاب اُن کی اصل شناخت ثابت ہوئی۔ اُن کی دیگر مشہور عربی تالیفات یہ ہیں: رجال الفكر والدعوة في الإسلام، النبوة والأنبياء في ضوء القرآن، الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية في الأقطار الإسلامية، الأركان الأربعة، مختارات من أدب العرب، قصص النبيين للأطفال، القراءة الراشدة، السيرة النبوية، روائع إقبال، الصراع بين الإيمان والمادية۔

✽ مشہور اردو تالیفات

سرت سید احمد شہید، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، نبی رحمت، کاروانِ مدینہ، منصب نبوت اور اُس کے عالی مقام حاملین، المرتضیٰ، تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، مکتوبات مولانا محمد الیاس، حیات عبدالحی، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، سوانح مولانا محمد زکریا کاندھلوی، کاروانِ زندگی جس کا ”فنی مسیریۃ الحیاة“ کے نام سے عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، پرانے چراغ، نقوشِ اقبال، ارکانِ اربعہ، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، قادیانیت: تحلیل و تجزیہ، عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح جس کا عربی ترجمہ ”التفسیر السیاسی للإسلام“ کے نام سے راقم الحروف نے کیا تھا جو بار بار شائع ہوتا رہا ہے، معرکہ ایمان و مادیات۔

✽ اسفار

مولانا نے پہلا سفر حج ۱۹۴۷ء میں دوسرا ۱۹۵۰ء میں کیا، جس میں کئی ماہ صرف ہوئے اور انھوں نے اس موقع سے نہ صرف سعودی عربیہ، بل کہ مصر، سوڈان، شام، قدس اور اردن وغیرہ کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے اہم علماء، مفکرین، ادبا اور صحافت کے پیشے سے وابستہ افراد، نیز معاشرے کے مختلف سربراہان اور لوگوں سے ملاقات کی۔

۱۹۴۸ء میں انھوں نے شام کا دورہ کیا اور وہاں ۴۸ دن قیام رہا، جس کے دوران انھوں نے دمشق یونیورسٹی میں ”شهادت العلم والتاریخ فی قضیۃ فلسطین“ کے عنوان سے محاضرے پیش کیے، اِس دوران انھوں نے محض، حماة، معرة النعمان اور حلب جیسے شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے چوٹی کے علماء اور مفکرین سے اسلامی مسائل پر تبادلہٴ خیال کیا۔ فلسطین کا دورہ کیا، مسجد اقصیٰ کی زیارت کی اور وہاں رمضان کے آخری دن گزارے اور وہیں عید الفطر کی نماز ادا کی نیز شہر ”خلیل“، بیت اللحم وغیرہ کا

دورہ کیا، ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شام تشریف لے گئے اور دمشق یونیورسٹی کے شریعت کالج میں ۳ ماہ کے قیام کے دوران ”رجال الفكر والدعوة في الاسلام“ کے موضوع پر لکچرس دیے، اسی سفر میں انھوں نے لبنان، بیروت، اور طرابلس کا دورہ کیا، نیز ترکی بھی تشریف لے گئے، جہاں دو ہفتے قیام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں بھی رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جانا ہوا، کویت کا سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں سفر ہوا، پھر ۱۹۶۸ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں بھی جانا ہوا، عرب مارات پہلی بار شارحہ کے امیر سلطان بن محمد القاسمی کی دعوت پر ۱۹۷۴ء میں تشریف لے گئے، پھر ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء میں بھی وہاں کا سفر ہوا، ۱۹۹۰ء میں سیرت نبوی کانفرنس میں شرکت کے لیے قطر جانا ہوا، ۱۹۷۳ء میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک وفد کی سربراہی کرتے ہوئے افغانستان، ایران، لبنان اور عراق، (جہاں پہلی بار ۱۹۵۶ء میں جانا ہوا تھا) سیریا اور اردن وغیرہ کا دورہ کیا، ۱۹۸۴ء میں اردن کے آل بیت ادارے کی دعوت پر وہاں جانا ہوا، جہاں کئی محاضرے اور تقریریں ہوئیں۔ ۱۹۷۶ء میں ”رابطۃ الجامعات الإسلامية“ کی دعوت پر مغرب اقصیٰ کا سفر ہوا، جب کہ ۱۹۸۲ء نیز ۱۹۸۶ء میں ”ملتقى الفكر الاسلامي“ میں شرکت کے لیے الجزائر جانا ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں برما کا سفر ہوا، اور ۱۹۶۳ء نیز ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۲ء میں کئی بار پاکستان کا سفر ہوا، ۱۹۸۲ء میں سری لنکا اور ۱۹۸۴ء میں بنگلہ دیش کا سفر ہوا، ۱۹۶۲ء میں پہلی بار یورپ کا سفر ہوا جس میں جنیوا، لوزان، برن، پیرس، لندن، کیمبرج، آکسفورڈ (گلاسکو) ایڈمبرا وغیرہ کا دورہ ہوا، جہاں فضلاء عرب اور چوٹی کے مستشرقین سے ملاقاتیں ہوئیں اسی سفر میں مڈریڈ یونیورسٹی میں لکچر دیا نیز طیلطہ، اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ جیسے اسپین کے اہم شہروں کا دورہ کیا، ۱۹۶۳ء میں دوسری مرتبہ یورپ کا سفر ہوا جس کے دوران آپ نے لندن، برلین، آخن، میونخ، اور یون جیسے شہروں کا دورہ کیا۔

تیسری مرتبہ ۱۹۶۹ء میں یورپ کا دورہ ہوا، جس کے دوران جنیوا اور لندن جانا ہوا، نیز برمنگھم، مانچسٹر، بلیک برن، ڈیویزبری، لیڈز، گلاسکو، وغیرہ کا دورہ کیا اور وہاں تقریریں اور ملاقاتیں ہوئیں۔ چوتھی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ سینٹر برائے اسلامک اسٹڈیز کی تاسیس کے موقع سے لندن جانا ہوا، ۱۹۸۵ء میں بلجیئم کا دورہ ہوا اور ۱۹۷۷ء میں امریکہ اور کناڈا کا سفر ہوا اس موقع سے نیویارک، شکاگو، جرسی سٹی، فلاڈلفیا، ہالٹی مور، بوس (انجوس)، ٹورنٹو، واشنگٹن (پوسٹن)، انڈیانا پولس، سالٹ لیک سٹی، سان فرانسسکو، مین ہاٹن (ہوٹل پال)، ڈیٹروٹ وغیرہ کا دورہ بھی ہوا اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں تقریریں ہوئیں۔

۱۹۹۳ء میں دوبارہ امریکہ کا سفر ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں ملیشیا کا سفر ہوا اور وہاں کے مختلف شہروں اور اطراف و اکناف میں بڑے بڑے جلسوں اور سیمیناروں کو خطاب کیا۔ ۱۹۹۳ء میں تاشقند، سمرقند، خرنک اور بخارا کا سفر ہوا۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور قصبہ ایسا ہوگا، جہاں کا مولانا نے دینی

یکتاے زمن حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ

ودعوتی سرگرمیوں کے لیے بار بار سفر نہ کیا ہوگا۔

✽ مناصب، عہدے اور اعزازات

- ناظم ندوۃ العلما
- رکن تاسیسی رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ
- رکن مجلس اعلیٰ عالمی برائے اسلامی دعوت، قاہرہ
- صدر مؤسس عالمی رابطہ ادب اسلامی
- صدر مجلس علمی، لکھنؤ
- صدر دینی تعلیمی کونسل، اتر پردیش
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر دارالمصنفین اکیڈمی، اعظم گڑھ
- صدر آکسفورڈ سینٹر برائے اسلامک اسٹڈیز
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- رکن رابطہ الجامعات الاسلامیہ، رباط، مراکش
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ عالمیہ، اسلام آباد، پاکستان
- رکن مجمع اللغة العربیہ، دمشق
- رکن مجمع اللغة العربیہ، قاہرہ
- رکن مجمع اللغة العربیہ، اردن
- رکن شاہی اکیڈمی برائے تحقیقات تہذیب اسلامی، ادارہ آل بیت اردن
- کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری برائے لٹرچرس ۱۹۸۱ء
- فیصل ایوارڈ برائے اسلامی خدمت، ۱۹۸۰ء
- ایوارڈ ممتاز اسلامی شخصیت، دہلی



بے لوث خادم ملک و ملت

مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

سابق ناظم عمومی جمعیت علمائے ہند

۱۳۵۰ھ/۱۹۳۲ — ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

کیا کیا حسین صبح، حسین شام آئے گی
لیکن ہماری یاد، بھلائی نہ جائے گی

دوشنبہ: ۱۸ شعبان ۱۴۲۲ھ = ۵ نومبر ۲۰۰۱ء کے اخبارات میں، مشہور عالم دین اور مخلص قائد مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری، سابق ناظم عمومی جمعیت علمائے ہند کے انتقال کی خبر پڑھ کر شدید صدمہ ہوا۔ اُن کا انتقال حرکتِ قلب بند ہو جانے سے، یک شنبہ: ۱۷ شعبان ۱۴۲۲ھ = ۴ نومبر ۲۰۰۱ء کو دہلی میں ہوا، جہاں وہ کم و بیش چالیس سال سے رہ رہے تھے اور یہیں کے باسی بن گئے تھے، وہ عرصہ دراز سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، جس نے اُن کے جسم و جان کو تو نچوڑ لیا تھا؛ لیکن اُن کی ہمت و حوصلے میں اُس سے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ آخری سانس تک نہ صرف سرگرم کار رہے؛ بل کہ ملک و ملت کے مفاد کے لیے، لمحہ لمحہ سوچتے اور سعی و عمل کی راہ پر انتھک دوڑتے بھاگتے رہے۔ ملی و اجتماعی خدمتوں کی چاٹ اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ اپنے شہر غازی پور

(اتر پردیش) کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے مرحلوں میں بھی ملی و اجتماعی سرگرمیوں کے دل دادہ رہے۔ ملت کے اس عظیم سپوت کی رحلت کی خبر سے آج میں دلی تکلیف محسوس کر رہا تھا اور بیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی کے اواخر و آٹھویں دہائی کے اوائل سے جب میں دہلی مدرسہ امینیہ کا طالب علم تھا، اُن کے حوالے سے جو کچھ جانتا تھا، میرے حافظے کی اسکرین پر، ایک ایک کر کے اُبھرنے لگا۔ باوقار شہری کی حیثیت سے اس ملک میں جینے کے لیے ہماری ملت کو آزادی وطن کے بعد سے، جس جاں سوز جدوجہد کی ضرورت پڑی، اُس میں مولانا ہاشمیؒ کا مخلصانہ و مجاہدانہ غیر معمولی حصہ یاد آتا اور دل کو رُلا تا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی زمین پر رہنے کے لیے اپنی خاک کو، اپنی وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دینے اور رہنے کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے، اہل فلسطین کے استثناء کے ساتھ، شاید ہی کسی قوم کو ایسی پیہم جدوجہد اور قربانی دینے کی ضرورت پڑی ہوگی، جیسی ہندی مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں دینی پڑی ہے، جس میں مولانا ہاشمیؒ جیسے اُن گنت مخلص اور بے لوث علما نے جہاد و نضال کی جو تاریخ رقم کی، اُس کی مثال خال خال ہی مل سکے گی۔

عظیم قائدین و علما کے جانشین

اُمت کے ضمیر کو بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے والے عہدِ استعمار و غلامی (جس نے نہ صرف برصغیر، بل کہ سامراج کے ظلم و ستم کے شکار سارے اسلامی و عربی ممالک میں قومِ مسلم کے ضمیر پر دستک دے کر، اُس کو بروقت ہوشیار کر دیا) کے لطن سے پیدا شدہ عظیم ترین نسل ہائے قائدین و زعماء، کے بڑی حد تک جانشین سمجھے جانے والے باقی ماندہ علما و قائدین میں سے ایک مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری، اپنے رنگ و آہنگ میں یکتا اور محنت و جفاکشی کی بہت سی سمتوں میں فی الواقع بے مثال تھے۔ عالمی سامراج نے، جس نے بہ طور خاص مختلف الانواع اہداف کے تحت عالم

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری

اسلام و عالم عرب کے سارے خطوں کو اپنی نوآبادیات بنا لیا تھا، مختلف طریقوں سے سعی پیہم کے ذریعے، وہاں کے باشندوں کو ہر اعتبار سے پس ماندہ و ناخواندہ و در ماندہ اور تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی و فکری سطح پر در یوزہ گر اقوام مغرب بنا چھوڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی؛ کیوں کہ محض عسکری سطح پر ان خطوں کو غلام بنانا مقصود نہ تھا؛ بل کہ فکری، ثقافتی و اقتصادی حملوں کے ذریعے، صدیوں کے لیے انھیں قعر مذلت میں دھکیل دینا تھا؛ لہذا تاریخ کے مختلف ادوار میں عالم اسلام پر حملہ آور سارے دشمنوں سے سب سے زیادہ خطرناک دشمن، مغربی سامراج تھا، جس نے عالم اسلام کو اس طرح تہس نہس کیا کہ اُس کے اثرات اب تک نہ صرف باقی ہیں؛ بل کہ وہ آئندہ بھی نامعلوم زمانوں تک انڈے بچے دیتے رہیں گے، عالم اسلام پر یلغار کرنے والے سارے دشمنوں نے، امت کی ذہنی تطہیر اور دماغی آپریشن کا وہ عمل کیا نہ جانا، جو مغربی سامراج نے کیا اور دنیا کو پہلی بار متعارف کرایا اور امت کی ثقافتی میراث کو متاثر کر کے، اُس کو صدیوں کے لیے گم کردہ راہ اور بے سمت بنا ڈالا؛ لیکن شر سے خیر کو برآمد کرنے والے خدائے قدیر نے، سامراج کی فکری تصادم کی اسی پالیسی سے، امت کی فکری بیداری کا کام لیا اور عہدِ استعمار میں ایسے افسانہ پرداز علماء و قائدین و مفکرین اور ہر سطح کے اولوالعزم مصلحین پیدا ہوئے، جن کی مثال مابعد عہدِ استعمار میں اب تک مفقود ہے۔

مولانا ہاشمی و دیگر علمائے متاخرین با کمال کی طرح، اُن اسلامی و دینی مدرسوں کے ساختہ و پرداختہ تھے، جو بڑی حد تک قدیم درسی نصاب پر کار بند ہیں اور جو اس وسیع تر دیار میں علمائے راسخین اور روح شریعت کے مزاج آشنا صلحائے ربانین کی تخلیق میں اپنی شناخت رکھتے ہیں؛ لیکن انھیں خدائے و بآب کی طرف سے بے پناہ قائدانہ صلاحیتیں و دیعت ہوئی تھیں؛ وہ عقل بیدار اور قلب ہوشیار کے ساتھ ساتھ دور رس، بالغ نظری، حکمت عملی اور صحیح وقت پر صحیح اور مفید تر فیصلہ لینے اور اُس پر کار بند ہو جانے کی ناگزیر عیمانہ صفات کے حامل تھے، جن کے طفیل ہی کوئی کام یاب اور باتوفیق

قائد، سنگ لائخ راہوں پر، دامن الجھائے بغیر، صحیح سمت میں محو سفر ہوتا اور بیاباں کی شب تاریک میں دیگر لوگوں کے لیے قدیل رہبانی ثابت ہوتا ہے اور ایک ایسے ملک میں امت مسلمہ کے لیے روز بروز پیدا شدہ نئی نئی پیچیدگیوں اور مسائل کے حل کے تعلق سے اجتماعی و ملکی خدمتوں کا اہل ہوتا ہے، جہاں کے شہری بالعموم طرح طرح کے مذاہب، خیالات، رجحانات، ثقافتوں، تہذیبوں اور عصبیتوں اور آپسی تصادم کی راہ پر ڈالنے والی نت نئی تحریکیں و تنظیموں کے سحر سامری کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور جہاں کی اکثریت اپنی حقیقی شہری ذمے داریوں اور انسانی قدروں کے تعمیری تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ”مصنوعی مذہبی غیرت“ کے منہیات کی لت میں گرفتار ہوتی رہتی ہے۔

مولانا ہاشمیؒ نے بچپن سے ہی، ہندوستانی مسلمانوں کی خوشیوں اور تکالیف کو بانٹنے کا سلیقہ و طریقہ سیکھنا شروع کر دیا تھا اور اُن کی اجتماعی و سیاسی خدمتوں کے جذبے سے سرشار ہونے لگے تھے، جب وہ مدرسہ دینیہ غازی پور — جو مشرقی یوپی کا تاریخی شناخت کا حامل ممتاز شہر ہے — کے طالب علم تھے، جس نے اپنے ہاں تعلیمی لیاقت اور تربیتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ، سیاسی شعور کے حامل لائق اساتذہ کا ایک جتھا اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ سیاسی شعور اُس وقت کے سامراجی حالات کی وجہ سے اکثر علما و متفقین اور تعلیم یافتہ حضرات میں ضرور پیدا ہو جاتا تھا؛ کیوں کہ حالات کی ستم ظریفی نے بالخصوص مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا تھا؛ اس لیے کہ انگریزی سامراج نے مسلمانوں کے لیے اس ملک کو، جس کو انھوں نے خون جگر سے سنبھالا تھا، اُن کے لیے نہ صرف بے گانہ بنا دیا تھا؛ بل کہ اُن کے عزیزوں کو ذلیل بنا چھوڑا تھا؛ لہذا علما اور مدرسین صرف کتابوں کے پڑھانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بل کہ وہ طلبہ میں غیرت و حمیت، آزادی کا جذبہ اور استعمار کے خلاف شدید نفرت کی روح بھی بیدار کرتے رہتے تھے، جس نے زندگی کے سارے میدانوں میں انھیں پس ماندہ کر دیا تھا۔

مولانا ہاشمی کی قائدانہ شخصیت کے تشکیلی عناصر

مولانا ہاشمیؒ کے بچپن کے ساتھی اور تعلیمی سفر کے اُن کے رفیق مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری، جو اُس وقت مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم ہیں، نے، اپنے ماہ وار رسالے ”تذکیر“ میں مولانا کی وفات پر، پُر مغز مقالہ لکھا ہے، جس میں اُنھوں نے اُن کی زندگی پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے اور اُن عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے، جو اُن کی قائدانہ شخصیت، عالمانہ ذہنیت اور فکری وجود کی تخلیق میں کار فرما رہے تھے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”۱۹۳۰ یا ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ نوجوان سید احمد ہاشمی کو اُن کے بڑے بھائی حافظ سید محمد، مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم مولانا عمر فاروقؒ کے حوالے کر، شہر کلکتہ کی راہ لیتے ہیں اور کچھ دنوں بعد مدرسے کے مہتمم کو خط لکھ کر، اپنے برادرِ خرد کا احوال معلوم کرتے ہیں، تو مہتمم صاحب اُنھیں لکھتے ہیں کہ آپ کا بھائی بہت ہوشیار اور وقت کا انتہائی پابند ہے، وہ سبق سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا، وہ ان شاء اللہ خاندان کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔

”مہتمم صاحب کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی، مولانا ہاشمی نہ صرف اہل خاندان، بل کہ ملت اور ہندی مسلمانوں کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوئے۔“

حسن اتفاق سے اُس وقت شہر ”غازی پور“ بالعموم اور مدرسہ دینیہ بالخصوص منتخب روزگار زُعماء و قائدین کے لیے ضیافت گاہ بنا ہوا تھا، جن کا سامراج کے خلاف جدوجہد اور جنگِ آزادی کے حوالے سے بڑا نام اور بڑا کام تھا، جس کی وجہ سے نوجوان سید احمد ہاشمی کے دل میں قومیت اور آزادی کا جذبہ پیدا ہوا اور مُتَعَدِّد آرزوؤں کو قریب سے دیکھنے

کا موقع ملا، نیز ماضی میں علما نے جو قربانیاں دی تھیں، اُن کی قدر شناسی کی انھیں توفیق ملی اور انھیں یقین ہوا کہ آزادی کا آفتاب بہ جلد طلوع ہونے کو ہے۔

نوجوان سید احمد ہاشمی کا مدرسہ اور اُس کے ذمہ داران، آزادی کی سرگرمیوں میں مسلسل حصہ لے رہے تھے، کبھی کانفرنسوں کا نظام بناتے، کبھی رائے عامہ ہم وار کرتے، کبھی شہر میں وارد ہونے والے قائدین و علما و زعماء کے استقبال کے لیے عوام کی بھیڑ اکٹھی کرتے۔ ان باتوں کی وجہ سے، نوجوان سید احمد ہاشمی اور اُن کے رفیق درس نوجوان عزیز الحسن صدیقی کے دلوں میں اُن جلوسوں اور نعروں میں پر جوش حصہ لینے کی تحریک پیدا ہوتی، جو اُن کے ہندو مسلم معاصرین منظم کرتے، گویا یہ ساری چیزیں خداے عالم الغیب کی طرف مولانا ہاشمی کے لیے ٹریننگ کا ذریعہ تھیں؛ کیوں کہ انھیں آئندہ اس حوالے سے ایک بھرپور، کارگر اور نتیجہ خیز کردار ادا کرنا تھا، جس کی ادا گی میں انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مولانا ہاشمی کا تعلیمی و تربیتی سفر اور قائدانہ بال و پر نکلنے کا آغاز

مولانا ہاشمیؒ غازی پور کے ایک شریف خاندان کے فرزند تھے۔ ۱۹۲۸ء میں شہر میں ایسا بھیانک سیلاب آیا کہ جس کی وجہ سے شہر میں بہت سے مکانات بہ گئے، جن میں محلہ ”خدائی پورہ“ میں واقع اُن کے خاندان والوں کے مکانات بھی تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سید حافظ محمد نے افرادِ خاندان کے ساتھ انھیں کلکتہ آجانے کو کہا، جہاں وہ تجارت کرتے تھے۔ مولانا ہاشمی کے والد سید محمد شفیع، جو علامہ سید سلیمان ندویؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) کے رفیق درس تھے، کیوں کہ دونوں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طالب علم رہ چکے تھے، کا سایہ اُن کے سر سے اٹھا تو وہ بہت کم عمر تھے؛ اس لیے اُن کے بھائی جو درحقیقت اُن کے سرپرست تھے، نے اُن کی تعلیم و تربیت میں خاصی دلچسپی لی۔

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

مولانا ہاشمیؒ نے درجہ پنجم عربی تک مدرسہ دینیہ غازی پور میں تعلیم حاصل کی، پھر کلکتے جا کر انھوں نے مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا اور ”ممتاز المحدثین“ کی سند لے کر وہاں سے فارغ ہوئے، تو اُن کے برادرِ بزرگ نے انھیں دارالعلوم دیوبند جانے کو کہا، یہاں ایک سال رہ کر دورہ حدیث شریف کیا اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء سے بخاری شریف و ترمذی شریف پڑھی، جو اُس وقت دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد ایک عرصے تک دہلی میں رہے اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات دیے، اسی دوران اُن کا رابطہ بڑے اسلامی مصنف اور پختہ کار قائد مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) سے ہوا، جو اُن دنوں جمعیت علمائے ہند کے ناظم عمومی تھے۔ اُن کی صحبت نے اُن کے حوالے سے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ملت کی خدمت، وطن کی محبت اور اُس کے لیے بلا امتیازِ مذہب و ملت کام کرنے کی دھن اُن پر سوار کر دی۔

چوں کہ افرادِ خاندان کی بود و باس کلکتے میں تھی؛ اس لیے وہ پھر کلکتے آ گئے۔ اُن کے برادرِ بزرگ نے جو تاجر تھے، انھیں تجارت یا کسی ایسے کام میں لگنے کا مشورہ دیا، جو اُن کے لیے کشادگیِ رزق کا ذریعہ بن سکے اور وہ عزت و آبرو کی زندگی گزار سکیں؛ لیکن وہ فطرتاً دینی دلی و اجتماعی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے، جو مدرسہ دینیہ غازی پور کی تعلیم و تربیت سے اور بیدار اور دہلی میں مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کی صحبت سے فزوں تر ہو گیا تھا؛ اس لیے ادارہ ”ندائے اسلام“ کلکتے میں وہ مدرس اور ذمے دار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس ادارے کو اسلامی خدمت کے جذبے اور ملی تڑپ کے حامل تاجر حاجی غلام رسولؒ نے قائم کیا تھا، جو (پڑی) کے بڑے تاجر تھے، وہی اس کا سارا صرفہ برداشت کرتے تھے۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت سے اداروں اور اسلامی سرگرمیوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

مولانا ہاشمیؒ نے اس ادارے کے مدرس اور ذمے دار کے دائرے میں اپنے کو محصور نہیں رکھا؛ بل کہ وہ جمعیتِ علما کے پلیٹ فارم سے مختلف سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے؛ کیوں کہ علاقہٴ بنگال کی جمعیت کے وہ فعال کارکن اور ممبر تھے، اسی طرح وہ اشتراکی منبر سے کام کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ اس خطے کے حالات کے حوالے سے کمیونسٹ پارٹی کو ملت کے لیے بھی مناسب سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک ہفتہ وار اردو رسالہ ”اکرمغان“ نکالا، جس کی جگہ پھر دوسرا رسالہ ”کندن“ شائع کرتے رہے۔ سرگرم اجتماعی و ملی کاموں کی وجہ سے انھوں نے بہ جلد ترقی کی اور صوبہٴ بنگال کی جمعیت کے ناظم منتخب ہو گئے۔

سوے اتفاق سے اُن دنوں کلکتہ میں ایک بڑا فرقہ وارانہ فساد ہوا، مولانا ہاشمیؒ نے اُس میں جان کی پروا کیے بغیر شب و روز راحت رسانی کا کام کیا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ملت کے وفائیکش خادم اور مسلمانوں کے رحم دل قائد ہیں، انھوں نے شعلہ زن علاقوں میں جانے سے قطعاً پرہیز نہیں کیا اور حکومت اور حکمرانوں کو بُری طرح جھنجھوڑا اور مسلمانوں کی حالتِ زار اور غیر مسلموں کی جارحیت سے تفصیل سے انھیں اس مؤثر انداز میں آگاہ کیا کہ اس سے اُن کی قائدانہ صلاحیت کا غیروں کو بھی اندازہ ہو گیا۔

پولس والوں سے رابطہ کیا، حکمرانوں کو آگاہی دی، زندہ ضمیر کے سیکولر ہندوؤں کو حقیقتِ حال سے واقف کرایا، مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی اور ہر ممکن طریقے سے اُن کی امداد و اعانت کی راہ پیدا کی، لٹے پٹے لوگوں اور اُجڑے ہوئے انسانوں کی باز آباد کاری کے امکانات پیدا کیے، مستقبل کے تئیں اُن کے اندیشے دور کیے۔ ان حالات نے اُن کی جرأت، ثابت قدمی، اولوالعزمی، ہوشیاری، اخلاص اور جاں سپاری کی اُن کی صفات کو نہ صرف الم نشرح کیا؛ بل کہ انھیں پختہ تر بھی کیا اور آئندہ اقدام و عمل کے لیے انھیں مانجھ دیا۔

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

اس فساد کا سلسلہ کلکتے میں محدود نہیں رہا؛ بل کہ مختلف اطراف ہند میں اس طرح پھیلا کہ مسلمانوں میں مایوسی اور مستقبل کے حوالے سے ناامیدی گھر گھر لگی؛ چنانچہ جمعیتِ علمائے ہند نے دہلی میں ایک عظیم تر قومی کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کیا؛ تاکہ موجودہ نازک حالات پر غور و خوض کے بعد، آئندہ کے لیے ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ مسلمان مزید تباہی سے محفوظ رہیں۔ اس موقع سے جمعیتِ علمائے تجربہ کار، جو اس سال قائد مولانا سید احمد ہاشمی کو بھی دعوت دی کہ وہ دہلی آئیں اور اس کنونشن کی کامیابی کے لیے اپنی حوصلہ مندانہ سرگرمیوں کو بروئے کار لائیں۔ انھوں نے شب و روز ایک کر کے کنونشن کو حسب توقع خوب مفید بنایا اور ان اہداف کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی، جس کے لیے اس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اُس وقت ذمے دارانِ جمعیت کو ان کی صلاحیت پر ایسا بھرپور اعتماد حاصل ہوا کہ انھوں نے یہاں مرکزی جمعیت کی ذمے داریاں ان کے حوالے کرنے کی سوچی۔ سب سے پہلے انھیں روزنامہ الجمعیت کا منیجر متعین کیا، جو سخت مالی بحران کا شکار تھا، مولانا ہاشمیؒ نے اپنی حکمت و دانائی سے اُس کو مالی بحران کے گھنور سے نکالا، تو انھیں جمعیت کا ناظم عمومی بنادیا گیا۔ انھوں نے اپنی بے باکی، جرأتِ مومنانہ، غیر معمولی سادہ زندگی اور بے پناہ خدمتوں کی وجہ سے اس منصب کو چار چاند لگا دیے۔ ۱۹۸۸ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے ۱۹۷۷ء میں دہلی وقف بورڈ کی صدارت بھی کی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۶ء تک ہند کے ایوانِ بالا کے رکن رکیں بھی رہے۔ عموماً ارکانِ پارلیامینٹ اپنے اس محترم عہدے کو لذتِ کوشی، زرکشی اور آسائشِ حیات کی حصولِ یابی کا ذریعہ ہی بنا لیتے ہیں؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ نے اس محترم منبر سے جو بے لوث ملی و قومی خدمتیں انجام دیں، وہ ہمارے قائدین کے لیے ایک مثال ہے اور مولانا ہاشمیؒ اور ان کے درمیان خط امتیاز بھی، اسی کے ساتھ وہ اپنی وفات تک مجلسِ مشاورت کے رکنِ تاسیسی رہے۔ بستی ضلع کے حلقہ انتخاب سے ۱۹۸۵ء میں اور غازی پور کے حلقہ انتخاب سے ۱۹۹۱ء میں

پس مرگ زندہ

انھوں نے ایون زیریں، یعنی لوک سبھا کالکشن بھی لڑا تھا۔

سابق مسلمان وزیر ریل مسٹر ”سی کے جعفر شریف“ جو عرصے تک وزیر ریل رہے تھے، مولانا ہاشمی کے بڑے معتقد اور قدرداں اور اُن کی بے لوثی، جاں فشانی اور ملک و ملت کے لیے قربانی کے بڑے قائل تھے؛ چنانچہ انھوں نے مولانا کو مسافروں کے لیے سہولت رسانی کی کمیٹی (PAC) کا صدر نام زد کیا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے دوران مولانا نے اعلیٰ سطحی پارلیمانی وفد کے ساتھ کئی ملکوں کا دورہ کیا، جن میں روس، سابق چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، سعودی عرب اور کویت وغیرہ ممالک شامل تھے۔

مولانا ہاشمی سے میری شناسائی

۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کے عرصے میں، یہ ناچیز راقم الحروف مدرسہ امینیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) جو بڑے اور ممتاز اسلامی اہل قلم، داعی الی اللہ، محدث و فقیہ اور مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث و صدر مفتی تھے، جمعیتہ علمائے ہند کے اہم ذمہ داروں میں تھے؛ اس لیے گلی قاسم جان کے ”احاطہ کالے صاحب“ میں واقع اُن کے مکان پر اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا، حسن اتفاق کہ گلی قاسم جان میں ہی پر شکوہ اور بڑی سی جمعیتہ بلڈنگ تھی، جس میں جمعیتہ کے اُس وقت کئی دفاتر تھے بالخصوص روزنامہ و ہفت روزہ الجمعیتہ کے آفس، جمعیتہ بکا ڈپو، دفتر ”مباحث فقہیہ“ وغیرہ، اسی بلڈنگ کے مشرقی شمالی گوشے میں مولانا ہاشمی کی رہائش گاہ تھی، جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ اسی میں قیام پذیر رہے۔

ادارہ ”مباحث فقہیہ“ کے چوں کہ حضرت مولانا سید محمد میاں ہی ذمہ دار تھے؛ اس لیے جمعیتہ بلڈنگ میں میری آمد بہ طور خاص بہت ہوتی تھی، حضرت سے

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

ملنے، یا اُن کی طرف سے مجھے سپرد کیے ہوئے کسی کام کو انجام دینے کے لیے۔ میں اکثر دیکھتا کہ مولانا ہاشمیؒ جمعیتِ بلڈنگ کی پہلی منزل سے اتر رہے ہیں اور پیدل ہی گلی قاسم جان کے گلی کوچوں میں چل رہے ہیں اور پرانی دہلی اسٹیشن کی جانب شرق و جنوب میں اسٹیشن سے متصل ”نوارہ“ کے نام سے مشہور جگہ پر پہنچ رہے ہیں، جو جمعیتِ بلڈنگ سے بالیقین ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں سے وہ دہلی ٹرانسپورٹ کا رپوریشن کی کسی بس پر سوار ہو کر نئی دہلی کے آئی ٹی او (I.T.O.) کے علاقے میں پہنچ رہے ہیں، جو دہلی گیٹ کی بالکل سیدھ میں، دہلی گیٹ سے جانب جنوب میں، تقریباً پون کلومیٹر کے فاصلے پر پڑتا ہے؛ کیوں کہ یہاں تاریخی مسجد عبدالنبی میں جمعیتِ کامرکزی دفتر ہے، جو اُس وقت بھی تھا، چوں کہ وہ جمعیت کے ناظم عمومی یا سکریٹری جنرل تھے؛ اس لیے روزانہ اُنھیں یہاں آنا اور یہاں سے جمعیتِ بلڈنگ گلی قاسم جان، جانا ہوتا تھا اور اُن کے جانے آنے کا یہی روڈ اور ذریعہ آمد و رفت سرکاری ٹرانسپورٹ کی بس ہوتی تھی۔

وہ کثرت سے پیدل لمبی مسافت طے کرنے کی وجہ سے بہت تیز گام ہو گئے تھے، ویسے بھی اُن کی فطرت میں چستی، تیز روی اور سرگرمی و جفاکشی داخل تھی۔ اُن کے جسم اور حرکات و سکنات سے چستی اور تیزی اُبلتی محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے چہرے بُشرے سے حوصلہ مندی، پیش قدمی، عمل و اقدام کا جذبہ، توقع اور امید کی کرنیں پھوٹی نظر آتی تھیں۔ اُنھیں ہر دیکھنے والا خواہ اُنھیں جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، محسوس کرتا تھا کہ یہ کوئی چستی اور پھرتی کا مجسمہ انسان ہے، یہ محنت اور سرگرمی کا رسیا معلوم ہوتا ہے، یہ بالیقین احساسِ ذمہ داری سے سرشار ہے؛ اسی لیے جابے عمل کی طرف برق رفتاری سے پہنچنا چاہتا ہے؛ لیکن اسی تیزوری کے دوران اگر کوئی اُنھیں راستے میں روک کے اپنی ذاتی یا اجتماعی ضرورت سے واقف کراتا، تو وہ نہ صرف اپنے کانوں؛ بل کہ اپنے پورے وجود اور دل و دماغ سے اُس کی طرف مُلتفت ہو جاتے، سکون سے اُس کی بات

سننے اور پھر اُسی طرح برق رفتاری سے چل پڑتے۔ گلی قاسم جان کی جمعیت بلڈنگ اور فوارے کے درمیان راستے کے دونوں طرف واقع دکانوں کے شجار و مالکان، کثرت سے اور روزانہ سال ہا سال سے آنے جانے کی وجہ سے کچھ تعارف کے ساتھ اور کچھ بلا تعارف، اُن سے آشنا ہو گئے تھے۔ اس علاقے کے باشندے مسلمان بالخصوص اور دہلی کے باشندے مسلمان بالعموم اور بہت سے غیر مسلم حضرات بھی دل سے یقین کرتے تھے کہ مولانا انتہائی بے لوث، محنت، جفاکش، ملک و ملت کی ہمتن خدمت کرنے والے اور مسلمانوں کی راہ میں بچھائے جانے والے سارے کانٹوں کو ایک ایک کر کے اٹھالینے کے لیے دل و جان سے محو عمل ہیں؛ تاکہ ہندی مسلمان ایک باعزت شہری کی حیثیت سے، اس ملک میں رہ سکیں، جہاں کی اکثریت کی ایک معتد بہ تعداد بد قسمتی سے عصبیت اور فرقہ پرستی کی وجہ سے جلی بھنی جا رہی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سارے لوگ، بالخصوص مسلمان، اُن کے بے حد مداح اور اُن کی تعریف میں اُس وقت رطب اللسان رہتے تھے۔ گلی قاسم جان کے باشندے تو سارے کے سارے انھیں اپنا فردِ خاندان، سر پرست اور ولی الامر گردانتے تھے۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ یہ اپنے بہترین پیش رو کے سچے جانشین ہیں، یعنی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مفتی اعظم علامہ مفتی کفایت اللہ وغیرہ کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ اس عینی اور ادراکی تجربے کی وجہ سے میں بھی مولانا کا اُسی وقت بے حد معتقد ہو گیا تھا؛ لیکن اپنی کم عمری، بے مائیگی اور تعارف کی کسی تقریب کے پیدا نہ ہونے اور پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہونے کی وجہ سے، اُس وقت مولانا سے متعارف ہونے یا ملاقات کرنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا؛ چوں کہ اُن سے ملنے کی کوئی ضرورت بھی پیش نہیں آئی؛ اس لیے بھی حصولِ نیاز سے محروم رہا؛ لیکن مجھے دل ہی دل میں بے حد خوشی محسوس ہوتی رہی کہ اللہ نے مجھے ایک خادمِ ملت، محبِ ملک اور انسان سے سچی ہم دردی رکھنے والے ایک عالم و قائد

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ سے واقف ہونے کا موقع عطا کیا، جو اپنی صلاحیت کے سارے خزانوں کے ساتھ ہندی مسلمانوں اور ہم وطن انسانوں کی خدمت میں شب و روز مصروف عمل رہتا ہے۔

مولانا ہاشمی کے لیے خدمت خلق غذا، دوا اور ہوا کے درجے کی چیز تھی

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ سے فارغ ہونے کے بعد میں مارچ ۱۹۷۲ء میں مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (متوفی ۲۲/۹/۱۴۲۰ھ = ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء) اور بالآخر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بہ حیثیت استاد وابستہ ہو گیا، یہاں میں نے کم و بیش ۱۰ سال تک تدریسی خدمت انجام دی، اس طویل عرصے میں مولانا ہاشمیؒ کو دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا؛ لیکن آنے جانے والوں سے اُن کا تذکرہ سنتا رہا، یا اخبارات و رسائل میں اُن کی سرگرمیوں اور ملت کی خدمت میں فنائیت کی اُن کی روداد پڑھتا رہا اور دور سے انھیں دعائیں دیتا رہا۔ تا آن کہ شوال ۱۴۰۲ھ = اگست ۱۹۸۲ء میں، میں بہ حیثیت مدرس اور رئیس تحریر الداعی دارالعلوم دیوبند آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد، مولانا ہاشمیؒ سے بار بار ملنے، اُن سے تبادلہ خیال کرنے، انھیں قریب سے جاننے کی راہ پیدا ہوئی؛ کیوں کہ ”الداعی“ کی طباعت اور دیگر امور چوں کہ دہلی ہی میں انجام پذیر ہوتے تھے؛ اس لیے بہ کثرت ہر پندرہ دن کے بعد ہی دہلی آنا جانا لگا رہتا تھا، حسن اتفاق کہ اُس وقت جمعیت کے عربی ترجمان پندرہ روزہ ”الکفاح“ (۱) کا دفتر جمعیت بلڈنگ گلی قاسم جان، ہی میں واقع تھا۔ چوں کہ مولانا منزل سے، حضرت الاستاذ کے شاگرد ہونے کے ناطے بے تکلفانہ تعلق تھا؛ اسی لیے سہولت کے لیے اسی جمعیت بلڈنگ میں ”الکفاح“ کے دفتر میں قیام

(۱) جس کے اصل چیف ایڈیٹر تو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ متوفی ۱۳۱۵/۱۹۹۵ء تھے؛ لیکن اس کے تحریری کام عموماً مولانا کے شاگرد رشید مولانا منزل الحق حسینیؒ حال استاد سکندری ہائی اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی انجام دیتے تھے۔

کرتا، جس کے بغل میں متصل ہی مولانا ہاشمیؒ کی رہائش تھی؛ اس لیے مولاناؒ سے پیہم ملتے رہنے کی تقریب، اللہ نے پیدا کردی اور طالب علمی کے زمانے میں اُن سے نیاز کے حصول کی محرومی کا مداوا ہو گیا۔

جمعیتہ بلڈنگ کے اسی مشرقی شمالی گوشے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس کو مولانا ہاشمیؒ بہ طور مہمان خانہ استعمال کرتے تھے، اسی سے متصل دوسرا کمرہ ”الکفاح“ کا دفتر تھا۔ مولاناؒ کے مہمان خانے میں ہمہ وقت مہمانوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا۔ اُن کے ملنے والوں میں ہر طبقے اور ہر نوع کے لوگ ہوتے، حکومت کے ذمے داران و افسران بھی، مختلف سیاسی زمروں کے اہل کار بھی، مسلم و غیر مسلم قائدین و زعماء بھی، مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہان بھی، مدرسوں اور تعلیم گاہوں کے منتظمین و مہتممین بھی، مختلف میدان ہائے کار میں سرگرم عمل علما و دانش وران بھی، معاشرے کے عام ارکان اور شہر کے سربراہ آدرہ لوگ بھی، عصری جامعات کے اساتذہ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی؛ لیکن اُن میں سے اکثر لوگ اُن کے پاس عموماً اسی لیے آتے تھے تاکہ وہ اُن کے لیے کسی مقصد کے حصول کے لیے سرکاری حکام و افسران، یا اُن لوگوں سے سفارش کر دیں، جن کا حکام و افسران سے تعلق ہے، یا کسی وجہ سے وہ اُن کے مُقَرَّب ہیں، یا مولاناؒ سے مختلف الانواع مقاصد کے لیے سفارشی و توثیقی تحریریں لینے آتے، تاکہ وہ بہ وقت ضرورت اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔

بعض مخلص اجتماعی خدمت گزار حضرات اُن سے مختلف مسائل کے حوالے سے مشورہ کرنے بھی آتے؛ تاکہ حقوق و واجبات اور وسائل کی تقسیم کے حوالے سے حکومتی عملہ مسلمانوں کے تعلق سے، جو نا انصافی برتتا ہے، اُس کے ازالے کی راہ ڈھونڈی جاسکے۔

میں ہمیشہ پاتا کہ مولانا ہاشمیؒ ہر ضرورت مند کی ضرورت کے پوری کرنے میں منہمک ہیں، اُن کے چہرے پر کوئی شکن ہوتی، نہ اُن کی بشاشت میں کوئی فرق آتا، نہ وہ جھنجھلاتے، نہ برامانتے، نہ کسی بے وقت آنے والے کی آمد پر، اُس کو جھڑکتے؛ بل کہ

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ
انتہائی خندہ روئی سے ہر ایک کا کام اُس کے منشا کے مطابق کر دیتے، یا اُن لوگوں کو فون
یا خط سے متوجہ کرتے، جو اُن کے کاموں میں اُن کے معاون ہو سکتے تھے۔

اُنھوں نے عام لوگوں سے ملاقات کے لیے بھی اوقات مخصوص کر رکھے تھے، جن
میں لوگ اُن سے ملتے اور اپنی ضرورتیں اُن کے سامنے پیش کرتے، اُنھوں نے اپنے
بعض خردوں کو جو ہندی، انگریزی اور اردو سے اچھی طرح واقف تھے، چند گھنٹوں کے لیے
اس کام کے لیے متعین کر رکھا تھا کہ وہ ضرورت مندوں کے کاغذات لے کر، اُن کی جانچ
پڑتال کر لیا کریں؛ تاکہ سفارشی و توثیقی تحریر لکھے جانے کے وقت مطلوبہ پہلوؤں پر توجہ
دلانے میں کوئی نقص نہ رہ جائے اور کام وقت پر نہ ہو سکے۔

یہ ساری باتیں ایسا لگتا ہے کہ میری آنکھوں میں آج بھی رچی بسی ہوئی ہیں
اور محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی انجام پذیر ہو رہی ہیں۔ یہ روٹنی امور مولاناؒ کی
شناخت اور وجہ امتیاز بن گئے تھے۔ ایسا خدمت گار خلق لوگوں نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ان
کا یہ انداز کار اور اعلیٰ اخلاق ہی اُن کی محبوبیت اور ہر دل عزیز کی کاسبب تھے۔ مولاناؒ
ان کاموں کو عبادت کی طرح پابندی سے انجام دیتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ شاید یہ اُن کی
غذا، دوا، یا ہوا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ پاتا۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریسی و تحریری ذمے داریوں کے اولین سالوں میں مولاناؒ
سے بہت سے امور پر بہ طور خاص تبادلہ خیال کا داعیہ پیدا ہوا اور تبادلہ خیال کا موقع
بھی ملا، خط و کتابت بھی ہوئی۔ مولاناؒ چوں کہ ملت کے تین بڑے مخلص اور ہم
درد تھے؛ اس لیے بہت سے مسائل پر اُنھوں نے جس طرح کھل کے گفتگو کی کسی اور
سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ دارالعلوم کے ۱۹۸۰-۱۹۸۲ء کے قضیہ نامرضیہ
کے حوالے سے بھی اُنھوں نے میرے بہت سے خلیجان کو دور کیا اور بڑے سوز کے
ساتھ متعلقہ مسائل پر اپنی رائے ظاہر کی۔

مولاناؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت مضبوطی کے ساتھ، صاف صاف اور

پس مرگ زندہ

ٹھہراؤ کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، مطلوبہ مقصد اور نقطہ نظر کو بیان کرنے کے لیے الفاظ و تعبیرات کا انتخاب کرتے اور صحیح جملوں اور مفردات میں اپنے زاویہ نظر کو پیش کرتے، عجلت اور روا روی میں گفتگو نہ کرتے۔ ٹھہراؤ، خود اعتمادی، رائے کی پختگی اور سنجیدہ اندازِ تکلم اُن کا مابہ امتیاز تھا۔

مولانا ہاشمی کے ساتھ ایک یادگار اور تاریخی سفر

۱۹-۲۱ جنوری ۱۹۹۲ء (۱۶-۱۸ رجب ۱۴۱۲ھ) کو کویت کی وزارتِ ابلاغ نے ”عراقی حکومت کی جیلوں میں قید کویت کے قیدیوں اور محبوسین کی گلو خلاصی کے لیے عالمی اسلامی کانفرنس“ (الْمُوْتَمَرُ الْإِسْلَامِيُّ الْعَالَمِيُّ لِلْإِفْرَاجِ عَنِ الْأَسْرَى وَالْمُحْتَجَزِينَ الْكُوَيْتِيِّينَ وَغَيْرِهِمْ فِي سُجُونِ النِّظَامِ الْعِرَاقِيِّ) کے عنوان سے ایک بڑی عالمی اسلامی کانفرنس منعقد کی تھی۔ ہندوستان کے دیگر علماء و تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ ساتھ وزارت نے، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نور اللہ مرقدہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء) مولانا سید احمد ہاشمیؒ اور راقم الحروف کو بھی مدعو کیا تھا، کام کی کثرت اور مشاغل کی بھیڑ کی وجہ سے شاید ہم لوگ اس میں شریک نہ ہو پاتے؛ لیکن کویت کے اُس وقت کے سفیر برائے ہندوستان عالی جناب ضرار عبدالرزاق رزوقی اور مشیر کار جناب محترم متعب عثمان ریح نے کویت پر عراقی حملے اور قبضے کے دوران راقم کے بے پناہ لکھنے اور طاقت کے ساتھ کویت کے موقف کی تائید کی وجہ سے، جو مذکورہ دونوں حضرات کے علم میں تھا، اتنا اصرار کیا کہ ہمیں سارے مشاغل کو پس پشت ڈال کر، کویت کا سفر کرنا ہی پڑا۔

اس کانفرنس میں شرکت اور علماء و مفکرین سے ملاقات و تبادلہ خیال کے فوائد کے علاوہ، اس کا بڑا فائدہ راقم کے حوالے سے یہ ہوا کہ دونوں بزرگوں: مولانا کیرانویؒ و مولانا ہاشمیؒ صاحبان کی صحبت اور سفر میں اُن کے اخلاقِ کریمانہ کے فیضان سے بہرہ ور

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

ہونے کا موقع ملا۔ کویت میں ہوٹل ”میریڈیان“ میں ہم لوگوں کے کمرے ایک ہی منزل پر پاس پاس ہی تھے۔ ہم تینوں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، کانفرنس میں شرکت کرنے، دعوتوں و سرکاری و غیر سرکاری ضیافتوں وغیرہ میں جانے اور دیگر دلچسپیوں میں ایک ساتھ رہتے۔ امیر کویت، ولی عہد، وزیرِ ابلان اور دیگر وزرا اور قدآور اشخاص نے بڑی بڑی پر لطف دعوتیں کیں، جن میں ہم تینوں ایک ہی میز پر بیٹھتے۔ آمد و رفت میں ایک ہی کار پر سوار ہوتے اور ایک ساتھ اترتے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، اُس کا اصل مزاج، صحیح افتادِ طبع وغیرہ سفروں میں ہی آشکار ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ تو زندگی کے سارے معاملات کے حوالے سے بے نظیر اور یکتاے معاصرین ہونے میں مشہور و مُسَلَّم تھے ہی اور انھیں پہلے سے بھی یہ ناچیز، اُن کے اپنا استاذ ہونے کی وجہ سے جانتا تھا؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ کو برتنے اور سمجھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ سفر و حضر و قیام کے بہترین ساتھی ثابت ہوئے۔ اُن کی تواضع، سادگی، خاکساری، بہ جلد مانوس ہو جانے اور مانوس کر لینے کی صفت اور حد درجہ اپنائیت کی وجہ سے ایسا لگا کہ ہم کسی اپنے ہم عمر اور بے تکلف ساتھی کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔ انسان کی غیر معمولی بڑائی غالباً یہی ہے کہ اُس کا ہم سفر یہ محسوس کرے کہ وہ کسی بے تکلف فردِ خاندان کے ساتھ ہے، اُس کی طرف سے کسی ترفع اور بڑائی پسندی کا اظہار نہ ہو، اس کو اُس کی جانب سے کسی طرح کی وحشت اور تکلف کا انداز دیکھنے کو نہ ملے، ورنہ ہر لمحہ ایک اذیت ناک عذاب ثابت ہوتا ہے اور سفر کی ساری لذتیں کا فورہ ہو جاتی ہیں۔

مولانا ہاشمیؒ میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شکر کے شدید مریض تھے؛ لیکن وہ زیادہ پرہیز پر عامل نظر نہ آئے، بیٹھائیاں اور پھل فروٹ خوب استعمال کرتے تھے۔ ہم تینوں ہی شکر کے مریض تھے؛ اس لیے مجھے اور حضرت مولانا کیرانویؒ کو بہت ہنسی آتی، جب ہم دونوں کھانے سے فارغ ہو کے سولہویں منزل پہ واقع ڈائننگ ہال میں میز پر بیٹھے بیٹھے

مولانا ہاشمیؒ کے فارغ ہو جانے کا انتظار کرتے؛ تاکہ ایک ساتھ پھل وغیرہ لینے جائیں؛ کیوں کہ وہاں سیلف سروس ہوتی تھی؛ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ مولاناؒ راز کی طرح میز سے تیزی میں کھسک جاتے اور شکر کے مریض کے لیے ضرور سارا یا بے مضرت پھلوں اور میٹھائیوں کا لحاظ کیے بغیر، پوری پلیٹ بھر کے واپس ہوتے ہوئے نظر آتے۔ ہمارے ہسنے پر فرماتے: سفر میں یہ چیزیں مضرت نہیں ہوتیں؛ کیوں کہ مضرت پیدا کرنے والے خدا نے سفر کے لیے اپنے احکام و عبادات میں بھی تبدیلی کر رکھی ہے۔ ایک لطیفہ یہ پیش آتا اور ناشتے اور دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی ہم اس کا مشاہدہ کرتے کہ مولاناؒ جیسے ہی پھلوں اور فواکہ کے لیے اُٹھتے، ضیافت پر مامور برتن اٹھانے والی لڑکی فوراً پلیٹ اور تیچھے، جو ذرا بھی آلودہ ہوتے یا نہ ہوتے اٹھالے جاتی، ہم اُن کے واپس آنے سے پہلے بعض دفعہ پھل وغیرہ لینے کے لیے جاتے، تو وہ واپسی میں فرماتے تم کیوں چلے جاتے ہو، یہ لڑکیاں ہماری پلیٹ اور تیچھے اٹھالی جاتی ہیں اور میں پریشان ہوتا ہوں، میں کہتا: حضرت! آپ دوسری صاف پلیٹیں اور تیچھے منگووالیا کریں۔ فرماتے اس میں دیر ہو جاتی ہے اور وہ گندے کب ہوتے ہیں کہ یہ لے بھاگتی ہیں؟ میں عرض کرتا کہ یہ اُن کے آداب میزبانی میں داخل ہوگا؛ اس لیے اس پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ دیکھیے ہم دوسری جا کے لے آتے ہیں یا انھیں سے منگوائے لیتے ہیں، تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

ایک روز ہوٹل کے استقبالیہ والوں نے اطلاع دی کہ سفیر ہند برائے کویت آپ لوگوں سے ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں، آپ لوگ وقت بتادیں، تو وہ خود ملنے آئیں گے۔ ہم لوگوں نے مشورے سے طے کیا کہ از خود سفارت خانہ ہولیں، اس میں وقت کم خرچ ہوگا، اگر سفیر صاحب خود آئیں گے، تو انتظار اور دیگر ترتیبات میں وقت زیادہ صرف ہوگا اور کانفرنس کے پروگراموں کے پیہم ہونے کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں۔ بہ ہر کیف ایک روز عصر کے بعد ہندوستانی سفارت خانے جانا

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

ہوا۔ سفیر صاحب جو پنجابی ہندو تھے بہت کھل کے ملے، بہت اچھی ششہ و شگفتہ اردو میں بات کر رہے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم ایک روز جس دن آپ پسند کریں، آپ تینوں حضرات کی دعوت کرنا چاہتے ہیں، ہم لوگوں نے اُس وقت تو یہی کہا کہ ہم ایک آدھ روز میں ہی بتا دیں گے؛ لیکن ہمیں وقت میں بالکل گنجائش نظر نہیں آئی؛ اس لیے سفیر صاحب کی خواہش پوری نہ کر سکے۔ مولانا ہاشمیؒ جو کٹر نیشنلسٹ اور وطن پرست تھے، اُنھیں اس کا بہت صدمہ رہا کہ وہ سفیر صاحب سے کیا گیا وعدہ وفا کر سکے نہ ہم لوگوں سے کروا سکے۔ کویت میں چند روزہ قیام کے دوران بار بار کہتے رہے کہ بھیجی یہ اچھا نہ ہوا کہ ہم لوگ سفیر صاحب کی دعوت کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔

ہمارے کمروں کے چند کمروں بعد پاکستانی وفد کا قیام تھا، جب اُنھیں معلوم ہوا کہ ہم دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم کا نگرہی نقطہ نظر کے لوگ ہیں، تو وفد کے سربراہ نے ہمیں مدعو کیا کہ ایک روز ہم مل بیٹھیں اور غیر رسمی باتیں اور ملاقاتیں کر لیں۔ ہم دونوں استاذ و شاگرد: حضرت مولانا کیرانویؒ وراقم الحروف تو رضامند ہو گئے کہ جب ہم لوگ پاس پاس ہی رہتے ہیں تو بیٹھ کے تبادلہ خیال کرنے میں کیا حرج ہے؟ جب کہ یہ بھی مسلمان ہی ہیں؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ نے یہ کہہ کے ٹال دیا کہ اس میں سیاسی زمرے کے لوگ بھی ہیں، پتہ نہیں وہ کیا کہہ بیٹھیں، یہ لوگ چوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے تئیں کبھی مخلص نہیں رہے؛ اس لیے ان سے ملنا اور ان کی باتیں سننا کچھ بھی سودمند نہیں۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے مولانا ہاشمیؒ سے بار بار کہا کہ تبادلہ خیال میں کیا نقصان ہے، ہو سکتا ہے اس سے ملت کے مفادِ عامہ کی کوئی سبیل نکل آئے؛ لیکن مولانا چوں کہ واقعی کٹر نیشنلسٹ اور وطن پرست تھے؛ اس لیے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُس وقت میں سوچنے لگا کہ ہمارے ہندو برادران بھی اتنے ہی وطن پرست ہوتے، تو آج ہندوستان میں ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا اور وطن کی سالمیت کے لیے جو خطرہ درپیش ہے، وہ ہرگز درپیش نہ ہوتا؛ لیکن شاید بڑے سے بڑا سیکولر ہندو لیڈر بھی اتنا سیکولر

نہیں ہوتا، جتنا مسلمان سیکولر ہوتا ہے۔

اس سے یہ اندازہ ہوا اور یقین بھی ہوا کہ مسلمان جب کسی اصول کو مانتا ہے، تو اُس پر جی جان سے کار بند ہوتا ہے اور کسی حال میں اُس سے چشم پوشی نہیں کرتا اور اُس کے حوالے سے کسی طرح کی ثنویت، دوہرے پن اور نفاق پر عمل پیرا نہیں ہوتا؛ لیکن غیر مسلم حضرات کے حوالے سے شاید ہی یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی اصول پر دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں یکساں طور پر عمل پیرا ہوں گے؛ کیوں کہ نفاق سے براءت اور دوہرے پن سے پاک ہونا، صرف اسلام اور مسلمانوں کا خاصہ ہے۔

مولانا ہاشمی کا سراپا اور سیرت و کردار

مولانا ہاشمی سرخ و سفید، متوسط القامت اور باوقار شخصیت کے حامل تھے، اُن کے خوب صورت چہرے پر گھنیری داڑھی بہت زیب دیتی تھی۔ وہ دیگر جمعیۃ اور کانگریس کے ہم نوا علما و قائدین کی طرح کھادی کے سفید لباس میں رہتے۔ اُن کی آواز اور لہجے میں خود اعتمادی، وضاحت اور طلاقت تھی۔ وہ مجلس اور بزم خطابت اور عام سیاسی اور دینی جلسوں میں بڑی مدلل اور مکمل گفتگو کرتے تھے، مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم اور فسادات کے موقع سے کی گئی اُن کی تقریریں درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ انھیں دلائل و شواہد بہت یاد رہتے تھے اور اُن سے استناد، اُن کے لیے برسرِ جلسہ بھی بہت آسان ہوتا تھا۔ اُن کی شخصیت اور گفتگو دونوں ہی جاذب تھیں۔ اُن سے مل کے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ سیاسی اور مخلوط جلسوں میں انگریزی کے الفاظ عام سامعین کی تفہیم کے لیے بہ کثرت استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنی مجموعی ادا اور رویے سے بھی واقعی ایک اچھے لیڈر، مدبر اور عالم محسوس ہوتے تھے۔ انھیں خدمتِ ملک و ملت کے آداب کی بھرپور واقفیت، اُن کا تجربہ اور انھیں برتنا آتا تھا اور دل کہتا تھا کہ واقعی انھیں اجتماعی خدمت کی انجام دہی کا قرینہ ہے۔ اُن سے ہر ملنے والے کو لگتا تھا کہ وہ

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

قائد اور مدبر ہی مخلوق ہوئے ہیں۔

افسوس ہے کہ عمر کے آخری مرحلوں میں اُن کی قدر نہیں کی گئی اور وہ جس شجر سے ہوش کی زندگی میں ہمیشہ وابستہ رہے، اُس سے یہ وجوہ وابستہ نہ رہ سکے اور بالآخر ایک دوسری جمعیت ”علیٰ جمعیتہ علما“ کے نام سے استوار کی گئی، جن کا انھیں ناظم عمومی منتخب کیا گیا؛ لیکن یہ زیادہ کچھ بال و پر نہیں نکال سکی۔ مولانا آہستہ آہستہ سمٹ سے گئے، شکر کے موذی مرض نے انھیں ویسے بھی نڈھال بنا دیا تھا۔ دولت و ثروت، وہ افتادِ شرافت و دیانت کی وجہ سے بٹور نہ سکے تھے؛ اس لیے علاج و معالجہ اور زندگی کی سہولتیں بھی، کچھ زیادہ میسر نہ تھیں، سادہ سی زندگی گزار کر، امراض کے اعذار کے ساتھ خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولانا ہاشمیؒ کے سلسلے میں ایک مؤرخ کو یہ ریکارڈ کرنا ہوگا کہ اپنے طویل سفرِ جدوجہد، قیادتی میدان میں سال ہا سال گزارنے کے بعد اور اعلیٰ سطح کے رُعماء و حکام سے مضبوط رشتوں کے باوجود، اپنی ذات، اپنی فیملی اور اپنے لوگوں کے لیے انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ انھوں نے آخری لمحے تک انتہائی سادہ اور وسائلِ عیشِ فراواں سے خالی زندگی گزاری، جب کہ ان سے کم تر درجے کے قائدین و خدمت گزاری کا دم بھرنے والے لوگوں نے دونوں ہاتھوں سے دولت و ثروت لوٹی اور حلال و حرام کی کسی تمیز کو پیشِ نظر نہیں رکھا کہ اس دنیا کی رنگینی اور چند روزہ باغ و بہار سے اکثر لوگ ہی دھوکہ کھا جاتے ہیں، بہت کم سعادت مند ہوتے ہیں، جنھیں سفرِ حیات کے دوران، سفرِ موت اور دارِ آخرت کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کرے، جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں۔

مولانا ہاشمیؒ ایک نظر میں

✽ پیدائش: ۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء (۷ شوال ۱۳۵۰ھ)

پس مرگ زندہ

- ابتدائی تعلیم: مدرسہ دینیہ غازی پور ۱۹۳۰ - ۱۹۳۸ء کے دوران
- متوسط اور اعلیٰ تعلیم: مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۹۳۸ - ۱۹۵۳ء کے عرصے میں
- دورہ حدیث شریف: دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۵ء
- ۱۹۵۷-۱۹۷۳ء کے عرصے میں کلکتے میں قیام رہا، انجمن ندائے اسلام کے مدرسے میں تدریس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور صحافتی میدانوں میں سرگرم عمل رہے۔ ”ارمغان“ اور ”کندن“ نام کے ہفت روزے نکالے اور صوبہ بنگال کی جمعیتہ علما کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا۔
- ۱۹۶۳ء میں کلکتے میں پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات میں، مسلمانوں کے لیے زبردست امدادی کام کیا اور اپنی قیادتی صلاحیت کا سکہ بٹھا دیا۔
- جمعیتہ علما کی طرف سے منعقد کیے جانے والے آل انڈیا اسلامی کنونشن کے لیے ۱۹۶۵ء میں دہلی بلائے گئے، اُس کے لیے بڑی تنگ و دو کی اور کنونشن کو کامیاب بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔
- اس کے بعد روزنامہ ”الجمعیتہ“ کے منیجر، پھر جمعیتہ علما کے ناظم عمومی منتخب ہوئے، اس عہدے پر ۱۹۸۸ء تک فائز رہے۔ اس دوران، ملت کی خدمت کے لیے، ملک کے اطراف و اکناف کا لاتعداد مرتبہ سفر کیا۔
- ۱۹۷۳ء میں راجیہ سبھا (ایوان بالا) کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۹۷۷ء میں دہلی وقف بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔
- ۱۹۸۶ء میں دوبارہ رکن ایوان بالا منتخب ہوئے۔
- ۱۹۸۸ء میں ملی جمعیتہ علما کے ناظم عمومی منتخب ہوئے۔
- ۱۹۹۰ء میں دہلی کی اسلامی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔
- نائب صدر آل انڈیا مجلس مشاورت۔
- ناظم اعلیٰ مدرسہ دینیہ غازی پور۔
- صدر انڈین ریلوے کی کمیٹی برائے سہولت رسانی مسافروں۔
- رکن تنظیم ایتناے قدیم دارالعلوم دیوبند۔
- رکن مدرسہ عظمتیہ دارالقرآن کلکتہ۔
- رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔
- رکن کمیٹی برائے بحالی بابر مسجد۔

بے لوث خادم ملک و ملت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

- رکن مجلس منظمہ مدرسہ دینیہ غازی پور۔
- دو مرتبہ حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔
- سعودی عرب، کویت، روس، چیکو اسلواکیا اور یوگوسلاویا وغیرہ کا دورہ کیا۔
- تصوف و احسان میں حضرت مولانا صدیق احمد باندوی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء) سے ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء میں بیعت ہوئے۔
- یک شنبہ: ۱۷ شعبان ۱۴۲۲ھ مطابق ۴ نومبر ۲۰۰۱ء کو وفات واقع ہوئی۔
- مسجد فتح پوری دہلی میں نماز جنازہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری کے اُس وقت کے شیخ الحدیث مولانا عبدالغفار (متوفی بہ روز بدھ ۶ صفر ۱۴۲۴ھ مطابق ۹ اپریل ۲۰۰۳ء) نے پڑھائی۔
- اُسی روز ۱۷-۱۸ شعبان کی درمیانی شب میں دہلی دروازہ کے قبرستان میں غازی عبدالرشید کی قبر کے قریب تدفین عمل میں آئی، جنہوں نے شاتم رسول ﷺ ”شردھانند“ کو قتل کیا تھا۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداغ“ عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۲، بابت ماہ رمضان و شوال ۱۴۳۹ھ مطابق ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود نصف شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق نصف اگست ۲۰۰۸ء۔

منفرد عالمِ دین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء — ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ افکنِ عشق
ہے مگر ز لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، راقم نے دو مضمون لکھے تھے، ایک مضمون وفات کے دو تین روز ہی بعد لکھا گیا تھا، جو ”راشٹریہ سہارا“ کے ضمیمہ سمیت مکتبہ اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔
دوسرا مضمون ”الداعی“ کے (الی رحمة اللہ) کے گوشے کے لیے لکھا گیا تھا، جو ”الداعی“ کے شمارہ ۳-۴، جلد ۲۶ میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو راقم نے اردو کا قالب دیا، جو بہت سے روزناموں اور ماہ ناموں میں شائع ہوا۔
یہاں قارئین کے استفادے کے لیے بالترتیب دونوں مضامین درج کیے جا رہے ہیں۔

جمعرات ۴ اپریل ۲۰۰۲ء (۲۰ محرم ۱۴۲۳ھ) مغرب کی نماز کے ذرا دیر بعد، میں سہارن پور سے واپس آ کر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا کہ دیوبند کے ایک صاحب نے فون پر کہا کہ ابھی ابھی دہلی سے فون پر مجھے بتایا گیا ہے کہ میں آپ کو یہ خبر پہنچا دوں کہ حضرت قاضی صاحب ابھی سات بج کر پانچ منٹ پر فوت ہو گئے۔ یہ خبر سننے ہی دل دھک سے ہو گیا اور ایسا لگا کہ ملت کے چراغ کے تیل کا آخری قطرہ چھوڑ لیا گیا ہے اور

اب یہ چراغِ خدا نہ خواستہ مفلس ہی کا چراغ بن گیا ہے۔

قاضی صاحبِ عرصہ کئی سال سے، شدید علالت سے گزر رہے تھے۔ ادھر کئی ہفتوں سے اُن کی صحت کی باقی ماندہ پوجی بھی ختم ہو رہی تھی اور اُن کے جسم و جان کا بچا کھچا سرمایہ بھی لمحہ لمحہ، تقدیرِ الہی کے ہاتھوں تیزی سے صرف ہو رہا تھا۔ سارے اہلِ تعلق اُن کی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے اور بالآخر وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا؛ لیکن اُن کی زندگی کے حوالے سے طویل اور شدید علالت سے پیدا شدہ مایوسی کے باوجود، اُن کی وفات کے غم کی شدت، اُسی طرح محسوس ہوئی جیسے کوئی جوان، توانا، زندگی کی اُمنگوں، رعنائیوں اور ولولوں سے سرشار اور اُن گنت کارناموں کو انجام دینے اور مہمات کو سر کرنے کی صلاحیتوں کے تمام ہتھیاروں سے لیس کسی مخلص اور جاں باز و منفرد قائدِ اچانک، عینِ بلالرائی کے دوران؛ بل کہ محاذِ جنگ پر کام آگیا ہو اور سارے ”سپاہی“ اور ساری قوم پر غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔

ہمہ جہت عالم و دالش و ر

ہماری موجودہ صف میں بڑے عالم، بڑے مفتی، بڑے داعی، محض مُصَنَّف، صرف سحر انگیز خطیب اور صرف قائد و مُفکر کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈ و ہزار ملتے ہیں؛ لیکن جس شخصیت میں یہ ساری صلاحیتیں بھرپور انداز میں، توازن کے ساتھ، کارگر مقدار میں اور مطلوبہ معیار پر موجود ہوں، وہ اس وقت صرف قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی شخصیت تھی۔ افسوس ہے کہ وہ واقعتاً دولتِ مستعجل ثابت ہوئے۔

وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے پر بولتے یا لکھتے، تو اپنی شگفتہ اور مُرَتَّب و مربوط زبان میں سارے گوشوں کو، اس طرح سمیٹ لیتے کہ لوگ عیشِ عیش کرنے لگتے، اُن کے لہجے میں بلا کی شیرینی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہانت و فطانت اور فہم و ادراک کی دولتِ فراواں سے نوازا تھا۔ علومِ شریعت اور فقہ و اجتہاد کے لیے، جس خاص فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے،

کہنا چاہیے کہ اُن کے معاصرین میں، برصغیر ہی نہیں، پورے عالم اسلام میں پاکستان کے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کو چھوڑ کر، اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُن سے گفتگو کرنے والے ہر پڑھے لکھے کو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل اور فقہ و شریعت کا ایک بحر بے کراں اُس سے مخاطب ہے۔ وہ جس سرعت کے ساتھ کسی مسئلے کی تہ تک پہنچ جاتے تھے؛ جس متانت، وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ مخاطب کو اپنی بات سے یا کسی علمی و فکری نقطے سے مطمئن کر دیتے تھے، مسلمانوں کی صف میں، اس طرح کا اب کوئی عالم موجود نہیں رہا۔ اُن کی آنکھوں کی ذہانت، چہرے کی متانت، ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، اُن کے تمام رویہ ہائے حیات کی شرافت، اُن کی علمی بے پناہی، فقہ و قضا میں اجتہاد کے درجے کی اُن کی صلاحیت، قائدانہ لیاقت، مُقلدانہ سوز و گداز، ملت کے لیے تڑپنے پھڑکنے کی اُن کی ادائیں، عالمی سطح پر اُمت کی مظلومیت، ٹھوس اور مؤثر قیادت کے خلا کے حوالے سے احساس کی وجہ سے اُن کے غم و الم کی نہ ختم ہونے والی کیفیت — اور سب سے بڑھ کر علم و مطالعے کے سمندر کی تہوں میں، اُن کی غواصی، اُن کے علمی و فکری سوچ کے کارخانے میں ڈھلنے والے آبِ دارموتی، تہذیب و تمدن کے نئے نئے قافلوں کی چاپ کو اڑائیں وقت میں محسوس کر لینے کی، اُن کی قوتِ ادراک کا امتیاز، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی داخلی و خارجی سازشوں کے تانے بانے کو سرعت کے ساتھ باور کر لینے کی، اُن کی غیر معمولی خوبی، علما کی صف میں عربی، اردو کے علاوہ، انگریزی زبان پر عبور کے تعلق سے اُن کی فوقیت اور اسلامی مسائل کے حوالے سے، جدید و قدیم اور مخالف و موافق دونوں طبقوں کے تمام شکوک و شبہات کو زبان کی حلاوت، فکر کے بانگین، ذہانت کی گود میں پلی ہوئی سوچ اور عالمانہ فراست کی انفرادیت کے ذریعے یکسر زائل کر دینے کی، اُن کی خدا داد لیاقت کو، نہیں معلوم کہ حقیقی قُط الرجال کے دور میں، ملت کب تک روئی رہے گی۔

دو گرامی قدر انتسابوں کا فیضان

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگردِ رشید اور دارالعلوم کے

یگانہ روزگار فاضل تھے۔ اُن دونوں گرامی قدر انتسابوں پر اُن کو جس درجہ فخر تھا، وہ اُن پر جتنا چلتے تھے، وہ جس طرح اُن دونوں سچائیوں کو اپنی زندگی کا مقدّس سرمایہ سمجھتے تھے، ہر موقع سے اُن کا جس لب و لہجے میں اظہار کرتے تھے؛ میں نے اُس کی مثال کسی فاضل دیوبند کے ہاں دیکھی نہ سنی اور نہ پڑھی۔

وہ دارالعلوم آتے، تو اُن کی زبان، اُن کے انداز اور اُن کے ہر سلوک سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مچھلی خشکی سے پانی میں آگئی ہے اور زندگی کی حقیقی لذتوں سے ہم کنار ہوگئی ہے۔

علم کی صنعت پر اُن کو عبور تھا۔ اِس میں اُن کی ذہانت اور محنت سے زیادہ، اُن کی اُس مذکورہ عقیدت و محبت کا اثر صاف طور پر محسوس ہوتا تھا؛ بل کہ اُن کے علمی و فکری جلال و جمال کی تمام گل گاریوں اور نقش نگاریوں میں اُس کا فیضان نمایاں نظر آتا تھا۔

تربیت فکر و آگہی کی لائق رشک دین

دارالعلوم سے فراغت کے بعد، وہ خانقاہِ رحمانی مونگیر میں مُدرس ہوئے۔ یہاں اُن کو عصرِ حاضر کے ایک جسور و غیور، قائدانہ ذہانت کے بے پناہ خزانے کے مالک، رجال شناس و رجال ساز عالم مولانا سید شاہ منّت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ کی علمی و فکری اور ماں باپ سے زیادہ ہم دردانہ و مشفقانہ و مربیانہ گود میں ملنے اور جس کام کے لیے خدا نے، اُن کا انتخاب کیا تھا، اُس کے لیے ڈھلنے کا موقع ملا اور شیخ الاسلام کا یہ شاگرد مولانا رحمانی کی عالمانہ و قائدانہ تربیت کے نتیجے میں واقعتاً پختہ کار و پختہ ذہن عالم بن کر ابھرا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ مولانا سید منّت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) کو اپنی صلیبی اولاد مولانا سید شاہ ولی رحمانیؒ مدظلہ العالی سے زیادہ محبت تھی، یا قصبہ ”جالہ“ ضلع درجنگ کے مولانا عبدالاحد قاسمیؒ (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء-۱۳۳۶ھ/۱۹۴۷ء) (شاگردِ رشید شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) کے صاحب زادے مولانا مجاہد الاسلام سے زیادہ

منفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

پیار تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے جس معصوم دور کی روداد سنار ہا ہوں، اُس دور میں غالباً مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو مولانا مجاہد سے اپنی صلیبی اولاد سے زیادہ محبت اور اُن کو کام کا بنانے اور کام میں لگانے کے لیے زیادہ فکر مندی تھی کہ خداے علام الغیوب نے انھیں اس کام کا مُکلف بنایا تھا کہ وہ ملت کے لیے موجودہ دور کے کھنور میں کشتیِ ملت کے کھینے کی خاطر، علم و فکر اور سمجھ داری سے مسلح کوئی ناخدا تیار کرنے کی کوشش میں جو حصہ بنا سکتے ہیں ضرور بنائیں۔ الغرض انھوں نے اپنی تمناؤں، محبتوں اور شفقتوں کے گھنیرے اور بار آور سائے میں انھیں پروان چڑھا کر، امارتِ شرعیہ بہار واڑیہ (اور اب جھارکھنڈ بھی) کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کر دیا۔ برصغیر کے تمام دیانت دار و حق گوئی کی جرأت رکھنے والے علما گواہ ہیں کہ قاضی مجاہد نے، اپنی ذہانت اور علمی استعداد کی وجہ سے اس منصب کو چار چاند لگا دیے اور علم و قضا و فقہ و فتویٰ و اجتہاد کی دنیا میں، رہتی دنیا تک کے لیے، اپنا نام جلی اور روشن حروف سے کندہ کر دیا۔

فقہیانہ بصیرت و قائدانہ لیاقت کا آمیزہ

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی ممتاز قائدانہ صلاحیت اور قاضی مجاہد الاسلام کی فقہیانہ بصیرت و مجتہدانہ شان سے، جو آمیزہ تیار ہوا تھا، اُس نے ملک و ملت کو کتنا فائدہ پہنچایا؟ اُس کی ہمہ گیری کا اس سرسری تحریر میں جائزہ نہیں لیا جاسکتا، یہ کام کسی سنجیدہ موقع کے لیے کسی بصیرت نصیب اہل قلم کے حوالے کرتا ہوں؛ لیکن صرف اتنا کہنے دیجیے کہ حالات کے موجودہ چوکھٹے میں، قیادت کے اس خوش گوار اور با فیض ”مجنون“ کے دوبارہ تیار ہونے کے دور دور تک آثار نہیں۔

ایک دن وہ آیا کہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، امارتِ شرعیہ کے نقطہٴ خیر یا محدود دائرے سے، ملت کی علمی و دینی و فکری قیادت کے ہند گیر صحرا بے کنار کی وسعتوں پر چھاتے چلے گئے۔ انھوں نے فقہ اکیڈمی کی طرح ڈالی، ہٹی کونسل کا راگ بنایا، فقہ

وفاتوں کے موضوع پر ٹھوس تصنیفی و تحقیقی نقوشِ جاوداں کندہ کیے، علما و فضلا کی ایک بڑی تعداد کو سرگرم کار کیا، فقہ و فتاویٰ کے موضوع سے دل چسپی رکھنے والے علما کو بہ طور خاص نئے نئے مسائل پر سوچنے، اُن کا حل ڈھونڈنے، اُن کے حوالے سے کتاب و سنت اور اصولِ شریعت کے ثوابت سے روشنی حاصل کر کے، نئے دور کی پیچیدگیوں کی راہ کو منظور کرنے کی نہ صرف دعوت دی؛ بل کہ راہ نمائی کی۔ ہاتھ پکڑ کے چلنا سکھایا، اس راہ پر دوڑنے کے لیے، بال و پردیے اور ایک بڑے قافلے کو جو سفر کر دیا۔

ملت کی راہ نمائی کے موضوع پر ہندوستان کے اطراف و اکناف میں، بڑے بڑے مجموعوں؛ خواص کی محفلوں؛ علما کی مجلسوں؛ وکلاء کی بزموں؛ اخبار نویسوں کی کانفرنسوں؛ دانشوروں کی انجمنوں؛ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملے جلے جلسوں؛ فقہی سیمیناروں؛ عالمی اجتماعات، مدارس کے جلسوں اور ملت کے دکھ درد کی دوا کی تلاش کی مشاورتی کونسلوں میں، اُن کی خوب صورت تقریروں، فکر و نظر کے موتیوں کے رولنے کا انداز، سیامعین کو شیریں سخن سے محفوظ کرنے کا نرالا پن، حاضرین پر جادو کرنے کی طرح، تبسم آمیز کلام، ذہانت ریز سوز و گداز اور ہر مخاطب کو اپنی محبت کے منفرد رویے سے، اسیر کر لینے کی اُن کی روش، لوگوں کو زندگی بھر یاد رہے گی۔

ہمیشہ جینے کے لیے کون آیا ہے؟ لیکن جس جانے والے کو زندگی مستعار کو جینے والے، جیتے جی بھی نہ بھولیں، اُس کا جینا اور مرنا دونوں قابلِ رشک ہیں اور اتنی ساری خلقِ خدا کی گواہی، خالق کے یہاں لائقِ اعتبار ہے؛ اس لیے کہ مخلوق، خدا کا کنبہ ہے۔ حق مغفرت کرے کہ وہ بہت سی خوبیوں کے اعتبار سے عالم میں فرد تھے۔ (۱)



(۱) یہ مضمون قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے صرف دو تین روز بعد روزنامہ ”راشر یہ سہارا“ کے صفت روزہ ضمیمے کے خاص نمبر میں جو مرحوم قاضی صاحب پر مخصوص تھا، شائع ہوا۔ یہ بڑی غلٹ میں خدوی مولانا اسرار الحق قاسمی بانی و صدر ملی تعلیمی فاؤنڈیشن و حال رکن ایوانِ زیریں لوک سبھا کی فرمائش اور تقاضے پر لکھا گیا تھا۔ امینی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی.. ایک عظیم فقیہ

ہے جنوں، اہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے، گریباں سے جدا میرے بعد

مولانا کے تعلق سے راقم کی معصومانہ یادیں

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو سب سے پہلے میں نے اپنی ۶-۷ سال کی عمر میں اپنے گاؤں راے پور ضلع مظفر پور (حال سیٹامڑھی) بہار میں دیکھا۔ دن اور تاریخ تو یاد نہیں؛ لیکن چودھویں صدی ہجری کی، آٹھویں دہائی کے، کسی سال کی، کسی تاریخ کو وہ اپنے قصبہ ”جالہ“ ضلع در بھنگہ، بہار سے (جو ہمارے گاؤں سے مشرق میں ۸-۹ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے) ہمارے گاؤں میں، اپنے دوست مولانا محمد اویس القاسمیؒ راے پوری متوفی بہ روز جمعہ ۱۴۱۹ھ/۲۵/۹/۱۹۹۸ء کی دارالعلوم سے فراغت کے جلسہ رجشن کے اصل مُقرّر اور مُعرّز مہمان کی حیثیت تشریف لائے تھے۔ جشن کی یہ تقریب ہمارے خاندان کے ایک عالی مقام عالم اور بزرگ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے صاحب زادوں کی کھلیان کے لان میں سر شام منائی گئی تھی۔ اُس وقت کی اُن کی کوئی شبیہ میرے خانہ خیال میں موجود نہیں، اتنا یاد ہے کہ پورے گاؤں میں ہر ایک کی زبان پر عرصے تک اس کا چرچا رہا کہ بلا داڑھی والے ایک نوجوان مولانا صاحب نے اتنی خوب صورت، پیاری اور جادو انگیز تقریر کی کہ اس گاؤں والوں نے تو کیا پورے علاقے والوں نے ایسی تقریر ماضی میں شاید ہی کبھی سنی ہوگی۔

اس پُر مسرت واقعے کے بعد دو تین سال کے دوران میرے عمر و شعور کا قافلہ،

خاصی منزل طے کر چکا تھا، میں اپنے گاؤں کے دیرینہ مکتب کے، نیک سیرت و بابرکت
 مُلّا ابراہیم عرف مولوی ٹھکن کے پاس قرآن پاک ناظرہ اور ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم
 کے بعد ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ/
 ۱۸۹۹ء کے خطہ مشرق یعنی دیار بہار کے منفرد خلیفہ حاجی شیخ منور علی نستوی در بھنگوی متوفی
 ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کے قائم کردہ مدرسہ امدادیہ در بھنگہ (تاسیس ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) میں مذکورہ
 مولانا محمد اولیس القاسمی رائے پوری کی وساطت سے داخل ہو چکا تھا۔ گاؤں رائے پور اور
 مدرسہ امدادیہ در بھنگہ دونوں جگہ جامعہ خانقاہ رحمانی مونگیر (احیاء نو ۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ)
 کے شیریں زبان و تازہ علم و قادر الکلام مدرس اور افہام و تفہیم کے امام مولانا مجاہد الاسلام
 قاسمی کا اتنی بار ذکرِ خیر سنا کہ وہ نہ صرف میرے اور میرے ہم قریہ رفقاء درس کے قلب
 و دماغ کا حصہ بن گئے؛ بل کہ وہ ہمارے ایک بزرگ فردِ خاندان کی حیثیت اختیار
 کر گئے۔ مشکل تھا کہ مشرق کے اس وسیع تر خطے کا علم وآگہی کے حوالے سے کوئی تذکرہ
 ہوا اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا تذکرہ نہ آئے۔ مدرسہ امدادیہ چوں کہ امیر شریعت
 حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۱۱ھ/۱۹۹۱ء کی سرپرستی میں تھا؛
 اس لیے اُن کے ممتاز مدرسہ جامعہ خانقاہ رحمانی مونگیر کے نوعمر اور ذہین مدرس مولانا مجاہد
 الاسلام قاسمی کا تذکرہ امیر شریعت کے ہر تذکرے کے ساتھ ناگزیر تھا۔ یہ دونوں ہی
 سال میں دو تین مرتبہ در بھنگے ضرور آتے، نیز خطے میں ہونے والی کسی بھی اسلامی سرگرمی
 کی سرپرستی کے لیے وارد ہوتے، تو یہاں ضرور تشریف لاتے۔ در بھنگہ ویسے بھی مولانا
 مجاہد کا وطنِ ثانی تھا کہ در بھنگہ شہر کے محلّہ ”قلعہ گھاٹ“ کی جامع مسجد کے مغرب میں
 بننے والی ندی کے پچھم جانب متصل واقع گاؤں ”مہدولی“ میں مولانا کا سرال تھا۔
 عجیب اتفاق کہ موت کے بعد یہی ”مہدولی“ گاؤں اُن کی آخری آرام گاہ بھی بنا اور رہتی
 دنیا تک کے لیے، وہ اسی کی خاک کا پیوند بنے رہیں گے اور کل قیامت کے دن وہ اسی کی
 خاک سے اٹھائے جائیں گے۔ رہے نام اللہ کا۔

ہمارے علاقے کے تین بافیض علما

ہمارے بچپن میں ہمارے علاقے کے دارالعلوم دیوبند کے تین فضلا کی صنعتِ علم میں اُن کی غیر معمولی استعداد کا آوازہ بلند تھا۔ نوعمری اور ناسمجھی کے اس دور میں بھی ہم لوگوں نے اُن کی عظمت کی جو دھوم مچی ہوئی دیکھی، جس طرح اُن کا غلغلہ بلند ہوتا ہوا دیکھا، اُس کی وجہ سے ہماری نسل کے تمام لوگوں کی نظروں میں کوئی اور فاضل پہلے اور بعد کا اپنی فی الواقع بھرپور صلاحیتوں یا صلاحیتوں کو باور کرانے کی اپنی ”غیر معمولی صلاحیتوں“ کے باوجود، کسی طرح نہ جم سکا۔ اُن تینوں سے میری مراد مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جالوی در بھنگویؒ، مولانا اولیس القاسمی راسپوریؒ اور مولانا محمد قاسم انگوا مادھوپوریؒ مظفر پوری مدظلہ ہیں۔

دارالعلوم سے مولانا مجاہد الاسلام نے مولانا محمد اولیس القاسمی سے دو سال قبل فراغت حاصل کی۔ وہ جامعہ رحمانی مولگیر کی مسند تدریس پر فائز ہو گئے۔ جب کہ مولانا محمد اولیس نے دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ امدادیہ در بھنگہ سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نے مدرسہ رحمانیہ سوپول ضلع در بھنگہ میں تدریسی ذمے داری سنبھالی۔ اُس زمانے میں مجھ جیسا خردسال بچہ یعنی ذرۂ بے مقدار، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جیسے آفتابِ علم و فضل تک رسائی اور اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکا؛ لیکن مدرسہ امدادیہ کی طالب علمی کے تین سالہ دورانیے میں بار بار اُن کی دید و شنید سے مستفیض ہوتا رہا اور جامعہ رحمانی میں مولانا مجاہد کی تدریس و تفہیم کی جادوگری کا شہرہ ہم بچوں کے کانوں میں بار بار پڑتا اور اُن کی عقیدت و محبت میں اضافہ کرتا رہا۔

مولانا مجاہد اور امارت کے گیسوے برہم
کو سنوارنے کا عمل

مولانا سید منت اللہ رحمانی نہ صرف ایک جلیل القدر عالم و قائد تھے؛ بل کہ رجال

شناس و رجال ساز مفکر و مدبر بھی تھے۔ انھوں نے جلد ہی اندازہ کر لیا کہ یہ نوجوان فاضل اور اُن کے مدرسے کا آفتابِ عالم تاب کی طرح چڑھتا ہوا مدرس، خاص قسم کی غیر معمولی فقہی بصیرت، زرخیز ذہن، قائدانہ لیاقت اور علم و فن کے صدف کا آبِ دار اور بے مثال موتی ہے؛ چنانچہ جب امیر شریعت رابع کی حیثیت سے مولانا منت اللہ رحمانی کا انتخاب عمل میں آیا، تو انھوں نے امارتِ شرعیہ کے قاضی و مفتی کی حیثیت سے مولانا مجاہد کو پھلوا ری شریف پٹنہ بھیج دیا۔ انھوں نے امارت کے گیسوئے برہم کو اپنے رفقاءے کار (جن میں بے لوث و مخلص عالم و انتظامی صلاحیت میں طاق اُس وقت کے ناظم امارتِ شرعیہ حضرت مولانا سید نظام الدین مدظلہ سرفہرست ہیں) کے مخلصانہ اشتراک و تعاون سے اس طرح سنوارا کہ نہ صرف علم و قضا اور فقہ و فتویٰ کے منصب کو چار چاند لگ گئے؛ بل کہ امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ (اور اب جھارکھنڈ بھی) اُن کے نام کا عنوان اور اُن کی زندگی کا حصہ بن گیا اور ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر ممکن نہیں رہا۔ امارت کی جدت کاری اور ترقی کے عمل میں جس طرح انھوں نے اور اُن کے رفقاء نے خونِ پسینہ ایک کیا؛ بل کہ جگر کو خون کیا؛ جاں کا ہی اور کوہ کنی کی جو زندگی بسر کی؛ ذہانت، فراست، بصیرت اور علم و آگہی کے خزانے کو جس طرح لٹایا؛ وسائل کی کمی، حالات کی سنگ دلی اور وقت کی جس بے التفاتی کا، کاروائی امارت کو اُس زمانے میں سامنا رہا، وہ خود ایک مستقل تاریخ ہے اور خدامِ امارت کی عزیمت کا نشانِ امتیاز بھی۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کم و بیش ۳۵ سال تک یہاں قضا و افتا کا جامِ اس طرح لٹھایا کہ ”قاضی“ اُن کے نام کا ہمیشہ کے لیے سابقہ بن گیا اور اب لوگ انھیں ”مولانا مجاہد الاسلام قاسمی“ کی بجائے ”قاضی مجاہد الاسلام قاسمی“ کہنے لگے۔ انھوں نے سیکڑوں معاملات کے اسلامی شریعت کی روشنی اور فقہ و اجتہاد کے اصول کی بنیاد پر نہ صرف فیصلے کیے؛ بل کہ سیکولر اور غیر اسلامی ہندوستان میں امارتِ شرعیہ کے برپا ہونے کی صورت کو اجاگر کیا اور عملی شکل میں مختلف صوبوں اور خطوں میں اُس کے قیام کی بار آور کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے بوریہ نشیں قاضی مجاہد اور اُن کے

اخلاص پیشہ رفقا کی سعی کو قبولیت سے نواز اور پھلوااری شریف کی تنگ گلی کے دو ایک تنگ کمروں سے نکل کر امارتِ شرعیہ کا مرکز پھلوااری شریف کی شاہ راہ عام پر اپنے نئے، کشادہ، خوش منظر اور حوصلہ بخش دفاتروں میں آگیا اور اُس کی خدمات بھی ہندی مسلمانوں کی مُتَوَسِّع ضروریات اور جذبات کا احاطہ کرنے لگیں؛ چنانچہ کئی عدد ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوئے، سجاد ہاسپٹل بنا، اَلْمَعْهَدُ الْعَالِمِيُّ لِلْقَضَاءِ کا قیام عمل میں آیا، دارالعلوم امارتِ شرعیہ کی بنیاد گزاری رو بہ عمل آئی اور ملت کی تمناؤں کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی مختلف شکلیں پیدا کی گئیں، بہار کے مدارس کو ایک نظام کے تحت مربوط کیا گیا، ریلیف کا کام وسیع پیمانے پر استوار کیا گیا، مکاتب کا جال پھیلا یا گیا، اُمت کے نوع بہ نوع دکھ درد کی زوداثر اور اصلی دوائیں ایجاد کرنے کی طرح ڈالی گئی۔ اس طرح امارت کا نام نہ صرف مسلمانوں بل کہ کم از کم بہار کی سطح پر حکومتِ وقت کی نگاہ میں مُعْتَبَر بن گیا، مشکل تھا کہ ملتِ اسلامی کے حوالے سے بہار گورنمنٹ کوئی قدم اٹھائے اور امارتِ شرعیہ کے چشم و ابرو کے اشارے سے صرفِ نظر کر لے۔

تعمیرِ ذات و صفات کے عناصرِ ترکیبی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی صفات سے نوازا تھا جو انھیں اپنے معاصرین و اقران سے بالکل ممتاز کرتی تھیں۔ انھوں نے طالبِ علمی کے زمانے میں تحصیلِ علم میں کما حقہ محنت کی، خداداد فطانت اور حوصلہ مندی نے اُن کا ساتھ دیا، توفیقِ الہی ہم رکاب رہی، اخاذ اور بیدار ذہن نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دینی، دعوتی، فکری و ثقافتی وجود کی سب سے بڑی علامت کی حیثیت رکھنے والے ادارے دارالعلوم دیوبند پہنچے، یہاں انھیں دیگر یگانہ روزگار اساتذہ کے ساتھ، بطلِ حریت اور حقیقی معنی میں عالمِ باعمل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء کے سامنے زانوئے

ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم اُس زمانے تک حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کے آنفاس کی گرمی کے طفیل، اپنے دیرینہ و بابرکت طرزِ کہن پر گام زن تھا۔ دارالعلوم کے اکثر اساتذہ شب بیدار تھے، دربان اور ملازمین میں بھی عبادت و ریاضت کی سرسستی پائی جاتی تھی، خیر و برکت دروہام سے اہلتی تھی، چپے چپے پر ذکرِ الہی کا نقش نمایاں تھا، علوم شریعت کی جامع تلقین کے ساتھ ساتھ، دل کی دنیا کی آبادی؛ بل کہ تابناکی اور عقل و خرد کی پاکیزگی اور دعوتِ الی اللہ کے ذوق و شوق کی دلوں میں آب یاری اور امت کے مسائل اور دکھ درد کے مد و جزر پر ہمہ وقت، ہمہ گیر اور گہری نظر رکھنے کی صلاحیت سازی کا اہتمام پایا جاتا تھا۔ مولانا مجاہد الاسلام حضرت مدنی کے فیضِ تعلیم و تربیت اور دارالعلوم کے اس روح پرور و مرد ساز ماحول کے طفیل، خدا کی توفیق سے اعلیٰ پایے کے عالم بن کر نکلے۔ اُن کے علم و فضل میں خیر و برکت کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں اپنے دیگر عالی مرتبت اساتذہ کے ساتھ ساتھ، شیخ الاسلام اور اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے لاثانی اور لافانی عقیدت و محبت تھی۔ انھیں ان دونوں انتساب ہائے گرامی پر حد درجہ افتخار تھا، وہ جب بھی ان دونوں کا، یاد و نوں میں سے کسی ایک کا تذکرہ کرتے، تو بے طرح مچلتے اور جھومتے اور ایسے وقت میں اُن کے لہجے میں اس قدر شیرینی اور عشق کرشمہ سازی و وارفتگی پائی جاتی کہ سننے والا بھی وجد کرنے لگتا، وہ دارالعلوم سے عشق اور شیخ الاسلام سے تلمذ کو مُقَدَّس ترین سرمایہٴ زندگی سمجھتے تھے۔ وہ دارالعلوم آتے، تو اُن کے ہر رویے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے چھلی، خشکی کی اذیت سے پانی کی راحت میں آگئی ہے اور زندگی کی لذتوں سے دوبارہ ہم کنار ہوگئی ہے۔ اُن کے تمام حرکات و سکنات سے ایسا لگتا کہ ایک عاشق محروم کو، حقیقی وصال کی لذت اندوزیوں کا موقع مل گیا ہے۔ دارالحدیث فوقانی میں اُن کی عرصہ ۱۷-۱۸ سال پہلے (۱) کی ایک تقریر کے یہ جملے، میرے کانوں کو لگتا ہے کہ اب بھی محظوظ کر رہے ہیں:

(۱) یہ عرصہ اس تحریر کے ربیع الاول ۱۳۳۳ھ / مئی ۲۰۰۲ء میں لکھے جانے کے اعتبار سے ہے۔

”دوستو! میں یہاں بیٹھ کر آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں؛ کیوں کہ میرے کانوں میں شیخ الاسلامؒ کی آواز، اس کو نے سے اب بھی شہسپ اور آ رہی ہے، صاف و شفاف آواز، عشقِ رسولؐ کے آبِ زلال سے دھلی ہوئی صاف پانی زبان کی پرسوز آواز: حدیثِ رسولؐ کی تلاوت کی آواز، اُن کا عربی لہجہ، اُن کا مدنی طرزِ ادا، اُن کی عالمانہ شان، اُن کی مجاہدانہ آن بان، اُن کا منور و پاکیزہ چہرہ، یقین پرور اندازِ کلام، دلوں میں گھر کر جانے والا خلوص۔ میں کہاں سے الفاظِ لاؤں اور کس طرح میں الفاظ کو معانی و حقائق کی صحیح صحیح تجسیم کی طاقت بخشوں کہ وہ اُن احساسات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں، جو دارالعلوم میں آنے کے بعد، میرے قلب کی پہنائیوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موج زن ہو جاتے ہیں۔ میں جذبات کے طوفان کو زبان سے کانوں تک منتقل کرنے سے قاصر ہوں۔ یہاں کے چپے چپے پر مہر و وفا کی جو جلوہ گری ہے، عشقِ بے خطر کی دولتِ بے بہا کا جو دریا یہاں رواں ہے، مکتب کی جو واقعی کرامت اور فیضانِ نظر کا جو کرشمہ یہاں ہر آن نظر آتا ہے؛ علم و فضل کی بے پناہی کے پہلو بہ پہلو آدم سازی اور قلب کی صیقل گری کا جو کارخانہ یہاں مصروفِ کار ہے، دینِ وسط اور توازن و اعتدال کے ساتھ ساتھ، تعمیرِ نو کا جو درس یہاں دیا جاتا ہے؛ میں سچی بات یہ ہے کہ — اُس کی تصویر کشی سے عاجز ہوں۔ یہاں آکر طالبِ علمانہ کھلا پن، طفلانہ معصومیت، حوصلہ مندانہ نوعمری، لا پرواہ کم سنی، خود رائی شعارِ نوجوانی، یادوں کی بارات، ماضی کے خوب صورت نقوش، آسائے کی شفقتیں، اُن کی فیاضانہ ساقی گری؛ سبھی باتیں حافظے کے کینوس (Canvas) پر ابھر آتی ہیں۔“

کہا جاسکتا ہے کہ علم کی صنعت پر مولانا مجاہدؒ کو جو عبور تھا، وہ صرف اُن کی محنت و خوئے جستجو، یا ذوقِ طلب و شوقِ سفر ہی کا نتیجہ نہ تھا؛ بل کہ مذکورہ عشق و عقیدت کا بھرپور

فیضان تھا۔ شجر سے وابستہ رہنے کی عادت حسنہ، بہار اور اُن گنت نئے نئے برگ و بار کی ضامن ہوتی ہے۔ وابستگی کا منکر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتا ہے، جس کی کوئی منزل ہوتی ہے، نہ راہ، نہ کارواں۔ مولانا مجاہدؒ کی علمی و فکری فتوحات کی بوقلمونیوں اور گل کاریوں میں مذکورہ فیضان ہر سطح پر نمایاں نظر آتا تھا۔

غیر معمولی ذہانت

اُن کا دوسرا ممتاز وصف یہ تھا کہ وہ غیر معمولی ذہین تھے۔ اُن کی ذہانت، محض کتابی علم اور مطالعہ و معلومات کی اسیر نہ تھی۔ وہ حالات، زمانہ، انسان، زندگی، معاشرے کے بھی نبض شناس تھے اور ہر نازک اور پیچیدہ مرحلے میں ”صحیح ترجیح“ یا ”پسند“ کو اختیار کرنے کے حوالے سے اُنھیں دیر نہیں لگتی تھی۔ ذہانت ہی کے طفیل وہ جو ہر شناسی میں بھی طاق تھے، نیز ہر انسان سے اُس کے پسندیدہ رویے کے مطابق پیش آنے اور اُس کو اپنا بنالینے اور اپنا بنائے رکھنے اور صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا گر جانتے تھے۔ اِس طرح اُنھوں نے اپنے گرد باصلاحیت افراد کو اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ اکٹھا ہوجانے والے مُنتَوَع الاستعداد افراد نہ کبھی اُن کے کارواں سے ٹوٹے، نہ کبھی خود اُن سے روٹھے، نہ اُن کے علم و عمل کے حرم سے بدگماں ہوئے۔ یہ اِس بات کی روشن دلیل ہے کہ علم و عمل کی اُن کی راہ مستقیم تھی، ورنہ زندگی کا تجربہ بتاتا ہے کہ کج مَج کردار کے حامل انسان سے، لوگ بدگماں ہو کر، اُس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور محض علم کا گھنیرا پن اُس پیارے اور راحت بخش سایے کو وجود نہیں دے پاتا، جس میں آنے کا شوق لوگوں کو کھینچتا ہے اور اُس سے فائدہ اٹھانے کی آرزو مختلف الاقسام انسانوں کو اُس سے مربوط رکھتی ہے۔ مولانا مجاہد سے اگر کوئی کبھی بدگماں ہوا ہوگا، تو یقیناً، اُن کی ذات یا صفات کی وجہ سے نہیں؛ بل کہ اِرد گرد کے بعض افراد اور مشیرانِ کار کے غلط سمجھاؤ کو بھی اِس میں دخل رہا ہوگا۔ نیز یہ کہ مولانا مجاہدؒ بہر کیف ایک انسان تھے اور اپنے ماحول اور عصر ہی کی پیداوار تھے۔ انسان

منفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

بہر کیف غلطی کر سکتا ہے؛ اس لیے کسی انسان کو اُس کے مجموعی رویوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے؛ اس لیے کہ صرف مولانا مجاہدؒ اور اُن کی قد کے لوگ یا اُن سے کم تر لوگ ہی انسان نہیں تھے؛ بل کہ ہم سبھی لوگ بھی انسان ہی ہیں اور ہم سبھوں کے اعمال و کردار صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔

ذہانت ہی کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے کتابی علم کو نکھارا، اپنے مطالعے اور معلومات کو صیقل کیا اور اپنی آگہی کا دائرہ اتنا وسیع کر لیا تھا کہ معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ اور جدید و قدیم دونوں حلقوں کے افراد، حتیٰ کہ مسلمان و غیر مسلم حضرات، اُن سے مل کر اور اُن کے افکار و خیالات سن کر یک ساں، طور پر نہ صرف مطمئن ہوتے تھے؛ بل کہ محظوظ بھی ہوتے تھے۔

شان ہائے امتیاز

اُن کو دوسروں سے یہ چیز بھی ممتاز کرتی تھی کہ اُن کا ملنے اور آنے جانے والوں کا استقبال کرنے کا انداز، اُلبیلا تھا۔ وہ اس طرح مسکراتے ہوئے پیار سے ملتے اور اُن کے مُصافحے اور مُعافحے میں ایسی گرم جوشی اور اپنائیت ہوتی کہ بعض دفعہ آدمی ایک ہی ملاقات میں، اُن ہی کا ہو کے رہ جاتا۔ اُن کی شیریں گفتگو، عالمانہ تواضع، قدرتی انکسار، سادہ انداز، تصنع کی آمیزش سے مکمل طور پر مُنرّۃ اچھے، سچے اور کھرے انسان کی ادا؛ ہر ملنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ چند منٹ کے لیے جانیے؛ لیکن اداے دل نوازی، اُن کے پاس سے ہٹنے کی اجازت نہ دیتی، اِلّا یہ کہ آپ خود اُن کی مشغولیت کو دیکھ کر واپسی کی اجازت لے لیں؛ لیکن اجازت لینے پر بھی بسا اوقات آپ کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں رکھ کر پھینچ لیتے اور کہتے بھائی اور بیٹھو، ابھی جی نہیں بھرا، کیا جلدی ہے؟ کتنے دن بعد آئے ہو، جلدی جلدی ملا کرو، تم سے ملنے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے: علمائے مشاہیر میں، اُن کی طرح دل میں سما جانے والا، اسیر

کر لینے والا، اپنوں سے زیادہ اپنا بن جانے اور اپنا بنالینے والا، کسی کو نہیں دیکھا۔ اُن کی خوش اخلاقی اور دل آویزی کے ساتھ ساتھ، ملنے والے کو اُن کی ذہانت، علمی بے پناہی، فکر و فراست کا امتیاز اور امت کی مجبوری اور رنجوری کی عالم گیر حقیقت کے ازالے کے لیے کارگردہ بیروتی کی، اُن کی کوشش پیہم کا استحضار؛ اُن کی محبت کا ہمیشہ کے لیے اسیر کیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کے دل کی وسعت کے سامنے دنیا کے ہر صحرا کی وسعت ہیچ ہے۔ ملنے والے کا دل گواہی دیتا تھا کہ گویا وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ، اُن کے دل میں جگہ پا سکتا ہے اور دیگر تمام ملاقاتیوں کے لیے بھی اُس کی وسعتیں کم نہ ہوں گی۔

شیریں یادوں کے اُجالے

اس سلسلے کے ایک دو واقعات کا تذکرہ بر محل معلوم ہوتا ہے۔ اوائل ربیع الاول ۱۴۰۰ھ/ اواخر جنوری ۱۹۸۰ء کی بات ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میری تدریس کے زمانے میں وہ اچانک وارد ہوئے، اپنے اُسی محبت بھرے لہجے میں دعا و سلام کے بعد فرمایا کہ میں ایک ضرورت سے یہاں لکھنؤ آیا تھا، پھر ندوہ آنا ناگزیر تھا۔ یہ خیال بھی یہاں لے آیا کہ میری عرصے سے ایک تمنا ہے کہ میں تم سے درخواست کروں کہ امارت شریعہ کا اچھا سا تعارف، تم اپنی خوب صورت عربی میں لکھ دو اور جلدی لکھ دو۔ میں کچھ عذر کرنا چاہتا تھا؛ لیکن اُنھوں نے کوئی جملہ ادا کرنے نہ دیا اور فرمایا: میں سمجھتا ہوں، تم مدرس ہو، پڑھانے کے علاوہ دیگر بہت سے لکھنے پڑھنے کے مشاغل ہیں، مولانا علی میاں صاحبؒ (متوفی جمعہ ۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء) کے تحریری کاموں میں بھی حصہ لینا رہتا ہے؛ لیکن تم کو اس کے لیے بہ ہر صورت وقت نکالنا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! وہ فلاں میرے دوست تو فلاں جگہ میں ہی رہتے ہیں، جہاں آپ یقیناً زیادہ آتے جاتے ہیں، اُن سے ربط کرنا بھی، میری بہ

نسبت زیادہ آسان ہوگا، آپ انھیں حکم فرمادیں، شاید کام اچھا ہو اور زیادہ جلدی۔ فرمایا: پھر تم نے بکواس شروع کر دی۔ بھائی میں تم سے ہی یہ کام لینا چاہتا ہوں۔ اُن کی محبت و شفقت کے سامنے میں بے بس ہو گیا اور کوئی عذر نہ کر سکا کہ اُن کے پیار اور اپنائیت کے انداز کے سامنے اظہارِ عذر، گناہ سا معلوم ہوا۔ یکم ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۸۰ء بروز یک شنبہ کو میں مظفر پور سے پٹنہ آمد و رفت کے قدیم راستے یعنی ”پہلیجا گھاٹ“ سے اسٹیمر کے ذریعے، اُن سے کیے ہوئے مذکورہ وعدے کو وفا کرنے کے لیے، زندگی میں پہلی بار پٹنہ اور وہاں سے بذریعہ تانگا، پھلواڑی شریف پہنچا۔ میں وہاں تین دن رکا۔ امارت کا دفتر پھلواڑی شریف قصبے کے بالکل اندر تنگ گلی کے ایک گھر میں واقع تھا۔ مولانا مجاہدؒ نے اتنی محبت دی، اپنائیت، خوش اخلاقی، مہمان داری اور خوردنوازی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ میرے الفاظ اُس کی تصویر کشی سے قاصر ہیں، اکثر اوقات ساتھ ساتھ رہتے، دل لگاتے، چھوٹی سی مسجد میں پنج گانہ نماز میں ساتھ ہوتے، اکثر ساتھ ہی ناشتہ کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے۔ ایک روز میرے ایک ندوی شاگرد یعنی مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری خانقاہ مجیبیہ والے کے بڑے صاحب زادے، جن کا نام غالباً نصر احمد تھا، دعوت دینے آئے کہ والد صاحب نے آج رات کو کھانے پر مدعو کیا ہے اور رات کا قیام خانقاہ مجیبیہ ہی میں تجویز کیا ہے۔ مولانا مجاہدؒ بڑی مشکل سے رضا مند ہوئے، عشا بعد خانقاہ کے لیے اپنی متہمسناہ ادا کے ساتھ، ہاتھ کو ہاتھ میں لے کے، اس طرح رخصت کیا کہ جی چاہا کہ اپنے عزیز شاگرد سے معذرت کر دوں کہ بھئی پھر کبھی دعوت کر لینا، اب کی بار تو مولانا کی صحبت سے محروم نہ کرو؛ لیکن مولانا مجاہدؒ نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کر دی کہ جاتے ہو تو جاؤ؛ لیکن فجر کے بعد فوراً آ جانا، ناشتہ میرے ساتھ کرنا ہے۔

○ شنبہ ۲۳ / رجب ۱۴۰۰ھ = ۳ / جون ۱۹۸۰ء کو میں امارت شرعیہ کے تعارف

والے عربی کتابچے کا مسودہ مکمل شکل میں لے کر، صرف ایک روز کے لیے، اُسی

”پہلیجا گھاٹ“ کے اسٹیمر والے راستے سے ”مہندر وگھاٹ“ پٹنہ اور وہاں سے بہ ذریعہ ٹیمپو پھلواری شریف پہنچا۔ مولانا مجاہد اُسی محبت اور گرم جوشی سے ملے؛ بل کہ عربی میں امارت کے تعارف والے کتابچے کو ”مالِ غنیمت“ سمجھ کر سوا خوشی کا اظہار کیا۔ پھر تین دنوں بعد ہی واپسی کی اجازت دی۔ بہت سی کتابوں اور منصوبوں کو عربی شکل دینے کے لیے راے مشورہ کیا اور امارت کے قضا کے کاموں کی تفصیلات بتائیں۔ اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں تو دل بھر آتا ہے۔

○ سہ شنبہ ۱۷ شعبان ۱۴۰۰ھ = ۱۷ جولائی ۱۹۸۰ء کو میں اپنے وطن مظفر پور سے، لکھنؤ کے لیے روانہ ہوا۔ اُس زمانے میں مظفر پور سے ”سون پور“ تک تو بڑی لائن بن چکی تھی؛ لیکن اُس سے آگے لکھنؤ تک چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کرنے کا کام جاری تھا؛ اس لیے لکھنؤ جانے والے مسافر، اکثر بس یا جیپ وغیرہ کے ذریعے سون پور پہنچ کر، وہاں سے بہ ذریعہ ٹرین سفر شروع کرتے تھے۔ میں مظفر پور سرکاری بس اڈے کے باہر ایک جیپ والے سے سون پور کے لیے بات ہی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کرتے کو کھینچتے ہوئے کہا نور عالم! میں نے جوڑ کے دیکھا تو مولانا مجاہد گواچانک پا کر اتنی خوشی ہوئی جیسے اُس شخص کو ہوتی ہوگی جسے عین مشکل کے وقت کوئی مخلص غم گسار مل جائے۔ فرمایا چلو ساتھ چلتے ہیں، سون پور تک ساتھ رہے گا، میں اسی جیپ سے ”پہلیجا“ چلا جاؤں گا، تم سون پور میں اتر جانا۔ جیپ پر سوار ہونے کے بعد میں نے خبر خیریت دریافت کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمائی کا ابھی چند روز قبل گرامی نامہ ملا تھا، انھوں نے حکم فرمایا تھا کہ ۲۳-۲۶ جون ۱۹۸۰ء کی کسی تاریخ کو میں پٹنہ یا مونگیر حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں؛ لیکن خط تاخیر سے ملا؛ اس لیے میں اس سعادت سے محروم رہا۔ انھوں نے اپنے مکتوب میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ امارت شرعیہ پر تمہارا مقالہ ”خِدْمَةُ دِينِيَّةٍ عَظِيمَةٍ“ مستقل کتابچے کی شکل میں چھپا ہوا عزیز ولی سلمہ (مولانا سید شاہ ولی رحمائی) نے دیا۔ تحریر بہت بلند ہے؛ لیکن طباعت ناقص ہے۔ یہ

سننے ہی مولانا مجاہدؒ نے اپنے بیگ سے کتا بچے کا ایک نسخہ نکال کر مجھے عنایت کیا۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! آپ پھلوری شریف سے کب تشریف لائے؟ فرمایا میں ۱۸ جون کو ”جالہ“ آیا تھا اور اس وقت وہیں سے پھلوری جا رہا ہوں۔ مولانا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دسیوں سال سے ہم آپ سفر کر رہے ہیں؛ مگر کسی سفر میں ساتھ نہیں ہوا، حسن اتفاق کہ آج ساتھ ہو گیا۔ میں کتا بچے کے مطالعے میں لگ گیا اور مولانا انگریزی اور اردو اخبارات پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔

منظر پور سے سات کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ جیپ والے نے یہ منہوس خبر سنائی کہ اُس کی گاڑی کا انجن بیٹھ گیا ہے؛ اس لیے ہم لوگ کوئی دوسری سواری کی سوچیں۔ ہم لوگ بہت متفکر ہوئے کہ کیا کریں۔ اتنے میں ایک ٹرک آیا، جیپ کے دیگر مسافر اُس پر چڑھ گئے۔ مولانا، میں اور اُن کے رفیق سفر وہیں پڑے رہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے کی دکان میں جیسے ہی پہنچے کہ چند سوٹ بوٹ والے نوجوان نمودار ہوئے، مولانا گود دیکھتے ہی اچنبھا ہوئے، واقعہ کا علم ہوا، تو وہ معقول سواری کی تلاش میں لگ گئے، اتنے میں ایک پرائیوٹ بس آئی اور اُن لوگوں نے احترام کے جذبات کے ساتھ، ہمیں اُس پر سوار کر دیا اور ہمارے سارے سامان بھی ہاتھوں ہاتھ اُس پر ڈال دیے۔ بس چل پڑی تو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ کون لوگ تھے؟ مولانا نے فرمایا: بھئی! میں بھی نہیں جانتا؛ لیکن میں نے اُن سے یہ پوچھنا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ مروت کے خلاف سمجھا، وہ اپنے دل میں سوچتے کہ یہ کیسے مولانا ہیں کہ میں انھیں پہنچانتا ہوں اور یہ مجھے نہیں پہچانتے؟ اندازہ یہ ہے کہ یہ لوگ ٹریننگ اسکول کے طلبہ ہیں کیوں کہ اس گاؤں کا نام ”ترکی“ ہے اور یہاں کا یہ اسکول بہت مشہور ہے۔

اس واقعے سے مولانا کی خوش خلقی، شرافت اور خورے انسانیت عیاں ہے۔ اسی ہتھیار سے، انھوں نے ہزاروں دلوں کو فتح کیا اور ہزاروں آنکھوں کو اپنے بعد اشک بار چھوڑ گئے۔ غیر معمولی علم و فراست اور فطانت و ذہانت کے ساتھ ملنساری، خوش اخلاقی

اور خندہ روئی کی اتنی بڑی دولت، کم لوگوں کو ہاتھ آتی ہے؛ لیکن جن لوگوں کو ہاتھ آتی ہے، خلقِ خدا کی بڑی تعداد، اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے بعد، پھر اپنا ہاتھ بھی نہیں چھینتی؛ کہ دلوں کا فاتح، فاتحِ زمانہ ہوا کرتا ہے۔

○ ۱۳۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، دارالعلوم دیوبند آمد کے بعد، مجھے مُعتمدِ مرتبہ امارتِ شریعہ پھلواڑی شریف حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اب امارت کے سارے دفاتر پھلواڑی شریف پٹنہ شاہ راہ عام پر، کشادہ اور شان دار عمارتوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ مولانا سے ہر مرتبہ مل کر نہ صرف جی خوش ہوتا؛ بل کہ اُن کی اپنائیت اور شفقت میں اضافہ محسوس ہوتا رہا۔ ایک آدھ مرتبہ میں بلا وقت بھی اُن کی خدمت میں جا دھمکا۔ ایک مرتبہ مجھے اپنے بعض مسائل کے حل کے لیے، بعض آزمودہ کار حضرات کے مشورے سے، مرحوم سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں انھیں ذاتی اور ناگزیر کام کے لیے زحمت دینے آیا تھا۔ وہ سابقہ تمام ملاقاتوں سے زیادہ خندہ پیشانی سے ملے، اُسی وقت پٹنہ کے سرکاری دفاتر کے بعض شناسا اور متعلق افسران کو انگریزی میں خطوط لکھے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کے ساتھ، مجھے اُسی ادائے دل داری کے ساتھ رخصت کیا اور فرمایا کہ بہ صورتِ دیگر مجھ سے دوبارہ ربط کرنا۔

○ دیوبند کے میرے اب تک کے ۲۰ سالہ دورانیہٴ عمل کے دوران (۱) وہ کئی بار دیوبند تشریف لائے۔ وہ جب بھی تشریف لاتے، فوراً کسی کے ذریعے، جن لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کا اہتمام فرماتے، اُن میں راقم الحروف بھی ہوتا۔ ایک بار مجھے دارالعلوم کے مہمان خانے میں تشریف آوری کے فوراً بعد، بہ جلد حاضر ہونے کا حکم فرمایا۔ میں جیسے ہی حاضر ہوا علیک سلیک کے بعد، مہمان خانے سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے اترے، میں نے سمجھا کہ شاید میری قیام گاہ افریقی منزل قدیم تشریف لے جانا چاہتے ہیں؛ لیکن وہ دارالعلوم کی مسجدِ قدیم والے چوراہے کی طرف مڑے اور اُس

(۱) یہ سطرین ۱۳۲۳ھ = ۲۰۰۲ء میں لکھی جا رہی ہیں۔ اتنی

منفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

کو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے عبور کر گئے اور فوراً حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی (صاحب زادہ گرامی حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کے مکان میں داخل ہو گئے۔ میں نے انھیں جب دیکھا کہ یہ حضرت میرے ساتھ ”ریڈ لائن“ (Redline) پار کر رہے ہیں — کیوں کہ دونوں دارالعلوموں: دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دیوبند، میں جو دوری ہے، اُس کی وجہ سے ایک دارالعلوم کے اساتذہ کا دوسرے دارالعلوم کے اساتذہ سے ملنا جلنا عملاً تقریباً بند ہی ہے (۱) — تو میں نے اپنا ہاتھ جھٹکنا چاہا۔ مولانا نے جھٹ فرمایا:

چوں در دوستی مخلصم یافتی عنانم ز صحبت چراتا فتی؟

اور فرمایا آؤ تو سہی مجھے تم سے ضروری کام ہے۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ کی بیٹھک میں جیسے ہی ہم لوگ داخل ہوئے، وہاں اخبار نویسوں کو دیکھا کہ وہ مولانا مجاہدؒ سے انٹرویو کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد واپس تشریف لائے اور سیدھے حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے ملاقات کے بعد مہمان خانے واپس آئے۔ فرمایا کہ عزیزم! میں نے کویت کی وزارت امور مذہبی و اوقاف کی طرف سے شائع کردہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ کروانے کا پروگرام تشکیل دیا ہے۔ اس سلسلے میں تم سے زیادہ امیدیں وابستہ ہیں، دیگر فضلا کا بھی انتخاب کر لیا ہے؛ لیکن تمہیں سب سے زیادہ زحمت دینی ہے۔ یہ

(۲) اللہ جزائے خیر دے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ اور مرحوم مولانا سید اسعد مدنیؒ کو کہ دونوں نے ذاتی طور پر پہل کر کے واسطہ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ اور آخر جنوری ۲۰۰۵ء سے اس دوری کو ختم کر دیا اور دونوں دارالعلوموں کے تقریباً سارے عجایب دور کر دیے۔ سوار ۱۸/ محرم ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۸/ فروری ۲۰۰۵ء کو مولانا سید اسعد مدنیؒ نے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ کو اپنے گھر پر عصرانے پر مدعو کیا اور ۳/ مارچ ۲۰۰۵ء مطابق ۲۱/ محرم ۱۴۲۶ھ کو عشاء پر مدعو کیا۔ اس کے دو تین ماہ بعد حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ نے مولانا سید اسعد مدنیؒ، اُن کے سارے اہل خاندان، دارالعلوم کے تینوں مہتممین اور دارالعلوم کے سارے درجہ علیا کے اساتذہ کی زبردست اور پر تکلف دعوت، اپنے مکان پر کی۔

کہتے ہوئے انھوں نے ایک جلد کا آدھا حصہ، میرے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ اتنے کا ترجمہ تو بہ جلد ہی کر دو۔ یہ ناچیز دیوبند آمد کے دو ایک سال کے بعد سے ہی مجموعہ امراض سا ہو گیا ہے، کارہائے مفوضہ کی انجام دہی کے بعد، دیگر کوئی کام مشکل سے کر پاتا ہے؛ لیکن محبت افشانی اور پیار پاشی کے اُن کے انداز کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہ کر سکا؛ مگر دو ڈھائی سو صفحات کا ترجمہ بہ مشکل تمام ایک سال میں مکمل ہو سکا، جس کو فقہ اکیڈمی کے مولانا امین عثمانی صاحب ندوی کے سپرد کر کے میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ، اُن سے معذرت کر لی۔

○ وہ کئی مرتبہ از خود اور بعض دفعہ میری درخواست پر، میری قیام گاہ افریقی منزل قدیم نزد چھتہ مسجد دیوبند تشریف لائے۔ ایک بار تو خاص میری عیادت کو آئے، فرمایا سنا ہے کہ تمہیں تلوے میں اکثر زخم رہا کرتا ہے، دیکھیں کہا ہے؟ میں نے زخم کھول کر دکھایا، تو پوچھا کہ تم کہاں علاج کراتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اکثر دیوبند ہی میں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کہ یہ آسان ہے، جب زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو دہلی میں ”آشرم“ کے علاقے میں واقع ”جیون نرسنگ ہوم“ کا قصد کرتا ہوں کہ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی متوفی ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء — جو اُن دنوں الحمد للہ حیات تھے — اکثر اپنا علاج بھی وہیں کراتے ہیں۔ فرمایا: دیکھو یہ کوئی ادب اور زبان کا مسئلہ نہیں ہے کہ تم مولانا کیرانوی کی اس سلسلے میں بھی تقلید کرتے ہو۔ تم ایک آدھ بار یا تو پٹنہ آؤ؛ ورنہ دہلی میں میری موجودگی کے وقت کبھی دہلی آؤ، تمہارا علاج میں کسی اچھی جگہ کروانا چاہتا ہوں۔ میں آج کل کرتا اور سوچتا ہی رہا کہ مولانا کے حکم کے مطابق دہلی میں اُن کے توسط سے، کوئی کارگر علاج کسی موقع سے ضرور کراؤں گا کہ اتنے میں مولانا خود انتہائی بیمار اور لاچار؛ بل کہ رہین فراش اور آخرش بستر مرگ پر دراز ہو گئے۔ وقت، موقع اور حالات کس کا انتظار کرتے ہیں کہ میرا مولانا مجاہد کا کرتے؟!۔

○ یوں تو وہ عرصے سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور اُس کے عوارض روز افزوں تھے؛ لیکن اپریل ۱۹۹۸ء (ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ) میں اس تشخیص کے بعد کہ انھیں کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا ہے، علاج کے لیے، اُن کا مستقل قیام دہلی ہی میں رہا۔ پہلے وہ حضرت نظام الدین ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک مخلص کے مکان میں کئی ماہ رہے، پھر (۱۶۶) ذکر باغ اوکھلا، میں سکونت اختیار کی۔ وہ بار بار اپولو ہسپتال میں داخل ہوتے رہے، یا اُسی ہسپتال کے ڈاکٹر کے مشورے اور نگرانی میں اُن کا پیہم علاج ہوتا رہا۔

دہلی کے اس طویل قیام کے دوران، مُعَدِّد مرتبہ عیادت اور ملاقات کے لیے حاضر ہوا، بیماری کے باوجود تصنیفی و تحقیقی مشاغل اور ملت کے ہمہ جہت مسائل کے حوالے سے، ہمہ وقت متفکر رہنے کی وجہ سے؛ اُن کا وقت انتہائی مصروف رہا کرتا تھا، مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے بعد، اُن کی ذمے داریاں دوچند ہو گئی تھیں؛ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی رفیق کار یا خادم نے اُن سے یہ کہا ہو کہ دیوبند سے نور عالم آیا ہے اور اُنھوں نے اُسی وقت اندر نہ بلا لیا ہو۔ جب بھی ملتا سراپا محبت و شفقت نظر آتے، مصافحہ کرتے وقت دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رہتے اور فرماتے تم ایسے چند مخلصوں سے مل کر زندگی پر اعتماد بہ حال ہو جاتا ہے۔ کبھی فرماتے اتنے دنوں بعد کیوں آئے ہو؟ ادھر آخری چند ہفتوں سے وہ اپنی زندگی سے مایوس سے ہو گئے تھے؛ لیکن خوش اخلاقی اور خندہ روئی کا خزانہ وہ حسب سابق لٹاتے رہے۔

غیر معمولی قادر الکلامی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو، اُن کے مُعاصرین و اُقران علما سے یہ بات بھی ممتاز کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے، اُن کو غیر معمولی قدرتِ گویائی سے نوازا تھا۔ گویائی کے دعوے دار ہماری صف میں بہت سے لوگ نکل آئیں گے، جو بے ہنگم طریقے سے

غیر موزوں، بھونڈا

پس مرگ زندہ

شور مچانے اور بے تکان گھنٹوں سمع خراشی اور گلے کی مشق کی بلا کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ لیکن میری مراد یہ نہیں۔ مولانا مجاہدؒ بھرے مجمع میں تقریر کرتے، یا کسی مجلس میں کوئی گفتگو کرتے، تو متعلقہ موضوع کو ترتیب کے ساتھ، خوش اسلوبی کے ساتھ اور اُس کے تمام ممکنہ گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے، اس طرح مدلل، منظم، باقاعدگی، خود اعتمادی اور ڈھنگ سے پیش کرتے کہ مخاطب نہ صرف متاثر ہوتا؛ بل کہ مرعوب ہو جاتا تھا۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بڑے ماہر تھے، تعبیر کی خوبیوں اور خرابیوں اور طرزِ ادا کے محاسن و معائب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ موضوع خواہ مسلم پرسنل لا کا ہو، اسلامی فقہ کا ہو، ملکی اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتا ہو، تفسیر و حدیث کا موضوع ہو، یا عربی زبان و بیان اور اُس کے قواعد کی بات ہو، یا تازہ ترین حالات پر تبادلہٴ خیال ہو، یا ہندی مسلمانوں کو درپیش چیلنج زیرِ غور ہو، یا اخبار نویسوں کو مسلمانوں کے نقطہٴ نظر سے مطمئن کرنا ہو؛ مولانا مجاہدؒ کی شگفتہ (شستہ) برجستہ، نپ تلی، بلیغ، موقع محل کے لیے موزوں، موتیوں کی طرح پروئی ہوئی، حشو و زوائد سے پاک اور حجت و برہان سے مستحکم گفتگو؛ مخاطب کو زبانِ حال اور بعض دفعہ حال اور قال دونوں کی زبانوں سے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ قانونی پہلو والی پیچیدہ اور طویل گفتگو کو حیرت ناک انداز اور آسان زبان میں مختصر آپیش کرنے میں طاق تھے۔ یعنی بہ وقتِ ضرورت کسی بھی موضوع کا خلاصہ، یا اُس کا جو ہر نکال کر مخاطب کے سامنے رکھ دینے کی عجب سی قدرت رکھتے تھے اور اگر کسی موضوع کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے، تو قطرے کو سمندر اور ذرے کو بیاباں بھی بنا دیتے۔ یعنی مقام اور موضوع کا جیسا تقاضا ہوتا، ویسا کرتے۔ پھر عجیب سی بات یہ تھی کہ مخاطبین خواہ علما ہوں، یا مفتیانِ کرام، مفکرینِ اسلام

منفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

ہوں، یادِ ایش ویران قوم، رُعمائے وطن ہوں، یا اخبار نویس، وکلا ہوں، یا ڈاکٹر، انجینئر، یا انگریزی تعلیم یافتہ اور نئے طبقے کے لوگ ہوں، یا قدیم طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، یا سیاست داں ہوں؛ پھر یہ کہ صرف مسلمانوں کا مجمع ہو، یا صرف غیر مسلموں کا، یا دونوں فرقوں کا؛ مولانا مجاہدؒ سمجھوں سے اپنی چشم کشا اور بصیرت افروز گفتگو سے، اپنے خیالات کی سچائی اور نقطہ نظر کی صحت کو منوالینے میں فرد تھے۔

اس سلسلے میں اُن کی ذہانت، علمی جامعیت، شیریں سخنی، موضوع پر قابو، مطالعے کی وسعت، حالاتِ حاضرہ سے آگاہی اور اردو و عربی کے علاوہ انگریزی زبان پر دستِ رس بھی اُن کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے بعد (جو دراصل حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی تحریک و فکر، مولانا مجاہد کی منصوبہ بندی اور ہندی مسلمانوں کے گوہرِ شب چراغ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیادت و سرپرستی میں معرضِ وجود میں آیا) حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا مجاہدؒ کی ملی خدمات کا قافلہ، جب بہار سے پورے ملک کے لیے سرگرم سفر ہوا اور مجاہدین دین کو دونوں غازیانِ کردار و گفتار کے خلوص اور قائدانہ صلاحیت سے واقفیت ہوئی، تو اکثر لوگوں کو کہتے سنا کہ مولانا منت اللہ رحمانی اگر مملّت کی گاڑی کا مضبوط انجن ہیں، تو مولانا مجاہدؒ اس انجن کا پٹرول ہیں۔ یعنی اول الذکر کا دماغ ایک نقشہ بناتا ہے اور ثانی الذکر کا علم و فکر اُس میں رنگ بھرتا ہے اور اپنے علم کی تازہ کاری اور فکر کی بالیدگی اور زبان و بیان کی شیرینی سے، ملی خدمات کے نئے نئے علاقوں کو فتح کرتا ہے۔

مولانا مجاہدؒ کی قادر الکلامی اور ذہانت و فطانت کی پروردہ بلاغتِ لسانی کے حوالے سے، ایک واقعے کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھنؤ میں چار باغ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک مسلم مسافر خانہ بنایا جاتا تھا، اواخر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ / اوائل مئی ۱۹۷۸ء میں اُسی میں آلِ انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلسِ عاملہ کی اہم میٹنگیں منعقد ہوئیں، جن

پس مرگ زندہ

میں بورڈ کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی، اُس وقت کے قاضی شریعت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، اُس وقت امارت شریعہ کے ناظم اور اس وقت امیر شریعت و سکریٹری جنرل بورڈ مولانا سید نظام الدین، ندوۃ المصطفین دہلی کے بانی و سرپرست اور ممتاز اسلامی قائد مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۳ء، مدرسہ امینیہ دہلی کے سابق استاذ مفتی ضیاء الحق دہلوی، امیر جماعت اسلامی مولانا یوسف، سابق امیر جماعت مولانا ابواللیث ندوی، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ابراہیم سلیمان سیٹھ اور اُس کے اہم لیڈر غلام محمود بنات والا، نیز مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی اور عالم و داعی اہل اللہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی متوفی ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء، لکھنؤ کے فرنگی محلی عالم مولانا ہاشم میاں، ندوہ کے شیخ النیسر مولانا محمد برہان الدین سنبھلی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے شرکت کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں اعترافِ حق کی غیر معمولی توفیق سے خدائے بخشنده نے نوازا تھا اور جو خود بے نظیر اور عالم میں انتخابِ عالم و مفکر وادیب و خطیب تھے) جب بھی مذکورہ میٹنگ کی کسی نشست میں شرکت کے بعد، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں تشریف لاتے، جہاں اُن کا لکھنؤ آمد کے وقت قیام رہا کرتا تھا، تو وہ اُس میں ہونے والی گفتگو اور مسائل پر ہونے والے تبادلہٴ خیال سے زیادہ، والہانہ انداز میں، بار بار مولانا مجاہد کے حسن بیان، قانونی نزاکتوں اور فقہی نقطوں کی دیدہ ورائہ تشریح کا، منہ بھر بھر کے اور مزے لے لے کر تذکرہ کرتے اور فرماتے کہ مولانا مجاہد ہندی مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں، اللہ نے عجیب سی قدرتِ گفتار سے نوازا ہے، جس بات کو دیگر علما گھنٹوں میں بیان نہیں کر سکتے، مولانا مجاہد نے منٹوں میں اس طرح بیان کر دیا کہ لوگ واہ وا کرنے لگے۔ ضرورت ہے کہ انھیں آگے بڑھایا جائے اور ملک و ملت کے مسائل کے حل کے لیے، اُن کے تازہ و بھرپور علم، قادر الکلامی اور حیرت ناک ذہانت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

فقہ وقضا وافتا کے لیے قدرتی طور پر ڈھلا ہوا ذہن

برصغیر کے علما میں وہ اس بات میں بھی ممتاز تھے کہ اُن کا ذہن، علم فقہ اور قضا وافتا کے لیے خدائے علیم نے خاص طور پر ڈھالا تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ عصر حاضر میں، اس صنعت کے خاص عالم کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ اُن کو اس باب میں جو مہارت و بصیرت تھی، اُس میں پاکستان کے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کے بہ جا طور پر استثنا کے ساتھ، اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس دعوے کو شاید ہی کوئی انصاف پسند اور حق گو عالم چیلنج کر سکے۔ اُن کی شہرت جب اندرون ملک سے بیرون ملک پہنچی اور عالم عرب و عالم اسلام کے علما ہی نہیں، وہاں کے قانون دانوں کو اُن کی ہمہ گیر فقہی بصیرت کا علم ہوا، تو سمجھوں نے اُن کا لوہا مانا، چنانچہ عالم عرب کے علاوہ دیگر مغربی اور افریقی ممالک میں اُنھیں فقہی، شرعی اور علمی سیمیناروں میں دعوت دی گئی، وہاں کے محدثہ فقہی و علمی اداروں کے ممبر اور سرپرست منتخب ہوئے، ہر جگہ نہ صرف اُن کی پذیرائی ہوئی، بل کہ فقہ وقضا واجتہاد میں اُن کی انفرادیت کا ماہرین فن اور مفکرین نے کھل کر اعتراف کیا۔ کویت، سعودی عرب اور مصر کے علما و ارباب علم و دانش نے تو بہ طور خاص اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جامعہ ازہر کے موجودہ شیخ سید طوطاوی (۱) اُن سے بہت متاثر تھے۔ علوم شریعت میں اُن کی گہرائی کو خراج عقیدت ہی کی بات تھی کہ اُنھیں اسلامک فقہ، اکیڈمی جدہ، اسلامک فقہ، اکیڈمی مکہ مکرمہ، علمی اکیڈمی شام، پینتہ خیریہ اسلامیہ کویت وغیرہ کا، رکن منتخب کیا گیا اور اندرون ملک تو وہ اسلامی فقہ وقضا کا عنوان؛ بل کہ اُس کی آبرو تھے۔ عالم اسلام کے علما و فقہاء، اُن سے ایک ملاقات کے بعد ہی اُن

(۱) اس مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے پروف ریڈنگ کے دوران آج بہ روز چارشنبہ: ۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۰ مارچ ۲۰۱۰ء کو سعودی عرب میں (جہاں وہ فیصل ابوارڈ لینے کے لیے آئے ہوئے تھے) انتقال ہو گیا، مسجد نبوی میں نماز جنازہ اور مدینہ منورہ کے مشہور و مبارک قبرستان ”جنت البقیع“ میں اُن کی تدفین ہوئی۔

کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ سعودی عرب کے محکمۃ العدل ریاض میں تشریف لے گئے، قاضیوں سے ملاقات ہوئی، فیصلوں کے طریقوں پر تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا مجاہدؒ نے جب وہاں کے قاضیوں کو اس راہ کے اپنے طویل تجربوں اور امارتِ شرعیہ میں اپنے فیصلوں کے انداز پر، عربی میں فاضلانہ گفتگو کی، تو وہ لوگ اُن کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اُس وقت اُن قاضیوں نے طے کیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً مولانا مجاہدؒ کو مدعو کر کے، اُن کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بعد میں اس پر عمل ہوا کہ نہیں۔

مدیرینہ منورہ میں شیخ عطیہ سالم مالکیؒ سے ایک مرتبہ تفصیلی ملاقات ہوئی، وہ مولاناؒ کے علم و تفقہ سے حد درجہ متاثر نظر آئے اور فرمایا کہ اگر میں اس وقت قضا کے منصب پر ہوتا، تو آپ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی، مجھے آپ جیسے عمیق العلم اور ذہین علما کی جستجو رہتی ہے۔

فکر و نظر کی بھرپور وسعت

مولانا مجاہدؒ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ اُن میں فکر و نظر کی بھرپور وسعت پائی جاتی تھی؛ لیکن ساتھ ہی اُن میں مومن کا توازن اور علومِ شریعت میں گہرائی رکھنے والے عالم کی شانِ اعتدال اور ثوابت و مبادی پر جمنے کی خوبی بھی پائی جاتی تھی۔ وسعتِ نظری کی وجہ سے، اُن میں وسیع النظر فی تھی اور وسیع النظر فی اور کشادہ قلبی کی وجہ سے، اُن کے اندر دوسروں کو برداشت کرنے اور کلمہ توحید کی بنیاد پر، امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اتحادِ ملت کی دعوت کو زور و شور سے ہر موقع سے، ہر بزم میں، اور اجلاس عام و جمع خاص میں، پیش کرنے کا نہ صرف داعیہ پیدا ہوا؛ بل کہ اُنھوں نے اس دعوت کو عملی طور پر برپا کرنے کے لیے، اپنی تمام صلاحیتوں اور امکانات کا لیاقت کے ساتھ استعمال کیا۔ اُنھوں نے اپنے قول و عمل سے ہر جگہ یہ ثابت کر دکھایا کہ امت اور ملت کی وحدت اصل ہے اور باقی تمام سرگرمیاں، تحریکیں، تنظیمیں، ادارے، انجمنیں،

جماعتیں اس کی فرع ہیں۔ مسلک اور نقطہ نظر کا اختلاف، امت کے اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے؛ ورنہ ملت کا وجود ہی معرض خطر میں آجائے گا، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جو دستور کے اعتبار سے خواہ سیکولر ہو؛ لیکن اکثریت کی بڑھتی ہوئی جارحیت اور ہندو مذہب کی جارحانہ تعبیر و عمل کی وجہ سے، تمام سرکاری اداروں اور مشینریوں کی سمت سفر میں تیزی سے جو خطرناک تبدیلی رونما ہو رہی ہے، وہ ننگی تلوار بن کر ملت کے سر پر لٹک رہی ہے؛ اس لیے اب اگر تحزب، تعصب، تنگ نظری اور مسلکی اختلافات کو دین بنالینے کی کوشش کی گئی، تو یہ بڑے جرم کی بات ہوگی اور ایسا کرنے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جس کے وہ شدید علالت کے زمانے میں، مفکر اسلام مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد صدر بھی ہو گئے تھے) تو شروع سے ہی، ہندی مسلمانوں کا سب سے زیادہ مضبوط اور وسیع البیاد پلیٹ فارم رہا، جس کو مولانا مجاہدؒ نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی سرپرستی میں، اول دن سے ملت کے اتحاد و اتفاق کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے پرسنل لا بورڈ نے جو کوششیں کیں اور ملت کی ملی و شرعی زندگی سے متعلق مسائل کے سلسلے میں جو اجتماعی فیصلے کیے، اُس کی نظیر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی اور تنظیم کے حوالے سے ہرگز نہیں پیش کی جاسکتی۔

مولانا مجاہد اور ملی کونسل

اتحادِ ملت ہی کے جذبے سے انھوں نے کئی سال قبل آل انڈیا ملی کونسل کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد گزاری کی؛ تاکہ ہندی مسلمانوں کے مسائل کو متحدہ پلیٹ فارم کے ذریعے مؤثر طور پر پیش کیا جاسکے۔ مولاناؒ کے اس اقدام سے نہ صرف مسلمانوں کی صفوں کے سیاسی طالع آزمائوں کو قلبی اذیت ہوئی؛ بل کہ علما کی صف میں

اُن کے بہت سے مخلصوں کو بھی اُن کے اس فیصلے سے آخر وقت تک اختلاف رہا۔ ثانی الذکر لوگوں کا اختلاف سچی نیت پر مبنی تھا؛ کیوں کہ اُن کو بہ جا طور پر اندیشہ تھا، جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آیا، کہ مولانا مجاہد جیسے عالمِ جلیل اور فقیہ وقت کو پرنسپل لا بورڈ اور امارتِ شرعیہ، نیز فقہ اکیڈمی کے بعد کسی اور پلیٹ فارم کی ضرورت نہ تھی کہ کسی درجے میں بھی سیاسی شناخت رکھنے والی تنظیم سے اُن کے انتساب کی وجہ سے، سیاسی قسمت آزمایہ لوگ اُن کو اپنا حریف بنالیں گے اور بلا ضرورت اُن جیسا بلند نگاہ، مخلص اور علومِ فقہ و قضا کا بے بدل عالم، سیاسی اختلافات اور حریفانہ کش مکشوں کا نشانہ بن جائے گا اور ملت کی فقہی راہ نمائی، شرعی گرہ کشائی اور نئے نئے مسائل کے لیے دینی حل کی راہ پر، جس قافلے کو اُنھوں نے سرگرم سفر کیا ہے، اُس کی رفتار سست پڑ جائے گی؛ بل کہ ہوسکتا ہے کہ یہ قافلہ اپنا سفر ہی روک دے۔

اہلِ علم و فکر کے بہت سے اقدامات سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا؛ اس لیے مولانا مجاہد کے اس فیصلے یا دیگر اقدامات سے اختلاف کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے؛ لیکن اُن کے خلوص اور نیک نیتی سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ ملی کونسل نے ملی خدمات کے میدانوں میں اپنی نوعمری، مولانا مجاہد کی ہمہ قسم کی علالت، مخلص اور معتد بہ تعداد میں لائق افراد کا رکی عدم دست یابی اور بعض دیگر رکاوٹوں کے باوجود؛ مُعَوَّد ایسے کام انجام دیے، جو کسی اور تنظیم اور جماعت نے انجام نہیں دیے۔ مثلاً مسلمانوں کی حقیقی بیداری کے جو بہت سارے خاکوں میں رنگ بھرا گیا، انھیں تعلیمی اور عصری ثقافت کی سطح پر خصوصاً ٹیکنیکل اور طبی تعلیم کے میدان میں معقول بلند سطح تک پہنچانے کی جو کوشش کی گئی، اس طرح کے جو تعلیمی ادارے قائم کیے گئے؛ نیز سرکاری مشینری کے ظلم کے شکار مسلمانوں کے لیے، ہر علاقے میں قانونی چارہ جوئی کا جو موثر نظام برپا کیا گیا اور ناڈا جیسے ظالمانہ اور فسطائی قانون کے خلاف جو فعال قدم اٹھایا گیا؛ اسی طرح مسلم سیاست دانوں کو باقاعدہ طور پر جوڑنے کی جو کارروائی کی گئی، ملک کے دانشوروں اور

چوٹی کے زعماء و قائدین سے بلا تفریق مذہب و ملت، جس طرح رابطہ استوار کر کے ٹھوس بنیادوں پر مسلمانوں کے مسائل و مشکلات سے انھیں آگاہ کر کے اور ان مسائل کو انسانی بنیادوں پر حکومتی، سیاسی، ابلاغی اور عوامی سطح پر پیش کرنے کی انھیں جس طرح دعوت دی گئی؛ یہ سب کارنامے ملی کونسل کو دیگر مسلم جماعتوں سے امتیاز کی سند عطا کرنے کے لیے کافی ہیں اور ملی کونسل کے حوالے سے یہ سارے کارنامے مولانا مجاہدؒ کے اور ثانیاً ان کے خلوص کیش رفقا کے نامہ اعمال میں ان شاء اللہ درج ہوں گے۔

فقہ اکیڈمی انڈیا

مولانا مجاہدؒ کا یہ کارنامہ بھی ممتاز اور ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے فقہ اکیڈمی انڈیا کی تاسیس، اُس کے سمیناروں اور فقہی اجتماعات کے ذریعے، نہ صرف یہ کہ ان گنت نئے نئے مسائل کے شرعی حل پیش کیے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر، عمل کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے نقطہ نظر کو عملی جامہ پہنایا، عام کیا اور علما کو اس کا عادی بنایا؛ بل کہ اُس پلیٹ فارم کے ذریعے انھوں نے نو جوان علما و فضلا کو نئے حالات و مسائل پر سوچنے، لکھنے، غور کرنے اور بولنے کے لیے، حوصلہ دیا اور نو جوان علما کی ایک بڑی جماعت کو صحیح وقت پر صحیح سمت میں سرگرم سفر کر دیا اور بہت سے لوگ فقہ و اجتہاد کے متنوع موضوعات پر لکھ کر مصنف و مؤلف بن گئے اور بننے جا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ اُن کا احسان نہ بھی مانیں تو شکر گزار اللہ کے یہاں تو مولانا مجاہدؒ کے سارے احسانات ریکارڈ ہیں۔ فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں جو مقالات پڑھے گئے، وہ بہ جائے خود عظیم فقہی سرمایہ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سارے مقالات و تحقیقات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، کاش اُن کے سچے خلف انھیں عربی زبان میں منتقل کروا سکتے۔

اس کے علاوہ فقہ اکیڈمی ہی کی طرف سے انھوں نے ”بحث و نظر“ کے نام سے جو وقیع علمی و فقہی رسالہ جاری کیا اور جو آخر تک جاری رہا، وہ مستقل کارنامہ ہے، اُس

پس مرگ زندہ

کے ذریعے بہت سے علمی، فقہی، تحقیقی مقالات اہل علم اور ارباب فقہ و فتویٰ کے لیے چشم کشا ثابت ہوئے اور بہت سے لوگوں کے لیے فکر و عمل کی تحریک کا ذریعہ بنے۔

علمی نقوش

قائدانہ، مفکرانہ، فقہیانہ اور سیاسی و سماجی و ملی سطح پر بے پناہ مشاغل اور ادھر سال ہا سال سے شدید قسم کی علالت کے باوجود، مولانا مجاہد نے جو علمی و تالیفی نقوش چھوڑے ہیں، وہ بھی معیار و مقدار دونوں اعتبار سے غیر معمولی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کے لیے نہ صرف باعثِ زندگی؛ بل کہ صدقہٴ جاریہ ثابت ہوں گے۔

اُن کی مشہور تالیف تو ”اسلامی عدالت“ ہے جو واقعی ایک عالم کی علمی بصیرت اور قاضی کی فراست و پختہ فہمی کی آئینہ دار ہے۔ وہ عرصہ پہلے چھپ کر عام ہو چکی ہے۔ عربی میں اُس کا ترجمہ ”نظام القضاء في الإسلام“ کے عنوان سے بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح قضایا فقہیہ معاصرہ، فقہ المشكلات، الذبائح، دراسات فقہیہ، دراسات علمیہ، بحوث فقہیہ اور الوقف کے عنوان سے کئی عدد کتابیں اردو سے عربی میں ترجمہ ہو کر، عالم عربی میں زورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ جلسہ ہائے عام میں کی ہوئی اُن کی بعض تقریریں بھی چھپ چکی ہیں، انہیں پڑھنے والے کو بھی زبان کی لذت، فکر کی ندرت، گفتار کی گل افشانی اور جہاں دیدہ مفکر کا سوز و ساز ایک خوب صورت آمیختہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔

عین بیماری کے زمانے میں جب کہ کہنا چاہیے کہ وہ بسترِ مرگ پر تھے، ”صنوان القضاء“ نام کی عظیم فقہی کتاب کو چار جلدوں میں ایڈیٹ کیا۔ وہ کویت کی وزارتِ اوقاف و امورِ مذہبی کی طرف سے شائع ہو کر، وفات سے قبل اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سرور کا باعث بن چکی ہے۔ مولانا مجاہدؒ نے نہ صرف زمانہٴ صحت میں؛ بل کہ علالت کے پورے عرصے میں جب کہ کئی سال پہلے بیمار دار اور ڈاکٹر، اُن کی زندگی سے

ماپوس ہو چکے تھے، نہ تو ملی مسائل سے صرف نظر کیا اور نہ دادِ تحقیق و تالیف دینے سے باز رہے۔ اُن کا یہ وصف انھیں عظیم علمائے سلف کی صف میں کھڑا کرتا ہے، جنہوں نے آخری لمحے تک قُرطاس و قلم کا ساتھ چھوڑا نہ اُسپ فکر و نظر کی پشت سے نزول کیا اور اَلْمَحْبَرَةَ إِلَى الْمَقْبَرَةِ (یعنی دوات کا تو قبر تک ساتھ رہے گا) کی زندہ جاوید، درس انگیز اور حوصلہ افزا مثل پر عمل کر کے خود ضرب المثل بن گئے۔

جمعرات ۴/۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء (۲۰/محرم ۱۴۲۳ھ) کو عرصے کے بعد میں ایک مختصر اور ناگزیر سفر پر ”راے پور“ اور ”مرزا پور پول“ ضلع سہارن پور، گیا ہوا تھا۔ مغرب کی نماز کے ذرا دیر بعد ہی، جیسے ہی گھر میں قدم رکھا کہ ایک صاحب نے فون پر بتایا کہ دہلی سے ابھی ابھی فون آیا ہے کہ مولانا مجاہدؒ سات بج کر پانچ منٹ پر اللہ کو پیارے ہو گئے، تو ایسا لگا جیسے کوئی مجنوں ہماری اس دنیا کے جنگل کو اداس کر گیا۔ فکر و نظر کے میدان کا مجنوں، ملی خدمتوں کے صحرا کا مجنوں، دین و شریعت کے جنگل کا مجنوں اور اُمت کی ہمہ گیر ترقی کے لیے تڑپنے، نقش بنانے اور اتحاد و اتفاق کی لیلیٰ پر جان چھڑکنے والا مجنوں — اور اب: ع

مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ اب دنیا میں نہیں رہے، اُن کا چھیڑا ہوا اور چھوڑا ہوا بہت سا کام ابھی باقی ہے؛ لیکن اُن کے ایسا عاشقِ سوختہ جاں اور اور عاشقی کی تمام اداؤں کا راز داں؛ بل کہ کاروبارِ عشق کا ماہر؛ ہر روز اور آسانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی روح گویا اُن کے بعد کے علما و قائدین سے بہ جاطور پر مخاطب ہے:

ہے جنوں، اہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع

چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ اُفکنِ عشق

ہے مُکڑ ر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد

پس مرگ زندہ

اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ملت کو اپنی قدرتِ کاملہ سے
اُن کا نعم البدل عطا کرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلٰی اللّٰهِ بِعَزِيزٍ۔

سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: (مولانا قاضی) مجاہد الاسلام بن (مولانا) عبدالاحد بن (سرکار) ارادۃ اللہ بن (قاری) عنایت اللہ بن (بیرسٹر) قاضی تبارک اللہ جن کا سلسلہ نسب حضرت علی کے صاحب زادے محمد بن حنفیہ سے جا ملتا ہے۔

✽ تاریخ ولادت: ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ)

✽ ابتدائی تعلیم: قرآن مجید ناظرہ اپنی والدہ سے پڑھا، اردو و فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا زین العابدین صاحب (والد ماجد مولانا خالد سیف اللہ رحمانی) سے پڑھیں۔ میزان الصرف اپنے والد مولانا عبدالاحد سے پڑھی۔

✽ متوسط و ثانوی تعلیم: مدرسہ محمود العلوم و منلة ضلع مدھوبنی، مدرسہ امدادیہ در بھنگہ اور دارالعلوم منو ناتھ بھجن میں متوسط و ثانوی تعلیم کے مراحل طے کیے۔

✽ اعلیٰ تعلیم: ۱۹۵۱ء (۱۳۷۰ھ) سے ۱۹۵۵ء (۱۳۷۴ھ) یعنی ۴ سال تک دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے آپ نے بخاری شریف پڑھی، آپ نے حضرت مولانا محمد اعجاز علی امر و ہوئی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا محمد حسین بہارئی، مولانا فخر الحسن مراد آبادی، مولانا بشیر احمد خان، مولانا نصیر احمد خان اور مولانا معراج الحق سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔

✽ جامعہ رحمانی مونگیر میں: ۱۵ شوال ۱۳۷۴ھ کو حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کا، مولانا مجاہد الاسلام کو اپنے وطن ”جالہ“ میں خط موصول ہوا کہ جامعہ رحمانی میں اُن کا تقرر کر لیا گیا ہے، مولانا مجاہد ۲۱ شوال ۱۳۷۴ھ کو جامعہ رحمانی پہنچ گئے، یہاں آپ نے مجموعی طور پر ۸ سال تدریسی خدمت انجام دی۔

✽ امارت شرعیہ آمد: یکم شوال ۱۳۸۴ھ کو حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی خواہش پر

مفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

امارت شرعیہ کی نظامت اور قضا کا عہدہ قبول کرتے ہوئے پھلوری شریف پٹنہ تشریف فرما ہوئے، یہاں آپ نے تین حیثیتوں سے کام کیا: ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء بہ حیثیت ناظم، ۱۹۶۲ء تا وفات قاضی شریعت و قاضی القضاۃ ۱۲/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۲ جون ۱۹۹۰ء تا وفات نائب امیر شریعت۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں قاضی صاحب کا حصہ

● امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی تحریک پر حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ذریعے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، جس کے تانے بانے کے بننے میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی شروع سے شریک رہے اور دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ اُس کے اولیں اجلاس کی تیاری کے لیے ایک ماہ دارالعلوم میں قیام فرمایا۔

● ۲۲ اپریل ۲۰۰۰ء کو، قاضی صاحب کو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے انتقال کے بعد صدر بورڈ منتخب کیا گیا، ۳ سال سے بھی کم عرصے تک وہ بورڈ کے صدر رہے؛ کیونکہ عمر نے وفا نہیں کی۔
✽ مجلہ بحث و نظر کا اجرا: ۱۹۸۸ء میں آپ نے تحقیقی رسالہ ”بحث و نظر“ کا اجرا فرمایا۔

✽ فقہ اکیڈمی کا قیام: اپریل ۱۹۸۹ء میں انھوں نے فقہ اکیڈمی قائم کی، جس کا پہلا فقہی اجلاس یکم تا ۳۱ اپریل ۱۹۸۹ء، نئی دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی کے سیمینار ہال میں ہوا۔

✽ آل انڈیا ملی کونسل کی تاسیس: مئی ۱۹۹۲ء میں آپ نے آل انڈیا ملی کونسل کی بمبئی کے اجلاس منعقدہ ۲۳-۲۴ مئی ۱۹۹۲ء کو اساس گزاری کی۔

✽ مرض الوفات اور وفات: اپریل ۱۹۹۸ء میں، دہلی میں ڈاکٹروں نے یہ انکشاف کیا کہ اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں پائے جانے والے گودے میں کینسر ہے۔ اس بیماری کا علاج جاری تھا کہ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ کے بعد اُن پر نمونیہ کا حملہ ہوا۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۲ء کو حالت، زیادہ نازک ہو گئی اور انھیں پھر اپولو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا، جہاں اُن کا مسلسل علاج ہو رہا تھا؛ لیکن مہنگے علاج کے باوجود جاں بر نہ ہو سکے اور جمعرات: ۲۰ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو دہلی اپولو ہسپتال میں سات بج کر پانچ منٹ پر، جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یعنی اُن کا انتقال جمعرات جمعہ: ۲۰-۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۴-۵ اپریل ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں ہوا۔

● ۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ کو بے صبح جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں، اُن کی پہلی نماز جنازہ مولانا عبداللہ مغنی نے پڑھائی، دوسری نماز جنازہ دہلی میں پالم ایر پورٹ پر گیارہ بجے کے قریب مولانا محمد یعقوب بلند شہری استاذ

پس مرگ زندہ

مظاہر علوم وقف سہارن پور نے پڑھائی۔ تیسری نماز جنازہ امارت شرعیہ پھولاری شریف پٹنہ میں ۳ بجے پہرے کے قریب امیر شریعت مولانا سید نظام الدین نے پڑھائی جس میں لاتعداد لوگوں نے شرکت کی۔ چوتھی نماز جنازہ درجہ گھٹلہ میں C.N. کالج کے وسیع و عریض میدان میں پڑھی گئی، جس میں تقریباً ۲ لاکھ کے مجمع نے شرکت کی، اس جنازے کی امامت مولانا کے برادر زادے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کی اور ساڑھے گیارہ بجے شب میں اُن کی تدفین اُن کے سرال ”مہدولی“ میں ہوئی۔

✽ ایوارڈس و اعزازات

- الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے کیونٹی لیڈر شب ایوارڈ۔
- انسٹی ٹیوٹ آف آئی جی کیو اسٹڈیز نئی دہلی کی طرف سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ۔ from India
- ”افنی“ یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلم کی طرف سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ۔
- ”مسی“ یعنی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی جانب سے بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ۔
- احکام شریعت اسلامی کی تطبیق کے لیے قائم حکومت کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی طرف سے فقہی ایوارڈ۔
- حکومت مراکش کی طرف سے بہترین اسلامی اور علمی خدمات پر گولڈ میڈل۔ (جو عین اُس دن اکیڈمی کے دفتر کو موصول ہوا جس دن آپ کی وفات ہوئی تھی)۔

✽ عہدے و مناصب

- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔
- صدر مؤسس اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔
- صدر مؤسس آل انڈیا ملی کونسل۔
- قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ۔
- صدروفاق المدارس الاسلامیہ، بہار۔
- صدر مولانا سجاد اسپتال امارت شرعیہ۔
- صدر المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء۔
- صدر مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ۔
- رکن گورننگ باڈی آف انسٹی ٹیوٹ آف آئی جی کیو اسٹڈیز۔
- رکن شرعیہ بورڈ آف الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن بنگلور۔

منفرد عالم دین حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

- رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ۔
- اسپرٹ ممبر انٹرنیشنل، اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ۔
- رکن المجمع العلمي العالمي دمشق۔
- رکن اعزازی الہیئۃ الخیریۃ الاسلامیۃ العالمیۃ، کویت۔
- تائیس جالہ ایجوکیشنل کیمپ۔
- ✽ اسفار: سعودی عرب، عرب امارات، قطر، بحرین، کویت جہاں کا آپ نے بار بار سفر کیا۔ امریکہ، برطانیہ، پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، روس کی آزاد مسلم جمہوریاں، مراکش، جنوبی افریقہ۔
- ✽ اسفار حج: پہلا سفر حج ۱۹۶۹ء، دوسرا سفر حج ۱۹۹۶ء۔
- ✽ تالیفات و تحقیقات و علمی کارنامے: اسلامی عدالت، مسلم پرسنل لا کا مسئلہ تعارف و تجزیہ، مباحث فقہیہ، خطبات بنگلور، چند مطبوعہ خطبات، فتاویٰ امارت شرعیہ، کتاب الفسخ والتفریق، آثار سجاد کی بازیافت، فقہی مجلات، آداب قضا، موسوعہ فقہیہ (کے اردو ترجمے کا اہتمام)، صنوان القضاء و عنوان الإفتاء، فقہ المشكلات، النظام القضائي الإسلامي، فقہی مجلات کے عربی تراجم۔ (۱)



(۱) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۳-۴، جلد ۲۶، ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق مئی - جولائی ۲۰۰۲ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود، جو ترجمان دارالعلوم بنی دہلی، ندائے شاہی مراد آباد، ترجمان دیوبند اور آذانِ بلال آگرہ میں شائع ہوئی۔

اسلامی عربی اہل قلم مولانا فصیح الدین دہلویؒ

۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء — ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء

کون سا جھونکا بچھا دے گا کسے معلوم
زندگی کی شمع روشن ہے ہوا کے سامنے

چهار شنبہ: ۱۰/۱۱ رجب ۱۴۲۳ھ کو صبح سویرے حسب معمول اخبارات کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ”عربی کے عالم وادیب مولانا فصیح الدین دہلوی کی وفات“ پر رک گئی۔ میں نے خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ سموار-منگل ۹-۱۰/۱۱ رجب ۱۴۲۳ھ = ۱۷-۱۸/ستمبر ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں، سوا گیارہ بجے وہ رت کریم کے جوار میں پہنچ گئے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس خبر کو اچانک پڑھ کر کس درجہ دل کو ٹھیس لگی۔ عرصے سے مولانا فصیح الدین دہلویؒ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ کئی ماہ سے قومی آواز میں، جس میں وہ بہت چھپتے تھے، بھی انھیں نہیں پڑھ سکا تھا۔ بار بار خیال ہوا کہ اپنے اور اُن کے دہلی کے اہل تعلق سے پوچھوں کہ مولانا فصیح الدینؒ بہ خیر تو ہیں؛ لیکن خدا بھلا کرے مشاغل کا کہ خواہش کے باوجود، بات آج اور کل پر ٹپکتی رہی کہ جلدی کیا ہے پھر معلوم کر لیں گے۔ بہ ہر صورت یہ خبر بجلی بن کر گری اور دل بیٹھ سا گیا۔ بعض دفعہ جان پہچان والوں کی اُن کی زندگی میں تو قدر نہیں ہوتی؛ لیکن اُن کی موت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُن سے کتنا تعلق تھا اور وہ دل و دماغ پر کس درجہ چھائے

پس مرگ زندہ

ہوے تھے۔ بار بار محسوس ہوا کہ شاید یہ خبر غلط چھپ گئی ہے، مولانا فصیح الدین دہلوی کا انتقال نہیں ہوا ہے۔ شدتِ تعلق کی وجہ سے بہت سے اہل تعلق کی وفات کے وقت ایسا ہی کچھ محسوس ہوا؛ لیکن معصوم تمناؤں سے دنیا کے حقائق کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اپنے وقت پر برپا ہوتی ہے اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی۔

جب الفاظ، احساسات کی ترجمانی نہیں کر پاتے

بہت سے احساسات و جذبات ایسے ہوتے ہیں، جن کی صحیح تعبیر کے لیے انسان اپنی تمام نثری و شعری وادبی صلاحیتوں کے باوجود، صحیح الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ الفاظ کے سارے خزانے میں، اُن کی ترجمانی کے لیے کوئی موزوں لفظ موجود نہیں ہے۔ مولانا فصیح الدین دہلوی کی وفات کی خبر پڑھ کر میں اسی طرح کے احساسات سے دوچار رہا اور اب تک ہوں۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اس درجہ رچے بسے ہوئے ہیں۔ اُن کی سادگی، بے ساختہ گفتگو، ذہانت، قوتِ حافظہ، اپنی رائے پر جمنے کی اُن کی خو، حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ، عالمِ اسلام کے دکھ درد کی وسعتوں پر اُن کی گرفت، عربی، اردو اور انگریزی پر اُن کی یکساں قدرت، اُن کی سادہ سی شروانی، لباس میں تراش خراش سے اُن کی بے نیازی، آب و ہوا سے زیادہ آسانی سے دوستوں کو اُن کے میسر آ جانے کی ادا، صاف شفاف گفتگو، اُن کی پیاری آواز اور بے پناہ اپنائیت کا رویہ: یہ سبھی کچھ حافظے کے کیوس پر اس طرح اُبھرنے لگا جیسے وہ ہمارے سامنے ہوں، ہاتھ سے سیاہ رنگ کا اپنے کاغذات کا بیگ ابھی ابھی دفترِ جمعیۃ علماء مسجد عبدالنبی کے کسی کمرے میں رکھ کر اپنے ہاتھ میری طرف مصافحہ کو بڑھایا چاہتے ہیں۔ آہ اُن کے ہاتھوں کی اپنائیت بھری گرمی جواب کبھی نہیں مل سکے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان کی محض علمی صلاحیتیں اور ثقافتی لیاقتیں، اُس کو اپنے

جاننے والوں کے دلوں میں ایسی پیاری جگہ نہیں دے پاتیں (جیسی مولانا فصیح الدین کو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں، اُن کی علمی صلاحیتیں دے گئیں) جب تک علم و فضل کے عناصر کے علاوہ مطلوبہ مقدار میں وہ مجموعی انسانی رویہ اُس میں موجود نہ ہو، جس کے بغیر انسان چوب خشک ہوتا ہے؛ بل کہ محض علم، علم کا پندار، لیاقت سے پیدا شدہ احساسِ برتری، اہل علم کو لوگوں کے دلوں سے اس درجہ دور کر دیتی ہے کہ ایک جاہل کے لیے بھی اُن کے دلوں میں اس درجہ دوری نہیں ہوتی۔ مولانا فصیح الدین اپنے مجموعی رویے سے ہر ملنے والے کا دل موہ لیتے تھے، اُن کا علم و فضل اُن کو برتنے والے کے لیے مزید باعثِ کشش ہوتا تھا۔

مولانا فصیح الدین کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل پر بہت بوجھ رہا کہ کس سے ربط کروں، کس سے تعزیت کروں؟ صبح کے نو بج چکے تھے، ہمارے اور اُن کے دہلوی ”عربی خاندان“ کے افراد کے دفاتر چلے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ مولانا کے گھر کا فون نمبر معلوم نہیں تھا، میں نے شام کا انتظار کیا، شام کے وقت بھائی بدر (مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی سپر اکبر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی) سے ربط کر کے میں نے اُن کی بیماری اور وفات کی تفصیل معلوم کی اور ایک دوسرے کی تعزیت کر کے غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ مولانا فصیح الدین کے گھر کا فون نمبر معلوم کر کے اُن کے بچوں سے تعزیت کی؛ لیکن دل نہیں بھرا کہ انھیں غالباً؛ بل کہ یقیناً اُن کے بچوں سے زیادہ اُن کے بعض دوسرے احباب جانتے تھے اور اُن کے ”عربی خانوادے“ کے افراد اُن کے زیادہ قدر داں اور اُن پر زیادہ دل و جان چھڑکنے والے تھے۔ میرے دل نے مشورہ دیا کہ میں راہِ علم و ثقافت کے، اُن کے دیرینہ دوست اور اُن کے افکار و خیالات کے مخلص ساتھی مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی سے تعزیت کروں کہ بعض دفعہ برادرِ فکر و نظر، برادرِ پدر و مادر سے زیادہ مخلص و غم گسار اور ہم راز و دم ساز ہوتا ہے۔ میں نے اُن سے فون پر تعزیت کر کے محسوس کیا کہ میں نے بہت اچھا کیا کہ اُن کے دوست کی اُن سے تعزیت کی، وہ غم و الم سے شکستہ نظر آئے اور ایسا لگا کہ اُن کے الفاظ بھی رنج و الم کے دباؤ میں ہیں۔

عربی زبان کے ہنرمند قلم کار

مولانا فصیح الدین دہلوی، ہندوستان میں عربی زبان کے ماہر عالم اور جدید اخباری ڈپلومیٹ عربی زبان کے ہنرمند قلم کار تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عربی سے انگریزی اردو اور انگریزی اردو سے عربی میں ترجمے میں گزارا۔ وہ دہلی میں عربی ممالک کے متعدد سفارت خانوں میں کم و بیش چالیس برس عربی کے مترجم اور رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انھیں تیز ترجمہ کرنے اور تیز لکھنے کی زبردست مہارت تھی، حالاتِ حاضرہ پر گہری اور بھرپور نظر تھی، عالم اسلام خصوصاً عالم عربی کے حالات سے اس طرح واقف تھے، جیسے خاص عربی دنیا کا صحافی واقف ہوا کرتا ہے۔ اللہ نے انھیں تحلیل و تجزیے کی زبردست صلاحیت سے نوازا تھا۔ سفارت خانوں میں خطوط و رسائل اور رپورٹوں کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی ہے، اُس میں بڑی نزاکت ملحوظِ خاطر ہوتی ہے۔ سفارت کاروں کے مزاج میں کہنا چاہیے کہ صنفِ نازک سے زیادہ حساسیت ہوتی ہے، وہ بعض دفعہ ایک لفظ کے بے جا استعمال سے بہت ناراض اور کسی لفظ کے بے جا استعمال سے بہت خوش ہو جاتے ہیں، اول الذکر صورت میں بنانا یا کام خراب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر صورت میں بگڑا ہوا کام بھی بن جاتا ہے۔ مولانا فصیح الدین دہلوی کو اپنے طویل تجربے کی وجہ سے اس میں بڑی مہارت تھی، خصوصاً اس لیے کہ وہ عربی، انگریزی اور اردو پر یک ساں قدرت رکھتے تھے۔ کئی زبانوں میں مہارت کی وجہ سے، ہر زبان کے صحیح متبادل کی جان کاری میں انھیں آسانی ہوتی تھی اور اُن کے تراجم اُن نقائص سے بالکل بے باک ہوتے تھے، جن سے صرف ایک دو زبان کی جان کاری رکھنے والے یا کئی زبانوں کی ناقص معلومات رکھنے والے کے تراجم، آلودہ ہو جاتے ہیں۔

اُن کے دوستوں، عربی انگریزی میں کام کرنے والوں، خصوصاً دہلی کے ”عربی

خاندانوں، کو اُن کی شانِ امتیاز کا اعتراف تھا۔ وہ عربی زبان کے ممتاز عالم و اہل قلم کی حیثیت سے اپنے امتیاز کی وجہ سے، دہلی میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ اُن کی خوش اخلاقی، اسلامی اقدار کی اُن کی نمائندگی، سفارت خانوں میں، جہاں کا ماحول آزاد اور بعض دفعہ نامعقول حد تک کھلے پن کا نمائندہ ہوتا ہے، کام کرنے کے باوجود، اسلامی شناخت اور شعائرِ اسلام کی پابندی کی وجہ سے بھی وہ قابلِ تعریف تھے۔ اُن کے بہت سے سفارت خانوں میں کام کرنے والے ساتھیوں نے کبھی داڑھی بڑھالی کبھی گھٹالی، کبھی پیٹ میں آگئے، کبھی داڑھی سے سبک دوش ہو گئے؛ لیکن اُنھوں نے ماحول سے صلح نہیں کی؛ بلکہ ماحول کو اسلامی اقدار سے صلح کرنے پر مجبور کیا۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے اُن کی یہ ثابت قدمی، اسلام پسندی، دینی حمیت اور مذہبی شناخت پر کاربندی کی ادا بہت پسند آئی۔ وہ جہاں رہے وقار سے رہے، اپنی رائے اور ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ اپنی رائے پر سفارت خانوں کی دنیا میں رہتے ہوئے جمنے والا، اُن کے جیسا میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مولانا فصیح الدین، نفاق اور ڈبلنگ (دوہرے بن) سے دوری اور ظاہر و باطن کی یکسانیت میں بھی ممتاز تھے۔ وہ بعض دینی جماعتوں میں عرصے تک عربی کا کام کرتے رہے؛ لیکن کویت عراق والے مسئلے میں، اُنھیں اُن جماعتوں کے قائدین کی دوہری پالیسی سے شدید اختلاف رہا اور اُنھوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ دل اور ضمیر کے خلاف اُن سے جڑے رہیں، چنانچہ اُنھوں نے علاحدگی اختیار کر لی اور اپنے اختلاف کا اُنھوں نے ہر جگہ، برملا اظہار کیا۔

علمی آبرو کا پاس اور احترام

غالباً پڑھا لکھا اور اپنے علم و کمال کا پاس رکھنے والا، اُنھیں کی طرح خوددار، بے لچک اور صاف شفاف پالیسی کا حامل ہوتا ہے، اسی لیے وہ اپنے ساتھیوں میں محبوب رہے۔ وہ اپنی صلاحیت، صلاحیت کی آبرو کا لحاظ رکھنے کی ادا، متعلقہ کام کو پختگی کے

ساتھ کرنے، احساسِ ذمے داری، وقت کی پابندی، وسعتِ نظری، وسعتِ قلبی اور نرم خوئی وغیرہ کی وجہ سے، ہر جگہ مقبول و محبوب رہے۔

اُن کی یہ خوبی بھی تھی کہ وہ صرف متعلقہ کاموں کے اسیر نہ تھے، الگ تھلگ اور گوشہ گیری سے انھیں حد درجہ نفرت تھی۔ وہ امت اور ملت کے مسائل سے بھرپور دل چسپی رکھتے تھے اور اپنے علم و فکر کی روشنی میں اُن کا حل ڈھونڈنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، ورنہ عموماً سفارت خانوں سے تعلق رکھنے والے اہل قلم ہر طرح کے ”ذخ در معقولات“ سے پرہیز کرتے ہیں، جیسے سفارت خانوں سے باہر بھی اُن پر ہر جگہ ہر طرح کی پابندی عائد ہو؛ بل کہ یہ وہاں ملازمت کی شرط ہو۔

مولانا فصیح الدین دہلوی کو اپنی رائے اور اپنے اخذ کردہ نتائج پر بہت اعتماد تھا، اپنی ذات، اپنی رائے اور اپنے افکار و خیالات پر بہت سے قلم کاروں کو اتنا اعتماد نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ ہر نظریے کے سلسلے میں شک و شبہ کا شکار رہتے ہیں۔ اُن کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا تھا؛ لیکن اُن کے اخلاص اور امت و ملت کے تئیں اُن کی بے لوثی سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔

۱۹۷۱-۱۹۷۲ء (۱۳۹۰-۱۳۹۱ھ) میں، میں ہندوستان کے مایہ ناز مؤرخ و فقیہ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء سے استفادے کی غرض سے مدرسہ امینیہ دہلی میں زیرِ تعلیم تھا، اس موقع سے کئی مرتبہ مولانا فصیح الدین دہلوی کا نام اور اُن کی صلاحیت کا تذکرہ سنا؛ لیکن ۱۹۸۲ء میں جب میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ منتخب ہوا اور ”الداعی“ کی ادارت کی ذمے داری تفویض ہوئی، تو اُس موقع سے بار بار دہلی آمد و رفت کا موقع ملا کہ اُس وقت میں خود ”الداعی“ کی طباعت کے لیے دہلی آیا جایا کرتا تھا۔ گلی قاسم جان میں واقع جمعیتِ بلدنگ کے ایک کمرے میں پندرہ روزہ جریدہ ”الکفاح“ کا دفتر تھا، وہیں مولانا منزل الحق حسینی صاحب کے پاس قیام رہتا، اُس موقع سے روزانہ شام کو مسجد عبدالنبی جانے کا موقع ملتا اور وہاں مولانا فصیح الدین سے ملاقات

کا شرف حاصل ہوتا۔ وہ مغرب بعد عموماً تشریف لاتے اور جمعیۃ علما کے عربی کے مفوضہ کاموں کو انجام دیتے۔ سال ہا سال اُن سے ملاقات ہوتی رہی، اُن کی علمی عظمت، عربی پر عبور، انگریزی کی ٹھوس مہارت، کی جان کاری بڑھتی اور اُن کی عقیدت و محبت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُسی دوران خصوصاً ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراق کے قبضے کے بعد مجھے بار بار دہلی میں کویت سفارت خانے جانے کا اتفاق ہوا اور سفارت کاروں کی خواہش پر، اُن سے ملاقات کا موقع ملتا رہا، اُس موقع سے مولانا فصیح الدین کی ملاقاتیں، اُن کی خوش اخلاقی اور اپنائیت کا بار بار تجربہ ہوا۔

دو ایک سال تو یہ سلسلہ جاری رہا؛ لیکن میں اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے سفارت کاروں سے زیادہ دنوں مجاہدہ کا تعلق نہیں رکھ سکا؛ کیوں کہ تعلقات پیدا کرنا اور انھیں نباہنا بھی ایک فن ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے اِس کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؛ ورنہ جس طرح سعودی اور کویتی سفر اُس وقت میری تحریر پسند تھی، جس طرح وہ مجھ سے محبت کرنے لگے تھے، اگر میں تعلقات گری کا فن جانتا، تو کم از کم اپنی دنیا کو سنوارنے کی راہ ضرور پیدا کر لیتا۔

بہ ہر صورت کئی سال کے بعد اچانک مخدومی جناب مولانا عمید الزماں صاحب کیرانوی سے معلوم ہوا کہ مولانا فصیح الدین اب کویتی سفارت خانے سے علاحدہ ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر دل دھک سے رہ گیا، پھر میں نے سوچا کہ یہ دنیا ہے، یہاں ہر طرح کی اُن ہونی ہو جاتی ہے۔ تعلقات، ملازمتیں اور وفاداریاں بھی اُسی طرح حادث ہیں جیسے خود دنیا؛ لیکن بہ ہر صورت نامانوس بات کو سن کر حیرت ہوتی ہی ہے۔ پھر انھوں نے سبک دوشی کی کچھ تفصیل بیان کی تو دل پر اور چوٹ لگی، معلوم ہوا کہ مولانا فصیح الدین کی خودداری اور خود اعتمادی، جس پر وہ کسی سے کبھی صلح کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، یہاں بھی رنگ لائی۔ انھوں نے زندگی اور صحت کے اِس مرحلے میں سفارت خانوں کے گلیاروں میں مزید بھٹکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ لکھنے پڑھنے کے لیے یک سو ہو گئے۔

علمی وثقافتی کام

انھوں نے قومی آواز وغیرہ میں سیاسی اور تجزیاتی موضوعات پر لکھنا جاری رکھا، نیز ایک بہت مفید کتاب ”معین المترجم“ تالیف کی، جس میں عربی سیکھنے والوں کے لیے، اردو تا عربی اور عربی تا اردو ترجمہ کرنے، نیز جدید عربی لکھنے اور سمجھنے کے لیے راہ نما اصول بتائے۔ عربی و اردو نصوص کے ترجمے بھی کر کے دکھائے، نیز مفردات کے متبادل کو سمجھنے کی راہ بھی بچھائی۔ بہت مفید کتاب لکھی، خیال تھا کہ وہ دو چار سال میں دو چار اسی طرح کی مفید کتابیں لکھ کر سفات خانوں کی دنیا میں ضیاع وقت کی تلافی کر کے، اپنے لیے ذخیرہ آخرت، سرمایہ شہرت اور دوسروں کے لیے فائدہ اٹھانے کا سامان بہم پہنچائیں گے؛ لیکن زندگی نے وفانہ کی اور میری معلومات کی حد تک، اس ایک قیمتی کتاب سے بات آگے نہ بڑھ سکی، جس کو ہمارے برادر مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی نے آب تاب سے اپنے مکتبہ وحید یہ دیوبند سے شائع کیا۔ یہ کتاب دیوبند کے سارے کتب خانوں میں دست یاب ہے۔

ہمیشہ جینے کے لیے کون آیا ہے؟ تو بھلا مولانا فصیح الدین کیسے ہمیشہ جیتے رہتے؟ لیکن اُن کے کچھ اور جینے سے ”فلک پیر“ کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور ہم دوستوں کو، اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا۔ وہ غالب کے شاگرد ”عارف“ کی طرح ”جوان“ تو نہ تھے؛ لیکن کچھ بہت عمر دارز بھی نہ تھے، سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جوانوں کی طرح تیز کام کرنے کے عادی تھے، اس لیے غالب کے شعر کو ہمیں بھی دہرانے کا حق ہے۔

ہاں اے فلک پیر! ”جوان“ تھا ابھی ”عارف“

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مولانا فصیح الدین نہیں رہے، ہم سمجھوں کو بھی کب تک رہنا ہے؟ لیکن ہم لوگ

اسلامی عربی اہل قلم مولانا فصیح الدین دہلوی

جب تک زندہ رہیں گے مولانا یاد آتے رہیں گے۔ اُن کی سادگی، اُن کی نرم گوئی، اُن کی صلاحیتوں کے نتائج، اُن کی خردنوازی، اُن کی احباب پروری یاد آتی رہے گی۔

اللّٰهُم اغفر له وارحمه .

مولانا فصیح الدینؒ سے مراسلت کی کبھی ضرورت نہیں پڑی، اُن سے تعارف و بے تکلفی کے بعد، دہلی میں ہی حسب ضرورت ملاقات ہو جایا کرتی تھی؛ اس لیے کسی کام کے لیے ہمیں آپسی خط و کتابت کا سہارا نہیں لینا پڑا، حال آں کہ مراسلت کا کلچر اُن کی وفات تک خاصی حد تک باقی تھا، اب ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں جس وقت ان تحریروں کو بہ شکل کتاب مدوّن کر کے شائع کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے یہ موروثی و انتہائی مفید ثقافت دم توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔

البتہ ایک بار مولانا نے اپنے نئے گھر کے پتے پر ”الداعی“ بھیجنے کو کہا اور پرانا پتہ، جس پر انھیں ارسال کیا جاتا تھا، کاٹ دینے کی تاکید بات کہی اور فرمایا کہ اُس پر ڈاک بے وجہ ضائع ہو جاتی ہے، اس لیے آپ یاد سے دفتر کے مُتعلّقہ ملازمین سے پتہ تبدیل کروادیں۔ ناچیز نے دہلی سے آکر فوراً اُس پر عمل درآمد کروایا اور ”الداعی“ کا تازہ شمارہ تبدیل شدہ پتے پر انھیں ملا، تو انھوں نے عربی زبان میں، جو دہلوی ہونے کے باوجود، اردو سے زیادہ اُن پر سوار رہتی اور اُن کے لیے، لکھنے اور بولنے میں آسان لگتی تھی، ذیل کی چند سطری تحریر کے ذریعے شکریے کے ساتھ، اس کی اطلاع دی، جو عربی ہی میں، یہاں یادگار کے طور پر ثبت کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی اردو خواں حضرات کے لیے اُس کا ترجمہ بھی پیش کیا جا رہا ہے:

الأخ الفاضل الأستاذ نور عالم المحترم

تحية أخوية، وبعد .

وصلتني نسخة من مجلة داعي، (العدد الأخير) وذلك على

عنوان منزلي الحديد؛ فشكراً جزيلاً على هذا الاهتمام .

پس مرگ زندہ

أرجو أن تكون صحتكم جيدة ، خصوصاً "السكر" بنسبة صحيحة .. ونتمنى اللقاء بكم ؛ فأرجو التكرم في المرة القادمة التي تأتون فيها إلى دلهي .

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته . أخوكم
فصیح الدین الدہلوی

۱۹۹۹/۸/۹ م

برادر کرم! مولانا نور عالم صاحب

برادرانہ سلام کے بعد یہ کہنا ہے کہ رسالہ الداعی کا آخری شمارہ، میرے نئے گھر کے پتے پر مجھے مل گیا، اس توجہ دہی کے لیے، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

توقع ہے کہ آپ بالکل یہ بہ خیر ہوں گے، بالخصوص "شکر" کا تناسب موزوں ہوگا۔ آپ سے ملاقات کی خواہش ہے۔ آئندہ دہلی آمد کے موقع سے آپ سے کرم فرمائی کی امید ہے۔

والسلام علیکم ورحمة الله وبركاته

آپ کا بھائی
فصیح الدین دہلوی

۱۹۹۹/۸/۹ء

سوانحی نقوش

✽ نام: (مولانا) فصیح الدین دہلوی بن عبدالقدیر دہلوی بن عظیم الدین دہلوی۔

✽ تاریخ پیدائش: ۳۰ ستمبر ۱۹۴۱ء (۸ شوال ۱۳۶۰ھ)

✽ جائے پیدائش: مکان نمبر (۷۶۱) گلی شیخ صاحب، محلہ قصاب پورہ، صدر بازار، دہلی۔

✽ مولانا فصیح الدین دہلوی کے دادا جناب عظیم الدین صاحب دہلوی بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد

اسلامی عربی اہل قلم مولانا فصیح الدین دہلوی

الیاس صاحب "کاندھلوی دہلوی سے بیعت تھے، انھیں نے موصوف کا نام "فصح الدین" رکھا تھا۔ موصوف کے والد محترم جناب عبدالقدیر صاحب "بھی ایک نیک عالم دین مولانا مقبول حسن صاحب گنگوہی سے بیعت تھے، جو صدر بازار کی مسجد شاہ گل میں اُس زمانے میں رہا کرتے تھے۔ مسجد نواب والی، قصاب پورہ، صدر بازار میں جب مولانا عبدالقادر راے پوری تشریف لاتے تھے، تو اُن سے ملنے کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی بھی تشریف فرما ہوتے تھے اور اکثر جناب عبدالقدیر صاحب کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ موصوف کے خاندان کا شروع سے ہی علما و صلحا اور مشائخ دیوبند سے عقیدت و محبت کا تعلق رہا تھا۔

✽ خاندانی طور پر یہ لوگ چمڑے کے بڑے تاجر تھے، جرمنی اور روس چمڑا اکسپورٹ ہوتا تھا، ۱۹۳۸ء-۱۹۴۰ء میں جنگی حالات کی وجہ سے یہ کام ماند پڑ گیا اور ۱۹۴۷ء میں بالکل ختم ہو گیا، موصوف کے ماموں دوست محمد صاحب قریشی بن الحاج شہاب الدین قریشی "چمڑے اور اُس کی مصنوعات، بالخصوص جوتے کے آج بھی ممتاز ایکسپورٹروں میں ہیں۔

✽ تعلیم: مولانا فصیح الدین نے قرآن پاک ناظرہ اور حفظ مولانا حافظ محمد قمر صاحب "جھنجھانوی" سے کیا، ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) میں حفظ کی تکمیل کی۔ حافظ محمد قمر صاحب ہی اُن کے اصلی مربی تھے، انھیں اُن سے بڑی عقیدت تھی؛ اسی لیے وہ اُن کے گھر جھنجھانہ بھی آیا جایا کرتے تھے، جس کا بڑی محبت سے وہ تذکرہ کرتے تھے، اُس کے بعد از ابتدا اتنا انتہاء، انھوں نے ساری دینی تعلیم مدرسہ عالیہ فتح پوری میں حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۶۱ء (۱۳۸۰ھ) میں فارغ ہوئے، اُن کے ممتاز اساتذہ میں مولانا قاری سید محمد میاں، مولانا قاضی سجاد حسین بجنوری، کرپوری، قاسمی (۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء-۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء) اور مولانا عبدالسمیع میواٹی تھے۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں دارالعلوم دیوبند میں قیام کیا اور عربی زبان و ادب میں کمال بہم پہنچایا۔ یہاں انھوں نے فلسفہ اور اصول فقہ کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ وہ اپنے کو دارالعلوم دیوبند کا فاضل ہی تصور کرتے تھے اور ہر موقع پر اپنی بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار کرتے تھے، ویسے بھی درس نظامی کے پرمغیر کے سارے اُن گنت مدرسے غیر رسمی طور پر دارالعلوم دیوبند ہی کی شاخیں ہیں اور اُن میں سے کسی جگہ کا فارغ گویا دارالعلوم دیوبند ہی سے فیض یافتہ ہوتا ہے اور اُس کو اپنی خاص مادر علمی سے زیادہ دارالعلوم دیوبند ہی سے عقیدت ہوتی ہے۔

✽ ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں پنجاب یونیورسٹی سے "آداب عربیہ عالیہ" (High Proficiency Arabic)

پس مرگ زندہ

کی فرسٹ ڈویژن سے ڈگری حاصل کی نیز جامعہ اردو علی گڑھ سے اردو ادب و زبان کی سند حاصل کی۔ نیز جامعہ اردو علی گڑھ سے انگریزی زبان کا ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔

✽ تدریسی و عملی زندگی: ۱۹۶۳-۱۹۶۵ء (۱۳۸۳-۱۳۸۴ھ) کے عرصے میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں نواور عربی زبان و ادب کے استاذ رہے۔

✽ ۱۹۶۵-۱۹۶۸ء کے دوران انڈین کونسل فار کچھل ریلیشنس (Indian Council for cultural relations) جو وزارت خارجہ کے تحت ایک سرکاری ادارہ ہے، رسالہ ”ثقافت الہند“ بہ زبان عربی کی اشاعت و ایڈیٹنگ کی سرپرستی کی۔

✽ ۱۹۶۹ء سے پانچ سال تک نئی دہلی میں اردن کے سفارت خانے میں بہ حیثیت مترجم خدمات انجام دیں۔

✽ ۱۹۷۴-۱۹۷۵ء میں دو سال تک سفارت خانہ عراق نئی دہلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔

✽ کچھ عرصے مراکش کے سفارت خانہ، نئی دہلی میں بھی کام کیا۔

جولائی ۱۹۷۵ء سے اگست ۱۹۸۸ء تک کویت سفارت خانے میں، بہ حیثیت مترجم سیاسی امور اور بہ حیثیت محاسب، عربی اور انگریزی میں گراں قدر خدمات انجام دیں، سفارت خانے کے اعلیٰ ذمے داروں بالخصوص سفراء کویت کو ان کی صلاحیت اور علمی خوبیوں کا بڑا اعتراف رہا۔

اسی کے ساتھ ساتھ اردو اور عربی زبانوں میں مختلف اسلامی سیاسی اور اجتماعی حالات پر گراں قدر مضامین و رپورٹیں لکھیں، جو ہندوستان کے کثیر الاشاعت اخبارات میں شائع ہوتی رہیں اور بڑے شوق سے پڑھی گئیں۔ دہلی کی علمی و ادبی دنیا میں ان کا ایک ممتاز مقام رہا، اور ہر مجلس میں انھوں نے اپنی علمی و فکری شناخت چھوڑی جو بہت دنوں تک یاد رہے گی۔

✽ بیماری اور وفات: نومبر ۱۹۸۸ء میں شدید بیمار ہوئے، دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا، فروری ۱۹۸۹ء میں ممبئی میں علاج ہوا اور بڑی حد تک صحت بہ حال ہو گئی؛ لیکن پہلی سی چستی و پھرتی باقی نہیں رہی۔

✽ اپریل ۲۰۰۲ء میں پھر بیمار ہوئے، یہ بیماری بڑھتی گئی اور صحت بہ حال نہ ہو سکی بالآخر سموار منگل ۹-۱۰/ رجب ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۷-۱۸/ ستمبر ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں سوا گیارہ بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ سہ شنبہ (منگل) ۱۰/ رجب ۱۴۲۳ھ کو دس بجے صبح ان کی نماز جنازہ صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا سید اسعد مدنیؒ (۱۳۳۶ھ/ ۱۹۲۸ء- ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) نے پڑھائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں پیوند

خاک ہوئے۔

✽ لائق ذکر ہے کہ مولانا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء- ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت تھے۔

✽ پس ماندگان: اُن کی اولاد میں چھ صاحب زادے ہیں، جن میں سے ۵ دہلی میں رہتے ہیں اور ایک لڑکا انگلینڈ میں زیرِ تعلیم ہے۔

✽ مولانا کے بڑے بھائی محمد عاقل دہلوی کی رہائش کلکتہ میں ہے۔ اُن سے چھوٹے بھائی دہلی میں رہتے ہیں، سب سے بڑی ہمشیرہ کراچی، پاکستان کی باسی ہیں، جب کہ دو گرتین بہنیں ایک مولانا سے بڑی اور دو چھوٹی بہنیں دہلی کی باشندہ ہیں۔ (۱) (*)



(۱) مولانا کے سوانحی نقوش کے سلسلے میں اُن کے بڑے صاحب زادے جناب محمد ارشد دہلوی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۲۳، رمضان و شوال ۱۴۲۳ھ مطابق نومبر و دسمبر ۲۰۰۲ء۔ اردو

تحریر یہ قلم خود سر شنبہ (منگل): ۲:۳۰ بجے دوپہر ۱۳ رمضان ۱۴۲۳ھ = ۱۹ نومبر ۲۰۰۲ء۔

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ

ایک نوجوان اور فعال عالم دین (۱)

۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء — ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۳ء

کتنے عالم ہیں جو غنچے پہ گزر جاتے ہیں
تب کہیں جا کے وہ رنگین قبا ہوتا ہے

۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء مطابق ۲۶ ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ بہ روز جمعرات کو ابھرتے ہوئے نوجوان عالم دین، اور لائق صاحب قلم مفتی نسیم احمد قاسمی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کی اچانک وفات، علمی و دینی حلقوں کے لیے افسوس ناک اور باعثِ رنج و الم تھی، اِس لیے کہ یہ ایک ایسے پر عزم اور بیدار مغز نوجوان کی وفات تھی، جس نے اپنی زندگی کی محض ۳۶ بہاریں دیکھی تھیں۔ صلاحیت مند با حوصلہ نوجوان کی موت، ان اکابر اور عمر رسیدہ افراد کی موت کے مقابلے میں زیادہ الم ناک اور اندوہ گیس ہوتی ہے، جو عزم و حوصلے سے ہمت ہار جاتے ہیں اور جن کی توانائی حیات مفقود ہو جاتی ہے، اُن کے بارے میں عام طور پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ چند دنوں کے مہمان ہیں، جو کسی وقت بھی کوچ کر سکتے ہیں۔

ایک ذی استعداد نوجوان

مفتی نسیم احمد قاسمی ایک ایسے قابلِ فخر، ذی استعداد نوجوان تھے جو اگر ایک طرف

(۱) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی مفتی خالد حسین قاسمی نیوی۔

تحریر و تقریر میں کمال رکھتے تھے، تو دوسری طرف فقہ و فتاویٰ میں بھی۔ موصوف پڑھنے کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اور نمایاں طلبہ میں سے تھے، وہاں سے امتیازی نمبرات کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے، اس کے بعد انھوں نے ہندوستان کے جلیل القدر فقیہ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (متوفی ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۲ء) کی معیت اور صحبت اختیار کی، حضرت قاضی صاحب نے امارتِ شرعیہ، ملی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے علمی فقہی اور سیاسی امور میں اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے اُن کا انتخاب کیا۔ قاضی صاحب کی اُمیدوں پر بھرپور اُترتے ہوئے مفتی نسیم نے اُن تمام میدانوں میں انتظامی، تحریری، تقریری، اور ہندوستان کے بہت سے خطوں بالخصوص مشرقی علاقوں کے عوام کے ساتھ رابطہ استوار کرنے میں فعالیت اور پر جوش حرکت کے ذریعے، اپنی صلاحیتوں کا بھرپور سکھ بٹھایا اور یہ سب انھوں نے انتہائی کم عمری میں انجام دیا۔

ذہانت اور بذلہ سنجی

ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند میں، اپنی طالب علمی کے زمانے میں، میرے حجرے سے متصل ایک کمرے میں رہا کرتے تھے اور بالعموم صبح و شام کی تفریح اور دسترخوان پر شریک اور دوسرے بہت سے اُمور میں میرے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے؛ یہاں تک کہ وہ میرے عزیز و قریب کے مانند ہو گئے تھے۔ انھیں مجھ سے بہت تعلق تھا، میرا بڑا احترام کرتے تھے، اللہ انھیں جنت میں بہترین بدلہ عنایت فرمائے اور اُن کے گھر والوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ مرحوم ظریف الطبع اور ہنس مکھ تھے، جس کی وجہ سے اُن کے ہم نشین اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بہت جلد اُن سے مانوس ہو جاتے تھے اور اُن کی بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہوتے تھے، اسی طرح انھیں اللہ نے ذہانت و فطانت سے نوازا تھا، جس کی وجہ سے علمی اُمور اور لوگوں کے معاملات و مشکلات کو فوراً سمجھ لیتے تھے۔

وہ دراز قد، خوش اخلاق، خوش مزاج، نرم خو، کشادہ جبین تھے، ناک کھڑی، گھنیرے بال، آنکھیں قدرے بڑی، چہرہ کتابی مائل بہ بیضوی، رنگ گندمی تھا۔ طالب علمی میں چھریرے بدن کے تھے، عمل کی زندگی میں آنے کے بعد ہی اُن کا بدن بھاری بھر کم ہوتا گیا، توند بھی نکل آئی تھی، وہ جب بھی مجھ سے ملتے میں کہتا کہ آپ وزن اور توند پر کنٹرول کیجیے، بالآخر یہی موٹاپا اور چربی کی کثرت، اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

وہ عصر کے بعد روزانہ اپنے کمرے سے (جو میرے کمرے کے سامنے ذرا اوپر کو واقع تھا) فوراً میرے کمرے میں (جو دارِ جدید میں فوقانی منزل پر فارسی خانے اور معراج گیٹ سے آتی ہوئی کمروں کی رو کے سنگم پر واقع ہے اور جو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی کا کمرہ اور اُن کی علمی و تربیتی تنگ و تنگ تقریباً رچ صدی تک مرکز رہا تھا) آجاتے اور تفریح کے لیے آمادہ کرتے، وہ جب تک اس کمرے میں (تقریباً دو سال تک) رہے ہمیشہ مجھے تفریح کرانے لے جاتے، کبھی کبھی تکان یا عدمِ فرصت کی وجہ سے یا اُس زخم کی وجہ سے جو شکر کے موذی مرض کے بعد عموماً، میرے دونوں پاؤں کے تلووں میں سے کسی میں ہو جایا کرتا ہے، اگر تفریح کو آمادہ نہ ہوتا، تو وہ اپنی خوش اخلاقی اور نیاز مند اندازوں کے ذریعے، تھوڑی بہت دور دارالعلوم کے احاطے سے باہر ضرور لے جاتے۔ عموماً ہم لوگ دارالعلوم کے مغرب میں عید گاہ پارک کے پاس سے مدرسہ اصغریہ دیوبند کی نئی عمارت کے نزدیک بھانلہ روڈ سے جاننے والی سڑک سے ریلوے گومتی (کراسنگ) پار کر کے پھر دوسری سڑک پکڑ لیتے، جو جانبِ شمال میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جا کر، قاسم پورا کو کراس کر کے، جی ٹی روڈ سے جا ملتی ہے، ہم لوگ قاسم پورا ہی سے ایک دوسری سڑک سے، جو دیوبند کی عید گاہ کے پاس سے ہوتی ہوئی دارالعلوم کے مدنی گیٹ سے آملتی ہے، دارالعلوم آجاتے، مغرب کی نماز عموماً اُنھیں کی امامت میں قاسم پورا میں ایک صاحب

کے کھیت میں نماز کے لیے بنے ہوئے چبوترے (مصلی) پر ادا کرتے۔ مفتی نسیم احمد ظریف الطبع بھی تھے، اُن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی، اُن کی ذہانت، ذہن کی زرخیزی، علمی مسائل پر تبادلہ خیال، مختلف اہل علم اور مسلم جماعتوں و تنظیموں پر تبصرے، ملکی و بین الاقوامی حالات کی تازہ خبروں پر رائے زنی، دارالعلوم کے بعض مسائل پر آزادانہ و معصومانہ تجزیے وغیرہ سے، تفریح کا یہ سفر بہت جلدی طے ہو جاتا۔

راحت رساں رفیق سفر

دہلی، گنگوہ اور آس پاس کے کئی مدرسوں میں اُن کی رفاقت میں جانا ہوا۔ وہ بڑے آرام دہ، جی لگانے والے اور سفر کے تقاضوں میں مکمل ہاتھ بٹانے والے رفیق سفر ثابت ہوئے۔ وہ میرے لیے اُس عرصے میں ایسے ہم دم بن گئے تھے کہ کسی سفر میں اور بے تکلفی کی مجلس میں، اگر میرے ساتھ اپنی طالب علمانہ مشغولیتوں کی وجہ سے نہ ہوتے، تو مجھے اُن کی کمی محسوس ہوتی تھی، وہ ہوتے تو مجھے سہارا محسوس ہوتا اور جو کام جس طرح ہونا چاہیے، وہ اُسی طرح ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ کھانا پکانے، ناشتہ بنانے اور سلیقے سے کھلانے پلانے کا بھی سلیقہ رکھتے تھے، ورنہ عموماً محنتی طلبہ اس حوالے سے خاصے گھامڑ ہوتے ہیں۔

اُن سے دارالعلوم میں پہلی ملاقات ۳۰ دارید میں ہوئی، جو دارالعلوم کی طالب علمی کے زمانے میں میرا بھی کمرہ رہا تھا، دارالعلوم میں جب تک رہا اسی کمرے میں رہا۔ برادرِ معظم مولانا محمد اولیس القاسمی (متوفی جمعہ ۳ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ = ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء) دارالعلوم دیوبند آئے تو طلبہ مظفر پور و سیتا مڑھی و ویشالی نے، اُسی کمرے میں اُن کے لیے جلسہ استقبالیہ ترتیب دیا، مفتی نسیم نے بہ حیثیت ناظم انجمن اُن کے تعارف و تعریف میں خیر مقدمی تقریر کی، جو بہت اچھی تھی، دل نے کہا کہ یہ طالب علم ان شاء اللہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد، اچھا فاضل اور لائق عالم ثابت ہوگا۔

قاضی مجاہد کے قافلہٴ علم و فکر سے وابستگی

دارالعلوم سے فراغت کے بعد جب وہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء-۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء) کے قافلہٴ علم و عمل سے جڑ گئے اور اچھے معاون و مددگار اور کامیاب مقرر و منتظم اور اُن کی دین و ملت کے تئیں سرگرمیوں کے نقشے میں رنگ بھرنے والوں میں سے ایک لائقِ فردِ ثابت ہوئے اور اُن کا قیام امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے پھلواری شریف میں ہو گیا، تو یہ راقم ایک بار اپنی ایک شدید ضرورت سے قاضی صاحبؒ سے ملنے اور ضرورت پوری کرنے کے لیے گزارش کرنے کے لیے، اچانک جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد اُن کی قیام گاہ محلہ ”سیدانہ“ میں حاضر ہوا، وہ انتہائی پرتپاک طریقے سے، بے پناہ خوشی کے ساتھ ملے، جیسے کوئی بڑا قیمتی خزانہ اچانک اُن کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ اُنھوں نے خاطر تواضع کا انتظام کیا، امارتِ شرعیہ میں رہائش کی معقول جگہ فراہم کی، پھر قاضی صاحب سے ملوایا، میں ڈیڑھ دو روز اُن کی ضیافت اور اکرام و احترام کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر، دوسرے دن کسی وقت واپس ہونے کو تیار ہوا، تو اُنھوں نے باہشتمِ غم مجھے رخصت کیا، جیسے کوئی نعمت اُن سے چھینی جا رہی ہو۔

وہ کئی بار میرے پاس دارالعلوم میں اور پھر میری عائلی رہائش گاہ افریقی منزلِ قدیم میں، کبھی قاضی صاحب کے ساتھ، کبھی کسی اور ہم سے جو قاضی صاحب نے چھیڑی ہوتی تھی اور کبھی اپنے امارت کے رُفقا کے ساتھ اچانک وارد ہوئے اور تھوڑی تھوڑی دیر رک رک کے ہی واپس ہو گئے، میں اُن سے شکایت بھی کرتا کہ اب ملنے کو وقت نہیں ہے اور کبھی ہمہ وقت ساتھ رہنے کو بے تاب رہتے تھے، تو وہ کہتے! حضرت اب آپ ہی لوگوں نے (یعنی قاضی صاحب اور امارتِ شرعیہ کے علما نے) ایسا مشغول کر دیا ہے کہ کہیں چین سے چند منٹ بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ میں اُن سے کہتا اچھا ہے، آپ

جوان ہیں، تازہ دمی ہے، توانائی ہے، حوصلہ کی کمان چڑھی ہوئی ہے، اس لیے جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتے جائیے، یہی منزل کام کرنے کی ہے، کچھ ہی سالوں بعد علم و عمل کی راہ پر چلنے میں تھکاوٹ سی محسوس ہوگی، ہم لوگ اب تھکاوٹ ہی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے مصافحہ کرتے اور سلام کرتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔

وہ کوہ گن کی بات پر اُن کے تاثرات

۱۳۱۵ھ / ۱۹۹۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی وفات کا جاں کاہ سانحہ پیش آیا، تو دل چھلنی ہو گیا، چند ماہ بعد ہی میں نے اُن پر اپنی تاثراتی کتاب: ”وہ کوہ گن کی بات“ شائع کی جو الحمد للہ توقع سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اُن کی خواہش پر میں نے کتاب کا ایک نسخہ انھیں بھیجا اور اُن سے ”فقہ اکیڈمی“ کے ترجمان مجلہ ”بحث و نظر“ میں تبصرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے اُس پر تبصرہ کرنے کے وعدے کے ساتھ یہ خط ارسال کیا:

مخدوم و محترم حضرت مولانا نور عالم امینی صاحب! ادام اللہ ظلہ

خدا کرے مزاج گرامی بہ عافیت ہو۔

آپ کی ارسال کردہ کتاب ”وہ کوہ گن کی بات“ موصول ہوئی۔ یہ میرے لیے بہترین اور سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ اس موقع پر یاد آوری و خصوصی توجہ کے لیے بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ بلاشبہ آپ نے حضرت مولانا کیرانویؒ کی سوانح حیات لکھ کر، قاسمی برادری اور فضلاے دیوبند کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے اور حضرت علیہ الرحمۃ سے آپ کو جو خصوصی عقیدت و تعلق تھا، اُس کا مکافئہ حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو بہترین صلہ دے۔ آمین

حضرت علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی نہ صرف ہندوپاک کے لیے؛ بل کہ پوری دنیا کے لیے خدائی عطیہ تھی، اُن کی ذات سے ملت اسلامیہ کو جو فائدہ

پہنچا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آپ نے حضرت علیہ الرحمۃ کی زندگی کے جن گوشوں اور خدمات کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اُن پہلوؤں پر آپ کے علاوہ کوئی اور فاضل دیوبند کا لکھنا مشکل تھا۔ یہ کتاب نہ صرف حضرتؒ کی خدمات و روشن کارنامے پر مشتمل دستاویز ہے؛ بل کہ مرحومؒ کے بے شمار تلامذہ و منتظمین کے حالات کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، یہ کتاب ظاہری و معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے، کتاب کی سطر سطر میں مرحوم سے آپ کے خلوص و عقیدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جب یہ کتاب مجھے ملی اور میں نے کھول کر دیکھا، تو یقیناً نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کتاب ہندوستان سے چھپی ہے، خیال تھا کہ پاکستان کے کسی کرم فرمانے ارسال کی ہے، یہ کتاب آپ کے اعلیٰ ذوق کی شاہ کار ہے۔ یقیناً مولانا مرحومؒ کی روح خوش ہو گئی ہوگی۔ عجلت میں یہ چند جملے لکھ رہا ہوں۔ میرے جیسا آدمی تبصرہ کیا کرے گا۔ البتہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا جائے گا۔

والسلام

نسیم احمد قاسمی

۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ء

تحریری سرگرمیاں

مفتی نسیمؒ اپنے مشغول ترین اوقات میں سے، کچھ وقت تصنیف و تالیف کے لیے بھی نکال لیا کرتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں، جو شائع ہوئیں، اسی طرح اُنھوں نے متعدد فقہی مقالات بھی لکھے، جو حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب کے جاری کردہ فقہی اردو مجلہ ”بحث و نظر“ اور امارت شرعیہ پھلواری شریف کے ترجمان ہفتہ وار ”نقیب“ اور ملی کونسل کے ترجمان ماہ نامہ ”ملی اتحاد“ میں شائع ہوتے رہے۔ بہت سے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے، نیز

دعوتی و تبلیغی مقاصد کے لیے، موصوف نے ہندوستان کے بے شمار شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا، خاص طور پر حادثات اور فرقہ وارانہ فسادات کے مواقع پر امداد اور ریلیف کا کام کرنے کے لیے، حادثے سے متاثرہ علاقوں کا مسلسل سفر کیا اور وہاں کے مسلمانوں اور مصیبت زدہ خاندانوں کی اشک شوئی اور باز آباد کاری کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ہم لوگوں کو بہت ساری امیدیں اور توقعات مفتی نسیم سے وابستہ تھیں، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ایسے علما بہت تیزی کے ساتھ رحلت فرماتے جا رہے ہیں، جن سے ہندوستانی مسلم سماج روشنی حاصل کرتا تھا اور فرقہ پرستوں کی طرف سے پیدا کردہ تمام تر نامساعد اور پریشان کن منفی حالات میں اُن کا سہارا لیا جاتا تھا؛ لیکن ظاہر ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے بے بس ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۶۷ء مطابق ۲۲ شوال ۱۳۸۷ھ میں ہوئی، اُن کا وطن مظفر پور، صوبہ بہار، کا ایک گاؤں ”بیل پکونہ“ تھا، انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ لہریہ سرائے درجہنگہ اور مدرسہ دینیہ غازی پور یو پی میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی، جہاں سے انھیں ۱۴۰۶ھ میں فضیلت کی ڈگری ملی، اس کے بعد شعبہ افتاء میں داخل ہوئے اور ۱۴۰۸ھ میں افتاء کی تربیت مکمل کی، اس کے بعد ایک سال تک معین مفتی کا کام کرتے رہے۔

بعد ازاں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے انھیں امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ آنے کی دعوت دی اور ایسے کام اُن کے سپرد کیے، جن سے اُن کی فقہ و فتاویٰ اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت کو جلا ملی، پھر جب مسلمانوں کی صف کو متحد کرنے کے لیے ملی کونسل کا ۱۹۹۲ء میں قیام عمل میں آیا، تو مفتی نسیم، حضرت قاضی صاحب کے سرگرم اسفار اور شہر و دیہات کے دوروں میں اُن کے ساتھ رہے، جس نے اُن کی ذہانت میں چار چاند لگا دیے، اُن کی فکر و نظر میں خاصی وسعت پیدا کر دی اور وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود

اور اُن کی بکبت و پستی کو دور کرنے کے لیے مختلف میدانوں میں ایک دیدہ ور اور تجربہ کار کی طرح کام کرنے کا اہل ہو چلے تھے؛ لیکن زندگی مستعار کے اتنے ہی دن انھیں ملے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (۱۰)

سوانحی نقوش

✽ نام: نسیم احمد بن محمد ہاشم بن محمد سلیم بن محمد یعقوب بن محمد فرزند علی بن محمد امیر الدین بن محمد عطاء اللہ بن محمد جعفر بن عبد القادر بن مولوی سعید الحق۔

✽ پیدائش: ۵ دسمبر ۱۹۶۷ء (۲ ر شوال ۱۳۸۷ھ)

✽ آبائی وطن: بھر وارہ کے مضافات میں تقریباً دو کیلومیٹر دور جانب مغرب ایک معروف و مشہور بستی ”تیل پکونہ“ ہے، اُس کا ڈاک خانہ ”بھر وارہ“ بلاک ”کٹرہ“ اور ضلع ”مظفر پور“ ہے۔

✽ تحصیل علم: ابتدا میں میاں جی انظار صاحب مرحوم پھر حافظ عبدالصمدؒ سے ناظرہ قرآن شریف اور اردو قاعدہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ ”مدینۃ العلوم بھر وارہ“ (یہ مدرسہ اس وقت بھی مکتب کی صورت میں ہے) کم و بیش ایک سال زیر تعلیم رہے، اس کے بعد مولانا قمر الزماں صاحب نقشبندی مجددی (۱) سے فارسی اور کچھ عربی کتابیں اور حساب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مولانا موصوف کے مشورہ سے مولانا عزیز اختر قاسمی استاذ دارالعلوم ”بالا ساتھ“ کے ساتھ دیوبند گئے (مولانا اُس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے) سوئے قسمت بیمار ہو گئے گھر واپس آ گئے۔ علاج و معالجہ سے صحت یابی ہوئی؛ لیکن سال یوں ہی ختم ہو گیا، بعد رمضان تقریباً شوال کی ۱۳ یا ۱۴ تاریخ کو مولانا قمر الزماں صاحب نے انھیں مدرسہ ”خزینۃ العلوم“ پو پری بازار میں داخل کرایا۔ درجہ فارسی ابتدائی میں پڑھنے لگے، تعلیم شروع ہو گئی تھی، کم و بیش ایک مہینہ گزرا تھا کہ زبردست بارش ہوئی، سیلاب کے نتیجے میں مدرسہ پانی میں ڈوب گیا، بارش کا وہ تسلسل تھا کہ ابر تھمتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ بالآخر ایک روز بارش کچھ رکی

(۱۰) عربی تحریر شائع شدہ ”الدامی“ عربی شمارہ ۱-۲، جلد ۲، محرم و صفر ۱۴۲۲ھ = مارچ و اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۱) مفتی نسیم کے ہم وطن یعنی ”تیل پکونہ“ کے ایک خوش اوقات تعلیم یافتہ جو ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر رہے، ذوق عبادت نے اُس دن داری سے سبک دوش ہو جانے پر مجبور کیا، ان سطور کے ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں تحریر کیے جانے کے وقت حیات ہیں۔

کچھ دنوں بعد مدارس میں عیدالاضحیٰ کی فرصت ہوئی، چھٹی ختم ہونے کے بعد مولانا قمرالزماں صاحب نے مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے درجہ نگ میں داخل کر دیا۔ مدرسہ امدادیہ میں گلستاں بوستاں اور میزان وغیرہ کتابیں پڑھیں، پورے سال مدرسہ امدادیہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء کا سال تھا۔ سال ختم ہونے کے بعد مولانا قمرالزماں انھیں ۱۹۷۹ء کے آخر میں مدرسہ دینیہ غازی پور لے کر پہنچے۔ اُس زمانے میں قاری شبیر احمد صاحب (حال ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھر وارہ درجہ نگ) و مولانا محمد صفی الرحمن صاحب (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ شکر پور) بھی مدرسہ دینیہ کے استاذ تھے۔ اس لیے شمالی بہار کے طلبہ کا اُس مدرسے میں تعلیم کا غیر معمولی شوق اور رجحان پایا جاتا تھا؛ لہذا چند لڑکوں کے ساتھ اُن کا بھی داخلہ مدرسہ دینیہ میں ہو گیا۔ درجہ عربی اول سے یہاں تعلیم شروع کی۔

مدرسہ دینیہ غازی پور میں درجہ عربی اول سے درجہ عربی پنجم تک تعلیم حاصل کی، ایک موقع پر کسی وجہ سے بعض ساتھیوں کے ہم راہ منو جا کر دارالعلوم منو میں درجہ عربی چہارم میں داخلہ لے لیا تھا؛ لیکن وہاں انھیں لُجبعی اور اطمینان میسر نہیں آ سکا۔ انھوں نے دوبارہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں داخلہ لینا چاہا؛ لیکن اب وقت گزر چکا تھا انتظامیہ نے داخلہ سے معذرت کر دی؛ لیکن قاری شبیر احمد صاحب سے مل کر جب انھوں نے صورت حال کا اظہار کیا، تو موصوف نے مہتمم عزیز الحسن صدیقی صاحب کو سمجھا بھجا کر دوبارہ مدرسہ دینیہ میں داخلہ کرا دیا۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ اور فراغت: درجہ عربی پنجم (جو مدرسہ دینیہ غازی پور میں درجہ ششم کے مساوی ہے) کی کتابیں مکمل کر لیں تو ۱۴۰۴ھ میں مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، امتحان داخلہ میں اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں درجہ عربی ہفتم سے تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۶ء میں دورہ حدیث سے فراغت ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں دارالافتا میں داخلہ لیا۔ ضابطہ کے مطابق سال بھر کی مدت اس شعبے میں انھوں نے گزاری۔ دو سال کے لیے دارالافتا میں معین الحفی کی حیثیت سے اُن کا تقرر رہا۔

عملی زندگی: اسی دوران قاری شبیر احمد صاحب کی معیت میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاضی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ مفتی نسیم صاحب کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کیا، حضرت قاضی اُن کی جانب متوجہ ہوئے اور فقہ و فتاویٰ سے متعلق اُن سے کئی سوالات کیے بعد دیگرے کیے، حضرت موصوف

نے اندازہ کر لیا کہ طالب علم باصلاحیت ہے، اگر بہتر ماحول اور مواقع مل جائیں تو آئندہ علمی ترقی کا بہت کچھ امکان ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے قاری صاحب سے فرمایا کہ جب یہ دیوبند سے اپنا کام ختم کر کے آجائے، تو انھیں امارت شرعیہ میرے پاس بھیج دیجیے۔

چنانچہ مفتی نسیمؒ ۱۹۸۹ء سے حضرت قاضی صاحبؒ کے ساتھ امارت شرعیہ میں کام کرنے لگے، اُن کی رہ نمائی میں امارت شرعیہ نیز فقہ اکیڈمی کے بعض کام اُن کے سپرد ہوئے۔ حضرت قاضی صاحبؒ کی صحبت اور بہ حیثیت مجموعی امارت کے علمی ماحول سے مرحوم مفتی نسیم کی صلاحیتوں کو خاصی جلا حاصل ہوئی، اُن کے مطالعے اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی۔ چند ہی سال بعد اُن کی تحریری و تقریری صلاحیت نے عوام و خواص کے حلقوں میں، انھیں متعارف کرا دیا۔ غازی پور میں باضابطہ عربی تعلیم کے آغاز کے ساتھ ہی تحریر و تقریر کی موصوف نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں نہایت ذوق و شوق سے مشق شروع کر دی تھی۔ زمانہ تعطیل میں جب وہ اپنے وطن آتے، تو اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر مختلف موضوعات پر چھوٹے بڑے مضامین لکھتے اور اصلاح کی غرض سے قاری شبیر احمد صاحب کو پڑھ کر سناتے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے اُن کی علمی و انتظامی صلاحیت کے پیش نظر، انھیں آل بہار ملی کونسل کا معاون سکریٹری بنادیا، اُس زمانے میں جنرل سکریٹری کے عہدہ پر ایڈوکیٹ راغب حسن صاحب فائز تھے۔ آگے چل کر موجودہ امیر شریعت سابق ناظم امارت شرعیہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے انھیں نائب ناظم امارت شرعیہ کا عہدہ سپرد کیا، انھوں نے ان ذمہ داریوں کو تادمِ آخر، نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا۔

✽ تالیفات: اپنی مختصر سی عمر میں مفتی نسیم نے چھوٹی بڑی جو کتابیں تالیف کیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

● اسلام اور نکاح ● اسلام اور طلاق ● اسلام اور وراثت

● اسلام اور زکوٰۃ ● اسلام اور عورتوں کے حقوق

✽ والد صاحب کی خدمت: اپنے والد بزرگوار ہاشم صاحب کی رحلت کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال ہی زندہ رہ سکے۔ اُن کے والد جس شخص کے یہاں ملازم تھے، تقسیم ملک کے بعد جب مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے، تو مفتی نسیم کے والد بھی اُن کے ہم راہ مشرقی پاکستان چلے گئے، پھر جب پاکستان بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اپنے سینٹھ کے ہم راہ ہاشم صاحب کو بھی کراچی منتقل ہونا پڑا۔ عمر کے آخری حصے میں وہیں فالج کا حملہ ہوا۔ مفتی صاحب کو جب اطلاع ہوئی تو کراچی پہنچ کر اپنے ساتھ والد صاحب کو پٹنہ لے آئے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، اُن کا علاج معالجہ کرایا؛ لیکن صورتِ حال روز بہ روز پیچیدہ ہوتی گئی۔ جب صحت

وشفا کی امید باقی نہیں رہی، تو انھیں اپنے آبائی وطن ”بیل پکونہ“ مظفر پور لے آئے۔ بالآخر ۲۷ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۹ جولائی ۲۰۰۱ء کو ہاشم صاحب اس دنیا سے فانی عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

✽ وفات: والد کی وفات سے جہاں انھیں غیر معمولی رنج و غم ہوا، وہیں اب خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بہ راہ راست اُن کے کندھوں پر آ پڑا۔ دوسری طرف امارتِ شریعہ کے کاموں سے دور و نزدیک کے مسلسل اسفار نے اُن کی صحت و توانائی پر خاصا ناخوش گوار اثر ڈالا۔ ذیابیطس اور امراضِ قلب سے انھیں کم عمری ہی میں سابقہ پڑا، جس کی تشخیص بروقت نہیں ہو سکی۔ بیرون ملک کے ایک طویل سفر سے جب وہ دہلی آئے، تو ڈاکٹروں نے انکشاف کیا کہ بہ یک وقت انھیں کئی امراض لاحق ہیں۔ علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، مگر ہوا وہی جو نوشتہٴ تقدیر تھا، یہاں تک کہ ۲۶ مئی ۱۴۲۳ھ مطابق ۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء کو اُن کا پیمانہٴ عمر لبریز ہو گیا اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سب سے پہلے اُن کی نماز جنازہ دہلی میں پڑھی گئی، بعد ازاں بذریعہ ہوائی جہاز اُن کی لاش کو پٹنہ لے جایا گیا، جہاں امارتِ شریعہ کے کیمپس میں امیرِ شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے دوسری بار نماز جنازہ پڑھائی، تیسری بار اُن کی نماز جنازہ مولانا قمر الزماں صاحب نے جنتا ہاٹ رام پٹی میں پڑھائی، جو مفتی نسیم مرحوم کے گاؤں سے تقریباً نصف کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ تدفین آبائی قبرستان ”بیل پکونہ“ میں ہوئی۔ (۱)



(۱) ”سوانحی نقوش“ کے سلسلے میں زیادہ تر قاری شیر احمد صاحب (مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھر وارہ ضلع درہنگہ) کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

خادمِ علم و دین

مولانا محمد تسلیم سدھولوی در بھنگوی^(*)

۱۳۲۸ھ/۱۹۳۰ء — ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء

خوگر پرواز کو، پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں، جُز سنجیدن پر کچھ نہیں

تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کی خدمت میں منہمک رہنے والے عالم، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، جامعہ رحمانی خانقاہ ”موگیڑ“ کے نائب ناظم، مدرسہ امدادیہ، در بھنگہ کے سابق ناظم اور ”مسلم پرسنل لا بورڈ“ کے رکن رکیں، مولانا ”محمد تسلیم صاحب در بھنگوی“ اپنے وطن یعنی در بھنگہ کے ایک گاؤں ”سدھولی“ میں ۲۶ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۳ مارچ ۲۰۰۳ء بروز اتوار شام چار بجے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وفات کے وقت مولانا کی عمر ۷۲ برس تھی، آپ نے اپنی ساری زندگی دین اور امت مسلمہ کی خدمت میں گزاری۔ مولانا کے سانچہ ارتحال کا علم مجھے اخبارات کے ذریعے ہوا، تو میرے اوپر بجلی گر گئی؛ کیوں کہ مولانا مرحوم سے مجھے والہانہ محبت و عقیدت تھی، اس محبت و تعلق کی وجہ سے یہ تھی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ دینی تعلیم کی خدمت اور کتاب و سنت کے سچ پر مسلمان نسل کی تربیت سازی کی راہ میں مسلسل سرگرمی کے خوگر تھے اور یہ اوصاف انھوں نے اپنے بلند پایہ، مایہ ناز استاذ، عالم باعمل، برصغیر میں ”شیخ الاسلام“ کے لقب سے مشہور حضرت مولانا سید

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی عارف عبدالرحیم لکھنوی قاسمی۔

حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سے اخذ کیے تھے۔ چند ماہ سے مولانا کی صحت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی؛ جس کی بنا پر آپ نے جنوری ۲۰۰۳ء سے جامعہ رحمانی مونگیر کی اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ علاج و معالجے کا سلسلہ برابر ”کلکتہ“ (آج کل کے ”کولکاتا“) سے رہا۔ چند ہفتوں سے اپنے وطن ”سیدھولی“ میں تھے، اُسی گاؤں میں ۲۷ محرم مطابق ۳۱ مارچ بہ روزِ دوشنبہ آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جنازہ کی نماز میں علما کی ایک بڑی جماعت کے علاوہ، گاؤں کے باشندے، آپ کے عزیز واقارب اور ملنے جُلنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

مولانا کی سیرت و صورت

مولانا محمد تسلیم صاحبؒ نے ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم اپنے معاصرین کی طرح اپنے گاؤں کے مکتب نیز پڑوسی گاؤں کے مدارس میں حاصل کی، درجاتِ ثانویہ تک مدرسہ امدادیہ درجہنگہ اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، جہاں سے ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں ضلع پورنیہ اور ضلع مدھوبنی کے مدرسوں میں مُدرّس رہے، پھر مدرسہ امدادیہ درجہنگہ میں مدرس و ذمہ دار ہو گئے۔ راقم الحروف نے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ امدادیہ میں داخلہ لیا، تو اُس وقت مولانا ہی مدرسہ کے ناظم تھے، میں نے وہاں اردو، عربی کی ابتدائی اور فارسی زبان کی بڑی کتابیں، خاص طور سے شیخ سعدی شیرازی (مصلح الدین متوفی تقریباً ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء) کی مشہور و معروف کتابیں ”گلستاں“ و ”بوستاں“ وغیرہ پڑھیں۔ مجھے مولانا کی چستی و پھرتی بہت اچھی لگتی تھی، وہ اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت، سفر و حضر میں ہر جگہ اور ہر وقت پھرتیلے نظر آتے، مولانا پان بہت استعمال کرتے تھے، جس سے اُن کے ہوٹ بیداری کی حالت

میں ہمہ وقت شوخ گلابی رنگ میں رنگے رہتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو سے مخاطب کو بہت متاثر کر لینے میں فرد تھے۔ اُن کے قالب پر عالمانہ وقار بہت سجا اور چٹا تھا۔ مولانا زندگی کے ہر کام کو اپنے وقت پر انتہائی مہارت اور پوری تن دہی کے ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ اُن کے اوپر جب بھی میری نظر پڑتی ایک شعلہ جلا کا تصوّر میرے ذہن میں ابھرتا، وہ واقعی تن دہی و جستی کی صورت لگتے تھے۔ کھادی کا سفید بے داغ لباس زیب تن فرماتے تھے، جو اُن تمام زُما کا لباس تھا جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا رمز سمجھے جاتے تھے۔ کپڑے کی اس قسم کو دست کاری کے اس طریقے سے بُنا جاتا ہے جس سے مہاتما گاندھی (م ۱۸۶۹ء - ۱۹۴۸ء) نے روشناس کرایا اور فروغ دیا تھا۔ مولانا تسلیم صاحب اُس وقت دبلے پتلے چھریرے بدن کے تھے۔ مولانا کا رنگ صاف، قد متوسط اور کچھ نکلتا ہوا، ناک ستواں، سر کے بال گھنیرے، کھوپڑی بڑی، آواز بلند تھی، گفتگو صاف ستھری کرتے تھے، شیریں زبان اور قادر الکلام تھے اور خوش گفتار مقرر بھی، حاضرین پورے انہماک کے ساتھ اُن کی تقریر سنتے تھے، اُن کی تقریر سے (جس میں سنجیدگی کے ساتھ مزاح کی آمیزش بہت ہوتی تھی) اپنے احوال کو سدھارنے اور اپنی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے حوالے سے بہت زیادہ استفادہ کرتے تھے۔ مولانا کی تقریر سادہ، آسان، پُر اثر، زندگی کے حقائق سے لبریز ہوتی تھی؛ اس لیے بہت مفید ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ننھے مَنّے طالب علم اپنی سادہ لوحی، بھولے پن، گفتگو کے اُسرار و رموز سے نابلد ہونے کے باوجود، طلبہ کے مجمع یا شہر کے اجلاس میں وقتاً فوقتاً مولانا جو تقریریں یا وعظ و نصیحت کرتے تھے، اُس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اُن کی تقریریں سن کے اٹھتے تو ہمارے دامن اُن قیمتی موتیوں سے بھرے ہوتے، جن کو مولانا نے اپنی دینی باتوں میں بکھیرا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ تدریسی اوقات کے باہر بھی ہمیشہ لکھنے پڑھنے کے کاموں، سبق یاد کرنے، اسباق کو دوہرانے، تکرار کرنے کی ذمہ داریوں سے ہم لوگ بوجھل ہوتے تھے، اُن جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، جن کے

پس مرگ زندہ
بارے میں ہمیں پہلے سے علم ہو جاتا کہ اُن میں مولانا کی تقریر ہوگی۔

مولانا سے دید و شنید

مدرسہ امدادیہ ہماری تعلیمی زندگی کا وہ پہلا اسٹیشن تھا، جہاں ہم نے گاؤں سے نکل کر قیام کیا۔ اس سے پہلے ہم گاؤں سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اس مدرسے میں داخلہ لینے سے پہلے مدرسے اور ہاسٹل کی زندگی کے طور طریقوں سے کوئی واقفیت نہ تھی، یہاں آکر پہلی مرتبہ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ جن طلبہ کے ساتھ ہم رہتے تھے، وہ نہ صرف عمر میں ایک دوسرے سے مختلف تھے؛ بلکہ طرز زندگی، معیارِ معیشت، اخلاق و کردار، عادات و اطوار اور زندگی کے مختلف معاملات کے حوالے سے، وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ ہم اپنی زندگی کے پہلے دہے میں تھے کہ یہ بات پہلی مرتبہ معلوم ہوئی اور نقش کا لہجہ ہو گئی کہ مدرسہ میں طلبہ کے لیے جماعت سے نماز پڑھنا لازمی ہے اور وہ فجر کی نماز میں شریک ہونے کے لیے صبح سویرے بیدار کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی سستی برتنے پر اُن کی پٹائی بھی ہوتی ہے۔ چوں کہ ہم لوگ اپنے وطن یعنی گاؤں ”رائے پور“ ضلع سیتا مڑھی - سابق ضلع مظفر پور - سے ”پوہری“ کے ”جنک پور روڈ“ اسٹیشن کے راستے، زندگی میں پہلی دفعہ، در بھنگہ جانے والی ٹرین میں سوار ہو کر عصر کی نماز کے وقت مدرسے پہنچے تھے؛ لہذا جب پہلی رات مدرسے میں گزاری اور صبح سویرے مولانا محمد تسلیم کی گرج دار آواز ہمارے اوپر کوڑے کی طرح پڑی، تو ہم خوف زدہ ہو گئے۔ وہ پکار رہے تھے ”اے عزیزو! نماز۔ اے عزیزو! نماز۔ صبح سویرے کے پرسکون وقت میں ہم بیدار ہونے کے عادی نہیں تھے؛ کیوں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب نیند ہم جیسے بچوں کی آنکھوں کو اس طرح چھپھکتی ہے جس طرح شفیق ماں کا ہاتھ چھپھکتا ہے۔

مولانا محمد تسلیم کی آواز ہر صبح ہمارے ہوش اُڑا دیتی تھی۔ مولانا کا یہ طرزِ عمل ہم بچوں کے نزدیک ہر اعتبار سے نہایت ”ظالمانہ“ تھا۔ ہم مدرسہ امدادیہ میں جتنے دن بھی

خادمِ علم و دین مولانا محمد تسلیم سدھولوی در بھنگوی

رہے، مولانا مرحوم کی جانب سے اس سلوک کے علاوہ کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوئی؛ اُن کے اس رویے کی وجہ سے ہم بچے دل ہی دل میں کہتے تھے: مولانا تسلیم صاحب کتنے ظالم ہیں، ہم چھوٹے بچوں کے احساسات سے کس قدر ناواقف ہیں، کاش یہ بھی بچے ہوتے، ہماری طرح سوچتے، ہماری نظر سے دنیا کی سچائیوں کو دیکھتے، پھر وہ ہمارے سکون میں اس انتہائی خوش گوار اوقات میں خلل انداز نہ ہوتے، ہم کو سوتا چھوڑ دیتے اور ہم لوگ پڑھائی شروع ہونے کے وقت سے کچھ پہلے از خود بیدار ہو جاتے۔

مولانا کے ساتھ ایک یادگار تجربہ

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ فجر، عصر اور عشا کی نماز میں امام کے سلام پھیرنے کے معابعد، مسجد سے نکل جاتے تھے اور اپنے دفتر کے پاس سے (جو کہ مسجد کے بغل میں مغربی و شمالی کونے پر مدرسے کی عمارت کے دائیں جانب جنوبی رخ پر پہلے نمبر کے کمرے میں واقع تھا) طلبہ کے رہائشی کمروں پر ایک مختص سناہ نگاہ ڈالتے تھے۔ ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ عصر کی نماز چھوڑنے کے جرم میں ہم پکڑے گئے، مولانا نے ہمارا تعاقب کیا؛ لیکن ہم اپنے کمروں سے ایک تنگ راستے کے ذریعے، مدرسے کے جنوب مشرق میں واقع مشہور ”لائٹ ہاؤس سنیما“ کو جانے والی گلی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہماری سربراہی ہمارے گاؤں ہی کا ایک طالب علم کر رہا تھا۔ یہ طالب علم، عمر میں ہم سے بڑا تھا، پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ پیدائشی طور پر لاپرواہ واقع ہوا تھا، عکس بھلائی سے اُس کو کوئی سروکار نہیں تھا، برائی میں پیش پیش رہتا تھا؛ اس وجہ سے نام کا عالم تو ہو گیا؛ لیکن علم دین اور عالم دین کی ضروری صفات سے آراستہ نہ ہونے کی وجہ سے، دین و دنیا میں وہ کوئی نام پیدا نہ کر سکا۔ جب مولانا مرحوم نے ہم کو پکڑا، تو ہم نے اُس دن اُن سے بتا دیا کہ اس نامراد طالب علم کے ایما پر، ہم نے عصر کی نماز چھوڑی تھی۔ مولانا ہمارے نام سے واقف تھے؛ کیوں کہ ہم مولانا محمد اولیس القاسمی (متوفی ۳ جمادی الاخری

۱۴۱۹ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء کے گاؤں کے تھے، وہ ہمارے قریبی رشتے دار بھی تھے اور ایک ہی حویلی میں ہم دونوں کی رہائش تھی، مولانا محمد اویس صاحب اُس وقت مدرسے کے کام یاب، نوجوان اور ذی استعداد و باصلاحیت مُدَرِّس تھے۔ چنانچہ مولانا مرحومؒ نے جوں ہی ہمارا نام پکارا، ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی اور میں نے کہا کہ لو پکڑے گئے، میں زمین پر گر پڑا، جس کی وجہ سے گھٹنا چھل گیا، گھٹنے پر کاپا جامہ پھٹ گیا۔ ناچار مولاناؒ کے پاس حاضر ہو کر معافی طلب کی۔ مولاناؒ نے پھر کبھی کوئی جماعت نہ چھوڑنے کی شرط پر معاف کر دیا۔ یہ واقعی ہماری زندگی کا تاریخی واقعہ تھا، اس کے بعد ہی ہم نماز کے پابند ہو گئے اور کسی شدید بیماری یا زبردست عذر ہی کی بنا پر، اس کے بعد کوئی نماز چھوٹی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اُن پر بارانِ رحمت نازل فرمائے۔

مولاناؒ کی راقم کو دعا اور شہادت

کسی بڑے انسان کے تذکرے میں خواہی نہ خواہی اپنا تذکرہ بھی شامل ہو ہی جاتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بر بنائے خود ستائی نہیں؛ بل کہ یہ کسی بڑے انسان کے تذکرے کا ہی ایک ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔

مدرسہ امدادیہ میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا، اس راقم نے دیکھا کہ مدرسے کے میدان میں غربی، شمالی اور جنوبی ہاشلوں سے جو راستے آتے ہیں وہ آڑے تر چھے اور ”خود رو پودوں“ جیسے ہیں، جن سے بدنمائی نکلتی ہے؛ اس لیے میں نے رسیاں خریدیں، کھر پا خرید کے لایا اور رسیوں کی مدد سے اُن سارے راستوں اور گزرگاہوں کو کھر پے سے تراشا اور اُن کے کناروں کے سبزوں اور گھاسوں کو کاٹ کر گزرگاہوں کو سیدھی اور خوب صورت بنا دیا۔ ایک روز یہ کام کرتے ہوئے مولاناؒ کی نظر میرے اوپر پڑ گئی، پوچھا یہ کام تم کیوں کر رہے ہو؟ میں ڈر گیا کہ شاید انھیں یہ برا لگ رہا ہے، پھر فرمایا: تم نے یہ بہت اچھا اور خوب صورت کام کیا ہے، اب یہ سارے راستے بہت خوش نما لگ

خادم علم و دین مولانا محمد تسلیم سہدولوی در بھگلوئی

رہے ہیں؛ لیکن تمھارے جی میں از خود کیسے یہ آیا کہ ایسا اور اس طرح کرنا چاہیے؟ میں نے کہا میں چوں کہ کسان آدمی ہوں، اپنے کھیتوں میں اس طرح سبزوں کو کاٹنے تراشنے وغیرہ کا کام کرتا رہتا ہوں؛ اس لیے اس سلسلے میں ایک ذوق سا پیدا ہو گیا ہے، شجر کاری سے قدرتی مناسبت بھی ہے؛ اس لیے میں ان گزرگاہوں کی بے ہنگمی کو دیکھ کر انھیں درست کرنے کے لیے بہت بے تاب ہو گیا، اگر حضرت والا کو میرا یہ عمل ناگوار گزرا ہو تو معاف فرمائیں۔ مولانا نے مجھے سینے سے لگا لیا اور فرمایا تمھارا یہ کام تمھاری سلیقہ مندی اور ہونہاری کا غماز ہے، ان شاء اللہ تم آئندہ زندگی میں بھی اپنی سلیقہ مندی، محنت اور لگن کی وجہ سے کام یاب اور بامراد ہو گے۔ تمھارے اس کام سے میرا جی بہت خوش ہوا، میں سوچتا تھا کہ ہفتہ عشرہ سے اس میدان کا نقشہ جو بدلتا جا رہا ہے، وہ کون بدل رہا ہے؟ اگر میں کسی مزدور سے یہ کام کراتا تو شاید اتنے سلیقے کا نہ ہوتا اور کئی سو روپے مزدوری کے صرف ہو جاتے۔

ہمارے آبائی گاؤں ”راے پور“ میں

مولانا کی آمد اور خوش گوار یادیں

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولانا علیہ الرحمہ مولانا محمد اولیس القاسمی کی دعوت پر مہمان بن کر ہمارے گاؤں آئے تھے، گاؤں والوں نے ایک یادگار دینی جلسہ کا انتظام کیا تھا، جس میں مولانا کا قیمتی بیان ہوا۔ یہ جلسہ دیر گئے رات تک ہوا، گاؤں کی جامع مسجد کے وسیع میدان میں پنڈال نصب کیا گیا۔ یہ دن ہم بچوں کے لیے لائق ذکر و ناقابل فراموش جشن کا دن تھا۔ ہم کو ایسا لگ رہا تھا کہ پورا مدرسہ امدادیہ ہمارے گاؤں میں اٹھ آیا ہے؛ اس وجہ سے کہ اس مدرسے کے زیرک ناظم و ماہر مقرر کے قدم ہمارے گاؤں میں پڑے تھے۔

مولانا محمد تسلیم مرحوم برابر ہمارے حافظے کے نہاں خانے میں جلوہ گر رہے۔ مجھے

ایسا لگ رہا ہے کہ میں اس وقت بھی انھیں دیکھ رہا ہوں اور وہ اپنی شستہ زبان میں بات کر رہے ہیں، جلسوں میں تقریر کر رہے ہیں، مدرسے میں طلبہ کو جگا رہے ہیں، اپنے دفتر میں مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں، مدرسے کے میدان میں سالانہ جلسے کا انعقاد کر رہے ہیں، مہمان علماء و بزرگانِ دین کے بغل میں تشریف فرما ہیں، مدرسے کے سالانہ جلسے کی نظامت کر رہے ہیں، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی (متوفی ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء) اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (متوفی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) اور اُن کے علاوہ دیگر حضرات کے ناموں کا تقریر کے لیے اعلان کر رہے ہیں۔

مدرسہ امدادیہ اور جامعہ خانقاہ رحمانی میں مولانا کی خدمات

میں مدرسہ امدادیہ درجہنگہ سے، دارالعلوم منوناتھ بھنجن آگیا، پھر چند سال بعد دارالعلوم دیوبند منتقل ہو گیا، رسمی فراغت کے بعد ”عالم“ بن گیا بعد ازاں میرا بھی شمار ”علماء“ میں ہونے لگا اور پھر میں مدرس بن کر علمی زندگی میں داخل ہو گیا، اس اثنا میں، مولانا کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات نہ ہو سکی، پھر اچانک یہ بات سننے میں آئی کہ مدرسہ امدادیہ کے حالات بدل گئے ہیں، مولانا محمد تسلیم جنھوں نے اُس مدرسے کی خدمت میں اپنی انتہائی محنت صرف کی تھی، ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء میں مدرسہ امدادیہ چھوڑ اپنے وطن ”سدھولی“ میں مقیم ہو گئے ہیں، پھر کئی سال بعد معلوم ہوا کہ وہ جامعہ رحمانی مونگیر منتقل ہو گئے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر اپنی آخری سانس تک تقریباً اٹھائیس سال آپ مونگیر کے اسی مدرسے میں نائب ناظم کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ مولانا کی دائمی سرگرمی، مسلسل عوامی تقریروں، دعوتی دوروں، تعلیمی اسفار (جن کی وجہ سے عوام سے اُن کے تعلقات مستحکم اور مختلف علاقوں کے لوگوں سے اُن کے رشتے مضبوط ہو گئے تھے) اور نظم و نسق کی اُن صلاحیت، خوش اخلاقی، حسنِ معاملت اور لوگوں کے

خادم علم و دین مولانا محمد تسلیم سید ہولوی در بھگلوئی

مزاج سے واقفیت نے، جامعہ کو بہت نفع پہنچایا۔

مولانا محمد تسلیم صاحبؒ اُن لائق لوگوں میں سے ایک تھے، جو حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تربیت کا ثمرہ تھے، حضرت والا ہی سے تصوف و سلوک میں بیعت ہوئے اور اُن ہی سے بیعت کرنے کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ جو کہ مولانا رحمانی کی کوشش و منصوبہ بندی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی توجہ اور فکر مندی سے وجود میں آیا تھا، آپؒ اس کے رکن اساسی بھی تھے۔

تقریروں میں مولانا کی زبان سے سنے ہوئے اشعار کی لذت

مولانا اپنی تقریروں میں اردو کے مندرجہ ذیل اشعار بہت پڑھتے تھے، جو بہار کی مقامی اردو کے زیادہ مشابہ ہیں:

مولیٰ مالی بڑا گیانی کلی کلی کل جوڑا رے

گچے پگچے کا حال نہ جانے جو چاہا سو توڑا رے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی روح قبض کرنے کے لیے، اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ یہ شخص بوڑھا ہو جائے اور اپنی تمام دنیاوی خواہشیں و آرزوئیں پوری کر لے، تب اُس کو موت دے؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ادھیڑ عمر والوں اور بوڑھے لوگوں کو موت کا مزہ چکھاتا ہے، اُسی طرح بچوں، جوانوں، حتیٰ کہ شیر خوار بچوں کو بھی موت سے دوچار کرتا ہے اور کبھی ایسا کرتا ہے کہ بوڑھے آدمی کی زندگی اتنی طویل کر دیتا ہے کہ وہ درازی عمر کی وجہ سے خط الحواس ہو جاتا ہے۔

تو عقل مند وہ شخص ہے، جس نے زندگی اور موت دونوں سے نصیحت حاصل کی، اپنی زندگی ہی میں مرنے کے بعد والی زندگی کا توشہ تیار کر لیا، جہنم سے بچ کر جنت میں داخل ہوا اور آخرت کی کامیابی حاصل کر لی۔

مولانا ان اشعار کو بھی بہت پڑھا کرتے تھے:

یہ بلڈنگ جو تم کو نظر آرہی ہے تنگم سے اپنے جو اُترا رہی ہے
ذرا ان کے گملے کے پھولوں کو سونگھو تو خونِ غریباں کی بو آرہی ہے

مولانا ان اشعار کو اپنے موثر انداز اور درد بھرے لہجے میں پڑھتے، تو ایک سماں بندھ جاتا، لوگوں پر ان اشعار کا غیر معمولی اثر ہوتا، بہت سے لوگ اُسی وقت گناہوں سے تائب ہو جاتے اور آئندہ زندگی کو، اللہ و رسول کی مرضیات کے مطابق ڈھال لینے کا عزم کر لیتے تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ مال دار و اہل ثروت کی یہ مال داری اور غرور کی مظہر بلڈنگ، جو تم کو اچھی لگ رہی ہے اور تم کو رشک میں مبتلا کیے دے رہی ہے اور تم زبانِ حال سے گویا کہ رہے ہو ”اے کاش! مجھے بھی فلاں کی طرح ثروت و مال ملا ہوتا، وہ تو بہت خوش نصیب آدمی ہے۔“ جب تم اس کے قریب جاؤ گے اور اُس طریقے کو جان لو گے، جس پر عمل پیرا ہو کر یہ حقِ ملامت مال داری حاصل ہوئی ہے اور جس کے نتیجے میں یہ پر شوکت، خوب صورت، جاذبِ نظر بلڈنگ تعمیر ہوئی ہے، تو تمہارے علم میں یہ بات بھی آجائے گی کہ درحقیقت یہ دولت اُن فقیروں اور محتاجوں کی بیگاری کا نتیجہ ہے، جنہوں نے حقیر سی ملنے والی اُجرت کے عوض اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ کتنے ہی ایسے غریب ہیں، جن کے حقوق کو پامال کیا گیا، اُن سے اُن کا حصہ چھین لیا گیا؛ (بل کہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مال داری کے پیچھے غریبوں کے حقوق کی ناقدری، محنت کشوں پر ظلم و زیادتی، مزدوروں اور محنت کشوں کی زبوں حالی، اور کم زوروں و بے بسوں کی حرماںِ نصیبی ہی ہوتی ہے) لہذا کسی پر شوکت محل، یا کسی فلک بوس عمارت پر رشک نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی رال ٹپکانے اور منہ میں پانی لانے والی کسی آسودہ زندگی کی چمک دمک پر لٹو ہونا چاہیے۔ اللہ کی رحمت ہو حضرت مولانا محمد تسلیم صاحب پر، اللہ انھیں صدیقین اور شہداء کے قریب جگہ دے اور اُن کے رشتہ داروں، گھر والوں، ملنے جلنے والوں کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مدرسہ امدادیہ کے تعلق سے مولانا کی مجاہدانہ وبے لوث قربانیاں

ہم جن دنوں کا تذکرہ کر رہے ہیں، یہ بڑے سخت دن تھے، مدرسہ امدادیہ کی مالی حالت اُن دنوں دیگر مدارس بہار کی طرح بہت خراب تھی، اس مدرسے کے عالی حوصلہ ناظم مولانا محمد تسلیم صاحب، اس قدیم مدرسے کو چلانے کے لیے (جو کہ اس ملک کے مشرقی حصے میں دارالعلوم دیوبند سمجھا جاتا تھا اور جس کے بانی الحاج منوّر علی صاحب متوفی ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی ہی کے خلیفہ تھے جنھوں نے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں یہ مدرسہ قائم کیا) عوامی امداد حاصل کرنے کے لیے، محنت شاقہ برداشت کرتے تھے، وہ اس کے لیے راتوں کو جاگتے، دن میں دوڑ دھوپ کرتے، دیہاتوں کا دورہ کرتے، اپنے کو اس کے پیچھے بڈھا کر لیتے تھے، متمول اور مال دار لوگوں سے اپنے تعلقات و اثر رسوخ اور اپنی عقل و فہم کو کام میں لاتے۔ بسا اوقات یہ تمام الجھنیں اُن کے چہرے سے رونما ہوتیں تھیں اور اُن کے چہرے پر انھیں صاف طور پڑھا جاسکتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مولانا مدرسے کے زیر کفالت پڑھنے والے طلبہ کی رہائش پر آنے والے خرچ کے بوجھ سے بچنے کے لیے، مدرسے میں تعطیل کا اعلان کر دیتے، خاص طور پر جولائی و اگست کے مہینوں میں؛ کیوں کہ ان دونوں مہینوں میں بارش اور سیلاب کا زور بہت ہوتا تھا، ان دنوں بہ طور خاص آمدنیوں میں بہت تخفیف ہو جاتی تھی؛ کیوں کہ ان مہینوں میں عوام خود اقتصادی پریشانیوں کا شکار ہوتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ برصغیر میں اسلامی مدارس اُن دنوں اپنی مالی امداد کے حوالے سے اندرون ملک عوام کے چندوں پر ہی بھروسہ کرتے تھے، بیرونی امداد کے حصول کے بارے میں کوئی سوچتا نہ تھا۔ جب کہ آج کل بہت سے مدارس بیرونی امداد کا ہی سہارا لے رہے ہیں اور کچھ مدارس تو صرف بیرونی امداد ہی سے چل رہے ہیں، خاص طور سے ”اہل حدیث“ اور دوسری جماعتوں کے قائم کردہ مدارس۔

پس مرگ زندہ

مولانا محمد تسلیمؒ اور اُن جیسے دین کے مخلص و غیور علما و صلحا کی کوششوں کی بنا پر، اسلام کا شجرہ طوبیٰ اِس ملک میں سرسبز و شاداب ہے اور اسلامی تعلیم و دعوت پھل پھول رہی ہے اور اسلام اپنی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیے جانے کے باوجود لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتا جا رہا ہے۔ مدرسہ امدادیہ میں اپنی طالب علمی کے اِس دور کے بعد مولانا سے پھر کبھی ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی؛ لیکن اُن کی شخصیت کا نقش جمیل ہمیشہ میرے خانہ تصور میں زندہ، متحرک اور گردش کرتا رہا اور خدا جانتا ہے کہ وہ کبھی میرے حافظے کے اسکرین پر دھندلا نہ ہوا اور تاحیات کبھی بھی مدھم نہ ہوگا، اِنْ شَاءَ اللہ۔

سوانحی نقوش

✽ نام: (مولانا) محمد تسلیم بن محمد مفید بن شیخ نوبت علی

✽ وطن و جاے پیدائش: موضع ”سدھولی“ Sidhauri، ضلع دربھنگہ Darbhanga، صوبہ ”بہار“

✽ تاریخ پیدائش: ۱۹۳۰ء (۱۳۴۸ھ)

✽ ابتدائی تعلیم: قاعدہ بغدادی، قرآن پاک ناظرہ، اردو پڑھنا لکھنا اور فارسی زبان ”گلستاں“ و

”بوستاں“ تک اپنے وطن ”سدھولی“ میں مولانا مقبول احمد صاحب سے پڑھی جو بہ وقت تیاری اِس کتاب برائے طباعت ماہ صفر ۱۳۳۱ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۹ء و جنوری ۲۰۱۰ء لاہر یا سرے (دربھنگہ) کی جامع مسجد کے

امام و خطیب مولانا قاری ابرار احمد قاسمی سدھولوی دربھنگوی کے والد بزرگوار تھے۔

✽ متوسط تعلیم: عربی اول سے عربی چہارم تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں تعلیم حاصل کی۔

✽ ثانوی تعلیم: عربی پنجم و عربی ششم درجات کی تعلیم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں حاصل

کی۔ وہیں تقریر کی طرف راغب ہوئے اور اُس کی مشق ذاتی شوق سے جی جان سے کی۔ وہ فرماتے تھے کہ

مدرسہ شاہی کی طالب علمی کے زمانے میں، میں کمرہ بند کر کے تقریر کی مشق کرتا تھا۔

✽ اعلیٰ تعلیم: موقوف علیہ اور دورہ حدیث شریف دارالعلوم دیوبند میں کیا اور ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں

وہاں سے فارغ ہوئے۔

خادم علم ودین مولانا محمد تسلیم سدھولوی درہنگویؒ

✽ تدریسی خدمات: تعلیم کے بعد آپ نے تدریس کا آغاز ضلع ”پورنیہ“ صوبہ ”بہار“ کے ایک مدرسے کیا جہاں چند ماہ آپ نے تدریسی خدمت انجام دی، اُس کے بعد مدرسہ ”فلاح المسلمین“ ”راگھوپور“ ضلع ”مدھوبنی“ میں درس و تدریس کی ذمہ داری بہ حسن و خوبی انجام دی۔

✽ نظامت مدرسہ امدادیہ درہنگہ: ۱۹۶۰ء میں مدرسہ امدادیہ کے عظیم دیرینہ خادم اور اُس کے ناظم حضرت مولانا عبدالرحیم درہنگوی (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۸ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) کی ۶ صفر ۱۳۸۰ھ مطابق ۳ جولائی ۱۹۶۰ء کو وفات کے بعد، اُن کی وصیت کے مطابق ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء میں مولانا محمد تسلیم صاحب کو مدرسہ امدادیہ کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، پھر چھ ماہ بعد ناظم اعلیٰ چنا گیا، اُس وقت سے ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) تک وہ بڑی شان و شوکت اور تندہی سے اس فریضے کو انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) سے ۴ سال تک اپنے وطن ”سدھولی“ میں مختلف اجتماعی و ملی و دعوتی امور انجام دیتے رہے۔

✽ نظامت خانقاہ رحمانی مونگیر: ۱۹۷۶ء (۱۳۹۶ھ) میں حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) نے انھیں اپنے فیضان بخش مدرسے جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کے نائب ناظم کے عہدے پر سرفراز فرمایا، جس پر وہ تاحیات فائز رہے۔

✽ وفات: مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۴ ماہ کی عمر کے جان لیوا مرض میں مبتلا رہ کر بالآخر بروز اتوار ۴ بجے شام ۲۶ محرم ۱۴۲۴ھ مطابق ۳ مارچ ۲۰۰۳ء کو اپنے وطن ”سدھولی“ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، تدفین ”سدھولی“ ہی میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے بغل میں ذاتی قبرستان میں عمل میں آئی۔ (۱) (*)



- (۱) سوانحی نقوش کے سلسلے میں بڑی حد تک مولانا مرحوم کی ہمیشہ کے داماد مولانا قاری ابرار احمد سدھولوی درہنگوی امام و خطیب جامع مسجد لہیا سرائے درہنگہ کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔
- (*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۴، جلد ۲۷، ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ = جون ۲۰۰۳ء۔

منفرد ادیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمی

۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء — ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

یہ آدمیوں کی بھیڑ اور ایسا سناٹا
کہ دور دور کوئی آدمی نہیں پیارے!

تقریباً ایک ماہ تک موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہ کر، بالآخر برادر محترم مولانا محمد رضوان القاسمیؒ دوشنبہ ۲۵ شعبان ۱۴۲۵ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو سہ پہر تقریباً ڈھائی بجے، اس دار فانی سے دار بقا کو کوچ کر گئے۔ تقریباً ایک ماہ قبل انھیں برین (مہر تن) ہو گیا تھا، جس کے بعد شہر حیدر آباد کے بہت اچھے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ہر طرح کی تدبیر و چارہ سازی اور فکر مندی سے کام لیا گیا؛ لیکن وقت موعود آ گیا تھا؛ اس لیے علاج معالجے کی سعی بے پناہ کے باوجود، وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ اُن پر اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا تھا؛ لیکن اب کی بار وہ شروع سے ہی ایسے بے ہوش رہے کہ سارے اہل تعلق کو اُن کی دوبارہ صحت یابی کے حوالے سے، شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا اور اُن کی وفات کی خبر سننے کے لیے، وہ بادل نا خواستہ دہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے، وہ شکر کے موزی مرض میں مبتلا تھے اور اُس کے بڑھتے ہوئے عوارض کا شکار ہو گئے تھے؛ لیکن طالب علمانہ زندگی سے انھیں علمی، دعوتی اور تعلیمی ولی کاموں کا ایسا چمکا پڑ گیا تھا کہ صحت، وقت اور ملت کے حوالے سے اپنی زندگی کے گراں مایہ ہونے کے احساس کے ہر دباؤ سے وہ لاپرواہ ہو کر، آخر تک سرگرم

سفر رہے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جو مجبوراً رہنے کو ہی، ہر بیماری کا علاج اور صحت کے حوالے سے، ہر خطرے کی تدبیر سمجھا کرتے ہیں۔

خلقِ خدا کے لیے افادیت کے بہ قدر ہی لوگ جانے والوں کو رویا کرتے ہیں

دنیا میں ہر ایک اسی لیے آیا ہے کہ اُسے جانا ہے، اُس کا آنا ہی اُس کے جانے کی دلیل ہے، روز ہزاروں آدمی آتے اور ہزاروں آدمی جاتے ہیں۔ آنے جانے کا یہ سلسلہ ایسا معمول سا ہو گیا ہے کہ لوگ اس پر کچھ زیادہ توجُّہ نہیں دیتے؛ اسی لیے سید التابیین حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے: ”مَا رَأَيْتُ حَقًّا أَشْبَهَ بِنَاطِلٍ مِّنَ الْمَوْتِ“ یعنی موت سے زیادہ کسی سچائی کو میں نے جھوٹ سے رلا ملا نہیں پایا۔ واقعی یہ واحد ایسی زبردست حقیقت ہے جس کو لوگ افسانہ سمجھا کرتے ہیں، جب کہ وہ کسی کو بھی کسی بھی وقت، آدبوچتی ہے اور ساری تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔

لیکن اس کائنات میں خلقِ خدا کے لیے جو جتنا مفید ہوتا ہے، اس دنیا سے جاتے وقت لوگ اُس کو اُسی قدر رویا کرتے ہیں۔ مولانا محمد رضوان القاسمیؒ بھی اُنھی خوش نصیب لوگوں میں تھے، جنہوں نے جیتے جی اپنی علمی صلاحیت، فکری و دعوتی لیاقت، تعلیمی و ملی سوچ کے ذریعے، اُمت اور مِلّت کو بھرپور طور پر فائدہ پہنچانے کی کوشش کی اور اُمت کے اُن گنت عظیم لوگوں کی فہرست میں اپنا نام خوب صورت حروف میں درج کرایا؛ اسی لیے آج ہم اُن کو رو رہے ہیں اور اُن کے فراق پر ہمارے دل پارہ پارہ ہو رہے ہیں؛ ورنہ باقی تو وہ ہماری ہی طرح کے انسان تھے، کھاتے پیتے تھے، سوتے اور جاگتے تھے، حوارج بشریہ کو پوری کرنے کے لیے مجبور و مضطر تھے، ہماری ہی طرح خاک کے بنے ہوئے تھے اور ہماری ہی طرح اسی خاک پر چلتے پھرتے تھے؛ لیکن جو چیز انھیں ہم سے ممتاز کرتی تھی وہ اُن کی علمی و فکری لیاقت اور اُن کے دعوتی و ثقافتی اور تربیتی نقوش ہیں، جو اُن کے

منفرد ادیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

بعد بھی اِنْ شاء اللہ اُجاگر اور شوخ رہیں گے اور ہمیں اُن کے لیے دعا گو رہنے اور اُن کی یاد میں رطب اللسان رہنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔

منفرد و نیر تاباں

اُن کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی، یعنی وہ ۱۹۴۴ء میں مولود ہوئے تھے؛ اِس لیے وہ مجھ سے تقریباً ۹ سال بڑے تھے؛ کیوں کہ اِس راقم کا سنہ پیدائش ۱۹۵۲ء ہے۔ اُنھوں نے اِسی کم عمری میں ملّی اور تعلیمی و دعوتی میدانوں میں، اپنی صلاحیت، ہنرمندی اور خلُق حسن کی وجہ سے، اپنی عظمت و انفرادیت کا لوہا منوالیا تھا۔ تقریر، تحریر، انتظام و انصرام اور ملت کے زخموں کی مرہم سازی و مرہم نہادگی کے جامع تر عمل کا کون سا پہلو ہے، جس میں اُنھوں نے لیاقت کے ساتھ بڑھ چڑھ کے حصہ نہیں لیا؟ ہندوستان کے کئی مُعتمَد تعلیمی و ملّی اداروں کے بانی یا تاسیسی رکن تھے۔ فقیہ عصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (متوفی ۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ = ۵ اپریل ۲۰۰۲ء) کی قائم کردہ ملّی کونسل اور فقہ اکیڈمی تو خصوصی طور پر اُن کے مشورے اور فکری منصوبہ بندی سے معرض وجود میں آئی تھی؛ چنانچہ وہ از اوّل تا آخر اُن دونوں میں فعال کردار ادا کرتے رہے؛ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے منصوبہ ساز اور اُس کی بنیادگزاری کے اصل محرّک تو امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء - ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) تھے، جو دیگر مُعتمَد علماے باوقار (بالخصوص مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ) کی طرح اُن کے بھی شروع سے روحانی و علمی سرپرست اور اُن کی محبت و عقیدت کا اصل سرچشمہ تھے؛ اِس لیے طبعی طور پر وہ شروع سے بورڈ کے اولیں قافلے میں شامل رہے اور ملت کا مخلص اور فعال ادارہ امارت شرعیہ بہار واڑیہ و جھارکھنڈ تو شروع سے ہی اُن کے فکر و عمل کا محور رہا تھا اور دم آخر تک اُنھوں نے اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا، جو مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور مولانا سید نظام الدین مدظلہ کے حقیقی ساختہ

و پرداختہ اور حُب و مُعْتَد اور اُن کے خاندانِ علم و فکر کے سچے خادم اور ہنرمند فرد کو کرنا چاہیے، اسی کے ساتھ ملی خدمات کی ہمہ گیری اور تعلیمی و تربیتی عمل کی جامعیت و توازن کی وجہ سے مرحوم ہندوستان کے تقریباً سبھی قابل ذکر و لائق ستائش اسلامی مکاتب فکر کی نظروں میں مقبول ہو گئے تھے؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی تنظیم اہلِ اہلِ قدیم نے انھیں نائب صدر کا عہدہ سپرد کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے انھیں اپنی مجلس عاملہ کا رکن نام زد کیا اور حیدر آباد اور آندھرا پردیش کے علمی اُفق پر تو وہ اس طرح منفرد انداز میں چمکے کہ کہنا چاہیے کہ اُن کے حینِ حیات سارے ملی اور علمی و دعوتی ستاروں کی روشنی اُن کے منفرد تیر تاباں کے سامنے واقعی ماند تھی۔

اپنے مُوَازِن مگر جامع فکر اور عصری شعور و آگہی کے بھرپور جذبے کو تسکین دینے اور اپنے اچھوتے اندازِ نظر کے تراشیدہ نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے، انھوں نے شہرِ حیدر آباد میں ”دارالعلوم سبیل السلام“ کے نام سے ایک ہمہ گیر ادارے کی بنیاد ڈالی اور اپنی جاں کا ہی، بے لوث محنت اور انتظام و انصرام کی خداداد اعلیٰ قابلیت اور سب سے بڑھ کر اپنے یقینِ محکم، عملِ پیہم اور فاتحِ عالم محبت کی وجہ سے چند سالوں میں، اُس کو ملک کی بہت سی دیرینہ اسلامی درس گاہوں کے لیے قابلِ رشک اور لائقِ تقلید بنا دیا۔ یہاں انھوں نے نہ صرف دینی مدرسوں میں مُرُوجِ نصابِ تعلیم میں عصری حسن کی قلم لگانے کے ساتھ ساتھ، سارے علوم و فنون کی تدریس کا انتظام کیا؛ بل کہ سیرتِ نبوی پر تحقیق و جستجو کے لیے ایسا نظام برپا کیا، جس کی نظیر ملک کے کسی مدرسے میں نہیں پائی جاتی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مُعْتَدِ اسلامی موضوعات پر اختصاص کا شعبہ بھی قائم کیا، نیز انھوں نے قدیم و جدید موضوعات پر، بیرونِ ملک و اندرونِ ملک چھپی ہوئی اچھی سے اچھی کتابوں پر مشتمل کامل و کارآمد کتب خانے کی تعمیر کی، جس کے لیے اپنے شوق اور مزاج و مذاق کی مدد سے مطالعہ و تحقیق کا جو نظام کار وضع کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ دراصل کتاب کے عاشق تھے اور کتب خانے سے اُن کا اُنس طبعی تھا، ہر انسان کی ”ممتاز خواہش“ ہوتی ہے، غالباً مولانا

محمد رضوان القاسمیؒ کی ممتاز خواہش، کتاب کی چاہت تھی۔ کتاب کے حسنِ ظاہر و باطن پر، وہ پڑھنے کے زمانے میں بھی رتجھ جایا کرتے تھے۔

نسبتاً کم عمری ہی میں عزت و شہرت سے بہرہ وری

مولانا مرحوم نے نسبتاً کم عمری ہی میں جو علمی مقام اور دعوتی و فکری میدان میں عزت و شہرت حاصل کر لی، وہ دنیا میں اُنھی کی طرح کے گئے چُنے خوش نصیبوں ہی کے حصّے میں آیا کرتی ہے، جو علم و فضل کے ساتھ نرم خوئی، شرافت و مروت، ملیّی اور اجتماعی کاموں کے رسیا اور اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے ہمہ وقت اور ہمہ حال اُسی طرح دل چسپی لیتے ہیں، جس طرح اُنھوں نے لی کہ حقیقت پسندانہ اسلامی شعور، کھلے ہوئے قلب و ذہن، عصری تقاضے سے آگہی اور حالاتِ حاضرہ کی بصیرت اور اسلام کو درپیش چیلنجوں کے ادراک اور سب سے بڑھ کر اسلام کی صحیح سمجھ سے اللہ نے اُنھیں بھرپور طور پر نوازا تھا۔ اُنھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کو دیکھا تھا، عالمِ عربی و عالمِ اسلامی کے اکثر ملکوں کا بار بار سفر کیا تھا، مسلمانوں کے مسائل کو، اُن کا عملی حل ڈھونڈنے کے ذریعے، صحیح دائرے میں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے مسائل اور پریشانیوں سے نمٹنے کی بات، وہ صرف شکوہ سنجی کے لیے نہیں کرتے تھے، جیسا عام طور پر علما و دانش ور اور مسلم اہل قلم کیا کرتے ہیں؛ اسی لیے اُنھوں نے اس حوالے سے کام کی نئی نئی کار آمد اور ٹھوس جہتیں تلاش کر لیں، جن کے ذریعے، اُنھوں نے وہ کچھ کیا، جو دیگر معاصرین نہیں کر سکے۔ ملیّی و دینی اُمور کو بہ روئے کار لانے کے لیے، اندرونِ ملک بھی اطراف و اکناف کا وہ پیہم سفر کرتے رہتے تھے، بہار، یوپی، دہلی اور حیدرآباد، تو گویا اُن کے لیے گھر آنگن بن گئے تھے۔ وہ دینی کاموں میں نہ صرف شرکت کرتے؛ بل کہ اُن میں انتظامی اور اخلاقی طور پر ذخیل و شریک رہتے، جلسوں اور سیمیناروں میں تقریریں کرتے اور اُن کی شرکت سے اُن میں نئی جان پڑتی، اسلامی تقریبات کی اکثر شکلوں کی سچ دھج

پس مرگ زندہ

میں اُن کا حصہ ہوتا، اہم اسلامی شخصیات سے بار بار ملتے، علم و فکر اور دعوت و تبلیغ کے میدان کے شہ سواروں سے بار بار مشورہ کرتے، اس سلسلے میں نہ وہ مرض کی پرواہ کرتے، نہ شخصی اُکھنوں کو خاطر میں لاتے؛ بل کہ اُن کے پیش نظر، اول و آخر صرف اسلام و مسلمان اور اُن کے مسائل و مشکلات ہوتے اور بس۔

سلیس، بلیغ اور خوب صورت قلم کے دھنی

وہ اردو میں انتہائی سلیس، بلیغ اور خوب صورت قلم کے مالک تھے، عام اسلامی موضوعات پر عموماً اور گرم مسائل پر خصوصاً، اُن کا قلم ہمیشہ گہر بارہتا۔ اُن کے قارئین اُن کی تحریروں کے حوالے سے سراپا انتظار رہتے۔ حیدرآباد کے اخبارات و رسائل اُن کی نگارشات سے تو مزمین ہوتے ہی، ملک کے دیگر علاقوں کے اسلامی رسائل بھی، اہمیت کے ساتھ اُن کی تحریریں چھاپتے، اُن کی ہر تحریر شرینی، اعلیٰ ادبی مذاق، لسانی صنعت، طبعی ظرافت، زبان کی پختگی، مطالعے کی وسعت، تاریخ عروج و زوال اُمم و ملل کی نتیجہ خیز معرفت، زندگی کے گونا گوں تجربات، کتاب و سنت کے نصوص کی فراست پر مبنی سمجھ اور اسلام کے مختلف ادوار میں اسلامی موضوعات پر تالیف کردہ علمائے کبار و حکمائے اسلام کی گراں بہا کتابوں کی بصیرت مندانہ ورق گردانی؛ پر مبنی ہوتی تھی۔ اُن کی بہت سی تحریریں خوب صورت، جاذبِ نظر اور دل رُبا کتابوں کی شکل میں بازار میں آچکی ہیں اور اہل نظر اور صاحب ذوق قارئین سے ظاہر و باطن کی خوبیوں میں امتیاز کے حوالے سے، خوب خوب دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں جن کی وجہ سے علم و ادب دونوں کے جوہریوں سے اُنھوں نے دعا و آفریں کی سوغات پائی۔ بعض دفعہ آدمی قلم و زبان کا تو اچھا ہوتا ہے؛ لیکن طباعت کے جمال، کتاب کی ظاہری نزاکت اور اشاعتی عمل کی حسن کاری کے حوالے سے کوئی مذاق نہیں رکھتا۔ مولانا محمد رضوان القاسمی اپنی نستعلیق شخصیت، متمیز سرایا، حسن

اخلاق میں ڈھلی ہوئی سیرت کی طرح کتابوں کے ظاہر و باطن کے حوالے سے بھی اعلیٰ پایے کے جمال پسند واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاں سے شائع کردہ، جتنی کتابیں میرے پاس بھجوائیں، میں ان کے باطن میں صرف اسی لیے نہیں جھانک سکا کہ ان کے ظاہر کی غیر معمولی جاذبیت نے مجھے محو حیرت رکھا۔

ممتاز فاضل دارالعلوم

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ برصغیر کے ائمہ المدارس: دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے چند ممتاز فضلاء میں تھے۔ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی تحریر و تقریر میں بال و پر نکالنے لگے تھے۔ اپنی محنت، پڑھائی لکھائی میں ہمہ تن مصروفیت، لایعنی باتوں سے بالکل تہ احتراز، سنجیدگی و متانت اور اچھے طالب علم کے واقعی اوصاف کا حامل ہونے کی وجہ سے، ایک مثالی طالب علم تھے۔ مجھے یاد ہے طلبہ، جن چند طلبہ کو پورے دارالعلوم میں اہمیت دیتے تھے، ان میں سے ایک مولانا محمد رضوان القاسمیؒ بھی تھے، چھریرے بدن، لمبے قد، کشادہ پیشانی، کشادگی مائل آنکھیں، تبسم ریز چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لفظی صنعت کی مہارت، بات میں بات پیدا کرنے میں امتیاز، الفاظ کی خوبیوں کا پرکھ رکھنے میں یکتائی، حسن تحریر اور حسن خط کی جامعیت، دل کی گدازی، آنکھ کی حیا، مروت کی فراوانی اور انسیت و محبت سے بنی ہوئی شخصیت کے حامل ایک طالب علم کو، میں دارالعلوم میں معراج گیٹ سے آتے اور دارالعلوم سے معراج گیٹ سے جاتے اور دار جدید کے فوقانی دو کمروں ۳۰ اور ۳۱ کا طواف کرتے ہوئے ہر روز دیکھتا تھا۔ اول الذکر میں راقم الحروف نور عالم اور اس کے ہم قریب و ہم ضلع و ہم صوبہ کئی طلبہ رہتے تھے اور ثانی الذکر، قاری شبیر احمد در بھنگوی، دستگیر احمد در بھنگوی، مولوی بلال در بھنگوی اور مولوی بدر الحسن در بھنگوی کا مسکن تھا۔ آہ! وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ نوجوان ہماری آنکھوں کے سامنے دارالعلوم کی ان گزرگاہوں، ان گیلیوں اور ان

برآمدوں میں آتا جاتا نظر آتا تھا، آج ۶۰ سال کا اُدھیر عمر ہو کر اپنے رب سے بھی جا ملا۔
 رہے نام اللہ کا۔ یہ طالب علم دارالعلوم میں طلبہ کی نگاہوں میں تو محبوب تھا ہی، جب
 دارالعلوم سے نکلا تو حیدر آباد کے عابد روڈ کی مسجد عامرہ کے امام و خطیب کی حیثیت سے
 اس شہر میں وارد ہوا، جہاں وہ نماز جمعہ سے قبل اردو میں ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے ہر جمعہ کو
 تقریر کا پابند تھا۔ اپنی دھلی ہوئی زبان، حسنِ اخلاق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت،
 اپنی وضو داری، شرافت، ظرفیت، مروت، انوکھی نکتہ سنجی، حالات و واقعات سے نتائج
 اخذ کرنے کی صلاحیت، لفظ و معنی کی عجیب سی ہم آہنگی و رعایت اور اپنی تقریر کے از دل
 ریزہ، بردل خیزد ہونے کی وجہ سے، دیکھتے دیکھتے اسلامی تہذیب و ثقافت کے اُس
 دیرینہ و منفرد پایہ تخت کا فاتح بن گیا؛ کیوں کہ اُس کی شہرت عابد روڈ کے علاقے سے تجاوز
 کر کے، سارے شہر میں پہنچ کر دلوں میں اُس کے لیے گھر بنا چکی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ
 عالموں سے بھرے پُرے خطہ آندھرا پردیش کے دو تین ممتاز عالموں میں سے ایک بن
 گیا، اُس کے دوستوں، بہی خواہوں اور اُس پر جان و دل نثار کرنے والوں کا حلقہ، بڑا اور
 انتہائی کارآمد بن گیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے تحریر کا جادو جو جگایا، تو نہ صرف وہاں کے علما کی
 صف میں؛ بل کہ ملک کے سارے علما کے درمیان ”ممتاز اسلامی اہل قلم“ کا بہ جا طور پر
 لقب پانے کا ہر طرح مستحق بن گیا۔ اور اب وہ بہ حیثیت مجموعی ایسا بن گیا کہ حیدر آباد کی
 خصوصاً اور ملک کی عموماً کوئی ثقافتی مجلس، اسلامی ادارہ، دینی تقریب، دعوتی جلسہ، اُس
 سے بالکل یہ صرف نظر کر کے اپنی نامُعتبریت پر مہر لگوانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ حال
 آں کہ وہ حیدر آباد میں اجنبی اور نو وارد بن کر آیا تھا۔ وہ بہار کے غیر منقسم درہنگہ سے تعلق
 رکھتا تھا؛ لیکن فضل و کمال کسی ایک خطے یا ملک کے لوگوں کی جا گیر نہیں ہوتی، علم و ہنر اور
 شرافت و لیاقت کے موتیوں کو جو بھی سلیقے سے رولنا جانتا ہو، لوگ اُس کے گرویدہ ہو جاتے
 ہیں۔ میں نے برصغیر کے دورِ آخر کے خاتم الخطبہ والو اعظین حکیم الاسلام حضرت مولانا
 قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء-۱۴۰۳/۱۹۸۳ء) سے اُن کی نکتہ

ریز تقریروں میں ایک سے زائد بار سنا کہ جمال، کمال اور مال والا آدمی کبھی بھی ”یوسف بے کارواں“ نہیں رہتا۔ اُن میں سے کسی کا حامل انسان، جہاں جاتا ہے مقبول و محبوب رہتا ہے، کسی جگہ وہ اہمیت اور ناقدری کا شکار نہیں ہوتا، اُس کے لیے ہر فصل، فصلِ گل اور ہر زمین، زرخیز اور ہر خطے کا انسان، جو دو سخا کا نمونہ بن جاتا ہے۔

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ، اپنے سارے ملنے جلنے والوں میں محبوب تھے، اُن کے کسی ہم نشین کو، کبھی بھی اُن کے بے مزہ ہونے کا شکوہ نہیں کرنا پڑا، چہ جائے کہ ”بے فائدہ“ ہونے کا؛ کیوں کہ وہ صرف دینی، علمی، ادبی اور فکری شخصیت کے ہی حامل نہ تھے؛ بل کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہونے کے ساتھ ساتھ، انتہائی سادہ، ظاہر و باطن میں یکسانیت کے حامل اور خود پسندی و غرورِ نفس سے بالکل مُبرا تھے، حال آں کہ خود پسندی و غرورِ نفس، وہ بیماری ہے، جس سے آج کل کے علما کا مُبرا ہونا خارج از امکان سمجھا جاتا ہے۔ یہ اُن کی ممتاز صفت تھی کہ اُن کی عزّت و شہرت میں جس درجہ اضافہ ہوتا گیا، اُن کی کُسر سی، سادگی اور متوّعِ اسلامی عمل میں اُن کی شراکت بڑھتی گئی۔ مسکراہٹ، بذلہ سخی، لفظی صنعت اور ضلع جگت میں مہارت کے ساتھ، روح کی پاکیزگی، قلب کی شفافیت، نفس کی عفت اور اپنے سارے متعارفین کے لیے مخلصانہ محبت، اُن کی شخصیت کے لیے شانِ امتیاز تھی۔

میرا اُن کا دیرینہ تعلق

میں انھیں، مدرسہ امدادیہ درجنگہ کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہاں درجہ ششم اردو میں، یہ اقمِ گلستاں، بوستاں وغیرہ کے درجے میں داخل ہوا، تو مولانا محمد رضوان القاسمیؒ وہاں مہوِ سطّات کے طالبِ علم تھے۔ مدرسے کے مُعتمِد استاذِ برادرِ معظم مولانا محمد اویس القاسمیؒ (متوفی جمعہ ۳ جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء) بن شیخ محمد حبیب رائے پوری (ضلع سیٹا مڑھی، سابق مظفر پور) سے اُن کا چوں کہ فردِ خاندان جیسا تعلق

پس مرگ زندہ

تھا؛ اس لیے اُسی زمانے میں، ہم لوگوں سے بھی اُسی طرح کا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ پھر میں اور میرے چند ساتھی مونا تھ بھجن کے بابرکت مدرسے دارالعلوم مونا میں کئی سال زیر تعلیم رہ کر، جب ۱۹۶۷ء (۱۳۸۶ھ) میں دارالعلوم دیوبند آئے، تو مولانا محمد رضوان، دارالعلوم سے فارغ ہو کر، اُسی کے ایک شعبے ”مطالعہ قرآنیہ“ میں (سال ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء) داخل تھے۔ یہ شعبہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں قائم ہوا تھا اور حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ العالی، اُس کے نگراں و سرپرست تھے، مولانا نے اُس شعبے کے نصاب کے مطابق، مفتی صاحب مدظلہ کی نگرانی میں کما حقہ محنت کی اور قرآنی علوم کے اہم موضوع ”قرآن کا عطا کردہ نظام حیات“ پر، اُنھوں نے ایک ضخیم رسالہ تیار کیا۔ مجھے اکثر وہ اپنے ہاتھ یا بغل میں معتد بہ مقدار میں لائق تحریر و تسوید سفید عمدہ کاغذ سے بھرا خوب صورت فائل لیے ہوئے، کبھی کتب خانہ دارالعلوم میں، کبھی مفتی صاحب کے کمرے پر اور کبھی ہم لوگوں کے کمروں کے پاس سے گزرتے ہوئے، یا ہم لوگوں سے مل کر اپنی مسجد کی اور جاتے ہوئے، یا وہاں سے آتے ہوئے نظر آتے۔ اس راقم کا اُس وقت خط، الحمد للہ بہت پاکیزہ تھا اب تو زود نویسی اور کثرت سے لکھنے کی وجہ سے، نیز شکر کی بیماری کے عوارض سے انگلیوں کے متاثر ہو جانے کے سبب، وہ بات باقی نہیں رہی۔ مولانا محمد رضوانؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اُس موقع سے، میرے داخل ہو جانے کو غنیمت جانا؛ کیوں کہ اُس وقت نہ تو ٹائپ رائٹر کی فراوانی تھی اور نہ کمپیوٹر کا چلن تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے اپنی سابقہ معرفت اور تعلق کی وجہ سے مجھ سے فائدہ اٹھانے کی سوچی۔ وہ اکثر میرے کمرے، میری درس گاہ، یا دارالعلوم میں میرے موجود رہنے کی جگہوں کا چکر لگاتے اور چھوٹے بھائی پر شفقت آمیز دباؤ اور ترغیب کے ذریعے، اپنے مسودے کی تمییز کے لیے آ پکڑتے۔ وہ مجھے اکثر بھانکے روڈ پر واقع مسجد میں (جس میں وہ امامت کرتے تھے) ساتھ لے جاتے یا فرصت کے اوقات میں آ جانے کی، تاکید و دعوت دے کے چلے جاتے۔ میں نے اُن گنت راتیں اور دن کے فرصت کے

اوقات اُن کے ساتھ، اُن کی مسجد میں گزارے، وہ راتوں کو میرے ساتھ جاگتے، چائے تیار کر کے لاتے اور مسودے کی چستی سے تہیض کے لیے، میرے ذہن اور ہاتھ کو تیار کرتے۔ وہ حیدرآباد سے درآمد کردہ ”لمسا“ چائے بھی بہت پلاتے، گو مجھے اُس سے دلچسپی نہیں ہو پائی؛ کیوں کہ میں ہمیشہ دارجلنگ کی لیٹن گرین لیبل چائے کا عاشق رہا۔ اُس وقت مولانا محمد رضوان، حیدرآبادی ”لمسا“ چائے، بہت شوق سے استعمال کرتے تھے۔ غالباً قدرت کی طرف سے یہ اشارہ تھا کہ ایک دن، انھیں حیدرآبادی ہی ہو جانا اور اُسی کی خاک کا ہمیشہ کے لیے پیوند بن جانا ہے۔

مولانا رضوانؒ سے، مدرسہ امدادیہ کے زمانے کا جو تعلق تھا، وہ اب زیادہ گہرا، پایدار اور اُن مٹ ہو گیا، اب ہم دونوں نے اس تقریب سے ایک دوسرے کو زیادہ قریب سے دیکھا، سمجھا، برتا اور ایک دوسرے کے دل میں آہستہ آہستہ، اس طرح پیوست ہو گئے کہ دونوں کو قلبی طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہا۔ یاد پڑتا ہے کہ بعض دفعہ میں اُن کے علمی کام میں، اُن کا تعاون کرنے سے اُسی طرح دریغ کرتا، جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے کاموں سے بعض دفعہ ناز اور اعتماد کی وجہ سے کرتا ہے، تو وہ طرح طرح سے مناتے اور میری ”سرتابی“ و ”سرکشی“ پر قابو پانے کی کوشش کرتے۔ اُن کی مذکورہ مسجد کے کمرے میں، رافم نے اُن گنت مرتبہ عمدہ، لذیذ اور محبت کی گھنیری چھاؤں میں ناشتہ کیا، جس کی لذت اب تک یاد ہے۔ اُس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں اچھے اچھے کھانے کھائے، بڑی بڑی شاہی، امیری اور کانفرنسوں کے ذیل میں کی جانے والی دعوتوں میں شرکت کی، سیکڑوں اقسام کے ایسے ایسے کھانے دیکھے اور چکھے، جن کی یقیناً میرے پُرکھوں کو بھی ہوا نہ لگی ہوگی؛ لیکن مولانا رضوانؒ کے اپنے ہاتھ سے تیار کردہ ناشتہ کی بے مثال لذت، اب تک یاد ہے، اُس کی مثال کہیں نہ مل سکی۔ اُسی کمرے میں انھوں نے کئی مرتبہ ہند کے مایہ ناز عبقری و جری عالم دین، امیر شریعت و محرمک تاسیس و سرکری جنرل آل انڈیا

پس مرگ زندہ

مسلم پرسنل لا بورڈ: مولانا سید منت اللہ رحمانی (متوفی درمیانی شب ۲-۳ رمضان ۱۴۱۵ھ = ۱۹-۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء) اور متعدد اَرکانِ شوریٰ دارالعلوم کی دعوت کی۔ میں جب تک دیوبند میں رہا، مولانا محمد رضوانؒ بڑے اور شفیق بھائی کی طرح ہم لوگوں کے نہ صرف بھائی اور دوست رہے؛ بل کہ نگران و سرپرست بھی رہے۔

مہمان نوازی میں طاق

مولانا محمد رضوانؒ بڑے مہمان نواز بھی تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ مہمان نواز ہی پیدا ہوئے تھے، انھیں اللہ پاک نے وہ ساری خوبیاں دی تھیں، جن کا حامل آدمی ہی سچا مہمان نواز ہو سکتا ہے۔ یعنی سیرچشمی، کشادہ نفسی، نرم خوئی، نستعلیقیت، سلیقہ مندی، رواداری، ایثار، بردباری، نرم روی، ٹھہراؤ، سنجیدگی اور اپنے سے زیادہ دوسروں کو گوارا کرنے کا بے تحاشا جذبہ۔ مذکورہ مسجد کے اُن کے کمرے ہی میں، میں نے پہلی مرتبہ اُن کی نشست گاہ کے سامنے کی بڑی الماری میں مَنَوِّعِ اسلامی موضوعات پر اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں دیکھی۔ وہ نئی نئی، عمدہ اور اچھی سے اچھی کتابوں کے حصول کے رسیا تھے۔ اُن کی الماری کی ہر کتاب نہ صرف مفید اور علمی طور پر گراں قدر ہوتی؛ بل کہ ساری کتابیں، حسنِ طباعت، حسنِ تجلید، ٹائٹل کی دیدہ زیبی اور کاغذ کی رعنائی کے لحاظ سے چیدہ ہوتیں اور صاف معلوم ہوتا کہ ان کتابوں کا حاصل کرنے والا، کتابوں کے حوالے سے ہمہ گیر مذاق کا حامل ہے۔ مولانا رضوانؒ، اپنی معمولی سی یافت میں سے کسی نہ کسی طرح پس انداز کر کے کتابوں کے حصول کے، اپنے ذوق کو ہمیشہ تسکین دیتے رہتے تھے، حال آں کہ وہ ہماری ہی طرح نادار طالبِ علم تھے اور طالبِ علم گھر کا مال دار ہو، تب بھی مدرسے کی زندگی میں مفلوک الحال ہوتا ہے؛ یہ طالبِ علموں کی فطرت اور اُن کی قسمت ہے۔ اللہ نے ایسا ہی چاہا ہے؛ تاکہ وہ توفیقِ الہی کی ہم رکابی کی صورت میں، کچھ تو حاصل کر سکیں، ورنہ ہمارے ایک دوست بہت صحیح کہا کرتے تھے کہ طالب

منفرد اَدیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمی
علم کو سہولت ميسر ہو تو اُس کی صلاحیت استوار نہیں ہوتی۔

دارالعلوم دیوبند میں ہماری یادگار مجلسیں

دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں، ہم لوگ جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب میں اپنے ایک باذوق، نستعلیق ساتھی مولانا قاری ابرار احمد سدھولوی در بھنگوی (حال امام و خطیب جامع مسجد لہریہ سرائے، در بھنگہ) کے کمرے ۳۲ باب الظاہر (دار جدید) میں اکٹھا ہوتے، اس مجلس کے میر تو مولانا قاری شبیر احمد در بھنگوی (حال مہتمم و ذمے دار مدرسہ اسلامیہ، شکر پور بھر وارہ) ہوتے؛ لیکن اس کے روح رواں مولانا رضوان القاسمی ہوا کرتے تھے۔ اُس کے شرکاء میں اکثر مولانا شگیر احمد در بھنگوی اور میرے ہم سبق مولانا بدر الحسن قاسمی ہوا کرتے تھے، (جو سر دست کویت کی وزارت اوقاف و امور مذہبی میں اہم عہدے پر فائز ہیں) یہ مجلس جو عموماً ضلعی انجمنوں کے ہفتہ واری پروگراموں کے اختتام کے بعد (نصف شب کے بعد) ہوتی تھی، ہم لوگ اس میں ادبی و ثقافتی موضوعات پر آزادانہ تبادلہ خیال کرتے تھے؛ لیکن جو موضوع بھی چھڑ جاتا، دیر تک مَسْجَع و مَفْشٰی عبارت میں اُسی کی پیروی ہوتی۔ مَسْجَع اور موزوں عبارتوں میں، ہماری طالب علمانہ نوآموزی و نا تجربہ کاری کی وجہ سے بہت سی دفعہ ”ہمارا قافیہ“ تنگ ہو جایا کرتا تھا؛ بل کہ بعض دفعہ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم ”مسدود راہ“ پر پہنچ گئے ہیں، جس کو کھولنا ہمارے لیے دشوار گزار ہے؛ لیکن خدا بھلا کرے قاری شبیر احمد اور مولانا رضوان کا کہ یہ دونوں حضرات اپنی مہارتِ لسانی، ذہانت، اور طالب علمی کے باوجود، نثری قدرت کے ساتھ ساتھ، شعر و سخن کا ماہرانہ مذاق رکھنے کی وجہ سے، جاری موضوع کی رعایت کرتے ہوئے، پہلے سے زیر استعمال ”وزن و قافیہ“ کی بند راہ اس طرح کھول دیتے کہ ہم لوگ عَشَّ عَشَّ کرنے لگتے، اس مجلس میں ایمان لانا پڑا کہ مولانا محمد رضوان اور قاری شبیر کو، اللہ نے لفظی صنعت کے استعمال، دو یا اُس سے زیادہ معنوں

والے الفاظ کی رعایت اور محاورہ و روزمرہ میں، اس نوعمری میں بھی خاص کمال سے نوازا ہے۔ اللہ اپنے فضل سے جس کو چاہتا ہے، کسی بھی غیر معمولی کمال سے نواز دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ دونوں حضرات، عمل اور تجربے والی اپنی بعد کی زندگی میں بھی اپنی اس خوبی اور امتیاز کے لیے مشہور رہے۔ مولانا رضوانؒ کی تقریر کو سننے اور تحریر کو پڑھنے والا ہماری اس بات کی بہ خوبی تائید کرے گا۔

احاطہ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد، میرے اُن کے روابط

دارالعلوم سے نکلنے کے بعد، ہم لوگ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا شکار رہے، قدرت کے قانون و عمل کے مطابق، تدریسی اور تعلیمی کام میں ہم لوگ مختلف علاقوں میں بٹ گئے، ہم لوگوں میں مکانی مسافت حائل رہی؛ لیکن ہمارا قلبی اور روحانی رشتہ چوں کہ اٹوٹ تھا؛ اس لیے نہ صرف قائم رہا؛ بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ، مستحکم سے مستحکم ہوتا گیا۔ مراسلات اور آنے جانے والوں کے ذریعے، نیز اس آخری سالوں میں ٹیلی فون کے نظام کے عام ہو جانے کے بعد، اُس کے ذریعے، ہم لوگ ایک دوسرے سے ہمیشہ جُڑے ہوئے رہے اور ایک دوسرے کی علمی و دینی ترقی اور ہم میں سے بعضوں کی مادی فارغ البالی کی خبروں سے ہمیشہ خوش ہوتے اور مزید ترقیات کے لیے دعاؤں کے تبادلے کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ ایک سچا اور اچھا بھائی دوسرے بھائی کے لیے، ہمیشہ یہی کچھ کرتا ہے اور کر سکتا ہے، سو ہم خدا کی توفیق سے اس پر کاربند رہے۔ کبھی کبھار ہم ایک دوسرے سے بہ راہ راست مل کر بے پناہ خوش ہوتے، جیسے چھوٹا بھائی اپنے بے پناہ مخلص اور شفیق بڑے بھائی سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ خدا جو عالم الغیب ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی محبت اور تعلق پر کس قدر اعتماد تھا، اتنا کہ بعض دفعہ ایک ماں اور ایک باپ کی دو اولادوں کے درمیان بھی نہیں ہوتا۔ عربی میں کتنی سچی بات کہی گئی ہے: رَبِّ أَخٍ لَّمْ تَلِدْهُ اُمَّكَ (تمہارے بعض بھائی ایسے

ہوں گے، جسے تیری ماں نے نہیں جنا ہوگا۔

ایک مرتبہ یک شنبہ: ۱۸/رجب ۱۳۹۸ھ = ۲۵/جون ۱۹۷۸ء کو تقریباً دس بجے دن میں، اچانک مولانا محمد رضوانؒ اپنے دیرینہ رفیق اور میرے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے رفیق درس مولانا بدر الحسن قاسمی در بھنگوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں، میری تدریس کے زمانے میں، مجھ سے ملنے کے لیے اور کچھ اور ضروری کاموں سے اچانک لکھنؤ میرے پاس وارد ہوئے، تو ایسی خوشی ہوئی جیسے لگا کہ مجھے کوئی غیبی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ تین روزہ قیام میں، میں دونوں کے ہر وقت اور ہر جگہ سایے کی طرح ساتھ رہا۔ کئی بار اُن کے ساتھ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء - ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء) کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ سہ شنبہ (منگل) ۲۰/رجب ۱۳۹۸ھ = ۲۷/جون ۱۹۷۸ء ۷ بجے صبح کو مولانا بدر الحسنؒ تو دیوبند کے لیے روانہ ہو گئے؛ لیکن مولانا محمد رضوانؒ ۱۰ بجے صبح کو پھلواڑی شریف، پٹنہ، امارت شرعیہ، وہاں سے کلکتہ اور کلکتہ سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں حضرات کو اسٹیشن پر چھوڑتے وقت ایسا لگا کہ میں نے کوئی گراں قدر، اُن مول اور نایاب سرمایہ دانستہ گم کر دیا ہے، جس کی کسک کئی روز تک؛ بل کہ لمبے عرصے تک محسوس ہوتی رہی۔

مولانا محمد رضوانؒ جب پھلواڑی شریف پہنچے، تو وہاں سے یہ محبت بھرا خط لکھا، جس سے اُن کی ظرافت، خوش مزاجی، زندہ دلی، زبان و بیان پر قدرت اور تعبیر و تحریر کی ندرت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے:

۲۲/رجب ۱۳۹۸ھ، شنبہ

از: پھلواڑی شریف پٹنہ

اخی الاعز زاد اللہ علماً و شرفاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
سوا گیارہ بجے ٹرین لکھنؤ اسٹیشن پر آئی، وہ بھی پلیٹ فارم نمبر سات پر۔
قلی جو مسلمان نام بتانے پر ایک حد تک رفیق تھا، وہ بھی انتظار کی تاب نہ لا کر

چپکے سے کہیں غائب ہو گیا۔ اب میں تھا، میرا سامان اور پلیٹ فارم نمبر سات، ویسے تنہا منتقل ہونے اور جگہ کی تلاش میں کوئی دقت پیش نہیں آئی — ٹرین پنجر تھی، اور پنجر کا حال معلوم ہی ہے، اُس کی پالیسی ”خوش کن“ ہوتی ہے۔ وہ رہ گذر کے کسی اسٹیشن کو ناراض کرنا نہیں چاہتی، خواہ اس میں طویل مسافت کا مسافر بیٹھا ہوا ”بور“ ہوا کرے، اُسے اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ لکھنؤ اور پٹنہ کے درمیان ہر اسٹیشن پر رکتی رہی، کچھ کو اتارتی اور کچھ کو سوار کرتی، پھر کچھ بات چیت کے بعد ”خدا حافظ“ کی سیٹی دیتی ہوئی روانہ ہوتی — اور ہاں طبیعت اُس کی بڑی، مسکین ہوتی ہے، تواضع اور انکساری کی صفت تو اُس کے رگ و پے میں سرایت ”بڑوں کا احترام“ بھی خوب جانتی، میل اور اکسپریس ٹرین آجائے تو، اُن کے اعزاز میں گھنٹوں کھڑا رہنا گوارا، مگر کیا مجال کہ اُس سے آگے بڑھنے کی جرأت یا گستاخی کرے۔ بہ ہر حال اس ”الیلی ٹرین“ کے ذریعے دوسرے روز شام کو ۶ بجے دانا پور پہنچا، پھلواری شریف جانا وہاں سے آسان تھا، میں وہیں اتر گیا، قبیل مغرب اپنے مقام پر پہنچا، یعنی

ع کتنے اوہام سے گذرے تو یقین تک پہنچے

ندوہ میں آپ سے مل کر طبیعت بہت مسرور ہوئی، بھولی بیری باتیں یاد آئیں، دعا ہے کہ وہاں آپ ترقی کے زینوں کو طے کرتے رہیں، اور شہرت و رفعت کے بام عروج تک پہنچیں۔

اسٹیشن تک آپ ”الوداع“ کہنے آئے، پھر ”تنہا“ مجھے چھوڑ کر واپس جانا آپ کو گوارا نہیں تھا، آپ تو میرے اصرار پر گئے، وہ بھی عالم بے تاباں میں۔ دلی محسوس نے اسے خوب محسوس کیا، اس اخلاص اور کرم کا خدا بدلہ دے — مولانا رابع صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا شمس الحق صاحب، مولوی انس صاحب اور مولانا اقبال صاحب سے بشرط یا دو ملاقات سلام فرمادیجیے، ان

منفرد اَدیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

حضرات کی عنایتوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں — ہفتہ عشرہ میں حیدر آباد پہنچوں گا، ان شاء اللہ۔

مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے نام بھی ایک خط شکریے کا لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ گاہ بے گاہ ہی سہی؛ مگر آپ خط لکھتے رہیں گے۔

والسلام، طالب دعا

محمد رضوان غفرلہ

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کی وفات کے بعد دو تین ماہ کے دوران ہی، اُن پر راقم نے تاثراتی کتاب ”وہ کوہ کون کی بات“ لکھی اور شائع کی، جو الحمد للہ بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اُس کا ایک نسخہ، مولانا محمد رضوان کو بھی بھیجا گیا، حسب توقع وہ بہت خوش ہوئے اور مندرجہ ذیل مکتوب کے ذریعے، راقم کے حوصلے کو ہمیز کیا۔ اللہ انھیں اس کا بدلہ اپنی اعلیٰ جنت کا مکین بنا کر دے اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کا جوار نصیب کرے۔ آمین:

انھی الاعز زاد اللہ علماً و شرفاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمۃ پر آپ کی تحریر کردہ کتاب ”وہ کوہ کن کی بات...“ بھی نظر نواز ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی ذات والا صفات اپنی گونا گوں خوبیوں، علمی و عملی کمالات اور اپنی تعلیمی و تربیتی اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیشہ پاد رکھی جائے گی۔ اُن کی پہلودار اور ہمہ جہتی و ہمہ رخی شخصیت میں ایک مُعَلِّم کی دردمندی و دل سوزی، ایک مربی کی شفقت نوازی و کرم گستری، ایک خطیب کی جادو بیانی و سحر انگیزی، ایک مصنف و مؤلف کی وسعتِ ظرفی و بلند فکری، ایک مدبّر و منتظم کی بیدار مغزی و حوصلہ مندی اور ایک صحابی کی دوراندیشی و دیدہ وری نظر آتی ہے، علم و عمل کے صبر آزمات سفر میں، وہ حقیقی معنوں میں ”کوہ

استقامت“ تھے، ہمت و شجاعت، اعلیٰ ظرفی و بلند حوصلگی کے وہ پیکر مجسم تھے۔ عربی زبان و ادب کی انھوں نے جولا زوال اور قابلِ رشک علمی خدمات انجام دی ہیں، وہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند؛ بل کہ پورے برصغیر کی علمی و دینی جامعات، تحریکات اور شخصیات کے لیے باعثِ افتخار ہیں، قحط الرجال کے اس ور میں انھوں نے ”مردم سازی“ کا جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ میری نظر میں اُن کی تمام قابلِ ذکر اعلیٰ صفات میں سب سے بڑی صفت ”مردم سازی“ کی تھی، اُن کی اس صفت نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے، اُن کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارا ہے، چھپے ہوئے جوہر کو چمکایا ہے اور میدانِ کار میں اُتار کر کام کرنے کا مثالی حوصلہ بخشا ہے، مگر اب تو

ع وہ کوہ کن کی بات گئی، کوہ کن کے ساتھ

آپ نے دارالعلوم دیوبند کی ایک عظیم عہد ساز شخصیت پر، جس دقتِ نظری اور وسعتِ فکری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اس پر آپ یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں، طرزِ نگارش اور اُسلوبِ بیاں بھی خوب ہے، ہر صاحبِ ذوق آپ کی اس کتاب کو شوق کے ہاتھوں لے کر قدر کی نگاہوں سے پڑھنے پر مجبور ہے، مولانا مرحوم سے متعلق آپ کے تاثرات اور احساسات کا یہ مجموعہ، مولانا کے بعد ایک مخلص مُعلِّم اور مشفق مربی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اُن کی بانیضِ صحبت کا ایک بدل ہے، آپ نے اپنی اس کتاب میں، اپنے پُر تاثیر قلم کا جادو کچھ، اس طرح جگایا ہے کہ کتاب کے اوراق میں مولانا ہمیشہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے، اور اُن کو دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے دونوں یکساں طور پر اُن کی اس نقل و حرکت اور آمد و رفت سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے رہیں گے، اور جگر کا یہ شعر پڑھ کر آپ کو داد دیتے رہیں گے۔

وہ آئے کب کے، گئے بھی کب کے، نظر میں اب تک سمار ہے ہیں

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں
تاہم اُن کے بعض خواب، بعض جھیلوں میں پھنسنے یا پھنسا دینے کی وجہ
سے جو اُدھورے رہ گئے، اور لغت نویسی کے جدید خاکوں میں جو رنگ نہیں
بھرے جاسکے۔ اِس کا افسوس تو ہم جیسے شاگردوں کو ہمیشہ رہے گا، دارالفکر
سے دارالموہبین کا علمی اور فکری سفر بھی اُن کا خوب ہے، کاش یہ ”شجرِ طوبی“
اپنی بہارِ جالیٰ فزائید دکھلا سکتا، اور اُسے مستحکم بنیادیں فراہم ہو سکتیں۔

ہاں! یہ بھی آپ نے اچھا کیا کہ مولانا کے آخری دور کے تذکرہ پر
”مصلحتوں“ کی چادر ڈال دی، اور یہ موقع نہیں دیا کہ لوگ کہیں مع
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اور یہ بھی کہ:

اُس نے دل رکھنے کو بس اتنا کیا وعدہ پورا کرنے کا وعدہ کیا
وہ تمہارے ملنے والوں میں سے ہے جس نے تم کو جا بہ جا رسوا کیا
میں دوبارہ اِس کتاب کی تالیف و ترتیب اور حسن طباعت و اشاعت پر
تہنیت و مبارک باد پیش کرتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ خوبیوں کی حامل شخصیت پر،
خوبیوں کے حامل قلم نے، اپنی خوبیوں کا جو جو ہر دکھایا ہے، وہ بہت خوب ہے۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین و علم کی اور عربی زبان و ادب کی خدمت لیتا
رہے اور آپ کا مرحلہ شوق کبھی طے نہ ہو اور قلم کسی طرح کے تعب اور تھکن سے
آشنا نہ ہو۔

نوٹ: جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، اِس کے لیے معذرت خواہ
ہوں، آپ نے اپنی یادگار کتاب میں زمانہ ماضی کو گریڈتے ہوئے میرا بھی
تذکرہ کیا ہے، اِس محبت کے لیے شکر گزار ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ کتاب کا نیا
ایڈیشن آنے والا ہے، یہ جب بھی آئے، اِس کے ۲۵ نسخے قیامتاً در سے کے

پتے پر ضرور ارسال فرمادیں۔

والسلام، طالب دعا

۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ

محمد رضوان القاسمی

۶ نومبر ۱۹۹۵ء

ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

اندرون ملک تو ہم دونوں کا ہے بیگاہے ملتے ہی تھے۔ مکتبہ دبار عالم عربی، خصوصاً دل اور روح کا نشیمن ہونے کی حیثیت رکھنے والے ملک سعودی عرب میں بھی اُن سے ملنے اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا مجھے موقع ملتا رہا۔ ایک بار تو ماہ رمضان میں خاص مطاف میں اُن سے اچانک ملاقات ہوئی اور اتنی خوشی ہوئی کہ میں اس کو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ احرام میں ملبوس تھے اور عمرے کا طواف کر رہے تھے اور میں طوافِ نفل کر رہا تھا، اس کے بعد اُن کی جاے رہائش پر بار بار حاضری ہوئی، وہ اُسی طرح خوش ہوئے جیسے ہمیشہ بے طرح خوش ہوتے رہتے تھے۔

دارالعلوم میں اپنی مدرسے کے بعد

اُن سے طویل ملاقات کی ایک تاریخی تقریب

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں، یہاں سے جانے کے بعد، اُن سے پہلی ملاقات مارچ ۱۹۸۰ء جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ میں اجلاسِ صد سالہ کے موقع سے ہوئی۔ وہ دارِ جدید کے مدنی گیٹ سے باہر اپنے مدرسے دارالعلوم سبیل السلام کا خاص قسم کا تاریخی معلومات پر مشتمل کیلنڈر بغل میں دبائے، گھوم پھر کر خود سے ہی فروخت کر رہے تھے اور کوئی ممتاز عالم یا بے تکلف دوست مل جاتا تو مفت ہی پیش کر دیتے۔ اُن کی جیسے ہی میرے اوپر نظر پڑی، اپنی مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کیلنڈر کے بنڈل کو زمین پر ڈال، میری طرف لپکے، ہم دونوں بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کی خبر خیریت دریافت کی، کئی روز وہاں ہم لوگوں کا قیام رہا اور بار بار ہم ملتے رہے اور طالبِ علمی کی لذت بھری

یادوں سے لطف لیتے رہے۔ اُن کا یہ کیلنڈر بہت مقبول ہوا، اس سے اُن کے علمی ذوق، ادبی شوق، تاریخی مذاق اور ثقافتی نستعلیقیت اور اشاعتی شایستگی و فن کاری کی عکاسی ہوتی تھی، جس نے دیکھا اُس نے بلا تردد خرید لیا۔ اُس وقت سے کیلنڈر کو اس خاص تاریخی و علمی معلومات اور دعوتی و تعلیمی روح کے ساتھ، شائع کرنے کا اُن کا معمول بن گیا اور اس خاص طرز کا کیلنڈر شائع کرنا بھی اُنھی کا امتیاز رہا۔ بعد میں بہت سے افراد اور اداروں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی؛ لیکن یہ قول حریری: اُنّی یَبْلُغُ الصَّالِحُ شَأْوَ الصَّالِحِ یعنی لنگڑا ایک طاقت ور کے حوصلے کو کب پاسکتا ہے؟ چنانچہ اُن کی شان امتیاز ہمیشہ قائم رہی۔

دارالعلوم دیوبند میں، میرے تدریسی ذمے داری سنبھالنے کے بعد، وہ حیدر آباد سے کئی بار تشریف لائے، اُن سے مل کے اور اُن کی ضیافت کر کے، اللہ جانتا ہے دل اتنا خوش ہوا، جتنی روح اُس وقت خوش ہوتی ہے جب اُس کو اُس کی صحیح غذا ملا کر پتی ہے، ماد علمی میں اُن سے تفصیلی ملاقات، استاذِ نسل نو و مربی طلبہ دارالعلوم و مُعَلِّمِ عبقری حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی (متوفی درمیانی شب ۱۴-۱۵ ذی قعدہ = ۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۹۵ء) کی آخری مایہ ناز تالیف ”القاموس الوحید“ کے اجرا کے موقع سے ہوئی، جو فقیہ الہند حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (متوفی شب جمعرات و جمعہ ۲۰-۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ = ۳-۵ اپریل ۲۰۰۲ء) کے ہاتھ شبِ شنبہ یک شنبہ ۴-۵/۵/۵ صفر ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۸-۲۹ اپریل ۲۰۰۱ء کو عمل میں آیا۔ شنبہ کے دن عصر بعد وہ یکا یک تنہا ہماری رہائش گاہ، افریقی منزل قدیم میں آدھمکے، عام معاصر علما کی طرح اُن کے ساتھ خدام و خشم کی کوئی جماعت نہ تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے، مختلف علمی و فکری اور ملی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، جو طالب علمی کے زمانے تک جا پہنچی۔ اُس وقت کی صحت، فراغت، بے فکری، نوعمری وغیرہ کا تذکرہ چل نکلا تو مولانا کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ میں نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا؛ لیکن اس میں کام یاب نہ ہوسکا؛ کیوں کہ وہ

ماضی کی راہوں پر اپنی سوچ کے ذریعے بہت دور نکل گئے تھے، چنانچہ وہ سنجیدگی سے سوچتے رہے۔ دراصل وہ بھی شکر کے مریض تھے اور میں بھی اُس کا شکار ہوں، ہم دونوں الحمد للہ اُس وقت (دور طالب علمی میں) مکمل صحت مند اور نو عمری کی تازگی، چستی اور پھرتی سے لبریز تھے۔ مولانا کو اپنی صحت کے حوالے سے خاص طور سے بڑی تشویش تھی، گو وہ اُس کی دیکھ ریکھ پر بہت توجہ نہیں دے پاتے تھے کہ علمی و ملی و دعوتی کاموں کی درازی اور تسلسل انہیں اس کاموقع ہی نہیں دیتا تھا؛ اسی لیے جب میں نے اُن کے سامنے ”عہد زریں“ کو یاد کیا، تو اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ مولانا نے اس موقع سے میرے اوپر بہت زور دیا کہ میں بار بار حیدر آباد آؤں اور کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو ضرور آؤں اور اُن کے مدرسے میں ہفتہ عشرہ قیام کروں؛ تاکہ ماضی کی ملاقاتوں کا جواں قطار رہا ہے، اُس کی تلافی ہو سکے؛ لیکن دنیا کی اکثر تمنائوں کی طرح یہ تمنا بھی خدا کی مشیت سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکی۔ میں اپنی صحت کی بے طرح ناہم واری، مشاغل کی کثرت اور الجھنوں کی بہتات کی وجہ سے، سفر کے حوالے سے بالخصوص بالکل بے ہمت واقع ہوا ہوں۔ اللہ جزائے خیر دے میرے چند مخلص گجراتیوں کو کہ انھوں نے پچھلے سالوں کے درمیان اپنی محبت کی بے پناہی کی وجہ سے، اپنے مدرسوں کا مجھ سے بار بار سفر کرا لیا اور یہاں دارالعلوم میں اپنے ہونہار طلبہ کو اس سلیقے سے میرے اوپر سفر کے لیے ذہنی تیاری کے حوالے سے مُسلط رکھا کہ اُن کے حسن عمل کی میں کسی بھی طرح داؤ نہیں دے سکتا۔

مولانا سے راقم کی آخری ملاقات

مولانا محمد رضوانؒ سے اُن کی زندگی میں آخری ملاقات اُن کی موت سے دو سال قبل دیوبند ہی میں رواروی میں ہوئی۔ وہ بعد مغرب اچانک اپنے منجھلے بھائی برادر م سلمان اور اپنے پسر خرد نعمان بدر سلمہ (بعد میں مولانا نعمان بدر) کے ساتھ ہمارے ہاں دہلی سے وارد ہوئے اور ابھی ٹھیک سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ فرمانے لگے کہ ایک ضروری

کام سے ہم لوگ دیوبند آئے تھے اور ابھی دہلی لوٹ جانا ہے؛ کیوں کہ علی الصباح وہاں میں بعض ناگزیر پروگراموں سے مربوط ہوں۔ میں نے بے وفائی سمجھی کہ دیوبند آ کے تم سے ملے بغیر چلا جاؤں۔ سلمانِ سلمہؑ کا بھی اصرار و اشتیاق تھا کہ تم سے چند منٹ کے لیے ملنا ضروری ہے۔ چنانچہ صرف چائے والے پر اکتفا کیا گیا۔ میں نے کھانے کو اصرار کیا، تو فرمایا کہ واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ آب و گل کی اس دنیا میں اُن سے میری یہ آخری ملاقات ہے، گذشتہ شعبان میں اُن پر غشی کی کیفیت طاری ہوئی تو اپنی کم زوری اور معذوری کے باوجود، جی چاہا کہ میں اُن کی عیادت کو حیدرآباد ضرور جاؤں؛ لیکن میرے بعض اَعزّاء کے ساتھ اُن کے گاؤں کے بے دین مسلمانوں کی طرف سے، ایسا سنگین معاملہ پیش آ گیا کہ اس حوالے سے مجھے ذاتی طور پر تنگ و دو میں مصروف ہونا پڑا اور میں برادرِ محترم مولانا محمد رضوانؒ کی عیادت کو حیدرآباد نہ جاسکا اور وہ بالآخر اپنے رب سے جا ملے۔ اُن کی کشادہ قلبی اور وسیع الظرفی کی وجہ سے یقین ہے کہ ہماری اس کوتاہی کو معاف کر دیں گے اور اپنے رب کے حضور میں میری اس کوتاہی کے لیے شکوہ سنچ نہ ہوں گے۔ خلقِ خدا کی نگاہ میں محبوبیتِ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا یہ بندہ، اپنے رب کے یہاں بھی محبوب ہے۔ اِنْ شَاءَ اللہ وہ اس کو بہت نوازے گا اور اپنے دامنِ غفور و رحمت و مغفرت میں جگہ دے گا۔

اُن کا ادارہ، اُن کی بہترین یادگار

اُن کی علمی سرگرمیاں، دعوتی کام، تعلیمی و تربیتی کارنامے، اسلامی خدمات، دینی و ملی مساعی، اِنْ شَاءَ اللہ اُن کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی۔ خصوصاً اُن کا ممتاز تعلیمی و تربیتی کارنامہ جو دارالعلوم سبیل السلام کی شکل میں حیدرآباد کی اسلامی و تاریخی عظمت و اہمیت میں اضافے کا باعث بنا ہے، اُن کے لیے پیہم ثواب کا ذریعہ رہے گا۔ انھوں نے اس کی تاسیس، ترقی اور بامِ عروج تک لے جانے کے لیے، اپنے گراں قدر

اوقات، بہترین مساعی اور شب و روز کی محنت سے کام لیا۔ اللہ کی ذات سے یہی امید ہے کہ وہ اس ادارے کے لیے مخلص خُدا کا انتظام کرتا رہے گا اور مولانا کی وفات کے بعد یہ کسی ایسے اختلاف یا کش مکش اور جدال کا شکار نہ ہوگا، جس کا عام طور پر ہمارے ملی ادارے اُن ہنرمند و قدر آور رجالِ کار کے اٹھ جانے کے بعد ہو جایا کرتے ہیں، جو انھیں اپنی زندگی میں اپنی ہوشیاری و قد آوری کی وجہ سے ہر طرح کے فتنوں سے بچائے رہتے ہیں؛ لیکن ریاکار اور اغراض و مقاصد کے غلام لوگ، اُن کے اٹھ جانے کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ملی اداروں کو اپنی ہوس کا شکار بنا کے، وہاں طرح طرح کے فتنے جگادیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس پاک پودے کی حفاظت کرے، جو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے لگایا گیا ہو؛ تاکہ اُس کی جڑیں زمین میں پیوست رہیں اور اُس کی شاخیں آسمان میں دراز ہوں اور وہ خدا کی مرضی سے برابر اپنا بیٹھا پھل دیتے رہیں اور مسلمانوں کی نسلوں کو اُس سے وہ فائدہ پہنچتا رہے، جس کی اُس سے توقع کی گئی تھی۔

مولانا کی علمی میراث، بہترین صدقہ جاریہ

مولانا محمد رضوانؒ آج ہمارے درمیان نہیں؛ لیکن اُن کے مختلف علمی و ملی کارنامے اور حسنِ اخلاق کی میراث ہمارے درمیان باقی ہے، جس کو ہم سلیقے سے تقسیم کر سکتے ہیں اور اُن کے طرز پر چل کر، اُن کی یادوں کو قائم و دائم رکھ کر، اُن کی محبت کا صحیح طور پر دم بھر سکتے ہیں اور انھیں کے ایسی مقبولیت و محبوبیت حاصل کر کے، دین و ملت اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکتے ہیں۔

آج اُن کے اہل خاندان نے انھیں کھو کر خاندان کے والی کو کھودیا ہے، بھائیوں نے اپنے شفیق بھائی کو کھودیا ہے، دوستوں نے وفادار دوست کو کھودیا ہے، ملی و دینی اداروں نے اپنے فعال اور مخلص کارکن کو کھودیا ہے، مجھے ذاتی طور پر یہ غم کھائے

جا رہا ہے کہ میں نے ایک ایسے غم گسار و دم ساز برادرِ کبیر کو کھو دیا ہے، جس کو میرے مفادات سے، میری ہی طرح، یا شاید اس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک ایسے وفادار دوست کو کھو دیا ہے، جس کی وفاداری اب زندہ اہل علم و فضل دوستوں میں دور دور تک نظر نہیں آتی، ”اہل علم و کمال“ کی کمی نہیں، کمی اُس ہمہ گیر وصف کی ہے، اُس جامع اخلاق کی ہے جو مولانا محمد رضوان کو دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ غالباً کسی انسان کو دوسرے انسان میں جو بہت کمی محسوس ہوتی ہے، وہ اسی طرح کے جامع اخلاق کی کمی ہوتی ہے، جو مولانا محمد رضوان کا وجہ امتیاز تھی اور جس کے بغیر انسان، نامکمل اور ناقص انسان رہتا ہے، خواہ وہ علم کا پہاڑ اور ڈھیر سارے کمال کا حامل کیوں نہ ہو۔ مولانا محمد رضوان جیسی ہمہ گیر صفت اور جامع الاخلاقی کے ذریعے ہی ایک انسان کو ارد گرد کا انسان مونس و غم خوار تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس دنیا میں تنہا نہیں بل کہ ایک شفیق بھائی، ایک مخلص دوست، ایک وفادار ساتھی، اُس کے دنیا و آخرت کے سارے معاملات میں اُس کا ہم رکاب و شریک کار ہے، لہذا مشکل سے مشکل حالات میں اُس کو اس دنیا سے، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اور دنیا کے انسانوں سے بالکلہ اعتماد اٹھالینے کے لیے، اُس کے پاس وجہ جواز نہیں۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کیا کوئی مہربان میرے لیے مولانا محمد رضوان جیسا انسان فراہم کر سکتا ہے اور اُن ڈھیر سارے انسانوں کے شر سے میرے لیے ڈھال بن سکتا ہے، جنہیں ”اہل علم“ کا عنوان دیا جاتا ہے؛ لیکن اُن کے کبر و غرور اور انسانیت سے اُن کے عاری ہونے کو دیکھتے ہوئے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنھیں اُس اسلامی اخلاق کی ہوا تک بھی نہیں لگی، جس نے مولانا محمد رضوان کو معاشرین کے درمیان علم، تحریر، تقریر اور خدمتِ دعوت و دین کے میدان میں شہرت سے پہلے ہی ”دراز قد“ بنا دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اسلامی

پس مرگ زندہ

اخلاق کے حوالے سے افلاس کے شکار ”اہل علم و کمال“ سے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے، اسلام کو سارا فائدہ اُن ”اہل علم و فضل“ سے ہی حاصل ہوا ہے جو اسلامی اخلاق اور صحیح انسانی صفات کے زیور سے آراستہ تھے؛ کیوں کہ یہی لوگ درحقیقت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کے وارث تھے، جنہیں ابوبکر و عمر و عثمان و علی، عشرہ مبشرہ اور سارے صحابہ اور اُن کے سچے متبعین کی سیرت و سلوک کے واقعی پیرو ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔

الہی! ہمارے خلیق و محترم بھائی مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کی قبر پر رحم و کرم کی موسلا دھار بارش نازل فرما؛ انبیاء، صدیقین، صلحا اور شہدا کے جوار میں انھیں اپنی اعلیٰ جنت کا مکین بنا؛ اُن کے اعزاء و اقربا، متعارفین و محبین اور دعا گو یوں کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرما اور ہمیں اُن کے بعد اپنی راہ مستقیم پر گام زن رکھ اور ہمیں اُن کی جدائی کے غم کا اجر عنایت فرما اور اُن کے بعد ہر طرح کے فتنوں سے محفوظ رکھ۔

سوانحی نقوش

✽ نام: محمد رضوان القاسمی۔

✽ ولدیت: الحاج محمد حبیب الحسن صاحب حسینی بن محمد سلیم بن چراغ علی عرف بھکاری بابور جہم اللہ۔

✽ تاریخ پیدائش: ۱۱/۷/۱۹۴۳ء (۱۸ شعبان ۱۳۶۳ھ)

✽ جائے پیدائش: بھاگ تھ پور سابق ضلع در بھنگہ، حال ضلع مدھوبنی، (بہار) جو اُن کی نانیال ہے۔

✽ وطن اصلی: ”رسول پور بڑھولیا“ ضلع در بھنگہ (بہار) جو اُن کے پردادا نے بسایا تھا، جن کا نام ”چراغ علی“ عرف بھکاری بابو تھا، جو اُس علاقے کے بڑے زمین دار تھے اور کئی گاؤں کے مالک تھے، بڑے دین دار، تہجد گزار اور پابند شریعت آدمی تھے، پہلے اسی علاقے میں اُن کا گاؤں اُسی جگہ واقع تھا، جہاں غیر مسلم آبادی زیادہ تھی، وہ بالخصوص وقت سحر اپنی عبادت گاہوں میں گانا بجایا کرتے، تو انھیں نماز سحر گاہی میں تکلیف ہوتی، اس لیے اُس سے قدرے دور اپنا دوسرا گاؤں بسالیا، انھیں ”بھکاری بابو“ اس لیے کہا جاتا تھا

منفرد ادیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

کہ وہ فقیروں کو بہت نوازتے رہتے تھے، اور انھیں کسی بھی حال میں خالی ہاتھ واپس ہونے نہیں دیتے تھے۔

✽ موجودہ جائے سکونت: H.No. 3-5-783/20A کنگ کوٹھی، حیدرآباد 500029 (A.P.)

H.No. 5-8-629/1 مسجد عامرہ، عابدس، حیدرآباد 500001 (A.P.)

✽ موجودہ مراسلت کا پتہ: دارالعلوم سبیل السلام، مدینۃ العلم

(صلالہ، بارکس) حیدرآباد 500005 (A.P.)

Darul Uloom Sabeelus Salam, Madinatul Ilm

(Behind Salala, Barkas) Hyderabad. 500005, A.P. INDIA

Phone: 0091-40-24440450, 2444691, 9246599169.

Fax: 0091-40-24441835

✽ تعلیمی لیاقت: ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی، پھر جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر میں، پھر ڈھاکا، ضلع چپارن کے مدرسہ حسینہ میں، بعدہ مدرسہ امدادیہ درجنگہ میں، اعلیٰ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں۔

✽ فضیلت: دارالعلوم دیوبند، ۱۹۶۷ء (۱۳۸۷ھ)

✽ اختصاص فی علوم القرآن: مقالہ بہ عنوان ”قرآن کا عطا کردہ نظام حیات“ دارالعلوم دیوبند

۱۹۶۸-۱۹۶۹ء

✽ خدمات: ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی بنیاد رکھی اور تاحیات اُس کے ناظم

رہے • مسجد عامرہ عابدس حیدرآباد میں جمعہ کی خطابت اور مختلف نمازوں کے بعد درس قرآن اور درس حدیث کا سلسلہ بھی تاحیات جاری رہا۔ حیدرآباد میں وہ ۱۹۶۹ء میں مسجد عامرہ کے خطیب و امام کی حیثیت سے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتخاب سے تشریف لائے تھے؛ کیوں کہ مذکورہ مسجد کے ذمے داروں نے، اس منصب کے لیے آپ سے کسی باصلاحیت اور لائق فاضل دارالعلوم کو منتخب کر کے بھیجنے کی درخواست کی تھی • اصلاح معاشرہ اور مختلف علمی، دینی، ادبی اور اصلاحی موضوعات پر منعقد ہونے والے سیمیناروں و کانفرنسوں اور اجتماعات میں شرکت کی اور خطبات و مقالات پیش کیے • مختلف مدارس اور دینی و ملی اداروں کی سرپرستی بھی کی۔

✽ صحافت: • روزنامہ ”سیاست“ سے تقریباً تیس سال سے وابستگی رہی اور اُس کے مستقل کالم نویس رہے۔ ”آپ کے سوال“ کے عنوان سے، ہر ہفتے لوگوں کے مختلف النوع دینی، مذہبی، ادبی اور سماجی قسم کے سوالات کا جواب دیتے رہے، اور اُسی اخبار میں ہر ہفتے ادبی، اصلاحی اور سماجی مضامین بھی

پس مرگ زندہ

شائع ہوتے رہے ہیں • مدیر سہ ماہی ”صفا“ و پندرہ روزہ ”قرطاس و قلم“۔

✽ تصنیف و تالیف: • صلاۃ و سلام • ظہور قدسی ﷺ • اے انسان! وقت کی قیمت پہچان • چراغِ راہ • باتیں اُن کی یاد میں گی • دینی مدارس اور عصر حاضر • زکاۃ و صدقہ فطر - احکام و مسائل • عید الاضحیٰ - احکام و مسائل • جرائم - مرض اور علاج • گلدستہ سنت • گنج ہائے گراں مایہ • سفر آخرت - احکام و مسائل • عصر حاضر کے فقہی مسائل • اسرارِ حیات • متاعِ قلم

✽ عہدے و مناصب: • ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد • رکن تاسیسی و عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ • نائب صدر فقہ اکیڈمی، انڈیا • رکن مجلس شوریٰ ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن اصحابِ حل و عقد امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ • رکن تاسیسی المعبد العالی لتدریب القضاء والافتاء، پٹنہ • نائب صدر تنظیم بنائے قدیم، دارالعلوم دیوبند • رکن تاسیسی و عاملہ آل انڈیا ملی کونسل • رکن تاسیسی مجلس علمیہ آندھرا پردیش • نائب صدر دینی مدارس بورڈ، آندھرا پردیش • نائب صدر یونائیٹڈ مسلم فورم، آندھرا پردیش

✽ مولانا کے بھائی بہن: ۱- محمد سلمان (گرجویٹ ماسٹر آف کامرس) حیدرآباد اور پونا میں تدریسی لائن سے جڑے، اُس کے بعد بمبئی میں ایک کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے سروس کی، ۱۹ اگست ۱۹۸۰ء میں دہلی چلے گئے، جہاں اپنی فیملی کے ساتھ ہنوز مقیم ہیں، وہاں ”بن فارس“ گروپ میں جنرل منیجر ہیں، اُن کے اپنے بھی کئی کاروبار ہیں، اُن کے ۴ لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

۲- حافظ محمد عرفان - پہلے سال ہاسال تک دی میں عطر و عود کے کاروبار سے منسلک رہے۔ اب تجارتی سرگرمیوں کے لیے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

۳- مفتی محمد حسان قاسمی - کویت میں وزارتِ اوقاف کے تحت بعض اہم ذمے داریاں انجام دے رہے ہیں، ساتھ ہی دارالعلوم سبیل السلام کی نظامت کی ذمے داریوں سے بھی بہ حسن و خوبی عہدہ برآہور ہے ہیں۔

۴، ۵- شاہدہ خاتون و راشدہ خاتون - دونوں اپنے اہل و عیال کے ساتھ حیدرآباد ہی کی باسی ہیں۔

✽ مولانا کی اولاد: مولانا کی پہلی شادی اپنے علاقے درہنگہ، بہار میں ہی ہوئی، پہلی اہلیہ سے ۳ اولاد ہوئی:

۱- عارفہ فرزانہ، اُن کی شادی حیدرآباد ہی میں ہوئی، صاحبِ اولاد ہیں۔

۲- محمد عمران، ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایم ڈی کر رہے ہیں۔

منفرد ادیب و خطیب مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

۳- کافہ خاتون، بی اے اور عالمہ ہیں۔

دوسری شادی ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو حیدرآباد میں ہوئی، جس سے ۳ اولاد ہوئی:

۱- محمد ریحان، کمپیوٹر انجینئر ہیں، الہلال اسلامک بینک میں پروجیکٹ انجینئر ہیں۔

۲- نکہت فوزیہ، ایم بی بی ایس، ڈاکٹر ہیں، اپنی کلینک ہے اور ”اسری ہسپتال“ حیدرآباد میں

شعبہ ولادت کی ذمہ دار ہیں۔

۳- مولانا محمد نعمان بدر، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علیت اور دارالعلوم دیوبند سے فضیلت

کے ساتھ ساتھ ایم بی اے بھی کیا ہے، اب دارالعلوم سبیل السلام کے مدیر کی ذمہ داری، لیاقت کے

ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی، شمارہ ۱۱-۱۲، جلد ۲۸، ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ مطابق جنوری و فروری

۲۰۰۵ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود اربعہ صبح، یہ روز بدھ ۱۶ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ = ۲۹ دسمبر ۲۰۰۴ء۔

سوانحی نقوش کے سلسلے میں اُن کے پسر محمد مولانا نعمان بدر سلمہ اور ان کے بھائی محترم سلمان صاحب کی فراہم کردہ

معلومات سے مدد لی گئی ہے۔

مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۸ء — ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

محفل سے اُٹھ کے، رونق محل کہاں گئی؟
کھل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھلے

۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ = ۴ مئی ۲۰۰۵ء چہار شنبہ کی صبح کو ساڑھے نو بجے قاری شریف احمد گنگوہیؒ، اپنی عمر کی ۷۸ بہاریں دیکھنے کے بعد، اس جہانِ فانی سے اُٹھ گئے۔ مرحوم دینی تعلیم کے میدان میں سرگرم ایک معروف عالمِ دین تھے، انھوں نے اپنی عمر کا بیش تر حصہ دینی و تعلیمی سرگرمیوں اور مسلم نسلِ نو کو دین و عقیدے اور ملک و قوم کی خدمت کا اہل بنانے میں گزارا۔

مرحوم وسعتِ علمی اور تحریر و تقریر کے حوالے سے کوئی مشہور عالم نہ تھے اور نہ ہی ایسے پیرومرشد تھے، جو اِرادت مندوں کی تربیت و تزکیہ میں یک سوئی کے ساتھ مصروفِ عمل ہو؛ لیکن انھوں نے انتہائی خاموش اور ہر قسم کے صلے اور ستائش سے بے پروا ہو کر قصبہ ”گنگوہ“، ضلع ”سہارنپور“ میں ایک دینی مدرسے کی داغ بیل ڈالی، جس کا آغاز بھی برصغیر کے دیگر اسلامی مدارس کی طرح، مکتب ہی کی شکل میں ہوا اور شبانہ روز محنت اور لگن کی وجہ سے اس خطے کے مدرسوں میں ممتاز حیثیت کا حامل بنا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ گنگوہ، مشہور محدث و فقیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۲۴/۱۸۲۹ھ - ۱۳۲۳ھ)

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی ابرار احمد اجڑادی قاسمی۔

۱۹۰۵ء) کی جاے پیدائش و وفات ہونے کی وجہ سے تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔
 مرحوم انتہائی جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ مدرسے کی ظاہری اور باطنی
 توسیع و ترقی میں لگے رہے، تا آنکہ وہ رفتہ رفتہ اُن کی زندگی ہی میں ایک بڑا مدرسہ بن
 گیا، جس میں ابتدائی اور متوسطات سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور حفظ و قراءت کے وہ تمام
 روایتی شعبے قائم ہیں، جو ہمارے برصغیر کے کسی بڑے مدرسے میں عام طور پر ہوتے
 ہیں۔ اُن کا مدرسہ دگر مدارس سے کئی اعتبار سے ممتاز بھی ہے؛ چنانچہ اُس کا رقبہ بڑا
 وسیع و عریض اور جاے وقوع، آب و ہوا کے حوالے سے خوش گوار اور بڑی پُر فضا ہے،
 بازار کے شور شرابے اور گنجان آبادی کے مسائل سے بالکل الگ تھلگ ہے، اُس کی
 عمارتیں خوب صورت اور دل فریب اور درس گاہیں کشادہ اور سلیقے کی ہیں، یہ مدرسہ
 انتظام و انصرام کی باقاعدگی میں بھی، اُن کے زمانے میں امتیازی شان رکھتا تھا،
 مدرسین سختی اور ذمے داران بے تکلف اور سادگی پسند تھے۔

قاری صاحبؒ سے ملاقات و تاثر

میرا کئی بار اُن کے مدرسے جانا ہوا۔ پہلی بار جون ۱۹۸۴ء = شعبان ۱۴۰۴ھ کو
 عربی کے عبقری معلم اور خداداد انتظامی صلاحیت کے مالک حضرت الاستاذ مولانا
 وحید الزماں کیرانویؒ — سابق استاذ و معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند — متوفی
 ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء کے ساتھ میرا وہاں جانا ہوا۔ حضرتؒ نے ایک دن دارالعلوم کے
 احاطے میں، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو تیار کھڑی کار میں یہ کہتے ہوئے
 بٹھالیا کہ آؤ! گنگوہہ چلتے ہیں، مجھے ایک ہنگامی ضرورت پیش آگئی ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے
 بعد گاڑی ایک مدرسے کے پاس رُکی، ہم گاڑی سے اتر کر مدرسے میں داخل ہوئے۔
 حضرت الاستاذ کے ساتھ میں قاری شریف احمدؒ کے کمرے میں داخل ہوا، علیک سلیک
 اور خبر خیریت دریافت کرنے کے بعد ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت

الاستاذ، جس کام کے لیے گنگوہ آئے تھے، اُس کی تکمیل میں لگ گئے۔ میں قاری صاحبؒ ہی کے پاس بیٹھا باہم ملاقات و تعارف میں مشغول رہا۔ اُن کی گفتگو میں بلا کی سنجیدگی، شائستگی اور جماؤ تھا، اُن کی ہر حرکت و سکون میں نظم و ضبط نمایاں تھا، اُن کے گرد و پیش کی ہر چیز صفائی و ستھرائی اور نفاست پسندی کا اعلیٰ نمونہ تھی، اُن کے کمرے کے فرش، کپڑے، برتن، چائے کی پیالیاں اور چائے دانیاں انتہائی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اُن کے کمرے میں وضو کرنے، ہاتھ دھونے، جوتے چپل اتارنے، استنجا اور وضو کے لوٹے رکھنے کے لیے الگ الگ مخصوص جگہیں تھیں۔ میں نے چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے ہلکے ناشتے کے دسترخوان پر، چائے اور برتنوں کے ساتھ، اُن کے رکھ رکھاؤ کو بہ غور دیکھا، یہ سب کچھ دیکھ، سُن اور برت کر میرے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش ثبت ہو گیا اور میں اُن کے روبرو، مہمانوں کے ساتھ اُن کے اس ہنرمندانہ طریقے سے پیش آنے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جس پر اُنھوں نے فرمایا: یہ سب کچھ مظاہر علوم اور دارالعلوم کے اکابر علماء و مشائخ کی بابرکت صحبت کا، رہین منت ہے، جن کی دانش مندانہ تربیت سے میں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے۔

خوش خلقی و خندہ روئی

شام کے وقت حضرت الاستاذؒ اپنے مذکورہ کام سے فارغ ہوئے، چنانچہ ہم دیوبند روانگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، قاری صاحبؒ نے ہمیں مدرسے کے صدر دروازے پر الوداع کہا اور گاڑی چل پڑی۔ واپسی میں گنگوہ سے دیوبند تک، دوپہر ۱۲ بجے سے شام ۶ بجے تک، گنگوہ کے مذکورہ مدرسے میں قاری صاحبؒ کے ساتھ ملاقات کے دورانیے کے، اُن کے سارے طرزِ عمل کی ہر تصویر، میرے خانہ خیال میں گردش کرتی رہی، یعنی اُن کی خوش خلقی، خندہ روئی، کام کی باتوں میں ہی لگے رہنے اور مہمانوں کی تعظیم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنے — یہاں تک کہ مہمانوں کو

محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گھر میں یا اپنے گھر سے بھی کہیں زیادہ آرام و آسائش میں ہیں۔
— کے حوالے سے اُن کا ہر رویہ میرے ذہن کے پردے پر از خود متحرک ہوتا رہا۔
جب میں نے اپنا مذکورہ تاثر حضرت الاستاذ سے بیان کیا تو فرمایا: ہاں! ٹھیک کہتے ہو،
وہ ہمارے مخلص احباب میں ہیں، مزاج کی یگانگت اور میری ہی طرح ہر چیز میں نظم
و نسق اور ڈسپلن کی پابندی کی وجہ سے، میرے اور اُن کے درمیان ہمیشہ گہرا تعلق رہا
ہے۔ وہ علاقے کے اس حوالے سے، گئے چٹے علما میں ہیں اور اپنی اس شناخت کی بنا پر
اس خطے کے ممتاز اور لائق احترام عالم دین سمجھے جاتے ہیں۔

میں جوں ہی دیوبند واپسی کے لیے، قاری صاحب کے پاس سے اٹھا، اُنھوں
نے مجھ سے یہ عہد و پیمان کر لیا کہ میں وقتاً فوقتاً، اُن کے مدرسے آتا جاتا رہوں گا،
خصوصاً جب وہ مجھے اس کی یاد دہانی کرائیں گے۔ چنانچہ اُن کی وفات سے آٹھ دس
سال قبل تک وقتاً فوقتاً، اُن کے مدرسے میں میری آمد و رفت جاری رہی، جب بھی میری
وہاں آمد میں ذرا زیادہ فاصلہ ہو جاتا، وہ براہِ نوازش مجھ سے فون پر رابطہ کرتے اور کرایے
کی ٹیکسی پر بہ جلد آنے کے لیے اصرار کرتے۔ مرحوم کرایہ بڑے اصرار کے ساتھ خود ہی
دیتے: بل کہ یہ شرط لگا دیتے کہ میں ایسے کرایے کی گاڑی سے ہی آمد و رفت کروں، جس
کا کرایہ وہ خود ادا کریں گے۔ وہ اس بات کے روادار نہ تھے کہ میں بسوں میں سفر کروں
اور خواہ مخواہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اذیت اٹھاؤں۔ میرا جب بھی گنگوہ جانا ہوا، اُنھوں
نے مجھے مدرسے سے کچھ ہی فاصلے پر واقع اپنے ذاتی مکان میں قیام کرایا، میں ہمیشہ
رات وہیں گزارتا اور فجر کی نماز اُنھی کے گھر سے متصل مسجد میں اُن کے ساتھ ہی ادا
کرتا۔ ناشتہ میں انواع و اقسام کی مرغوب اشیاءِ سترخان پر سلیقے سے بچی ہوتیں، اُن کا
ناشتہ بڑی حد تک ہمارے شمالی بہار کے باشندوں کے ناشتوں سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ شمالی
بہار والے ناشتے کو انتہائی لذیذ بنانے اور نوع بہ نوع کرنے پر جتنی توجہ دیتے ہیں، اتنی
دوپہر اور رات کے کھانے پر نہیں دیتے۔

وہ اپنے دفتر میں مدرسے کی ترقی اور اُس کی کارکردگی کو مزید فعال بنانے کے لیے برابر مجھ سے صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیال کرتے، جس سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تدریسی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ، نصابِ تعلیم کو مزید بہتر اور فعال بنانے کے لیے بڑے فکر مند رہتے تھے۔

میں اُن کے مدرسے میں کم و بیش پانچ بار تنہا یا برادرِ عزیز مفتی نسیم احمد مظفر پوری کے ہم راہ (۱) گیا۔ ادھر تقریباً دس سالوں سے قاری صاحبؒ کی ایک عمارتوں: کتب خانہ، طلبہ کے دارالاقاموں اور عالی شان صدر دروازے وغیرہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے، فنڈ کی فراہمی کے مقصد سے بیرون ہند کے بڑے بڑے اسفار میں کچھ اس طرح کھو گئے کہ انھیں میری یاد دوسروں کی فکر کیوں کر ہو سکتی تھی؟ میں خود بھی چند سالوں سے مجموعہٴ امراض ہونے کے علاوہ بہت ساری مصروفیات کی بندش میں جکڑ سا گیا اور اس دوران اُن کے ہاں جانے اور ملاقات و مکالمات کا موقع نہ مل سکا، تا آنکہ میرے گھر والوں نے مجھے ۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ - ۳۰ مئی ۲۰۰۵ء بروز چہار شنبہ یعنی اُن کی وفات کے دن ہی یہ اندوہ ناک خبر بذریعہ فون دی کہ گنگوہہ کے کسی صاحب نے فون پر، اُن سے کہا کہ میں مولانا نور عالم صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ میں اس وقت سفر میں ہوں، تو انھوں نے کہا کہ مولانا کو یہ خبر کر دیجیے کہ قاری شریف احمد گنگوہیؒ کا آج انتقال ہو گیا، وہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ اگر ہو سکے، تو اپنی عربی تحریروں میں مرحومین کے صفحات پر اُن کا بھی تذکرہ کر دیں؛ اس لیے کہ مرحوم اور مولانا کے درمیان دیرینہ تعلقات تھے۔ جب گھر والوں نے یہ الم انگیز خبر

(۱) جو ۳۵-۳۶ سال کی عمر میں ہی بروز جمعرات ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء کو اس جہانِ آب و گل سے اٹھ گئے، وہ دارِ جدید دارالعلوم دیوبند میں میرے برابر والے کمرے میں رہتے تھے اور اپنے طالب علمانہ مقررہ کاموں سے فراغت کے بعد، میرے ہی ساتھ وقت گزارا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور روزِ آخرت اس کا بھرپور بدلہ دے۔

دی، تو مجھے سخت دھچکا لگا اور میں نے دل میں کہا: میدانِ تعلیم و تربیت کا ایک مضبوط اور عالی شان ستون گر گیا۔

مرحوم نے ”اشرف العلوم رشیدی“ کے نام سے اپنے قائم کردہ چھوٹے سے مکتب کو قلیل عرصے میں، طویل و عریض رقبہ، بہت ساری عمارتوں اور فیض یافتہ گان کی کثرت کے حوالے سے علاقے کے ممتاز ترین بڑے مدارس کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کر دیا۔ درحقیقت یہ سب کچھ اُن کی تنظیمی اور تربیتی صلاحیت اور اُس تاریخی اور مبارک قصبے میں تعلیم و تربیت کے عظیم مینارے کے قیام کے لیے اُن کی بے انتہا لگن اور تڑپ کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا۔

مختصر تعارف

✽ قاری شریف احمد کی پیدائش ۲۶ ایش ۱۳۲۸ھ = مطابق ۱۳ اگست ۱۹۲۸ء بہ روز پیر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن قصبہ گنگوہ میں اپنے دادا حافظ عبدالرحمن سے حاصل کی۔ حضرت گنگوہیؒ کے ایک تربیت یافتہ (بزرگ) حافظ قرآن ”عبدالرحمن بن عبدالرحیم“ کے پاس تکمیلِ حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں تجوید و قراءت کی تعلیم کے لیے قاری عبدالحق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو محلہ قاضی، ضلع سہارن پور میں مدرسہ تجوید القرآن کے شعبہ تجوید و قراءت کے مدرس اور شہر کی جامع مسجد کے امام تھے۔ ۱۹۴۲ء = ۱۳۶۱ھ میں وہاں سے وہ بہترین قاری بن کر نکلے۔ اس کے بعد مشہور محدث و فقیہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (متوفی ۱۴۱۷ھ = ۱۹۹۶ء) — سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند — سے ۱۹۴۳ء = ۱۳۶۲ھ میں لدھیانہ، صوبہ پنجاب کے کسی مدرسے میں سلسلہ تلمذ قائم کیا، وہ یہاں چھ مہینے رہے۔ پھر تجوید و قراءت کے ذوق کو مزید جلا بخشنے کے لیے مدرسہ تجوید القرآن میں قاری عبدالحق کے پاس واپس چلے آئے، انھوں نے اس دوران عربی، فارسی اور ابتدائی دینی عربی تعلیم بھی حاصل کی۔

✽ ۱۹۴۴ء = ۱۳۶۳ھ میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور وہاں مسلسل تین سال رہ کر متوسطات تک کی تعلیم مکمل کی، ۱۹۴۷ء = ۱۳۶۶ھ میں دارالعلوم دیوبند آئے اور یہاں بھی تین سال رہ کر ۱۹۴۹ء = ۱۳۶۸ھ میں سندِ فضیلت حاصل کی۔

✽ دارالعلوم اور مظاہر علوم میں پڑھنے کے دوران مرحوم نے اپنے چھوٹے سے مدرسے پر بھرپور توجہ

دی، جسے انھوں نے سہارن پور کے ایام طالب علمی میں اپنے استاذ اور مظاہر علوم کے ناظم مولانا سید عبداللطیف صاحبؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ = ۱۹۵۴ء) کے ایما پر قائم کیا تھا۔ وہ چندے کی فراہمی اور تعلیمی ترقی کے حوالے سے برابر اُس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے جوں ہی دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، علما و مشائخ — جن سے وہ مدرسے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کرتے تھے — نے انھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ مدرسے کے مستقل ذمے داری حیثیت سے اس کی ترقی کے لیے کام کرنے کو کہا؛ چنانچہ وہ اس اہم کام میں ہمہ تن لگ گئے۔ کئی بار انھیں مخالفت اور مصائب و مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا؛ لیکن اُن کے قدم نہیں ڈگ گئے؛ بلکہ وہ علما و صلحا کی دعاؤں اور مخلصانہ مشوروں کے طفیل، ثابت قدمی اور مکمل عزم و حوصلے کے ساتھ اپنی مقررہ راہ پر رواں دواں رہے اور توفیق خداوندی سے ایسی کامیابی حاصل کی، جس سے کوئی خدا کا باتوفیق بندہ ہی سرفراز ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں روزِ آخرت بھرپور بدلہ مرحمت فرمائے، انھیں اپنی فردوسِ بریں میں داخل کرے اور اُن کے اہل خانہ اور محبین و متعارفین کو صبر و اجر سے نوازے۔ (۵)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۶-۷، جلد ۲۹، جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ مطابق جولائی واگست ۲۰۰۵ء۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقؒ

شخصیت اور شان امتیاز (۱)

۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء — ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

نہ تخت و تاج میں، نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

ہندوستانی مسلمانوں نے انتہائی رنج و غم کے ساتھ عالم ربانی، مصلح کبیر، پیرو
مرشد اور دین حق کے عظیم اور بے لوث داعی: محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ”ابرار الحق حقؒ“
کو الوداع کہا، جنہوں نے اپنی حیاتِ مستعار کی ۸۶ منزلیں طے کرنے کے بعد ۸ ربیع
الثانی ۱۴۲۶ھ = مطابق ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء کی شب میں تقریباً پونے نوبجے، اپنے وطن
ہردوئی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

داعیانِ حق کے سلسلے کی آخری کڑی

مرحوم اُن چہندہ علماء، صلحائے اُمت اور داعیانِ حق کے سلسلے کی آخری کڑی تھے،
جنہیں برصغیر کے عوام و خواص میں یکساں مقبولیت اور اعتماد و استناد حاصل تھا، وہ اس
وقت خلقِ خدا کی دینی آرزوؤں کا مرکز، علمائے عظام کی جائے امید، دعا و مصلحین،
نیز اتباعِ سنت، دین کی عملی تعلیمات کے حصول، عقیدے کی درستی اور تعلق مع اللہ کی

(۱) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی ابرار احمد قاسمی، اجراوی، بہ روز جمعہ: ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۲ جولائی ۲۰۰۵ء۔

پس مرگ زندہ

مضبوطی اور استحکام کی لگن اور تڑپ رکھنے والوں کا واحد اور آخری مرجع تھے؛ اس لیے اُن کے اُٹھ جانے سے، اس دیار کے مسلمانوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے اُن کے سروں سے سعادت و خوش بختی کا ایک ایسا گھنیرا سایہ اُٹھ گیا ہے، جو — تو یقیناً خداوندی سے — اُنھیں مادیت کی تیز آندھی، دنیا سے غیر معمولی وابستگی اور روزِ سر اُبھارنے والے اُن ڈھیر سارے فتنوں کے طوفانِ بلاخیز کی اذیت رساں ”ٹھنڈک“ اور آگ برساتی ”دھوپ“ سے بچائے رہتا تھا، یعنی اُن فتنوں کی بلاخیزی سے جو بندگانِ خدا کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لینا چاہتے ہیں۔

دنیاوی مقبولیت و محبوبیت، نقدِ خدائی بدلہ

ترکیہ و احسان کی دنیا میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ - ۱۳۶۲ھ = ۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) کے خلفا میں صرف مولانا مرحوم ہی اب تک بہ قیدِ حیات تھے، جو بندگانِ خدا کو سیدھی راہ دکھلانے اور اپنی شبانہ روز کی بے پناہ کوششوں کے ذریعے، اُن کا خدا سے رشتہ جوڑنے اور اُنھیں سنتِ نبویؐ اور شریعتِ محمدیؐ کے قالب میں ڈھالنے کے لیے، ہر وقت فکر میں گھلتے اور پگھلتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں عامۃ الناس کی نگاہوں میں اتنی مقبولیت اور محبوبیت سے نوازا، جو ہمیں اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ قبل از مرگ یہ ربِ کریم کی بارگاہ سے ان کو نقد ملا ہوا بدلہ تھا۔ رہا روزِ محشر کا بدلہ تو وہ بھی اِن شاء اللہ اُنھیں بلا کم و کاست مل کر رہے گا۔ اُن کی وفات کی خبر وحشت اثر کے پھیلتے ہی ہزاروں معتقدین و محبین کو ایسا صدمہ اور ایسا رنج پہنچا جسے قیدِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ غم و اندوہ کے مارے اُن کی حالت ایسی دگرگوں ہو گئی، جیسے کسی نے اُن کی متاعِ حیات چھین لی ہو؛ چناں چہ اُن کی وفات کی خبر ملتے ہی وہ ذکر و اذکار، تلاوتِ قرآن و دعا اور اُن کی روح کو ثواب پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت سے بہرہ یابی کے لیے، جنھیں بھی صحت اور

تندرستی، طاقت اور توانائی اور عزم و حوصلے کی دولت بے بہا ہم دست تھی، اُن سے بروقت جس طرح بھی بن پڑا، شہر ”ہردوئی“ کے لیے روانہ ہو گئے؛ تاکہ اگر موقع ملے تو وہ اُن کے جسدِ خاکی کا آخری دیدار کر سکیں۔ حال اُن کہ نمازِ جنازہ کا مقررہ وقت ۹ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = مطابق ۱۸ مئی ۲۰۰۵ء چار شنبہ صبح نو بجے تھا، مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے پونے دس بجے ہی نمازِ جنازہ کی ادائیگی کی صورت نکل سکی۔ اُن کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے والے اور انھیں آخری آرام گاہ تک لے جانے کے سفر میں شامل ہونے والے علمائے دین نے بتایا کہ حاضرین کی اکثریت چیدہ لوگوں: علماء، بزرگانِ دین، طالبانِ علومِ دینیہ، دین داروں، پابندگانِ صوم و صلوٰۃ، احکامِ شرع پر چلنے والوں اور نیکوکاروں ہی پر مشتمل تھی۔ ہجوم کی کثرت کے باوجود مجمع انتہائی منظم اور پرسکون تھا، کوئی ایسی بد نظمی، انتشار اور افراتفری نظر نہیں آئی، جیسا کہ عام طور سے اس قسم کے جمِ غفیر میں، جس میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ضرور دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُن کی نمازِ جنازہ محدث کبیر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ = ۱۹۸۲ء) — جو جنت البقیع مدینہ منورہ میں آسودۂ خواب ہیں — کے دست گرفتہ اور مرحوم کے دیرینہ رفیقِ کار، قاری ”امیر حسن“ نے پڑھائی۔

بیماری کے باوجود پابندی اوقات

سن رسیدگی اور ہلکے پھلکے امراض کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوارض کو اگر چھوڑ دیا جائے، جن سے ہر شخص دو چار رہتا ہے، تو مرحوم عموماً صحت مند اور بہت چست رہتے تھے، اپنے مقررہ کام پابندی سے بغیر کسی کوتاہی کے سرانجام دیتے تھے؛ لیکن تین سال قبل انھیں برین ہمبرج ہو گیا تھا، جس سے لکھنؤ اور ممبئی جیسے بڑے شہروں میں بروقت علاج معالجے اور گہری طبی نگہداشت، ساتھ ہی اُن کے نیکوکار عقیدت مندوں اور محبتیں علماء، بزرگانِ دین، خصوصاً ہندوستان اور عموماً دنیا کے مختلف

خطوں سے تعلق رکھنے والوں کی سحرگاہی دعاؤں اور سب سے بڑھ کر توفیق خداوندی سے وہ بہت جلد شفا یاب ہو گئے۔ اس ناسازی طبع کی سنگینی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، انھیں ڈاکٹروں نے احتیاط و تحفظ برتنے کی صلاح دی تھی، مگر وہ عمر کے آخری ایام میں ان کے صلاح و مشورے پر کار بند نہ رہ سکے، گویا انھیں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ زندگی کے ایام گئے چُنے اور اُس کے لمحات محدود ہیں؛ لہذا وہ پہلے سے کہیں زیادہ جوش و جذبے کے ساتھ اصلاح کے مشاغل، دعوتی اُسفار اور تربیتی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ اُن کی حد درجہ بھاگ دوڑ۔ جس کی رو بہ زوال صحت اجازت نہیں دیتی تھی۔ کی وجہ سے اُن کے محبتیں و مخلصین اور رُفقاءے کار کو اُن کے حوالے سے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ مبادا کوئی حادثہ پیش آ جائے۔

مرحوم معمول کے مطابق منگل ۱۴۲۶/۴/۸ھ = ۲۰۰۵ء کو اپنی مجلس میں بعد نماز عصر تشریف رکھتے تھے کہ یکا یک بہت زیادہ بلغم آنے لگا۔ اس کے بعد کم زوری محسوس ہوئی، تو گھر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دماغ کی رگ پھٹنے کی وجہ سے بلغم کی بجائے خون آنے لگا۔ بہ مشکل تمام مغرب کی نماز ادا کر پائے تھے کہ خون منہ اور ناک سے بھی بہنے لگا نتیجہً سارا خون رگوں سے نکل کر باہر آ گیا۔ فوراً ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا، جنھوں نے بہ جلد شہر ”ہردوئی“ کے ہسپتال میں انتہائی نگہداشت والے یونٹ میں بھرتی کرانے کا مشورہ دیا۔ لیکن ابھی انھیں ایسبولینس میں سوار کرایا ہی تھا اور گاڑی در سے سے باہر بھی نہیں جانے پائی تھی کہ انھوں نے اپنی آخری سانس لی اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دیں۔

مرحوم کے پس ماندگان میں دو بھائی ہیں: ایک پاکستان میں رہتے ہیں اور دوسرے علی گڑھ میں۔ تین بھائی اور ایک بہن اُن کے حین حیات ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے نیک بیوی اور اولاد جسمانی میں اکلوتی بیٹی چھوڑی ہے، جو طبع یونانی کے ماہر حکیم جناب الحاج ”کلیم اللہ“ کی زوجیت میں ہیں، جنھیں اُن

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقّی

کے تمام دعوتی، تربیتی اور تعلیمی اُمور کے حوالے سے، اُن کا جانشین مُنَّخَب کیا گیا ہے۔ لڑکی کے بطن سے چھ اولاد: تین بیٹے (علیم الحق، فہیم الحق، سلیم الحق) اور تین ہی بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کو خدا نے ایک متقی، پرہیزگار اور نیک بخت لڑکے (اشرف الحق) سے بھی نوازا تھا، مگر عمر نے وفانہ کی اور نو عمری (۲۸ سال کی عمر) ہی میں ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء کو دارِ بقا کو سدھار گئے۔

مرحوم کے زیرِ نگرانی تزکیہ و احسان و سلوک کی تربیت پانے والوں کی مجموعی تعداد ۱۳۹ ہے۔ اُن میں سے مجاز بیعت کی تعداد ۱۰۳ ہے، جب کہ مجازِ صحبت کی تعداد ۳۶ ہے۔ پہلی قسم کے خلفا دنیا کے مختلف ممالک میں احسان و سلوک کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ چناں چہ ہندوستان میں ۶۰، پاکستان میں ۶، برطانیہ میں ۱، امریکہ میں ۱، افریقہ میں ۳، سعودی عرب میں ۱۱۵ اور بنگلہ دیش میں ۳۷ خلفا موجود ہیں۔

نقوشِ حیات

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقّی نے ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ = مطابق ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء کو اتر پردیش کے شہر ”ہردوئی“ کے ایک دین دار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ والد صاحب کا نام ”محمود الحق“ تھا، جو حضرت تھانویؒ کی بزمِ اصلاح و تربیت کے نامور رکن (مجازِ صحبت) تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وکالت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اُن کا شمار ”ہردوئی“ کے نام ور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ اُن کا آبائی وطن ”دہلی“ کے نواح میں قصبہ ”پلول“ تھا؛ لیکن اُن کا خاندان پہلے شہر ”میرٹھ“ منتقل ہوا، پھر شہر ”ہردوئی“ میں مستقل سکونت پذیر ہو گیا۔ اُن کا سلسلہ نسب ہندوستان کے مشہور محدث شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلویؒ (۱۵۵۱ھ/ ۱۵۵۲-۱۶۳۲ء) سے جا ملتا ہے؛ اسی لیے اُن کے نام کے ساتھ ”حقّی“ کا مشہور لاحقہ لگا ہوا ہے۔ اُن کے والد صاحب انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور وکالت کا پیشہ کرتے تھے؛ لیکن انھوں

نے خدائی فیصلہ کے مطابق۔ جس میں خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ اپنے سعادت مند لڑکے کے لیے یہی پسند کیا کہ وہ ایک اچھا اور باصلاحیت عالم دین بنے۔ اُن کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ اُن کی تعلیم کی بسم اللہ دارالعلوم کے سابق اُستاد اور خدا رسیدہ بزرگ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی (متوفی ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء) نے کرائی۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی تکمیلِ حفظ قرآن کی سعادت حاصل کر لی۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم ”ہردوئی“ میں ”جمعیت اسلامیہ“ کے زیرِ انتظام چلنے والے مدرسے میں مولانا انوار احمد اُٹھوئی مظاہری سے حاصل کی۔ یہ انجمن اُنھی کے والدِ محترم کی قائم کردہ تھی، جنہیں وکالت کے پیشے کی ڈھیر ساری مصروفیات کے باوجود، دینی اور رفاہی کاموں سے بے پناہ دل چسپی تھی، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ کم عمری میں ہی علومِ شرعیہ کی تحصیل میں ترقی کرتے چلے گئے۔ دس سال کی عمر میں وہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء میں مدرسہ ”مظاہر علوم“ سہارنپور چلے گئے، جو ”دارالعلوم“ کے بعد بزرگ کی دوسری سب سے بڑی اسلامی درس گاہ ہے، وہاں داخل ہو کر ابتدائی عربی تعلیم کے حصول میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔

مثالی طالب علم

اُنھوں نے حصولِ تعلیم میں محنت اور لگن، ذکر و عبادت کی پابندی اور وقت کے صحیح استعمال کے حوالے سے، ایک مثالی طالب علم کے مطلوبہ معیار پر پورا اُترتے ہوئے، ابتدائی سے لے کر اعلیٰ اور تخصصات تک کی تعلیم کے تمام مراحل بہ حسن و خوبی طے کیے۔ وقت کے کسی بھی لمحے اور وقفے کو اُنھوں نے رایگانہ نہ جانے دیا۔ وہ تہجد کی نماز کے طالبِ علمی کے زمانے میں بھی پابند تھے۔ مدرسہ ”مظاہر علوم“ کے زمانہ طالب علمی میں وہ اپنے اُستاد مولانا عبداللطیف صاحب کے خادمِ خاص تھے، جو اُس وقت ”مظاہر علوم“ کے ناظم کے عہدے پر فائز تھے۔

اُنھوں نے تعلیمی سال ۱۳۵۵-۱۳۵۶ھ میں دورہ حدیث شریف کا ششماہی

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حق

امتحان اول نمبر سے پاس کیا، جس سے خوش ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے، انھیں اپنے استاذ، محدث کبیر مولانا ”خلیل احمد سہارن پوری“ (جائے پیدائش نانوتہ: ۱۳۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء) جاے وفات مدینہ منورہ: ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) کی ابوداؤد کی مایہ ناز عربی شرح ”بذل المجہود“ مکمل سیٹ انعام میں دی؛ لیکن وہ اچانک بہت زیادہ علیل ہو گئے، جس کی وجہ سے مذکورہ تعلیمی سال میں دورہ حدیث کا سالانہ امتحان نہ دے سکے؛ چنانچہ تعلیمی سال: ۱۳۵۶-۱۳۵۷ھ میں اُن کا اعادہ سال ہو گیا اور ماضی ہی کی طرح ریکارڈ کام یابی درج کرتے ہوئے اول نمبر سے سالانہ امتحان پاس کیا۔ آئندہ دونوں تعلیمی سال: ۱۳۵۶-۱۳۵۷ھ اور ۱۳۵۸-۱۳۵۹ھ مظاہر علوم ہی میں گزارے اور مقولات و منقولات کی معرکتہ الآرا کتابوں میں گیرائی اور گہرائی حاصل کی اور دونوں سالانہ امتحانوں میں امتیازی نمبرات سے کام یاب ہوئے۔ اُن کی بے پناہ علمی قابلیت، تعلیمی صلاحیت، ساتھ ہی صلاح و تقویٰ اور دین داری کی اس شہادت سے زیادہ قوی اور مضبوط کوئی شہادت نہیں ہو سکتی، جس کا اظہار فقہ حنفی کی مستدل احادیث کی انسائیکلو پیڈیا ”اعلاء السنن“ (۲۰ جلدوں) کے مصنف اور حضرت تھانویؒ کے بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی دیوبندی تھانویؒ (۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ = ۱۸۹۲-۱۹۷۴ء) نے کسی مدرسے کے مہتمم کے نام ارسال کیے گئے اپنے ایک خط میں کیا تھا، جس کی توثیق حضرت تھانویؒ نے اپنے دست خط کے ذریعے یہ کہتے ہوئے کی تھی: ”بندۂ عاجز اشرف علی درج بالا مکتوب کی حرف بہ حرف توثیق کرتا ہے۔“ خط کے مندرجات درج ذیل تھے:

”میں مولوی ابرار الحق سلمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں، یہ انتہائی دین دار اور ذی استعداد عالم ہیں، ان کی صلاحیت پر ”مظاہر علوم“ کے مدرسین اور ناظم صاحب کو۔۔۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔۔۔ پورا اعتماد ہے۔ انھوں نے مظاہر علوم میں مقررہ تعلیمی نصاب کے مطابق انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ علوم شرعیہ کی

پس مرگ زندہ

تحصیل کی ہے۔ ماشاء اللہ حافظ قرآن اور قاری بھی ہیں۔ یہ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ، تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ طلبہ ان کے اسلوب تدریس کے دل دادہ ہیں۔ یہ اپنے ہم عصروں سے تقویٰ، پرہیزگاری اور علم و عمل میں حد درجہ بڑھے ہوئے ہیں۔ (ذکر ابرار ص: ۱۵)

صلاحیت و قابلیت کا تعلق اخذ و کتاب سے ہے، اس لیے یہ اسی وقت آسان اور ممکن ہوتا ہے، جب کہ معلم با کمال اور مطلوبہ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ، صلاح و تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط و مستحکم تعلق سے بھی سرفراز ہو۔ حضرت مرحوم کو یہ سب کچھ اُس مدرسے میں باسانی میسر آیا، جو سربراہ و ردہ علماء، نام ورمحمد شین اور بزرگانِ دین کے وجودِ مسعود سے بہرہ یاب تھا؛ چنانچہ آپ کے اساتذہ میں ناظم مدرسہ مولانا عبداللطیفؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء) صدر مدرس مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ (متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بن تخی کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) مولانا منظور احمد خانؒ (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) مولانا اسعد اللہ رام پوریؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۸ء) صدر مفتی: مفتی سعید احمدؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) مولانا ظریف احمدؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) مولانا عبدالجبار اعظمیؒ (متوفی ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء) اور مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (متوفی ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء) جیسے بڑے بڑے علمائے دین تھے۔

توفیق الہی کی ہم رکابی

فصلِ خداوندی اور اپنے والد بزرگوار کی دعاؤں کے صدقے، ہمیشہ توفیق الہی اُن کے ہم رکاب رہی اور روزِ اول ہی سے علومِ شرعیہ میں پختگی اور مہارت کے ساتھ، تقویٰ و پرہیزگاری اور تعلق مع اللہ کی استواری میں ہمہ تن لگے رہے۔ چنانچہ وہ جہاں ایک طرف محنتی طالب علم تھے، وہیں دوسری طرف تہجد گزار اور بیچ وقتہ نمازوں

کے پابند بھی تھے۔ اسی محنت و لگن اور مجاہدے کو دیکھ کر، اُن کے استاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا تھا:

”مولوی ابرار الحق“ کو خدا نے زمانہ طالب علمی ہی میں احسان و سلوک

اور اپنے ساتھ تعلق کی بے بہا نعمت سے نوازا ہے۔“ (۱)

بعض مطالعہ کنندہ کو حضرت کی طالب علمی کے زمانے میں لکھے گئے چند نوٹ بک اور یادداشتیں ملی ہیں، جن میں وہ اپنا روزنامہ مکمل پابندی کے ساتھ درج کیا کرتے تھے، حال آں کہ اُن کی عمر اُس وقت صرف ۱۳ سال تھی۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

”میں رات کو تہجد کے لیے بیدار ہوا۔ ناظم صاحب (مولانا عبد اللطیف) کے لیے وضو کا پانی لایا، پھر میں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد اُن سے ”مختصر المعانی“ کا مقررہ سبق پڑھا اور دیگر کتابوں کے اسباق کی تیاری کی۔“

حضرت تھانویؒ کی دست گرننگی

مظاہر علوم میں پڑھنے کے دوران ہی حضرت تھانویؒ سے وہ وابستہ ہو گئے۔ اُن کے گھر کا ماحول چوں کہ خالص علمی اور دینی تھا؛ اس لیے بچپن ہی سے احکام الہی پر کار بند رہے۔ اُن کی نشوونما دینی ماحول میں ہوئی تھی؛ اس لیے صلاح و تقویٰ اُن کی فطرت بن گیا تھا۔ وہ ایام طالب علمی میں ہر ہفتے اپنے پیر و مرشد کی زیارت کے لیے ”تھانہ بھون“ جاتے، اُن کی تعلیمات و ہدایات سے رشد و ہدایت کا چراغ اپنے دل میں روشن کرتے، اپنے رب کی چوکھٹ پر جمیں نیاز خم کرنے کا سلیقہ سیکھتے اور حضور ﷺ کی محبت سے محفوظ ہونے اور آپ ﷺ کی سچی پیروی کے راز و انداز کی معرفت حاصل کرتے تھے۔ وہ اپنی چھٹی کے سارے ایام اپنے شیخ کی خدمت ہی میں گزارتے اور

وہاں رہ کر اپنے اندر شریعت کی روح کو جذب کرتے، اخلاص کے معانی و مفاہیم کی آگاہی سے بہرہ ور ہوتے اور مکمل دین پر عمل کرنے کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ اپنے مریدوں اور اپنے ہاں تربیت پانے والوں کی کڑی نگرانی کیا کرتے تھے؛ اسی لیے وہ بیعت و خلافت اور تربیت و تزکیہ باطن کی اجازت صرف اسی شخص کو دیا کرتے تھے، جس کو وہ مکمل راست روی، بھرپور دین داری اور زندگی کے تمام شعبوں میں امانت و دیانت کے مطلوبہ معیار پر، پورا اُترتا ہوا پاتے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے انھیں سنہ ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء ہی میں اجازت و خلافت کے اعزاز سے سرفراز فرمادیا، جب کہ اُن کی عمر ۲۲ سال کی بھی نہ تھی۔ اس سے اس بات کا بھی یہ خوبی پتہ چلتا ہے کہ صلاح و تقویٰ اُن کے رگ و ریشے میں پیوست تھا۔ شاید ہی کسی عالم کو اس نوعمری میں بیعت و خلافت کی اجازت حضرت تھانویؒ جیسے دقیق النظر شیخ سے ملی ہوگی۔ حضرت تھانویؒ کا کسی کو بیعت و خلافت کی اجازت سے نوازنا، درحقیقت اس بات کی پختہ دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ دین داری اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی کے حوالے سے قابل اعتماد، مادیت کے میل کچیل سے دھلا ہوا اور ہوائے نفس کی آلودگیوں سے پاک صاف ہے۔ تاہم اجازت ملنے کے بعد مولانا ابرار الحق صاحبؒ نے اپنے آپ پر اعتماد کیا اور نہ اپنے آپ کو اصلاح و تزکیے سے بے نیاز تصور کیا؛ چنانچہ وہ حضرت تھانویؒ سے استفادہ کرنے اور اُن کے سامنے اپنا احوال پیش کرنے کے لیے، برابر اُن سے مراجعت کرتے رہے۔ اپنے خاص پیرومرشد کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، اُنھی کے ایک خلیفہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) سے وابستہ رہے۔ اُن کے بھی دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد حضرتؒ کے دگر خلفا: مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ (متوفی ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ (متوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) سے تعلق قائم رکھا۔ جب یہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، تو مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حق

(متوفی ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۱ء) اور دارالعلوم کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی (متوفی ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء) سے رابطہ رکھا۔

تدریسی خدمات

- ۱- مظاہر علوم سے فراغت اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں تخصصات کے شعبوں کے نصاب کی تکمیل کے بعد وہیں معین مدرس رکھ لیے گئے۔
- ۲- کچھ عرصے بعد، اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کے حکم پر انھیں کے قائم کردہ مدرسہ ”جامع العلوم کان پور“ میں تقریباً دو سال تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔
- ۳- پھر انھیں کے مشورے پر مدرسہ اسلامیہ فتح پور، ہنسوہ چلے گئے، جہاں دو سال تک تدریس کی خدمات انجام دی۔
- ۴- حضرت شیخ ہی کی ہدایت پر اپنے وطن ہردوئی میں ”آشرف المدارس“ کے نام سے ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور وقت کو صحیح مصرف میں خرچ کرتے ہوئے، مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت، اُن میں دین کی صحیح تخم ریزی اور مادیت کے سیلاب بلاخیز میں بہ جانے سے بچاؤ کے عظیم مقصد سے، انتہائی فروتنی و انکساری اور جاں فشانی کے ساتھ، عرصہ دراز تک تنہا ہی مقررہ درسی کتابوں کی تدریس کی ذمہ داری، سرانجام دیتے رہے۔

دینی و دعوتی و تربیتی خدمات اور کارنامے

انھوں نے ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۰ء میں اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کی قائم کردہ ”مجلس دعوة الحق“ میں از سر نو جان ڈالی۔ اس مجلس کا مقصد تھا: بدعات و خرافات کو نیک و بن سے اکھاڑ پھینکنا، مسلم معاشرے میں صلاح و تقویٰ کی روح پھونکنا، اُسے غیر اسلامی رسم و رواج کی آلائشوں سے پاک صاف کرنا، تعلیمی پس ماندگی کے خاتمے، مسلم بچوں

میں تعلیمی بے داری لانے اور انھیں دین کی اُن بنیادی تعلیمات سے واقف کرانے کے لیے، بڑے پیانے پر مہم چلانا، جن کے بغیر اُن کا مسلمان رہنا ممکن نہیں، نیز دینی مکاتب قائم کرنا، دعویٰ پروگرام اور اجتماع منعقد کرنا اور اُس کی وساطت سے بڑوں اور چھوٹوں کو دین حاصل کرنے اور اُس پر عمل کرنے کی راہ پر لگانا۔ چوں کہ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد یہ مجلس بے جان ہو کر رہ گئی تھی؛ اس لیے اُنھوں نے اِس کا از سر نو آغاز کیا اور ملک اور بیرون ملک میں اِس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے انتھک کوشش کی؛ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اثرات ہندوستان سے تجاوز کر کے افریقہ، یورپی ممالک، امریکا، عرب ممالک اور پاکستان و بنگلہ دیش پہنچ گئے، جہاں آپؒ بار بار تشریف لے گئے اور جہاں کے مسلمان تربیت و تزکیے کے تعلق سے آپؒ سے وابستہ ہوئے۔ حضرتؒ نے اپنی زندگی میں صحت و تجوید کے ساتھ قرآن کریم اور دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم کے لیے ۹۶ مکاتب قائم کیے، جو ضلع ”ہردوئی“ کے اطراف اور دگر ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نیز ان مکاتب کے طرز پر جنوبی افریقہ، برطانیہ، امریکا اور بنگلہ دیش وغیرہ میں بھی مکاتب کا قیام عمل میں آیا، جہاں کے مسلمانوں کی بڑی تعداد، آپؒ کی دست گرفتہ ہے اور آپؒ کی صحبت و تربیت سے فیض یاب ہوتی رہی ہے۔

چندہ کے سلسلے میں اُن کا مسلک

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت مولانا ابراہار الحق صاحبؒ نے، مکاتب اور اپنے مدرسے ”اشرف المدارس“ میں عوامی چندوں پر تکیہ کرنے، پیشے کے طور پر چندہ اکٹھا کرنے اور اُس کو کمائی کا ذریعہ بنالینے سے مکمل گریز کرنے کے حوالے سے، اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کے ہی اصول اور طریقہ کار پر عمل کیا؛ چنانچہ اُنھوں نے اپنے مدرسے اور مکاتب کی بنیاد ہی مال داروں کی کا سہ لپسی سے بالکل یہ احتراز پر رکھی؛ اسی لیے اُنھوں نے، چٹکی، کانوکھا اور مثالی نظام قائم کیا اور مسلم عورتوں سے یہ اپیل کی

کہ وہ تینوں وقت: صبح، دوپہر اور شام آنا اور چاول میں سے بہ قدر چنگی نکال لیا کریں کہ اہل خانہ کی خوراک میں کمی نہ ہو اور اُسے کسی برتن میں جمع کر کے مکاتب میں زیرِ تعلیم چھوٹے بچوں کے ہاتھ بھجوا دیں۔

لیکن وہ اُن لوگوں کے چندے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا کرتے تھے، جو انتہائی مخلص ہوتے تھے، شہرت و نام وری سے دور اور صرف آخرت کے اجر و ثواب کے طلب گار ہوتے تھے۔ مولانا اپنے آدمیوں کو، اپنے مدرسے یا مکاتب کی امداد کے لیے کسی طرح کے اشارے سے بھی کلی اجتناب کا حکم دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس بات پر مکمل ایمان رکھتے تھے کہ علماء، دعاۃ اور مذہبی لوگوں کا بہ ذاتِ خود چندہ کرنا اور اس کے لیے مال داروں اور تاجروں کی خوشامد کرنا، اُن کے وقار کو جراثیم پہنچاتا اور اُن کی حیثیت و وقعت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ کوئی مال دار یا تاجر اُن کی زیارت کے لیے آتا، تو وہ اُن کے ساتھ اپنے مدرسے ”اشرف المدارس“ یا کسی مکتب کا گشت نہیں کرتے تھے؛ لیکن علمائے دین، صوفیائے کرام اور نیکو کاروں کو از خود مدرسہ اور مکاتب گھوم پھر کر دکھایا کرتے تھے، جن کا آپؒ کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا؛ تاکہ آپؒ سے شرفِ ملاقات کے علاوہ مسلمانوں کے نو نہالوں اور نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے، آپؒ کے ہاں معمول ہے جن طریقہ ہائے تعلیم و تربیت کو صالح، نفع بخش اور کارآمد پائیں، انھیں اپنا کر اپنے ہاں کے مدارس و مکاتب میں نافذ کریں اور وہاں کے نافذ العمل طریقہٴ تعلیم و تربیت میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں، تو اپنے تاثرات میں اظہار کریں؛ تاکہ اس کی اصلاح کی جاسکے، جیسا کہ وہ خود اس کا تاکید ہی دیتے تھے۔

سنن نبویہ کا احیا

جو چیز انھیں معاصر علماء سے ممتاز کرتی تھی، وہ اُن کا سنن نبویہ کے احیا کا حد درجہ

اہتمام، لگن اور تڑپ تھی۔ اسی وجہ سے انھیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں ”محمی السنہ“ کے لقب سے جانا جاتا تھا؛ چنانچہ وہ خود بھی زندگی کے تمام شعبوں: جلنے، پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، آرائش وزیالیش، پوشاک ولباس، گھر اور مسجد، خلوت و جلوت، صبح و شام، لوگوں سے ملاقات و زیارت، مریض کی عیادت وغیرہ اور عبادات و معاملات سے لے کر اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اتباع سنت کے پابند تھے اور اپنے رفقا اور واردین و صادرین کو بھی اس کا پابند بناتے اور ان سنتوں کی قدر و قیمت کا دھیان دلاتے، جنھیں معمولی سمجھ کر عوام خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنے خطبات، پند و نصائح، مجلس گفتگو، نیز سفر و حضر میں اور اپنی تحریروں، پمفلٹ، ہینڈ بل وغیرہ کے توسط سے اس طرف اُن کی توجہ مبذول کراتے تھے۔ حضرت اپنے مصاحبین و خدام کے تعاون سے خود ان چیزوں کی تیاری میں دل چسپی لیتے اور اپنی قیام گاہ ہر دوئی یا دعوتی اور اصلاحی دوروں میں مختلف مقامات پر اپنے ملاقاتیوں میں انھیں تقسیم کرتے تھے۔

ماہ شعبان ۱۴۲۳ھ = ۲۰۰۲ء کو راقم السطور کا ممبئی جانا ہوا اور وہاں کے بعض ہسپتالوں میں شکر کے مرض اور اس سے پیدا ہونے والے خطرناک عوارض کے علاج کے سلسلے میں، پورا ایک مہینہ وہاں قیام رہا۔ اس دوران میری ملاقات کو بہت سے پُرانے اہل تعلق اور اُن کے نحیین و متعارفین آتے رہے، جنھیں وہاں میری موجودگی کا علم ہوا۔ اُن میں سے اکثر لوگ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کے علاج کے لیے، ممبئی تشریف لانے کا تذکرہ کرتے تھے؛ کیوں کہ حضرتؒ وہاں میرے پہنچنے سے کچھ ہی دنوں پہلے، واپس تشریف لے گئے تھے۔ میری عیادت کو آنے والے، اکثر لوگ نہایت لذت اور تاثر کے ساتھ بعض ہسپتالوں میں علاج معالجے کے دوران، اُن کی عیادت کرنے والے اہالیانِ شہر کے قلوب پر اُن کی مختصر صحبت کی اثر انگیزی کو بیان کرتے تھے، انھوں نے بتایا کہ بہت سے چھوٹوں اور بڑوں نے، مریض کی عیادت و دعا کے تعلق سے حضور ﷺ سے منقول دعائیں یاد کر لیں؛ بل کہ وہ لوگ میری عیادت کے وقت بھی وہی

دعائیں پڑھتے تھے۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ

”حضرت کے مبارک اسفار اور وقتاً فوقتاً ہمارے درمیان اُن کی مختصر یا طویل اقامت سے ہمیں بے پناہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ سنتوں کے سیکھنے، اُن کی تکرار اور ہر موقع سے اُن پر بغیر کسی اکتاہٹ کے عمل کرنے کی عادت ڈال لینے کا زریں موقع ہوتا ہے؛ اس لیے کہ حضرت ہمیں اُن کی تعلیم اس طرح دل آویز انداز میں دیا کرتے ہیں کہ وہ کسی پرگراں نہیں گزرتا اور سنتیں معمول کی زندگی کا جزو بن جاتی ہیں۔“

مُنکَر پر نکیر

آپ کو ایسے بہت سے عالمِ دین اور داعیِ آسانی سے مل جائیں گے، جو اَمْر بالمعروف کرتے اور خیر کی دعوت دیتے ہیں؛ لیکن منکر پر نکیر کرنے والے شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ دعوتی میدان کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ اَمْر بالمعروف داعیوں کے لیے، نہیں عن المنکر سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ چوں کہ اَمْر بالمعروف ایک مُثبتِ عمل ہے، جو اَمْر پر گراں بار ہوتا ہے، نہ مامور پر اور نہ ہی یہ عموماً، مامور کی طرف سے اَمْر کے خلاف کسی سرکشی، روگردانی، یا منفی ردِ عمل کا سبب بنتا ہے؛ لیکن نہی عن المنکر دونوں ہی فریق کے لیے یکساں دشوار گزار ہے؛ اس لیے کہ نہی عن المنکر کرنے والے شخص کو، مخاطب کی جانب سے اکثر و بیشتر، روگردانی، اعراض، بغض و عداوت اور منفی ردِ عمل کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اَمْر بالمعروف ایسا ہے، جیسے مامور کو کسی بخشش یا عطیہ سے نوازا نا اور نہی عن المنکر ایسا ہے، جیسے مخاطب سے اُس کی کوئی محبوب اور عزیز ترین چیز چھین لینا اور کسی بھی انسان پر یہ بات ناقابلِ برداشت حد تک گراں گزرتی ہے کہ مفت میں اُسے اپنی مملوکہ چیز سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اَمْر بالمعروف کی بہ نسبت نہی عن المنکر کا دشوار عمل ہونا، اس بات سے بھی عیاں ہے کہ نبی ﷺ نے عزم و حوصلے اور جرأت و استقامت کے لحاظ سے نہی عن المنکر کرنے والے کی تین قسمیں بتائی ہیں، فرمایا: ”جو شخص کسی منکر کو دیکھے، تو

وہ اُس کا اولاً اپنے ہاتھ سے ازالہ کرے، اگر اس کی استطاعت نہ رکھے تو اپنی زبان سے اُس کے ازالے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھے تو دل میں اُس کو برا سمجھے۔ یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے، (مسلم) لیکن آپ ﷺ نے امر بالمعروف کرنے والے کی تین قسمیں نہیں بتائیں۔ گویا کہ نبی عن المنکر کرنے والا صرف ایمان کے اعلیٰ درجے کا حامل نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ اقویٰ، اضعف اور اوسط میں سے کسی درجے کا حامل ہوتا ہے۔

مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے، جو دین کے معاملے میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتے اور برائیوں کا جو کوئی بھی ارتکاب کرتا بے چین ہو جاتے اور اُس پر تکبر کیے بغیر نہ رہتے۔ وہ اس سلسلے میں حکمت و مصلحت، حالات کی رعایت اور نبی عن المنکر کے عظیم فریضے کی انجام دہی میں دانش مندانہ آہستہ روی کے ساتھ، جرأت مندی سے بھی کام لیتے تھے؛ اس لیے کہ وہ حضرت تھانویؒ کی تربیت گاہ کے تربیت یافتہ تھے، جو ”حکیم الامت“ کے لقب سے پوری دنیا میں اسی وجہ سے مشہور ہوئے کہ وہ دینی احکام کے دونوں شعبوں: اوامر و نواہی میں ایسی حکمت اور دانش مندی سے بھرپور طور پر کام لیا کرتے تھے، جس پر قرآن و حدیث نے بے انتہا زور دیا ہے۔

مرحوم نے مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت ساری غلطیوں کی اصلاح کی اور اخلاق و آداب، عبادات و معاملات، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے، اسلامی احکام سے ناواقفیت یا برادران وطن کے ساتھ بود و باش کے نتیجے میں جو خرابیاں معاشرے میں در آئی ہیں، اُن کا بڑے حکیمانہ انداز میں ازالہ کیا؛ چنانچہ وہ بے حیائی و بے حجابی کی تمام شکلوں، گُنہوں سے نیچے لباس پہننے، داڑھی مونڈوانے، یا مشیت بھر سے کم داڑھی کو ترشوانے، تصویر کشی، غیبت، چغل خوری، بے ہودہ گوئی، اجنبی عورت پر نظر ڈالنے، کسی پر بُری نگاہ ڈالنے، مال میں اسراف اور فضول خرچی، خوشی و مسرت کی تقریبات خصوصاً شادی بیاہ اور موت میں غیر اسلامی رسومات؛ والدین کی نافرمانی، رشتہ داروں سے بدسلوکی اور اُن

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حق

سے قطع تعلق، ٹیلی وژن دیکھنے، سنیما بنی اور اس کے علاوہ جتنی برائیوں کے جراثیم مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سرایت کر گئے تھے؛ اُن سب سے روکا کرتے تھے۔
منکر پر نکیر کے تعلق سے مرحوم کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے سامنے منکرات کے دائرے میں آنے والے کسی بھی عمل کے ارتکاب کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی اور وہ اُن کی نکیر سے پہلے ہی اُس سے رک جاتا تھا۔

قرآن کریم کی تصحیح و تجوید کا غیر معمولی اہتمام

قرآن کریم کو اُس کے حروف کی صحیح ادا گی: یعنی تجوید و قراءت کے قواعد کی مکمل رعایت کرتے ہوئے پڑھانے کو، اُنھوں نے اپنے تدریسی سفر کے آغاز سے ہی؛ اپنا مشن بنالیا تھا، اُنھوں نے اس مشن کو بڑے پیانے پر برپا کیا اور اس بات کا پختہ عہد کر لیا کہ وہ آخر دم تک اپنے کو اس راہ سے الگ نہیں کریں گے؛ چناں چہ اُنھوں نے اور اُن کے مدرسین نے صرف مجلس ”دعوت الحق“ کے ماتحت چلنے والے مکاتب میں قرآن کی تعلیم کو محدود نہیں رکھا؛ بل کہ اس شعور کو عامۃ المسلمین میں بیدار کیا اور اُنھیں یہ نصیحت کی کہ وہ اس اہم کام کے لیے اپنی اپنی مسجدوں میں فجر کی نماز کے بعد دس یا پندرہ منٹ فارغ کریں؛ تاکہ ائمہ کم از کم ایک آدھ آیت کے حروف کے مخارج کی تصحیح کرادیا کریں۔ بسا اوقات وہ بنفس نفیس اس عظیم اور مہتم بالشان کام میں شریک ہوتے اور مسلم عوام و خواص کو اس کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلاتے۔ اُنھوں نے اس اہم کام کے لیے تجوید و قراءت کے بنیادی قواعد پر مشتمل متعدد رسالے بھی ترتیب دیے اور مکاتب کے مدرسین کو یہ حکم دیا کہ وہ اُن قواعد کو چھوٹے بچوں کو حفظ کرائیں اور قرآن کی تعلیم میں اس کا نفاذ کریں۔ مرحوم اس مقصد سے وقفہ فو قنا تر بتی اجلاس بھی منعقد کرتے تھے، جس میں مدرسہ اشرف المدارس اور ”ہردوئی“ کے دیگر مکاتب میں کام کرنے والے اساتذہ، اجلاس میں ملک بھر سے آنے والے مندوبین کو ٹریننگ دیا کرتے تھے۔

پس مرگ زندہ

حضرتؒ کی اس تحریک نے۔ جس سے وہ مرتے دم تک لگے رہے۔ ملک بھر میں پھیلے مدارس و مکاتب میں ہمہ گیر اثر چھوڑا، جس کی بازگشت سے بیرون ہند کے مدارس و مکاتب کے بام و در بھی گونج اٹھے؛ چنانچہ عصر حاضر میں قرآن کریم کو صحت حروف اور قواعد تجوید کے ساتھ پڑھنا پڑھانا محبوب مشغلہ بن گیا ہے اور عامۃ الناس بھی، اس سے کافی حد تک دلچسپی لینے لگے ہیں؛ بل کہ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ ایسا عالم دین جو تجوید کے قواعد سے نا آشنا ہو، حلقہ مدارس میں ”اچھوت“ یا ”اچھوت جیسا“ محسوس ہونے لگا ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں ایسا مسرت بخش ماحول نہیں تھا، اُس زمانے میں اکثر علمائے دین، قرآن کریم کو عجبی لب و لہجے میں پڑھا کرتے تھے، جس کو عربیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اور میرے ہم درس وہم عصر اُن کی قراءت میں در آنے والی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: ”فلاں شخص قرآن کو اردو میں پڑھتا ہے“۔ اب جب کہ ہم اپنی عمر کے چھٹے دہے میں ہیں تو ہماری نسل نو، خدا کا شکر و احسان ہے کہ قرآن کریم کو قواعد تجوید کے بھرپور لحاظ کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے، جو ہماری طالب علمی کے زمانے میں ناپید تھی۔ اس خوش گوار تبدیلی میں جہاں بہت سے اسباب دخل ہے، وہاں بنیادی دخل حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ کی تحریک و دعوت کا ہے۔

اذان و اقامت کی تصحیح کا اہتمام

تصحیح قرآن کے ساتھ، مرحوم اذان و اقامت کی تصحیح کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ اسلام کے ان دونوں اہم ارکان سے ہمارے برصغیر کے عوام اور بعض خواص بھی۔ اللہ انھیں ہدایت دے۔ یہ تصور کرتے ہوئے غفلت و بے اعتنائی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بھلا اذان و اقامت بھی کوئی ایسی چیز ہے، جس پر توجہ دی جائے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ اپنی مسجدوں میں ایسے موزنون کا تقرر کرتے ہیں، جنھیں اذان دینے اور

حضرت مولانا شاہ ابراہیم الحق حق

اذان و اقامت کے کلمات کی ادائیگی کا کوئی شعور نہیں ہوتا، عام طور پر وہ بھونڈی آواز اور مکروہ لب و لہجہ والے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ایام طفولت میں سنا تھا کہ ایک عیسائی کو اسلام کے غیر جانب دار مطالعے اور اُس کی حقیقت سے جان کاری کے بعد اسلام لانے کی توفیق ہوئی۔ اتفاق سے اس نے برصغیر کے بعض ممالک کا دورہ کیا۔ جیسے ہی اُس نے اذان دیتے وقت مؤذنوں کی بھدی اور بے مزہ آواز سنی، اُس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلابہ اتار پھینکا اور کہنے لگا: میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان، دین اسلام کے سب سے بڑے شعار کی ادائیگی کے لیے اس قسم کی بھونڈی اور مکروہ آواز سے بکلاتے ہوں گے۔

بہر کیف اُنھوں نے اذان و اقامت کے حوالے سے، مسلمانوں کی حد درجہ غفلت شعاری کا اِدارک کر لیا اور ان دونوں کی اصلاح کو اپنے دعوتی مشن کا ایک اہم حصہ بنالیا، جس سے وہ جیتے جی دست بردار نہ ہوئے؛ چنانچہ وہ صرف ان دونوں کے حروف و کلمات کی تصحیح پر ہی اکتفا نہ کرتے؛ بل کہ مدّت کی درستگی، دراز گی الف، خصوصاً لفظ ”اللہ“ کے درمیانی الف کو کھینچنے وغیرہ سے منع کرنے پر بھی اپنی توجّہات مرکوز رکھا کرتے تھے۔ مؤذنین، ائمہ اور طلبہ کو اذان و اقامت کے الفاظ خود سکھاتے تھے، قراءت میں تجوید کے قواعد اور ترتیل کے اُصولوں کی ماہرانہ رعایت کرتے تھے۔ چوں کہ اذان و اقامت، مذہب اسلام کے سب سے بڑے رکن میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ بنا بریں دروازہ کو بھی اتنا خوب صورت اور شان دار ہونا چاہئے؛ تا کہ اندر کی عمارت کی خوب صورتی کا پتہ دے؛ اس لیے وہ مسلمانوں میں اذان و اقامت کی اہمیت کے شعور کی بیداری میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے تھے۔

تصحیح نماز کی تحریک و دعوت اور اس کے لیے سرگرمی پیہم

نماز اسلام کے چاروں ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، وہ کفر و ایمان کے

ماہین واضح حد فاصل ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بقول اس کی مذہب اسلام میں اتنی اہمیت ہے کہ جس نے اُسے ضائع کر دیا، وہ دگر ارکان کو بہ درجہ اولیٰ ضائع کر دے گا۔ اسی لیے حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ نماز کو فرائض و سنن اور مستحبات کے مضبوط سانچے میں ڈھال کر ادا کرنے کی دعوت دیتے تھے؛ تاکہ ادائیگی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اُنھوں نے یہ ادراک کر لیا تھا کہ مسلمان عموماً نماز چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی پابندی نہیں کرتے اور جو مسلمان اس حوالے سے باتوفیق واقع ہوا ہے، وہ اس کی کما حقہ ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے اور سنن و مستحبات کو جانے دیجیے، وہ فرائض و واجبات کے ساتھ بھی نماز ادا نہیں کرتا؛ چنانچہ اُنھوں نے نماز کو اُس کے تمام ارکان: فرائض و سنن اور مستحبات کی رعایت کے ساتھ ادا کرنے کی مسلمانوں کو ٹریننگ دینے کا اہتمام کیا۔ وہ اس بات کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے کہ ہماری نمازیں آپ ﷺ کی نماز جیسی ہوں۔ اسی غرض سے اُنھوں نے متعدد چارٹ تیار کیے، جن میں فرائض و سنن اور نماز کے تمام ارکان درج ہوتے، جس کو وہ اپنے ہاں آنے جانے والوں کے توسط سے عام کیا کرتے تھے، اُن ارکان اور سنن و مستحبات کو یاد کرنے اور نماز کی ادائیگی کے دوران اُس پر عمل کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی خانقاہ اور اپنے مدرسے میں نماز کو اُس کے تمام آداب کی رعایت کے ساتھ ادائیگی کی عملی ٹریننگ کے لیے، ایک مضبوط نظام کا وضع کر رکھا تھا، جس کی تنفیذ نماز فجر کے فوراً بعد عمل میں آتی تھی؛ چنانچہ ہر طالب علم، ہر مدرس اور اُن کی خانقاہ میں زیر تربیت ہر شخص، نماز اس طرح ادا کرتا تھا، جو سنت نبویؐ سے قریب تر ہوتی تھی۔ مرحوم، سفر و حضر میں بھی اس کا بھرپور خیال رکھتے اور ہندو بیرون ہند جہاں بھی قیام فرماتے، مسلمانوں کو اس کا پابند بناتے تھے۔

دعوتی و دینی رسائل اور کتابیں

مرحوم نے مختلف اسلامی موضوعات پر پچیس (۲۵) سے زائد کتابیں اور رسالے

لکھے اور اُن کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ تمام کتابیں اور رسائل دین کی طرف امت مسلمہ کی بازگشت کی دعوت، مسلمانوں میں در آنے والی برائیوں کی اصلاح اور امت کی کجی و بے راہ روی کو درست کرنے کی فکر جیسے بنیادی اور اہم موضوعات پر مشتمل ہیں؛ چنانچہ وہ زندگی بھر اسی غم میں گھلتے اور پگھلتے رہے، امت کے ہر فرد کے اصلاح کی فکر اُن کے اندر اس طرح پیوست ہو چکی تھی کہ رات اور دن کے کسی بھی لمحے اور وقفے میں انھیں سکون میسر نہ آتا۔ آپ کی تقریر و تحریر، دورے و اسفار اور مجلسی گفتگو کا محور، یہی رفیع الشان اور عالی قدر مقصد ہوتا، یعنی امت مسلمہ کے بنیادی دینی و عقائدی ڈھانچے کو پاش پاش کر دینے والی مہلک بیماریوں کا علاج، جس کے نتیجے میں وہ اس طرح بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے کہ وہ اپنے اندر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور خالق کائنات پر ایمان رکھنے والی امت کی طرح اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہیں پاتی۔ وہ اپنے آپ پر بھی توجہ نہیں دے پا رہی ہے چہ جائے کہ وہ دوسروں کی خبر گیری، انسانوں کو بندوں کی عبادت کی تاریکی سے خداے واحد کی عبادت کی روشنی میں، دنیا کی تنگی سے اُس کی کشادگی میں اور دگر مذہب و ادیان کے ظلم و جور سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لانے کی فکر کرے۔ جو اپنے آپ کو فراموش کر دے، وہ بھلا کس طرح دوسروں کی خبر گیری کرے گا؛ اسی لیے امت مسلمہ کو اپنی اصلاح کی ذمہ داری کی سطح پر لانا، تاکہ وہ دوسروں کی اصلاح کی اہل ہو جائے اور اپنے رب کی جنت میں داخلے اور اجر و ثواب کی مستحق ہو جائے؛ یہی کچھ زندگی بھر اُن کا اوڑھنا بچھونا رہا؛ چنانچہ وہ ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کراتے تھے، جس کی اصلاح، تصحیح اور تبدیلی ضروری ہوتی۔

مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ جن برائیوں میں لوگوں کا ابتلا عام دیکھتے، اُن کے علاج کے لیے ناگزیر موضوعات پر کتاب اور رسالہ تیار کرتے، پھر اُس کی اشاعت اور بڑے پیمانے پر عام کرنے کا حکم دیتے، جہاں بھی وارد ہوتے، انھی موضوعات پر گفتگو کرتے اور اپنے رفقاء، ہم نشینوں اور ملاقاتیوں کو اس جانب متوجہ کرتے۔ کہنا

پس مرگ زندہ

چاہیے کہ کسی بھی بیماری سے کوئی مسلمان دوچار ہوتا، تو وہ یہ تصور کرتے کہ یہ بیماری مجھے آچکی ہے؛ اسی لیے انھوں نے دوسروں کے غم کو اپنا غم اور دوسروں کو خرافات و بلیات کی آمیزشوں سے پاک کرنے کو، اپنے آپ کو اُن سے پاک کرنا بنا لیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے سچے اور حقیقی وارثوں میں تھے۔

اُن کے پیرومرشد حضرت مولانا تھانویؒ، فنِ تربیت اور علمِ تزکیہٴ نفس کے گوہر نایاب تھے؛ اسی لیے وہ اُن کی کتابوں میں سے جن باتوں کو اپنے ہم عصروں اور نسلِ نو کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتے، اُن کا انتخاب کر کے رسالوں اور لٹریچروں کی شکل میں زود فہم اور آسان اُسلوب میں، کتابت و طباعت کی رنگینی اور چمک دمک سے بالکلیہ اجتناب کرتے ہوئے، انتہائی سادہ انداز میں الگ سے شائع کراتے تھے۔ اُن کے بعض فیض یافتگان نے اُن کی مجلسی گفتگو کو، کئی جلدوں میں ”مجالسِ ابرار“ کے نام سے یک جا کر کے پاکستان میں شائع کرایا ہے، جس کو کما حقہ شوق و رغبت کے ساتھ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ یہ اُن امراض کے لیے شفا بخش نسخہ ہے، جن سے آج امتِ مسلمہ دوچار ہے۔

امتیازی اوصاف

پابندیِ اوقات

اوقات کی پابندی اُن کی شخصیت کی شناخت تھی، جسے انھوں نے اپنے مربی حضرت تھانویؒ سے اخذ کیا تھا، جن کے ہاں ہر وقت کے لیے کام اور ہر کام کے لیے ایک متعین وقت ہوا کرتا تھا، جس میں وہ کسی بھی حالت میں خلل اندازی گوارا نہ کرتے تھے اور اپنے رفقا کو بھی اس کا سختی سے پابند بناتے تھے؛ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے پیچھے نادر و نایاب کتابوں سے بھرپُر ایک زبردست کتب خانہ چھوڑا۔ حضرت تھانویؒ،

اُمّتِ محمدیہ کے کثیر التالیف علما میں تھے۔ اُن کے تمام دستِ گرفتہ بھی توفیقِ خداوندی سے، وقت کے بڑے پابند واقع ہوئے، چنانچہ وہ زندگی کے کسی بھی لمحے کو بے مقصد اور رایگاں جانے نہ دیتے تھے۔ مولانا ”ابرار الحق صاحب“ بھی اُسی دانا مربی یعنی حضرت تھانویؒ کی تربیت گاہ کے فُضلا میں تھے؛ اسی لیے وہ اس صفت میں اور اس کے علاوہ دیگر صفات میں بھی اُن کی ٹوکا پی کہے جاسکتے تھے۔

اوقات کا پابند آدمی، خود بھی مشقت و پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اِس سے بچاتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے اور نہ مقررہ اوقات کی خلاف ورزی۔ ہر کام وقت پر کرتا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام کرتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں ڈھیر سارے کام کر لیتا ہے۔ وہ چوں کہ اپنے اوقات کی حفاظت کرتا ہے؛ اسی لیے دوسروں کے اوقات کی بھی پاس داری کرتا ہے، اپنے وقت کو بے جا اسراف سے بچانے کا رسیا ہوتا ہے؛ اسی لیے وہ دوسروں کے اوقات کے عظیم سرمایے کی قدر کرنا بھی جانتا ہے؛ لیکن جو لوگ وقت کے استعمال کے حوالے سے بے ہنگم واقع ہوئے ہیں، انھیں مذکورہ بالا اُمور سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی؛ اسی لیے اُن کے کارنامے تھوڑے، اُن کی افادیت کا سرمایہ نا کے برابر اور اُن کی کارکردگی اور تخلیقی عمل کی مقدار تھوڑی اور معمولی ہوتی ہے، وہ اپنے لیے بھی باعثِ اذیت ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی، وہ اپنے اوقات کا خون کرتے ہی ہیں؛ اِس لیے دوسروں کے اوقات کے، اپنے اوقات سے بھی زیادہ بے قدر ہوتے ہیں۔ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ وقت کے بڑے پابند تھے، یہ کبھی نہ سُنا گیا کہ انھوں نے اپنے وقت کا کوئی منٹ؛ بل کہ سکنڈ بے کار اور رایگاں جانے دیا ہو۔

نظم و نسق پر کاربندی

اِس کے ساتھ حضرتؒ، زندگی کے ہر گوشے میں نظم و نسق کو پسند کرتے تھے،

بدنظمی، بے اصولی اور انتشار سے اُن کا دل دکھتا تھا۔ یعنی وہ حد درجہ اصول پسند تھے، وہ خود بھی اس پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بناتے تھے، یا چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اس کے پابند ہوں۔ جن لوگوں کو اُن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی، یا اُن سے سابقہ پڑا، وہ اُن کے انتظام و انصرام اور اصول پسندی کی شہادت دیں گے۔ جس نے بھی اُن کی خانقاہ اور اُن کے مدرسے ”اشرف المدارس“ کو دیکھا، اُس کو وہاں کی ہر چیز میں نظم و ضبط کے مظاہر دیکھنے کو ملے۔ طلبہ اپنے جوتوں اور چپلوں کے اتارنے اور اُنھیں سلیقہ مندی سے متعینہ مقام پر رکھنے تک کے پابند تھے۔ مدرسے میں کہیں بھی کاغذ کا کوئی ایسا ٹکڑا نہ ملتا، جو ہوا کے دوش پر ادھر ادھر اڑ رہا ہو اور نہ مدرسے کی درو دیوار پر پان کی پیک کے دھبوں کا کوئی نام و نشان۔ ہر سامان اور ہر ضرورت کی چیز، مناسب جگہ پر رکھی ہوئی ہوتی۔ مرحوم، جہاں ملاقاتیوں اور ملنے لانے والوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھتے، اُنھیں لائن میں لگنے کا حکم دیتے؛ تاکہ سہولت اور آسانی کے ساتھ، تھوڑے وقت میں یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔

میرا کئی بار اُن کے داماد، طب یونانی کے مشہور و ماہر حکیم الحاج کلیم اللہ (جو علی گڑھ میں مطب کرتے ہیں) سے ملنا ہوا، تو میں نے اُن کے ہاں زندگی کے تمام امور میں نظم و ضبط کے ساتھ دیواری گھڑیوں کو عام گھڑیوں سے پانچ منٹ آگے پایا، جن پر ایک چٹ آویزاں تھی اور اُس پر یہ لکھا ہوا تھا: ”یہ گھڑی عام گھڑیوں سے پانچ منٹ آگے ہے۔“ میں نے اُن سے دریافت کیا: آپ نے یہ وضاحتی پرزہ کیوں لکھا ہے؟ فرمایا: اپنے شیخ مولانا ابراہار الحق صاحب کے حکم سے، جو کہا کرتے تھے: ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ آگے رہنے والی گھڑیوں سے دھوکہ کھا جائیں اور پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ میں نے کہا: تو پھر آپ نے اُنھیں کیوں آگے رکھا ہے؟ عام گھڑیوں کے مطابق ہی کیوں نہیں کر دیتے؟ فرمایا: میں اور اسی طرح بہت سے آدمی ہر چیز میں سبقت اور اولیت کو پسند کرتے ہیں؛ چنانچہ میں اور میرے جیسے تمام لوگ جب ہماری

گھڑیوں کو ٹھیک پانچ منٹ آگے پاتے ہیں، تو راحت محسوس کرتے ہیں۔

صفائی ستھرائی کا اہتمام

مرحوم، صفائی ستھرائی کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے؛ چنانچہ اُن کے کپڑے سمیت اُن کی ضرورت کی ہر چیز پاک اور صاف ستھری ہوتی۔ مدرسے کا ہر گوشہ صفائی اور نظم و نسق کی منہ بولتی تصویر ہوتا، اُن سے متعلق کسی بھی چیز میں میل کچیل اور گندگی کا دور دور تک نام و نشان نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ صفائی کو شریعت اسلامیہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے؛ بل کہ اس کا حکم اور اس کی تاکید کی گئی ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے، اکثر لوگ دین کے اس پہلو پر دھیان نہیں دیتے؛ بل کہ وہ لوگ گندگی کو سادگی کی دلیل سمجھتے ہیں؛ چنانچہ اگر کسی ایسے عالم دین پانڈہی آدمی سے، اُن کی ملاقات ہو جائے، جو صاف ستھرا ہو، تو وہ یہ باور کر لیتے ہیں کہ انھیں سادگی سے کوئی لینا دینا نہیں اور اگر وہ نستعلیق ہو، تب تو وہ اُن کے نزدیک انتہائی لائق ملامت ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے اپنی زندہ و پابندہ سیرت سے، اس بات کی تعلیم دی کہ صفائی ستھرائی جزو ایمان ہے، اہل علم اور دعوت کا کام کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں؛ اس لیے کہ لوگ صاف ستھرے لوگوں کے پاس ٹھنچے چلے آتے ہیں اور میلے کپڑے پہنے والوں اور گندگیوں میں لتھڑے ہوئے لوگوں سے وہ دور بھاگتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی بڑے اہل علم اور اہل فضل و کمال کیوں نہ ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس واضح فرق کو محسوس نہیں کرتی، حال آں کہ یہ آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہے۔

زہد و ورع کی تصویر مجسم

حضرت، حقیقی معنی میں زاہد تھے۔ انھیں دنیاوی مشاغل سے کوئی لینا دینا نہ تھا،

دنیاوی جاہ و جلال کے پرستاروں اور مال و دولت کے بندوں سے کوئی ضرورت نہ تھی؛ چنانچہ وہ اُن کی اس طرح خوشامد اور چاہلوسی نہیں کرتے تھے، جس طرح بہت سے ایسے اہل علم کیا کرتے ہیں، جنہیں علم کی قدر و منزلت اور ”علما“ کی حرمت و عظمت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے اپنے ملنے والے کئی علماے دین سے — جن کے ساتھ اُنھوں نے مدرسے کا گشت کیا — یہ بات کہی: میں کسی تجارت پیشہ یا مال دار شخص کے ساتھ مدرسے کا گشت نہیں کرتا؛ تا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں اُن کے مال و اسباب کا ضرورت مند ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ علما کا مال داروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور گرے پڑنا، علم اور دین دونوں کی تحقیر و تذلیل ہے؛ لہذا اس طرزِ عمل سے ہر حال میں بچنا ضروری ہے، خواہ اس بچنے کی وجہ سے، بہ ظاہر نقصان کیوں نہ ہو۔

خوش اخلاقی و نرم خوئی

وہ اللہ کے نیکو کار بندوں کی طرح، نرم مزاج و نرم خور اور خوش خلق واقع ہوئے تھے، خلقِ خدا کے ساتھ رحم دلی سے پیش آتے، مسلمانوں کی غم گساری اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی، تو وہ غم زدہ اور بے تاب ہو جاتے، قرض داروں کے قرض کی ادائیگی، مریضوں کے دوا و علاج اور گردشِ میل و نہار کے ماروں کی آشک شوئی کے لیے ہر دم کوشاں رہتے۔ وہ کسی سائل کو اپنے ہاں سے لوٹاتے نہ تھے۔ شیریں کلامی اُن کی امتیازی شان تھی، جو انھیں دگر داعیوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ اسی نرم گوئی کی وجہ سے دلوں میں گھر کر لیتے تھے۔

حضرت مولانا، طلبہ کی ضرورتیں پوری کرنے سے بڑی دل چسپی رکھتے تھے، وہ مدارس اور تعلیمی اداروں کے ذمے داروں کو اس کی سختی سے تاکید کرتے تھے؛ اس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ اس حوالے سے ذمہ دارانِ مدارس میں غفلت شعاری عام ہے، وہ لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ بھلا طلبہ بھی کوئی ایسی قوم ہیں، جس کے حقوق کی رعایت اور اس کی

حاجتیں پوری کی جائیں؛ چنانچہ اُن کا ہر دینی کام مدرسہ طلبہ کی خدمت کے اعتبار سے دگر مدارس سے ممتاز تھا کہ وہاں نہ صرف طلبہ کی بڑی ضرورتوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا؛ بل کہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر بھی دھیان دیا جاتا تھا۔ وہ اس بات سے تکلیف محسوس کرتے تھے کہ ہمارے برصغیر کے ذمہ داران مدارس عموماً ذیلی اور غیر ضروری امور پر جتنی توجہ دیتے ہیں، اتنی توجہ ضروری امور پر نہیں دیتے؛ چنانچہ وہ عالی شان عمارتوں کی تعمیر، ظاہری چمک دمک اور فلک بوس گنبدوں اور مناروں کی تراش و خراش میں اسراف کی حد تک روپے خرچ کرتے ہیں اور طلبہ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اور اُن کی تعداد کے مطابق بیت الخلاؤں کی تعمیر اور سال کے مختلف موسم کے مطابق پانی گرم اور ٹھنڈا کرنے کے نظام پر بہ قدر واجب بھی خرچ نہیں کرتے۔ نہ جزیئر فراہم کرتے ہیں کہ جب بجلی غائب ہو جائے تو سچھے چلانے، بجلی کے بلب جلانے اور پانی کی لٹنکی بھرنے کے لیے اُس سے کام لیا جاسکے؛ اسی طرح صبح و شام کی خوراک اور ناشتے کو عمدہ بنانے، نہ آسمان چھوتی مہنگائی کے حساب سے، نقد تعلیمی وظائف کی مقدار میں اضافے پر خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی تعلیم و تربیت کے نظام کو ترقی دینے اور تعلیم و تفہیم کی مطلوبہ صلاحیت سے عاری اساتذہ کی جگہ لیاقت مند اور باصلاحیت اساتذہ کی تقرری پر خرچ کرتے ہیں۔ مرحوم اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ مدارس اسلامیہ میں ان امور کی اصلاح اور تبدیلی کی از حد ضرورت ہے۔ یعنی باطن پر ظاہر سے زیادہ توجہ دینی چاہیے اور ذمہ داروں کو قول و عمل میں سچا اور حقیقت پسند ہونا چاہیے۔

طلبہ و مریدین کے لیے شفیق باپ

مرحوم، طلبہ اور اپنے مریدین سے شفیق باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ شفقت و رحم دلی ایک ایسی کلید تھی، جس کے ذریعے وہ دل پر لگے تالوں کو بہ آسانی کھول لیتے تھے، اُن کی یہ صفت بڑی مؤثر اور دل و دماغ کو فتح کر لینے والی تھی؛ چنانچہ وہ

آپ ﷺ کے اس قول پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ ”جس چیز میں نرمی ہو وہ مزین اور خوب صورت بن جاتی ہے اور جس چیز میں نرمی نہ ہو وہ معیوب اور بدنما ہو جاتی ہے“ (مسلم) ”اللہ تعالیٰ رحیم ہیں اور رحم دلی کو پسند فرماتے ہیں اور رحم دلی کی وجہ سے اُس چیز سے نوازتے ہیں، جس سے تشدد اور سختی پر نہیں نوازتے“ (بخاری، مسلم) اسی وجہ سے ترش رو اور تشدد داعی و معلم کی کوششیں اتنی نتیجہ خیز اور بار آور نہیں ہوتیں، جتنی کہ بردبار اور رحم دل داعی و معلم کی کوششیں نتیجہ خیز اور بار آور ہوتی ہیں۔ مرحوم اُن داعیوں اور مربیوں میں تھے، جن کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے بہت ساری بھلائیاں دنیا میں پھیلائیں۔

مذکورہ بالا اوصاف و امتیازات کی روشنی میں، مرحوم بے بدل عالم وداعی اور مربی تھے، جن کے قول و عمل میں یکسانیت تھی؛ بل کہ اُن کی بات کا منبع و سرچشمہ ہی عمل ہوتا تھا۔ وہ اپنے دست گرفتوں، مریدین اور طلبہ کو ایسا مطلوبہ انسان بن کر نکلنے پر زور دیتے تھے، جو اپنے اور دوسروں کے لیے یکساں نفع بخش ہو اور جو اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کی فکر کرے؛ اِس لیے کہ جو چیز کسی کے پاس نہ ہو، وہ دوسروں کو وہ چیز کیوں کر دے سکتا ہے؟ وہ اپنی سیرت و اخلاق، اپنے رویے، طرزِ عمل اور زندگی کی ہر نقل و حرکت کے حوالے سے مصلح وداعی تھے، وہ ایسے داعی نہ تھے، جو صرف زبانی جمع خرچ کرنے اور کاغذی گھوڑے دوڑانے کا عادی ہوتا ہے؛ اسی لیے انھیں دعوت و تربیت کے میدان میں ہمہ گیر اور نمایاں کام یا بی ٹی۔ انھوں نے اپنے پیچھے راست طور پر استفادہ کرنے والوں یا اپنے فیض یافتگان کی دعوت سے متاثر ہونے والوں کی ایک بڑی کھیپ چھوڑی ہے۔ اِس عظیم اور وسیع تر دِبار (برِ صغیر) کے مسلمان اُن کی کمی ہمیشہ محسوس کریں گے۔

اُن کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے زائد از پچاس حج اور ساٹھ سے زائد عمرے کی سعادت حاصل کی، پچیس سے زائد ممالک کا دورہ کیا اور اپنے پیچھے عقیدت مندوں، محبین، تربیت یافتوں، نیز حکمت و نصیحت کے ذریعے اصلاح و تربیت اور اسلام، اسلامی احکام اور سنت نبویؐ کی دعوت دینے میں اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کی ناقابلِ شمار

تعداد چھوڑی ہے۔ اے اللہ تو مرحوم جیسے لوگوں کی اس دنیا میں کثرت کر دے، اُن کے تذکرے کو زندہ جاوید بنا دے، انھیں اپنی فردوسِ بریں میں داخل کر، انھیں وہاں نبیوں کی صحبت نصیب فرما، اُن کے اہل خانہ، رشتے داروں، خیمین متعارفین، رفقا، خلفاء اور عقیدت مندوں کو، صبر جمیل عطا فرما۔ اللہ کا درود و سلام اور اُس کی برکت نازل ہو، اُس کے بندے اور رسول ہمارے آقا اور روزِ محشر ہمارے شفاعت کنندہ یعنی رسولوں کے سردار حضرت محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کے سارے آل و اصحاب پر، نیز قیامت تک آپ کی سچی پیروی کرنے والوں پر۔ (۵)

مختصر سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: (حضرت مولانا شاہ) ابرار الحق حق بن محمود الحق۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء-۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) سے جاملتا ہے؛ اسی لیے آپ کے نام کے ساتھ ”حق“ کا لاحقہ لگا ہوا ہے۔ آپ کے والد محترم محمود الحق صاحب پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، حضرت تھانوی کے دستِ گرفتہ اور اُن کے مجاز بنِ صحبت میں تھے۔

✽ ولادت: ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء (۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ)

✽ جائے ولادت: شہر ہردوئی، یوپی۔ اصل وطن ”پلوال“ (Palwal) ہے جو دہلی کے قریب صوبہ ”ہریانہ“ میں واقع ہے۔

✽ تعلیم کی بسم اللہ: آپ کی بسم اللہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی (۱۲۹۳ھ/۱۸۷۷ء-۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء) نے کرائی۔

✽ ابتدائی تعلیم: آٹھ سال کی عمر میں حفظِ قرآن پاک کی تکمیل کی۔ اُس کے بعد اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہردوئی کی ”انجمن اسلامیہ“ کے مدرسہ میں، مولانا انوار احمد انیسٹھوی مظاہری سے حاصل کی۔

✽ دورۂ حدیث شریف: دورۂ حدیث شریف کی تکمیل، بہ وجہ علالت دو سال میں ہوئی۔ پہلے سال

(*) عربی تحریر جمعہ: ۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء کو لکھی گئی اور ”الداغی“ عربی، شمارہ ۶-۷،

جلد ۲۹، جمادی الاخریٰ ورجب ۱۳۲۶ھ مطابق جولائی-ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ اور حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ آپ کے رفقاء درس میں تھے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے ششماہی امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم کو ”بذل المجہود“ کا سیٹ دینے کا اعلان فرمایا تھا، اپنے ساتھیوں میں اس انعام کے مستحق صرف آپ ہی قرار دیے گئے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے امتحان سالانہ میں شریک نہ ہو سکے۔

● ۱۳۵۶ھ میں جب آپ سترہ سال کے تھے دوبارہ دورہ حدیث شریف میں شریک ہو کر اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۵۸ھ تک تکمیل فنون کیا اور منقولات و معقولات کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور اعلیٰ نمبرات حاصل کیے، لہذا نہ صرف بہت سی کتابیں انعام میں ملیں؛ بل کہ ۵ روپے نقد انعام بھی حاصل کیا، جو اُس وقت ایک معتد بہ رقم تھی۔

✽ تدریس: ۱۳۵۸ھ میں فنون کی تکمیل کے بعد، مظاہر علوم میں معین مدرس منتخب ہوئے، پھر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے حکم سے جامع العلوم پٹنہ پور، کانپور میں تدریسی خدمت انجام دی۔ اس کے بعد دو سال مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے وابستہ رہے۔

● ۱۹۴۲ء میں ہردوئی میں ”أشرف المدارس“ کا سنگ بنیاد رکھا۔

● ۱۹۵۰ء میں ”دعوة الحق“ تحریک و تنظیم کا آغاز فرمایا۔

● ۱۹۵۳ء میں مکاتیب کے قیام کا سلسلہ شروع فرمایا۔

● ۱۹۷۳ء میں پہلا مکتب موضع ”اسہی اعظم پور“ ہردوئی میں قائم کیا۔

✽ بیعت و خلافت: دورانِ تعلیم ہی حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے، ۱۳۶۱ھ میں جب کہ آپ کی عمر صرف ۲۲ سال تھی، حضرت تھانویؒ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

● حضرت محی النہ مولانا شاہ ابراہیم الحق کے خلفائے مجازین صحبت کی تعداد ۳۶ اور خلفائے مجازین بیعت کی تعداد ۱۰۳ ہے۔

✽ مرض و وفات و وفات: ۸ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء بہ روز شنبہ عصر سے قبل و بعد عصر تا مغرب ایک مہمان کے ساتھ اہم امور میں مشغول رہے، بعد مغرب بھی بہت سے مہمانوں سے ملاقات ہوئی۔ پھر چند منٹ بعد کھانسی آئی اور ساتھ میں خون ظاہر ہوا اور پھر خون کی آمد بڑھتی گئی، معالجین کو اطلاع دی گئی، آپ کے خصوصی معالج فوراً آ گئے؛ لیکن ممتاز ڈاکٹروں کی ساری کوششوں کے باوجود ۹-۸ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = ۱۷-۱۸ مئی ۲۰۰۶ء کی درمیانی شب میں ۸ بج کر ۲۵ منٹ پر، آپ

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حق

کی روح، قفسِ غضری سے پرواز کر گئی۔

✽ جنازہ و تدفین: دوسرے روز: چہار شنبہ ۹ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = ۱۸ مئی ۲۰۰۶ء کو تقریباً ۱۰:۳۰ بجے، آپ کی نمازِ جنازہ مولانا قاری امیر حسن (صدر مدرس مدرسہ اشرف المدارس و خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا) نے پڑھائی، جس میں کئی لاکھ علما و طلبہ اور عام مسلمانوں نے شرکت کی۔

✽ پس ماندگان: آپ کے پانچ بھائی اور ایک بہن تھیں، بھائی سب وفات پا چکے ہیں، آپ کی اہلیہ محترمہ کا یک شنبہ: ۱۵/رمضان ۱۴۳۰ھ = ۶/دسمبر ۲۰۰۹ء کی صبح کو ۹ بجے بمبئی میں انتقال ہو گیا، وہیں تدفین عمل میں آئی۔ آپ کی صاحبزادی حیات ہیں، جو آپ کے جانشین: الحاج حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کو (جو عرصے سے علی گڑھ میں، جسمانی طبابت کے ساتھ ساتھ، روحانی علاج و معالجے میں خلوص، لگن اور ہمت و حوصلے کے ساتھ ہمہ تن مصروف کار ہیں) منسوب ہیں۔ آپ کے ۳ نواسے اور ۳ نواسیاں ہیں۔

نواسوں میں جناب علیم الحق مجاز بیعت ہیں۔ آپ کے (حضرت شاہ ابرار الحق کے) ایک صاحبزادے، جن کا نام اشرف الحق تھا، ۲۸ سال کی عمر میں طویل بیماری کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔



داعی اسلام وعاشق رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء — ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۶ء

یوں خونِ دل میں ڈوب کے نگلی مری غزل
جیسے کوئی چھلکتا ہوا جام آگیا

عرصے تک بیماری کو مغلوب کیے رہنے کے بعد، بالآخر اس سے مغلوب ہو کر، یک شنبہ یکم جنوری ۲۰۰۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ (بہ تقویم سعودی عرب) و ۲۹ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ (بہ تقویم ہندوستان) کو ۱۲ رنج کر ۱۰ ارمنٹ پر، ہندوستانی ثم السعودی عالم وداعی وادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے، جدہ سعودی عرب کے ایک ہسپتال میں، ہجری جنتری کے مطابق ۸۲ سال اور عیسوی کلنڈر کے مطابق ۸۱ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اپنی شان کے مطابق اس خادمِ دین ودعوت کو نوازے۔ آمین

یک شنبہ - دو شنبہ: ۱-۲ جنوری ۲۰۰۶ء، مطابق ۱-۲ ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ کی شب میں عشا کی نماز کے بعد حرمِ مکی میں، امام حرم نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی، جس میں لاکھوں نمازیوں نے شرکت کی، جن میں اکثر عازمین حج تھے، جو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے تھے۔ پھر مکہ مکرمہ کے تاریخی اور مقدس قبرستان ”جنت المعلّٰۃ“ میں صحابہ و صحابیات (رضی اللہ عنہم اجمعین) و تابعین و تابعات اور صلحا امت (رحمۃ اللہ علیہم

پس مرگ زندہ
 (جمعین) کے پہلو میں، انھیں اس خاک کی دنیا میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

قابل رشک موت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مُعتمدِ تعلیم تھے، نیز ہندوستان اپنا اصلی وطن بھی تھا؛ اس لیے سعودی عرب کا حَوْطُن ہو جانے کے باوجود، ہندوستان بالخصوص لکھنؤ بار بار اور طویل طویل وقفوں کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ہندوستان میں کسی قیام کے دوران ہی اُن کا آخر وقت آجاتا اور انھیں بادلِ ناخواستہ یہیں کی خاک کا پیوند ہو جانا پڑتا؛ لیکن اللہ پاک نے اُن کے لیے، ساری دنیا کے مسلمانوں کے اصلی وطن اور ایمان و روح کے نشیمن مکہ مکرمہ (جہاں کے وہ جسمانی باشندے بھی ہو چکے تھے) کی خاک میں ملنا مُقَدَّر کر رکھا تھا۔ چنانچہ جدہ میں طائرِ روح نے پرواز کیا اور جسدِ خاکی کو مکہ مکرمہ میں قرار ملا۔ اس سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ خدائے کریم نے انھیں اپنی رحمتِ خاص سے نوازا نا چاہا تھا اور یہ کہ وہ ذاتِ جوہر اور اُس سے مخفی ترکو جانتی ہے، اس دنیاے عمل میں کی گئی، اُن کی سرگرمیوں اور بھلائی کی حرکات و سکنات کو شرفِ قبولیت سے نواز چکا ہے۔ انھوں نے تعلیم و مطالعہ، تدریس و تعلیم، تحریر و تصنیف، دعوت و تبلیغ اور علم و عمل کے لیے چلت پھرت کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ، آپ کے صحابہؓ، حریمین شریفین ﷺ کے آخری پیغام کے سرچشمے، رسول ﷺ کے مولد و مدفن و جاے بعثت کی سچی اور مخلصانہ محبت سے لبریز اور جگمگاتی ہوئی، ایسی زندگی گزاری جو دین و دعوت اور علم و ثقافت کے میدان میں سرگرم عمل اُن گنت انسانوں کے لیے، باعثِ رشک ہوگی، جو خواہش اور تڑپ کے باوجود، اُن کی ایسی سعادت سے سرفراز نہیں ہو پاتے۔

اسلام کے اصل مسکن سے تعلق رکھنے والے مقاماتِ مقدسہ سے، اُن کی بے پناہ محبت کو ربِّ شکور کی طرف سے قبولیت کی سند، اُسی وقت مل گئی تھی، جب اللہ پاک نے،

عاشقِ رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

بیتِ عتیق کے جوار اور بلدِ امین میں اُن کے خاکی وجود کے لیے بھی جاے رہائش پا جانے کی راہ ہموار کردی اور اُنھیں سعودی نیشنلٹی دلا دی اور وہیں بود و باش اختیار کر لینے کے لیے، اُسی کے تسلسل والے شہر جدہ اور پھر عین مکہ مکرمہ میں روزی روٹی کے حصول کا سامان بہم پہنچا دیا۔

روزِ قیامت آسان حساب کی امید

اس راقمِ آثم کا تو خیال یہی ہے — اور اللہ حقیقتِ حال اور اپنی مشیت سے زیادہ واقف ہے — کہ اللہ پاک روزِ قیامت اُن کا آسان حساب لینے کا ارادہ کر چکا تھا؛ اسی لیے اُس نے زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں، اُنھیں اپنے گھر کا پڑوسی بنانا مُقَدَّر کیا۔ نہ جانے کتنے مسلمان ہیں؛ بل کہ کتنے صالح اور خدا رسیدہ مسلمان ہیں، جو موت کے دن تک؛ بل کہ موت کے لمحے تک مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں موت اور تدفین کی سعادت پانے کی تمنا میں مرجاتے ہیں؛ لیکن اُن کی موت وہیں واقع ہوتی ہے، جہاں اللہ نے مُقَدَّر کر رکھی ہوتی ہے۔ مکہ یا مدینہ میں موت یا تدفین کی سعادت اور حرمِ مکرّم میں نمازِ جنازہ اور لاکھوں نمازیوں کی دعاؤں کا اَرْفَع مقام حاصل نہیں کر پاتے؛ کیوں کہ یہ سعادت زورِ بازو، کوشش، خواہش اور محض تمناؤں سے حاصل نہیں کی جاسکتی، یہ تو صرف تقدیرِ الہی کی دین ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے خود فرمایا ہے:

﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (لقمان ۳۴)

ترجمہ: اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا۔ تحقیق اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

مولانا کی خوبیاں

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ مسلم علما و محققین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جس

کو علوم شریعت میں درک کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو زبانوں پر یکساں ماہرانہ عبور ہوتا تھا۔ مولانا وقتاً فطری ادیب تھے۔ اُن کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ فصاحت میں دھلا ہوا، ہر تعبیر بلاغت میں سچی ہوئی اور ہر جملہ ظاہراً خوب صورت اور باطناً خوب سیریت ہوتا تھا۔ اُن کا ہر مضمون اور ہر تحریر، آنکھ سے پہلے دل کے لیے شیریں اور محبوب ہوتی تھی۔ اُن کی عبارت میں صرف آمد ہوتی اور وہ سلاست اور روانی کا فیضان ہوتی۔ ایمان کی برکت، یقین کی مٹھاس اور دین و عقیدہ و نبی ﷺ و کتاب اللہ و امت محمد ﷺ کی محبت کی چاشنی میں لبریز ہوتی تھی۔ قاری اُن کی تحریر کو پڑھتا، تو وہ اُس کو پارہٴ دل اور قاشِ جگر، یا کم از کم برادہٴ زریا اُس سے بھی قیمتی تر کسی ایسی دھات کے ذروں کا مجموعہ سمجھتا، جس کا وجود، صرف مومن کے خانہٴ خیال اور زاہد شب زندہ دار کے ذہن میں ہی ہوتا ہے اور بس۔

اردو اور عربی زبانوں پر عبور کے ساتھ ساتھ، انھیں انگریزی اور فارسی میں بھی خاصی مہارت تھی؛ لیکن اپنی علمی و ادبی تخلیقات اور فکری و دعوتی نگارشات کے لیے، انھوں نے اول الذکر دونوں زبانوں اور زیادہ تر اردو کو ہی اساس بنایا، جس کے دامن کو انھوں نے آخری چند سالوں کے دوران، اپنے گراں بہا علمی و دعوتی و ادبی افکار و خیالات سے مالا مال کر دیا۔ شرعی علوم میں سے، علم تفسیر اُن کی توجہ کا مرکز رہا۔ دوسری طرف ادبی فنون اور اصلاحی و دعوتی موضوعات پر انھوں نے کثرت سے لکھا اور خوب تر لکھا۔ انھوں نے سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا (اور بہت کچھ لکھا) وہ اپنے مواد کی گراں مائیگی، زبان کی چاشنی، اسلوب کی لذت، طرزِ تحریر کی شوق انگیزی کی وجہ سے، اپنا الگ انداز اور مخصوص امتیاز رکھتا ہے، جس کو باذوق قاری ایسی لذت کے ساتھ پڑھتا ہے، جیسے مزے دار کھانوں کا رسیا، لذیذ کھانوں کے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریادگی کا رنگ

اُن کی اردو تحریروں کو پڑھ کر، بسا اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ البیلے اسلامی ادیب

عاشقِ رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

ومفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۹ھ - ۱۳۹۷ھ - ۱۸۹۲ء) کی زبان ہے۔ مولانا عبداللہ عباسؒ نے، طالبِ علمی کے زمانے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجدؒ کو کثرت سے پڑھا ہوگا اور اُن کی طرزِ نگارش اور روحِ تحریر کو جذب کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ مولانا عبداللہؒ کے ہاں کچھ اُسی قسم کی منفرد چاشنی اور ایمانی حلاوت و ساحرانہ درس انگیزی ہوتی تھی، جو مولانا عبدالماجدؒ کی تحریر کا وجہ امتیاز تھی۔

لیکن کوئی اہلِ قلم، زبان کی خوبیوں پر بھرپور دسترس رکھنے اور اُس میں اپنا طرزِ خاص بنالینے کے باوجود بھی، زندگی سے بھرپور ایسا ادب اُس وقت تک تخلیق نہیں کر سکتا، جس سے روح کو غذا، دل کو سکون، فکر کو بالیدگی اور عقیدے کو ایسی پختگی ملتی ہو، جو قاری کے فکری سرچشمے اور اُس کی سرگرمیوں کے سارے دھارے پر کنٹرول رکھتی ہو، جب تک کہ اُس کا دل بادۂ حبِ نبوی ﷺ اور اس عقیدے سے سرشار نہ ہو کہ آپ ﷺ ہی امام الانبیاء، سید الرسل اور منیرِ راہ ہائے حیات و کائنات ہیں اور یہ کہ کسی مومن کا ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کو آپ ﷺ سے، اپنی ذات، اپنی اولاد اور روئے زمین کی ساری محبوبات سے زیادہ محبت نہ ہو۔ مولانا عبداللہ عباسؒ کو اس معززانہ محبت اور شریفانہ عقیدے سے وافر حصہ ملا تھا، چنانچہ اُنھوں نے ایسا تاب ناک اور بابرکت ادب تخلیق کیا جو ہر باتو فیق اور باذوق قاری کو پڑھنے، استفادہ کرنے اور اُس کی پہنائیوں میں موجود روشن فکر، برگزیدہ سوچ اور بے نظیر خوبی کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔

بصیرت مند عالم و داعی

مولانا عبداللہ عباسؒ تدریس کی مکمل لیاقتوں کے حامل کامیاب اور بافیض مدرس و مُعَلِّم تھے اور بار آور تریسیل، مفید تر اندازِ عرض اور کارآمد طریقہٴ تفہیم کے مالک بھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کہاں ایجاز کی ضرورت ہے اور کہاں تفصیل کی، کہاں بھرپور شرح کی ضرورت ہے اور کہاں اشارے کی، چنانچہ مستفید اور طالبِ علم اُن کی بات

کو خود کار طریقے سے اخذ کر لیتا تھا اور اُن کے پیش کردہ مواد کو لذت اور طیب نفس، نیز دعا و شکر و قدر دانی کے جذبات کے ساتھ پی جاتا تھا۔ عام گفتگو میں بھی اُن کا یہی طریقہ ہوتا تھا۔ وہ مجلس میں گویا ہوتے تب، کسی جلسے میں بولتے تب، کسی مسئلے میں تبادلہ خیال کرتے تب، ہر جگہ اُن کا انداز بہت میٹھا، آسان اور تفہیمی عناصر سے بھرپور ہوتا تھا۔ اُن کی گفتگو سے ہمیشہ اُن کی دین داری، نیکی، حضور ﷺ کی محبت، اُمت کو درپیش مسائل کی کسک، قوم مسلم کے سر پر کھڑے خطرات سے دل گرفتگی، عربوں کی گردن پر سازشوں کی لگتی تلوار کی چھین؛ صاف طور پر محسوس ہوتی اور ساتھ ہی حاضرین کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اُنھیں کس درجہ زندگی کے مسائل کی بصیرت، عربی میں گہرائی اور اردو زبان میں مہارت اور دونوں کے امتیازات کا ادراک ہے اور دوسری طرف تعلیم و تربیت کے میدان کا کیسا طویل تجربہ ہے اور عالم اسلام کی علمی و فکری قیادت کے لیے، مطلوبہ افراد کی تیاری کے لیے کارگر طریقہ کار کی کیسی جانکاری ہے، نیز وہ کیسی بالغ نظری، دور اندیشی، ضرورت کی حد تک کھلے پن اور ذہانت، بذلہ سخی اور علمی سنجیدگی کے جامع اہل علم و دانش ہیں؟!۔ اسی لیے مولانا کے پاس بیٹھنے والوں کو تھوڑے وقت میں بھی بہت سارے فائدے حاصل ہو جاتے تھے اور ہم نشینوں کو لذت اور فائدے کے امتزاج سے غیر معمولی خوشی ہوتی اور کبھی بھی کوئی اکتاہٹ نہ ہوتی تھی۔

مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ دعا و اُدبا کی اُس نسل کے چند انتہائی برگزیدہ افراد میں سے ایک تھے، جس نے عالی مقام مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (۱۳۳۳-۱۴۲۰ھ = ۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کی خصوصی تعلیم و تربیت کا بھرپور اور بے اندازہ فیض پایا تھا اور علم و فکر، دعوت و مجاہدے کے باب میں اُنھی کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور اُن کے مے خانے سے اُس نے اس طرح جام پر جام چڑھایا تھا کہ جس کے پاکیزہ اور مقدّس نشے نے زندگی کے آخری لمحے تک اُس کو مست رکھا۔ مولانا عبد اللہ نے زندگی بھر اس مستی کا گن گایا، مزے لے لے کر اس کو بیان کیا، اس موضوع پر بھی بہت

عاشقِ رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

کچھ لکھا اور سرمایہ افتخار سمجھ کے لکھا، وہ زندگی بھر اسی کیف و مستی کے داعی رہے اور اپنی تمام سرگرمیوں میں اسی جَوْر پر گردش کرتے رہے۔ مولانا علی میاں ندوی کا رنگ و آہنگ اور علمی و فکری ڈھنگ، اُن کی تمام حرکات و سکنات سے چھلکتا تھا؛ کیوں کہ یہ اُن کے اعصاب پر سوار اور اُن کی سوچ پر چھایا ہوا تھا۔ اللہ دونوں مرحومین استاذ و تلمیذ کو بہتر سے بہتر بدلہ دے، جو وہ اپنے حسنِ عمل والے بندوں کو دیا کرتا ہے۔

شرافتِ نفس و کشادہ قلبی

مولانا مرحوم، کریمِ انفس اور شریفِ الطبع تھے، کشادہ نفسی، سخاوت اور سرچشمی سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ اُن کے عام برتاؤ، مہمان نوازی اور قول و فعل، نیز اپنے اور غیروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے انداز میں رواداری و کشادہ قلبی کا انکاس صاف طور پر محسوس ہوتا تھا۔ وہ ہر اُس رویے سے بچتے تھے، جس سے کسی کو قلبی اذیت پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بھی ایسے الفاظ و تعبیرات کا انتخاب کرتے، جن کا ظاہر خوش گو اور باطن پاکیزہ ہوتا اور جن کا کوئی بھی مصداق باعثِ مسرت ہی ہوتا۔ قلم اور زبان پر کنٹرول رکھنا، اس راہ کے راہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ بڑا مشکل؛ لیکن بہت مبارک کام ہے۔ مولانا کو تمام تر احتیاط کے باوجود بھی، کسی کی طرف سے ذرا بھی یہ اشارہ ملتا کہ اُس کو اُن کی کسی بات یا تحریر کے کسی نقطے یا حرف یا لفظ سے کوئی اذیت ہوئی ہے، تو وہ فوراً اور صاف لفظوں میں معذرت خواہ ہوتے، خواہ یہ اذیت اُس آدمی کو اپنی غلط فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ مولانا معذرت خواہی میں کبھی بھی تردد نہ کرتے۔ یہ بھی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے؛ ورنہ بہت سے اہل قلم اور اہل لسان واضح غلطیوں کی بھی تاویل کر لیتے ہیں؛ لیکن کسی کی دل آزاری پر کبھی معذرت خواہ نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ کسی سچے دین دار اور خدا ترس کا کبھی نہیں ہو سکتا۔

مولانا مرحوم دل کی گدازی، خدا کی یاد میں رونے والی اور استحضارِ گناہ سے پر غم

ہو جانے والی، سعادت مند اندر آنکھیں رکھتے تھے۔ اُن کے چہرے سے شب بیداری، دن کی تپیدگی، ہمہ وقت محاسبہ نفس اور اپنے عیوب پر مسلسل نگاہ کی وجہ سے دوسروں کے عیوب سے بے نیازی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ مومن کی شان رکھتے تھے، جو ہر لفظ کو منہ سے نکالنے سے پہلے اچھی طرح تول لیتا ہے اور جو اپنی ذات کو صحیح میزان پر تولتا رہتا ہے اور اپنی ذات کے نقائص کا شغلِ مسلسل، دوسروں کے اچھے بُرے کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں دیتا۔ وہ اس بات کا کام یابِ ادراک رکھتے تھے کہ سوائے انبیاء اور اصحابِ انبیاء کے، نقائص سے کوئی پاک نہیں اور سب سے ضروری کام ایک مومن کے لیے یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کی اصلاح کے لیے ہی فکر مند رہے۔ اُن کے شیخ و مربی مولانا علی میاں ندوی فرمایا کرتے تھے: ”جس کو اپنے عیوب میں مشغول رہنے کی توفیق مل گئی، تو اُس کو دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں مل گئیں۔“

خدا کے گھر کے پڑوس میں

مولانا کے گھر میں اُن سے یادگار ملاقات

۱۴۱۵ھ یا ۱۴۱۶ھ کے رمضان المبارک کی کسی تاریخ کو، یہ راقمِ سحری کے اوقات کی ابتدا میں اُن کے دولت کدے واقع مکہ مکرمہ میں اُن کے ہاں ایک بار مہمان ہوا۔ میں نے جدہ سے ٹیلی فون پر اُن سے رابطہ کر کے وقت لے لیا تھا، جیسے ہی اُن کے گیٹ پر پہنچا مرحوم سراپا انتظار کھڑے تھے، بڑی شرمندگی ہوئی کہ میں نے انھیں ناحق زحمت دی۔ میں نے اپنے احساس کا اظہار اُن سے کیا، تو فرمایا: ”مولانا یہ گھر آپ کا ہے۔ خدا کے پڑوس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اس شہر مقدس میں رہائش کا یہی تو ہے کہ آپ جیسے بہت سے مخلص احباب کا استقبال و ضیافت کرنے کا، ربِ کریم نے موقع دے رکھا ہے۔“ مولانا نے دسترخوان لگایا اور بہترین ولذیذ کھانوں کے ساتھ پر لطف و چشم کشا باتوں سے بھی محظوظ فرمایا۔ پھر اُس روز ہم دونوں نے ساتھ ہی

عاشق رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

حرم شریف میں نماز ادا کی۔ مولانا نے اتنی عزت دی اور اس طرح نوازا کہ اُن چند گھنٹوں کا میرے دل پر ایسا تاثر نقش ہوا، جو ان شاء اللہ مرتے دم تک قائم رہے گا۔ جن محسنوں، متعارفین، محبین اور اُساتذہ و داعیوں کے لیے زندگی میں ہمیشہ دعا کی سعادت حاصل رہتی ہے، مولانا بھی اُن میں سے ایک ہیں۔ اللہ ہمارے لیے اپنے فضلِ خاص سے، اس سعادت کو قائم و دائم رکھے۔

میرے نام مولانا کا مکتوب

مولانا کی کتاب ”ردائے رحمت“ جب پہلی بار ۱۹۸۹ء میں مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ سے شائع ہوئی، جس میں انھوں نے عربی زبان کے دو مشہور و مقبول نعتیہ قصیدوں: قصیدہ بَانتُ سَعَادَہ از کعب بن زُہیر بن ابی سلمیٰ اور قصیدہ بُرْدَہ از علامہ محمد بن سعید بوسیری مصری (۶۰۸ھ/۱۲۱۲ء — ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء)، کی مکمل لفظی و معنوی تشریح کی ہے، تو راقم نے رسالہ ”الداعی“ کے ایک شمارے میں عربی زبان میں اُس کا تعارف پیش کیا، جو مولانا کے علم میں آیا، تو اُن کا جی خوش ہوا اور انھوں نے مندرجہ ذیل مکتوب سے راقم کی حوصلہ افزائی کی:

۲۸ اگست ۱۹۹۰ء

برادرِ مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”الداعی“ میں میری کتاب ”ردائے رحمت“ کا جس تحسین کے انداز میں آپ نے تعارف کرایا ہے، اُس کے لیے دل سے شکر گزار اور آپ کے حق میں دعا گو ہوں۔ یہ کوئی دستور نہیں ہے کہ تبصرہ و تحسین لکھنے والے کو شکریے کا خط لکھا جائے، ہاں تنقید اور کم زور پہلو اگر کسی نے نمایاں کیا، تو بعض لوگ اپنی برہمی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ ہم آپ مدرسے کے لوگ ہیں، احترامِ مبادِل کے قائل

ہیں۔ بہر حال اُسبغ اللہ عَلَیْكَ ثَوْبُ الْعَافِیَةِ، وجزاك عَنِّي خیرًا۔
 میں جون میں لکھنؤ میں تھا، واضح صاحب (۱) نے بتایا کہ ”الداعی“
 میں مولانا نور عالم نے تمھاری کتاب پر بہت اچھا لکھا ہے؛ مگر وہاں پرچہ
 باوجود تلاش کے نہیں مل سکا، دہلی آیا تو ”ذکر و فکر“ کے دفتر میں یہ پرچہ (جو
 تبادلے میں آتا ہے) ملا۔ مکہ مکرمہ کے پتے پر بھی آیا کرتا ہے، جس کے
 لیے ہم مزید و دائماً شکر گزار ہیں۔
 حجاز تشریف لائیں، تو ملاقات کا مجھے بھی موقع دیں۔

والسلام
 عبداللہ عباس ندوی

خوش حالی کے باوجود، سادہ زندگی

میری معلومات کی حد تک مولانا فارغ البال اور خوش حال تھے؛ کیوں کہ انھیں
 سعودی عرب کی نیشنلٹی مل گئی تھی، وہاں وہ عرصے تک مختلف تدریسی، انتظامی و نشریاتی
 لائق ذکر مناصب پر فائز رہے، جامعہ ام القریٰ میں استاذ اور جدہ میں مشرقی نشریات کی
 ذمہ داری کے علاوہ وہ ”رابطۃ العالم الاسلامی“ مکہ مکرمہ میں اہم عہدوں کے لیے
 باعثِ زینت رہے؛ لیکن انھوں نے ہمیشہ معمولی آدمی کی طرح سادہ زندگی گزاری۔
 وہ ظاہر کی آراستگی پر توجہ نہ دے کر باطن کی تعمیر میں لگے رہتے تھے۔ ملنے والے کو پہلے
 سے معلوم نہ ہو، تو اُن سے مل کر وہ یہ قطعاً اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ وقت کے بہت
 بڑے ادیب، جہاں دیدہ داعی، باہر تعلیم، مشاق مربی، صاحب طرزِ انشا پرداز، عاشق
 رسول، محبت صحابہ، امت کے ایک غم خوار، قد آور مؤلف اور دودرجن سے زیادہ گراں قدر

(۱) مولانا سید واضح رشید ندوی برادرِ خرد حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی و استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء و ایڈیٹر ”البعث
 الاسلامی“ و ”الرائد“ و ہمیشہ زادہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

عاشق رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

کتابوں کے مصنف سے مل رہا ہے۔

بہت کام کرنے والے، خصوصاً اہل قلم کے روٹینی مشاغل کی وجہ سے، اُس کو اپنے اوقات کی ترتیب میں بڑی نزاکت اور سوچ سے کام لینا پڑتا ہے، ہر کام کے لیے وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام متعین نہ کیا جائے، تو کام نہیں ہو پاتا؛ لیکن مولاناؒ طرح طرح کے مشاغل کے باوجود، اپنا در ہر وقت کھلا رکھتے تھے، ہر آدمی بغیر کسی ڈنٹی تردد اور نفسیاتی تیاری کے اُن سے مل سکتا تھا۔ اُن کے ایسے عظیم المرتبہ نہیں؛ بل کہ جو لوگ اُن کے عشرِ عشر بھی نہیں ہوتے، اُن سے ہر وقت اور بغیر کسی ڈنٹی الجھن کے ملنا مشکل ہوتا ہے، تو اُضح اور خاک ساری اُن کی واضح شناخت تھی۔ عالم اور داعیہ کے جسم پر یہی لباس، زیب دیتا بھی ہے۔ اگر کسی عالم کا جسمانی وجود اس لباسِ جمیل سے عاری ہو، تو وہ بہت مکروہ اور قبیح محسوس ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُس سے عالم اور داعی کا رسمی لقب بھی کسی طرح چھین لیا جاتا، تو بہت اچھی بات ہوتی۔

مولاناؒ اسی کے ساتھ، عالم وداعی کی مکمل شان کے حامل تھے اور اپنے علم کا احترام کرنا جانتے تھے، چنانچہ وہ علم کے تقاضوں پر بہ خوبی عمل کرتے تھے اور کسی بھی بے عملی کے ذریعے، علم کی آبرو کو پامال نہ ہونے دیتے تھے؛ کیوں کہ وہ جانتے تھے، عالم کا علم اُس کو اور دوسروں کو تب ہی فائدہ دیتا ہے، جب وہ اُس پر عمل کرتا ہے، علم بغیر عمل کے ایک پہیلی ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اللہ انھیں جنت الفردوس کا مکین بنائے اور انبیاء و صلحا کے جوار میں جگہ نصیب

کرے، آمین۔ (۱)

(۱) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۱-۲، جلد ۳۰، محرم و صفر ۱۴۲۷ھ = فروری و مارچ ۲۰۰۶ء۔

اردو تحریر یہ قلم خود ۱۲: ۱۲ بجے، بدوقت اذان جمعہ ۲۵ محرم ۱۴۲۷ھ = ۲۳ فروری ۲۰۰۶ء۔

سوانحی نقوش

✽ نام و نسب: مولانا عبداللہ بن ابوالفضل مفتی محمد عباس بن مولانا محمد انس بن مولانا شاہ نور احمد بن مولانا شاہ محمد امام بن مخدوم شاہ نعمت اللہ بن تاج العارفین پیر مجیب اللہ قادری جعفری زنبلی پھلواوی قدس سرہ۔

✽ تاریخ پیدائش: ۱۳۳۳ھ/۱۹۲۵ء

✽ جائے پیدائش: پھلواوی شریف، پٹنہ (بہار) آباواجداد آٹھ پشتوں سے علم دین سے وابستہ رہے۔
✽ ابتدائی تعلیم: گھر پر حاصل کی، اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی مولانا شاہ نعمت امام پھلواوی سے بہت اثر قبول کیا۔ شاہ نعمت امام فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسہ قدیمہ میں پڑھاتے تھے۔

✽ لکھنؤ آمد: ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ آئے، فرنگی محل مدرسہ قدیمہ میں تین سال تک پڑھا، پھر ندوے میں داخلہ لیا اور وہاں سے فزیلیت کی ڈگری حاصل کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اُن کے اساتذہ میں شاہ حلیم عطاء، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مفتی محمد سعید وغیرہ تھے۔

✽ پوسٹ گریجویٹ: ”السنۃ سامیات“ (ممتاز)

✽ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی: (فلسفہ لسانیات) یونیورسٹی آف لیڈز۔ انگلینڈ

✽ سکونت و شہریت: مکہ مکرمہ

✽ عہدے اور مناصب

- استاذ ادب، ادیب اول دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، وکیل ادارہ نشریات شرقیہ (سعودی عرب)
- مدیر منظمات اسلامیہ و اقلیات، رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) ● ایڈیٹر ماہنامہ رابطہ (انگریزی)
- استاذ جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ (ادب عربی و معہد عربی برائے غیر عرب) ● معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء
- مشیر اعزازی رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) ● ممبر آف لنگوئجک سوسائٹی کیمبرج (انگلینڈ)

✽ تصنیفات

- (۱) ● چند دن دیار غیر میں (سفر نامہ یورپ) شائع شدہ ”الحجیب“ دور اول۔ شائع کردہ: دارالاشاعت

عاشق رسول ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

خانقاہ موگنیر، بہار۔

- (۲) ● دروس الاطفال (عربی)
- (۳) ● آسان فقہ (اردو)۔ یہ دونوں کتابیں ”مکتبہ دین و دانش لکھنؤ“ نے شائع کی تھی جو تقریباً ہر سال ایک دو بار شائع ہوتی ہے، دروس الاطفال کا ایک ایڈیشن ”مکتبہ نشریات اسلامی“ کراچی نے شائع کیا تھا۔
- (۴) ● عربی میں نعتیہ کلام۔ اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مفصل مقدمہ ہے۔ اس کے دو ایڈیشن کراچی میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ”مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ“ سے شائع ہوا تھا۔ مزید اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن عن قریب ”مکتبہ اسلام“ سے شائع ہونے والا ہے۔
- (۵) ● تفہیم المنطق۔ شائع کردہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، (نئی ایڈیشن) مجلس نشریات اسلام کراچی ایک ایڈیشن، دارالاشاعت کراچی ایک ایڈیشن۔
- (۶) ● پیغمبر اخلاق و انسانیت۔ (مجموعہ خطابات سیرۃ النبی) شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔
- (۷) ● قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ۔ شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔
- (۸) ● تاریخ تدوین سیرت۔ شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔
- (۹) ● آفتاب نبوت کی چند کرنیں۔ شائع کردہ: کراچی۔ دہلی۔
- (۱۰) ● میر کارواں (نقوش سوانح مولانا علی میاں)۔ شائع کردہ: پہلا ایڈیشن پارک آفسیٹ پریس لکھنؤ۔ شائع کردہ: دوسرا ایڈیشن مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔
- (۱۱) ● نگارشات (مجموعہ مقالات) دو ایڈیشن۔ شائع کردہ: علمی اکیڈمی دہلی۔
- (۱۲) ● مفصل تبصرہ (میں بھی حاضر تھا وہاں کا جواب)۔ شائع کردہ: ندائے ملت ٹرسٹ لکھنؤ۔
- (۱۳) ● یادے رحمت۔ شائع کردہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ۔
- (۱۴) ● ارشادات نبوی کی روشنی میں نظام معاشرت۔ شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔
- (۱۵) ● روح کائنات و فضائل درود و سلام۔ شائع کردہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
- (۱۶) ● سفر نامہ حیات۔ زیر طبع: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
- (۱۷) ● ترجمات معانی القرآن و تطور فہمہ عند العرب۔ پہلا ایڈیشن دارالارشاد، بیروت سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ”رابطہ عالم اسلامی“ مکہ مکرمہ نے شائع کیا۔

- (۱۸) ● المذاهب المنحرفة في التفسير (عربی)۔ دارالارشاد، جدہ۔ اس کے نسخے نہیں مل رہے ہیں، ایک نسخہ ام القریٰ کی لائبریری میں ہے۔
- (۱۹) ● نظام اللغة الأردية (عربی)۔ شائع کردہ: جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ۔
- (۲۰) ● شرح کتاب النکت فی إعجاز القرآن للرماني۔ شائع کردہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔
- (۲۱) ● أساس اللغة العربية أول، ثاني، ثالث۔ شائع کردہ: دارالین کثیر دمشق۔
- (۲۲) ● تعلم لغة القرآن الكريم (عربی، انگریزی)۔ ۸/۱ ایڈیشن، جدہ، بیروت، سنگاپور، کوالا لپور، کراچی۔
- (۲۳) ● قاموس ألفاظ القرآن الكريم (عربی، انگریزی)۔ ۱۰/۱ ایڈیشن، جدہ، بیروت، سنگاپور، کوالا لپور، کراچی
- (۲۴) ● مصائب کامداوا (شرح قصیدہ علامہ نحوی مراکشی) (*)



(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں ”تغیر حیات“ (پندرہ روزہ ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلماء) میں شائع شدہ بعض مضامین سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

ایک قد آور قائد

۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء — ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء

کاوشِ دشتِ جنوں ہے، ہمیں اس درجہ پسند
کبھی تلووں سے جدا، خارِ مغیلاں نہ ہوا

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ پر، راقم نے اردو میں بہ راہِ راست دو مضمون لکھے تھے: پہلا مضمون ”عفت روزہ“ عالمی سہارا“ نئی دہلی کے لیے بہ عنوان ”مولانا اسعد مدنی.. ایک ہمہ جہت اور بے مثال قائد کی رحلت“ بہ روز بدھ ۱۶ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵ فروری ۲۰۰۶ء تحریر ہوا، جو ”عالمی سہارا“ کے شمارہ ۴۱، جلد ۳ میں ۱۸ فروری ۲۰۰۶ء کو شائع ہوا۔

دوسرا مضمون بہ عنوان ”مولانا سید اسعد مدنی.. مروّ آہن کی موت“، یک شنبہ ۲۰ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء کو تحریر ہوا اور ”ماہ نامہ دارالعلوم“، ”ندائے شاہی“ اور ”ترجمانِ دیوبند“ وغیرہ میں شائع ہوا۔

یہاں دونوں ہی مضامین نذرِ قارئین کیے جا رہے ہیں کیوں کہ دونوں کے نہ صرف رنگ و آہنگ میں خاصا فرق ہے، بل کہ دونوں کے شمولات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مولانا مرحوم پر راقم نے عربی میں، ان دونوں سے الگ مضمون لکھا تھا جو ”الداعی“ عربی کے شمارہ ۲-۱، جلد ۳۰، محرم و صفر ۱۴۲۷ھ مطابق فروری و مارچ ۲۰۰۶ء میں بہ عنوان ”العالم الداعی القائد الہندی البارز فضیلۃ الشیخ السید اسعد المدنی“ شائع ہوا۔

مولانا پر ایک چوتھا مضمون اردو میں خاصا طویل، بہ عنوان ”حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور عالمِ اسلام“ لکھا گیا، جو عفت روزہ ”الجمعیۃ“ کے خاص شمارے میں شائع ہوا، جو اس کتاب میں، شامل نہیں۔

پس مرگ زندہ

مولانا سید اسعد مدنی، اپولو اسپتال میں مسلسل ۳ ماہ بے ہوشی کی حالت میں زیرِ علاج رہ کر دو شنبہ: ۲۰ فروری ۲۰۰۶ء مطابق ۷ محرم ۱۴۲۷ھ کو پونے چھ بجے شام کو مالکِ حقیقی سے جا ملے اور سہ شنبہ کی صبح کو دیوبند کے مقبرہ قاسمیہ میں، اکابرِ دارالعلوم دیوبند کے پہلو میں آسودہ خاک ہو گئے۔ مولانا کی وفات سے، ملتِ اسلامیہ ہند کو شدید صدمہ ہوا۔ مسلمانوں میں قد آور قیادت کے خلا کے اس دور میں، اُن کا قد سارے قائدین و زعماء میں سب سے اونچا تھا۔ وہ اپنی مجموعی صفات کے حوالے سے سب سے ممتاز اور با اثر تھے۔ اُن کی سیاسی، ملی اور قائدانہ سوچ و بوجھ سے، ہندی مسلمانوں کو موجودہ دور بے کسی میں بڑا سہارا ملا۔ دارالعلوم دیوبند کو اُس کے دورِ جدید میں جس طرح ترقی دی، وہ ہر طرح لائقِ تحسین ہے۔ مسلکِ دیوبند، چونکہ اعتدال، توازن اور روحِ شریعت کی گہری بصیرت پر مبنی مسلک ہے؛ اس لیے دائیں اور بائیں رجحان کی ہر انتہا پسندی، اُس سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہی ہے اور بالیقین آئندہ بھی رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتدال اور انتہا پسندی دونوں ایسے فریق ہیں، جس میں کسی طرح کی کوئی صلح کبھی ممکن نہیں؛ کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مولانا مدنی نے ہمیشہ ہر مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی سے، کامِ یابی سے لوہا لیا؛ اس لیے اس طرح کے رویے کے حامل افراد اور جماعتیں، سچی بات یہ ہے کہ اُن کے دم قدم سے ہمیشہ خائف رہتی تھیں اور دارالعلوم کے مسلک کے مُعاندین، اُن سے بہت گھبراتے تھے۔

اُن کی کام رانیوں کا ضامن و صف

مولانا سید اسعد مدنی چستی، ہمہ وقت سرگرم عمل رہنے اور سستی سے بالکل مبرا شخصیت کا نام تھا۔ بلند ہمتی، خود اعتمادی اور ارادے کی پختگی میں وہ اپنے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کا پر تو تھے۔ ہر وہ ہدف جس کی صحت پر اُنھیں یقین ہوتا، ہر طرح کے موانع کو عبور کر کے اُس کو پالینے کی ایسی جتن کرتے کہ

لوگوں کو حیرت ہوتی۔ فریق مخالف کے توڑ کی تدبیر تک بہ غلبت ذہنی و عملی رسائی کی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ پیچیدہ مسائل و مشکلات کے حل تک سرعت سے جا پہنچنے کا ہنر، اُن سے بہتر کسی کے پاس نہ تھا۔ مسلم عوام سے ہمہ وقت اور ہر سطح پر مربوط رہنے کے فن میں وہ بہ جاطور پر طاق تھے اور اس رابطے سے سیاسی، ملی اور دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے وسائل جٹالینے میں وہ بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ سخاوت، سیرچشی (جو انھیں اپنے عظیم والد اور اپنے محترم خاندان سے وراثت میں ملی تھی) پر وہ اس خوب صورتی سے اور اتنے بھرپور انداز میں کار بند تھے کہ انھیں برتنے والا ہر آدمی خاندانِ سادات کی فیاضی پر از سر نو ایمان لے آتا تھا۔ انھوں نے اس وصف کے ذریعے بھی، جہاں نیک نامی اور شکر گزاری حاصل کی، وہیں بڑے بڑے معرکے بھی سر کیے۔ بلاشبہ یہ صفت اُن کی بہت سی کام رانیوں اور شاد کامیوں کی ضامن تھی۔

ہمہ گیر اور بے نظیر مقبولیت

ہندوستان میں دین کی بقا کے سب سے بڑے رمز: دارالعلوم دیوبند کے ارد گرد کے خطوں اور ضلعوں کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے عظیم والد کی مجاہدانہ و زاہدانہ زندگی کی لاثانی اور لافانی محبت کی ختم ریزی کی نہ صرف ہنرمندانہ نگہداشت کی؛ بل کہ ملی سرگرمیوں کے ذریعے، اُس کی آب یاری کی اور ملک و ملت کو بہت فائدہ پہنچایا، بالخصوص اُس سے دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علما کو غیر معمولی فائدہ ہوا۔ ہندوستان کے کسی مسلم قائد اور زعیم کو یہ دعویٰ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی کہ اس ملک کے کسی خطے میں بھی، اُس کو مسلمانوں میں وہ ہمہ گیر و شمر آور مقبولیت و عقیدت حاصل ہے، جو مولانا اسعد مدنی کو حاصل تھی؛ اسی لیے دہلی میں اور دیگر مرکزی شہروں میں، کسی بھی تحریک، احتجاج، مظاہرہ اور تاریخ ساز جلسے کے لیے، اُن کی صرف ایک اپیل، ایک آدھ دورے اور عاجلانہ کوششوں کے ذریعے، عوام و خواص کی لاکھوں کی جو بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی، وہ

پس مرگ زندہ

کسی اور کے بس کی بات تھی نہ ہو سکتی تھی اور نہ اب مٹھوڑ ہے۔
اپنی مٹھوڑ، مٹوڑن، دھیمی اور مستحکم سوچ اور پالیسی، نیز سیکولرزم کے صحیح، شفاف اور
سچے تصوُّر پر غیر مٹوڑن ایمان اور عمل کی وجہ سے، برادرانِ وطن کے بڑے طبقے میں اور
سارے غیر مسلم زعماء و سیاست کاروں کے نزدیک، جو اعتماد، عظمت اور ساکھ، اُن کی تھی کسی
اور مسلم قائد اور زعيم کے لیے، اس مقام تک پہنچنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ہے اور کہنے
دیجیے کہ اس مشکل کو سر کرنے والا کوئی مسلمان قائد و زعيم؛ دور دور تک نظر نہیں آتا۔

وجہ امتیاز

اُن کا ذہن اور عمل ایک ہی وقت میں کئی مشکل محاذوں پر سوچنے اور اپنا اثر دکھانے
کی غیر معمولی طاقت رکھتے تھے۔ عام قائدین و زعماء کے لیے، ایک وقت میں کسی ایک ہی
سمت میں، سوچنا اور سرگرم عمل ہونا ممکن ہوتا ہے۔ مولانا کی اسی صلاحیت کی وجہ سے یہ
ہوا کہ حرکت و عمل کی اُن کی زندگی میں بہت سے لوگ، اخلاص سے یا کسی مصلحت کے
تقاضے سے، اُن کے کارواں سے ٹوٹے اور اُن سے بدگمان ہو کر، اُن کی بزم سے نکلے،
جن میں سے متعدد لوگ، اُن سے پہلے ہی اپنی آخرت کی منزل کو جالیے — اللہ
انھیں بھی اور انھیں بھی غریقِ رحمت کرے — لیکن اُن میں سے زندہ اور مرد کسی
قائد و زعيم کو، اُن کو مغلوب کر دینے، یا اُن کو اُن کی سمت سفر سے ہٹا دینے کی طاقت
میسر نہ آ سکی، جو خود ریکارڈ کرنے کی چیز ہے اور اُن کی غیر معمولی تفکیری صلاحیت،
فولادی قوتِ عمل، دور رس پلاننگ اور غنیم کی ہر چال کے توڑ کے لیے، پہلے سے تیار کردہ
یا بروقت سوچی ہوئی ”جیلہ شکن“ اسکیم پر، اُن کے ساحرانہ قابو کی بین دلیل ہے۔

جہد مسلسل اور یقین محکم

مولانا مدنی نے مسلمانوں کے معتد بہ طبقوں میں مقبولیت اور عقیدت کی ایسی
زندگی گزاری، جس کی سفیدی کو، ان سے اخلاص سے یا نفاق سے اختلاف رکھنے والے

کی سلاہی کوششوں کے باوجود، داغ دار نہیں کیا جاسکا۔ اُن کی سرگرمیوں اور جہد مسلسل یقیناً محکم کا سیل بے پناہ، اُن کے خلاف اچھالے گئے سارے خس و خاشاک کو بہالے گیا۔ وہ محو عمل رہنے کا، ایسا کر جانتے تھے جو بد قسمتی سے شہرت اور عزت کے خواہش مندوں کے ذہن میں عام طور پر نہیں آتا۔ مولانا کام کرنا جانتے تھے، تنقید اور حرف گیری کو، اس طرح خاطر میں نہ لاتے تھے کہ ہمت ہار کر بیٹھ جائیں۔ دیگر حوالوں کے ساتھ ساتھ، اس حوالے سے بھی اُن کی زندگی اور سیرت و کردار انتہائی سبق آموز ہے۔ وہ ہر اعتراض کا جواب مثبت عمل اور سفر مسلسل کے ذریعے دینا جانتے تھے۔

مولانا مدنی سے کسی کو اتفاق رہا ہو یا اختلاف، اس بات سے کسی کو اختلاف کرنے کا یار نہیں کہ وہ معاصرین زعماء و علما میں اپنے مجموعی کردار و عمل سے لاثانی تھے، اُن کے جانے سے ایسا لگتا ہے کہ ملت کی قیادت کی عمارت کا مرکزی ستون، اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے اور کوئی دوسرا ستون اُس کی جگہ فٹ ہوتا نظر نہیں آتا۔

مولانا اپنی عظمت و وجاہت اور قوتِ کار کی وجہ سے، مسلکِ دیوبند کے سب سے بڑے پاسبان تھے۔ پاسبانی کے اس محاذ پر بھی اُنھوں نے بہت ٹھوس کارنامے انجام دیے اور اس حوالے سے کسی صلح، بھید بھاؤ کو قبول نہیں کیا اور کسی ملامت کنندہ کی ملامت کو خاطر میں نہیں لائے۔ وہ حق اور باطل (بالخصوص عقیدہ کے حوالے سے) کو گڈمڈ کرنے کی راہ پر ایک قدم بھی چل نہیں پاتے تھے؛ اسی لیے، اُن کے بہت سے معاصرین یہ تک کہ بیٹھتے تھے کہ مولانا اسعد ہر جگہ ایک اینٹ کی اپنی الگ مسجد بنانے لگتے ہیں۔ یہ وصف اُن میں واقعتاً اپنے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نیز اکابرِ دیوبند سے منتقل ہوا تھا، جو حق و باطل کے معجون پر ایمان رکھتے تھے نہ عمل کرتے تھے۔

عظمت کا راز

مولانا نے بیرون ملک بھی عظمت و شہرت حاصل کی اور وہاں کے عوام اور حکومتوں

نے انھیں اہمیت دی۔ وہ مُتَّعِدِ مَلُکوں کے اِداروں کے صدر اور سرپرست تھے۔ انھوں نے دعوتی، ثقافتی اور تربیتی اتنے دورے بیرون ملک اور اندرون ملک کے کیے کہ کئی مرتبہ ذرائع ابلاغ میں یہ آیا کہ اُن سے زیادہ اَسفار کسی دینی یا دنیوی سیاسی قائد نے نہیں کیے۔ وہ سیلاب کی رُو کی طرح بے طرح بہنا جانتے تھے۔ ایک ایک روز میں کئی کئی جلسوں اور میٹنگوں کو خطاب کر لیتے تھے۔ تھکاوٹ، گراوٹ، آرام، ٹھہراؤ اور پڑاؤ سے وہ واقف نہ تھے۔ یہی اُن کی عظمت کا راز، اُن کی عزت کا مرکزی سبب اور اُن کی عقیدت کی محوری وجہ تھی۔ بہت سے دانا یا نادان اُن کی ساری عظمتوں کو، اُن کے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی غیر معمولی محبت و عقیدت کی دین سمجھتے ہیں، جو اللہ پاک نے انھیں اُن کی خاکساری، اخلاص اور للہیت کی وجہ سے عطا کی تھی؛ لیکن میرا مطالعہ مجھے یقین دلاتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ، مولانا اسعد مدنی کی ملک گیر عظمت و مقبولیت کی وجہ اُن کی غیر معمولی فعّالیت اور افادیت تھی؛ ورنہ بہت سے عظیم والدوں کی اولادوں کو (جو مولانا سید حسین احمد مدنی ہی کی طرح دینی و علمی سطحوں پر غیر معمولی تھے) مولانا اسعد مدنی کے عُشر عُشر بھی عظمت و مقبولیت میسر نہ آسکی، حال آں کہ خواہش، کوشش اور فکر و عمل کا سرمایہ خرچ کرنے میں کسی نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ سچ ہے: ”توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے“۔

مولانا کی ایک اہم صفت

مولانا سید اسعد مدنی کی ایک اہم صفت اُن کی نماز باجماعت اور قیام اللیل کی پابندی تھی؛ بل کہ نماز کو انتہائی خشوع و خضوع و اطمینان سے ادا کرنے میں وہ ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ ارکان کی ادائیگی اور تمام اجزائے صلاۃ کو پورا کرنے میں درازی، سکون اور انہماک، میں نے اُن کی طرح بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ خواہ کتنی عجلت ہو، وہ نماز میں رواروی اور ”کنسیشن“ کے قائل اور عامل نہ تھے۔ لوگوں کو کتنی عجلت ہو، کوئی بڑا لیڈر

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

آ رہا ہو، پانچویں کسی بڑے سے ملنے جانا ہو، گاڑی تیار ہو، دسترخوان چُجن دیا گیا ہو، جلسے کے مُنظّمینِ عجلت مچار ہے ہوں؛ مولانا نماز شروع کرنے کے بعد، اُس کو انتہائی اطمینان ہی سے ادا کرتے تھے۔

مولانا اسعد مدنیؒ میں مردِ ہشیار کی ذہانت، قائد کی دور رس، سپہ سالار کی جرأت، عالم کا وقار، داعی کی حکمتِ عملی، سیاست داں کی سمجھ داری، سپاہی کی تیز روی، مصلح کی فکر مندی، برسرِ جنگ سالار لشکر کا احساسِ ذمہ داری، مثالی عبادت گزار کا انہماک، پیدائشی فیاض و سخاوت کی کشادہ دلی اور ہمہ جہت مقابلے کی صلاحیت رکھنے والے محارب کی چوکی اور بیداری تھی۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں؛ لیکن اُن کا کام اور نام بہت دنوں تک زندہ اور اُن کے لیے دعا اور جاری ثواب کا ذریعہ بنے رہیں گے۔ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ (۱)

(۱) تاریخِ تحریر: بدھ ۱۵ / فروری ۱۹۰۶ء = ۱۶ / محرم ۱۳۲۷ھ، شائع شدہ ہفت روزہ ”عالمی سہارا“ اردو نئی دہلی، شمارہ ۳۱، جلد ۳، ص ۱۳، بتاریخ ۱۸ / فروری ۲۰۰۶ء۔

مولانا سید اسعد مدنی.. یعنی مردِ آہن

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا، بے جزأتِ رندانہ

عرصہ دراز سے (جس میں ۳ ماہ یعنی از شب ۵-۶ نومبر ۲۰۰۵ء تا شام ۶ فروری ۲۰۰۶ء، مطابق سنچر- اتوار: ۲-۳ شوال ۱۴۲۶ھ تا سوار: ۷ محرم ۱۴۲۷ھ، مستقلاً موت و حیات کی کش مکش سے دوچار رہے) بیماری سے نبرد آزما رہنے کے بعد، بالآخر مردِ آہن مولانا سید اسعد مدنی نے، موت کے آگے سپر انداز ہو کر ۶ فروری ۲۰۰۶ء کی شام کو ۵ بج کر ۳۵ منٹ پر، دہلی کے اپولو ہسپتال میں آخری سانسیں لے لیں اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ پاک نے اُن کے لیے جتنی زندگی مُقَدَّر کر رکھی تھی، اُس سے ایک لمحہ بھی زیادہ وہ کیوں کر جی سکتے تھے:

ایک لمحے کی اجات بھی نہیں ملنے والی
موت آتی ہے تو دستک بھی کہاں دیتی ہے

مولانا کی کمی کا احساس

دنیا میں ہر آن موت و حیات کی پنچہ آزمائی جاری رہتی ہے۔ زندگی پر موت کی یقینی فتح ایک غیر معمولی واقعہ ہے؛ لیکن ہر وقت اور ہر جگہ اور ہر موسم میں پیش آنے کی وجہ سے زندوں کا ایک ہی لمحے میں مردہ ہو جانا اور پھر لوٹ کے کبھی نہ آنا، ایک عام سا واقعہ بن گیا ہے، جس پر کسی کی توجہ مرکوز نہیں ہوتی؛ لیکن جب کوئی ایسا انسان دنیا سے منھ موڑ

لیتا ہے، جس کی زندگانی، خود اُس کے لیے اور دوسروں کے لیے مفید تھی، تو افادیت کے بہ قدر، دنیا والوں کو اُس کے چلے جانے کا غم ہوتا ہے اور اُس کو کھودینے کے بعد، اُس کی قدر و قیمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے، خصوصاً تب جب اُس کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا اور صلاحیت و افادیت کے حوالے سے، اُس کے بعد کسی بے جوڑ انسان پر مجبوراً انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا احساس مولانا سید اسعد مدنیؒ کے اٹھ جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ مولانا کی کمی پورے ملک میں شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔

موت اُس کی کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مولاناؒ کے عمل کی مرکزی سمتیں

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کاموں کی بہت سی سمتیں تھیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ انھوں نے مدینہ منورہ میں گزارا، جہاں اُن کے خاندان کے لوگ متوطن ہیں۔ پھر دارالعلوم میں مدرس ہوئے۔ اس عرصے کی کوئی تفصیل مجھے معلوم نہیں؛ اس لیے اس حوالے سے میں کوئی گفتگو نہیں کر سکتا۔ تدریس سے از خود سبک دوشی کے بعد، وہ جمعیۃ علما کی قیادت کے میدان میں آ گئے، جو اُن کے فکر و عمل کی دوسری سمت تھی۔ جمعیۃ علما کی نظامت سے صدارت تک کے دور میں (جس پر وہ وفات تک فائز رہے) ملک و ملت کی سطح پر دوسری خدمتیں انجام دیں:

(الف) مسلمانوں کے حقوق کی دست یابی اور نا انصافیوں کے ازالے کی ہمہ گیر کوششیں اور اسلامی اداروں اور مراکز اور تعلیم گاہوں اور مساجد و مقابر و مزارات کی حفاظت کے لیے زبردست اور جامع جدوجہد، جس میں وقتاً فوقتاً غیر معمولی بھیڑ والے جلسوں، مظاہروں اور طویل المیعاد تحریکوں کے ساتھ ساتھ، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور متعلقہ وزراء و حکام و افسران سے ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے، ارتباط مسلسل

شامل ہوتا۔

(ب) مسلم کش فسادات پر حکومتِ وقت سے پرزور اور موثر احتجاج اور ساتھ ہی متاثرین کی تعمیر اور ٹھوس مدد اور اس کے لیے قریہ بہ قریہ اور کو بہ کو مسلسل چکر اور دوڑ دھوپ۔ نیز قدرتی آفات کے موقع سے مصیبت زدگان کی ہمہ جہت مدد اور حکومت کو اُن کی دادرسی کے لیے جھنجھوڑنا۔

مولانا نے دونوں سطحوں پر عمل کے لیے ہمیشہ جمعیۃ علما کی تائیدی روح اور اُس کے اولین قائدین کے عملی و نظری طرزِ عمل سے روشنی کے حصول کے ساتھ ساتھ، اپنی ہمت و عزیمت، دور رس منصوبہ بندی اور نتیجہ خیز حکمتِ عملی سے فائدہ اُٹھایا۔ نیز ملک کے سیکولر کردار، دستور کے مزاج اور مختلف المذاہب باشندگانِ ملک کے لیے اُس کی شفقت ریز ملامت سے نہ صرف استناد کیا؛ بل کہ ہمیشہ، ہر جگہ، ہر موقع سے اُس کی دُہائی دی اور ملک کے سیکولر ضمیر پر، ایسی زبردست دستک دی کہ مسلمانوں کے خلاف عصبیت، نفرت اور دشمنی سے مسموم فضا میں، جو انتہا پسند اور جارحانہ جذبات رکھنے والی ہندو جماعتوں اور افراد نے بنائی ہے، اُن کی بات زیادہ یا کم ضرور سنی گئی اور اُس کا نتیجہ دیر یا سویر، کم یا زیادہ ضرور نکلا۔

اُن کے کام کا انداز

اسی نقطے کو پیش نظر رکھتے ہوئے، مولانا نے ہندی مسلمانوں کے مسائل کو ہندوستان کے اربابِ حل و عقد کے سامنے کبھی بھی صرف مسلمانوں کے مسائل کی حیثیت سے پیش نہیں کیا؛ بل کہ اُنھیں سرکاری اور عوامی سطحوں پر مرکزِ توجہ بنانے کے لیے، ملک کے سیکولر کردار کے حوالے کو، اتنی شدت کے ساتھ اُجاگر کیا کہ بعض اُن برادرانِ وطن زُعماء کو، جو سیکولر زُعماء کی دوسری صف سے تعلق رکھنے اور صفِ اول کے زُعماء سے تربیت پانے کے باوجود، سیکولرزم کی روح سے کسی غرض یا مرض یا مجبوری کی

وجہ سے، انماض کرنے لگے تھے، سیکولرزم کا بھولا ہوا سبق پھر یاد آ گیا۔

اپنے اکابر مجاہدین آزادی (خواہ مشائخ دیوبند ہوں یا دیگر بانیان جمعیت) کی طرح اُن کا ایمان تھا کہ آزاد ہندوستان میں، محض مسلم اکائی کی بات، محض اکائی ہونے کی حیثیت سے منفردانہ طور پر نہیں سنی جائے گی اور اگر خدا نہ خواستہ بعض نادان مسلم سیاست دانوں کی طرح، مسلم مسائل اور حقوق کی لڑائی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے برادران وطن کی رائے عامہ کو محسوس ہو کہ مسلمان اس ملک کے سارے ہندوؤں کو (جن کی اکثریت کے ہاتھ میں ہی ملک کی تکمیل ہے اور رہے گی) دشمن محض ہی تصور کرتے ہیں اور اُن سے دودھ ہاتھ کر لینے کے لیے تیار ہیں، تو اس طرز عمل سے آزاد ہندوستان میں کوئی بھلا نہ ہوگا اور نہ کوئی حق حاصل کیا جاسکے گا۔ ہندوستان میں اقلیت (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) اور اکثریت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ پہ مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ ملک کی تقسیم سے (خواہ اس کا ذمے دار کوئی ہو: ہندو یا مسلمان یا دونوں) اور قیام پاکستان سے، اکثریت یعنی ہندوؤں کے ضمیر کو خواہی نہ خواہی چوٹ لگی ہے۔ اکثریت کے بہت سے نادان افراد (جن کی تعداد انتہا پسند اور جارحیت پیشہ ہندو قائدین و زعماء کی شب و روز کی جہد مسلسل کی وجہ سے بھیانک طور پر بڑھتی جا رہی ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی اقلیت کو پاکستان کی شکل میں ”حق“ یا ”انعام“ مل چکا ہے؛ لہذا اب جو یہ باقی ماندہ ملک ”ہندوستان“ کے نام سے ہے، صرف اکثریت کا حق یا اُس کی بلا شرکتِ غیرے ملکیت ہے۔ مسلمانوں کو، اپنا حق لے لینے کے بعد بھی اگر یہیں رہنے پر اصرار ہے، تو ملک کا دستور سیکولر ہو یا چک دار، دو نمبر کا شہری بن کے رہنا پڑے گا اور اب تو آئین کو بد لنے، اُس کی سیکولر روح کو ختم کر دینے کی بھی یہ عناصر مانگ کر رہے ہیں، جن کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان دو نمبر کا شہری بن کر رہنا از خود گوارا نہیں کریں گے، تو وطنی حقوق کی تقسیم میں ہم اُن کے ساتھ بے انصافی کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں اور اگر مسلمان زیادہ بے لگام ہوں گے، تو ہمارے پاس فسادات، مسجدوں پر قبضہ کر لینے اور

انھیں مندر ثابت کر دینے، نیز مسلمانوں کے سرکار سے مدد یافتہ اداروں کا اقلیتی کردار سلب کر لینے، جیسے بہت سے کارگرا سلطے موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے دینی اداروں اور جماعتوں اور افراد کو دہشت گرد قرار دے کر، اُن کے خلاف انسداد دہشت گردی کے قانون کی مشق اور ستم ایجاد کا ہنر بھی ہمیں معلوم ہے۔ سرکاری ملازمتوں، سرکاری حقوق و واجبات کی تقسیم کے اداروں کے مناصب تک پہنچنے کی راہیں، مسلمانوں پر آہستہ آہستہ اور بالآخر بالکلیہ بند کر دینے کے عمل سے ہمیں کون روک سکے گا؟ قانون سازی کے اداروں اور انتظامیہ میں بھی ہم ہی ہیں، عملی طور پر دو نمبر کی شہریت کی حامل اقلیت آٹے میں نمک کے برابر ہے؛ لہذا عملاً جو ہم چاہیں گے وہی ہوگا۔

تلخ حقیقت کا ادراک اور حکمتِ عملی

مولانا مدنی مذکورہ تلخ حقیقت کا، اتنا ادراک رکھتے تھے، جو واقعہ یہ ہے کہ کسی معاشرے کا مذکورہ حاصل نہ تھا؛ اس لیے وہ مسلمانوں کے سارے مسائل کی ہر لڑائی، اقلیتوں اور مسلمانوں کے تئیں ملک کے دستور کی تصریحات اور تقاضوں کی روشنی میں، سیکولر ہندوؤں کو ساتھ لے کر، ہنرمندی سے لڑتے تھے اور جیت جاتے تھے یا جیتنے کی راہ ہم وار کر دیتے تھے۔ اللہ نے انھیں برادرانِ وطن کے سیکولر مزاج طبقے کو قریب رکھنے کا بڑا سلیقہ دیا تھا اور یہ طبقہ بھی مولانا کی سیکولر مزاجی پر پوری طرح مطمئن تھا۔ بڑے سے بڑے ہندو لیڈر کو مولانا سے کوئی وحشت نہیں ہوتی تھی؛ کیوں کہ اُس کو مولانا کی وطن پرستی پر مکمل اعتماد تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زیادہ معتبر نمایندگی کا حق رکھتے ہیں۔

مسلمانوں میں گروہی عصبیت اور مسلکی تحاسد اور بغض کی بیماری نہ ہوتی تو دیگر زعماء، مولانا مدنی سے ہر اختلاف کے باوجود، اُن کی اس کامیاب حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھا کر، اس ملک میں مسلمانوں کے آئندہ مسلمان باقی رہنے کی راہ، بڑی حد تک آسان بنا سکتے تھے؛ لیکن افسوس کہ لوگ موت سے پہلے ہی جیتے جی بھی ایک دوسرے سے

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

علاحدہ اور ذہنی وجسمانی طور پر دور رہنا چاہتے ہیں، حال اُن کہ موت دوری پیدا کرنے کے لیے کافی ہے:

كَفَى بِالْمَمَاتِ فُرْقَةً وَتَنَائِيًا

بل کہ مُتَعَدِّدِ مُسْلِم جماعتوں کے لوگ تو مولاناؒ کی اس کارگر حکمتِ عملی کو ”مُذَاهَنَت“ اور ”نیم دروں اور نیم بروں“ کی پالیسی سے تعبیر کرتے تھے؛ تاکہ اُن کی اپنی ناکردگی پر پردہ پڑا رہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے تھے کہ مولاناؒ اپنی تدبیر سے ملت کے لیے جو کچھ کر لیتے ہیں یہ لوگ اُس کا عشرِ عشر بھی کیوں نہیں کر پاتے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ملک کے غیر مسلم سیکولر زُعماء و قائدین بھی، حالیہ زمانے میں مولانا مدنیؒ کو، ملک کے سیکولر کردار کی بقا کی جنگ کے ہراول دستے کا ممتاز سپاہی تصور کرتے تھے؛ اسی لیے اُن کی موت کے بعد ہفتہ عشرہ تک جس طرح قومی اور علاقائی سطح کے بڑے اور چھوٹے مسلمانوں سمیت غیر مسلم زُعماء و قائدین کی بڑی تعداد، جمعیت کے مرکزی آفس واقع آئی ٹی او، ہلی کے علاوہ اُن کے دیوبند کے دولت کدے پر، پارٹی، انتساب اور وفاداری سے اوپر اٹھ کر آتی رہی اور اُن کی روح کو جذباتی انداز میں والہانہ طور پر خراجِ عقیدت اور اُن کے اہلِ خاندان اور افرادِ خاندان کو دلاسا دیتی اور تعزیت کرنی رہی، اُس کی مثال ہندوستان کے کسی اور مسلم زعيم و قائد کے حوالے سے، اس دورِ آخر میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ لوگوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ مولاناؒ سے مسلمانوں و عُلَماء و دُعاة کے علاوہ، غیر مسلم زُعماء کی اتنی بڑی تعداد، اس درجہ تعلق رکھتی ہے کہ وہ اُن کی وفات کے بعد، اُن کی کمی کو اس شدت سے محسوس کرے گی کہ اُن کے خاکی دربار میں اُن کا تانتا لگا رہے گا۔

مولانا مدنیؒ نے تین میقاتوں (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۴ء) میں ۱۸ سال تک، کانگریس کی نام زدگی پر، راجیہ سبھا (ایوانِ بالا) کی رکنیت کی ذمہ داری انجام دی اور اس منصب کو اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے مسائل کی طرف

ملک کے سب سے بڑے مقتدرہ ادارے کی توجہ مرکوز کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہاں بھی انھوں نے ملک کے سیکولر دستور کو ہی اساس بنایا اور اپنی تقریروں، تجویزوں اور مباحثوں میں اُسی کو پیش نظر رکھا۔ لفظی جذباتیت، بے اساس و بے فائدہ جوش سے احتراز کیا؛ کیوں کہ اس سے اکثریت کے ارباب اختیار اور اصحابِ حل و عقد متاثر نہیں ہوتے؛ لیکن ضرورت کے مطابق اُن کی وطنی غیرت اور قومی وفاداری کو بہت بار سلیقے سے لکارا، چناں چہ اُن کی بہت سی باتیں سنی گئیں۔ پارلیامنٹ کی اُن کی تقریریں چھپ چکی ہیں، انھیں پڑھا جاسکتا ہے۔

فتح مند قائد

مولانا نے خدا کی تقدیر کے بہ موجب علمی اشغال کو اپنا وظیفہ حیات نہیں بنایا؛ لیکن خدا نے انھیں میدانِ قیادت و سیادت میں جو کام کرنے کی توفیق بخشی، اُس میں فتح مند یوں نے بے طرح اُن کے قدم چومے۔ ملک و ملت کے عام مفاد کے علاوہ انھوں نے جمعیۃ علما اور دارالعلوم دیوبند سے عوام کے رشتوں کو مضبوط کر لیا اور ہماری جماعت کے علما و خواص کو مسائل کے احساس، اُبلتے ہوئے خطرات کے ادراک، مشکلات کے حل کے طریقوں کے شعور اور تقاضا ہائے زمانہ کی معرفت کے ساتھ ساتھ، کسی لچک کے بغیر اپنے معتدل، متوازن اور مستقیم مسلک پر جنم کے نقطے پر یک جا کر کے، ہمت اور ولولے کے ساتھ سرگرم عمل رہنے کا حوصلہ دیا اور اس مسلکِ حق کو چیلنج کرنے والے دینِ صحیح کے نام نہاد علم برداروں کو نہ صرف چیلنج دیا؛ بل کہ معتدِ دبار انھیں رگیدا، دوڑایا اور اُن کی صفوں میں زلزلہ پیدا کر دیا۔

اقدامی حملے کا امتیاز رکھنے والا سپاہی

مولانا مدنی میدانِ عمل کے آدمی تھے، اُن کا ذہنی سانچہ اسی کے لیے تشکیل ہوا

تھا۔ محض آفس، دفتر اور کسی مرکز میں بیٹھ کر کاغذات کی ورق گردانی کرنا اور کسی پرسکون کمرے میں بیٹھ کر قسطاں و قلم کا رشتہ جوڑنے کے عمل پر انحصار کرنا، ہے تو اپنی جگہ مفید اور دیرپا اور دور رس عمل اور جو لوگ اس کے لیے مخلوق ہوئے ہیں، اُن کے لیے یہ کام آسان ہے اور میدانِ عمل کی ضربِ کلیسی سے سہل تر ہے؛ مگر بعض دفعہ اس کا وہ فائدہ مُرتَّب نہیں ہوتا، جو میدانِ کار میں نکل کر ایک ظالم، ایک بے انصاف، ایک بے لگام جابر اور ایک جارحیت شعار سچائی کے دشمن اور تیرگی کے علم بردار پر، بڑھ کر وار کرنے والے کے ذریعے مُرتَّب ہوتا ہے۔

مولانا اُردی آدمی تھے، وہ آگے بڑھ کے حملہ کرنا جانتے تھے، دفاعی پوزیشن کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہم مسلکوں کو بھی یہی راہ دکھائی اور اس پر چلنے کا گرا اُنھیں بتایا۔ کانفرنسوں، سمیناروں اور جلسوں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں اُس کے دورِ نو میں، متعدد باطل فرقوں اور مخرف جماعتوں کے داؤ پیچ کو جاننے کے لیے، محاضرات کا پایدار نظام قائم کروایا جو ہنوز معمول بہ ہے۔ اُنھوں نے مسیحی برطانوی استعمار کے کاشت کردہ نبوتِ محمدی کے حریف فرقہ: قادیانیت کی توڑ کے لیے دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ ختم نبوت کے شعبے کی تاسیس کا مشورہ دیا، جواب پہلے سے زیادہ تازہ دم ہے۔

انسان شناسی اور کام لینے کی صلاحیت

مولانا سید اسعد مدنیؒ کی ایک بڑی صلاحیت، انسان شناسی تھی۔ وہ بہت جلد سمجھ جائے تھے کہ متعارفین اور لائق افراد میں سے کون کس خوبی اور خرابی کا آدمی ہے۔ جمعیتِ علما کی قیادت کے منبر سے، سال ہا سال جو ملکی و ملی کارنامے اُنھوں نے انجام دیے، اُن میں بہت بڑا رول اُن کی انسان شناسی اور لیاقت کے عرفان کا رہا ہے۔ اُنھوں نے اُن گنت کام کے آدمیوں کی دریافت کی اور اُن سے مختلف الانواع کام لیے۔ لائق انسانوں کا حصول جتنا مشکل کام ہے اس کو اہل دانش اچھی طرح جانتے

ہیں اور اس سے بھی زیادہ مشکل اُن سے کام لینا ہے۔ ہر لائق آدمی میں ایک طرح کی ”نالائقی“ بھی ہوتی ہے، آپ کو ایسا کوئی آدمی اس روئے زمین پر ہرگز نہیں ملے گا جو صرف لائق ہو۔ صرف لائق فرشتے ہوتے ہیں اور انبیاء اور اُن کے اصحاب۔ زندگی جینے، برتنے اور کام کرنے سے یہ تجربہ ہوا کہ جو آدمی جتنا لائق ہوتا ہے اُس میں اسی درجہ ایک طرح کی ”نالائقی“ ضرور ہوتی ہے۔ صرف نالائق میں غالباً اس طرح کی ”نالائقی“ ہوتی ہی نہیں جو لائق کا وجہ امتیاز ہوتی ہے۔ کام لینے والا ذمے دار، افسر اور آقا، لائق کی لیاقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کی ”نالائقی“ کو ہنرمندی کے ساتھ نہ صرف گوارا کرتا ہے؛ بل کہ بعض دفعہ اُس کو (نالائقی کو) اپنا رنگ دکھانے کا موقع بھی دیتا ہے؛ کیوں کہ لائق کی یہ ”نالائقی“ اُس کی شخصیت کی کلید ہوتی ہے۔ اب اگر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی جائے، تو لائق کے لیے، لیاقت کے حوالے سے اپنا رول ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

میں نے لائق کی جس ”نالائقی“ کی طرف اشارہ کیا ہے، اُس کی تعبیر آپ کسی لفظ سے کر لیں ”ناز و نخرے“ ”خود اعتمادی“ ”ایک قسم کی دیوانگی“ ”احساسِ افادیت“ اور دیگر جو موزوں الفاظ ملیں، نالائق کی جگہ ڈال سکتے ہیں؛ لیکن لائق میں ایسا کچھ ہوتا ضرور ہے۔

مولانا نے بہت متنوع کام کیے؛ لہذا متنوع الاستعداد لوگوں کی ”نالائقی“ سے انھیں سابقہ ہوا اور انھوں نے ہشیاری کے ساتھ، اُن کی استعداد اور لیاقت سے کام لیا، جو واقعی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔ مجھے دارالعلوم کے ایک لائق اہل کار (۱) نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) ایک بار بڑی اچھی بات کہی: مولانا! اچھا افسر اور ذمے دار وہ

(۱) میری مراد دارالعلوم کے سابق پٹیش کر ”بابوطاہر“ (محمد طاہر حسین) سے ہے، جو دیوبند کے محلہ قلعہ، دیوبند کے باشندے تھے، انگریزی پر اچھا عبور تھا، بڑے محنتی اور احساسِ ذمے داری کے حامل آدمی تھے، ان کی وفات بہ روز جمعرات ۲۸ شعبان ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ نومبر ۲۰۰۱ء کو ہوئی۔ اللہ غریقِ رحمت کرے۔

نہیں ہوتا، جو خود بہت کام کرے؛ بل کہ کام یاب اور لائق افسر، وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے زیادہ کام لے لے۔ کام لینا زیادہ لیاقت کی دلیل ہے۔ خود محنت کرنا اور بہت کام کرنا احساس ذمّے داری کی تو دلیل ہے، افسر ہونے کی دلیل نہیں۔ قائد اور افسر کے لیے پہلی صفت کا حامل ہونا ضروری ہے، دوسری صفت کا حامل ہونا ضروری نہیں، ہاں اگر پہلی صفت کے ساتھ دوسری صفت بھی ہو تو یہ سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

مولانا کاوش دشتِ جنوں کے سپاہی اور اس دشت کے فائز المرام رہی تھے۔ وہ تیز روی سے اس طرح لپکنا جانتے تھے کہ کسی لمحے کو پیچھے مڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ معاصر قائدین میں اس امتیاز کی وجہ سے اپنی واضح شناخت رکھتے تھے۔ وہ کسی منزل پر جا کر دم لینے کے قائل نہ تھے اور نہ تلووں سے کانٹوں کے نکالنے کی سوچتے تھے۔ وہ اس شعر کے مصداق تھے۔

کاوش دشتِ جنوں ہے ہمیں اس درجہ پسند

کبھی تلووں سے جدا خارِ مغیلاں نہ ہوا

جو باتو فائق آدمی اس قسم کا ہوتا ہے، وہ عموماً تیز روی کی وجہ سے کسی پڑاؤ، یا وقفے پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس طرح کا آدمی ایک خاص قسم کا مزاج رکھتا ہے کہ بڑھے چلو اور دائیں بائیں نہ دیکھو چوہ جائے کہ پیچھے؛ کیوں کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا ہمت شکن ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفقاء سفر میں سے بہت سے لوگ، اُس سے کچھڑ جاتے ہیں یا وہ خود اُن سے کچھڑ جاتا ہے، بالآخر کچھڑاؤ یا کچھڑاؤ آپسی شکوہ سخی اور بددلی کا باعث بنتی ہے۔ جو آدمی جس درجہ بڑے کام اور بہت کام کا ہوتا ہے، اُس کی زندگی میں خواہی نہ خواہی کچھڑاؤ اور کچھڑاؤ کا مرحلہ ضرور پیش آتا ہے۔ یہ مرحلہ قدرتی طور پر مولانا کو بھی اپنی زندگی میں پیش آیا؛ لیکن یہ اُن کی اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ اُنھوں نے متعدد کچھڑے ہوؤں کو موت سے پہلے ہی گلے لگا لیا اور کچھڑے ہوؤں کے پاس از خود پہنچ گئے اور یک جائی کے بعد ہی اس دنیا کو الوداع کہا۔ اُن میں سرِ فہرست ہند میں دورِ آخر میں سرمایہ

ملت کے نگہ بانوں کے سرخیل امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پڑپوتے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی ہیں، جن سے اُن کی صلح صفائی کا تاریخی واقعہ ہزاروں فضلاء دیوبند اور محبان دارالعلوم دیوبند کی ایسی مسرت کا باعث بنا، جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کی زندگی نے مزید وفا کیا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ صلح صفائی کی بات اُس منزل تک پہنچ جاتی، جس کے تمام فضلاء دیوبند بہت آروز مند ہیں، یعنی دونوں دارالعلوموں کا مکمل اتحاد اور ایک دوسرے میں انضمام۔

اس راقم کے لیے بہ طور خاص، اس فانی دنیا میں ایک دائمی مسرت اُس وقت ہاتھ آ جاتی اگر اسی طرح کی صورت حال مولانا مدنی اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے درمیان پیش آ گئی ہوتی؛ لیکن خدا کی مشیت سے ایسا کچھ نہ ہوسکا؛ ورنہ اس واقعے سے بھی (اگر یہ رو بہ عمل آ جاتا) فضلاء دیوبند اور بھی خواہان دارالعلوم کو پہلے ہی واقعے جیسی خوشی ہوتی۔ اب اس دنیا میں نہ مولانا کیرانویؒ ہیں نہ مولانا مدنیؒ کہ اول الذکر تو ثانی الذکر سے دس ۱۰ سال ۶۸ اڑسٹھ دن پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اللہ دونوں کو اپنی اعلیٰ جنت کا مکین بنائے جہاں لوگ مخلص بھائی وردوست بن کر ہی رہیں گے، اور اس مادی دنیا کی کدورتیں، وہاں اُن میں سے کسی کا آٹاشہ نہ ہوں گی، وہاں تو اخوانا علی سرر متقابلین ہوں گے۔

کام کے آدمی کی خاصیت

بہ ہر کیف مولانا مدنی بہت کام کے آدمی تھے، کام کے آدمی سے بھول چوک، کوتاہی کسی سے اتفاق، کسی سے اختلاف کے مراحل ضرور پیش آتے ہیں۔ کام کی کثرت اور تنوع کے بہ قدر راہ عمل میں ان مراحل کی کثرت بھی ہو جاتی ہے۔ مولانا نے بہت اور متنوع کام کیے؛ اس لیے یہ مراحل دگر فعال قائدین کی طرح اُنھیں بھی پیش آئے۔ کام کرنے والے انسان کے لیے، اصل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

کہ وہ دین و شریعت کے مطابق، اپنی دانست میں صحیح سُنّت کا تعین کر کے چلتا رہے۔ جب وہ چلے گا اور مسلسل چلے گا تو ہو سکتا ہے کہ ٹھوکر بھی کھائے اور گر بھی جائے۔ جو چلتا ہی نہیں وہ کیا خاک گرے گا۔ ہم سے غلطی یہاں سے ہوتی ہے کہ ہم ہر داعی، قائد اور عالم کے متعلق یہ باور کر لیتے ہیں کہ اس کا خمیر ملکوتیت سے اٹھایا گیا ہے، حال آں کہ وہ ہمارے ہی طرح کا انسان ہوتا ہے، جب ہم سے غلطی ہوتی ہے، تو اُس سے غلطی کا صدور کیوں ممکن نہیں؟

شیشہ و آہن کی یک جانی

مولاناؒ کا ایک غیر معمولی کمال یہ بھی ہے کہ سیکولر مزاج زُعمائے سیاست و قائدینِ حکومت اور اُن کے اہل کاروں اور اُن کے مشیروں سے ضرورت کی حد تک مؤثر اور طاقت ور تعلق اور رابطے کے ساتھ ساتھ، نہ صرف ایک عالم باعمل کی شان اور ایک داعی الی اللہ کی پہچان کے ساتھ شان دار دین دارانہ زندگی گزاری؛ بل کہ اُن کی شناخت ہی بہت بڑے حلقہٴ ارادت و عقیدت والے شیخ و مربی کی تھی، جو مرتے دم تک قائم رہی۔ عبادت و ریاضت کا اُن کا معمول کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ سیاست کی گلی میں اتنی کثرت سے آمد و رفت کے باوجود، دین کے سارے تقاضوں کو نمائندہ عالم و داعی کی شناخت کے ساتھ پورا کرتے رہنا مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا معاصرِ علما و مشائخ کے درمیان بڑا امتیاز تھا۔ وہ بہ یک وقت مربی و عالم، سیاست داں و سیاست رال، قائد و زعيم، مُصلح و مربی، اجتماعی خدمت گزار، فریقِ باطلہ و جماعاتِ منحرفہ سے فاتحانہ لوہا لینے والے اور اندرونِ ملک و بیرونِ ملک زبردست عوامی و سرکاری مقبولیت کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ یہ امتیاز مولاناؒ کو ورثے میں ملا تھا اپنے عظیم والد دارالعلوم دیوبند کے فرزندِ جلیل شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے۔

مولانا سے راقم کا تعارف

یہ راقم دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی سے قبل مولانا سید اسعد مدنی کو بالکل ہی جانتا نہ تھا، کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ دارالعلوم میں داخلے کے بعد عربی زبان کے سب سے بڑے عبقری معلم اور باتو فیق خدمت گزار حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے تعلیم عربی زبان کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ چند روز گزرے ہوں گے کہ مولانا کی زبان سے مولانا مدنی کا اتنا اور اس طرح تذکرہ سنا کہ کان اُن کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ جب تک دارالعلوم کا طالب علم رہا، مولانا مدنی کی بھرپور، مسلسل اور متنوع سرگرمیوں کے مشاہدے، یا اُس کی سماعت اور تذکرے کا دور رہا: مولانا مدنی آرہے ہیں، جارہے ہیں؛ آنے والے ہیں، جانے والے ہیں؛ فلاں کام چھیڑنے والے ہیں؛ فلاں تحریک برپا کرنے والے ہیں؛ فلاں پروگرام کی ابتدا کرنے والے ہیں؛ فلاں ملک کے سفیر اور ڈپلومیٹ کو دارالعلوم لانے والے ہیں؛ فلاں ملک کے طویل سفر پر جانے والے ہیں؛ فلاں خطے کے طویل دورے کے بعد آج اُن کی واپسی ہے۔

آج یہ شور یک لخت تھم گیا ہے اور ہمیشہ کے لیے۔ امید اس پر قائم ہے کہ ہر چھوٹے اور بڑے کو بہر کیف یہاں سے جانا ہے۔ از آدم تا ایس دم اُن گنت لوگ جا چکے ہیں، دنیا اُسی طرح قائم ہے اور جب تک خدا کی مرضی ہے قائم رہے گی۔ ماضی کے مقابلے حاضر میں اور حاضر کے مقابلے مستقبل میں ہمیشہ ہی لائق افراد کو دنیا روتی رہی ہے اور آئندہ بھی روتی رہے گی اور کارگہ حیات اسی طرح چلتا رہے گا؛ مگر مولانا کے متعلق بار بار یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے ”ملک“ کو ویران کر گیا

مولانا کی ایک پر لطف صحبت کی یاد

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک پر لطف صحبت، حرمین شریفین میں اُس وقت ملی جب مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس کے ۲۵ سالہ جشن اور گولڈن جوبلی تقریبات میں دارالعلوم دیوبند کے حلقے سے مولانا بہ حیثیت صدر جمعیتہ علمائے ہند اور راقم الحروف بہ حیثیت اسلامی صحافی اور اہل قلم شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس ”الدَّعْوَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ وَ سُبُلُ تَطْوِيرِهَا نَظَرَةً إِلَى الْمُسْتَقْبَلِ“ کے عنوان سے ۱۸-۲۲/صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱-۱۵/اکتوبر ۱۹۸۷ء کے عرصے میں ہوٹل انٹر کنٹینینٹل مکہ مکرمہ کے موٹرمہال میں ہوئی۔ مولانا کو دوروز قبل اور مجھے دوروز بعد دعوت نامہ، بہ ذریعہ تار ملنا؛ اس لیے مولانا افتتاحی نشست میں پہنچ گئے جو خادم حرمین شریفین مرحوم شاہ فہد (۱۳۴۳ھ/۱۹۲۱ء-۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء) کی سرپرستی اور صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ میں دوسرے روز پہنچ سکا۔ اتفاق سے جیسے ہی ہوٹل کی بیرونی گیلری میں راقم نے قدم رکھا، سب سے پہلے مولانا ہی اچانک مل گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کل سے ڈاکٹر عبدالحلیم عولیس مصری (۱) تمہیں کئی بار معلوم کر چکے ہیں کہ شیخ نور عالم آرہے ہیں کہ نہیں؟ بڑا اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ سامنے ہی بِطَاقَةُ الضَّيْفِ (گیسٹ کارڈ) کی تیاری کا کارنر تھا، مولانا ساتھ لے گئے اور نہ صرف کارڈ کی تیاری؛ بل کہ مہمان بہ حیثیت اسلامی صحافی و اہل قلم کی ساری کارروائیوں کی تکمیل تک ساتھ رہے، پھر اُس وقت کی نشست میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ بعد میں بار بار ملاقات ہوتی رہی اور خبر خیریت دریافت کرتے رہے۔ مدینہ منورہ میں ہوائی اڈے پر ہی فرمادیا کہ دیکھو تم بہ

(۱) جامعہ اسلامیہ امام محمد بن سعود، ریاض کے سابق پروفیسر مشہور اسلامی اہل قلم، جو ہندوستانی علما و دعاة و مفکرین سے بڑے واقف اور اُن کی علمی و فکری و دعوتی خدمات کے بڑے قدرواں ہیں، راقم الحروف سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس وقت اپنے وطن مصر ہی میں علمی و تحریری مشاغل میں مصروف ہیں۔

پس مرگ زندہ

حیثیت صحافی اور قلم کار مدعو ہو، اسی لیے تمہیں مکہ مکرمہ میں بھی، اکیلے کا کمرہ ملا تھا، یہاں بھی بیبی ہوگا، ہم چوں کہ محض ”صیف مشارک“ (شرکت کنندہ مہمان) ہیں؛ اس لیے مکہ مکرمہ میں ہمارے ساتھ ایک چینی یا فلپائنی کوٹھہر ادا کیا گیا تھا، مُفَاہِمَت میں پریشانی ہوتی تھی، یہاں تم اپنے ساتھ ہی ہمارا نام کروالینا، اس سے ہم دونوں کو سہولت ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں۔ اللہ انھیں اپنی جنت میں نوازے اور تمام حسنات کو دوچند کرے اور سینات کو جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں، حسنات میں تبدیل کر کے اعلیٰ مقام نصیب کرے، آمین۔

رفقہ دہ لے نہ از دلِ ما

مختصر سوانحی خاکہ

✽ نام نامی: (مولانا سید) اسعد (مدنی)

✽ والد ماجد: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔

✽ تاریخ پیدائش: جمعہ ۶/ ۷/ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۷/ ۱/ ۱۹۲۸ء

✽ تعلیم: بالکل ابتدائی اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں فوت ہو گئیں، اُس وقت مولانا سید اسعد مدنی ۹ سال کے تھے۔ والد صاحب سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر والد صاحب کے خادم خاص قاری اصغر علی سہس پوری نے آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ پھر آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور سارے تعلیمی مراحل طے کیے۔ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔

✽ عملی زندگی: دارالعلوم سے فراغت کے بعد، آپ نے ایک عرصہ مدینہ منورہ میں گزارا، جہاں آپ کے خاندان کے افراد موطن ہو گئے تھے۔ پھر آپ ۲۸/ ۱۲/ ۱۳۷۰ھ = ۵/ ۷/ ۱۹۵۱ء کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو گئے، آپ نے یہ خدمت ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء تک انجام دی، اس کے بعد قومی و ملی و ملکی خدمات دارالعلوم سے مستعفی ہونے کی متقاضی ہوئیں، چنانچہ آپ مستعفی ہو گئے۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

✽ قائدانہ سفر: ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں جمعیتہ علما صوبہ اتر پردیش کے صدر منتخب ہوئے ● ۹ اگست ۱۹۶۳ء مطابق ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ کو جمعیتہ علماے ہند کے ناظم عمومی منتخب ہوئے ● ۱۹۶۸ء (۱۳۸۸ھ) میں جامعہ ازہر مصر کی اسلامی تحکیمات اکیڈمی کے نمائندے منتخب ہوئے اور ۱۹۶۸ء-۱۹۷۰ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں اُس کی چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں کانفرنس منعقدہ قاہرہ میں شریک ہوئے ● ۱۱ اگست ۱۹۷۳ء (۱۸ شعبان ۱۳۹۳ھ) میں جمعیتہ علماے ہند کے صدر منتخب ہوئے ● ۲ نومبر ۱۹۸۶ء (۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ) کو نائب امیر شریعت ہند منتخب ہوئے ● ۹ مئی ۱۹۹۲ء (۸ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ) کو امیر شریعت ہند منتخب ہوئے ● ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء) میں دارالعلوم دیوبند میں نئی انتظامیہ کی استواری کے کچھ ہی بعد آپ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے ● آپ تاحیات آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی رہے ● عملی میدان میں سرگرم کار ہونے کے اولین مرحلے میں ہی آپ نے غیر سودی مسلم فنڈ دیوبند میں قائم کیا، جس کی متعدد شاخیں ملک کے طول و عرض، بالخصوص مغربی یوپی میں قائم ہو چکی ہیں۔

✽ اسفار: مولانا سید مدنیؒ نے دنیا کے کونے کونے کا لاتعداد مرتبہ سفر کیا، ذرائع ابلاغ کے مطابق کثرتِ اسفار کے حوالے سے بڑے صغیر کا کوئی عالم اور قائد یا داعی الی اللہ آپ کی ہم سری نہ کر سکا۔ آپ نے اندرونِ ہندو بیرونِ ہند دعوتی، اصلاحی، ثقافتی اغراض اور سمیناروں، کانفرنسوں اور دینی و سیاسی جلسوں میں شرکت کے لیے، ملک کے گوشے گوشے میں اتنی بار سفر کیا کہ اخبار نویسوں کے بقول آپ نے اپنے مستقر پر قیام کم اور سفر میں اپنی زندگی کے اوقات زیادہ گزارے۔

✽ مرض الموت: ۱۴۲۵ھ میں کعبہ مُکَرَّمہ کے غسل کے موقع سے، سعودی عرب کی دعوت پر آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، جہاں حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران شدید طور پر بیمار ہو گئے، آپ وہاں ایک ہسپتال میں زیرِ علاج رہے، مرض کی شدت کے کم ہونے کے بعد، آپ وطن لوٹ آئے اور دہلی میں ”اپولو“ ہسپتال میں زیرِ علاج رہ کر ایک مدت کے بعد صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے؛ لیکن صحت کی قدرتی حالت بحال نہ ہو سکی۔

✽ حادثہ وفات: ۵ نومبر ۲۰۰۵ء (شعبہ ۲ شوال ۱۴۲۶ھ) کو آپ دہلی جیپ پر، دارالعلوم کی مسجد رشید سے دیوبند میں اپنے گھر واپس آرہے تھے کہ اُس سے پھسل گئے، جس کے نتیجے میں دماغ میں گہرا زخم آیا، دماغ کی رگیں ناکارہ ہو گئیں اور آپ مفلوج ہو گئے۔ دہلی منتقل کیا گیا اور ”اپولو“ ہسپتال میں دوبارہ

پس مرگ زندہ

داخل کیے گئے، جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ علاج ہوتا رہا؛ لیکن آپ مسلسل تین ماہ تک بیہوش رہے، عیادت کنندوں اور معاشرے کے ہر طبقے کے سیکڑوں لوگوں کی روزانہ آمد و رفت رہی، جو آپ کی خبر خیریت معلوم کرنے کے لیے ہسپتال کے زیریں ملاقاتی ہال میں بھیڑ لگائے رہتے تھے۔ وقت آخر آچکا تھا؛ اس لیے ساری تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں اور آپ نے بد روز دو شنبہ ۷ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶ فروری ۲۰۰۶ء کی شام کو ۵ بج کر ۳۵ منٹ پر جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ سہ شنبہ ۸ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۷ فروری ۲۰۰۶ء کو صبح تقریباً ۸ بجے آپ کی نماز جنازہ میں، جو دارالعلوم میں ادا کی گئی، ایک لاکھ سے زائد علما، مشائخ، طالبانِ علوم نبوت اور عام مسلمانوں نے شرکت کی اور مقبرہ قاسمیہ دیوبند میں سپرد خاک ہوئے۔

✽ پس ماندگان: آپ نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے، دو بیٹیاں اور دو بھائی، اُن کی والدہ محترمہ اور خاندان کے بہت سے افراد کے ساتھ ساتھ مریدوں، معتقدوں، محبین اور اہل تعلق کی بہت بڑی تعداد چھوڑی۔ (۱۰)



(*) تحریر کردہ در اردو بہ روز یک شنبہ: ۲۰ محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء، شائع شدہ در ماہ نامہ ”دارالعلوم“ و ماہ نامہ ”ندائے شائقی“ و ماہ نامہ ”ترجمانِ دیوبند“۔

مردِ صالح مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ

۱۳۵۲-۱۴۲۷ھ = ۱۹۳۳-۲۰۰۶ء

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

جمعہ ۱۲/۵/۱۴۲۷ھ = ۲۰۰۶/۶/۹ء صبح ۵ بجے مولانا محمود حسنی ندوی سلمہ نے،
لکھنؤ سے فون پر مجھے یکا یک یہ بتا کے چونکا دیا کہ تقریباً ایک گھنٹہ قبل مولانا محمد عارف
سنبھلی ندویؒ استادِ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے، اللہ کو
پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

چوں کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مولانا محمد عارف اس طرح اچانک
داغِ مفارقت دے جائیں گے؛ اس لیے اُن کے انتقال کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ اُن
سے قلبی تعلق تھا، جو اُن کی نیکی، خاک ساری اور سادگی کی دین تھا، جو اُن کو بہت سے
معاصرین اور رفقاءے کار سے ممتاز کرتی تھی۔

وہ میرے دو ایک سال بعد، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرس اور تفسیر و اصول کے
استاد کی حیثیت سے تشریف لائے اور اپنی تواضع، نیکی، بے ساختگی اور زندگی کے
سارے معاملات میں اپنی سادگی کی وجہ سے اساتذہ و طلبہ کے معاشرے میں خاصے
مقبول و محبوب بن گئے۔ وہ ہر کسی سے اس طرح ملتے، جیسے فردِ خاندان؛ بل کہ اُس کی
ذات کا حصہ ہوں۔ دل سے ملتے، اخلاص سے خبر خیریت دریافت کرتے، اپنائیت کی
وجہ سے دل میں گھر کر جاتے اور احساس و جذبات میں شریک ہو جاتے۔

بندہ مومن

اللہ کی اس کشادہ دنیا میں، خوش قسمتی سے چند ایسے لوگوں سے ملاقات و تعارف کا موقع ملا، جن کے متعلق دل نے، اپنی خدا کی دی ہوئی، فراست ایمانی سے گواہی دی کہ یہ بالیقین اللہ کے مومن بندے ہیں۔ دنیاے فانی میں اُن کی آرزوئیں قلیل اور ہمیشہ کی آخرت کے حوالے سے اُن کے مقاصد جلیل نظر آئے۔ زندگی کی رونقوں اور آسائشِ حیات میں سے، ستر پوشی کے بقدر لباس اور بقائے حیات کے بقدر خور و نوش کا سامان، اُن کے لیے کافی تھا اور ان دونوں ضرورتوں کے پوری کرنے سے بھی، اُن کا مقصد اپنے رب کی طاعت و عبادت تھا۔ میں نے انھیں پایا کہ وہ دنیا کو صرف آخرت کی کھیتی جانتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ یہاں کا بویا ہوا ہی وہاں کا ثنا ہے۔ قسم کھا سکتا ہوں کہ مولانا محمد عارف سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اُن میں سے ایک تھے۔

وہ ہمیشہ انتہائی معمولی کپڑے میں نظر آئے۔ وہ کپڑوں کو پریس کرنے یا کروانے سے بالکل بے پروا تھے۔ کئی بار ندوہ میں اُن کے رہائشی مکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ بعض دفعہ اپنے وطن مالوف سنبھل کے علاقے میں تیار کی جانے والی کھانے کی کسی خاص چیز کے لیے، بہ اصرار مجھے اور بعض رفقا کو بلا لے جاتے یا چائے کے لیے مدعو کرتے۔ ہم نے ہمیشہ اُن کے ہاں ضرورت کی چیزیں بھی انتہائی ضرورت کے بقدر رہی دیکھیں اور ٹھاٹ باٹ کی چیزوں کا تو اُن کے ہاں کوئی گزر ہی نہ تھا۔ وہ زندگی کے سارے گوشوں میں بے ساختگی پُر عمل پیرا تھے، تکلف اور تصنع سے اُن کی زندگی کی ڈکٹنری نا آشنا محض تھی؛ لہذا وہ وقت اور توجہ کا قیمتی سرمایہ، کسی ایسی چیز پر خرچ نہیں کرتے تھے جس سے دنیا و آخرت میں کوئی بھلائی مٹھوڑ نہ ہو۔

دین داری و خوش طبعی

اس کے باوجود وہ خندہ رو، خوش اخلاق اور انتہائی حلیم و کریم تھے، نمائشی زاہدوں

کی طرح ترش رو، بد اخلاق اور اپنے سوا ہر ایک کو ”بے عمل“ سمجھنے والوں کی طرح خشک نہ تھے۔ انتہائی ظریف، خوش طبع اور زندہ دل تھے۔ ملنے جلنے والوں سے نہ صرف مذاق کو روا جانتے تھے؛ بل کہ برجستہ مزاحیہ جملوں سے، دل کی مرجھائی ہوئی کلی کو دفعتاً کھل اٹھنے کا ایسا موقع دیتے کہ لوگ عیش عیش کرنے لگتے۔ غم غلط کرنے میں انھیں مہارت تھی اور روتوں کو ہنسانے میں وہ طاق تھے۔ اُن سے جب بھی اچانک ملاقات ہوتی اور وہ مجھے کسی سنجیدگی یا پیچیدگی میں الجھا ہوا محسوس کرتے، تو برجستہ ایسے جملے کہہ جاتے، جن سے دل اور ذہن دونوں کا ماحول تبدیل ہو جاتا۔ دراصل اُن کی طرح کے نیک اور آخرت کو نصب العین بنائے رہنے والے سعادت مند لوگ دنیا، اُس کے غم و الم اور اُس کے سارے مسائل کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتے؛ اس لیے دنیا اور اُس کے مسائل کے ساتھ، اُن کا رویہ انتہائی لاپرواہی کا ہوتا ہے۔ دنیا کو ہنس کھیل کے گزارنے میں آخرت کی فکر کے لیے، انھیں وافر وقت مل جاتا ہے۔ مقصد کا استحضار اور اُس کی عظمت و اہمیت کا ہمہ وقت احساس، دنیاوی غم و الم کی اہمیت کو کم کیے رہتا ہے۔

بے تکلفی اور اپنائیت

مولانا محمد عارفؒ کو اکثر میں دیکھتا کہ بغل میں کوئی کتاب ضرور دبائے ہوتے۔ عموماً تفسیر کی یا کسی بھی اسلامی موضوع کی، جس کے وہ مطالعے کے درپے ہوتے۔ درجے میں جاتے یا آتے ہوئے یا کینٹین (Canteen) میں داخل ہوتے یا نکلتے ہوئے، یا کسی خالی گھنٹے (Period) میں کہیں بیٹھے ہوئے، وہ کتاب ہاتھ میں ضرور لیے ہوتے۔ جیسے ہی اُن کی نظر میرے ایسے کسی مخلص رفیق پر پڑتی، کسی ایسے مزاحیہ جملے سے تواضع ضرور کرتے، جس سے ہنسی بھی آتی، خوشی بھی ہوتی اور اُن کے لیے دعا بھی نکلتی۔ اُن کے مزاحیہ جملے بھی کسی پر تکلف سوچ کا نتیجہ نہ ہوتے؛ بل کہ وہ ہمیشہ بے تکلفی اور اپنائیت کی دین ہوتے۔ مثلاً وہ کہتے: ”بھئی! آپ یہ نہ جھیے گا کہ میں نے آپ کو دیکھا نہیں

ہے کہ آپ کمرے کی اُور بھاگے چلے جا رہے ہیں“ یا ”برادر! آپ یہ سمجھے نہ بیٹھے رہیں کہ صرف آپ ہی کو عربی زبان آتی ہے، میں نے بھی پڑھنے کے زمانے میں عربی کے بہت سے بہت اچھے اچھے جملے بڑی محنت سے رٹے تھے، بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے انھیں بھول گیا ہوں؛ ورنہ آپ میرے سامنے کبھی بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے“ کبھی کہتے: ”دیکھیے! آپ اس دھوکے میں نہ رہیے گا کہ صرف آپ ہی مولانا علی میاں مدظلہ^(۱) کے مقرب ہیں اور عربی جاننے یا حسن خط کی وجہ سے اُن کے منظورِ نظر ہیں؛ اس لیے کہ میں بھی بہت بڑا ”خطیبِ اسلام“ ہوں اور اہل بدعت کی تردید میں ”لا جواب“ ہوں؛ اس لیے مولانا علی میاں؛ مجھے آپ سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ اس حوالے سے، میرے نزدیک کسی کھیت کی مولیٰ نہیں ہیں۔ ایک دفعہ مولانا عارف نے مجلس کو یہ کہ کر زعفران زار بنادیا کہ ”خاک سار“ بہت پرانا لفظ ہو چکا ہے، اب ”ڈھیلا سار“ استعمال کرنا چاہیے۔ کئی بار ”ایسی تیشی“ کو ”ایسی کی سواتیشی“ اور ”ایسی کی سوا چارتیشی“ استعمال کیا۔ دگر جملوں میں اسی طرح کی دیگر مسرت ریز تر میمات کے ذریعے، دوستوں کے ہنسنے کے مواقع پیدا کرتے رہتے۔

کئی حیثیتوں سے ممتاز؛ بل کہ بے مثال

مولانا سنبھلی^۲ کئی معنوں میں ممتاز؛ بل کہ بے مثال تھے۔ وہ اپنی ذات میں اتنے مشغول رہتے کہ دوسروں کی طرف توجہ کی انھیں فرصت نہ ہوتی۔ یعنی وہ اپنی ذات کے عیوب و نقائص کے شمار سے کبھی فارغ نہیں ہوتے تھے؛ اس لیے وہ پیہم مشغول رہتے تھے۔ ایسا آدمی کبھی بھی دوسروں کے معایب کے پیچھے نہیں پڑتا؛ چنانچہ مولانا محمد عارف

(۱) اور اُس وقت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ظاہر ہے کہ بے قید حیات تھے؛ اس لیے کہ آپ کی وفات بروز جمعہ تقریباً ۱۲ بجے بہ تاریخ ۲۳/رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کو پیش آئی اور میں ۱۹۸۱-۱۹۸۲ء سے قبل کے واقعات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اُستاد تھا۔

کو بھی دوسروں کے عیوب کے تعلق سے بے پروا پایا۔ قرآن پاک سے شغف کے حوالے سے بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ قرآن کی تلاوت بہت سوز کے ساتھ، سمجھ کر ایک ایک لفظ اور شوشے کو محسوس کر کے؛ کرتے، اُس کے معانی و طالب، الفاظ کے مفہام، تعبیروں کی گہرائیوں، اُس کے اعجاز کے رازوں اور بلاغت کے گوشوں اور اسباب پر غور کرتے۔ قرآنی موضوعات کی کتابوں کے حصول کے لیے، کوشاں رہتے۔ علمائے اسلام کی اس حوالے کی کاوشوں سے فائدہ اٹھاتے۔ تفسیر کی ائمہات الکتاب کے امتیازات سے اتنے واقف تھے کہ اتنے واقف کم لوگ ہی ہوتے ہیں۔

اردو تفسیروں میں مرحوم، ادیب کبیر مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء — ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) کی ”تفسیر ماجدی“ کے بڑے دل دادہ تھے کہ اُس میں عصر حاضر کے مسائل، جدید ذہن کے شکوک و شبہات اور بعض ایسے اعتراضات کو بھی حل کیا گیا ہے، جو ماضی میں بھی تفسیر کے طلبہ کے لیے، الجھن کا باعث رہے تھے۔ اسی طرح وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء — ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے مشہور و مقبول اردو ترجمہ قرآن کے حاشیے پر لکھی گئی علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ثم الپاکستانی (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء — ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کی تفسیر عثمانی کے ثنا خواں تھے اور فرماتے تھے کہ تفسیر کی زبان، اُس کا معجزانہ اختصار، حقائق قرآن کی اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق کھری، صحیح اور ٹھوس ترجمانی اور تفسیر قرآن کے باب میں اُمت کے ثقہ علما کی راہ کی مکمل پیروی میں، یہ تفسیر لاثانی ہے۔ مجھ سے مرحوم نے کئی بار فرمایا کہ ادب کے طلبہ کو زبان و بیان کی نزاکت سے واقفیت کے لیے بھی، اس تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے یہ اردوے معلیٰ کی بھی بے مثال کتاب ہے۔ بعض جگہ انھوں نے حقائق قرآن کی ترجمانی کے لیے جو زبان استعمال کی ہے، وہ ادب کا جاوید شہ پارہ ہے۔ ایک اچھے مقرر کے لیے بھی مضامین، طرزِ تکلم اور خیالات کے الہام کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اس تفسیر کی اہمیت کو مدرسوں کے ماحول نے، مذاق ادب سے

پس مرگ زندہ

عمومی نا آشنائی کی وجہ سے اب تک کما حقہ محسوس نہیں کیا ہے۔
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء — ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی تفسیر ”بیان القرآن“ کو ائمہ فن کی تفسیروں کا عطر کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس تفسیر میں معانی کی گہرائی اور لطیف اشاروں کی جو بہتات ہے، اُس کی وجہ سے اُس کا مطالعہ عالم و عامی، طالب علم و مدرس: ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ اس کے مطالعے سے فکر و نظر میں گہرائی، عقل و خرد میں کشادگی، بصیرت میں اضافہ اور کتاب اللہ کے لفظی و معنوی اعجاز پر ایمان اور مضبوط ہوتا ہے۔

مولانا کی خوش نصیبی

مولانا کی سعادت کی بات تھی کہ وہ تفسیر کے مضمون کا سال ہا سال درس دیتے رہے۔ قرآن پاک کے معانی و مطالب میں غور و خوض سے اُن کو طبعی دل چسپی تھی، اس مضمون کی تدریس میں، اُن کے لیے اپنے ”پیشے“ اور اپنی دلچسپی دونوں کی تسکین کا بہترین سامان میسر آ گیا تھا۔ یہ کسی آدمی کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اُس کے پیشے اور خدمت کے لیے اُس کو اُس کی دل چسپی کی شے ہی مل جائے اور وہ بہ یک وقت اپنی ڈیوٹی بھی انجام دیتا رہے اور اپنے ذوق کی تسکین بھی کرتا رہے۔ تفسیر کا موضوع علوم شریعت میں سب سے کشادہ ہے؛ بل کہ یہ بحرِ ناپیدا کنار ہے؛ لہذا جس کسی کو اس میں گیرائی حاصل ہو جاتی ہے، اُس کو کئی موضوعات میں از خود دست رس حاصل ہو جاتا ہے اور وہ علوم شریعت میں ہمہ گیری کا حامل بن کر، اسلام کی ترجمانی کا اہل ہوتا جاتا ہے، اُس میں اسلام کے دفاع اور ملحدین و منحرفین راہ سے مقابلے کی بہ خوبی لیاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا سنبھلیؒ بھی خدا کی توفیق سے اسی طرح کے وسیع النظر، عمیق العلم اور دقیق الفکر عالم بن گئے تھے؛ اسی لیے فرقِ ضالہ اور اور تحریکاتِ باطلہ، بالخصوص بدعتی فرقے سے محاذ آرائی میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ یہ فرقہ اندرونی و بیرونی اسلام دشمن

طاقتوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے برصغیر میں، ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر، اسلام کی صحیح تعلیمات میں رخنہ اندازی کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ مولانا سنبھلی نے اُس کے ایک چرب زبان و تیز قلم عالم کی کتاب ”زلزلہ“ کا جواب ”بریلوی فتنے کا نیا روپ“ کے نام سے دیا۔ یہ کتاب خاصی دندان شکن ثابت ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔ مولانا نے اہل بدعت سے مناظرے بھی کیے اور اپنی مکمل و مضبوط تحریروں اور مدلل و مربوط تقریروں میں بھی اُن کو رگیدتے اور لٹکارتے رہے۔ اُن کی تقریروں کا بنیادی موضوع ہی توحید کا بیان اور بدعت و ضلالت کی تردید ہوا کرتا تھا۔

مرحوم نے ردِ قادیانیت میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ قادیانیت کا توڑ ہمارے جلیل القدر اور غیرت مند علما کا معززانہ کام رہا ہے۔ نبوتِ محمدی کے خلاف جب سے یہ عظیم فتنہ برطانوی استعمار کی سازش سے برپا ہوا، جس نے اسلام ہی کو اپنی توسیع پسندی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر محسوس کیا، علمائے اسلام نے اس فتنے کی خطرناکی کو محسوس کرتے ہوئے، اس کی سرکوبی پر زبان و قلم اور تبلیغ و دعوت کی راہ سے بہت زور صرف کیا۔ مولانا سنبھلی نے بھی اپنے اکابر کی سنت ادا کی اور زبان و قلم کو ہمیشہ اس محاذ پر بھرپور طور پر استعمال کیا۔

مولانا محمد عارف مرحوم، ملک کے طول و عرض، بالخصوص لکھنؤ اور اُس کے اطراف میں ہونے والے دینی و دعوتی جلسوں میں کثرت سے شریک ہوتے اور جم کر تقریر کرتے تھے۔ وہ فنِ تقریر کے میدان کے بھی شہسوار تھے؛ لیکن وہ پیشہ ور مقرر کی طرح بامعاوضہ تقریر نہیں کرتے تھے؛ بل کہ وہ اکثر دفعہ آمد و رفت کا صرفہ بھی خود ہی برداشت کرتے تھے، حال آں کہ وہ مالی طور پر بہت کم زور تھے، تدریس کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا؛ لیکن دین و دعوت کی خدمت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی؛ اس لیے وہ اُس کے لیے ہر طرح کا بار، اُسی طرح برداشت کرتے تھے، جیسے اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لیے۔ ہمارے بہت سے نام نہاد علما اور دُعاۃ نے تو تقریر و تحریر کے پیشے کو تعویذ و گنڈوں کے پیشے کی طرح زرخشی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور عام مسلمانوں کے لیے اُن کی

سیرت اور اُن کا کردار ذریعہ اذیت بنا ہوا ہے؛ لیکن مولانا محمد عارف سنبھلی جیسے بھی کچھ علما ہیں جو دین و دعوت کی آبرو کو بچائے ہوئے ہیں۔

مولانا کی تقریر کا اصل موضوع تو وہی توحید اور اُس کے مخالف رجحانات کی شرح و تفصیل اور اُن رجحانات کے رد کے دلائل کا بیان ہوتا تھا؛ لیکن وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کی اصلاح کے طریقوں پر بھی خوب بولتے تھے۔ شادی بیاہ، موت کے مراسم اور غم و اُلم کو منانے کے غیر اسلامی طریقوں سے بھی عوام کو واقف کراتے اور انھیں کتاب و سنت کی راہ پر لوٹ آنے کی دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح برصغیر کے صحیح اسلامی مسلک یعنی ”دیوبندیت“ عصر حاضر میں اُس کی معنویت اور مختلف انتہا پسندیوں کے بیچ اُس کی افادیت اور اُس کی روح، یعنی اعتدال و توازن پر بھی اکثر بھرپور روشنی ڈالتے تھے۔

رفیق القلبی

مولانا مرحوم رفیق القلب تھے۔ وعظ و نصیحت کے موقع سے، خصوصاً نماز کے اندر یا باہر ترہیب و انداز کی آیتوں کی تلاوت خود کرتے یا دوسرے سے سنتے، تو گریہ طاری ہو جاتا اور پھر روتے ہی رہتے تا اُن کہ خوف و خشیت کی کیفیت زائل ہو جاتی اور اُس کا دباؤ ختم ہو جاتا۔ کسی کو اپنے کسی رویے سے تکلیف پہنچ جانے یا اُس کے احساس کے مجروح ہو جانے کا ذرا بھی اندازہ ہوتا، تو فوراً معذرت خواہ ہوتے۔ میں نے ہر اچھے اور نیک میں یہ شیوہ دیکھا اور برتا ہے۔ واقعی نیک آدمی، ضرور دوسرے سے معذرت خواہ ہوتا ہے، بہ تکلف نیکی کا لبادہ اوڑھ لینے والا البتہ کسی کو اذیت دے کر، کبھی نادیم نہیں ہوتا اور نہ معذرت کا لفظ کبھی زبان پر لاتا ہے؛ کیوں کہ غرور و نفس، اُس کو اس سے روکے رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے رفقا اور متعارفین سے ہمیشہ یہ کہتے: بھئی! میری تحریر یا تقریر یا کسی گفتگو سے آپ میں سے کسی کو ذاتی تکلیف پہنچی ہو یا آپ لوگوں نے اُس میں کوئی دینی، علمی یا دعوتی یا کسی اور قسم کی کوئی غلطی کبھی محسوس کی ہو، تو

بتا دیجیے تاکہ اُس کا ازالہ کیا جاسکے اور دیگر لوگ اُس سے گم راہ نہ ہوں۔ اُن کے سارے معمولات سے صاف طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت آخرت کے حساب اور ربّ قہار کی پکڑ کو مستحضر رکھتے تھے۔ دنیا کے جھیلے اور یہاں کی زینت، انھیں وہاں سے کبھی غافل نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ واقعی خوش قسمت تھے اور ہم جیسے واقعی بد قسمت ہیں، جو اُن جیسوں کی زندگی سے سبق نہیں لے پاتے۔ اللہ انھیں بہت نوازے اور یہاں کی محرومیوں کا، انھیں وہاں خوب خوب بدلہ دے۔ اُن کا عمومی برتاؤ بھی اُن کے بھولے پن کا غماز ہوتا تھا، اُن کی ہر ادا سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ وہ ایذا رسانی کی صلاحیت سے عاری لگتے تھے۔ زندگی کا میرا اپنا تجربہ، جو تجربے کی میری زندگی ہی کے بہ قدر ہے، یہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں؛ لیکن بہت اچھے ہوتے ہیں اور شاید جنتی لوگ دنیا سے دنی میں عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں اور صحیح علم تو ہر بات کا اللہ عالم الغیب ہی کو ہے۔ انھیں نہ علم کا غرور تھا، نہ مطالعے کی وسعت کا دعویٰ تھا، نہ اپنے عالم ہونے کا پندار تھا، نہ مقرر ہونے کا احساس تھا، نہ مناظر ہونے کی اہمیت کا گھمند تھا، نہ کام یاب اور مقبول مدرس ہونے پر فخر تھا، نہ دنیوی عزت کی خواہش تھی، نہ ستائش کی تمنا تھی، نہ صلے کی پروا تھی۔ اُن کے سامنے صرف ایک ہدف تھا، خدا کی رضا جوئی کا ہدف، جو انھوں نے اللہ کی رحمت کے طفیل ضرور پالیا ہوگا۔

مولانا محمد عارف سنبھلیؒ، برصغیر کے مشہور عالم اور داعی و اسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳-۱۴۲۷ھ = ۱۹۰۵-۱۹۹۷ء) کے حقیقی بھتیجے تھے۔ انھوں نے ۲۵-۳۰ سال تک یعنی زندگی کے آخری سالوں میں موت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر و عقیدے کے ہر ذیل عزیز استاد کی حیثیت سے تدریسی فریضہ انجام دیا۔ وہیں اُن کا وقت آخر آیا اور اُسی کے میدان میں ندوۃ العلماء کے حالیہ ناظم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی، جس میں بڑی بھیڑ تھی، جو اُن کے مقبول عند اللہ و عند الناس ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری نماز اُن کے صاحب زادے

پس مرگ زندہ

مولوی حمزہ ندوی سنبھلی نے پڑھائی، بعدہ ”ڈالی گنج“ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔
 مولانا نے پس ماندگان میں اہلیہ، دو صاحب زادے اور ایک صاحب زادی چھوڑی
 ہے؛ لیکن انھوں نے ان خاکی پس ماندگان کے علاوہ، اس دنیا کے لوگوں کے دلوں میں
 اپنی ناقابل فراموش یاد چھوڑی ہے، جس کا نقش اُن کے دلوں میں اتنا گہرا ہے کہ وہ کبھی
 نہیں مٹ سکے گا۔ اُن کی انسانیت، تواضع، سادگی، یگانگت، سچے زہد اور ساتھ ہی اُن
 کی علمی لیاقت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی، وہ لیاقت جس کی وجہ سے ہزاروں زبانیں اُن کی
 ثنا خواں اور درس و افادے اور وعظ و نصیحت، علمی تبادلے اور دینی مناظرے کے ذریعے
 فیض بخشی کی وجہ سے، اُن کی شکر گزار اور اُن کے لیے دعا گو تھیں۔

کتنے لوگ اس دنیا سے روزانہ رخصت سفر باندھ جاتے ہیں اور چند روز بعد لوگ
 انھیں قطعاً فراموش کر دیتے ہیں؛ لیکن اپنی انسانیت، تواضع اور بے نفسی کے ذریعے، جو
 لوگ دلوں میں گھر کر جاتے ہیں، وہ ہمیشہ دلوں میں اور زبانوں پر زندہ رہتے ہیں اور اُن
 کا ذکر خیر بلا انقطاع جاری رہتا ہے۔ اُنھی میں مولانا مرحوم بھی ہیں، جو اپنے علم سے
 پہلے اپنے اخلاق سے عالی قدر تھے اور اپنی نام آوری سے پہلے اپنی نیکی آمیز گم نامی سے
 اور اپنی برتری سے پہلے اپنے خاک ساری سے اور اپنے علم سے پہلے اپنی دین داری
 سے۔ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ۔ (*)

سوانحی نقوش

- ❁ نام: (مولانا) محمد عارف۔
- ❁ تاریخ پیدائش: ۱۹۳۵ء (۱۳۵۴ھ)۔
- ❁ جائے پیدائش: سنبھل، ضلع مراد آباد، یوپی۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۸، جلد ۳۰، شعبان ۱۴۲۷ھ = ستمبر ۲۰۰۶ء، اردو تحریر یہ قلم خود، ۱۰ بجے صبح
 دو شنبہ ۲۶ رجب ۱۴۲۷ھ = ۲۱ اگست ۲۰۰۶ء۔

✽ والد کا نام: حاجی محمود حسین بن صوفی احمد حسین۔ صوفی احمد حسین کے پانچ لڑکے تھے، جن میں سب سے بڑے (مولانا) محمد حسن، دوسرے مولانا غلام امام، تیسرے (عالِم کبیر اور مشہور داعی اِلی اللہ مولانا) محمد منظور (نعمانی) چوتھے محمد حسین (جو مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی مرحوم کے والد محترم تھے) پانچویں حکیم محمد احسن قاسمی۔

✽ خاندان: ٹرک۔

✽ مولانا کے برادران: مولانا کے سب سے بڑے بھائی حاجی محمد عامر تھے، دوسرے بھائی حاجی محمد عمر۔ مولانا محمد عارف بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی محمد زبیر ہیں اور اُن سے چھوٹی بہن مسلمہ بیگم تھیں۔ سب سے بڑے بھائی حاجی محمد عامر اور بہن مسلمہ بیگم وفات پا چکی ہیں۔

✽ تعلیم: ابتدائی تعلیم سبزی منڈی اسکول سنبھل اور دارالعلوم الحمدیہ، روضے والی مسجد، دیپا سرا، سنبھل میں حاصل کی۔ اُس کے بعد ایک سال مدرسہ فرقانیہ ”گوٹھا“ میں زیرِ تعلیم رہے۔ ثانوی اور متوسط اعلیٰ تعلیم کے لیے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قصد کیا، جہاں سے ۱۹۵۶ء (۱۳۷۵ھ) میں فارغ ہوئے۔

✽ تدریسی خدمات: تدریس کا آغاز دارالعلوم الحمدیہ، روضے والی مسجد، سنبھل سے کیا، اُس کے بعد مختلف جگہوں پر تدریسی خدمات انجام دیں، جن میں انجمن معاون اسلام سنبھل، مہاراشٹر کا علاقہ براہ، اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ شامل ہیں۔

✽ تحریری کاوشیں: اُن کی اہم اور مشہور کتاب ”بریلوی فتنے کا نیاروپ“ ہے، اس کے علاوہ انھوں نے توحید، ردِ بریلویت اور ردِ قادیانیت کے موضوع پر بہت سے مضامین لکھے، جن میں سے اکثر ”الفرقان“، لکھنؤ اور ”تعمیر حیات“ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شائع ہوئے۔

✽ پس ماندگان: مولانا کے پس ماندگان میں اُن کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ، اُن کے بڑے لڑکے مولانا محمد حمزہ ندوی ہیں، جو ندوۃ العلماء کی ایک شاخ میں مدرس ہیں، دوسرے لڑکے قاری محمد طلحہ ہیں، جو لکھنؤ کے شباب اسلام مارکیٹ میں اسکرین پرینٹنگ کا اپنا کام کرتے ہیں۔ اولاد میں سب سے چھوٹی صاحب زادی مریم عقیفہ ہیں۔ (*)



(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں برادر عزیز مولانا محمد اسعد قاسم سنبھلی کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مفتی دارالعلوم دیوبند

مولانا کفیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندی

۱۳۵۹ھ/۱۹۳۹ء — ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

موت برحق ہے اور انسان کو اپنی ساری ترقی کے باوجود، جس پر اُس کو آج بے طرح
اترا ہٹ ہے، موت کی آمد کی جگہ اور وقت کا کوئی اندازہ نہیں۔ اللہ کو ہی اس کا علم ہے کہ وہ
کس پر، کب اور کہاں طاری ہوگی؟ ہمارے سامنے بسا اوقات موت کے واقعات اس
طرح پیش آتے ہیں کہ اُس سے مارنے اور جلانے کے تعلق سے اللہ کی قدرتِ کاملہ کا
یقین از سر نو تازہ ہو جاتا ہے۔

صحت مندی و چستی و پھرتی

دارالعلوم دیوبند کے مفتی: مفتی کفیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندی، موت سے ایک روز
پہلے تک بہ ظاہر مکمل صحت مند، نشیط اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور تازگی کے مالک نظر
آتے تھے۔ وہ ۶۷ سال کے بوڑھے تھے؛ لیکن دارالعلوم کے سارے اساتذہ و ملازمین
میں اُن کی عمر کے کسی بوڑھے کو چستی، پھرتی اور صحت کا وہ حصہ وافر نصیب نہیں تھا، جس

سے اللہ نے انھیں نوازا تھا۔ وہ چلت پھرت سے ۲۰-۲۵ سال کے نوجوان لگتے تھے۔ میں انھیں دارالعلوم جانے کی راہ میں، اتنی تیز گامی سے جاتے ہوئے دیکھتا کہ مجھے اُن پر رشک آتا۔ دارالعلوم جاتے ہوئے جو طلبہ معمول کے مطابق میرے ساتھ ہوتے، میں ہمیشہ اُن سے کہتا: کاش میں بھی انھی جیسا صحت مند، توانا اور چست ہوتا۔

اسی لیے منگل: ۶/ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ = یکم اگست ۲۰۰۶ء کو تقریباً ساڑھے ۱۰ بجے، جب میں نے طلبہ کی زبانی اور پھر دیوبند کی مسجدوں کے مناروں سے اُن کے انتقال کی اچانک خبر سنی تو میں خاصاً اچنبھا ہوا؛ بل کہ اس خبر کو تسلیم کرنے میں مجھے تڑو دسا ہوا؛ لیکن موت کا اعلان بار بار ہوتا رہا، اور موت کے بعد اُن کی دید کے بعد میرے پاس آنے والے بعض لوگوں نے، اُن کی موت کی تفصیل بتائی، تو بالآخر یہ یقین کرنا پڑا کہ اُدھیر عمر کا ”نوجوان“ صالح واقعی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ صبح اُٹھے تو انھیں معمولی سا بخار تھا، ہاتھوں میں درد تھا جو پھر دونوں رانوں میں اتر گیا اور اسی اثنا میں تقریباً سوادس بجے انھوں نے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی، یہ سب کچھ نیند میں آنے والے خیال کی مانند پیش آیا، جس کی دیکھنے والا عموماً تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب۔

اس طرح کے واقعے سے، باتوفیق اور خوش نصیب لوگوں کو، جنھیں زندگی کے واقعات سے سبق لینے کی توفیق ملا کرتی ہے، دوبارہ سبق ملتا ہے کہ یہ دنیا واقعی فانی اور اس کی ہر شے آنی جانی ہے۔ ہر زندہ ہر وقت موت کے خطرے سے دوچار ہے اور زندگی واقعی ناپائیدار ہے۔ وہ بے وفا ہے، اُس کا پیشہ ہی جفا ہے۔ وہ چند روزہ ہے: کچھ سالوں یا مہینوں یا دنوں یا گھنٹوں سے عبارت ہے۔ دنیا کا فاح اور اُس کے سارے مال و اسباب کی ملکیت کا مدّعی بھی موت کے شکنجے سے نہیں بچ پاتا۔ دولت و ثروت، اختیار و اقتدار، حکمرانی و سرداری، امارت و ریاست اور گرانوں و نگہ بانوں و پاس داروں کا لشکرِ جزار یا نت نئے تباہ کن اسلحوں کا انبار بھی موت کی راہ نہیں روک پاتا۔

وقت کی پابندی

مولانا مفتی کفیل الرحمن نشاط عثمانیؒ کی موت سے دیوبند کا ہر بچہ و بوڑھا واقعی غم زدہ نظر آیا اور جس کو موقع ملا موت کے بعد اُن کے گھر جا کر، اہل خانہ سے تعزیت اور اُن کے آخری دیدار سے بہرہ مند ہوا۔ دارالعلوم کی پوری فضا خاصی سوگ وار نظر آئی۔ مرحوم یہاں تقریباً ۳۵ سال سے منصب افتا پر فائز تھے، اُنھوں نے اس اثنا میں سیکڑوں مسائل کے جوابات تحریر کیے، نیز زیر تعلیم طلبہ کی تدریس و تمرین کا فریضہ بھی احساسِ ذمّے داری اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کیا، جس کو طلبہ و ذمّے داران بار بار یاد کر رہے ہیں۔ اُن کے چہرے مہرے اور ساری حرکات و سکنات سے دیکھنے والے کو اُن کی دین داری کا یقین ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتے اور کسی ضرورت کے وقت ہی گویا ہوتے اور صرف کام کی بات کر کے خاموش ہو جاتے۔ عالمِ باعمل کا نمونہ تھے اور وقت و وعدے کی پابندی اُن کا شیوہ تھا۔ دارالعلوم کا وقت شروع ہوتے ہی وہ آموجود ہوتے یا کچھ پہلے ہی آ جاتے۔ وہ چھتہ مسجد کے شرق و جنوب میں واقع ایک چھوٹی سی مسجد کے امام تھے، جہاں اُن کے والد بزرگ وار مولانا قاری جلیل الرحمنؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء - ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء) نے بھی زندگی بھر امامت کی تھی اور اُن کے دادا حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء - ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۲۸ء) بھی نماز پڑھتے تھے۔

سنجیدگی و بردباری

مفتی کفیل الرحمنؒ کی طویل اور مسلسل خاموشی، جو گفتگو کی کسی ناگزیر ضرورت کے وقت ہی ٹوٹتی تھی، اُن کی گہری فکر، پختہ عقل اور اُن کے طویل تجربے کے ساتھ ساتھ، سطحیت پر گہرائی کو ترجیح دینے کی اُن کی فطرت کی غماز تھی۔ وہ سنجدگی، بردباری، نرم خوئی، دل جوئی اور پیار اور محبت کا مجسمہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوچ اور فکر میں ڈوبی ہوئی

خاموشی بے ضرورت کی ہمہ وقت کی بکواس اور لایعنی گفتگو سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اچھا مفتی اور اچھا شاعر

مرحوم اردو زبان کے اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ، قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انھوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر گراں قدر مضامین لکھے، جن میں زبان کی ستھرائی اور مطالعے کی گیرائی نمایاں ہوتی تھی۔ میں نے خود کوئی مضامین پڑھے اور اُن کی علمی لیاقت کی داد دی۔ اُن کے اشعار میں مولانا حالی کی طرح لفظِ ظہیت سے اجتناب ہوتا تھا؛ لیکن معانی اور خیالات کا انوکھا پن، زندگی کی سچائیوں کی سچی ترجمانی اور انسانوں پر بیت رہے ظلم و ستم کی کہانی کا آہنگ بہت اونچا اور اُس کا رنگ بہت شوخ ہوتا تھا۔ اُن کے اشعار بھی اس راقم نے بہت سے رسالوں میں پڑھے اور اُن کی چٹنگی و خوش گوئی سے ہر بار نیا لطف ملا۔ بعد میں اُن کے اشعار کا ایک مجموعہ ”شناسا“ کے نام سے چھپا، جس کے ذریعے لوگوں کو اُن کے گہنہ مشق شاعر ہونے کی بھی شناسائی ہوئی اور یہ جان کر خوشی اور حیرت ہوئی کہ دارالعلوم کا ایک اچھا مفتی ایک اچھا شاعر بھی ہے۔

حمد و نعت کے علاوہ، اُن کے دیوان میں غزل کے دُھلے ہوئے آبِ دارِ اشعار سے ہر باذوق قاری محفوظ ہوگا۔ اُن کے شعر میں، کہیں کہیں میر کی نزاکت، غالب کی حلاوت، حالی کی سنجیدگی، داغ کے سوز، مومن کی شفافیت جگر کی روانی، اصغر کی تپیدگی، فانی کے اندازِ اظہارِ غمِ عالم اور کہیں کہیں اقبال کی بلند آہنگی اور احساسِ بلندی کی تراوش بھی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے دیوان پر اگر ”مولانا“ یا ”مفتی“ کا لفظ اُن کے نام کے ساتھ سابقے کے طور پر لکھا نہ جائے، تو عام لوگوں ہی نہیں زبان کی پرکھ رکھنے والوں کو بھی یہ کہنے کی ”جرات“ نہ ہو سکے گی کہ یہ اشعار کسی ”مولوی“ نے کہے ہیں۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ زبان پر دورِ آخر میں آزاد خیالوں کی ”اجارہ داری“ کے بعد یہ باور کرایا جانے لگا ہے کہ مولوی لوگ زبان کا صحیح مذاق نہیں رکھتے؛ حال اُن کہ اردو کے اساطینِ اربعہ یا خمسہ سب

مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا کفیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندی
 کے سب مولوی یا دینی تعلیم کے ہی نمائندے اور اسی کے پر داختہ تھے۔
 کفیل الرحمن نشاط کے چند اشعار آپ بھی پڑھیے اور زبان کی چنگلی کے ساتھ
 خیالات کی خوب صورتی سے لطف اٹھائیے:

کوہِ غم ٹوٹ پڑے دیدہ و دل پر کتنے
 قافلے درد کے آئے ہیں برابر کتنے
 خشک کانٹوں سے ٹپکتا رہا کلیوں کا لہو
 قتل گاہوں سے ملے پھول کے پیکر کتنے
 ہم ہیں منصور لبِ دار نے چوما ہم کو
 ہم ہیں سقراط ملے زہر کے ساغر کتنے

ایک دوسری غزل میں ذیل کے اشعار پڑھیے، استعارے، کنایے اور معانی
 و بیان کے کتنے رنگ کے پھول اپنی نرالی خوش بوؤں سے استقبال کو تیار ملیں گے:

عارضِ شفق، نگاہِ کرن، لبِ حسیں گلاب
 اے دل قسمِ خدا کی ترا حسنِ انتخاب
 روشن ہے ترے دم سے شبستانِ آرزو
 اے شاہِ کارِ حسنِ ازل، رشکِ ماہِ تاب
 غم بھی تری عطا ہے خوشی بھی تری عطا
 کافی ہے بارگاہِ محبت سے انتساب
 کب تک رہے گی تشنہ دیدارِ چشمِ شوق
 کب تک رہے گا چشمِ عنایت سے اجتناب

انتہائی سادگی میں پُر کاری اور بے ساختہ تعبیر میں تخیل کی رعنائی، ملاحظہ کیجیے:

عنوانِ سخن کیا کیا، عنوانِ بیاں کیا کیا
 ہیں اُن سے تعلق پر لوگوں کے گماں کیا کیا

پس مرگ زندہ

پھولوں کے تحفیل سے آباد ہیں ویرانے
کلیوں سے تراشے ہیں سپنوں کے مکاں کیا کیا
جب نطق کو یارے گفتار نہیں رہتا
کرتی ہے بیاں اکثر اشکوں کی زباں کیا کیا

شاعر نے اپنے ہمت و حوصلے کی تصویر اور کٹھن حالات سے نبرد آزما کی کا زندہ
نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے، آپ بھی پڑھیے اور داد دیجیے:

ہم نے دیکھے ہیں بُرے وقت کے منظر کتنے
پھول بن جاتے ہیں حالات سے پتھر کتنے
حادثہ شرطِ محبت ہے تو تسلیم مگر
حادثے ہوں گے مرے قد کے برابر کتنے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے آبلہ پا بھی تو چلے
راہ رو بیٹھ گئے راہ میں تھک کر کتنے

شاعر نے اپنے شعر کی معنویت اور محض لفظیات پر زور صرف کرنے سے بچنے
کے اپنے رویے کو بھی بڑی خوب صورت تعبیر دی ہے:

صرف الفاظ کے پیکر نہیں اشعارِ نشاط
فکر و معنی کے سموئے ہیں سمندر کتنے

ایک غزل میں جگر کی روانی اور اُنھی کی سی بے ساختگی ملاحظہ ہو:

وقت نے آخر یہ سمجھا یا کون ہے اپنا کون پرایا
زیست کی راحت ڈھونڈنے والو زیستِ مکمل دھوپ نہ سایا
جب بھی دل نے ٹھوکر کھائی اُن کے کرم نے ہاتھ بڑھایا

ایک غزل میں اپنی بات محبوب کے دل میں، مشورے اور نصیحت کے خاک سارا نہ
انداز میں، اُتارنے کی جو خوش انداز کوشش کی ہے، اُس کو پڑھ کے، ہر سخن شناس قاری

ملا کرو کبھی ہم سے تو زندگی کی طرح
یہ کیا کہ دیکھ کے اٹھ جاؤ اجنبی کی طرح
سمٹ سکو تو سمٹ جاؤ ماہ تاب صفت
بکھر سکو تو بکھر جاؤ چاندنی کی طرح
تمھاری ریشمی زلفیں رخ حیات کی وضو
سحر کے دوش پہ مانوس تیرگی کی طرح
رہ حیات کے غم میں نشاط کا پہلو
کسی کے حسن لب و رخ کی دل کشی کی طرح

مفتی کفیل الرحمن نشاط کے اشعار، رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کے نت نئے مسائل کی ترجمانی میں لب و لہجہ، انداز و ادا اور رنگ و آہنگ کے تعلق سے اپنی مخصوص طرح رکھتے ہیں۔ زندگی کی کام رانیوں اور فیض بخشوں اور اُس کی ناقابل تلافی ناکامیوں اور محرومیوں دونوں کی نقشہ گری میں، یہ اشعار لا جواب ہیں، اور شاعر کی پاکیزہ نفسی، روح کی شفافیت، احساس کی نزاکت، تخیل کی بلندی، مسائل حیات کے احاطے اور کائنات کی سچائیوں کی ہمہ گیر تعبیر پر شاہدِ عدل ہیں۔

اُن کی خاموشی اور سراپا کو دیکھ کے

اُن کے اتنے اچھے شاعر ہونے کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا

مرحوم کی موٹی صورت، سادہ سے سراپے، ہمہ وقت خاموشی اور بڑی حد تک گوشہ نشینی اور جلوت سے احتراز کو دیکھ کے، یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ اتنے اچھے سخن ور ہیں اور زندگی کی کج رفتاری اور مسائل کی ظالمانہ و جارحانہ یورش کا اُنھیں اس درجہ ادراک ہے۔ سچ ہے خاموش، بعض دفعہ گویا سے زیادہ گویا ہوتا ہے اور بولنے والا، بعض

پس مرگ زندہ

دفعہ زندگی کے حقائق، کائنات کے راز، انسان کی پیچیدہ گہرائیوں اور تہ داریوں اور دنیا اور اُس کے عجائبات کا ایسا ہمہ گیر مطالعہ نہیں رکھتا جیسا ایک خاموش انسان جو ہمہ وقت وہ انہی کی خواندگی میں لگا رہتا ہے۔

سہ شنبہ - چہار شنبہ، ۶-۷/رجب ۱۳۲۷ھ = ۱-۲/اگست ۲۰۰۶ء کی رات میں مغرب بعد، دارالعلوم کے مشہور احاطہ مولسری میں، اُن کے برادرِ اکبر مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی دیوبندی مفتی پنجاب نے، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں غیر معمولی بھیڑ تھی اور صفیں صدر گیٹ یعنی بابِ قاسم سے آگے تک پھیل گئی تھیں۔ مقبرہ قاسمیہ میں انھیں اپنے عظیم دادا مرد صالح مفتی عزیز الرحمن عثمانی دیوبندی (۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء - ۱۳۳۷ھ/۱۹۲۸ء) کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مفتی کفیل الرحمن نے اپنے پس ماندگان میں اہلیہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک انھیں اپنے خاندان والا شان کی دینی و علمی میراث کو اپنے سینوں سے لگائے رہنے کی توفیق بخشے۔

دین اور علم کی وراثت

مرحوم کو دین اور علم و صلاح، نسلاً بعد نسل ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے پردادا مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۱۲۳۷ھ/۱۸۳۱ء - ۱۳۲۵ھ/۱۸۳۷ء - ۱۹۰۷ء) دارالعلوم کی تاسیس کے لیے، اولیں سرمایہ دہندہ چھ ہما نصیب لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ کچھ عرصے دارالعلوم کے مہتمم بھی رہے۔ اُن کے ولی صفت صاحب زادے مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی دارالعلوم کے مفتی اعظم رہے اور انھوں نے، دارالعلوم کے سابق مہتمم متکلم اسلام و حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء - ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کے بہ قول، اپنے ہاتھ سے سوالا کھ سے زیادہ فتوے لکھے، فتاویٰ دارالعلوم کی شائع شدہ ۱۲-۱۳ جلدوں میں ابھی اُن کے فتاویٰ میں سے ایک چوتھائی بھی نہیں آسکا ہے۔ اُن کے دوسرے صاحب زادے مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ثم الپاکستانی (۱۳۰۵ھ/

مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا فکیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندیؒ

۱۸۸۷ء-۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) سے کون واقف نہیں، وہ اپنے دور میں اسلام کی زبان ناطق اور اُس کے باتوفیق شارح و ترجمان تھے، مشہور ترجمہ شیخ الہند اُن ہی کی تفسیر عثمانی سے مُزین ہے۔ اُن کے تیسرے صاحب زادے مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۹ء) دارالعلوم دیوبند کے نہ صرف مہتمم؛ بل کہ تاریخ دارالعلوم میں سب سے بڑے منتظم اور مدبر بنے دارگزرے ہیں۔ مولانا مفتی فکیل الرحمن کے والد مولانا قاری جلیل الرحمن عثمانی دیوبندیؒ (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء-۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء) زندگی بھر دارالعلوم میں تجوید و قرأت کے استاذ رہے اور سیکڑوں طلبہ اُن سے مستفیض ہوئے۔ مفتی فکیل الرحمن نے کم گوئی، کثرتِ کار، نیکی، سلامت روی، وقت اور وعدے کی پابندی، فرائض کی ادائیگی میں تندہی، یہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ اپنے آبا سے وراثت میں پایا تھا۔ اُن کے نزدیک یہ اوصاف اعلیٰ قدر کا درجہ رکھتے تھے، جس پر کاربندی ہی مومن کی سب سے بڑی شناخت ہوتی ہے۔

خانہ خیال میں اُن کی تصویر کی گردش

میرے خانہ خیال میں اُن کی تصویر اب تک متحرک ہے اور شاید تاحیات زندہ رہے گی۔ وہ ظہر کی نماز کے معاً بعد اپنے مکان اور اپنی چھوٹی سی مسجد، جس میں وہ امامت کرتے تھے، کی سمت سے سبک خرامی سے آتے ہوتے اور میں چند طلبہ کے ساتھ ادھر افریقی منزل قدیم سے، دارالعلوم کے لیے محو خرام ہوتا۔ وہ اکثر مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ (۱۳۳۷ھ/۱۹۲۸ء-۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء) کے مکان اور چھتہ مسجد کے شمالی نکلے کے بیچ میں مجھ سے آ ملتے اور اس برق رفتاری سے میرے پاس سے گزر جاتے، جیسے کوئی انھیں دوڑا رہا ہو، یا انھیں کسی ضروری کام سے بروقت پہنچنا ضروری ہو۔ میں طلبہ سے جو میرے ساتھ ہوتے، اکثر کہتا کہ مفتی صاحب اس تیزی سے میرے پاس سے بھاگ نکلتے ہیں، جیسے کوئی اُن کا وہ پرس جو وہ اپنے سینے سے لگائے اور ہاتھ سے دبائے ہوئے ہیں، چھیننے لے رہا ہو، یا انھیں خدشہ ہو کہ شاید میں ہی اُن کے ساتھ اس قسم کی حرکت کر

بیٹھوں گا۔ دارالعلوم کی راہ میں ہی ہمیشہ میری اُن کی اسی طرح کی عاجلانہ اور سرسری ملاقات رہی؛ لیکن نہ میں کبھی اُن سے مخاطب ہوا اور نہ اُنھوں نے کبھی رک کے خبر خیریت پوچھی؛ کیوں کہ شاید اُنھیں یہ احساس تھا کہ اُنھیں بہت جلد بہت دور اس دنیا کی حد کو عبور کر جانا ہے۔ میں جب سے اپنی فیملی کے ساتھ افریقی منزل قدیم کا باسی ہوا، میرے اُن کے درمیان مذکورہ جگہ کے بیچ روزانہ کی ”دوڑ“ کا جو سلسلہ شروع ہوا، اُس میں وہ اس دنیا میں بھی ”جیتے“ ہوئے تھے اور اُس دنیا کی طرف بھی مجھ سے آگے لپک کے جا پہنچے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں کی زندگی میں مجھے پیچھے چھوڑ جانے والا وہاں کا ”ہدف“ بھی پہلے پالے گا، گویا اُن کے لپکنے اور مجھے ”ہرا“ دینے کے لیے کوشاں رہنے کا راز، اب مجھ پر منکشف ہوا۔

میں اُن کی زندگی کے حوالے سے غالباً اس سے بھی کم جانتا ہوں، جتنی دیر کے دورانیے میں، میں اُنھیں روزانہ چھتے مسجد کے پاس اُنھیں کم عمر بچے کی طرح پھرتی سے چلتے دیکھتا تھا۔ دیکھنے کا دوسرا ذریعہ اُن کی نثر نگاری تھی اور تیسرا واسطہ اُن کے چھپے ہوئے اشعار اور چوتھا ذریعہ ایک آدھ آدمی، جس نے دارالعلوم کی ۲۵-۲۶ سالہ ملازمت میں مجھ سے اُن کے حوالے سے ایک آدھ بات کہی ہوگی۔ ان سارے ذرائع سے میرے خانہ خیال میں اُن کی جو تصویر بنی وہ خوب صورت ہے اور محبوب بھی، اتنی کہ اب تاحیات گردش کرتی رہے گی اور ذہن کے اسکرین پر اپنی دل ربائی کے ساتھ ابھرتی رہے گی۔ یعنی ایک اچھے اور باہمہ دبے ہمہ اور بے ضرر انسان کی تصویر۔ دل کہتا ہے کہ شاید اس انسان نے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہوگی۔ یہ اُن کے سچا مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ روزانہ اُن کا اسی جگہ ملنا جس کی طرف اشارہ ہوا، اُن کے پابندِ اوقات اور ذمے داری کے احساس اور اپنے فرائض کو بے کم و کاست ادا کرنے کے لیے اُن کی تڑپ کی دلیل ہے، جو اُن کے مومن ہونے کی بھی دلیل ہے اور یہ دونوں باتیں ان شاء اللہ اُن کے جنتی ہونے کی بھی علامت ہیں؛ کیوں کہ رب کریم کی رحمت

مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا کفیل الرحمن نشاط عثمانی دیوبندیؒ سے اُمید ہے کہ وہ ان صفات کے حامل افراد کو، اپنی جنت سے محروم نہ کرے گا۔
 مفتی کفیل الرحمن کی شرافت اور نیکی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس آب و گل کی دنیا سے اُن کا رب انھیں اس طرح لے گیا کہ وہ قبل از موت کسی کے لیے، اپنی معذوری، طویل بیماری اور ارذل العمری کی بنا پر، بلا ارادہ بھی باعثِ زحمت نہ بنے اور اللہ حکیم نے انھیں چلتے چلاتے آنا فانا اٹھالیا۔ (۰)

سوانحی نقوش

✽ نام: (مفتی حافظ مولانا) کفیل الرحمن

✽ تخلص: نشاط

✽ رہائش: مکان نمبر ۴۵ محلہ ابوالعالی، دیوبند، سہارنپور، یوپی

✽ تاریخ پیدائش: ۱۵ مارچ ۱۹۴۲ء (۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ)

✽ تعلیم گاہ اول: دارالعلوم دیوبند

✽ فراغت: ۱۹۶۱ء (۱۳۸۱ھ)

✽ تعلیم گاہ ثانی: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ایم، اے، عربک)

✽ فراغت: ۱۹۷۵ء (۱۳۹۵ھ)

✽ وفات: سہ شنبہ ۶/رجب ۱۴۲۷ھ مطابق یکم اگست ۲۰۰۶ء۔

✽ اساتذہ دارالعلوم

- حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ • حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحبؒ • حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ • حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ • حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ • حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ • حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ • حکیم الاسلام حضرت مولانا

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۰، رمضان و شوال ۱۴۲۷ھ = اکتوبر و نومبر ۲۰۰۶ء۔ اردو

تحریر یہ قلم خود ۲۵ بجے شام ۲۴/رجب ۱۴۲۷ھ = ۱۹ اگست ۲۰۰۶ء۔

قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

✽ علی گڑھ کے اساتذہ

- پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب • پروفیسر مہدی حسن صاحب • ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب
- ڈاکٹر عبدالباری • ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب۔

✽ پس ماندگان

اہلیہ محترمہ (رفیعہ خاتون عرف تسکین دہن) بنت حاجی لطیف احمد۔ چھ لڑکے: قتل الرحمن نبیل، معاذ عزیز (پ: ۲۷/۲ اپریل ۱۹۶۷ء) عمار عزیز (پ: ۲۸/۲ اپریل ۱۹۷۰ء) سعد عزیز (پ: ۲/۲ اگست ۱۹۷۲ء) صفوان عزیز (پ: ۲۸/۲ دسمبر ۱۹۷۷ء) طاہر عزیز (پ: ۱۲/۲ فروری ۱۹۸۴ء) اور دولڑکیاں: عروسہ سعدیہ (پ: ۱۹۶۴ء) شگفتہ جبین (پ: ۱۹۷۵ء)۔

✽ علمی نقوش

عربی تراجم

ناشر

نام کتب

- | | |
|-------------------------------|--|
| کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۰ء | ۱- سراج المعانی ترجمہ و شرح اردو شرح جامی |
| کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۲ء | ۲- سراج الوقایہ شرح اردو شرح وقایہ |
| مکتبہ العزیز | ۳- سراج المطالب ترجمہ شرح اردو کافیہ |
| | ۴- تفہیم المسلم ترجمہ شرح اردو فتح المسلم |
| کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۳ء | ۵- سراج الايضاح ترجمہ و شرح اردو نور الايضاح |
| کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۵ء | ۶- اصول اکبری ترجمہ و شرح اردو فصول اکبری |
| کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۶ء | ۷- سراج الطالبین ترجمہ اردو شرح پنج گنج |
| زکریا بک ڈپو دیوبند ۱۹۹۸ء | ۸- ترجمہ فتاویٰ عالمگیری |
| | ۹- سراج المنیر ترجمہ الفیۃ الحدیث |
| مکتبہ العزیز دیوبند | ۱۰- سراج النخو شرح ہدایت النخو |

فارسی تراجم

- ۱- ترجمہ مالابدمنہ
- کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۷ء

- ۲- ترجمہ پندنامہ کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۸ء
- ۳- ترجمہ گل زاہد بستان کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۹ء
- ۴- ترجمہ مسائل اربعین مکتبہ دانش ۱۹۹۰ء
- ۵- ترجمہ تحفۃ الموحدین مکتبہ فیض القرآن ۱۹۹۰ء
- ۶- ترجمہ رباعیات حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی عظیم بک ڈپو ۱۹۹۰ء
- ۷- ترجمہ فارسی کی پہلی کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۳ء
- ۸- ترجمہ فارسی کی دوسری کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۴ء
- ۹- حاشیہ اردو بوستاں کتب خانہ محمودیہ دیوبند
- ۱۰- حاشیہ اردو گلستاں کتب خانہ محمودیہ دیوبند
- ۱۱- حاشیہ مالا بدمنہ کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۵ء

اردو تصنیفات

- ۱- زیارت قبور ۲- آئینہ بدعت ۳- شادی کی رسمیں ۴- اسلامی مہینے ۵- حیات ابو زہرہ ۶- حیات سلمان فارسی ۷- حیات ابو ہریرہ ۸- حیات ابن عباسؓ - ناشر مکتبہ فیض القرآن ۹- نعت حضور، شعری مجموعہ (کتب خانہ محمودیہ دیوبند) ۱۰- کلیاں (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) مکتبہ العزیز دیوبند ۱۱- مجموعہ کلام ”شعنا“ ناشر فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند۔



عالم صالح و بانیض مدرس مولانا سید محمد شمس الحق ویشالویؒ

۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء — ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء

صراحی روتی اُٹھی، جام اُٹک بار اُٹھا
پھر آج نئے کدے سے ایک بادہ خوار اُٹھا

برادر عزیز مولوی محمد قمر عالم سلمہ استاذ مدرسہ عالیہ عرفانیہ، عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ کے خط، فون اور مکرر یاد دہانی کے ذریعے اصرار کی وجہ سے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، ورنہ مولانا سید محمد شمس الحق صاحب مدظلہ (۱) کے تعلق سے مجھے جان کاری نہیں ہے۔ عرصے سے اُن کا ذکر خیر سن رہا ہوں اور یہ کہ وہ بہار کے مشہور و معتبر مدرسہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کے شیخ الحدیث اور وہاں کے بانیض اُستاد و مربی اور سیکڑوں قد آور علما کے روحانی باپ ہیں۔ وہ ۱۹۱۶ء میں مولود ہوئے۔ اس اعتبار سے اُن کی عمر اس وقت کم و بیش ۹۰ سال ہے۔ ۱۹۳۸ء سے وہ مسلسل درس و افادے میں مشغول ہیں۔ اس طرح اُن کی تدریسی زندگی کا دورانیہ کم و بیش ۶۷-۶۸ سال پر محیط ہے۔ اس حساب سے وہ ہندوستان کے انتہائی فیض رساں عالم و مدرس ہیں، اتنی طویل زمانی مسافت تک بہت کم

(۱) اور اب رحمۃ اللہ علیہ؛ کیوں کہ یک شنبہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ = ۲۵ نومبر ۲۰۰۷ء کو وہ وفات پا گئے۔

پس مرگ زندہ

اہل تدریس کو فیض بخشی کی توفیق ملتی ہے۔ خدائے پاک کا اُن کے ساتھ یہ خصوصی اور امتیازی کرم ہے۔ دینی افادے کے ساتھ طویل العمری اور پیہم کارِ خیر میں صرف ہوتی ہوئی سن رسیدگی، اُن کے منتخب روزگارِ علما میں ہونے کی علامت ہے۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں نابغہ روزگار علما سے تحصیلِ علم کیا۔ اس کے بعد جب دارالعلوم میں میں تقدیرِ الہی سے اُس وقت ایک بڑا انقلاب آیا اور اُس کے جید علما و مشائخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہو گئے، جن میں سرخیل علما و محدثین علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری اور جلیل القدر عالم و محقق و مفکر و قائد علامہ شبیر احمد عثمانی بھی تھے، جس کی وجہ سے مدرسہ تعلیم الدین کو جنوب کا دارالعلوم دیوبند ثانی اور جامعہ اسلامیہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا، تو مولانا سید محمد شمس الحق صاحب، جو اُس وقت دارالعلوم کے طالب علم تھے، اپنے مایہ ناز اساتذہ کرام کی ڈابھیل منتقلی کی وجہ سے، خود بھی کشاں کشاں تعلیم الدین چاہنے لگے اور دسمبر ۱۹۳۶ء یعنی اواخرِ شوال ۱۳۵۵ھ سے وہاں کسبِ علم کا سلسلہ شروع کیا۔ ستمبر ۱۹۳۷ء یعنی شعبان ۱۳۵۶ھ میں اُنھوں نے وہاں سے ہی رسمی فراغت پائی اور علامہ شبیر احمد عثمانی، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء) اور مفتی اعظم ہند علامہ مفتی محمد کفایت اللہ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء- ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۲ء) کے ہاتھوں اُن کے سرپرستارِ فضیلت بندھی، جو اس بات کا اشارہ غیبی تھا کہ یہ جوان ایک روز، اس ملک کا یگانہ روزگار مدرس اور بافیض عالم و مربی بنے گا۔

مولانا کی فیض رسانی

مولانا سید محمد شمس الحق ویشالوی اپنے عظیم استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی سے بیعت بھی ہوئے اور تربیت بھی پائی۔ اُن کی پاکستان منتقلی اور پھر وفات کے بعد، وقت کے عالم و دانش ور اور مربی مولانا سید منت اللہ رحمانی سے رجوع ہوئے اور اُن سے مشورے اور تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح وہ صرف حرفِ علم کے رسمی شناسا اور

خشک عالم نہیں؛ بل کہ طریقت و روحانیت کی راہ کے پر شوق مسافر بھی رہے اور اُن کے شوق سفر کو کبھی تسکین نہ ملا کہ یہ مسافر کی تنگ دامانی کی علامت ہوتی ہے۔

مولانا، تدریسی فیض رسانی کے انہماک کی وجہ سے اکثر مختصر مدرسین کی طرح، تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے؛ لیکن جو تھوڑا بہت کام اس سلسلے کا سامنے آیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھیں وقت ملا ہوتا، تو وہ کام یاب مؤلف اور پاپے کے مصنف ہوتے۔ بدیع الزماں ہمدانی کے دس مقاموں کی ”تسہیل المعانی“ کے عنوان سے کام یاب اور مقبول شرح لکھی، جو اُن کے ابتدائی زمانہ درس کے نقش اول میں شمار ہوتی ہے۔ عربی زبان کی ریڈنگ بک ”تسہیل العربیہ“ کے نام سے تصنیف فرمائی یہ بھی تدریس کے اولین دور کی یادگار کتاب ہے۔ علم نحو پر ایک منظوم کتاب ترتیب دی جو ”عوامل النحو“ کے نام سے مطبوعہ ہے۔ صحیح بخاری کے درسی افادے ”جهد البھاری فی حل صحیح البخاری“ کے نام سے اور جامع ترمذی کے درسی افادے ”غنیۃ المبتدی فی حل الترمذی“ کے عنوان سے مَدُون ہو چکے ہیں۔ پارہ عم کا منظوم اردو ترجمہ بھی آپ نے اِرقام فرمایا ہے۔ آخر الذکر کتابیں لاسٹ ٹچنگ سے گزر رہی ہیں اور وہ مطبوعہ شکل میں آکر، اِنْ شاء اللہ طلبہ اور علما کے لیے بڑی کارآمد ہوں گی۔

مولانا نے خدا کی توفیق سے بڑی محنت اور جانفشانی سے پڑھا تھا؛ اِس لیے علم میں گہرائی اور گیرائی دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ پختہ گواور قادر الکلام شاعر بھی ہیں ”یادِ حرم“ کے نام سے ایک مجموعہ کلام بھی طبع ہو چکا ہے۔ فارسی، اردو، عربی تینوں زبانوں پر عبور ہے اور ضرورت کی حد تک ہندی اور انگریزی بھی جانتے ہیں؛ کیوں کہ اسکول کے نظام کے مطابق ”بی اے“ کا امتحان بھی دے چکے تھے۔ انھوں نے ہر مدرسے میں امتیازی نمبرات حاصل کیے اور تدریس کی دنیا میں آئے تو ممتاز مدرس اور بانیض معلم ثابت ہوئے۔ وہ بہار کے ممتاز ترین علما کی صف میں تاریخ نگاروں کے لیے

بھرپور مضمون کے مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہار کے اہل علم کا مؤرخ، انھیں ممتاز جگہ دینے پر مجبور ہوگا۔ خاموشی، گوشہ نشینی کے ساتھ بغیر کسی انقطاع کے ۶۰-۷۰ سال تک فیض رسانی اور علم و افادے کا جام لندھانے میں انہماک کے حوالے سے، اُن کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔

مولانا کی تدریسی خدمات کے تعلق سے خاص بات

خاص بات یہ ہے کہ اُن کا تدریسی و تربیتی عمل سارا کا سارا بہار ہی میں محدود رہا۔ انھوں نے اپنا تعلیمی و تدریسی مے خانہ بہار کے چند محدود خطے، جو اُن کے وطن مظفرپور و پیشالی سے مونگیر تک کی مسافت پر پھیلا ہوا ہے، ہی میں تعمیر و آباد کیا اور اُس کو کبھی ویرانی کا شکوہ نہ ہوا؛ ورنہ بہار کے خطے کو دورِ آخر میں علم خور خطہ باور کیا جانے لگا ہے۔ اس اعتبار سے وہ بہار میں اس دور کے عالی مقام مدرس و مربی ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شہرت، علمی چمک، تدریسی بہار، تصنیفی نکھار اور زر کشی کے ذریعے کی تلاش میں، اپنی خاک سے ”بے وفائی“ کی نہیں سوچی اور جس مٹی نے اُن کے خمیر کی تیاری میں اپنا گراں مایہ جوہر صرف کیا تھا اور جس کی آب و ہوانے انھیں علم و عمل کے ”جراثیم“ عطا کیے تھے، اُس کی بھرپور خدمت کو اصل فریضہ باور کیا اور اُسی سے چمٹے رہے۔ اس وقت کے نوجوان علما کی حالت سے، اس معزز زانہ رویے کا موازنہ کیجیے، تو آپ کو مولانا سید محمد شمس الحق انتہائی قد آور و منفرد علما و صلحائے وقت کی صف میں، سلفِ عظام کی سیرت پر گام زن نظر آتے ہیں۔ اللہ پاک انہیں اُن کی ساری قربانیوں اور ذاتِ فراموشیوں کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے۔

مولانا ویشالوی بہار کی مٹی کی زرخیزی کا بہترین نمونہ

بہار کی زمین بلاشبہ بڑی مردم خیز ہے۔ اس خطے میں ہمیشہ کی طرح آج بھی

ہر علم و فن کے نامی گرامی اہل کمال پورے ہندوستان میں، نیز بیرون ملک میں، اپنے علم اور ہنر کا لوہا منوار ہے ہیں۔ ذہانت، جرأت مندی، حق گوئی اور بے باکی اور علم و فن کے اکتساب کی غیر معمولی صلاحیت، اہل بہار کی آج بھی بہت بڑی شناخت ہے۔ نفاق سے نفرت، حق پر جماؤ اور اصرار اور اُس کے لیے قربانی دینے کے لیے، ہمہ وقت تیار رہنا؛ ساکنانِ بہار کا امتیاز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ہر جگہ کی مٹی کو اللہ نے کچھ خوبیوں اور خرابیوں سے ممتاز بنایا ہے۔

مولانا سید محمد شمس الحق ویشالوی بہار کی مٹی کی قابلِ تعریف امتیازی خصوصیات کا مکمل نمونہ ہیں اور موجودہ علما کے لیے علم و عمل کی جامعیت، کام میں انہماک، شہرت سے نفرت، اپنی ذات کو برپا کرنے کی خواہش سے بالکلیہ براءت کے حوالے سے لائقِ تقلید ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی علم آموزی، تربیت سازی اور افراد کی تیاری میں صرف کردی اور اپنی عظمت کی دھاک بٹھانے کی انھیں کبھی نہ سوجھی، یہ بہت بڑی بات ہے، جو لائقِ پیروی بھی ہے اور قابلِ ریکارڈ بھی۔ کَثُرَ اللَّهُ أَمْثَالَهُ۔

نہ دیکھنے کے باوجود، وہ میرے لیے دیدہ سے

مولانا کو میں نے دیکھا ہے، نہ برتا ہے، نہ کسی طرح کا اُن سے استفادہ کیا ہے؛ لیکن انھیں دیکھنے، اُن کو جینے اور اُن سے ہر طرح کا فیض پانے والوں نے اُن کے حوالے سے اتنا کچھ کہا، بتایا اور سنایا ہے کہ وہ نہ صرف شنیدہ؛ بل کہ دیدہ سے لگتے ہیں۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ آدمی کو دیکھ، برت اور تجربہ کر کے جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہ زیادہ اچھا، بھرپور اور موقع ہوتا ہے۔ یہ سطریں اس وقت انتہائی غفلت میں مذکور الصدر عزیز کی خواہش پر تحریر کی گئی ہیں۔ اللہ کرے اس سے زیادہ اطمینان کا کوئی موقع نصیب ہو اور مولانا کی ذات کو قریب سے دیکھنے، یا اُن کی علمی نگارشات سے فائدہ اٹھانے کی سعادت ملے اور میں زیادہ طاقت اور تفصیل کے ساتھ اُن کے سلسلے میں کچھ لکھنے کی

عزت حاصل کر سکوں۔ واللہ وحده يُقَدِّرُ الأعمالَ والآجالَ وَيُحَقِّقُ الرغباتِ
والآمالَ. (۱)

وفات

یک شنبہ: ۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵/ نومبر ۲۰۰۷ء کو تقریباً ڈھائی بجے
دن میں، سال ہا سال کی بیماری و کم زوری کے بعد انھوں نے اپنے وطن ”ابا بکر پور“
ضلع ”ویشالی“ سابق ضلع ”منظفر پور“ میں آخری سانس لی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔
اُن کے جنازے میں بڑی تعداد میں علما و طلبہ اور صلحا نے شرکت کی۔ جامعہ رحمانی خانقاہ
مونگیر، جہاں وہ سال ہا سال شیخ الحدیث رہے، کے علما کے ایک موقر وفد نے اُن کی نمازِ
جناہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کی۔

سوانحی نقوش

- ✽ نام: سید محمد شمس الحق بن سید محمد ابراہیم
- ✽ جاے ولادت: چک اولیا (ویشالی)
- ✽ تاریخ ولادت: ۱۹۱۶ء سنداً ۱۹۱۹ء
- ✽ ابتدائی تعلیم: اپنے والد محترم سید محمد ابراہیم اور برادرِ مکرم مولوی منظور الحق سے حاصل کی
- ✽ اعلیٰ تعلیم: مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور میں (دس سال کی عمر میں) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ، ماہ
جولائی ۱۹۳۰ء دارالعلوم دیوبند، ماہ جنوری ۱۹۳۳ء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات ۲۹/ شوال ۱۳۵۵ھ
- ✽ فراغت: جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات ۹/ شعبان ۱۳۵۶ھ (دستار بندی بہ دست علامہ شبیر احمد
عثمانی، حبان الہند مولانا احمد سعید اور مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ)

- (۱) یہاں تک مرحوم کی حیات میں براہِ راست اردو میں بہ روز یک شنبہ: ۱۶/ شعبان ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۰/ ستمبر ۲۰۰۶ء
لکھا گیا۔ اس کے بعد والا حق پہلے والے حصے کے ساتھ ملا کر عربی زبان میں تحریر کیا گیا، جو ”الداعی“ عربی کے
شمارہ ۱۲-۱۳، جلد ۳۲، ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق نومبر و دسمبر ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

عالم صالح و با فیض مدرس مولانا سید شمس الحق ویشا لوی

✽ اساتذہ کرام: دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ: مولانا عبد السمیع صاحب، مولانا میاں اختر حسین صاحب، مولانا اجتبا صاحب، مولانا محمد جمیل، مولانا نافع گل، مولانا شمس الحق، شیخ الحدیث مولانا محمد اعزازی علی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مفتی ریاض الدین، حکیم الاسلام قاری محمد طیب، مولانا گل محمد خان۔ شمس الہدیٰ پٹنہ کے اساتذہ: حافظ عبدالرحمن، مولانا اقبال حسین، مولانا عبد الماجد، مولانا عبدالرشید، مولانا محمد قاسم، مولانا عبدالغفور، مولانا دیانت حسین، ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا شاہ عبید اللہ، مولانا اصغر حسین۔

✽ رشتہ ازدواج: چک نصیر ویشا ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ (لا ولد) دوسری شادی: رسول پور بکھری، ویشا ۲۱ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ (ایک لڑکا نام مظاہر عالم سابق پرنسپل مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور، ویشا) تیسری شادی: رسول پور بکھری ویشا ۲۰ صفر ۱۳۶۶ھ

✽ اولاد: مظاہر عالم، قطب عالم، خورشید عالم، نظیر عالم، محبوب عالم، تنویر عالم (لڑکیاں) زینت بیگم، ہاجرہ خاتون، فاطمہ ششی۔

✽ درس و تدریس: مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور یکم فروری ۱۹۳۸ء تا ۶ ستمبر ۱۹۴۲ء، باڑھ حق منزل ۸ نومبر ۱۹۴۲ء (تقریباً ایک سال) کھگو یا ۸ اگست ۱۹۴۳ء تا اپریل ۱۹۴۴ء، باگھی ہائی اسکول مظفر پور، یکم مئی ۱۹۴۴ء (چار سال) مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء، جامعہ رحمانی خانقاہ موگیہ ۱۹۶۵ء سے تاحیات۔

✽ زیارت بیت اللہ: (حج) ۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء (عمرہ) ۱۹۸۱ء (حج) ۱۹۸۳ء۔

✽ مشہور تلامذہ: مولانا عبدالسبحان رحمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا رضوان القاسمی، مولانا بدر الحسن القاسمی (مقیم کویت)، مولانا نور الحق رحمانی، مولانا فضل الرحمن رحمانی، مولانا طفیل احمد رحمانی، مولانا نایز احمد رحمانی وغیرہم۔

✽ بیعت: علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ۔ (تجدید بیعت) حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی۔

✽ مشاغل: شیخ الحدیث جامعہ رحمانی خانقاہ موگیہ، قاضی شریعت موگیہ، رکن مجلس شوریٰ امارت شرعیہ پھلواڑی شریف پٹنہ۔

✽ سرپرست: مدرسہ اسلامیہ، امانوری پاتے پور، ویشا؛ بانی و سرپرست مدرسہ اسلامیہ شمشہ، چک معین الدین، ویشا اور ان کے علاوہ بہت سے مدرسوں کے بانی و سرپرست۔

پس مرگ زندہ

❖ تصنیف: مقامات بدیع الزماں ہمدانی کے دس مقامات کی شرح بہ نام تسہیل المعانی، تسہیل العربیہ، عوالم النحو (منظوم)، یادِ حرم (غیر مطبوعہ) جہد البھاری فی حلّ البخاری، غنیۃ المبتدی فی حلّ الترمذی، پارہ عم (منظوم)
❖ ان کی تصنیف کی ترتیب: کاکام مولانا مظاہر عالم شمشی سابق پرنسپل مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور اور مولانا عبدالقیوم شمشی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ اماموری کے زیر نگرانی ہو رہا ہے۔ (*)



(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں مولوی محمد قمر عالم ویشا لوی سلمہ کی ارسال کردہ معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

منفرد عالم و مقرر و محدث

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

۱۳۴۷/۱۹۲۸ء — ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

بجھ گئے کتنے شبستانِ محبت کے چراغ
مخفلیں کتنی ہوئی شہرِ خموشاں، کیسے

اوائلِ ربیع الثانی، اواسطِ اپریل میں، میں کچھ ضروری کاموں اور علاج کی غرض سے اپنے وطن ”ہر پوریشی، اورائی، مظفر پور، بہار“ گیا ہوا تھا۔ شنبہ: ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو اپنے گھر کی ایک گیلری میں، تقریباً ۱۱ بجے حسب معمول دواؤں کی خوراک لے رہا تھا کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی، میں نے جلدی میں بٹن دبا کر کان سے لگایا تو مولوی وحی احمد استاذ ”جامعہ امام انور“ دیوبند کی عاجلانہ اور مغموم آواز سنی کہ حضرت! اس وقت یہ ناچیز آپ کو بڑی غم انگیز خبر دے رہا ہے، ابھی ابھی دہلی سے خبر آئی ہے کہ حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ ساڑھے دس بجے ”گنگارام ہسپتال“ میں اللہ کو پیارے ہو گئے ”إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ“ انھوں نے فوراً ہی فون کاٹ دیا۔

واقعی اس خبر کو سن کے جو صدمہ ہوا، اُس کو الفاظ سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ ایک ایسے بڑے اور ممتاز عالمِ جلیل کے انتقال کی خبر سن کے، دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو گئی، جس نے زندگی بھر بزرگِ صغیر کے اسلامی حلقوں کو اپنے علمِ نافع، روشن دماغ، لائقِ ذکر ذہانت، بے حساب سرگرمیوں اور جوانوں کے لیے بھی قابلِ رشک تازگی و زندگی،

ظرافت و طلاقت لسانی، روانی قلم، خوش نما تدریس، لذت انگیز و پُر جوش تقریر، نئے رنگ و آہنگ کی تحریر، شیریں زبانی، مزاحیانہ مخاطب، تبسم آمیز سلوک سے، ہمیشہ مشغول و معمور رکھا، جس میں اُن کا وسیع مطالعہ، گہرا تجربہ، بے پناہ معلومات اور ہر موضوع کو پیش کرنے میں غیر معمولی سلیقہ مندی اور نرالا پن مستزاد ہوتا تھا۔

اس خبر کو سنتے ہی، میں ہر اُس کام سے غافل ہو گیا، جو اُس وقت میرے اوپر طاری تھا اور جس کو انجام دینا میرے لیے انتہائی ناگزیر تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر ایک سے بڑھ کے ایک خوب صورت یادوں کا نقشہ اُبھرنے لگا اور خیال و فکر پر اس طرح چھا گیا کہ میں صرف اُسی پر غور کرنے لگا۔ اُن کی ممتاز شخصیت، اُن کی منفرد شبیہ، زندگی کی راہوں اور علم و فکر، دین و دعوت کی شاہ راہوں پر اُن کی پیہم دوڑ اور مسلسل سرگرمیوں (جن کا سلسلہ اُسی وقت تھا جب اُن کی نبض حیات، ہند کے تہذیبی، ثقافتی و سیاسی اور اسلامی مرکز: دہلی کے ایک ہسپتال کے ایک پُر سکون کمرے میں یکسر رُک گئی) کی انمول تصویریں اُجاگر ہوتی؛ اور دعوتِ نظارہ دیتی رہیں۔

سیرت و صورت

”دارالعلوم دیوبند“ میں میری طالب علمی کے زمانے کی اُن کی ایک خوب صورت تصویر خانہ خیال میں گردش کرنے لگی کہ وہ ”دارالعلوم“ کی کسی درس گاہ سے سبق پڑھا کر، کسی گیلری سے گزر رہے ہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے، چہرے پر خوشیوں کی لکیں اُبھری ہوئی ہیں، وہ تازہ دم اور چستی کے ساتھ تیز تیز چل رہے ہیں، حسبِ معمول اُن کے گرد طلبہ کی بھیڑ اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے (۱) اور وہ معنی خیر مزاحیہ اور علمی فقروں

(۱) جو ہمہ حال اُن کے ساتھ ضرور رہتی تھی، حتیٰ کہ صبح و شام کی اُن کی اُس تفریح میں بھی، جس کو سفر و حضر، جاڑا و گرمی، خشکی و برسات کے دنوں اور صحت و بیماری میں بھی، اُس وقت تک چھوڑتے نہ تھے، جب تک کسی وجہ سے ڈاکٹر انھیں اس سے منع نہ کر دیتا۔ وہ اپنے معاصر تمام علما میں غالباً اس حوالے سے بے نظیر تھے کہ وہ صبح و شام کی تفریح کی، مقدس و ظیفہ کی طرح پابندی کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ اُس کو صحت کی بقا و افزائش کا بنیادی عنصر سمجھتے تھے۔

سے طلبہ کو محفوظ کر رہے ہیں۔

یہ تصویر میرے خانہ ذہن میں رقصاں ہی تھی کہ اُن کی دوسری تصویر ذہن میں اُبھرنے لگی: وہ دارالعلوم کی کسی بڑی درس گاہ میں متعلقہ سبق پڑھا رہے ہیں، وہ علمی گوہر لٹا رہے ہیں، ایک سے بڑھ کے ایک خوب صورت جملوں اور خوش نما نقطوں سے طلبہ عیش عیش کر رہے ہیں، جوش و خروش اور علم و فکر کی موسلا دھار بارش کی وجہ سے، طلبہ کسی اور طرف تাকنے اور جھانکنے کی ایک لمحے کی فرصت بھی نہیں پار رہے ہیں، وہ اس طرح جھے بیٹھے ہیں، جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، اُنھوں نے ذرا سی حرکت کی نہیں کہ وہ سب یک لخت اُڑ جائیں گے۔ سارے طلبہ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اُن کا ایک جملہ بھی اُن کی گرفت سے رہ نہ جائے۔ مطالعہ کی وسعت، تدریس کی مہارت، اسلوبِ ادا کی نزاکت، زبان کی فصاحت، لہجے کی گھن گرج، جملوں کی خوب صورت ساخت، کے ساتھ ساتھ اُن کا سارا سبق سنجیدگی و مزاح کی متوازن آمیزش سے بھرپور ہوتا تھا، جس کی وجہ سے طلبہ پر کبھی وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی، جس کو اُکتاہٹ یا چنی غفلت کا نام دیا جاسکے، جو عموماً سامعین و حاضرین پر اُس وقت ضرور طاری ہوتی ہے، جب مقرر، مدرّس، خطیب؛ طرزِ ادا کی ہنرمندی سے مطلوبہ مقدار میں بہرہ ور نہیں ہوتا، جب کہ یہی صفت مولانا کشمیریؒ کا وجہ امتیاز تھی اور اسی وجہ سے وہ اپنے بہت سے معاصرین میں اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ وہ کوئی پیشہ ور مدرس نہ تھے جو روزی روٹی کمانے کے لیے یا کسی خالی جگہ کی خانہ پُری کے لیے کام کرتا ہے؛ لہذا وہ توجہ اور دلچسپی سے اپنا کام نہیں کرتا۔ مولانا کشمیریؒ فطری تدریسی ملکہ کے حامل مدرس تھے، وہ واقعتاً مثالی معلّم تھے۔ وہ درس گاہ جانے سے پہلے ہی تدریسی مواد کا بھرپور مطالعہ کر کے، اُس کے ہر گوشے کو اپنے ذہن اور معلومات کے خانے میں مرتب کر چکے ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ اللہ نے انھیں مخاطب کو مکمل طور پر مطمئن کر دینے اور اُس کے ذہن میں اپنی بات کو اُتار دینے کی عجیب و غریب صلاحیت سے نوازا تھا۔ اُن کا اندازِ تکلم بڑا مزے دار، اُن کی

زبان انتہائی خوب صورت اور اُن کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی اور انسان کے تجربوں سے مالا مال تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بڑے ذہین، بیدار مغز، حاضر جواب اور ذکاوت کھس تھے، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف حقائق کوئی پر بلا کی قدرت رکھتے تھے؛ بل کہ وہ بہ وقت ضرورت حقائق سازی بھی کر سکتے تھے؛ لہذا دلوں اور عقلوں کو جیت لینے کے فن میں نہ صرف ماہر؛ بل کہ طاق تھے۔

وہ انتہائی معنی خیز، حکمت آمیز اور اشارہ ریز مزاحیانہ اور بے ساختہ فقروں کے ذریعے؛ مجلس درس و مجلس گفتگو دونوں کو زعفران زار بنائے رکھتے تھے۔ اُن کے دُور رس اشاروں پر مبنی جملوں کی تہ داری کے سامنے متوسط ذہن کے طلبہ بے بس اور لاچار رہ جاتے تھے۔ ان ساری خوبیوں کی وجہ سے وہ ایک بے بدل، انتہائی مفید اور کثیر الافادہ اُستاد تھے۔ طلبہ اُن کے اُسباق کا اس طرح انتظار کرتے جیسے ایک سچا محب اپنے حبیب کا۔ کسی باکمال اور کثیر النفع اُستاد کے حوالے سے یہی وہ خراج عقیدت و محبت ہے، جو باتوفیق طلبہ بہ خوشی ادا کیا کرتے ہیں اور یہی ایک ایسے باتوفیق اُستاد کی اصل شناخت ہے، جو فائدے اور افادے کے لیے پیدا ہوتا ہے اور خدا کی توفیق سے؛ وہ مکمل افادے کی راہ سے بہ خوبی واقف ہوتا ہے۔

منفرد اور باکمال مدرس

سنہ عیسوی کے اعتبار سے ۵۵ سال اور سنہ ہجری کے حساب سے ۵۷ سال اُنھوں نے مسلسل درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا؛ کیوں کہ وہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں دارالعلوم میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعجاز علی امر و ہوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء - ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کی سفارش و کوشش سے مدرس منتخب ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند اور اُس سے منسلک مدرسوں میں پڑھائی جانے والی ساری کتابیں ماسواے فلسفہ کی کتابوں کے، اُنھوں نے ذوق و شوق سے پڑھائیں۔ طویل تدریسی سفر کی وجہ سے اُن

منفرد عالم و مقرر و محدث مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

کی تفہیمی صلاحیتیں دو بالا ہو گئی تھیں۔ مختلف علوم و فنون کی گلیوں میں مسلسل گردش کی وجہ سے وہ اُن کے مزاج آشنا ہو گئے تھے اور اُن کے مضامین، اُن کے خیال و ذہن اور فکر کا حصہ بن گئے تھے؛ اسی لیے اُن کی عام گفتگو میں بھی عالمانہ گہرائی کی چھاپ دکھائی دیتی تھی؛ لیکن وہ اپنے حسن گفتار سے، گہرائی کے باوجود پیچیدگی پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ انھیں خوبیوں کی وجہ سے، علوم کتاب و سنت کی اشاعت میں دارالعلوم کے اُس حقیقت پسندانہ طریقہ کار کی صحیح ترجمانی کا حق رکھتے تھے، جس میں صرف فعالیت ہوتی ہے اور قوالیت اور اِدّعا یت کا کہیں گز نہیں ہوتا۔

لیکن پچھلے سیویں سال سے وہ حدیث شریف کی تدریس کے لیے فارغ ہو گئے تھے، خصوصاً صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی تدریس کے لیے۔ حدیث کی تدریس کے دوران، اُن کی وہ عبقریت و ہمہ گیریت کھل کر سامنے آئی جو وقت کے بے مثال محدث اور علامہ یگانہ ”مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ“ (۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء — ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) کی اولاد ہونے کی وجہ انھیں وراثت میں ملی تھی۔ علامہ کشمیریؒ عرب و عجم کے منتخب علمائے باکمال کے نزدیک نہ صرف اپنے ہم عصروں میں؛ بل کہ بعض اعتبار سے بہت سے علمائے سلف سے بھی بلند پایہ عالم دین اور ممتاز محدث تھے۔ مولانا انظر شاہؒ بہت سی خوبیوں میں اپنے عظیم والد کی شبیہ تھے۔ وہ حدیث کی تدریس میں بھرپور تحقیق و تدقیق، زبردست مطالعے اور انتہائی چھان بین کے ہتھیار سے کام لیتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے، جن کی طرف حدیث کا اشتغال رکھنے والے پرانے لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہو پاتا۔ تدریس حدیث میں اُن کی فن سے مناسبت، اُس سے غیر معمولی دلچسپی، اُس کا بے انتہا شوق اور درایت و روایت، متن و سند، الفاظ و معانی اور عبارت و اشارت و دلالت کے حوالے سے؛ اُس پر دست رس ہر طرح عیاں ہوتا تھا۔ وہ ان خوبیوں کی وجہ سے حدیث کے بھی علمائے نام دار میں شمار ہوتے تھے اور اِس تعلق سے اُن کی ہر جگہ بہ جا طور پر شہرت ہو گئی تھی، جیسا کہ وہ اپنے غیر معمولی مختلف

الانواع کمالات کی بنا پر بڑے صغیر کے ممتاز ترین علما میں تھے۔ بہ ہر صورت، بہ حیثیت محدث اُن کا اُٹھ جانا بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہے؛ کیوں کہ بڑے صغیر کے یہ بے شمار مدارس، علما کی کھیپ کی کھیپ پیدا کرنے کے باوجود، فنِ تدریس بالخصوص علومِ عالیہ: تفسیر و حدیث اور فقہ کے ہنرمند اور پختہ کار اساتذہ کو ہمہ وقت چراغ لے کر ڈھونڈ رہے ہیں، خصوصاً فنِ حدیث پر قابو رکھنے اور صحیح ڈھنگ سے اُس کی تدریس کا ملکہ رکھنے والے علما تو شاذ و نادر ہی ملتے ہیں؛ اس لیے کہ تدریس میں پختہ کاری کے حصول کے لیے، جس سکون، محویت، انہماک اور مادی حرص و ہوس سے بہ قدرِ ضرورت کنارہ کشی کی ضرورت ہے؛ وہ اِس وقت غنفاً ہوتی جا رہی ہے؛ کیوں کہ مادیت اِس وقت گویا منہ کھولے کھڑی ہے اور ”مخلصوں“ کو بھی اپنا لقمہ بنائے لے رہی ہے، ریاکار اور وسیع تر اسلامی خدمت کے قافلے سے منسلک غرض پسند افراد کی بات تو جانے ہی دیجیے کہ اسلامی محاذ کو اصل خطرہ اسی طرح کے لوگوں سے ہے؛ کیوں کہ کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرہ نہیں ہوا کرتا؛ اِس لیے کہ وہ مرنی ہونے کی وجہ سے بہ آسانی مار کھا جاتے ہیں؛ کیوں کہ اسلامی محاذ کے سپاہیوں کے لیے اُن سے محتاط رہنا اور اُن پر یک بارگی وار کرنا آسان ہوتا ہے۔

پر جوش و ولولہ انگیز خطیب

میرے ذہن کے پردے پر اُن کی ایک اور تصویر ابھری کہ وہ کسی بڑے جلسے میں مصروفِ خطابت ہیں اور اپنے پر جوش خطاب، لذیذ و عزیز شیریں بیانی، پُرکشش اندازِ بیان، منفرد اندازِ گفتار، گونج دار آواز، بھرپور معلومات سے جلسے پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ میری طالبِ علمی کے زمانے میں نہ صرف دارالعلوم؛ بل کہ بڑے صغیر کے یکتاے زمانہ پر جوش خطیبوں میں سے ایک تھے۔ وہ جس جوش و جذبے سے بے تکلف بولتے، اُسی جوش و جذبے کی حالت میں ہمیشہ اچانک اپنی تقریر؛ کسی تمہید کے بغیر ختم کر دیتے۔ اِس

سلسلے میں وہ بالکل یکتا اور بے مثال تھے، میں نے اس حوالے سے کسی کام یاب اور باتو فیق مقرر کو ان جیسا دیکھا نہ سنا۔

اُن کے ہاں بہت سے جملے بالکل نئے اور خود ساختہ ہوتے، لہجہ کی انفرادیت، اندازِ تکلم کا نرالا پن، مواد کا نیا رنگ و آہنگ، بات کہنے کا سارا لب و لہجہ؛ بالکل جداگانہ ہونے کی وجہ سے بہت سے طلبہ اُن کے اندازِ خطابت و القا کی نقل کرتے رہتے تھے، ناچیز بھی اُنھی طلبہ میں سے ایک تھا۔ بہت سے طلبہ تو اُن کی اتنی کام یاب نقل اتار لیتے تھے کہ طلبہ کی ایک تعداد اُن کی ”نقلی تقریریں“ سن کے، کمروں سے نکل پڑتی تھی کہ دیکھیں شاہ صاحب کہاں بول رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔

جس جلسے میں اُن کی شرکت کی خبر مشتہر ہو جاتی، اُس میں سننے والوں کی بھیڑ دیدنی ہوتی تھی، کسی جلسے میں اُن کی شرکت، جلسے کی کام یابی کی یقینی دلیل ہوتی تھی، جب کہ کسی وجہ سے کسی ایسے جلسے میں اُن کی عدم شرکت بڑی مایوسی اور اُس کی ناکامی کا سبب ہوتی تھی، جس میں اُن کی شرکت کی خبر گرم ہوتی تھی اور وہ کسی ناگزیر سبب سے اُس میں شرکت نہیں کر پاتے تھے۔

وہ قدرتی مقرر تھے، اُن کے ہاں آمد ہی آمد ہوتی تھی، آورد کا دور دور تک گزرنے نہیں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ریاضت، مشق اور محاکات کے ذریعے تقریر نہیں سیکھی تھی۔ ہاں طویل عرصے تک، جوانی سے ادھیڑ عمری اور سن رسیدگی کے فاصلے پر پھیلا ہوا ہے، مسلسل اور بے پناہ تقریروں نے اُن کی زبان کو مانجھ کر، اُنھیں انفرادیت کے زیور سے آراستہ کر دیا تھا؛ اس طرح وہ اس وسیع و عریض ملک میں اپنے رنگ و ڈھنگ کے بے بدل خطیب بن گئے تھے اور علم و ہنر کے بہت سے میدانوں میں اپنے گہرے نقوش کے ساتھ ساتھ، وہ اس میدان کے بھی نہ صرف شہ سوار تھے؛ بل کہ وہ تاحیات ”محبوب ترین قادر الکلام“ مقرر کی حیثیت سے ہی مشہور و معروف رہے؛ اسی لیے وہ اس میدان میں بھی نہ پُرا ہونے والا خلا چھوڑ گئے ہیں، بالخصوص اس زمانے میں جو دین و عقیدہ اور

دعوت کے حوالے سے عبقریوں سے خالی ہوتے چلے جانے کے تعلق سے ہی جانا جاتا ہے، چنانچہ قد آور علمائے گرامی کے مسلسل اٹھتے جانے کے بعد، دور دور تک اُن کا اپنے اپنے میدان میں کوئی بدل نظر نہیں آتا، گویا اس وقت امت مسلمہ آسمان سے گر کر کھجور پر بھی نہیں اُٹک رہی، بل کہ سیدھی زمین پر گر رہی ہے۔

بلند پایہ اہل قلم

نیز وہ اردو کے بلند پایہ اہل قلم تھے۔ اُن کی زبان پر شکوہ ہونے کے ساتھ ساتھ، نئی نئی ترکیبوں اور خوش نما ساختیات سے بھری پُری ہوتی تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں زیادہ تر اپنے تراشے ہوئے جملے استعمال کرتے، جو روانی، شیرینیت اور جمال کا پیکر ہوتے تھے۔ وہ زندگی کے اکثر میدانوں میں نقالی و محاکات اور ”دوسروں سے مانگنے“ کے رویے سے بے نیاز تھے، اُن کی تحریر میں یہ رنگ بے نیازی زیادہ نمایاں تھا؛ لہذا اُن کی تحریریں اپنے بانک پن کی وجہ سے بڑی پرکشش اور طرح دار ہوتی تھیں، جیسے سامعین اُن کی تقریروں سے بے پناہ محظوظ ہوتے تھے، اسی طرح قارئین اُن کی تحریروں سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے، جن میں خیال کی ندرت، زبان کی بلاغت، ترکیبوں کی فصاحت، طرزِ ادا کی سحر کاری اور پیرایہٴ بیان کے تنوع اور ہمہ گیریت کی وجہ سے، ہر لمحہ ایک نئی لذت محسوس ہوتی اور قاری کسی قدم پر اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہم ان شاء اللہ، اس مضمون کے اواخر میں اُن کی کتابوں اور تراجم کی ایک فہرست ثبت کریں گے، جس سے مضامین و مقاصد کے تنوع کا اندازہ کیا جاسکے گا۔ ان کے متنوع الاغراض مضامین بھی کثرت سے شائع ہوئے اور ملک کے اہم اور تعمیری و باوقار رسالوں و اخبارات نے انھیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

مولانا متعدد در سالوں کے سرپرست اور چیف ایڈیٹر بھی رہے، جیسے ماہ نامہ ”ہادی“ جو ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۵ء - ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء کے عرصے میں نکلا اور بند ہو گیا۔ ماہ

منفرد عالم و مقرر و محدث مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

نامہ ”نقش“ یہ رسالہ ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء — ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں دیوبند سے شائع ہوتا رہا تھا۔ پندرہ روزہ ”یثرب“ جو دیوبند ہی سے ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء — ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء کے درمیان شائع ہو کر بند ہو گیا۔

وہ نہ صرف زود نویس ہوتے ہیں؛ لیکن دوسروں کو بہ سرعتِ املا کرانا مشکل ہوتا ہے اور دونوں پر بہ یک وقت قدرت تو شاذ و نادر ہی کسی کو ہوتی ہے۔ مرحوم برجستہ دوسروں کو مضامین بول کے لکھواتے تو معانی و الفاظ اور جملوں کی ساختیات میں ذرا بھی کہیں فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے خیالات و معلومات کو از خود لکھنے اور دوسروں کو املا کرانے میں بلا کی مہارت رکھتے تھے۔

بہ حیثیت سیاست داں

علمی و تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ، انھوں نے ضرورت کی حد تک سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس شغل کو بھی جاری رکھا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سیاست میں بہ قدر ضرورت حصہ لینے کو ناگزیر تصور کرتے تھے؛ کیوں کہ آزادی سے قبل سے ہی عموماً اور آزادی کے بعد خصوصاً ہندی مسلمانوں کو جن پیچیدہ اور گونا گوں مسائل کا سامنا رہا، اُن کے مداوا کے لیے اکثر علما و قائدین کے نزدیک سیاسی راہ پر بہ قدرے ضرورت چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے، اُن کی وابستگی ہمیشہ جمعیۃ علما ے ہند سے رہی، جس کا آزادی وطن میں زبردست قائدانہ رول رہا تھا؛ لیکن بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے، وہ ادھر دسیوں سال سے اُس سے اپنی وابستگی ختم کر چکے تھے؛ لیکن رجحان و خیال کے اعتبار سے اُن کا وہی موقف رہا جو جمعیۃ کار ہا تھا، چنانچہ وہ سیاسی عمل میں بالعموم کانگریس پارٹی کے مؤید اور ہم راے رہے؛ کیوں کہ اُس کا چلک دار سیکولر دستور و موقف ہی ہندوستان جیسے سیکولر

ملک میں، جہاں سیکڑوں مذاہب و خیالات کے لوگ رہتے ہیں اور جہاں کی طاقت و اکثریت ہندو اور صنم پرست ہے، مسلمانوں کے لیے انصاف کی کوئی گنجائش نکل سکتی یا نکالی جاسکتی ہے۔ کانگریس کے دستور کے پچھلے ہونے کے باوجود ہندی مسلمانوں کو اُس کے عملی رویے اور ہندو اکثریت کے لیے جانب دارانہ اور مسلمانوں کے لیے منافقانہ کردار اور عمل کو دیکھتے ہوئے، اس سے آزادی کے ۶۰ سالہ دور میں ہمیشہ بڑی شکایت رہی؛ اسی لیے بہت سے مسلم قائدین، عمل کے بہت سے مرحلوں میں اُس سے اپنی وابستگی برقرار نہیں رکھ سکے، جن میں مولانا انظر شاہ مرحوم بھی تھے، جو اُس سے ایک آدھ دفعہ اتنے ناراض ہوئے کہ مسلمانوں کی کھلم کھلا دشمنی میں بازوؤں کی ہندو سیاسی پارٹی ”بھارتیہ جنتا پارٹی“ — سابقہ جن سنگھ — سے وابستہ ہو گئے؛ لیکن یہ بہت اچھا ہوا کہ بہ جلد انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور دوبارہ کانگریس سے ہی جا ملے۔ کانگریس سے اُن کا تعلق بالعموم غیر رسمی ہی رہا؛ لیکن زندگی کے آخری مرحلے میں وہ یوپی کانگریس کے نائب صدر منتخب کر لیے گئے اور اس طرح وہ رسمی طور پر اُس سے ہم رشتہ ہو گئے۔ یہ رشتہ اُن کی موت پر ہی ختم ہوا۔ چنانچہ اُن کے انتقال پر چوٹی کے کانگریسی لیڈروں نے، اُن کے پس ماندگان، بالخصوص اُن کے فرزند وحید مولانا احمد شاہ خضر کشمیری سے تعزیت کی اور اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

اُن میں چوں کہ خوش اخلاقی و خوش کلامی دونوں صفتیں بہ درجہ اتم تھیں؛ اس لیے چوٹی کے ارباب حکومت اور کانگریس کے بلند پایہ زُعماء سے، اُن کے اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے، جن کو انھوں نے مدارس اسلامیہ اور خود اپنی ذات کے لیے بہت سلیقے سے استعمال کیا، جس کا ملت کو بعض دفعہ دور رس فائدہ ہوا۔ ادھر کئی سالوں سے صلیبیت و صہیونیت کی گہری دوستی؛ بل کہ دونوں کے شیر و شکر اور یک جان و دو قالب ہو جانے کی وجہ سے پوری دنیا میں بالخصوص ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے امریکہ کے عالمی تجارتی مرکز کے دھماکے سے اڑائے جانے کے ڈرامے کے بعد، جو اسلام و مسلمانوں کے خلاف سوچی

منفرد عالم و مقترر و محدث مولانا سید انظر شاہ شمیریؒ

سمجھی اسکیم کو بہ عجلت و بہ حکمت رو بہ عمل لانے کے لیے، صہیونیوں نے صلیبیوں کے تعاون سے کیے اور کرائے تھے، ہر طرف اسلام و مسلمانوں کو گھیرنے، انھیں ہر سطح پر ستانے اور دہشت گرد قرار دے کر، عبرت ناک سزائیں دینے اور جان و مال، عقیدہ و شعائر کی سطح پر بھرپور نقصان پہنچانے کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، اُس میں عالمِ عربی یقیناً نمبر ایک میدانِ کار ہے؛ لیکن سارے اسلامی ممالک اور جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی پائی جاتی ہے، وہاں بھی مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کیے جانے کا عمل زور شور سے پیا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں، جہاں ہم نے ایک ہزار سال تک حکومت کی اور خون پسینے کے ساتھ ساتھ عقل و خرد، فکر و نظر کی ساری توانائیوں کو نچوڑ کر، ہم نے اِس کی زلفِ برہم کو سنوارا، ہندو اکثریت کے انتہا پسند اور فرقہ پرست جو حکومت کی ساری مشینری میں، پوری طرح ذخیل ہو گئے ہیں، صہیونیوں سے ساٹھ گانٹھ کر کے، مسلمانوں کو ہر سطح پر نقصان پہنچانے کے لیے، یہی دہشت گردی کا ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف حکومت کے زبردست اور بھرپور نظام کو حرکت میں لانے کے لیے، مسجد، مندر اور عوامی جگہوں، نیز اہم حکومتی حساس اداروں میں دھماکے کرتے ہیں اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر مٹھ کر، مسلم نوجوانوں کو بلا دلیل پکڑ کر انھیں ہمیشہ کے لیے جیل میں ڈال کر، اُن کی ہڈی پسلی توڑتے اور انھیں چنی اور جسمانی سزائیں دے کر، اپنی موت آپ مر جانے پر آمادہ کرتے ہیں یا پولس سے مصنوعی مقابلہ اور مڈ بھیڑ دکھا کر جان سے مار ڈالتے ہیں۔

اِس سلسلے میں مدارسِ اسلامیہ کو زیادہ بدنام کیا جا رہا ہے؛ اِس لیے کہ یہی دینی سرچشمے ہیں، دین کے سارے سوتے یہیں سے اُبلتے ہیں اور دینی اور عقائدی کھیتوں کو سیراب کر کے اُس کو سرسبز اور پھل دار بنائے رکھتے ہیں؛ اِس لیے صہیونیوں اور صلیبیوں کے اشارے پر انھیں بہ طور خاص نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اِن حالات میں، جہاں دگر قد آور اور ذی اثر علمائے اپنالائق شکر کردار ادا کیا، وہیں مولانا انظر شاہؒ نے بھی اپنی زبان،

اپنے اثر و رسوخ اور اپنی مؤثر شخصیت سے بعض دفعہ بہت نتیجہ خیز کردار نبھایا۔

بے نظیر خوبیاں

مولاناؒ اپنی ان ساری خوبیوں کے ساتھ، انتہائی ہنس مکھ، مرنجا مرنج، انسیت شعار اور مانوس کر لینے والے انسان تھے۔ وہ وقت کے دراز قد عالم تھے؛ لیکن اُن میں علمی طغیانیہ، احساسِ علم سے پیدا شدہ ایک خاص قسم کا غرور اور اپنے بڑا عالم ہونے کا زائد از ضرورتِ احساس نہیں تھا۔ یہ ایسی خوبی ہے، جو بہت سی خامیوں کو چھپالیا کرتی ہے اور اس کے بغیر ساری علمی خوبیوں اور کمالات پر پانی پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی بہت علم دے؛ لیکن اُس کا بے جا احساس نہ دے۔ مولاناؒ کبھی بھی ترش رو نہیں دیکھے گئے، نہ انھوں نے کسی پر علمی دھونس جمایا۔ وہ اپنے سے کم علم اور کم عمر کے ساتھ بھی، بڑائی کا رویہ نہیں اپناتے تھے؛ بل کہ اس طرح کھل کر ملتے تھے کہ مشاہیر علما عموماً چھوٹوں سے اس طرح نہیں ملتے۔ اسی کے ساتھ وہ میزبانی کے آداب کو برتنے کی خاص مہارت رکھتے تھے، وہ مہمانوں سے نہ صرف کھانے کے لیے اصرار کرتے؛ بل کہ از خود دسترخوان پر پُچنے ہوئے کھانوں کو اُن کی طرف بڑھاتے اور اُن کی پلیٹوں میں ڈالتے یا ہاتھ سے اُنھیں دیتے۔ یہ عربوں کا طریقہ ہے، اس سے مہمانوں کو کھانے میں حجاب نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ مہمان نواز تو ہوتے ہیں کہ دسترخوان پر ڈھیر ساری چیزیں جمع کر دیتے ہیں؛ لیکن مہمان کھائیں نہ کھائیں، وہ اُن سے کوئی اصرار نہیں کرتے، گویا اُن کا مقصد مہمانوں کے سامنے کھانے کی نمائش تھی، جو ہو چکی، اب وہ کھائیں نہ کھائیں، اُن کی بلا سے۔ مولاناؒ بڑے مجلسی بھی تھے، اُن کی مجلس عشا بعد منعقد ہوتی تھی، جس میں اساتذہ کے علاوہ شہر کے مختلف انخیال لوگ بھی جمع ہوتے اور دین و دنیا کی بے تکلفانہ باتیں ہوتیں۔ مولاناؒ اپنی بے پناہ معلومات اور تجربے کی روشنی میں اُن میں بھرپور حصہ لیتے اور حاضرین کی معلومات اور تجربے میں اضافہ کرتے۔

خردوں کی بے مثال حوصلہ افزائی

اُن کے گھر اور ہم لوگوں کی رہائش گاہ ”افریق منزل قدیم“ کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ ہے؛ لیکن اپنے اپنے مشاغل کی وجہ سے، اُن سے کبھی بکھار ہی ملاقات ہو پاتی تھی؛ لیکن جب بھی اچانک ملاقات ہوتی، تو استاد ہونے کے باوجود، سلام کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کرتے اور حسبِ معمول مسکراہٹ کے ساتھ کوئی جملہ چست کرتے ہوئے خبر خیریت دریافت کرتے۔ اُن کے اندازِ گفتگو میں بلا کی شیرینی اور انسیت ہوتی۔ خشکی، کھر دراپن اور نپے تلے انداز سے وہ قطعاً نا آشنا تھے۔ اُن کے خمیر میں الفت اور انسانیت کے بے پناہ عناصر کی آمیزش تھی۔ ظرافت، مزاح، خوش طبعی، حسنِ گفتار، خوش لباسی اور ہر بات میں ذہانت کی تراوش اُن کا امتیاز تھی۔

گذشتہ ۱۵ سال کے عرصے میں اس راقم نے عربی کے ساتھ ساتھ، اردو میں بھی لکھنا شروع کیا، اس سے پہلے میں صرف عربی میں لکھتا تھا، اردو کے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا؛ لیکن برصغیر میں عصرِ حاضر کے عربی زبان کے سب سے بڑے خادم و معلم حضرت الاستاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی نور اللہ مرقدہ (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۳۰ء — ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کی وفات سے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اُس نے میرے قلم کو اردو میں لکھنے کے لیے بری طرح مجبور کیا اور میں نے اُن پر صرف چند روز بعد ”وہ کوہ کن کی بات“ کے عنوان سے ایک تاثر اُتی کاوش شائع کی، جو توقع سے زیادہ مقبول ہوئی اور علما و طلبہ نے اتنا پڑھا کہ عصرِ حاضر میں کوئی سوانحی نقش شاید اتنا نہیں پڑھا گیا ہوگا۔ میں نے دگر علما و اساتذہ کی طرح مولانا کے پاس بھی اپنے بعض عزیزوں کے ذریعے اُس کا ایک نسخہ بھجوایا۔ اُنھوں نے کتاب دیکھ کر نہ صرف بے حد خوشی کا اظہار کیا؛ بل کہ ٹیلیفون پر کتاب کے ظاہر و باطن کی بہت تعریف کی، شان دار طباعت، بہت اچھے کاغذ، معنی خیز ٹائٹل اور مضامین کتاب کی خوبیوں کی کھل کر داد دی۔ بعد میں

میرے شاگردوں نے بتایا کہ کئی مجلسوں میں اُنھوں نے کتاب کے محاسن کو سراہا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے کسی ”احتیاط“ کو راہ نہ دی؛ ورنہ بڑے لوگ عموماً چھوٹوں کو سراہتے وقت بھی ”احتیاط“ کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بعد میں، میں نے جتنی ٹوٹی پھوٹی تحریریں شائع کیں، مولانا کون کا ایک ایک نسخہ روانہ کرتا رہا اور اُن کی حوصلہ افزائی و استحسان کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ بعض دفعہ اُن کے تبصروں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے مشغول ترین اوقات میں سے، مجھ جیسے خردوں کی تحریریں پڑھنے کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتے ہیں اور سرسری نگاہ ڈالنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ واقعی وہ بہت سے معنوں میں بڑے تھے؛ ورنہ بڑوں کے پاس چھوٹوں کی چیزوں کے پڑھنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ہوتا۔ اس سے اُن کی علم نوازی و علما نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خود اعتمادی

مولانا میں ایک ممتاز خوبی اُن کی خود اعتمادی تھی، جو اُن کے مواقف اور افکار و خیالات میں نمایاں ہوتی رہتی تھی؛ اس لیے بعض دفعہ اُن کے ہم مسلک علما بھی اُن کی راے سے اختلاف کرتے تھے؛ کیوں کہ مولانا کسی موقف اور راے کے حوالے سے، کسی سے بہت زیادہ مشورے اور تادیب تبادلاً خیال کے قائل نہ تھے، اپنے تجربے اور اپنی سوچ کے مطابق کسی بھی مسئلے میں اپنا موقف اور اپنی راے قائم اور ظاہر کر دیتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی راے اور موقف کے تعلق سے مفادات و اغراض کے غلام نہ تھے؛ کیوں کہ جو آدمی اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے وہ کسی راے اور موقف کے تعلق سے دائیں بائیں دیکھنے اور اُن کی اُن کی سننے اور اُن کی مرضی کے مطابق راے قائم کرنے کا عادی ہوتا ہے، مولانا اس طرح کے نہ تھے، وہ اپنی ذات و افکار پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی نظریے اور راے کو بہت پکانے اور طویل غور و فکر کے بعد کوئی راے قائم کرنے قائل

نہ تھے، وہ فی البدیہہ بولنے کی طرح فی البدیہہ راے قائم کر لیتے تھے۔ اس کی واضح مثال حکومت کی طرف سے ۲۰۰۷ء/ ۱۴۲۸ھ میں ”مدرسہ بورڈ“ قائم کرنے کے اقدام کی اُن کی طرف سے کھلی ہوئی تائید تھی۔ حکومت نے اس سلسلے میں ماضی کے دگر اقدامات کی طرح، اس حوالے سے بھی خوب سبز باغ دکھائے تھے کہ اس بورڈ سے ملحقہ مدارس کے فضلا کو ڈھیر ساری سرکاری سہولتیں ملیں گی اور مدرسوں کو بے شمار فائدے حاصل ہوں گے، جن میں دہشت گردی کے تعلق سے اُن کی براءت کی تصدیق بھی ہوگی؛ اس لیے مولانا نے اس کی تائید و توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم اپنے تشخص کو باقی رکھتے ہوئے، ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں اور نوجوانوں کے لیے فائدہ اٹھانے کی راہ ہم وار کر دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن دگر مسالک کے بہت سے علما اور دیوبندی مکتبہ فکر کے تقریباً سارے علما نے حکومت کے اس اقدام کی نہ صرف مخالفت کی؛ بل کہ مدارس کے معاملات میں دخل اندازی اور اُن کی آزادی کو سلب کرنے کے لیے راستہ وا کرنے کی سازش باور کرتے ہوئے، اس کو بالکل مسترد کر دیا؛ کیوں کہ ان مدارس کا اصل کردار وسیع تر اسلامی محاذ کی پہرہ داری ہے، حکومت اپنے اس اقدام کے ذریعے اُن کے اس کردار کو ختم کر دینے کی دور رس پالیسی پر عمل کر رہی ہے؛ کیوں کہ ماضی میں بھی اُس نے مختلف حیلوں بہانوں سے اسلامی سوتوں کو خشک کرنے کی کوشش کی ہے، جن سے بہ ظاہر کوئی خطرہ شروع شروع میں محسوس نہیں کیا گیا۔

مولانا سے ایک یادگار ملاقات

جمعہ ۱۸/ شوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۰/ نومبر ۲۰۰۶ء کو دارالعلوم دیوبند کے موقر استاذ مولانا ریاست علی صاحب قاسمی کے صاحب زادہ خرد مولوی سعدان قاسمی سلمہ کی تھانہ بھون میں شادی کی تقریب کے موقع سے ہم لوگ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء — ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے وطن تھانہ بھون

کے ریلوے اسٹیشن سے متصل حضرت تھانویؒ کے مہمانوں کے لیے بنائے ہوئے عارضی مہمان خانے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا کشمیری کی نشست کے بغل ہی میں یہ ناچیز بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اُن کے گرد بہت سے لوگ اُن سے محو گفتگو تھے، جیسے ہی اُن کی نظر میرے اوپر پڑی مسکراتے ہوئے فرمایا: برادر عزیز! چلو ہم ایک طرف کو بیٹھ کر کچھ محبت کی باتیں کریں، اُن کی فرمائش کے مطابق ہم دونوں وہیں پڑی کرسیوں پر ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ مولانا کے چہرے مہرے سے نحافت، شیخوخت اور ماہ و سال کی گردشوں کے آثار نمایاں تھے، وہ کسی عم زدہ عندلیب کی طرح اپنے اندرونی غم و الم اور آہ کو آشکارا کر رہے تھے، بہت سی باتوں کے ساتھ فرمایا: برادر! میں اب زندگی کے بے پناہ بوجھ سے تھک ہار سا گیا ہوں، یہ مسلسل اسفار، تقریروں، ملاقاتوں اور شہروں اور قریوں کی گشت سے بھی اکتا سا گیا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اب بعض اُن علمی کاموں کے لیے فارغ ہو جاؤں جنہیں میں زندگی کے آخری اسٹیشن کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُن کی بات کے تسلسل کو کاٹتے ہوئے عرض کیا: ”حضرت! آپ سن سال کی پختگی کو پہنچ چکے ہیں، آپ کے چہرے پر اُس کے اثرات عیاں ہیں، خدو خال سے طبعی مکان چھلکی پڑ رہی ہے، سچ یہ ہے کہ مجھے آپ کے بڑھاپے پر رحم آرہا ہے، میں ایک خرد ہونے کے ناطے آپ سے گزارش کرنا چاہوں گا کہ آپ واقعی دیوبند میں بیٹھ جائیے، جامعہ انور کو اپنی تصنیفی و دعوتی تحریک کا مرکز بنا لیجیے، آپ بہت چل پھر چکے، بہت تقریریں کر چکے، شہروں اور قریوں کا کونا کونا چھان چکے، اب ضرورت ہے کہ سانس لینے کو بیٹھ جائیں اور زندگی کی باقی منزلوں کو علمی و تالیفی و دعوتی کاموں کے لیے وقف کر دیں، یہ تقریروں اور دوروں سے زیادہ دیر پا اور تعمیری کام ہے۔ کیا بہتر ہوتا کہ آپ اپنی جامعہ کی مسجد میں رمضان میں اعتکاف و قیام کرتے اور آپ کے ساتھ ایک قافلہ، دین و دعوت کے کام پر محو سفر ہوتا۔ بیرون ملک و اندرون ملک کے اسفار کے لیے آپ اپنے خردوں کو مکلف کر دیجیے۔ ماہ رمضان میں تو آپ سفر سے ضرور ہی

منفرد عالم و مقرر و محدث مولانا سید انظر شاہ میری

احتراز رکھیں، اس سے لوگوں کو بھی بہت فائدہ ہوگا۔

حضرت نے میری باتوں کو جو ایک خرد کی بزرگ کے تئیں بہت بڑی جرأت تھی، بہت غور سے سنا۔ اُن کی یہ خوبی تھی کہ وہ اچھا بولتے بھی تھے اور دوسروں کو اچھی طرح سنتے بھی تھے؛ ورنہ عموماً قادر الکلام لوگوں میں دوسروں کو سننے کی عادت نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے میری بات سننے کے بعد فرمایا: میں خود بھی ادھر کچھ دنوں سے اسی طرح کی بات سوچ رہا ہوں، اب میرا فیصلہ ہے کہ مجھے اسی پر عمل کرنا ہے۔ اُنھوں نے واقعاً آئندہ رمضان سے اپنی جامعہ کی مسجد میں اعتکاف و قیام اور رمضان میں دیوبند سے کہیں نہ جانے کا قطعی پروگرام بنالیا، جس سے اُن کے مخمیں و تلامذہ کو بے حد خوشی ہوئی۔

مرض الموت اور وفات

اس کے بعد ہی رمضان میں اُنھوں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا ہی تھا کہ اُن پر مرض کا شدید حملہ ہوا، بعد میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ جگر اور گردے کی خرابی کا اثر ہے، اُنھوں نے ہر طرح کا علاج دودا کیا، جس میں انگریزی اور یونانی دونوں طرح کے اچھے سے اچھے معالجین کا مشورہ شامل رہا، وہ دیوبند سے باہر بالخصوص دہلی اور بعض دفعہ بیرون ملک بھی علاج کے لیے جاتے رہے۔ اس اثنا میں عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ دارالعلوم وقف کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ بھی عیادت کو جاتے رہے، یہ ناچیز بھی کئی بار شرف عیادت سے ہم کنار ہوا۔ مولانا اِس زمانے میں بھی لوگوں کی خوب ضیافت کرتے اور دینی و علمی موضوعات پر تبادلہ خیال بھی۔

بعض اوقات اُنھیں کچھ افاقہ محسوس ہوتا، تو وہ دارالعلوم وقف میں تدریس کے لیے بھی تشریف لے جاتے۔ جمعہ یکم محرم ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۱ جنوری ۲۰۰۸ء کو اُنھوں نے دارالعلوم وقف کے کتب خانے کی عمارت کے افتتاح کے موقع سے تقریر بھی کی، جو اُن

کی زندگی کی آخری تقریر ثابت ہوئی؛ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اُن کی طبیعت خاصی بگڑ گئی۔ وفات سے دو ایک ماہ قبل ہی مرض کی شدت کے آثار اُن کے چہرے پر منعکس ہو گئے تھے، رنگ بھی اُن کا تبدیل ہو گیا تھا، نفاہت بھی جسم سے عیاں تھی۔ اُن کی یہ حالت ہم لوگوں کے لیے بڑی افسوس ناک تھی؛ کیوں کہ وہ انتہائی پھرتیلے، چست اور سرگرمی کی فطرت کے حامل تھے؛ لیکن ہم لوگوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں اور اُن کی زندگی اچانک ”وقفہ تائمہ“ کا شکار ہو جائے گی، ایک صاحب نے بہت اچھی بات کہی کہ: ”مولانا کی موت سے ایسا لگا کہ وہ مذاقاً اچانک رخصت ہو گئے“، ایک صاحب نے بہت دل چسپ انداز میں کہا کہ: ”وہ اپنی تقریر کو انتہائی جوش کے وقت ہی اچانک اس طرح ختم کر دیتے تھے کہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ تقریر ختم کرنے والے ہیں، اسی طرح ایسا لگا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے سفر کو بھی اچانک ختم کر دیا۔“

شنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ = ۱۲ اپریل ۲۰۰۸ء کو اُن کے مرض نے پھر شدت اختیار کر لی، لہذا انھیں دہلی لے جایا گیا اور دہلی کے ”گنگارام“ ہسپتال کے سخت نگہداشت والے یونٹ میں انھیں رکھا گیا، ہر طرح کے اچھے سے اچھے علاج کے باوجود، اُن کی طبیعت سنبھل نہ سکی اور بالآخر شنبہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶ اپریل ۲۰۰۸ء کو جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ایک بجے دن میں اُن کی نعش دہلی سے روانہ ہوئی اور ۵ بجے دیوبند پہنچی۔ تجھیز و تکلفین کے بعد ۷ بجے دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث تحتانی میں اُن کا جنازہ دیدار کے لیے رکھا گیا اور دس بجے شب میں ممتاز مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم دارالعلوم وقف نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں علما و طلبہ و عوام نے شرکت کی۔ ۱۱ بجے شب میں اپنے عظیم والد علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے۔

آسمان اُن کی لحدِ شہنم افشانی کرے۔

ع

مختصر سوانحی نقوش

✽ پیدائش: شنبہ ۱۲ شعبان ۱۳۴۷ھ - ۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

✽ جاے پیدائش: ”شاہ منزل“، محلہ خانقاہ، دیوبند۔

✽ علمی و تدریسی سفر: پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عصری تعلیم کی مختلف قسم کی ڈگریاں حاصل کیں، پھر عربی تعلیم از اوّل تا آخر دیوبند میں حاصل کیا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا محمد اعزّی امر وہوئی (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء - ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) جن کی اُن کی دینی تعلیم و تربیت میں خصوصی توجہ رہی تھی کی سفارش سے ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں دارالعلوم میں مدرّس ہوئے۔ اس وقت سے ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء تک دارالعلوم میں فلسفہ کے سوا ہر فن کی کتاب پڑھائی۔ دارالعلوم میں تقریباً ۴۰ سال تک صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی جلد ثانی پڑھائی۔ اسی دوران دارالاقامہ کے ناظم اعلیٰ، مددگار ناظم تعلیمات پھر ناظم تعلیمات اور قائم مقام مہتمم بھی رہے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء مطابق ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۲ھ کو دارالعلوم میں دوسری انتظامیہ کی عمل داری قائم ہوئی، اس سے قبل دو سال تک دارالعلوم فتنہ و فساد کے دور سے گزرا، جس میں تعلیمی و انتظامی عمل درہم برہم رہا۔ چونکہ مولانا کشمیریؒ انتظامیہ کی اس تبدیلی کے مؤید نہ تھے، اس لیے انھوں نے شروع سے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ کے ساتھ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء - ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کی سرپرستی میں جامع مسجد دیوبند میں دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کر لیا۔ کئی سال بعد یہ دارالعلوم عید گاہ دیوبند کے جنوب مغرب میں وسیع قطعہ اراضی پر نو تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہو گیا، مولانا کشمیریؒ نے اس کی تعمیر و ترقی میں بڑی دلچسپی لی، اس دارالعلوم میں رسمی طور پر وہ شیخ الحدیث تھے، لیکن عملاً وہ اس کے فعال منتظم بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں اُن سے ۱۶۵ طلبہ نے بخاری و ترمذی پڑھی، جب کہ دارالعلوم وقف میں

۳۱۸ طلبہ نے اُن سے ان کتابوں کا درس لیا۔

✽ ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء میں انھوں نے دارالعلوم وقف ہی کے بغل میں ”معجد انور“ کے نام سے (جو بعد میں جامعہ امام انور سے موسوم ہوا) ایک الگ ادارہ قائم کر لیا؛ لیکن دارالعلوم وقف میں اُن کا شیخ الحدیث کا

عہدہ برقرار رہا، مہند انور کو انھوں نے بڑی محنت، جستجو اور شوق سے ترقی دی۔ یہاں سے ۲۰۰۱ء سے ”صحف عصر“ کے نام سے ایک ماہ وار رسالہ بھی جاری کیا، جس کے وہ سرپرست اور عملی مدیر بھی تھے، ادارہ وہ خود لکھتے تھے اور اُن کے اسفار و تقاریر کی رپورٹیں بھی اس میں شائع ہوتی تھیں، اس مدرسے میں انھوں نے ایک خوب صورت مسجد اور ایک ہال بھی تعمیر کیا۔ یہاں کی ابتدائی و متوسط تعلیم کی اچھی شہرت کی وجہ سے، طلبہ کا اس کی طرف رجوع عام ہوا۔ اُن کی وفات کے بعد یہ مدرسہ حسب سابق سرگرم کار ہے اور اُن کے فرزند ارجمند مولانا احمد شاہ خضر کشمیری اپنے عظیم خاندان کے موروثی صفات کی وجہ سے خوب صورتی سے اس کو نہ صرف چلا رہے ہیں بلکہ والد کے چھوڑے ہوئے سارے کاموں اور اُن کے دیکھے ہوئے خوب صورت خوابوں کی تعمیر و تکمیل میں جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔

تصنیفات

- ۱:- تقریر شاہی (اردو) تفسیر قرآن۔
- ۲:- اسمائے حسنیٰ کی برکات (اردو) قرآن وحدیث۔
- ۳:- الفیض الجاری (عربی) حدیث۔
- ۴:- تراجم ابواب (عربی) اردو) حدیث۔
- ۵:- تفردات کشمیری (اردو) حدیث۔
- ۶:- لالہ وگل (اردو) شخصیات۔
- ۷:- نقش دوام (اردو) سوانح۔
- ۸:- تذکرۃ الاعزاز (اردو) سوانح۔
- ۹:- خطبات کشمیری (اردو) تقاریر۔
- ۱۰:- فروغِ سحر (اردو) تقاریر۔
- ۱۱:- گل افشانی گفتار (اردو) تقاریر۔
- ۱۲:- ربینا (عربی) اردو) ادعیہ۔
- ۱۳:- فردوس درود و سلام (اردو) ادعیہ۔
- ۱۴:- فردوسِ صلاۃ و سلام (عربی) اردو) ادعیہ۔

تراجم از عربی و فارسی در اردو

- ۱:- تعلیم المعلم (عربی سے اردو)
- ۲:- تفسیر ابن کثیر (// //)
- ۳:- تفسیر مدارک (// //)
- ۴:- تفسیر طحاوی (// //)
- ۵:- تفسیر جلالین (// //)
- ۶:- تفسیر مظہری (// //)
- ۷:- تشریح و توضیح تفسیر حقانی (اردو)

منفرد عالم و مقرر و محدث مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

۸:- تکمیل الایمان (فارسی سے اردو) دینیات و عقائد۔

۹:- کشف الحجابہ (عربی سے اردو) تشریح حدیث۔

✽ عہدے و اعزازات

۱:- تاسیسی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

۲:- سربراہ خیر سگالی وفد برائے حج (از گورنمنٹ آف انڈیا)

۳:- صدر جمہوریہ ایوارڈ (ماہر عربی زبان) برائے سال ۲۰۰۳۔

✽ ازدواجی زندگی

مولانا کشمیریؒ کے تین نکاح ہوئے۔ اُن کی پہلی اہلیہ سے ۲ لڑکے اور ۶ لڑکیاں تولد ہوئیں۔ پہلا لڑکا

”شاہین انور“ ۹ ماہ کی عمر میں فوت ہو گیا۔ دوسرا لڑکا مولانا ”سید احمد خضر شاہ مسعودی“ اور دگر صاحب

زادیاں صاحب اولاد اور حیات ہیں۔ تیسری اہلیہ سے ایک صاحبزادی ”لبنی شاہ“ ہیں۔



پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید محمد اجتبانہ دہلی

۱۳۱۵ھ/۱۹۳۲ء — ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

جو ہر انساں ، عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

امراضِ قلب کے عالمی شہرت کے حامل معالج: ڈاکٹر محمد خلیل اللہ کے ”ہارٹ سینٹر“ میں آپریشن کے بعد، ہارٹ اٹیک کی وجہ سے، عالمِ دین و اسلامی اہلِ قلم پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید محمد اجتبانہ دہلی، جمعہ کے روز، عینِ اذانِ جمعہ کے وقت، ۱۵/۶/۱۴۲۹ھ = ۲۰/۶/۲۰۰۸ء کو، ۶۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی دین و علم، زبان و ادب بالخصوص عربی زبان اور ثقافتِ اسلامی کی بھرپور اور لائقِ ذکر خدمت میں گزاری۔ وہ کئی سال سے دل کی تکلیف میں مبتلا تھے، پچھلے دنوں اُن کے مرض نے شدت اختیار کی، وقتِ موعود آچکا تھا: اس لیے وہ مناسب علاج معالجے کے باوجود بھی جاں بر نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ بالِ بال مغفرت فرمائے اور اپنی اعلیٰ جنت میں اونچے سے اونچا مقام عنایت کرے۔

شبِ جمعہ و شنبہ: ۱۵-۱۶/۶/۱۴۲۹ھ = ۲۰-۲۱/۶/۲۰۰۸ء کو بعد نمازِ مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی جامع مسجد میں، اُن کی نمازِ جنازہ اُن کے فاضلِ برادر زادے مولانا عبید اللہ اسعدی بن مولانا محمد مرتضیٰ مظاہری (متوفی ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء) نے پڑھائی، جس میں عام مسلمانوں کی بڑی تعداد کے ساتھ بہ طورِ خاص دہلی میں مقیم یا

موجود قاسمی و ندوی علما و فضلا، پڑھے لکھے لوگ، مفکرین و دُعاۃ اور اسلامی خدمت کے میدان میں سرگرم حضرات نے شرکت کی، جیسے مولانا اسرار الحق قاسمی، ڈاکٹر محمد منظور عالم، مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی، مولانا عبدالحمید نعمانی قاسمی، مولانا امین عثمانی ندوی، پروفیسر مولانا شفیق احمد خاں ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد ایوب خاں ندوی، پروفیسر اختر الواسع، مولانا قاری محمد سلیمان قاسمی امام و خطیب جامع مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ اور جامعہ ہی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

مرحوم نے پس ماندگان میں ایک لڑکا، تین لڑکیاں اور اہلیہ چھوڑی ہیں۔ اللہ انھیں اور سارے افرادِ خاندان کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا کرے اور تمام محبین و متعارفین کو، اُن کے غم کا بہترین بدلہ دے۔

عربی زبان و ادب کا ایک ممتاز عالم

مولانا محمد اجتہاد ندویؒ، برصغیر میں، عربی زبان و ادب کے ممتاز و منتخب علما میں سے ایک تھے۔ وہ وسیع علم و مطالعے کے ساتھ ساتھ، عالمی حالات و واقعات سے بصیرت مند انداز آگاہی رکھتے تھے۔ وہ اُن چیدہ افراد میں سے تھے، جو ہمہ وقت اسلامی مسائل کی سوچتے اور انھیں کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بد حالی و کس پرہیزی سے بہت ڈکھی رہا کرتے تھے۔ انھیں عالمِ اسلام و عالمِ عرب کی خوشیوں اور تکالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُمتِ مسلمہ کی کم زوری اور اُعدا کے سامنے، اُس کی بے بسی و ہوا خیزی سے دگر سچے داعیوں کی طرح سوختہ جاں و افسردہ دل رہتے تھے۔ اُن کی عربی اور اردو تحریروں میں، اُن کے اسلامی درد کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے عربی اور اردو زبانوں میں براہِ راست بہت کچھ لکھا ہے، مضامین و تحقیقات کے ساتھ ساتھ، دسیوں گراں قدر کتابیں لکھیں، جیسے امام ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے علمی کارنامے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالیؒ اور اُن کے علمی و ادبی کارنامے، مولانا

ابوالحسن علی ندویؒ بہ حیثیت ادیب و داعی، تابندہ نقوش، تاریخ فکرِ اسلامی، شریعتِ اسلامی میں انسانی حقوق، اسلام میں عورت اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی تالیفات، جو ان کے نام کو زندہ اور یاد کو تازہ و تابندہ رکھیں گی اور علم و آگہی کے قدردانوں کی زبانوں سے، انھیں دعائیں دلواتی رہیں گی، ان شاء اللہ۔

مولانا اجتہا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اُن ممتاز فضلا میں تھے، جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وہ مفکرِ اسلام، داعیِ الی اللہ اور عظیمِ اسلامی مؤلف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء — ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی علمی و ادبی، فکری و دعوتی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد، انھوں نے دمشق یونیورسٹی میں پانچ سال گزارے اور شام کی علمی و ادبی فضا سے خوب خوب استفادہ کیا۔ یہ زمانہ وہاں کے چوٹی کے باکمال علما و فضلا کا تھا، جنھوں نے نہ صرف عالمِ عرب کی علمی و ادبی اور دینی و دعوتی فضا کو متاثر کیا؛ بل کہ عالمِ اسلام میں اپنے ایسے جاودا نقوش ثبت کیے، جن کے تذکرے کے بغیر معاصر اسلامی تاریخ کا مطالعہ یکسر نامکمل رہے گا، مولانا اجتہا نے اُن میں سے مَعتمد حضرات کی صحبتوں کا فیض پایا اور اپنے علمی سفر اور دینی و دعوتی تجربے کو کامیاب اور پختہ کر لیا۔

ہندوستان واپس آ کر انھوں نے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا، جہاں سے عربی زبان میں امتیازی نمبرات سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ اُس کے بعد انھوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اور ملک کی کئی ایک مرکزی یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب اور اسلامی مضامین کے پروفیسر اور متعلقہ شعبوں کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف اپنی عظمت کو تسلیم کرایا؛ بل کہ نسلِ نو کی ایک بڑی کھپ کو فیض یافتہ اور باکمال بنایا۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، آلہ آباد یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی کے علاوہ، جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ نیز جدہ ریڈیو اسٹیشن کے اردو سیکشن کے اناؤنسر اور مترجم کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ انہوں نے ہر جگہ اپنی محبت، نرم خوئی اور دل جوئی کی صفات سے رُفقاءے کار اور منتظمین کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ اسی کے ساتھ وہ ”رابطہ ادب اسلامی“ کے نہ صرف تاسیسی رکن؛ بل کہ اُس کے اہم منتظمین میں سے ایک تھے۔ وہ اپنی ممتاز علمی و ادبی لیاقت اور رسوخ و تجربے کی شہرت کی وجہ سے بیرون ملک، بالخصوص عالم عربی کی یونیورسٹیوں اور علمی و ادبی محفلوں میں محاضرات کے لیے مدعو ہوتے رہتے تھے۔ اندرون ملک وہ عربی زبان و ادب کے وسیع تر خاندان کے اہم رکن شمار ہوتے تھے؛ چنانچہ اس حوالے کی کوئی لائق ذکر تقریب، اُن کی شرکت کے بغیر برپا نہیں ہوتی تھی۔

مرحوم سے راقم کی دید و شنید

مرحوم سے راقم السطور کی دید و شنید بہت دیرینہ تھی، یعنی اُس وقت سے تھی، جب جولائی ۱۹۷۲ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) میں، راقم الحروف دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہوا۔ وہ اُس وقت دارالعلوم سے وابستہ تو نہ تھے؛ لیکن اُن کا وہاں کثرت سے آنا جانا ہوا کرتا تھا؛ کیوں کہ وہ نہ صرف وہاں کے فارغ اور فیض یافتہ تھے؛ بل کہ انہیں اپنی اس درس گاہ سے بہت محبت تھی، نیز یہ کہ وہ وہاں کے دیگر باکمال لوگوں سے استفادے کو اپنی ساری لیاقتوں کے باوجود، سعادت سمجھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اُس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم اور ملک اور عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم دین، نگہ بلند و بخن دل نواز و جاں پر سوز کا رُحبتِ سفر رکھنے والے میر کارواں و عظیم داعی الی اللہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے روحانی و فکری و دعوتی مے خانے میں جام و سبکو کا دور اپنے شباب پر تھا اور دیگر بلا نوشوں کی طرح، انہیں بھی جب بھی موقع ملتا گرتے پڑتے یہاں آپہنچتے اور مقدور بھر بادہ پیمائی سے نہیں چوکتے تھے۔ پھر یہ کہ اُن کے بڑے بھائی

اور اُن کے مربّی و سرپرست مولانا محمد مرتضیٰ مظاہریؒ اُس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ناظم کتب خانہ تھے، تو گویا مرحوم کا بھی گھر یہیں تھا؛ لیکن اُس وقت میں اُنھیں دور ہی سے جانتا تھا، اُن سے متعارف ہونے، اُنھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوئی تقریب کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ خصوصاً اُس لیے کہ میرے روٹینی ”فرائنض“ اُس وقت مجھے بُری طرح مشغول کیے رہتے تھے اور ”مستحبات“ کی طرف توجّہ کی بھی فرصت نہ تھی، چہ جائے کہ اپنے حوالے سے لایعنی اور غیر متعلّقہ اُمور کی طرف جھانکنے کا موقع ملتا۔

میں جب دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۴۰۲ھ / اگست ۱۹۸۲ء میں استاذ و مدیر ”الداعی“ عربی کی حیثیت سے برسرِ عمل ہوا، تو مجھے بار بار دہلی اور دگر علمی جگہوں میں آنے جانے کی مجبوری لاحق ہوئی اور مولانا اجتہاؒ سے وقفے وقفے سے ملاقات کی صورت نکلتی رہی اور اُنھیں اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا۔ اُن کے اخلاق و کردار، اُن کی سنجیدگی، نرم گوئی، آہستہ روی اور متعارفین کے ساتھ، ہمیشہ خوش دلی و لطیف الطبعی سے پیش آنے کی، اُن کی خوبیوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ علم و ادب میں اُن کا مقام اپنی جگہ؛ لیکن میرے لیے اُن کی یہ صفات ہی زیادہ باعثِ کشش رہیں۔ میری افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ میں عموماً لوگوں کے علم و فضل سے کم اور اُن کے حسنِ اخلاق سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ میرے نزدیک حسنِ اخلاق، علم محض سے زیادہ گراں مایہ ہے، اس کے بغیر فضلِ بے پایاں کی کوئی قیمت نہیں۔ مولانا اجتہاؒ کو جتنا پرکھا وہ اُسی درجہ گندن ثابت ہوئے، اُن کی عظمت و کمال کی تہیں کھلتی گئیں اور اُن کی محبت کا نقشِ دل میں گہرا ہوتا گیا۔

اُن سے آخری طویل اور یادگار ملاقات

اُن سے مسلسل دور و زنگ ملنے کا ایک سنہرا موقع، اُس وقت ہاتھ آیا، جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ عربی زبان و ادب نے ۱۴۲۶ھ / ۲۰۰۵ء میں ”لسانی مہارتوں کی افزودگی کا طریقہ“ کے موضوع پر خصوصی تربیتی محاضرے کے لیے راقم کو اصرار کے

ساتھ دعوت دی کہ میں بہ روز جمعہ ۱۸/ شعبان ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۳/ ستمبر ۲۰۰۵ء کو یہ محاضرہ دوں اور دوسرے دن شنبہ ۱۹/ ۸/ ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۴/ ۹/ ۲۰۰۵ء کو قومی علمی سمینار بہ عنوان ”ہندوستان میں عربی زبان کی تدریس.. مسائل اور توقعات“ میں بھی اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ شرکت کروں۔ ذمے داروں کے اصرار پر میں نے الحمد للہ دونوں پروگراموں میں مشارکت کی۔ خوش قسمتی سے مذکورہ سمینار کے افتتاحی جلسے کی صدارت، معروف اسلامی ادیب و اہل قلم، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم اور ”البعث الاسلامی“ کے چیف ایڈیٹر مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی نے کی۔ سمینار کی پہلی علمی نشست میں جو مذکورہ تاریخ کو سہ پہر کے وقت منعقد ہوئی، پہلا قیمتی تحقیقی مقالہ مرحوم مولانا اجتہاد ندویؒ نے بہ عنوان ”معاصر دنیا میں عربی زبان کی اہمیت“ کے موضوع پر پیش فرمایا۔ دوسرا مقالہ راقم الحروف نے پڑھا، جس کا عنوان تھا ”عربی زبان.. لغوی تعریف، عالمی اہمیت، عرب و ہند کے تعلقات کے استحکام میں اُس کا کردار اور معاشی حالت کی بہتری میں اُس کا رول“ عموماً لوگ، چاہے علم و معلومات کے کتنے ہی رسیا ہوں، لکھے ہوئے مقالے کو جو لفظاً لفظاً اُن کے سامنے کاغذ میں دیکھ کے پڑھا جائے، بہ غور نہیں سنتے اور بہ عجلت اُکتا کے ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں اور ایسی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں کہ مقالہ خواں، اپنی مٹی پلید نہ ہونے دینے کے لیے، از خود بہ جلد ہی خواندگی سے باز آ جاتا ہے؛ لیکن لوگوں نے الحمد للہ بہت غور اور سکون سے میرے دراز نفس مقالے کو سنا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہی مخلص دعا گو کی توجہ اور خداے کریم کی خاص توفیق کی بات ہے۔

میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میرے مقالے کے دوران نہ صرف مولانا محمد اجتہادؒ بل کہ مولانا سعید الرحمن اعظمی بھی مسلسل اپنی کرسی پر بیٹھے بہ نظر استحسان اور شاباشی میری طرف متوجہ رہے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ میرے مقالے کے ختم پر ہی دونوں حضرات ہال سے اُٹھ کر آ گئے اور دیگر لوگوں کے مقالے نہیں سن سکے؛ کیوں کہ مولانا

سعید کو اُسی وقت اسٹیشن جانا اور لکھنؤ جانے کے لیے گومتی اکسپریس پکڑنا تھا؛ چنانچہ مولانا اجتہا، راقم الحروف اور دیگر متحہء دلوگ انھیں رخصت کرنے کو اُٹھ آئے۔

مولانا اجتہا سے اس کے بعد کئی بار ملنا ہوا، وہ ناچیز کے اس مقالے سے اتنا متاثر تھے کہ وہ کئی صحبتوں میں یہ دہراتے رہے کہ یہ مقالہ اس سمینار کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ وہ زبان، اسلوب، مقالے کی پختگی کو بار بار سراہتے رہے۔ یقیناً اُن کے الفاظِ استحسان سے میرا حوصلہ بڑھا؛ لیکن میں اس کو اُن کی ذاتی شرافت، خاندانی نجابت اور طبعی تواضع پر محمول کرتا ہوں۔ اس موقع سے انھوں نے اپنے اخلاق و کردار کا غیر معمولی اثر اس راقم کے ذہن پر چھوڑا۔ انھوں نے اسی فرصت میں یہ بھی فرمایا کہ میں ”الداعی“ کو شوق سے پڑھتا ہوں؛ لیکن افسوس ہے کہ وہ مجھے نہیں ملتا؛ بل کہ جامعہ ملیہ کے شعبہ عربی سے ہی کبھی کبھار اُس کا کوئی نسخہ اُٹھالے جاتا ہوں اور استفادے کے بعد واپس کر جاتا ہوں، انھوں نے اپنا ویزٹنگ کارڈ بھی دیا کہ آپ میرے نام ”الداعی“ ضرور جاری کر دیں۔

اس کے بعد اُن سے بہ راہِ راست کبھی ملاقات مُقدّر نہ ہو سکی، فون سے انھوں نے کئی بار رابطہ کیا کہ تمہارا فلاں مقالہ ”الداعی“ میں پڑھا، خوب تھا۔ وہ ”الداعی“ کے طریقہٴ اشاعت اور ظاہر و باطن کی خوبیوں کے بھی بہت مدّاح تھے اور فرماتے تھے کہ اس رسالے نے دارالعلوم کی عظمت کو مزید نکھارنے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔

مولانا اجتہا، اب اس دنیا میں نہیں رہے، یہاں کس کو ہمیشہ رہنا ہے؛ لیکن وہ اپنے اخلاق و کردار، اپنے علمی و تحریری نقوش اور اپنے تخلیقی و ادبی فیضان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ میں نے انھیں عالم باعمل پایا، وہ توازن، دھیمے پن اور حلم و کرم کا پتلا تھے، انھیں جھوٹی شہرت اور نام و نمود سے نفرت تھی، وہ کام کے آدمی تھے اور اُن کا کام ہی اُن کے نام اور شہرتِ دوام کا ذریعہ تھا۔ یہ اُن کا بہت نمایاں وصف تھا، اس کے بعد کسی اہل قلم، داعیِ الی اللہ اور عالم و فاضل کو کسی اور سہارے کی کوئی

ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ با مقصد اور پیغام کے حامل ادیب و اہل قلم تھے۔ ایسا آدمی اپنی ذات سے عظیم ہوتا ہے، ہر پروپیگنڈے اور ابلاغ کے ذرائع سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اُن سے کوتاہ قامت اور کمتر قیمت بہت سے لوگ چمکتی ریت کے بجاری دیکھے گئے ہیں، اگر وہ مولانا اجتہاد کی صفت کے ہوتے تو اُن کے لیے یہی کافی ہوتا اور ہمارے لکھنے اور فخر کرنے کا بڑا سرمایہ ہوتا۔ مولانا اجتہاد خاندانی عظمت بھی رکھتے تھے، وہ حسینی سید تھے، اُن کے جد اعلیٰ سید جعفر علی، امام احمد بن عرفان شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء — ۱۲۳۶ھ / ۱۸۳۱ء) کی تحریک جہاد و حریت کے سرگرم رکن رہے تھے۔

مولانا اجتہاد ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۵ء میں ضلع ”لبستی“ صوبہ ”یوپی“ کے ایک گاؤں ”مچھوامیر“ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شہر لبستی کے مدرسہ ”ہدایت المسلمین“ میں حاصل کی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد، اُن کا تعلیمی قافلہ آگے کوچ سفر ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اُنھوں نے ملک و بیرون ملک کی متعدد بڑی جامعات میں تدریسی فرائض انجام دیے، جامعہ الہ آباد، اُن کی آخری پڑاؤ گاہ ثابت ہوئی، وہ وہیں سے ریٹائر ہوئے اور دہلی میں جامعہ نگر، اوکھلا میں رہائش اختیار کی اور بالآخر وہیں کی خاک کا پیوند بنے، رہے نام اللہ۔ قیام دہلی کے دوران جامعہ ملیہ کا شعبہ عربی اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا چند سالوں سے قائم کردہ ادارہ ”معهد اللغة العربیة“ اُن کی سرگرمیوں کا خاص مرکز بن گیا تھا، اُنھوں نے دیگر فقائے کار کے ساتھ، یہاں عربی زبان و ادب کے شائق نوجوانوں کی راہ نمائی کی اور خاصی تعداد کو کام کا بنایا اور اپنے ذخیرہ آخرت میں اضافہ کیا۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الدامی“ عربی شمارہ ۹-۱۰، ماہ رمضان و شوال ۱۴۲۹ھ مطابق ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود ساڑھے بارہ بجے بہ وقت جمعہ ۱۲ شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۵ اگست ۲۰۰۸ء۔

خدا کا ایک قدرے گم نام؛ لیکن انتہائی نیک نام بندہ

حافظ محمد اقبال گونڈوی

۱۳۳۱/۱۹۱۳ء — ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

انجمن میں بھی مُیَسَّر رہی خلوت اُس کو
شیع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق

کئی سال سے بڑھاپے کے بہت سارے عوارض اور طرح طرح کے امراض سے
لڑتے ہوئے، مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے مہتمم و سرپرست، مردِ ربّانی حافظ محمد اقبال گونڈوی،
۹۵-۹۶ سال کی عمر میں اپنے وطن گونڈہ میں، چہار شنبہ: ۲۶ رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۰
جولائی ۲۰۰۸ء کو ایک بج کر تقریباً دس منٹ پر ظہر کے وقت، اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔
اللہ پاک بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔

چہار شنبہ و پنج شنبہ کی درمیانی شب میں تقریباً دس بجے اُن کی نمازِ جنازہ ملک کے
ممتاز عالمِ دین، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم و سرپرست حضرت
مولانا محمد رابع حسنی نے پڑھائی۔ نمازِ جنازہ میں بڑی تعداد میں علما، صلحا و طلبہ کے ساتھ
ساتھ، بڑی تعداد میں عوام نے شرکت کی، جس میں اُن کے معتقدین و محبین کی خاصی
تعداد بھی دور دور سے وقت کی قلت کے باوجود شریک ہو جانے میں کامیاب رہی۔

حافظ محمد اقبالؒ نے عمرِ دراز یعنی ۹۵-۹۶ سال کی زندگی پائی۔ اپنی عمر کے ۷۶ سال
اُنھوں نے کتابِ الہی: قرآنِ پاک کی تحفیظ و خدمت میں صرف کیے۔ اُن کی زندگی

صلاح و تقویٰ اور زہد و ورع کا نمونہ تھی۔ وہ اپنے بہت سے ہم عمروں اور رفقاء کے کار و متعارفین کے لیے بہ جا طور پر اس حوالے سے قابل رشک رہے؛ کیوں کہ اپنی سی کوشش اور چاہت کے باوجود وہ نیکی و پرہیزگاری میں اُن کی سطح کو نہ پاسکے۔ وہ بڑے صغیر کے صلحاے مشاہیر میں شمار نہ ہونے کے باوجود، میرا خیال ہے — اور شاید میری طرح اُن کے بہت سے متعارفین کا بھی یہی خیال ہوگا — کہ وہ بہت سے شہرت یافتہ علما و صلحا سے زہد و اتقا اور سادہ اور کفاف کی زندگی گزارنے میں بالیقین فائق تھے۔

شریعت اسلامی نے، کسی آدمی کے واقعی نیک اور خدا ترس ہونے کا یہ معیار بتایا ہے کہ اُس کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے کو خدا یاد آجائے اور اُس کی صحبت میں جتنا زیادہ وقت گزارا جائے، صحبت یافتوں کو اُسی درجہ اپنے خدا سے تعلق میں اضافہ محسوس ہو، دنیا سے اُس کا رشتہ کم زور اور خدا سے اُس کا رشتہ مضبوط تر دکھائی دے۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر یہ بات کہتا ہوں کہ حافظ محمد اقبالؒ سے جب جب ملا، ایک عجیب سی ایمانی لذت اور روحانی کیفیت محسوس ہوئی، جس کو میں صحیح طور پر اپنے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ایسی ایمانی لذت، بعض دفعہ بعض معروف علماے صالحین کی صحبت میں بھی محسوس نہ ہوئی، جن کے یہاں ارادت مندوں، معتقدوں اور دست گرفتوں کی بھیڑ رہا کرتی تھی۔

دین داری سے دمکتا ہوا مکھڑا

وہ انتہائی منحنی، بلکے پھلکے بدن کے آدمی تھے، سرخ و سفید، متوسط القامت، چہرے پہ ہلکی سی داڑھی، مگر انتہائی روشن رو تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ کسی بھی ملنے والے کو اُن کے مختصر وجود سے قبل ہونٹوں پر کھیلتی اُن کی مسکراہٹ سے سامنا ہوتا۔ ہر ملنے والے کو محسوس ہوتا کہ حافظ محمد اقبالؒ اُس کی اپنی جان سے زیادہ اُس سے قریب ہیں۔ نظر پڑتے ہی وہ سلام کرتے اور خبر خیریت دریافت کرتے، تو ملنے

والے کو لگتا کہ اُن کی شخصیت اُس کے اندر سرایت کر رہی ہے، اُن کا وجود اُس کے اندر تحلیل ہو رہا ہے۔ وہ واقعتاً جذبات و احساسات کو بانٹتے محسوس ہوتے اور صاف معلوم ہوتا کہ وہ ملاقاتی کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں، خواہ ملاقاتی اُن کی ذات کا حصہ نہ بن سکا ہو۔ اُن کی زبان اُن کے ضمیر کی ترجمان تھی، اُن کے ظاہر و باطن میں ایسی یکسانیت تھی، جو کم ہی ہوتی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے اُن کے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں، جن کی زبان دل کی اور دل زبان کا ترجمان ہو۔ اس کے برعکس میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا اور تجربہ کیا ہے، جن کی نیکی کی دھوم مچی ہوئی تھی؛ لیکن وہ تجربے کے بعد شہرت کے معیار مطلوب پر پورا نہیں اُتر سکے، اُس وقت بہت افسوس ہوا اور دل میں ایسا منفی اثر قائم ہوا کہ اُس کی وجہ سے سارے اُن لوگوں سے بہت بدظنی ہو گئی، جو نیکوں کے لباس میں تو ہوتے ہیں؛ لیکن ذرا بھی نیک نہیں ہوتے۔

بہت سے قد آور علما سے زیادہ قد آور ”حافظ“

حافظ محمد اقبال رسمی طور پر ”عالم“ نہ تھے، انھوں نے کسی مشہور یا غیر مشہور مدرسے سے علمیت و فضیلت کی سند حاصل نہیں کی تھی۔ وہ صرف قرآن پاک کے حافظ تھے اور بس۔ وہ غالباً باقاعدہ تجوید و قراءت کی بھی سند نہیں رکھتے تھے؛ اسی لیے وہ صرف ”حافظ محمد اقبال“ تھے، ”قاری محمد اقبال“ بھی نہ تھے، چہ جائے کہ ”مولانا محمد اقبال“ ہوتے؛ لیکن ”حافظ محمد اقبال“ مشرقی یوپی کے ایک بڑے علاقے میں ایک باوقار و پُر اعتبار نام بن گیا تھا، جس کا مصداق صلاح و تقویٰ، دین داری و پرہیزگاری، دنیا سے دینی سے بے رغبتی اور رحمن کی چوکھٹ پر پڑے رہنے والے ایک بڑے نیک نام آدمی کی ناقابل شمار خوبیوں سے عبارت تھا۔ اُن کی دید و شنید کے دائرے کے مدارس کے ماحول کا کوئی آدمی جب بھی ”حافظ محمد اقبال“ سنتا، تو اُس کا دل اس یقین سے بھر جاتا کہ یہ وہی ذات ہے، جس سے اللہ نے محبت کی ہے، اللہ نے اُس کو جان لیا ہے اور اُسی نے اُس کو اپنی

مخلوق کی ایک معتد بہ تعداد میں مشہور کر دیا ہے اور اُس کے دل میں اُس کی محبت ڈال دی ہے۔ حافظ محمد اقبال ایک ایسے انسان کا استعارہ تھا، جس کے دل میں ایمان کی بشارت رچ بس گئی تھی اور اسلام کی عظمت اُس کے رگ وریشے میں سما گئی تھی۔ یہ انسان بد اخلاقی، کج روی، سیرت کے بگاڑ، بد باطنی وغیرہ کی ساری آلودگیوں سے یکسر منزہ تھا۔ میں نے سال ہا سال دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں انھیں جیا اور برتا تھا۔ وہاں درجہ حفظ کی تاسیس ہی انھیں کے ذریعے عمل میں آئی تھی، وہ عرصہ بیس سال تک وہاں اُس کے روح رواں اور سرپرست رہے، کچھ سالوں بعد میں بھی وہاں مدرس ہوا، یہ بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کی بات ہے، حفظ و تجوید کے حلقے اُن دنوں زیادہ تر سلیمانیہ ہاسٹل کی دوسری منزل کے وسطی ہال میں لگا کرتے تھے، ہال کی جانب شرق کے کمرے ہی درجہ حفظ کے طلبہ کی رہائش گاہ تھے، راقم السطور اُن دنوں اُسی دوسری منزل پر جانبِ غرب میں ہال کے بغل کے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ حافظ محمد اقبال درجہ حفظ کے طلبہ کے کمروں، ہال میں واقع درجہ حفظ کے حلقوں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد اور اپنی رہائش گاہ کے درمیان، جو گومتی ندی کے سامنے دارالعلوم کی مرکزی عمارت کے مغرب میں واقع تھی، اُن گنت بار میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے نظر آتے، اُن کی زبان ذکر اللہ سے ہر وقت تر رہتی، اُن کے ہاتھ میں باریک دانوں کی خوب صورت سی تسبیح ہوتی، جیسے ہی کسی سے اُن کی ملاقات ہوتی اُن کی باچھیں کھل جاتیں، وہ سلام میں سبقت کرتے اور اُس سے اُس کی خبر خیریت دریافت کرنے میں پہل کرتے، وہ جیسے ہی ملتے شدید سے شدید غم، غلط ہو جاتا، اچانک ملنے والے کو بھی ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سب سے بڑے غم گسار اور ہم دردیرینہ سے مل رہا ہے۔ ۲۳ گھنٹے میں دسیوں بار اُن سے آتے جاتے ضرور ملاقات ہو جاتی اور ایک آدھ مرتبہ وہ میرے کمرے میں بھی منہ ڈال کے میری خبر خیریت معلوم کرتے، تو لگتا کہ کسی ہم درد حکیم نے زندگی کے میرے زخم ہائے دامن دار پر مرہم ڈال دیا ہے۔ اُن کے ایک

تبسم اور ایک بول سے بھی ایسی حلاوت و برودت محسوس ہوتی، جس کا اور اک آسان اور اُس کا بیان مشکل ہے۔ اس حلاوت و برودت کا سرچشمہ اُن کی پختہ ایمانی، قلب کی صفائی، اپنے مولیٰ کی مخلصانہ عبادت، اپنے رب سے سچا تعلق، گناہوں سے اجتناب، معاصی کے محرکات سے احتراز اور ہر مسلمان کے ساتھ ہمہ وقت حسن ظن تھا۔

علمائے صالحین کے محبوب

میں نے کسی لمحہ انھیں لایعنی میں مشغول نہیں پایا، وہ اپنے فرائض منصبی کو انتہائی ایمان داری، چستی اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرتے یا تسبیح اور اوراد و وظائف میں لگے رہتے، چلتے پھرتے بھی اللہ کا ذکر ہمہ وقت اُن کی زبان پر جاری رہتا، عبادت و تلاوت اُن کا امتیاز تھی، پابندی اوقات اُن کی شناخت تھی، وہ قیام اللیل کے، فرائض ہی کی طرح پابند تھے۔ اُن کی آنکھوں اور چہرے بُسرے سے شب بیداری کے اثرات چھلکتے تھے، وہ اپنے درجے کے طلبہ کو عشا کی نماز کے بعد بہ غلت کھلا پلا کے سلا دیتے اور رات کے آخری حصے میں جگا دیتے، ایک گھنٹہ تلاوت اور تہنک کے بعد ہی صبح صادق طلوع ہوتی، وہ طلبہ و مدرسین کو بھی پابندِ وقت بنائے رکھتے۔ وہ تحفیظ کے پختہ نظام کے وضع کرنے، اُس کو برپا کرنے اور اُس پر متعلقہ حفظ و طلبہ کو کاربند رکھنے کے حوالے سے، لائق تقلید نمونہ تھے۔ اس سلسلے میں اُن کی نیکی و دین داری اور ساری سرگرمیوں اور معاملات میں حسن اخلاق، نرمی و گدازی اور شفقت و محبت کو بنیاد بنانے کی وجہ سے نہ صرف انھیں بڑی آسانی ہوتی؛ بل کہ متعلقہ لوگوں کو بھی کوئی پریشانی محسوس نہ ہوتی۔ وہ اپنے سے وابستہ خدمت گزاروں کو بہ جلد مانوس کر لیتے اور خود بھی اُن سے مانوس ہو جاتے؛ چنانچہ انھیں اُن کے تحت کام کرنے میں بڑی سعادت محسوس ہوتی۔ کسی بھی سرپرست، ذمے دار اور منظم کی یہ سب سے بڑی کام یابی ہے کہ اُس کے ماتحت لوگ کام کو بار نہیں؛ بل کہ سعادت سمجھیں۔

حافظ محمد اقبال، وقت کے چیدہ و برگزیدہ علما و صالحین کے ہاں ہمیشہ محبوب رہے۔ وہ اُن میں سے اکثر کے ہاں آتے جاتے اور اُن کی صحبت و مجالست سے فائدہ

اٹھاتے اور زادِ آخرت کے حصول کی راہ کی رکاوٹوں کے دور کرنے کا طریقہ اُن سے سیکھتے؛ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے لوگوں میں پروفیسر مولانا عبدالباری ندویؒ (متوفی جمعرات: ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء = ۲۶ صفر ۱۳۹۶ھ) کی خدمت میں تقریباً روزانہ ہی حاضر ہوتے، جن کا مکان لکھنؤ میں ڈالی گنج کے علاقے میں سیتاپور روڈ پر واقع تھا اور اُس وقت وہ بسترِ مرض و شیخوخت پر تھے، جو بالآخر بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کے ہاں آمد و رفت میں اکثر یہ راقم اُن کے ساتھ ہوتا، اِس طرح دونوں بزرگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا۔ اِسی طرح اکثر اُن کی معیت میں اسلامی اہلِ قلم، داعیِ الی اللہ اور عمیقِ العلم عالم و شیخ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء — ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) کی ملاقات کو بھی جاتا، حافظ صاحب اُنھی کے دستِ گرفتہ اور اُن کے خلیفہ و مجاز بھی تھے۔ حافظ محمد اقبال ناظمِ ندوۃ العلماء مقررِ اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء — ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) کے ہاں بھی بڑے محبوب و محترم تھے اور اُن کے شاگردِ رشید و دستِ راست و نائبِ ناظمِ ندوۃ العلماء مولانا معین اللہ ندویؒ (متوفی ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) تو اُن کے بہت ہی قدرِ رواں تھے۔ مولانا محمد احمد پرتاپ گدھی (متوفی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء) کی خدمت میں بھی وہ کثرت سے حاضر ہوتے اور اُن کے سوزِ دل و پیشِ جگر سے اپنے دل کی بھی گرم کرتے۔

اُن کے متقی ہونے کی یقینی علامت

انسان کی نیکی کی غالباً سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ خدا کے نیک بندوں کو اُس سے محبت ہو اور عام مسلمانوں کے دل بھی اُس کی طرف اِس طرح کھینچتے ہوں، جیسے آہن پارے مقناطیس کی طرف اور ہر انسان کو اُس کی صحبت سے اُنسیت محسوس ہوتی ہو؛ بل کہ ہر آدمی اُس کو اپنا جگہری دوست باور کرتا ہو۔ حافظ محمد اقبالؒ اِس معیار پر مکمل طور پر نہ صرف اُترتے تھے؛ بل کہ وہ اُن ضلحی میں تھے، جنہیں دیکھ کر ہی یہ معیار

قائم کیا جاسکتا ہے۔ وہ تادم حیات اس معیار پر قائم رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے رب نے ہی انھیں اس معیار کا بنایا تھا اور خداے کریم کے کرم سے امید ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ جنت میں بھی انھیں مقام اعلیٰ عطا کرے گا اور انبیا و صدیقین، شہداء و صالحین کے جوار میں انھیں جگہ دے گا اور یہی لوگ بہترین ساتھی ہیں۔

حافظ محمد اقبال نے مدرسہ فرقانیہ گوئدہ میں حفظ قرآن پاک کیا اور وہیں تقریباً ۲۰ سال تک مدرس حفظ رہے، اسی اثنا میں مولانا علی میاں ندویؒ کی نظر انتخاب اُن پر پڑی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درجہ حفظ کے قیام و انصرام کے لیے انھیں اپنے ہاں بلا لیا، یہاں بھی انھوں نے کم و بیش بیس سال گزارے، پھر وہ اپنی مادر علمی و مادر وطن مدرسہ فرقانیہ گوئدہ واپس آ گئے اور زندگی کا باقی حصہ مدرسے کے انتظام و انصرام اور تحفیظ قرآن پاک کی خدمت میں گزارا۔ وقت کے ساتھ ساتھ، اُن کی نیک نامی و نیک کامی میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی سعادت مندانہ حالت میں انھوں نے وفات پائی۔ وہ عرصے سے نحیف و زار اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، وہیل چیر پر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے؛ لیکن اس حالت میں بھی وہ تحفیظ کی درس گاہ میں آ کر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے اور طلبہ حفظ قرآن میں مشغول رہتے، وہ اُن کی مبارک آواز سن کر سکون قلب محسوس کرتے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اُن کی محبت و عقیدت کی برکت سے راقم کو بھی حسن خاتمہ کی سعادت سے سرفراز کرے۔ اللہ پاک اُن کے سارے پس ماندگان و حبین کو صبر و جزا سے نوازے۔ آمین۔ (*)

سوانحی نقوش

✽ نام: (حافظ) محمد اقبال۔

✽ والد کا نام: عبداللہ۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداغی“ عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۳، بابت ماہ رمضان و شوال ۱۴۲۹ھ مطابق ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود نصف شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق نصف اگست ۲۰۰۸ء۔

✽ والدہ کا نام: شہیدہ۔

✽ سنہ ولادت: تقریباً ۱۹۱۲ یا ۱۹۱۳ء، جو اُن کے بعض اہل خاندان نے اُن کی عمر کے حساب سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اُن پر لکھنے والوں میں سے کسی نے ۱۹۱۱ء، کسی نے ۱۹۱۷ء، کسی نے کچھ اور لکھا ہے۔ اُن کے خاندان میں اُن کا سنہ ولادت تحریر شدہ موجود نہیں ہے۔

✽ جاے ولادت و وطن: ”موضوع“ ”مکرم ڈیم“، ضلع ”گوئدہ“، یوپی۔

✽ ابتدائی تعلیم: موضع ”ہردھر مو“، ضلع گوئدہ میں اپنے پھوپھا منشی اسحاق صاحب کی سرپرستی میں حاصل کی۔

✽ تعلیم کا دوسرا مرحلہ: اُس کے بعد کی تعلیم انھوں نے موضع ”دھانے پور“، ضلع گوئدہ میں حاصل کی، جہاں مڈل کلاس یعنی آٹھواں درجہ سرکاری عصری اسکول سے پاس کیا، جو اُس زمانے میں لوگوں کے نزدیک بڑے اعزاز کی بات تھی۔

✽ تعلیم کا تیسرا مرحلہ یعنی حفظ قرآن پاک: قرآن پاک کے حفظ کی تکمیل، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں کی، وہاں جانے کا سبب اُس مدرسے کے استاذ قاری عبدالوہابؒ بنے، جو اُن کے قدیم رشتہ دار اور نہ صرف انتہائی دین دار تھے؛ بل کہ زہد و تقویٰ کا نمونہ اور مثالی مدرس تھے۔ قاری عبدالوہابؒ، حافظ محمد اقبالؒ کی والدہ محترمہ کے حقیقی ماموں تھے۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ فرقانیہ ہی میں حفظ و قراءت کی تعلیم حاصل کی اور وہیں معین مدرس کی حیثیت سے، تدریسی خدمت انجام دینے لگے۔ لکھنؤ کے سٹی انجینئر کے پاس ”گولانچ“ کی ایک مسجد میں قاری عبدالوہابؒ اِمامت کرتے تھے، وہیں اُن کا قیام بھی تھا، حافظ محمد اقبالؒ بھی مدرسہ عالیہ فرقانیہ کی طالب علمی کے زمانے میں انھی کے ساتھ اُسی مسجد میں قیام پذیر رہے۔

✽ تدریسی و عملی زندگی: تقریباً ۱۹۳۴ء (۱۳۵۳ھ) میں قاری عبدالوہابؒ، اہل گوئدہ کے اصرار پر لکھنؤ سے گوئدہ آگئے اور مسجد منہاران میں مکتب کی شکل میں ایک مدرسے کا آغاز کیا۔ ایک ماہ بعد حافظ محمد اقبالؒ بھی لکھنؤ سے ”گوئدہ“ آگئے اور اسی مکتب میں درجہ ناظرہ میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی، دو سال کے بعد درجہ حفظ کے مدرس مقرر ہوئے اور بہت جلد اُن کی تدریسی مہارت و محنت کی شہرت عام ہو گئی۔

● یہاں مسلسل بیس سال تک تدریسی خدمت انجام دی، اسی دوران قاری عبدالوہابؒ نے، اپنی اکلوتی ہمشیرہ کی شادی حافظ محمد اقبالؒ سے کر دی۔ حافظ محمد اقبالؒ نے اس مدرسے کی جی جان سے خدمت کی، نہ صرف تدریسی فریضہ، محنت و جان فشانی سے انجام دیا؛ بل کہ اُس کے لیے چندہ بھی کیا، مطبخ کا نظام بھی سنبھالا، بوقت ضرورت طلبہ کے لیے، اپنے ہاتھ سے روٹیاں بھی پکائیں، بعض دفعہ اس طرح کی خدمتیں

طویل طویل عرصے تک انجام دیں۔

● قاری عبدالوہابؒ کے انتقال کے بعد، مدرسہ فرقانیہ گوئدہ کے حالات خاصے تبدیل ہو گئے، جن میں حافظ محمد اقبالؒ کے لیے وہاں خدمت کرنی مشکل ہو گئی، تو وہ ندوۃ العلما کے نائب ناظم مرد صالح مولانا معین اللہ ندویؒ (متوفی ۱۱ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳ اگست ۱۹۹۹ء) کی تحریک پر دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ چلے گئے، جہاں انھوں نے، درجہ حفظ کی اساس گزاری کی، یہاں کام کے دوران ان کی دینی عزت و عظمت میں اضافہ ہوا اور شہرت و نیک نامی بھی دو چند ہوئی۔

● پھر مدرسہ فرقانیہ گوئدہ کے دیگر گروں ہوتے ہوئے حالات نے، انھیں ندوۃ العلما سے گوئدہ واپس آ جانے پر مجبور کیا اور عمر عزیز کا باقی ماندہ عرصہ، جو بیس سال سے زائد پر پھیلا ہوا ہے، اُسی کی خدمت میں گزاردیا۔ ان کی یہاں آمد سے، اُس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح عود کر آئی، اُس کی شہرت اور تدریسی امتیاز کا غلغلہ دور دور تک بلند ہو گیا۔

● مدرسہ فرقانیہ گوئدہ کی انھوں نے ۵۵-۵۶ سال تک خدمت کی اور دارالعلوم ندوۃ العلما کی ۲۰ سال، اس طرح ۷۵-۷۶ سال قرآن پاک کی تحفیظ و تدریس میں گزارے، جو بہت بڑی سعادت اور عند اللہ ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

✽ بیعت و خلافت: وہ سب سے پہلے شیخ الہندؒ کے خلیفہ مولانا ضرعام الدین فیض آبادی سے نوعمری ہی میں اپنے استاذ و مربی قاری عبدالوہابؒ کی معیت میں بیعت ہوئے، ان کی صحبت میں دونوں بار بار جاتے رہے، جس سے تہجد، شب بیداری اور اوداؤ کا رپرکار بندی کا شوق و ذوق پیدا ہوا، ان کی وفات کے بعد مراسلت کے ذریعے، حضرت تھانویؒ سے بھی بیعت ہوئے، بعد میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے بیعت ہو کر سلوک کی منزلیں طے کیں اور انھی سے اجازت و خلافت ملی۔

✽ وفات: چہار شنبہ ۲۶/رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۰ جولائی ۲۰۰۸ء ایک بج کر تقریباً دس منٹ پر۔
✽ حافظ صاحب کے اہل خاندان: حافظ صاحب کے ان کے علاوہ دو بھائی تھے، جو وفات پا چکے، تین بہنیں تھیں، جن میں سے ایک زندہ ہیں۔ حافظ صاحب کے دوڑکیاں ہیں، دونوں زندہ ہیں۔ (۱)



(۱) سوانحی نقوش کی معلومات کے حوالے سے، حافظ محمد اقبالؒ کے چھوٹے داماد مولانا عبدالحفیظ استاذ مدرسہ فرقانیہ گوئدہ کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مولانا فضیل احمد قاسمی گورکھپوری

۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء — ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم برادری، مولانا فضیل احمد قاسمی جنرل سکریٹری مرکزی جمعیتہ علمائے ہند کی اچانک موت سے، خاصی غم زدہ اور دل گرفتہ نظر آئی۔ تقریباً دس بجے کے قریب ہم لوگوں نے یہ خبر دیوبند میں مسجدوں کے مانک سے سنی، تو دیر تک سکتے کے عالم میں رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دہلی کے مشہور ایمس ہسپتال میں سہ شنبہ ۱۲/۱۳ صفر ۱۴۳۰ھ = ۱۰/فروری ۲۰۰۹ء کو علی الصبح تقریباً پانچ بجے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے راہی ملک بقا ہو گئے۔ اُن کی عمر انتقال کے وقت بہ حساب سال ہائے عیسوی کل ۵۷ سال اور بہ حساب سال ہائے ہجری ۵۹ سال تھی۔ اُن کے اچانک انتقال سے ایسا لگا جیسے کوئی گراں بہاد دولت ملت کے ہاتھ سے اچانک چھین گئی ہو۔

اُنھیں موٹا پا اور اُس سے پیدا شدہ عوارض کثیرہ کی وجہ سے کئی طرح کی پیچیدگیوں کی شکایت تھی؛ لیکن وہ اپنی ہمہ وقت کی سرگرمی، طبعی چستی اور دوڑ بھاگ کی وجہ سے بڑی حد تک اُس پر قابو پائے رہتے تھے۔ اُنھیں ملک کی اعلیٰ قیادت اور مسلمانوں کے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے قائدین و عوام سے جو وسیع تر ربط و تعلق تھا، اُس کو وہ ملک و قوم، دین و ملت اور فرزندانِ اسلام کی خدمت کے لیے ہنرمندی سے استعمال کرتے تھے۔ عوام و خواص کے دل میں اُن کے لیے جو کشادہ جگہ تھی، وہ بہت سے قد آور قائدین و زعماء

اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی باعثِ رشک تھا۔ وہ اپنی نرم خوئی، شیریں گفتاری، بے تکلفانہ برتاؤ اور سحرانہ رویے کی وجہ سے، ہر کسی کو صرف پہلی اور ایک ہی ملاقات میں عموماً زندگی بھر کے لیے گرویدہ بنالیا کرتے تھے۔

وفات سے چار پانچ دن پہلے، انھیں ”آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں“ ریڑھ کی ہڈی اور پیشاب کی راہ میں تکلیف کی وجہ سے علاج کے لیے داخل کرایا گیا تھا، اُس وقت انھیں یا اُن کے کسی عزیز اور متعلقہ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دنیا سے آخری سفر کے لیے یہاں سے ہسپتال جا رہے ہیں۔ جانچ کے دوران ڈاکٹروں نے انھیں بے ہوش کیا، تو وہ آخر تک صحیح طور پر ہوش میں نہ آ سکے۔ اُن کے بھائی ڈاکٹر عزیز احمد قاسمی نے بتایا کہ انھیں پانچ بجے صبح کو ہارٹ اٹیک ہوا اور اُن کی روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ سہ شنبہ ہی کو ۲۰ - ۲۱ بجے دن میں، اُن کی پہلی نمازِ جنازہ ”منہدیان“ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء) —

۱۱۷۶ھ/ (۱۷۶۱ء) کے مزارِ اقدس کے احاطے میں واقع ”جامعہ رحیمہ“ میں ادا کی گئی، جہاں اُن کی مرکزی جمیعۃ علماے ہند کا صدر دفتر بھی قیام کے وقت سے قائم ہے، اُس کی امامت مدرسہ عربیہ عالیہ فتح پوری کے شیخ الحدیث مولانا عبدالکریم نے کی اور اُس میں عام مسلمانوں، اُن کے ہی خواہوں کے علاوہ علما و طلبہ و خواص و اہل سیاست و قیادت کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پھر خصوصی ایسبولینس کے ذریعے، اُن کی نعش اُن کے وطن ”بیرواچندن پور“ ضلع ”مہراج گنج“ سابق ضلع ”گورکھپور“ لے جانی گئی اور اعزاء و اقربا بھی، جو اُن کے علاج کے دوران گھر سے آ گئے تھے، نعش کے ساتھ ہی وطن کے لیے روانہ ہو گئے، چنانچہ دوسرے دن چہار شنبہ ۱۵/۲/۱۴۳۰ھ = ۱۱/فروری ۲۰۰۹ء کو پڑوس کے گاؤں ”اڈا بازار“ میں (جہاں مولانا فضیل نے اپنا مکان بنا کے باقاعدہ وہیں رہائش اختیار کر لی تھی) واقع مدرسہ سعد بن ابی وقاصؓ کے کیمپس میں، اُن کی دوسری نمازِ جنازہ دارالعلوم کے بڑے استاذِ حدیث شریف: حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین گورکھپوری

مدظلہ العالی نے پڑھائی، جس میں بڑی تعداد میں علما و صلحا اور سربراہان و لوگوں کے ساتھ عوام کی بڑی تعداد اور مولانا کے رشتہ داروں نے شرکت کی اور مدرسے کے پاس ہی اُن کی تدفین عمل میں آئی۔ ”آسمان اُن کی لحد پہ شبنم افشانی کرے۔“

وطن، خاندان اور تعلیمی سفر

مرحوم کی پیدائش اپنی ننھیال ”مانڈہ“ ضلع ”فیض آباد“ کے ”حیات گنج“ محلے میں ہوئی، جہاں اُن کے نانا کا گھر تھا، وہ چہار شنبہ: ۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق یکم اگست ۱۹۵۲ء کو متولد ہوئے۔ اُن کے والد مولانا مجیب اللہ قاسمی (متوفی ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء) جو اپنی دین داری و خاک ساری کی وجہ سے ”صوفی مجیب اللہ“ کے نام سے مشہور تھے، اصلاً ”اونچیرا“ ضلع ”ہستی“ کے باسی تھے۔ دین کی سرگرمیاں اُنھیں ضلع ”مہراج گنج“ سابق ضلع ”گورکھپور“ کے موضع ”بیرواچندن پور“ لے گئیں، پھر اُسی کے قریب ”اڈا بازار“ نام کے چھوٹے سے گاؤں میں معمولی سا گھر بنا لیا اور وہیں رہنے لگے۔ کچھ سالوں پہلے اپنی حیات میں، اُنھوں نے وہیں ”مدرسہ سعد بن ابی وقاصؓ“ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر لیا تھا، جو مولانا فضیل اور اُن کے برادران کی کوششوں سے تعلیم و تربیت کے میدان میں سرگرم عمل ہے۔

مولانا فضیل نے ابتدائی تعلیم ”بیرواچندن پور“ کے ہی مدرسہ ”بیت العلوم“ میں حاصل کی۔ ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں ابتدائی تعلیم مکمل کر لی۔ ۱۹/ صفر ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۳/ جون ۱۹۶۲ء کو قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ حفظ کے دوران اُن کے والد کی فکر مندی کی وجہ سے اُنھیں متعدد مدرسوں سے فیض یافتہ ہونے کا موقع ملا، جس کا مقصد جہاں حفظ میں چٹنگی اور کمال پیدا کرنا تھا، وہیں علما و صلحا دین سے تربیت اور اُن کی صحبت سے فیض اٹھانا بھی تھا، چنانچہ مدرسہ ”نور العلوم“ بہرائچ، ”مدرسہ اسلامیہ“ بھٹنی، ”مدرسہ فرقانیہ“ گونڈا، ”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ لکھنؤ، ”جامعہ عربیہ اسلامیہ“

پس مرگ زندہ

ہتھورا، باندہ، مدرسہ ”ہدایت العلوم“، کرہی ضلع ”بستی“ مدرسہ ”کنز العلوم“، ٹانڈہ ضلع ”فیض آباد“ وغیرہ میں سے ہر ایک میں سال چھ مہینے گزارے اور ”تمتع زہر گوشہ یافتہ“ کا فائدہ اٹھایا۔

۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں حفظ کی تکمیل کی اور یہیں دور بھی کیا۔ دارالعلوم ہی میں ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں فارسی وارڈو وغیرہ کی تعلیم کے بعد عربی اوّل میں داخل ہوئے اور ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں فارغ ہوئے، بخاری شریف حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ (۱) سے پڑھی۔ اُن کے اساتذہ میں حضرت مولانا فخر الحسنؒ، حضرت مولانا معراج الحقؒ دیوبندیؒ، مولانا عبدالاحدؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا قمر الدین گورکھپوریؒ، حضرة الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، مولانا سعید احمد پالن پوریؒ حال شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وغیرہ جیسے باکمال اساتذہ تھے۔ مرحوم نے دورانِ تعلیم خوش خطی بھی سیکھی اور پیشہ کی حیثیت سے اُس کو کچھ وقتوں کے لیے استعمال بھی کیا۔

خدمتِ خلق کا پیدائشی جذبہ

اجتماعی خدمت، خلقِ خدا سے میل جول، لوگوں کے غم و الم اور خوشی و مسرت میں پوری طرح شریک رہنے کا جذبہ اور سلیقہ مولانا فضیل احمدؒ کی گھٹی میں پڑا تھا، وہ پیدائشی طور پر اس ہنر کے حامل تھے؛ اسی لیے طالبِ علمی کے زمانے میں وہ طلبہ کی آرزوؤں اور امنگوں، اُن کی ضرورتوں اور تقاضوں، مدرسہ زندگی کی آسانیوں اور پریشانیوں، رہائش و تعلیم و مطالعے کے حوالے سے اُن کے ضروری مطالبوں سے ہر وقت آگاہ رہتے اور

(۱) اور بہ وقتِ لاسٹ فچنگ ایس مضمون برائے اشاعت بہ شکل کتاب بہ اوّل ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ مطابق آخر اپریل ۲۰۱۰ء ”رحمۃ اللہ علیہ“، اس لیے کہ چار شنبہ - پنج شنبہ: ۱۸-۱۹ صفر ۱۳۳۱ھ مطابق ۳-۲ دسمبر ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب میں وہ آنج کرہ ۱۰ منٹ پر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

بڑے اساتذہ اور ذمے داروں سے ربط کر کے اُن کی ساری ضرورتوں کو پوری کروانے کی کوشش کرتے۔ دیوبند آمد کے بعد مولانا فضیل سے جب تعارف ہوا، تو جب بھی میں اُنھیں دیکھتا اور برتاؤ دل یقین کرتا کہ اللہ نے اُنھیں بہ طورِ خاص خلقِ خدا کی خدمت ہی کے لیے پیدا کیا ہے؛ اسی لیے یہ کام اُن کے لیے اُن خدمتوں کے حوالے سے بھی بہت آسان ہے، جو دوسروں کے لیے علم و تجربے کے باوجود انتہائی مشکل ہوتی ہیں۔ مولانا فضیل کوئی غیر معمولی اہلِ علم نہ تھے؛ لیکن خدمتِ خلق اور ملک و ملت کی گراں قدر خدمت اور خدمت سے زیادہ جذبہٴ خدمت کے تعلق سے دیکھا جائے، تو وہ بہت سے کثیر العلم لوگوں سے بھی بڑے قد آور تھے۔ جو اُن سے ایک بار بھی مل لیتا وہ اُن کی خوش اخلاقی، ہنرمندانہ خدمت اور دل میں گھر کر جانے والی اداؤں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اُن کی یادوں کا نقشِ جاوداں اپنے دل میں ثبت پاتا۔ وہ عربی اور انگریزی کے ماہر نہ تھے اور دونوں زبانوں میں گفتگو ٹوٹی پھوٹی بھی بہ مشکل ہی کر پاتے تھے؛ لیکن عرب و یورپ و افریقہ کے جس علاقے میں بھی وہ گئے، وہاں لوگوں کو اپنے اخلاق و کردار کا غلام بنانے کے آگئے؛ کیوں کہ محض منہ کی زبان ہی انسانوں کو غلام بنانے کے لیے کافی نہیں؛ بل کہ دل سے گویا ہونے کی زبان سے واقفیت اور ضمیر کو اپیل کرنے کی طاقت بھی ضروری ہے، جس میں مولانا فضیل بے مثال تھے؛ کیوں کہ وہ فطری طور پر ترسیل کے فن پر عبور اور لوگوں کے احساس و جذبات سے ہم رشتہ ہونے کی عجیب سی صلاحیت رکھتے تھے، وہ جب بھی کسی سے ہم کلام ہوتے تو لگتا کہ اُنھوں نے اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ واقعتاً وہ دوست بنانے کے فن میں جتنے ماہر تھے، اُسی قدر وہ دشمن بنانے کے فن سے ناواقف تھے۔

لوگوں کی خدمت کا رسیا ہونے کی وجہ سے وہ بعض دفعہ اتنے لوگوں سے اُن کے کام کر دینے کا وعدہ کر لیتے کہ وہ اُنھیں پورا نہیں کر پاتے تھے؛ کیوں کہ پہلے سے دگر ڈھیر سارے کاموں اور وعدوں سے مربوط ہونے کی وجہ سے یا کسی طرح کی دگر

رکاؤٹوں کی بنا پر وہ بعض لوگوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح کے لوگوں کو اُن سے شکایت ہوتی تھی؛ لیکن یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ بالقصد ایسا نہیں کرتے تھے؛ بل کہ مجبوریاں اُن کی راہ میں حائل ہو جاتی تھیں۔

طالب علمی کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی سب سے بڑی انجمن ”مدنی دارالمطالعہ“ کے صدر، نیز ضلع سہارنپور کی جمعیت علما کے سکریٹری بھی رہے، وہ اپنی خوش گفتاری، اساتذہ کی خدمت، طلبہ سے میل جول اور ہر طرح کے لوگوں سے جلدی گھل مل جانے کی وجہ سے، اساتذہ کے بھی مقرب رہے، کسی استاد کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے یہ خصائل اپنے والد مولانا صوفی مجیب اللہ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء) سے ورثے میں پائے تھے۔ وہ بھی خادِمِ علم و دین تھے، اُنھوں نے اپنے وسیع تر علاقے میں تقریباً دو درجن مدرسے قائم کیے اور زندگی بھر اُن کی خدمت، اُنھیں ترقی دینے اور مسلمانوں کے نو بہاولوں کو زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے میں جی جان سے لگے رہے، اُن کی دین داری اور صلاح و تقویٰ کی وجہ سے لوگ اُنھیں — جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا — ”صوفی مجیب اللہ“ ہی کہا کرتے تھے۔

قائدانہ رنگ و آہنگ کا آغاز

۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں وہ دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں جمعیتِ علمائے ہند کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اُن کا مستقل قیام مرکزی دفتر مسجد عبدالنبی میں رہنے لگا، وہ شب و روز سرگرم کارِ نظر آتے، جمعیت میں آنے والے مہمان (جو بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں کہ جمعیت کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی ایسی تنظیم نہیں جس کی جڑیں مسلم عوام کے دلوں میں اتنی پیوست ہوں) مولانا فضیل کے اخلاق و کردار کی وجہ سے اُنھی کی طرف لپکتے اور جو یہاں سے جاتا ہر جگہ اُن کے اخلاق کا گُن گاتا۔ وہ اپنی خادمانہ روش اور منکسرانہ انداز کی وجہ سے اپنے زمانے میں جمعیت

کی پہچان بن گئے تھے، وہ چھوٹے بڑے، نام آور اور گم نام اور معمولی آدمی سے بھی نرم گوئی سے اس طرح ملتے کہ دل میں گھس جاتے، ہر ایک کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اُس کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں اور وہ اُس کے لیے اتنے مخلص ہیں کہ شاید اُس کی ذات بھی اُس کی اتنی مخلص نہیں۔

لوگوں کے دل کسی کی طرف، اُس کے صلاح و تقویٰ اور زہد و ورع کی وجہ سے بھی کھینچتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے، تو وہ لوگوں کا بھی محبوب ہو جاتا ہے؛ لیکن کبھی کبھی لوگ کسی کی طرف اُن صفات حمیدہ کی وجہ سے بھی لپکتے ہیں، جن سے مولانا فضیل احمد قاسمی متصف تھے۔ یہ صفات دین داری، تقویٰ شعاری اور پرہیز گاری سے قطع نظر بھی اپنے موصوف کو لوگوں کا محبوب بنا دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ان صفات میں جادو کی تاثیر، مقناطیس کی کشش، باؤ سحر گاہی کی برودت اور قند کی حلاوت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی اسی صفات کو برت کے میری تصدیق کر سکتا ہے۔

مولانا فضیل کی یافت و دریافت

۱۳۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، یہ راقم آثم دارالعلوم کے استاد اور ”الداعی“ کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے دیوبند آیا۔ اُس کے بعد ہی دہلی کی جو آمد و رفت شروع ہوئی، تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی، اکثر ”الداعی“ کے کاموں سے اور کبھی کبھار اپنے ذاتی کاموں سے بھی۔ جمعیتِ علمائے ہند چون کہ (اگر میری تعبیر صحیح ہو) دارالعلوم دیوبند کا غیر رسمی طور پر گویا سیاسی رفاہی بازو ہے؛ اس لیے دارالعلوم کے استاذ اور ملازم کی جو کسی کام سے دہلی جائے، جمعیت کے دفتر میں حاضری ناگزیر ہی ہوتی ہے، آتے یا جاتے ہوئے وہ وہاں ضرور جاتا ہے اور یہ وقت ضرورت قیام بھی کرتا ہے؛ اس لیے یہ ناچیز بھی بار بار جمعیت کے مرکزی دفتر نیز گلی قاسم جان میں واقع اُس کی بلڈنگ میں ضرور جاتا، اُن موقعوں سے مولانا فضیل سے گہری واقفیت ہوئی، جو بے تکلفی اور حد درجہ اپنائیت میں

تبدیل ہوتی چلی گئی، وہ راز کی طرح میرے دل کے گوشوں میں آہستہ آہستہ پیوست ہوتے چلے گئے۔ جب بھی دفتر جمعیت جاتا، مولانا فضیل کو اپنی مسکراہٹ اور خدمت کے اُسی پرانے جذبے کے ساتھ مُستعد پاتا، اگر وہ کبھی نہ ملتے اور کسی پروگرام کے تحت دہلی سے باہر ہوتے، تو ایک اہمیت سی معلوم ہوتی، وہ ہوتے تو لگتا کہ درودیوار میں بھی اہمیت ہے اور ہمارے لیے ہر گوشے میں جگہ ہے۔ وہ خدمت کر کے خوش ہوتے، بھلائی کر کے زندگی پاتے، ضرورت پوری کر کے آرام محسوس کرتے۔

مئی ۱۹۸۳ء / رجب ۱۴۰۳ھ میں، میں سعودی عرب کے اپنے پہلے سفر سے واپس آیا، جہاں ۳ ماہ قیام رہا اور غیر عربوں کو عربی پڑھانے والے اساتذہ کی مختصر سہ ماہی ٹریننگ کے کورس، جامعۃ الملک سعود، ریاض میں شرکت ہوئی۔ واپسی کے بعد چند روز دیوبند میں قیام رہا، پھر دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز پٹنہ اور وہاں سے اپنے وطن مظفر پور جانے کے لیے میں دہلی آیا، چوں کہ مطلوبہ فلائٹ کے وقت اور دوبارہ OK (تاکید حجر) وغیرہ کے قوانین وغیرہ سے ناواقفیت تھی؛ اس لیے میں نے جمعیت کے مرکزی آفس مسجد عبدالنبی نئی دہلی میں قیام کرنا مناسب سمجھا؛ چناں چہ میں وہاں اپنے سامان کے ساتھ جا پہنچا، تو مولانا فضیل اپنی اُسی کریم النفسی، خندہ پیشانی اور بے پناہ اپنائیت کے ساتھ ملے اور مزید کرم یہ کیا کہ اپنے قیام والے کمرے ہی میں مجھے جگہ دی، جو مسجد کی مشرقی دیوار سے متصل تھا اور مسجد سے ہی اُس میں آنے جانے کا راستہ تھا۔ اُنھوں نے میرے سارے کام دوا یک گھنٹے کے اندر کرادیے۔ مجھے علی الصبح بہ وقت سحر ہوائی اڈے جانا تھا، میں سونے کے لیے جانے لگا تو مولانا نے کہا کہ آپ اطمینان خاطر کے ساتھ سو جائیے میں نے ۳ بجے صبح کے لیے الارم گھڑی لگادی ہے، میں صبح کو چائے کے ساتھ خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ میں چوں کہ بے چین طبیعت کا واقع ہوا ہوں؛ اس لیے وقت مُقرر پر کیے جانے والے کاموں کے لیے، وقت سے پہلے تیاری میری عادت ہے، چناں چہ میں رات بھر نیند اور بیداری کے درمیان ہی رہا؛ لیکن مولانا

واقعی ٹھیک ۳ بجے چائے لیے آ موجود ہوئے اور کہنے لگے: دیکھیے میں نے آپ سے کہانہ تھا کہ میں وقت پر موجود رہوں گا۔ چائے کے بعد کرایے کی گاڑی منگوائی، جو اُس وقت وہیں جمعیت آفس کے سامنے سے مل جاتی تھی اور وہ مجھے نیچے خود چھوڑنے آئے، جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی، وہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔

سعودی عرب کے ایک سفر میں

مولانا کے جذبہ خدمت سے استفادہ

کسی انسان کو صحیح طور پر جاننے کا اصل موقع سفر ہوتا ہے، جہاں اونچ نیچ کے پیش آنے کا امکان رہتا ہے، مولانا فضیل کو میں نے سفر میں بھی آزمایا ہے، وہ وہاں بھی کندن ثابت ہوئے۔ شعبان ۱۴۰۲ھ / اپریل ۱۹۸۴ء میں، اس ناچیز کو دوبارہ سعودی عرب جانے کی سعادت حاصل ہوئی، جہاں شعبان اور رمضان کے بیشتر حصے میں نے حرمین شریفین میں گزارے۔ مولانا فضیل میری آمد سے پہلے سے ”جدہ“ میں موجود تھے، اُن کے ہم راہ جمعیت علماء کے پندرہ روزہ عربی ترجمان ”الکفاح“ (۱) کے کارگزار ایڈیٹر مولانا منزل الحق بھی تھے، انھیں جیسے ہی میری ”جدہ“ آمد کا علم ہوا، وہ ہوائی اڈے پر میرے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ساتھ ہی اپنی جائے قیام لے آئے، جو مولانا بدر الدین اجمل آسامی قاسمی رکن شوری دارالعلوم دیوبند کی مشہور کمپنی ”اجمل واولادہ للعطور“ کے آفس میں تھی، جو اُس وقت نئی نئی ”جدہ“ میں قائم ہوئی تھی اور مولانا شمشاد مظفر نگری قاسمی (۲) اور مولانا جمیل احمد بجنوری قاسمی (۳) اجمل کمپنی کے تعارف کے لیے سرگرم عمل تھے اور وہی دونوں آفس کے انچارج تھے۔ کئی روز مولانا فضیل ساتھ رہے اور ”جدہ“ شہر میں اپنے

(۱) جو کئی سال پہلے یعنی یکم دسمبر ۱۹۸۷ء کے شمارے کے شائع ہونے کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ یہ ۱۹۷۲ء سے نکلتا شروع ہوا تھا۔

(۲) حال مقیم ”جدہ“ جو اب اپنی ”القاسمی للعطور“ کمپنی قائم کر کے مصروف تجارت ہیں۔

(۳) حال مقیم ریاض جو خود بھی اپنی عطر و عود کی کمپنی قائم کر چکے ہیں۔

ساتھ خوب گھمایا پھرایا؛ لیکن اُس وقت بے حد افسوس ہوا، جب اُنھوں نے کئی روز کے بعد یہ کہہ کر داغ مفارقت دے دیا کہ ہم لوگ بھی چوں کہ جمعیت کے تعارف کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں اور یہاں سعودی عرب کا ہمارا مشن ختم ہو گیا ہے؛ اس لیے اب کویت وغیرہ کا پروگرام ہے۔ اُن کے جاتے ہی ایسا لگا کہ اب میں بے یار و مددگار ہو گیا ہوں۔ بہ ہر کیف پھر عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ اور باقی وقت مدینہ منورہ میں گزرا اور ریاض میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی بہ روز جمعرات: ۲۶/ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳/ مئی ۱۹۹۹ء) سے ملاقات اور دارالعلوم کے تعارف کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا فضیل کا کسی جگہ ساتھ ہو جاتا تو ایسا لگتا کہ اب ہمیں کچھ سوچنا ہے نہ کرنا ہے؛ کیوں کہ سارے معاملات، حالات اور ”نان و نفقہ و سکنی“ سے لے کر زندگی کے سارے مسائل کا بار، وہ صرف اپنے سراوڑھ لیتے اور ساتھ والا بے فکری اور مکمل آرام کے ساتھ صرف وقت گزارتا، یا اُن کے ساتھ ساتھ رہتا اور لطف زندگی حاصل کرتا۔

مولانا فضیل کی جمعیتِ علما سے علاحدگی اور نئے سفر کی سمت کی تلاش و تعین

مولانا فضیل جمعیتِ علما سے ہند کی ہمہ گیر خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے، تعلقات کے قیام و استواری کی اپنی ساحتِ انہ صلاحیت اور عدیم الشال لیاقت کے ذریعے لوگوں کو جمعیت کا گرویدہ اور وفادار و خدمت گزار بناتے رہے اور اُس کی عوامی مقبولیت (جو پہلے سے بھی ساری جماعتوں اور تنظیموں سے اُس کو زیادہ حاصل ہے) میں اضافے کے ذریعے مسلم معاشرے میں اُس کی جڑیں پیوست کرتے رہے۔ اُنھیں مولانا سید اسعد مدنی (صدر جمعیت علما ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۲۸ء — ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) سے بڑی عقیدت و محبت تھی، جو تاحیات قائم رہی۔ کسی جماعت و تنظیم کو اگر مولانا فضیل جیسے دو ایک آدمی مل جائیں، تو اُس کی عوامی مقبولیت کی ہمہ گیری کی ضمانت کے لیے بالکل کافی ہے اور اس

کے بعد اُس جماعت اور تنظیم کو پھر کسی کی دشمنی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ۲۷/ ستمبر ۱۹۹۱ء مطابق ۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ کو ہم لوگوں کو اچانک یہ سننے کو ملا کہ مولانا فضیل احمد قاسمی اپنے ۸-۹ ساتھیوں سمیت، جن میں مولانا اسرار الحق قاسمی (حال صدر ملی و تعلیمی فاؤنڈیشن ورکن ایوان زیریں ”لوک سبھا“) و مولانا صدر الدین صدر انصاری بھوپالیؒ (متوفی جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ = نومبر ۱۹۹۵ء) وغیرہ شامل ہیں، جمعیت سے مستعفی ہو گئے ہیں، تو بے حد افسوس ہوا اور دل نے کہا کہ یہ اُن لوگوں کے لیے اچھا ہوا یا بُرا، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا؛ لیکن جمعیت کے لیے تو یہ بہت بُرا ہوا کہ مولانا فضیل اور مولانا اسرار جیسے لوگ آسانی سے دست یاب نہیں ہوتے؛ بل کہ برسوں کی محنت و دعا کے بعد بہ مشکل تمام صرف توفیق الہی سے ہی تیار ہو پاتے ہیں۔ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۱ء مطابق ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ کو ان لوگوں کا استعفا منظور کر لیا گیا۔

مولانا اسرار الحق قاسمی مدظلہ العالی نے کچھ دنوں بعد ”ملی و تعلیمی فاؤنڈیشن“ قائم کر لی، جس کا مرکز ذاکر نگر اوکھلا میں ہے اور جو ملت کے لیے تعمیری و تعلیمی میدانوں میں ٹھوس سطح پر مصروف عمل ہے۔ مولانا فضیل احمد قاسمیؒ نے اپنے مجاہدین کے تعاون و اشتراک سے ۲۳/ نومبر ۱۹۹۲ء مطابق ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ کو مرکزی جمعیت علماء ہند کے نام سے دوسری جمعیت بنائی؛ لیکن خود انھوں نے اُس کی صدارت قبول نہیں کی؛ بل کہ وہ تاحیات جنرل سکریٹری رہے۔ اُس کے پہلے صدر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء — ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) رہے، دوسرے صدر مولانا صدر الدین صدر انصاری بھوپالیؒ تھے، جب کہ تیسرے صدر مولانا عبدالحق سملکی گجراتی (متوفی ۹/ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ مطابق ۴/ جولائی ۱۹۹۸ء) اور چوتھے صدر مولانا افضل الحق جوہر قاسمی مدظلہ العالی ہوئے، جو اپنی بیماری و پیرانہ سالی کے باوجود اس وقت بھی ہیں۔

مولانا فضیل نے اپنی جمعیت کے مستقر کے طور پر مہدیان میں حضرت الامام شاہ

ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مزارِ مبارک کے کیمپس میں واقع ”جامعہ رحیمیہ“ کی عمارت کے ایک بازو کو منتخب کیا اور اُن کی وفات تک یہی مُستقر رہا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ہر طرح کے ضرورت مند آتے اور مولانا فضیل اُن کی ضرورتوں کو نہ صرف پوری کرتے؛ بل کہ اُن کی رہائش اور کھانے پینے کا بہترین انتظام کرتے۔ اُن کی پیشانی پر بل آتا، نہ انھیں کبھی کبیدگی ہوتی، نہ وہ کسی پیچیدہ کام کے لیے آنے والے سے دل برداشتہ ہوتے؛ کیوں کہ وہ خدمتِ خلق ہی کے لیے اپنا اڈہ یہاں جمائے ہوئے تھے۔ اُن کی شیریں کلامی، دل رُبا گفتار و کردار کی وجہ سے بہت سے اہل حکومت و سیاست و قیادت سے اُن کے بے تکلفانہ تعلقات تھے، جنھیں وہ ہمیشہ ملک و ملت کی بھلائی کے لیے سلیقے سے استعمال کرتے رہے، انھوں نے رفاہی کاموں اور بھلائی کی سرگرمیوں کے ذریعے دعاؤں کی جو سوغات حاصل کی، انھی کی طرح کے گنے چنے خوش قسمتوں نے حاصل کی ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے کہ مولانا فضیل اور اُن کی طرح کے لوگ خدمت گزاری، نیک نامی اور تذکرہ حسن کی راہ سے، اللہ کے ہاں اپنی دیگر خامیوں کے باوجود، جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں، بڑا مقام و مرتبہ حاصل کر لیں گے؛ کیوں کہ حسنِ اخلاق ہمارے غفور رحیم کو اتنا پسند ہے کہ وہ ایمان والوں کو سب سے زیادہ اسی راہ سے جنت میں داخل کرے گا۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اپنی جامع میں ایک روایت درج کی ہے، جس کو انھوں نے ”حدیث حسنِ صحیح“ قرار دیا ہے، جس میں فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سے جنت میں سب سے زیادہ داخل کرنے والے عامل کے متعلق پوچھا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ”خدا ترسی اور حسنِ اخلاق“ پھر آپؐ سے جہنم میں لے جانے والے سب سے بڑے محرک کی بابت پوچھا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ”منہ اور شرم گاہ۔“

ہر دل عزیز عالمِ دین

اُن سے ہر طرح کے لوگ ملتے، مسلم بھی اور غیر مسلم بھی، طلبہ بھی اور علما بھی،

معاشرے کے عام انسان بھی اور خواص بھی، گم نام، بے نام اور انتہائی نیک نام بھی۔ ہر ایک کو یہ یقین ہوتا کہ مولانا فضیل سے ہمارا کام ضرور ہو جائے گا۔ اُن کے پاس آنے والوں کو سب سے زیادہ جو چیز لے کے آتی، وہ اُن کا بے تکلفانہ بے ساختہ اور اپنائیت کا انداز ہوتا۔ بعض دفعہ آدمی کسی کام کے آدمی کے پاس اُس کی افادیت کے باوجود، صرف اس لیے نہیں جاتا ہے کہ اُس کا انداز متکلفانہ ہوتا ہے اور وہ کام تو کر دیتا ہے، لیکن اُس کا تصنع و استعلاقیات یا ملاقات کی خاص ترتیب اور پیچیدگی یا ایک قسم کی ”بداخلاقی“ اُس کے پاس جانے سے مانع بنتی ہے، ویسے بھی بعض دفعہ بلند بام، تنگ در ثابت ہوتا ہے، جب کہ جھونپڑی میں کشادگی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔

مولانا نے اندرون ملک کے کونے کونے کا سفر کیا اور ساتھ ہی بیرون ملک کے بہت سے ممالک میں بھی اُن کا بار بار آنا جانا ہوا۔ ہر جگہ اُن کے محبتیں اور شاخوانوں کی ایک معتد بہ تعداد پائی جاتی تھی۔ انھوں نے سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین، عمان، امارات عربیہ متحدہ، انگلینڈ، جنوبی افریقہ، ویسٹ انڈیز وغیرہ کا دورہ کیا، انسانوں کی دعاؤں اور اُن کے ذکرِ خیر کا مستحق بنے اور دین و ملت کے لیے جو ہو سکتا تھا وہ کیا۔ وہ ایک بار شاہ فہد بن عبدالعزیزؒ (متوفی دوشنبہ: ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ مطابق یکم اگست ۲۰۰۵ء) کی دعوت پر حج و زیارت سے بھی شرف یاب ہوئے۔ رابطہ عالم اسلامی کے سابق جنرل سکریٹری شیخ عبداللہ عمر نصیف مدظلہ سے اُن کے بڑے گہرے روابط تھے، ہندوستان کے چند بڑے اہل علم و قیادت کے علاوہ کسی کے اتنے گہرے تعلقات اُن سے نہ تھے؛ نیز موجودہ سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی اور سابق وائس چانسلر امام سعود یونیورسٹی عبداللہ عبدالمحسن ترکی مدظلہ سے بھی اُن کا بے تکلفانہ تعلق تھا۔ وہ کئی بار شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملے اور جمعیت علماء اور دارالعلوم کے حوالے سے انھیں اپنے سے قریب کیا۔

وہ متعدد منصوبوں پر اعزازی طور پر فائز رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ

پس مرگ زندہ

کے ممبر رہے، جامعہ اردو علی گڑھ کی چانسلری پر فائز رہے، کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے عہدے پر بھی کام کیا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلسوں میں خصوصی مدعو کی حیثیت سے بلائے جاتے رہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اُن کی کشادہ نفسی کی وجہ سے، مسلمانوں کی اکثر جماعتیں اور تنظیمیں انھیں اپنے سے قریب سمجھتی تھیں؛ کیوں کہ وہ ساری جماعتوں اور تنظیموں کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔

انھوں نے اپنی جمعیت کی ایک بڑی، پر شکوہ اور خوب صورت سی عمارت بھی بگلہ ہاؤس، دہلی میں تعمیر کی، جس سے ایک مسجد بھی ”مسجد تقویٰ“ کے نام سے اٹیچ ہے اور ایک مدرسہ بھی۔ یہ عمارت اُن کا ایک پائے دار کارنامہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو تعجب تھا کہ بے سروسامانی کے باوجود انھوں نے اتنی بڑی، اتنی اچھی اور مہنگی عمارت کیسے بنائی؟

انھوں نے اپنے ورثا میں اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ اہلیہ، ایک لڑکا فاضل دیوبند: مولانا محمد سہیل قاسمی، نیز دو لڑکیاں اور ایک بھائی ڈاکٹر عزیز احمد قاسمی چھوڑا ہے۔ اُن کے ایک بھائی شعیب احمد قاسمی کا دو تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ انھیں اپنی جنت میں اعلیٰ مقام اور پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرمائے۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الذاعی“ عربی شمارہ ۴، جلد ۳۳، بابت ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ، مطابق اپریل ۲۰۰۹ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود اربعہ دن، جمعہ ۲۴/ صفر ۱۴۳۰ھ = ۲۱/ فروری ۲۰۰۹ء۔

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر الحاج محمد اجمال علی آسامیؒ

۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء — ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

وہی ہے صاحبِ امروز، جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے ، نکالا گوہر فردا

سہ شنبہ: ۲۱/صفر ۱۴۳۰ھ = ۱۷/فروری ۲۰۰۹ء صبح تقریباً بج کر ۵۵ منٹ پر،
عطر و عود کے بڑے اور دیانت دار و نیک نام مشہور تاجر الحاج محمد اجمال علی بن عبد المجید
آسامی اپنی رہائش گاہ واقع ”میکرٹاور“ علاقہ ”کف پریڈ“ ممبئی (سابق بمبئی) میں
۸۶ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ کئی سال سے بڑھاپے کی وجہ سے کئی طرح کے امراض کا شکار تھے۔ اُن کا اعلیٰ
پیمانے پر اچھے سے اچھا علاج ہوا، اُن کے سپوت اور ہونہار فرزندوں نے اُن کی خدمت
و نگہداشت کے ذریعے بڑی نیکی کمائی اور اُن کا جی خوش کرنے کے ساتھ ساتھ رب
شکور کے ہاں اپنے لیے بہت سا ثواب و جزا انداختہ کیا۔ اُن کی نماز جنازہ ممبئی کے
”وی ٹی“ علاقے کے انجمن اسلام ہائی اسکول کے میدان میں سہ شنبہ و چہار شنبہ: ۲۱-۲۲/صفر
۱۴۳۰ھ مطابق ۱۷-۱۸/فروری ۲۰۰۹ء کی درمیانی شب میں تقریباً بجے، دارالعلوم
دیوبند کے استاد حدیث مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ نے پڑھائی، جس میں ممبئی کے بڑے
بڑے شجرار و کاروباری حضرات نیز ملک کے متعدد مسلم قائدین و سیاست داں و علما و طلبہ

اور عام مسلمانوں کا ہم غیر شریک ہوا۔ مرحوم کے فرزندان اور رشتہ دار جو بیرون ملک بالخصوص خلیجی عربی ممالک میں کاروبار کے لیے مقیم ہیں، سبھی آگئے تھے، نیز دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ علما کے مقرر و فود نے بھی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ دارالعلوم کے وفد کی سربراہی، دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی نے کی۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن نے اپنی ذاتی نمائندگی کے لیے اپنے صاحب زادے مولانا انوار الرحمن قاسمی کو بھیجا۔ دوسری نماز جنازہ ”مرین لائن“ کے قبرستان میں، جس میں مرحوم کی تدفین عمل میں آئی، بارہ۔ ایک بجے شب میں، اُن کے صاحب زادے مولانا بدرالدین اجمل قاسمی رکن شوری دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی۔ ۲ بجے شب میں اُن کی تدفین عمل میں آئی۔ اللہ غریق رحمت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دینی و رفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والے تاجر

چند سال قبل تک وہ عموماً صحت مند تھے، اُس وقت اُن کا حرمین شریفین کی زیارت اور حج و عمرہ کے لیے معمول رہا تھا، وہ کافی وقت حرمین شریفین میں گزارتے رہے تھے۔ وہ بڑے نیک، خدا ترس، فقیروں اور مسکینوں پر ترس کھانے والے آدمی تھے۔ بیواؤں، یتیموں، مجبوروں پر فراخی سے خرچ کرنا اُن کا معمول تھا۔ دینی و رفاہی کاموں اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے منصوبوں پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرنا اُن کی عادت تھی، وہ مکمل حساب کے ساتھ ایک ایک پائی زکاۃ کی رقم ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ نے صرف اسی لیے مجھے برکت سے نوازا ہے۔ امانت و دیانت اُن کا کاروباری ستون تھا، انھوں نے اپنی تجارت کی بنیاد سچائی اور پاک بازی پر رکھا تھا۔ وہ نوجوانی سے نہ صرف پابندِ صوم و صلاۃ؛ بل کہ تہجد گزار اور شب بیدار رہے تھے۔ اپنی ساری اولاد کو دین اور احکام دین کا پابند بنایا، اس حوالے سے وہ بڑے سخت واقع

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر الحاج محمد اجمل علی آسامی

ہوئے تھے۔ وہ وقت، وعدہ اور نظام و قانون کے بھی بڑے پابند تھے۔ اُن کی اُصول پسندی سے اُن کے سارے ملازمین واقف تھے اور ذرا سا بے اُصولی اُن میں سے کسی سے بھی سرزد ہو جائے، تو وہ بہت ڈرتا تھا کہ حاجی اجمل اُسے سزا ضرور دیں گے۔ اُنھوں نے اپنی تجارت کے فروغ پر جتنی محنت کی، اُسی قدر یا اُس سے کچھ ہوا اپنی اولاد کی تربیت پر توجہ دی، اُن کے لیے علما و صالحین کی تربیت و صحبت سے باقاعدہ فائدہ اُٹھاتے رہنے کا نظام وضع کیا، جس پر اُن سے پابندی سے عمل کرواتے تھے، اپنی ایک اولاد مولانا بدر الدین اجمل قاسمی کو باقاعدہ عالم بنایا، وہ دارالعلوم سے نہ صرف فارغ ہوئے؛ بل کہ شروع سے اب تک دارالعلوم کی خدمت، اُن کی سرگرمی حیات کا جلی عنوان ہے۔ (ہیں) وہ نہ صرف عالم بنے؛ بل کہ مولانا سید اسعد مدنی (۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء — ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) اور مولانا احمد علی آسامی (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء — ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء) کے باقاعدہ دست گرفتہ اور اُن کے خلیفہ ہوئے۔ حاجی محمد اجمل علی کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی، وہ چاہتے تو اپنی اولاد و احفاد کے لیے بڑی سے بڑی عصری تعلیم گاہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا، اپنے مصارفِ خاص سے انتظام کر سکتے تھے؛ لیکن اُنھوں نے اپنے پوتوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے بھی باقاعدہ دیوبند میں مکان خریدا، اُن کی رہائش کا انتظام کیا اور اُنھیں حافظ و قاری قرآن پاک کے بعد عالم و مفتی بننے کی راہ ہم واری۔ اُن کے تقریباً ایک درجن پوتے دیوبند میں رہائش پذیر ہیں اور علما و اُتقیا کی صحبت میں دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

دیانت دار تاجر

حاجی محمد اجمل علی بن عبدالمجید ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء میں ایک پس ماندہ علاقے میں (جو ”سِلہٹ“ کے نام سے جانا جاتا تھا اور اُس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آسام کا حصہ تھا اور اب ”بنگلہ دیش“ میں ہے) اِس عالم آب و گل میں آئے۔ ”ہو جانی“ کے

قریب ”علی نگر“ گاؤں میں ابتدائی تعلیم اور ”نیل باغان“ کے ہائی سکندری اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کی، وہ اپنے آبائی پیشہ زراعت ہی میں لگے رہے؛ لیکن شروع سے وہ بیماری کی وجہ سے قدرے کم زور ہو گئے تھے؛ اس لیے اُن کا میلان تجارت کی طرف ہوا، اُنھوں نے ”ہوجائی“ میں عطر و عود کا چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا۔ ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء میں وہ ”ہوجائی“ سے ”ممبئی“ (بمبئی) آ گئے، یہاں اُنھوں نے معمولی پیمانے پر یہی کاروبار جاری رکھا۔ ”الحافظ ٹریڈرس“ کمپنی کے ساتھ اشتراک کر لیا، وہ آسام سے سامان لاتے اور اس کے اشتراک میں کام کرتے۔ محنت، سچائی، دیانت داری اور دین داری کے ساتھ شبانہ روز کی محنت کی وجہ سے اللہ نے اُنھیں برکت دی، آج اُن کی اولاد کے پاس دنیا کے مختلف ملکوں اور ہندوستان میں ایک سو سے زائد شوروم ہیں۔ اُن کی اجمل کمپنی عطر و عود کے حوالے سے دنیا بھر میں اپنا امتیاز و وقار رکھتی ہے اور اجمل کا مطلب ہی مال کے اصلی ہونے کی علامت ہے۔ اُن کے کاروبار میں اتنی وسعت و ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ اُن کے ہاں دیانت و سچائی اور زکاۃ کے مکمل طور پر ادا کرنے کا جس درجہ اہتمام ہے، وہ کم تاجروں کے ہاں ہوگا۔ آج حاجی محمد اجمل علی دنیا سے اس حال میں گئے ہیں کہ اُن کی اولاد صاحب ثروت ہے، اُن کے ہاتھ اونچے ہیں کہ وہ خوب لوگوں میں داد و دہش کیا کرتے ہیں۔

علمائے صالحین کے دست گرفتہ و صحبت یافتہ

مرحوم ہمیشہ نیکوں اور علمائے متقین سے جڑے رہے، اُن کی صحبت میں جانا، اُن کے نفس گرم کی تاثیر سے اپنی ذات کو مٹو کرنا اور باطن کو سنوارنا، اُن کا مستقل رویہ رہا۔ دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علمائے ہند، تو اُن کے گھر اور خاندان کی طرح تھے۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء — ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت ہوئے، اُن کے انتقال کے بعد وہ حضرت مولانا احمد علی آسامی

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر الحاج محمد اجمل علی آسامی

رحمۃ اللہ علیہ کے دست گرفتہ ہوئے۔ انھوں نے دیگر بہت سے رفاہی کاموں کے ساتھ ”ہوجائی“ میں ایک بڑا ہسپتال ”حاجی عبدالمجید میموریل ہوسپتال اینڈ ریسرچ سینٹر“ (Haji Abdulmajeed Memorial Hospital & Reserch center) قائم کیا، جس میں ۳۵۰ بیڈ کی گنجائش ہے، اُن کے فرزندوں نے اسے ۵۰۰ بیڈ تک وسعت دینے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ نیز انھوں نے ”گوالپاڑہ“ اور ”ڈبری“ ضلعوں میں فساد سے متاثر یتیموں کے لیے دو ہاٹل قائم کیے، جن میں سے ایک میں ۷۵۰ اور دوسرے میں ۳۵۰ بچوں کی گنجائش ہے، نیز انگریزی اور عصری تعلیم کے لیے ۱۲ اسکول قائم کیے گئے ہیں اور مزید کے لیے سرگرمی جاری ہے۔ اسی کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کے لیے بھی ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ ایک بڑا اور اہم کام ”مرکز المعارف“ کے نام سے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے انگریزی تعلیم کے ادارے کا قیام ہے، جس کا مرکز ممبئی میں ہے، جس میں اعلیٰ پیمانے پر انگریزی تعلیم دو سالہ نصاب کے تحت دی جاتی ہے، نیز کمپیوٹر میں بھی اکسپرٹ بنایا جاتا ہے۔ اس ادارے سے بڑی تعداد میں فارغین مدارس نے انگریزی سیکھی اور وہ دین و دنیا سے متعلق مختلف میدان ہائے حیات میں عزت و آبرو اور وقار کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ تحقیق و ریسرچ کے شعبے کے ساتھ ساتھ، اُس سے ایک ماہ وار ہمہ گیر انگریزی رسالہ بھی شائع ہوتا ہے، جو گویا زیر تعلیم طلبہ کے لیے مضمون نویسی کا بہترین پلیٹ فارم ہے۔

حاجی محمد اجمل علی مرحوم نے اپنے پیچھے پانچ باتوفیق بچے: امیر الدین اجمل، فخر الدین اجمل، مولانا بدر الدین اجمل قاسمی، سراج الدین اجمل اور نذیر الدین اجمل، نیز دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ سبھی صاحبِ اولاد ہیں اور مجموعی طور پر سبھی دینی مزاج کے حامل ہیں۔ اُن کے لڑکے مولانا بدر الدین اجمل قاسمی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، دارالعلوم دیوبند سے فارغ اور دارالعلوم کی شوریٰ کے سرگرم رکن ہیں۔ وہ دینی میدانوں کے علاوہ پچھلے کچھ سالوں سے میدانِ سیاست میں بھی فعال ہیں، انھوں نے ”آسام

یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ“ (یو ڈی ایف) کے نام سے مستقل سیاسی پارٹی ترتیب دی، پہلے اپنے صوبے آسام میں اُس کو سرگرم کیا، وہاں اُس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، اب ملک کے دوسرے صوبوں میں اُس کی توسیع کے لیے تگ و دو کی جا رہی ہے۔

دین دار تاجر کی قابل تقلید مثال

مرحوم الحاج محمد اجمل علی آسامی دین دار و امانت دار تاجر کی قابل تقلید مثال تھے۔ اللہ نے انھیں جہاں بے پناہ مال و دولت سے نوازا تھا، وہیں انھیں نیک سیرت و فرماں بردار اولاد بھی عطا کی، ساتھ ہی انھیں اپنی اس توفیق خاص سے بھی نوازا کہ انھوں نے اپنی دولت کا قابل لحاظ حصہ، دین، دینی تعلیم، اسلامی مدارس و جامعات، بالخصوص دارالعلوم دیوبند و جمعیت علماء ہند پر فیاضی کے ساتھ خرچ کیا اور ضرورت مندوں، مسکینوں، یتیموں اور بیماروں کے علاج معالجے کے لیے، اپنی پاک کمائی کا معتدبہ ٹکڑا مخصوص کیا اور اپنے بعد اپنی اولاد کو تاکید نصیحت کی کہ وہ مذکورہ شریفانہ مقاصد کے لیے انھی کی طرح کوشاں رہیں اور آمدنی کے بڑے جز کو مستقلاً اُن کے لیے مخصوص رکھیں۔ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ کہتے تھے کہ ہماری تجارت میں برکت کار از محض زکاۃ کی مکمل ادائیگی اور کارِ خیر میں خرچ میں پوشیدہ رہا ہے، وہ انھیں بتاتے تھے کہ قرآن پاک اور حدیث رسول ﷺ میں صاف لفظوں میں وارد ہوا ہے کہ ہمارے مالوں میں زکاۃ کے علاوہ بھی فقر و محرومین کے کچھ حصے ہوا کرتے ہیں، جنھیں نکالنے میں ہمیں دریغ نہیں ہونا چاہیے۔

حاجی صاحبؒ کے ساتھ راقم کا مدینہ منورہ کا یادگار و پر بہار سفر

رمضان ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء میں، یہ راقم آٹھ ”جدہ“ میں تھا، ”مرکز الفیصلیہ“ نام کی مشہور عمارت میں حاجی اجملؒ ہی کے شوروم کے ملازمین کی قیام گاہ میں رکا ہوا تھا؛

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر الحاج محمد اجمل علی آسامی

کیوں کہ علما و صلحا بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ علمائے ہند سے متعلق علما کے لیے یہ قیام گاہ شروع سے اُن کی ہدایت کے مطابق مہمان خانہ بھی رہا، جہاں ہر ایک کو ہمیشہ حج و عمرے کی ادائیگی، یا کسی اور ضرورت سے سعودی عرب آمد کے موقع سے، گھر کی سی سہولت اور آرام میسر رہتا تھا، میں عمرے کی سعادت کے بعد یہاں مقیم تھا، مجھے مدینہ منورہ جانا تھا اور وہاں سے واپسی پر ”جدہ“ سے ریاض ہوتے ہوئے ہندوستان واپس ہونا تھا، ہر جگہ آمد و رفت کا ٹکٹ مجھے اُس وقت سعودی عرب کے سفیر برائے ہند جناب فواد صادق مفتی نے عنایت فرمایا تھا۔ میں پایہ رکاب تھا کہ شوروں کے ملازمین نے بتایا کہ آج الحاج محمد اجمل علی آرہے ہیں اور وہ آج ہی یا کل مدینہ منورہ جانے کو ہیں۔ مجھے اُن لوگوں نے کہا کہ آپ آج رُک جائیں، اُن سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور تعارف بھی ہو جائے گا، انھیں یقیناً آپ سے وگرا سائنڈ دارالعلوم کی طرح مل کے خوشی ہوگی۔ چنانچہ وہ تشریف لائے تو اُن سے ملاقات و تعارف ہوا۔ میں نے انھیں اپنا پروگرام بتایا کہ میرا آج شام کے وقت کا مدینہ منورہ کے لیے OK اوکے تھا؛ لیکن ان لوگوں نے مجھے آپ کی آمد کا بتایا تو میں شرفِ ملاقات کے لیے رُک گیا تھا، اب آپ اجازت دیجیے تاکہ میں سفر کے لیے تیاری کر سکوں۔ انھوں نے سنتے ہی فرمایا: تمہیں مدینہ منورہ جانا ہے تو میرے ساتھ چلو، میں گاڑی سے جاؤں گا، بڑی اور آرام دہ گاڑی ہے، راستے کے منظر سے ہم لطف اندوز ہوں گے اور حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ کی یاد سے ہمیں سعادت حاصل ہوگی، کیا عجب کے اس صحرا میں کسی ایسی جگہ پر بھی ہماری نگاہیں پڑ جائیں، جہاں سے کبھی اُن قدسی صفات انسانوں کا گزر ہوا ہوگا۔ ہوائی جہاز کا OK اوکے ختم کروادو، ٹکٹ تمہارا اوپن ہے، یہ واپس ہو جائے گا اور تمہاری رقم بچ جائے گی، ساتھ رہو گے باتیں کرتے چلیں گے اور مجھے تم سے اُنسیت بھی ہوگی۔

چنانچہ دوسرے دن ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد دوڑھائی بجے کے قریب روانہ ہوئے، اُن کے ساتھ کئی خدام اور جدہ کے شوروں کے کئی ملازمین تھے۔ راستے میں نبی

ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی جاں فشانی اور اسلام کے لیے اُن کی قربانی کا تذکرہ رہا۔ بدر و احد کے معرکوں کے واقعات یاد کیے جاتے رہے۔ ہم ٹھیک اذانِ مغرب کے وقت مسجدِ قبا پہنچ گئے، ہم نے سیکڑوں روزہ داروں کے ساتھ افطار کیا اور نمازِ مغرب کے بعد فوراً مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ جنت البقیع قبرستان کے شمال میں ایک بلندنگ میں حاجی صاحب کے خدام نے کئی کمروں پر مشتمل ایک ”شقہ“ لے رکھا تھا، ہم جیسے ہی اُس میں داخل ہوئے اور اُن کا سامان سیٹ ہو گیا، تو ہم نے حاجی صاحبؒ سے اجازت لے لی کہ یہاں ہم بلا تکلف رہنا چاہتے ہیں، آپ کی درازی عمر اور اُس کے عوارض کی وجہ سے، آپ کی ترتیبات دوسری ہوں گی اور میری دوسری؛ اِس لیے یہاں کی مبارک ساعتوں میں، میں آپ کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونا مناسب نہیں سمجھتا، آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں بعض دوستوں کے ساتھ، جنھیں پہلے سے کہہ رکھا ہے، وقت گزاروں۔ اُنھوں نے میری ”مدل تقریر“ کے بعد بادل نا خواستہ اجازت دے دی؛ لیکن فرمایا کہ تم ساتھ رہتے تو اچھا تھا، مجھے کوئی خلل نہ ہوتا؛ لیکن مجھے تمھارے آرام میں آرام ہے۔

حاجی اجمل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، اِس سے پہلے یا اِس کے بعد اتنی دیر تک اِس طرح بے تکلفی کی صحبت تو کیا ملاقات کا بھی موقع نہیں ملا تھا، اِس تفصیلی ملاقات میں، جو مبارک شہر کے مبارک سفر کے دوران، مجھے اُن کے ساتھ حاصل ہوئی، وہ انتہائی متواضع، بے نفس، سادہ مزاج، دینی فکر سے سرشار نظر آئے۔ اُن میں علما و صالحین سے بڑی محبت محسوس ہوئی۔

اُنھوں نے پورے سفر میں دنیا کی کوئی بات نہیں کی، وہ صرف دینی باتیں کرتے اور سنتے رہے، اُن پر دینی فکر غالب نظر آئی اور آخرت کے متعلق سوچنا ہی اُن کا شیوہ محسوس ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ خاص توفیقِ الہی کی بات ہے کہ بہت سارے مال و دولت کے باوجود، اُن کے ذہن اور دل پر دنیا کا تسلط نہیں ہے؛ ورنہ اُن

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجرا الحاج محمد اجمل علی آسامیؒ
 کے ایسے اکثر لوگ مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے فخر و مباہات، بے وجہ کی شہرت
 اور ریا کاری و مکاری ہی میں مبتلا رہتے ہیں اور نیکی کا کام بھی دینی شہرت اور دنیوی نام
 آوری کے لیے کیا کرتے ہیں؛ کیوں کہ ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنالیتی ہے
 تصویریں۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الداعی“ عربی شمارہ ۴، جلد ۳۳، بابت ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ مطابق اپریل ۲۰۰۹ء۔ اردو
 تحریر یہ قلم خود، اواخر صفر ۱۴۳۰ھ = اواخر فروری ۲۰۰۹ء۔

مولانا عبدالحق خان قاسمی مظفر پوری سیتا مڑھویؒ

۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء — ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

کہیں سرمایہ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

چہار شنبہ: ۷/۵/۱۴۳۰ھ مطابق ۱۳/۵/۲۰۰۹ء کو تقریباً ۲ بجے، شدید بخار اور دائیں پاؤں کے ٹخنے کے زخم، نیز شکر کے مرض سے پیدا شدہ نئے عوارض کی وجہ سے، بے چینی کے عالم میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں اچنکھا ہوا کہ اس وقت عموماً مجھے کوئی فون نہیں کرتا یہ کون صاحب ہیں، جو اس وقت فون کر رہے ہیں، یہی سوچتے ہوئے میں نے بٹن دبایا، تو ایک صاحب کو ٹنگین لہجے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت! ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحق خان قاسمی بالاسا تھوی، اس دنیا میں اب نہیں رہے۔ ایک بج کر ۲۰ منٹ پر وہ اپنے رب جا ملے۔ میں نے ”إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ“ کا ورد کرتے ہوئے، خبر دینے والے کو دعا دیتے ہوئے، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت و بلندی درجات کے کلمات کہے۔ چند منٹ بعد ملک و بیرون ملک سے کئی آدمیوں نے فون کیا، جن میں سے کچھ اس خبر کی تصدیق چاہ رہے تھے اور کچھ یہ سمجھ کر خبر دے رہے تھے کہ شاید مجھے ابھی اس کا علم نہ ہوا ہوگا، جس سے اندازہ ہوا کہ آنا فانیہ خبر ملک اور بیرون ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہے۔

مولانا کی وفات سے طبعی طور پر تو شدید رنج و غم ہوا، لیکن اُن کا انتقال میرے

لیے اور اُن ہزاروں آدمیوں کے لیے کوئی اچانک واقعہ نہ تھا، جو پہلے سے جانتے تھے کہ مرحوم سال ہا سال سے طرح طرح کے شدید امراض کا شکار تھے اور شکر کے مرض کی وجہ سے آخری سالوں میں خاصی پیچیدگیوں اور ایسے عوارض کی زد میں آ گئے تھے کہ اُن کے لیے چلنا پھرنا اور انسانی ضرورتوں کو پوری کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ مفلوج اور بے دست و پا ہو گئے تھے۔

مرض الوفات میں مولانا سے ملاقات

مارچ ۲۰۰۹ء (ربیع الاول ۱۴۳۰ھ) کے وسط میں، اِس ناچیز کو اپنے علاج اور دیگر ضروریات کی وجہ سے گھر جانا ہوا۔ دیوبند سے چلتے وقت ہی یہ سوچ کے چلا تھا کہ گھر جاتے ہی پہلے مولانا کی عیادت کرنی ہے؛ کیوں کہ اُن کی بیماری اور صحت کی بڑھتی ہوئی ناہمواریوں کی مجھے مسلسل اطلاع مل رہی تھی۔ اُن کا گاؤں ”بالا ساتھ“ میرے گاؤں ”ہرپوریشی“ سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ہے، میں نے دوسرے ہی دن کرایے کی گاڑی لی اور اپنے فرزند اوسط ”عمارہ نور“ سلمہ نیز گاؤں کے چند افراد کے ساتھ، اُن کے گھر پہنچا۔ گاڑی کی آواز سن کر مولانا مرحوم کے بھائی جناب عبدالسلام صاحب باہر کو آئے، علیک سلیک کے بعد فوراً اندر گئے، پردہ وغیرہ کرا کے واپس آئے اور ہم لوگوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمیں سیدھے مولانا کی چارپائی کے پاس لے گئے۔ مولانا اپنے مکان کی مغربی گیلری میں ساکت وصامت لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے مکان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، تو مجھے یہ مکان بھی ایک بڑا مدرسہ یا اسکول نظر آیا، اِس سے پہلے کئی بار مولانا سے ملنے آنا ہوا؛ لیکن مکان کے اندر آنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ اِس کی ضرورت ہوئی تھی۔

میں نے مولانا کو بہ آوازِ بلند سلام کیا، تو اُنھوں نے فوراً آنکھیں کھول لیں اور میری طرف دیکھنے لگے؛ لیکن زبان یا ہاتھ سے کوئی اشارہ نہ کر سکے۔ اُن کے بھائی عبدالسلام

صاحب نے بتایا کہ ابھی کل تک وہ بولتے رہے تھے اور سلام کرنے والوں کا جواب دے دیا کرتے تھے؛ لیکن آج گویائی پر قادر نہیں۔ ویسے بات مکمل طور پر سنتے ہیں؛ اسی لیے آپ کے سلام کے ساتھ ہی اُن کی آنکھیں فوراً کھل گئی تھیں۔ عبد السلام صاحب نے بار بار بہت زور زور سے مولانا کو آواز دی کہ یہ مولانا نور عالم رائے پوری، پیشوی، استاذ دارالعلوم دیوبند آپ کی عیادت کو آئے ہیں اور آپ کو سلام کہہ رہے ہیں، آپ نے پہچانا؟ لیکن مولانا خاموش رہے اور لب ہلا سکے نہ ہاتھ کو جنبش دے سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ دماغ بھی پورا مفلوج ہو چکا ہے، صرف چوتھائی حصہ محفوظ ہے، جس کی وجہ سے آنکھیں کھلتی ہیں اور باتیں ساری سن لیا کرتے ہیں۔

میں اُن کے پاس تقریباً بیس منٹ تک رہا، اتنے میں عبد السلام صاحب چائے لے آئے، میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ زحمت کیوں کی، میں اور میرے ساتھی اس وقت مہمانی کرنے نہیں، صرف عیادت کو آئے ہیں اور آپ لوگ اس وقت ذہناً اور جسماً شدید طور پر مشغول ہیں؛ لیکن اُنھوں نے اصرار کیا اور کہا کہ اس کا انتظام رہتا ہے؛ اس لیے کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ میں جتنی دیر مولانا کے پاس بیٹھا رہا اللہ کی قدرت اور انسان کی بے بسی پر غور کرتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ مولانا اپنی خطیبانہ صلاحیت، متکلمانہ قدرت کی مثال سمجھ جاتے تھے۔ ہر وقت بولتے رہتے، الفاظ اُن کی زبان پر آب سیلاب کی طرح بہتے، اُن کے حلق سے اُبلتے، اُن کے ہونٹوں پر کھیلنے اور مچلتے رہتے تھے، وہ اُنھیں بے ساختہ بہنے کے لیے چھوڑ دیتے، نہ اُن پر روک لگاتے، نہ کسی قید و بند کے لیے رضا مند ہوتے۔ آج محض ایک لفظ کی ادائیگی بھی اُن کے بس میں نہیں۔

کہیں سرمایہ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آ میزی

وہ ہمہ وقت ملاقاتوں اور گشتوں میں لگے رہتے، قریوں اور شہروں میں پھرتے،

کہیں رات کرتے تو کہیں صبح اور صبح و شام کے عرصے میں طویل فاصلے طے کر لیتے۔ کہیں قیام انھیں اچھا لگتا، نہ ٹھہراؤ انھیں پسند آتا، نہ جمود انھیں بھاتا، نہ جماؤ پر اُن کی طبیعت آمادہ ہوتی۔ وہ اسفار کے رسیا تھے، ملاقاتوں اور زیارتوں سے انھیں راحت ملتی تھی، جلسوں اور تقریبوں میں شرکت اُن کی غذا اور دوا تھی؛ لیکن آج لیٹے لیٹے بھی اپنے پاؤں کو پھیلا سکتے ہیں نہ سمیٹ سکتے ہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتے ہیں نہ سر کو جنبش۔ انسان کتنا ضعیف البدیان ہے؟ وہ کم زور پیدا ہوتا ہے، پھر بچپن سے گزر کر طاقت ور جوانی کو پہنچتا ہے، پھر بھر پور طاقت کا حامل مرد بن جاتا ہے، پھر کم زوری کی طرف مائل ادھیڑ عمری کی دلیلیز پر جا پہنچتا ہے، پھر بوڑھا اور پیر فرقت ہو جاتا ہے اور اسی دنیا میں نو مولود بچے کی طرح دوبارہ سہاروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

باتوفیق عالم اور خوش گفتار مُقَرَّر

مولانا عبدالحنان صاحب اپنے عصر کے باتوفیق علما میں تھے، اللہ نے اُن سے بہت کام لیا، اُن کی تعلیمی و تربیتی فتوحات و اکتسابات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے تقریباً ۴۰ سال تک درس و تدریس کا جام لٹدھایا، اُن سے ہزاروں طلبہ علوم دین نے استفادہ کیا۔ اُنھوں نے تقریباً ۴۵ سال تک تقریر و وعظ کا جادو جگایا اور اُن کے بے شمار بیانات و خطابات و مواعظِ حسنہ سے اُن گنت لوگوں کو توبہ کی توفیق ملی، شریعت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُنھوں نے ہزاروں دینی و علمی جلسوں میں اپنی شیریں بیانی اور حسن گفتار کی جوت جگائی اور عوام و خواص کے ہزاروں کے مجموعوں میں اُن کی واعظانہ گھن گرج اور دینی و تبلیغی دعوت کی لٹکار اور اصلاحی و تربیتی للک آمیز و ولوہ خیز تقریروں سے دل کی دنیا کے کتنے خرابات آباد ہو گئے۔ اُن کی واعظانہ شوخیوں سے اڑوس پڑوس کے بدعت پرستوں اور خرافات و اداہام کے پجاریوں کو بھی ہمہ لمحہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب خرمن بدعت و توہم، چھاگل و کاگل، دیگ و مرغ،

مولانا عبدالحق خان قاسمی مظفر پوری سیتاڑھوی

عرس و مزار اور تعویذ و کرامات کی ساحری خاکستر ہو جائے۔

وہ جہاں مدرسے میں مدرس تھے، میں نے دیکھا کہ عصر بعد نکل جاتے، رات کو جلے یا تقریب میں تقریر کرتے، شب کے آخری حصے میں پھر مدرسے پہنچتے، ذرا بہت آرام کرتے، پھر تہجد کے لیے مسجد میں آجاتے اور صبح کی اذان تک محو عبادت و مناجات رہتے۔ فجر بعد ناشتہ کرتے اور وقت پر درس گاہ میں حاضر رہتے اور متعلقہ کتابوں کا درس دیتے۔

اُن کی تقریریں بہت مقبول تھیں، وہ خوش گفتار تھے، وہ ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرتے، عوامی ذہن کو پیش نظر رکھ کر بولتے، اندازِ کلام پیارا ہوتا، آواز پاٹ دار ہوتی، تقریروں اور اسباق میں توازن کے ساتھ سنجیدہ انداز اپناتے؛ لیکن ضرورت کے وقت مزاحیانہ انداز بھی اختیار کرتے۔ وہ ظریف الطبع اور حاضر جواب تھے۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے، نرم خوئی، شریف الطبعی اُن کا امتیاز تھی، وہ پاک سیرت، خوب صورت اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ عالمانہ وقار، خطیبانہ انداز، واعظانہ طرز، اُن کی شخصیت کو چار چاند لگاتا تھا۔ وہ برجستہ بولنے کی بھرپور قدرت رکھتے تھے؛ اس لیے حاضرین کبھی بے مزہ ہوتے نہ سامعین کو کوئی تکان محسوس ہوتی؛ کیوں کہ وہ عوام کے مقرر تھے، عوام کی زبان میں، عوام کی دینی و اصلاحی ضرورتوں کی بات ہی کہتے تھے۔ یہ کسی مقرر کا بڑا امتیاز ہوتا ہے کہ سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ یہ ہماری زبان میں، ہماری باتیں کہہ رہا ہے۔ جس مقرر کا یہ انداز ہو کہ سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ یہ عالم بالا یا ملاوٹے بشریت دنیا کے لوگوں کی باتیں کر رہا ہے، ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟ یہ اُس کا بڑا عیب ہوتا ہے۔

خوش اوقات عالمِ دین

میں مولانا کے ساتھ باقاعدہ ہفتہ عشرہ بھی کبھی نہیں رہا؛ لیکن جہاں جہاں اُن کے مدرسوں میں انھیں دیکھا، انھیں تہجد اور نمازِ باجماعت کا پابند پایا۔ اُن کے چہرے سے راتوں کو جاگنے اور دن میں تنگ و دو میں لگے رہنے کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ خوش اوقات عالم

پس مرگ زندہ

تھے، ذکر و تلاوت سے اپنے لمحات کو معمور رکھتے، یا علمی مسائل میں اپنے اُن ساتھیوں اور طلبہ سے باتیں کرتے، جو اُن کے پاس اُٹھتے بیٹھے تھے۔ کچھ مدرسین اُن کی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کی وجہ سے اُن سے زیادہ ہی مانوس تھے، جو اُن کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔

مولانا کا سراپا

اُن کے جسم پر قدرے بڑا سا سر بہت اچھا لگتا تھا، اُن کی آنکھیں فراخ، اُن کی بھنویں گہری، اُن کا رنگ سرخ و سفید، اُن کا قد متوسط تھا۔ اُن کے سر پر تاج کی طرح کھڑی دوہلی ٹوپی بہت چمکتی تھی، جس کی ایستادگی کے لیے وہ بہت اہتمام کرتے تھے۔ اُن میں علما کا وقار اور صلحا کی سنجیدگی تھی۔ وہ نصف ساق تک لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کرتا استعمال کرتے اور وقت ضرورت اُس سے بڑی اور ڈھیلی شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ ان چیزوں کی وجہ سے وہ خاصے پر رعب لگتے تھے؛ لیکن فطرتاً وہ رعب داب کے آدمی نہ تھے، انتہائی مرتجا مرنج، گھل مل جانے والے اور عام انسانوں سے آسانی سے مانوس ہو جانے والے اور اُنھیں مانوس کر لینے والے تھے۔ ادھیڑ عمری کے بعد اُن کا جسم خاصا بھاری بھر کم ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور نتیجتاً طرح طرح کے امراض کا شکار ہو کر رہیں فراش بن گئے تھے۔

مولانا عبدالحقان کا تعلیمی کارنامہ

مولانا عبدالحقان رحمۃ اللہ علیہ بڑے علم والے اور کتاب و سنت میں گہرائی کی شناخت رکھنے والے علما میں نہ تھے، جن کا اوڑھنا بچھونا لکھنا پڑھنا، تصنیف و تالیف اور مطالعہ و تحقیق ہوتا ہے اور اسی میدان میں وہ شانِ امتیاز کے حامل بن کر جبین کائنات پر اپنی عظمت کا نقش کندہ کر جاتے ہیں اور اُن کی بلندقامتی کا سارے معاصرین لوہا مانتے ہیں۔ لیکن مولانا عبدالحقان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خدا کے فیصلے اور اپنے

سلسلے میں اللہ کی تقدیر کے مطابق، تعلیمی و تربیتی میدان میں دوسرے انداز میں اپنی صلاحیت کا خوب خوب استعمال کیا؛ چنانچہ انھوں نے اپنے وطن کے ایک بڑے علاقے میں بہت سے مکاتب و مدارس قائم کیے اور خاص اپنے گاؤں ”بالا ساتھ“ ضلع ”سیتا مڑھی“ سابق ضلع ”مظفر پور“ بہار میں دینی تعلیم کا ایک بڑا مدرسہ قائم کیا اور اپنی محنت، شب و روز کی تگ و تاز اور سعی مسلسل کے ذریعے، اُس کو اتنی ترقی دی کہ وہ اس وقت بہار کے ممتاز مدرسوں میں سے ایک ہے۔ اب وہاں درجہ حفظ و تجوید و ابتدائی دینیات کے ساتھ ساتھ دورہ حدیث شریف تک تعلیم ہے، ساتھ ہی انھوں نے موت سے ذرا پہلے اُسی کے ماتحت ایک عصری اسکول بھی، سکندری سطح تک کی تعلیم کے لیے، اقامت گاہ کے ساتھ قائم کیا۔ انھوں نے دونوں طرح کی تعلیم کے لیے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی، آرام دہ درس گاہیں، کشادہ رہائش گاہیں، خوب صورت سی کشادہ مسجد، کتب خانہ اور ایک ایسا صاف ستھرا اور نستعلیق مہمان خانہ تعمیر کروایا، جس میں بیرون ملک کے آرام آشنا مہمان بھی قیام کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔

لائق ذکر ہے کہ مولانا نے اپنی علمی زندگی کا تقریباً پورا دورانیہ علاقہ گجرات میں گزارا، جہاں کے مسلمانوں کو خداے حکیم نے دینی کاموں اور رفاہی منصوبوں میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہ نسبت، سب سے زیادہ حصہ لینے اور حصہ لے کر بے پناہ خوش ہونے اور اپنی جزا صرف اپنے رب سے پانے اور بندوں پر قطعاً احسان نہ جتانے کی توفیق خاص سے نوازا ہے۔ مولانا کی دل پذیر تقریر اور موثر وعظوں کی وجہ سے وہاں کے نہ صرف مقیم باشندوں؛ بل کہ بیرون ملک رہنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اُن سے بہت متاثر ہو گئی تھی؛ اِس لیے جب انھوں نے مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، اُسی وقت سے اُن لوگوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے انھیں مدد دی، جو کم از کم بہار کے شاید ہی کسی عالم کو ملی ہوگی؛ اِس لیے انھیں اپنے مدرسے کو ترقی دینے، اچھے مدرسین کو لانے، زمین جایداد خریدنے، اُن پر بڑی بڑی پر شکوہ عمارتیں کھڑی کرنے اور شہر اور دیہات میں

مدرسے کے لیے بہت سے منصوبوں کو بروئے کار لانے اور اپنے پروگراموں کو، اپنی خواہش سے بڑھ کر پورا کرنے میں؛ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ کبھی پیش نہیں آئی۔

مولانا دنیا سے اس حال میں گئے ہیں کہ اُن کے مدرسے اور دگر دینی منصوبوں کے لیے مالی آمدنی کے ذرائع تقریباً یقینی بن گئے ہیں۔ توقع ہے کہ کسی خرنشے کے بغیر اُن کے بعد، اُن کے منصوبوں کے نقشوں میں اُن کی خواہش کے مطابق رنگ بھرتا رہے گا۔ اُنھوں نے اپنی اولاد بالخصوص اپنے بڑے صاحب زادے عزیز گرامی مولوی قاری حفظ الرحمن سلمہ کی تربیت اس طرح کی کہ وہ اُن کے بعد، بل کہ اُن کی زندگی ہی میں — اُن کی بیماری و معذوری کے دوران — اُن کے مدرسے اور سارے چھیڑے اور چھوڑے ہوئے منصوبوں کا بوجھ سنبھالنے کی بھرپور لیاقت اور استحقاق کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ وہ اچھے مقرر، کامیاب واعظ اور اپنی اہلیتوں کی وجہ سے لوگوں بالخصوص مولانا کے محبین و معتقدین اور اُن کے کاموں کے لیے مادی تعاون دینے والوں کے لیے باعث کشش بن گئے ہیں۔ مولانا نے یہ اچھا کیا کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے اس لائق صاحب زادے کا، اُن تحبین و متعاونین سے اچھی طرح تعارف کرا دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی حفظ الرحمن سلمہ میں وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں، جو آج کسی دینی ورفا ہی ادارے کو چلانے کے لیے ناگزیر ہیں، جن میں سرِ فہرست مالیہ کی فراہمی کی صلاحیت ہے کہ کسی ادارے کی رفتار مسلسل کے لیے مالیہ ہی آج ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا سے وابستہ ناقابلِ فراموش یادیں

میں اُس وقت بھی طالب علم ہی تھا، جب مولانا ایک کامیاب مدرس اور کہنہ مشق واعظ کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ اُس وقت جواں سالی اور اُدھیڑ عمری کے درمیان تھے، نحیم و جسیم نہ تھے؛ بل کہ قدرے دبے پتلے اور چھریرے بدن اور

تراشیدہ قد کے آدمی تھے۔ دور دراز کے گاؤں میں بھی سائیکل پر آتے جاتے تھے، جسے ہم بچے بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ اُن دنوں بھی تقریر و وعظ کے بڑے دل دادہ تھے، گاؤں گاؤں میں دینی محفلوں اور جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ مرحوم بہت سے جلسوں میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اُس وقت اپنی طالب علمانہ تقریروں، جلسوں اور دینی محفلوں کو تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ نبوی کی خواندگی کے ذریعے شروع کرنے کی لیاقت کے حوالے سے، اپنے ہم عصروں میں مشہور تھا۔ میں دارالعلوم منوناتھ بھنجن میں زیرِ تعلیم تھا، وہاں درجہ سوم عربی تک تجوید کے ساتھ قرآنی سورتوں کی مشق ضروری ہے، اس سے ہم لوگوں کو فائدہ ہوا کہ قرآن پاک کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی خاصی مشق ہو گئی۔ بچپن کی آواز عموماً رسیلی اور خوب صورت ہوتی ہی ہے؛ اس لیے قرآن پاک کی تلاوت اور نعت کا میرا پڑھنا، لوگوں کو بھلا لگتا تھا اور جلسے کو جمانے کے لیے ابتدا میں، میں خاصا بول لیتا تھا؛ اس لیے رمضان کی طویل چھٹیوں کے زمانے میں، جو وسط شعبان سے ہی عموماً شروع ہو کر وسط شوال تک جاری رہتی ہیں، مولانا کی خواہش ہوتی کہ میں میسر رہوں، تو اچھا ہے، وہ کسی کو بھیج کے مجھے بلوالیتے اور دینی اجتماعات میں ساتھ لے جاتے۔ اُن صحبتوں میں میں نے انھیں ایک اچھا انسان پایا۔ وہ حلیم، کریم، شفیق، چھوٹوں پر کرم کرنے والے اور بڑوں کا ادب کرنے والے تھے، اُن کی آواز گرج دار تھی۔ وہ خود اعتمادی سے بولتے، عقیدہ صحیحہ کا دفاع کرتے، بدعات و خرافات کے خلاف گرجتے، معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کرتے۔ بدعت کے خلاف وہ اس لیے بھی شمشیر برہنہ تھے کہ وہ اس کی زہرناکی سے بہ راہِ راست واقف تھے۔ اُن کے گاؤں سے جڑے ہوئے بعض گاؤں مکمل طور پر بدعتیوں اور کٹر رضا خانیوں کے گاؤں تھے اور ہیں۔

میں نے اُس وقت بھی دیکھا کہ وہ تقریر میں گہرے، معنی دار، علمی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے، مشکل طرزِ کلام سے بالکل بچتے، علمی اصطلاحات کو کبھی ہاتھ نہ لگاتے، آسان، ہلکے پھلکے اسلوب میں بولتے، جو دیہاتیوں، عام لوگوں، اُن پڑھوں کو بھی بہ

آسانی سمجھ میں آجاتا؛ اس لیے جب وہ گجرات کے خطے میں مدرس ہوئے، تو وہاں بھی ممتاز اور بڑے عوامی مقرر ثابت ہوئے، حتیٰ کہ لوگ انھیں اپنے گجراتی علما و مقررین پر بھی ترجیح دیتے تھے، جب کہ یہ علما و مقررین گجراتی بھی جانتے تھے اور اپنے علاقے کی اصطلاحوں اور روزمرہ سے واقف ہونے کی وجہ سے بہ ظاہر اُن کے لیے زیادہ سودمند تھے؛ لیکن مولانا اپنی سہل گوئی، شیریں بیانی اور عام فہم زبان کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے لیے بھی ہر دل عزیز مقرر بن گئے۔

مولانا کی ہمارے گاؤں ”بیشی“ کے جڑواں گاؤں ”نیا گاؤں“ ٹولہ اسری میں رشتہ داری تھی، اُن کی اپنی پھوپھی یہیں بستی تھیں، وہ جب بھی اُن کے ہاں آتے، سب سے پہلے مجھے یاد کرتے اور جب تک ہمارے گاؤں میں رہتے ہمیں اپنے ساتھ رکھتے۔

دارالعلوم منوکی طالب علمی ہی کے دور میں، میں نے اپنے گاؤں میں کئی بار دینی اجتماعات کا اہتمام کیا۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ گاؤں کی خواتین اور نوجوانوں سے چندے کرتا اور جلسے کے لیے ضروری مصارف بہم پہنچا، اُن جلسوں میں مولانا عبدالحنان صاحبؒ ہی عموماً مدعو ہوتے، جلسوں کو میں اپنی تلاوت، نعت شریف اور تمہیدی تقریر سے شروع کرتا، پھر مولانا کے تعارف کے بعد مولانا کو دعوتِ خطاب دیتا۔ ہمارے گاؤں کے لوگ اُس زمانے میں انگریزی عصری تعلیم کے اس درجہ دل دادہ تھے کہ دینی عربی تعلیم کو اس کے بالمقابل حقارت کی حد تک غیر مفید تصور کرتے تھے۔ اُن جلسوں اور دیگر دینی اجتماعات اور علما کی چلت پھرت سے بڑا دیر پا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو مسجد کی راہ معلوم ہوگئی، اُن کا اللہ سے کچھ نہ کچھ تعلق قائم ہو گیا، اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اُن جلسوں نے ایسا دینی بیج بويا، جو بعد میں تناور اور ہر موسم میں پھل لانے والا درخت ثابت ہوا، اُن میں دینی جذبے کی آبیاری ہوئی، جس نے اُن میں انقلاب برپا کیا اور اپنی اولاد و احفاد کو دینی تعلیم دلانے، انھیں عالم و فاضل بنانے پر آمادہ کیا۔ آج ہمارے گاؤں میں دسیوں فضلاء دیوبند ہیں اور بہت سے دارالعلوم دیوبند میں اور دیگر

مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں، جب کہ اُس وقت یہ راقم اور ایک دو صاحب ہی مدرسہ آشنا تھے۔ اب لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ مدرسے کی تعلیم بھی نہ صرف دینی طور پر؛ بل کہ دنیا کی سطح پر بھی عصری تعلیم ہی کی طرح مفید طلب ہے، پہلے لوگوں کا ایمان تھا کہ مدرسے میں پڑھ کے ہماری اولاد کی زندگی ان کے دوش ناتواں پر بار ثابت ہوگی۔

مولانا کو قریب سے دیکھنے کی تقریبیں

دارالعلوم دیوبند کے بعد میں نے اپنے وقت کے بڑے محقق عالم، فقیہ و محدث و اہل قلم حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء-۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) سے بہ راہ راست استفادے کی غرض سے مدرسہ امینیہ دہلی کشمیری گیٹ میں ایک سال گزارا۔ اُس زمانے میں مولانا عبدالحق خان صاحب چھاپی، گجرات میں مدرس تھے، وہاں آتے جاتے ہوئے، وہ ہمارے پاس تشریف لاتے اور حسبِ موقع ایک آدھ روز گزار کر اپنا آگے کا سفر جاری رکھتے۔ میں حسبِ استطاعت اُن کی مہمان نوازی کرتا اور انتہائی احترام و اکرام کے ساتھ پیش آتا۔ مولانا مرحوم میری ضیافتی سلیقہ مندی، اندازِ اکرام و احترام سے بہت متاثر ہوتے اور فرماتے: تم نوعمری کے باوجود جس سلیقے، نستعلیقیت اور تہذیب و شائستگی سے پیش آتے ہو، اُس کی روشنی میں میرا دل کہتا ہے کہ میری نسل کے علمائے بہار کے بعد، تم اپنی نسل کے شانِ امتیاز کے حامل عالم بنو گے، اللہ تمہیں کامیاب اور بامراد کرے۔

جمعرات ۱۰ دسمبر ۱۹۸۷ء (۱۷ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ) کو مجھے دارالعلوم ماثلی والا بھروچ — جہاں مولانا مرحوم استاذِ حدیث و فقہ و تفسیر تھے — کی دعوت پر علاقہ گجرات کی پہلی بار زیارت کا موقع ملا۔ وہاں طلبہ کے ایک ادبی و ثقافتی پروگرام کی جو ”اسلام اور اُس کا معاشرتی نظام“ کے موضوع پر منعقد ہوا، صدارت کی گئی اور حکم کا فریضہ انجام دیا گیا؛ بل کہ یہ شرکت اور یہ سفر دونوں تاریخی اور یادگار ثابت ہوئے۔

میرے نام اس دعوت کے محرک برادرِ مکرم، فاضلِ محترم مولانا رشید احمد سلوڈی بھروچی تھے، جو اُس وقت وہاں سرگرم استاد، طلبہ کے مربی اور مدرسے کی تعلیمی ترقی کے لیے ساری توانائیوں اور علمی صلاحیتوں کے ساتھ محوِ عمل تھے۔ اس وقت وہ گجرات کے ”دارالعلوم دیوبند“ یعنی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بڑے اساتذہ میں سے ایک ہیں۔

اس سفر سے جہاں علاقہ گجرات کی اولین جان کاری حاصل ہوئی، وہیں مولانا عبدالحمنانؒ سے عرصے کے بعد طویل ملاقات، انھیں قریب سے دیکھنے، عمر اور سال کے اُن کے طویل سفر کے بعد انھیں برتنے اور اُن کے اخلاق و کردار اور سلوک اور رویے کی تہ تک پہنچنے کا موقع ملا، بالخصوص اُس وقت جب کہ میری سمجھ بوجھ کے بھی بال و پر نکل آئے تھے اور زندگی، زمانہ اور انسانوں کی شناخت کی کسی قدر اہلیت سے یہ ناچیز بہرہ ور ہو چکا تھا۔ وہاں اس موقع سے ہفتہ عشرہ قیام رہا۔ تینوں وقت دسترخوان پر، پانچوں وقت نماز باجماعت میں، نماز فجر کے بعد تفریح میں، نماز عصر اور عشا کے بعد درس گاہ سے اُن کی رویشی پابندی سے آزادی کے اوقات میں، اُن سے بار بار ملنے اور اُن کی سیرت و اخلاق کی تہوں میں جھانکنے کی فرصت میسر آئی، جس سے اُن کے ساتھ میری محبت و عقیدت میں اور اضافہ ہوا اور بچپن سے جو تعلق اُن سے تھا، وہ اور پختہ تر ہو گیا۔ اس کے بعد کئی بار ”دارالعلوم ماٹلی والا“ بھروچ ہی کی دعوت پر اور بعض دفعہ اُس علاقے کے دیگر مدرسوں کی تحریک پر وہاں کا سفر ہوا۔ عموماً میری آمد و رفت کے وقت اسٹیشن پر لینے اور رخصت کرنے کے لیے آنے والے دیگر علما محترمین کے ساتھ مولانا عبدالحمنانؒ بھی تشریف فرما ہوتے، تو میں شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا۔ وہ میرے اس تاثر کے اظہار پر فرماتے: بھئی! کچھ دیر اور تمہارے ساتھ گزارنے کا موقع مل جاتا ہے، زندگی ناپائدار کا کیا بھروسہ کہ کب ہم تم سے اور تم ہم سے نہ مل سکو۔ میں عرض کرتا: حضرت! اللہ آپ سے درازی عمر و صحت کے ساتھ اور کام لینے والا ہے؛ اس لیے آپ پر اعتماد رہیں۔ فرماتے: لیکن اللہ کے رسول کے ارشادات سے یہی یقین جمتا ہے کہ

زندگی کی بے وفائی اور ناپایداری کو ہمہ وقت مستحضر رکھنا چاہیے۔ اُن کے اس جواب پر میں خاموش رہتا۔

میں نے گجرات کے سفر کے دوران انھیں دسترخوان پر پایا کہ ہر جگہ عموماً اور دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ کے اُس وقت کے مہتمم مولانا محمد یعقوب دلتوی (متوفی ۱۱/۱۱/۱۳۲۴ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۳ء) کے ہاں خصوصاً جب بھی کسی ڈش کو پسند کرتے، تو بے اختیار سبحان اللہ، سبحان اللہ کی رٹ کے ساتھ پکانے والیوں، پکانے میں معاونت کرنے والیوں اور اُن تمام مرد و خواتین کو بے پناہ دعائیں دیتے، جن کا اُس کھانے کی تیاری میں کوئی کردار ہوتا۔ اُن کے انداز سے ایسا لگتا کہ وہ کسی بہت خوب صورت شعر یا بے مثال و شان دار ادبی شہ پارے کی داد دے رہے ہوں، اُن کے اس انداز سے سارے گجراتی بہت خوش ہوتے اور عموماً خواتین اُن کی مزید دعائیں لینے کے لیے، اندرون خانہ سے پھر کوئی پیالہ یا کھانے سے بھر اڑے بھیج دیتیں۔ کھانے کے دسترخوان پر دعا کا یہ عجیب و غریب اور خوش منظر انداز میرے لیے نیا بھی تھا اور باعثِ تعجب بھی، میں نے وہاں دوستوں سے اپنے اس استعجاب کا اظہار کیا، تو انھوں نے بتایا کہ مولانا کے اس انداز سے گجرات کا یہ سارا علاقہ واقف ہے اور لوگ دعائیں لینے کے لیے، اسی طرح پیالوں پر پیالے اور پلیٹوں پر پلیٹیں بھیجتے رہتے ہیں اور وہ خوب خوب دعائیں دیتے اور ہر لقمے پر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے جاتے ہیں۔

لذیذ یادوں کا تسلسل

اپریل ۱۹۸۹ء (رمضان ۱۴۰۹ھ) میں، اس ناچیز نے لوگوں کے اصرار اور اہل قریہ کی طلب پر اپنے گاؤں ”ہرپوریشی“ ضلع ”مظفر پور“ بہار کی بوسیدہ و دیرینہ مسجد کی، جو مسلسل سیلاب کی وجہ سے بے حد خستہ حال ہو چکی تھی، تعمیر نو شروع کی، جس کا نام بعد میں ”جامع ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ“ تجویز کیا گیا، تو اُس کی اساس

گزاری کے لیے مولانا کو دعوت دی، جو انھوں نے بہ خوشی نہ صرف قبول کیا؛ بل کہ ایک روز اپنی گاڑی سے اپنے قافلے کے ساتھ فجر بعد ہی تشریف لا کر یہ سعادت مندانہ کام انجام دیا اور اس کے اتمام کے لیے بڑے مجمع میں دعائیں کیں۔ مولانا کا گاؤں ”بالاساتھ“ ہمارے ہاں سے صرف ۶-۷ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے؛ لیکن ہمارا گاؤں تاریخ کے نامعلوم وقتوں سے، ہمالیائی نیپالی ندیوں کے پانی کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے، ہمیشہ شدید سیلاب کی زد میں رہا؛ اس لیے آج بھی وہاں ناپختہ سڑکیں بھی ایسی نہیں کہ صحیح طور پر گاڑی لے کر کوئی انجان آدمی وہاں آسکے؛ لیکن انھی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے مولانا تشریف لائے اور خاصی دیر تک ہمارے ساتھ رہے اور مشقت سے کسی طرح کبیدہ خاطر نہ ہوئے۔

ترقی کے اس دورِ سرعت و ثور میں اس طرح کی بستی کا انگریز کے مرکزِ توجہ، قصبہ ”اُورائی“ ضلع ”مظفر پور“ سے صرف ۲ کلومیٹر پچھم میں، اس طرح کچھڑا ہوا پڑا رہنا، ہماری ”ترقی پسند“ حکومت، ”حوصلہ مند“ حکم راں اور چین وروس کو پیچھے چھوڑ کر امریکہ کے مد مقابل کھڑے ہونے کے لیے بے تاب ناخدا یاں ملک کا منہ چوانے کے لیے کافی ہے؛ لیکن احساسِ ذمہ داری و دیانت کے فقدان، وطن سے سچی محبت سے محرومی اور ”دیش بھگتی“ کی جھوٹی دعوے داری کے اس دورِ نفاق میں کسی طرح کی بھلائی کی امید رکھنا محض کارِ عبث ہے۔

”دارالعلوم دیوبند“ میں جب یہ ناچیز خادمِ تدریس اور چیف ایڈیٹر ماہ نامہ ”الداعی“ عربی کی حیثیت سے برسرِ عمل ہونے کی سعادت سے سرفراز ہوا، تو اس اثنا میں کئی بار مولانا عبدالحق اپنے مدرسے ”دارالعلوم ماٹلی والا“ بھروچ کے نمائندے کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور ہر بار میری رہائش گاہ ”افریقہ منزل قدیم“ نزد چھتہ مسجد، دیوبند، میرے اصرار پر ناشتے یا کھانے میں آنے کی زحمت گوارا کیا اور میری دیرینہ نیاز مندی، جس کو وہ ”سلیقہ مندی“ کا نام دیا کرتے تھے، حسبِ

سابق بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

جمعرات - جمعہ: ۲۰-۲۱/محررم ۱۴۲۳ھ = ۴-۵/اپریل ۲۰۰۲ء کی شب میں دہلی میں ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالم دین اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے کچھ عرصے بعد اواخر اپریل ۲۰۰۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دفتر واقع ”اوکھلا“ نئی دہلی میں ایک تعزیتی جلسہ کیا گیا، جس میں امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین مدظلہ نے اس ناچیز کو بھی مدعو کیا۔ میں اُس وقت شدید بیمار تھا؛ لیکن مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے غیر معمولی تعلق و محبت کی وجہ سے ٹیکسی کے ذریعے دیوبند سے دہلی پہنچ کر، اُس میں حاضری کی سعادت حاصل کی۔ اتفاق سے اُس میں مولانا عبدالحکمان صاحبؒ بھی شریک تھے، میں جلسے کے اختتام پر آنے لگا، تو اُنھوں نے کان میں کہا کہ تمہارے یہاں رابطہ مدارس عربیہ کی مجلس عمومی کا اجلاس ہے، میں اُس میں آ رہا ہوں، شکر کے عوارض کی وجہ سے اب طبیعت نڈھال رہتی ہے؛ اس لیے قیام جتنے دنوں رہے گا، تمہارے ہاں رہے گا۔ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ تو میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔ سہ شنبہ ۳۰/اپریل ۲۰۰۲ء (۱۶/صفر ۱۴۲۳ھ) کو یہ اجلاس دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید میں ہوا۔ مولانا ایک روز قبل تشریف لے آئے، ۴-۵ روز میرے یہاں ہی قیام فرمایا۔ مجھ سے اُن کی اور اُن سے ملنے آنے والے طلبہ و محبین کی جو ٹوٹی پھوٹی خدمت ہو سکی، اُس پر اُنھوں نے بہت دعائیں دیں اور میرے ہر بچے کو بلا بلا کے ملاقات کی اور اُنھیں ”انعام“ دیا اور اُن کے سروں پر ہاتھ رکھ کر اُن کی بلائیں لیں۔

اس کے دو تین سال بعد جمادی الاخریٰ ۱۴۲۷ھ جولائی ۲۰۰۶ء میں بہار واڑیہ و جھارکھنڈ و نیپال کے طلبہ کی انجمن ”سجاد لائبریری“ نے، اُنھیں سالانہ جلسے میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا۔ مجھے طلبہ نے رات میں اچانک اس کی اطلاع دی، میں فوراً مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند پہنچا اور مولاناؒ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی، تو فرمایا کہ میرے

پس مرگ زندہ

عزیر! مجھے یہیں زیادہ آرام ملے گا؛ لیکن صبح کو فجر بعد فوراً ناشتے میں تمہارے ہاں آؤں گا۔ اُن کے ساتھ بہار ہی کے دو تین آدمی اور تھے، جو دہلی سے اُن کے ہم راہ ہو گئے تھے۔ اُن سبھوں کے ساتھ صبح کو ہمارے ہاں تشریف لائے اور ناشتہ کر کے بہت دعدادی اور فرمایا: تمہاری دیرینہ نستعلیقیت اور سلیقہ مندی ہمہ وقت مجھے مستحضر رہتی ہے اور تازیت رہے گی۔ دیوبند میں؛ بل کہ ہوش کی حالت میں یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ رہے نام اللہ کا۔

جس وقت مولانا ہماری رہائش گاہ سے جانے کے لیے اپنے جوتے پاؤں میں ڈال رہے تھے، حالی کا یہ شعر بار بار میرے دل کی زبان پر آتا رہا:

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں، جہاں میں

اللہ تعالیٰ مولانا عبدالحقان صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اُن کی خطاؤں اور لغزشوں سے، جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے، اُن کے پس ماندگان و اہل خاندان و محبین و معتقدین کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا کرے اور انھیں اُن کے نقش قدم پر چلنے اور اُن کے اخلاق حسنہ پر کاربند رہنے اور اُن کے وضع کردہ نقوش میں خوب صورت رنگ بھرنے کی توفیق ارزانی کرے، آمین۔

سوانحی نقوش

❁ مولانا عبدالحقان ۳ جنوری ۱۹۳۳ء (۱۶ رمضان ۱۳۵۲ھ) کو اپنے گاؤں ”بالا ساتھ“ ضلع ”سیٹامڑھی“ سابق ضلع ”حظفر پور“ صوبہ ”بہار“ میں اس عالم رنگ و بو میں آئے، اُن کے والد ماجد کا نام ”حسن توحید“ تھا۔

❁ قرآن پاک ناظرہ اور ابتدائی اردو و فارسی تعلیم اپنے والد سے گھر ہی پر حاصل کی۔ اس کے بعد کی تعلیم مدرسہ ”محمود العلوم“ موضع ”دملہ“ ضلع ”مدھوبنی“ سابق ضلع ”دربھنگہ“ نیز ”مدرسہ امدادیہ“ لہریا سرائے دربھنگہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے برصغیر کی مادر مدارس و جامعات دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں سے ۱۹۵۷ء (۱۳۷۷ھ) میں فارغ ہوئے، مولانا نے دورہ حدیث شریف شیخ

مولانا عبدالحکیم قاسمی مظفر پوری سیتا مڑھوی

الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء=۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سے بڑھا۔ دارالعلوم دیوبند کے آپ کے دیگر اساتذہ میں حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن مراد آبادیؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد ہاپوڑیؒ ثم المراد آبادیؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا معراج الحقؒ دیوبندی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندیؒ ہیں۔

✽ فراغت کے بعد مولانا شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے دست گرفتہ ہو گئے تھے، پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا بن یحییٰ کاندھلویؒ سے بیعت ہوئے اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ سے بھی اصلاحی تعلق قائم رہا۔

✽ ۱۹۵۶ء (۱۳۷۵ھ) میں مولانا ”جالہ“ ضلع ”درجہ گتہ“ میں رخصتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، اُن کے خسر کا نام حاجی عبدالشکور مرحوم تھا۔

✽ تدریسی زندگی کا آغاز مولانا نے ضلع ”مظفرنگر“ یوپی کے قصبہ ”مورنا“ سے کیا، یہاں ایک ابتدائی مدرسہ قائم فرمایا، دو سال تک اس کی ترقی و استحکام کے لیے سرگرداں رہے۔ اُس کے بعد اپنے شفیق استاذ مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۳ھ/۱۹۰۵ء-۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) کے حکم سے اُٹھی کے آبائی وطن قصبہ ”عمری کلاں“ مراد آباد، یوپی تشریف لے گئے، جہاں دو مدرسوں کے درمیان نا اتفاقی اور خلفشار تھا۔ آپ نے اپنی حکمت و تدبیر سے دونوں کو ضم کر کے ایک متحدہ مدرسہ اور مضبوط درس گاہ بنادیا۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں عالم بے بدل، قائد ملت اور رجال ساز عبقری عالم امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی قدس سرہ العزیز (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) کے حکم پر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں ایک سال تک اُس کی تنظیم و ترقی کے لیے ہنرمندانہ کارنامہ انجام دیا؛ لیکن بہ وجوہ یہاں ایک سال سے زیادہ قیام نہ کر سکے۔

✽ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) اور ۱۹۷۳ء (۱۳۹۳ھ) کے عرصے میں مولانا نے کم و بیش ۱۲ سال تک دارالعلوم چھاپی صوبہ گجرات میں تدریسی فرائض انجام دیے، یہاں انھوں نے فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ علوم پڑھائے اور شہرت اور قبولیت حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء (ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ) میں وہاں سے مستعفی ہو گئے۔

نومبر ۱۹۷۳ء (ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ) سے شنبہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء (کچھ شعبان ۱۴۱۹ھ) تک مولانا نے ”دارالعلوم ماٹلی والا“ شہر ”بھروچ“ (صوبہ گجرات کی مشہور درس گاہ) میں استاذ حدیث و تفسیر و فقہ کی حیثیت سے نہ صرف تدریسی فرائض انجام دیے؛ بل کہ اُس کی شہرت اور تعمیری و تعلیمی ترقی میں بنیادی اور کھوس کر دار ادا کیا۔ یہاں کے قیام کے دوران علاقہ گجرات میں اُن کے تحبین و معتقدین کی تعداد میں بے شمار اضافہ ہوا، مولانا کی تقریروں اور مواعظ حسنہ سے لوگوں کو بے انتہا فائدہ ہوا، شہر و دیہات کا کوئی چہرہ ایسا نہیں، جہاں کا انھوں نے

پس مرگ زندہ

دورہ نہ کیا ہو، گاؤں اور شہر کے سارے خواص و عوام اُن کے کام اور نام سے واقف ہو گئے تھے۔
 ”دارالعلوم ہاشمی والا“ سے مستغنی ہونے کے بعد، مولانا اپنے مدرسہ ”جامعہ اسلامیہ قاسمیہ“ بالاساتھ کی خدمت کے لیے ہمہ تن فارغ ہو گئے۔ انھوں نے یہ مدرسہ ۶ جون ۱۹۸۰ء (۹ رجب ۱۴۰۰ھ) میں قائم فرمایا، اپنی جانفشانی، تقریری لیاقت، دلوں میں گھر کر جانے کی صلاحیت، کے ذریعے، بہت جلد اس مدرسے کو بام عروج تک پہنچا دیا اور وفات پہلے ہی اس مدرسے کی قرب و جوار میں بہت سی شاخیں قائم ہو گئیں، جن میں ابتدائی عربی و فارسی واردو کے ساتھ ساتھ قرآن پاک ناظرہ اور بنیادی تعلیم کا نظم قائم ہوا۔ مرکزی مدرسہ جامعہ قاسمیہ میں دو تین سال سے دورہ حدیث شریف کی تعلیم کا نظم بھی ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ اسی مدرسے سے ملحق وسیع قطعہ اراضی میں انگلش میڈیم اسکول کی عمارت اور ہاسٹل بھی تعمیر کروایا، جو اُن کی زندگی میں ہی مصروف کار ہو چکا تھا۔ مولانا کے بعض مواعظ و خطبات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، چھوٹے چھوٹے رسائل بھی انھوں نے اصلاح معاشرہ سے متعلق آسان اردو میں تالیف کیے تھے، جو اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے ہیں۔
 ✽ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، مسلم پرسنل لا بورڈ اور علاقے کے کئی ایک مدرسوں کے ذمے دار و رکن کی حیثیت سے مولانا نے اپنا ذمہ دارانہ کردار ادا کیا۔

✽ مولانا کے پس ماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ ۵ بیٹیاں اور ۲ بیٹے نیز ۳ بھائی ہیں۔ مولانا نے بہت سے ملکوں کا بار بار دورہ کیا اور کئی بار حج و عمرہ سے شرف یاب ہوئے، اُن ملکوں میں سعودی عرب، یو کے، امریکا، کناڈا، پناما، باربدو، ویسٹ انڈیز، فیجی، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ری یونین، زامبیا، موریشیوس، ملاوی، پاکستان اور نیپال سرفہرست ہیں۔

✽ مولانا کی وفات اپنے وطن ”بالاساتھ“ میں ۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ = ۱۳ مئی ۲۰۰۹ء کو ایک بج کر ۲۰ منٹ پر واقع ہوئی اور تدفین دوسرے روز تقریباً دس بجے دن میں یہ روز جمعرات ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ = ۱۴ مئی ۲۰۰۹ء کو عام قبرستان میں عمل میں آئی، نماز جنازہ مولانا کے بڑے صاحب زادے مولوی قاری حفظ الرحمن نے پڑھائی، علماء و فضلا و طلبہ اور عام مسلمانوں کے جم غفیر نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الدامی“ عربی شمارہ ۷، جلد ۳۳، رجب ۱۴۳۰ھ = جولائی ۲۰۰۹ء۔ اردو تحریر یہ قلم خود بہ روز بدھ ۱۲ بجے دن، ۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ = ۳ جون ۲۰۰۹ء جو اردو نامہ نمبر مبینی اور دیگر متعدد رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوئی۔

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام
 مولانا سید عبداللہ بخاریؒ
 ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء - ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

چوٹ کھائی نئی نئی؛ لیکن
 بات ہم نے وہی پرانی کی

سال ہا سال کی بیماری اور بڑھاپے کے بہت سارے عوارض کے ساتھ طویل کش مکش کے بعد چہار شنبہ: ۱۴/۱۱/۱۴۳۰ھ مطابق ۸ جولائی ۲۰۰۹ء کی صبح کو، آل انڈیا میڈیکل سائنسز انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں، شاہ جہانی جامع مسجد دہلی کے شاہی امام: مولانا سید عبداللہ بخاریؒ نے آخری سانس لیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ انتقال کے وقت تقویم ہجری کے اعتبار سے اُن کی عمر ۹۰ سال اور تقویم عیسوی کے حساب سے ۸۷ سال تھی۔ اُن کا سال پیدائش ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء تھا۔

وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، کئی بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا، انھیں برین ہیمیرج بھی ہو چکا تھا، انھیں شدید تنفس کی شکایت تھی، سن رسیدگی کی وجہ سے وہ ویسے بھی خاصے نحیف و زار رہتے تھے۔ انتقال سے ایک ماہ قبل اُن کی حالت خاصی دگرگوں ہو گئی تھی، جس کے بعد انھیں یک شنبہ: ۱۳/جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ مطابق ۷ جون ۲۰۰۹ء کو آل انڈیا میڈیکل سائنسز انسٹی ٹیوٹ میں داخل کیا گیا جہاں اُن کی بڑی دیکھ ریکھ ہوئی اور چنیدہ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اُن کے علاج پر مامور رہی؛ لیکن وقت آخر آچکا تھا؛ اس

لیے کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہو سکی اور بالآخر وہ وہاں چلے گئے جہاں ہر فرد بشر کو جانا ہے۔
 چہار شنبہ - پنج شنبہ: ۱۲-۱۵/۱۱/۱۳۳۰ھ مطابق ۸-۹/جولائی ۲۰۰۹ء کی
 درمیانی شب میں، عشا کی نماز کے بعد اُن کی نماز جنازہ، اُن کے فرزند اکبر مولانا سید احمد
 بخاری حال شاہی امام جامع مسجد دہلی نے پڑھائی اور ہزاروں غم زدہ عام مسلمانوں،
 قائدین، علما اور شہر و بیرون شہر سے آئے ہوئے سوگواروں کی موجودگی میں جامع مسجد کی
 مغربی جانب اُن کے خاندانی مقبرے میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ رہے نام اللہ کا۔
 مرحوم کے پس ماندگان میں، اُن کی اہلیہ محترمہ، دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں: مولانا
 سید احمد بخاری، سید یحییٰ بخاری، سید طارق بخاری، سید حسن بخاری۔

مولانا سید عبداللہ بخاری نے پیہم ۲۷ سال امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیا،
 انھیں اُن کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحمید بخاری^(۱) نے بروز یک شنبہ: ۶/۱۱/۱۳۹۳ھ
 مطابق ۸/جولائی ۱۹۷۳ء کو علما و منتخب اعیان شہر کی موجودگی میں باقاعدہ طور پر
 امامت و خطابت کے عہدے سے سرفراز کیا تھا۔ مرحوم جامع مسجد کے ۱۲ویں شاہی امام
 تھے، وہ اپنے اس عہدے سے اپنے بڑے لڑکے مولانا سید احمد بخاری کے حق میں رسمی
 طور پر بروز شنبہ: ۱۵/۱۱/۱۳۲۱ھ مطابق ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۰ء کو سک دوش ہو گئے تھے۔
 اس تقریب میں، حرم مکی کے امام و خطیب اور امور حرمین کے صدر نشین شیخ محمد بن عبداللہ
 سبیل کے نمایندے شیخ محمد عبدالرحمن المرشد، سفرائے بلاد عربیہ اور بہت سے علما اور
 اسلامی انجمنوں و تنظیموں کے قائدین نے شرکت کی تھی۔

جامع مسجد کے اولیٰ شاہی امام مرحوم کے جدِ اعلیٰ سید عبدالغفور بخاری تھے، جو
 ”بخارا“ سے تشریف لائے تھے اور شاہ جہاں نے انھیں اس عظیم مسجد کا امام مقرر کیا تھا۔
 ۱۶۵۶ء/۱۰۶۶ھ میں جب یہ جامع مسجد مغل شہنشاہ شاہ جہاں (۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء -

(۱) پیدائش: ۱۳/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق ۵/اکتوبر ۱۸۹۲ء بروز چہار شنبہ، وفات: ۵/صفر ۱۳۹۶ھ مطابق ۶/فروری

۱۹۷۶ء بروز جمعہ، پونے دو بجے دوپہر، انھوں نے تقریباً ۶۵ سال امامت کی۔

۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء) کے حکم سے دس لاکھ روپے کی لاگت سے ۶ سال کی مدت میں بن کر تیار ہوئی، جس کے دوران ۵۰۰۰ اعلیٰ پایے کے معمار و مزدور شب و روز اُس کی تعمیر میں لگے رہے، تو شاہ جہاں نے (جن کا دور حکومت ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء رہا تھا) شاہ ”بخارا“ کے پاس قاصد بھیجا کہ ہمیں ایک نجیب الطرفین، عمیق العلم، متقی و خدا ترس امام چاہیے۔ اُنھوں نے اِس کے لیے مولانا سید عبدالغفور بخاری کا انتخاب کیا۔ مولانا سید عبدالغفور بخاری نے یکم شوال ۱۰۶۶ھ/۲۴ جولائی ۱۶۵۶ء کو جامع مسجد میں شاہ جہاں، اُن کے وزرا اور اُمراء سلطنت کو عید الفطر کی نماز پڑھائی۔ بادشاہ نے اُنھیں انعام و اکرام سے نوازا اور ”شاہی امام“ کے لقب سے سرفراز کیا۔

جرات و بے باکی میں کیتاے روزگار

مولانا سید عبداللہ بخاری اپنی جرات و بے باکی کے لیے مشہور تھے۔ وہ چند سال قبل تک مسلمانوں کی مظلومیت اور اُن کی حق تلفی کے خلاف اُٹھنے والی واضح اور نمایاں آواز کی حیثیت رکھتے تھے؛ اسی لیے تمام مسالک و نقطہ ہائے نظر کے مسلمان، اُن کی بے پناہ عزت کرتے تھے؛ چنانچہ جیسے ہی اُن کی وفات کی خبر عام ہوئی دہلی کے سارے مسلم علاقوں، بالخصوص جامع مسجد کے وسیع تر اطراف پر غم و الم کا بادل چھا گیا، دکانیں اور اسکول بند ہو گئے، تجارتی سرگرمیاں موقوف ہو گئیں، سارے قابل ذکر قائدین و سیاست داں اور مسلم تنظیموں کے ذمے داروں کا رخ جامع مسجد کی طرف تھا، جو اُن کے پس ماندگان، بالخصوص اُن کے جانشین مولانا سید احمد بخاری سے تعزیت کرنے کے لیے بڑی تعداد میں آتے رہے، جس سے اُن کی غیر معمولی عوامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں وہ مسلمانوں کے تنہا قائد تھے، جن کی وفات پر تعزیت کے لیے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ اور دیگر مسالک کے قائدین کسی تکلف کے بغیر جامع مسجد آئے اور یکے بعد دیگرے، اُن کے پس ماندگان سے ملے اور

شریکِ غم ہوئے۔ یہ بات بہ طورِ خاص نوٹ کرنے کی ہے؛ کیوں کہ عموماً بڑے سے بڑے آدمی کی وفات پر کسی ایک ہی مسلک کے مسلمان یا سیاسی پس منظر رکھنے کی صورت میں غیر مسلم حضرات پُر ساء کے لیے آتے ہیں، دوسرے مسلک کے لوگ شاذ و نادر ہی آتے ہیں اور اخبار و رسائل میں بھی تعزیتی پیغام نہیں دیتے۔

۱۹۷۱-۱۹۷۲ء میں، یہ راقم الحروف دہلی میں طالبِ علم تھا، اُس وقت باقاعدہ امام تو مولانا سید عبداللہ بخاری کے والدِ بزرگ وار مولانا سید عبدالحمید بخاری (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) تھے، جن کی نیکی، سادگی اور بے نفسی، زبانِ زدِ خاص و عام تھی۔ لاتعداد نمازیں اُن کے پیچھے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جن میں جمعہ کی نمازیں بہ طورِ خاص لائقِ ذکر ہیں۔ عصر و مغرب کی اکثر نمازیں ہم جامع مسجد ہی میں ادا کرتے تھے۔ مولانا سید عبداللہ بخاری بھی باقاعدہ امام نہ ہونے کے باوجود وقتاً فوقتاً امامت کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں یہ ناچیز دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں، مدرس ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء میں، مولانا بخاری جامع مسجد کے باضابطہ امام منتخب ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف وہ جامع مسجد کے منبر و محراب پر؛ بل کہ ملک کی مسلم قیادت کے منبر پر بھی چھا گئے۔ میں لکھنؤ میں بیٹھا حالات و واقعات کی اسکرین پر اُن کی تیز رفتار شہرت و اعتبار کی تصویریں مسلسل دیکھتا رہتا تھا۔ اُن کی بے باکانہ تقریریں، مسلمانوں اور بے کچلے طبقوں کے خلاف، حکومت کے ظلم و نا انصافی کے رویوں پر اُن کے پُر زور احتجاج اور اُن کے گرجنے و چنگھاڑنے کی صدا نہ صرف پوری دہلی، بل کہ ملک کے اطراف و اکناف میں سنائی دیتی تھی۔ احساسِ مظلومیت کے بے طرح دباؤ میں جینے والے مسلمان، مولانا بخاری کی طاقت ور آواز اور پاٹ دار احتجاج سے اپنے اندر غیر معمولی طاقت محسوس کرتے تھے۔ اُن کے پُر زور احتجاج کی صدائیں حکومتِ وقت کی اعلیٰ قیادت اور اربابِ سیاست و اقتدار کے کانوں سے بھی بار بار ٹکراتی اور اُنھیں جھنجھلاہٹ پر آمادہ کرتی تھیں، بالخصوص خاتونِ آہن ”اندر گاندھی“ (پ: ۱۹ نومبر

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ
 ۱۹۱۷ء مطابق ۳ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ، م ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء مطابق ۴ صفر ۱۴۰۵ھ
 کے لیے وہ سوہانِ روح ثابت ہوتی تھیں۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے دفاع، اُن کے ساتھ ہونے والی
 نا انصافیوں کے خلاف احتجاج اور انھیں آزادی کے بعد سے مسلسل لگنے والے کچوکوں
 کے تعلق سے فریاد چاہنے والی سب سے زیادہ پُر زور اور پُر شور اور کسی بھی ذاتی مصلحت
 سے سب سے زیادہ بے پروا ہانہ آواز، امام صاحب ہی کی آواز بن گئی اور بہت جلد اُن
 کی آواز نے خاصا اعتبار و وقار حاصل کر لیا اور اُن کی عوامی مقبولیت کے ساتھ وہ خاصی
 وزن دار بن گئی۔ اب وہ محض کسی منبر و محراب میں گونجنے والی آواز کے مالک نہ تھے؛ بل
 کہ ملک کے گوشے گوشے میں سنی جانے والی لٹکار والے قائد بن گئے جس کا
 مسلمانوں، بالخصوص مسلم عوام کے دلوں میں اتنا احترام تھا کہ بعض اُن قائدین کا بھی نہ
 تھا، جو امام سید عبداللہ بخاریؒ کی بہ نسبت بہ درجہ عالم و فکر، سیاسی پختہ کاری، قائدانہ تجربہ
 اور اجتماعی خدمت کے میدان میں طویل تجربے کے مالک تھے یا سمجھے جاتے تھے؛
 کیوں کہ وہ مصلحت کوشی کے بغیر، جس جرأتِ رندانہ کے ساتھ، مسلم مسائل کے لیے
 گرجتے تھے، اُس کی وجہ سے نہ صرف مسلم عوام کے نزدیک؛ بل کہ حکومتِ وقت کے
 نزدیک بھی بلند قامت، باوقار شخصیت، ”خوف ناک“ آواز اور ناقابلِ نظر انداز احتجاج
 کے حامل قائد بن گئے تھے، حال آں کہ علم و تجربہ، فکری گہرائی، سیاسی بصیرت اور
 قائدانہ حکمت کے حوالے سے، وہ اب بھی بہت سے لوگوں کے نزدیک کوتاہ قامت ہی
 شمار کیے جاتے تھے۔

مسلمانوں کی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ اٹھنے والے

مولانا بخاریؒ کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ مسلمانوں کو لگنے والے کسی زخم کو دیکھیں
 اور بے تابانہ تڑپ نہ اٹھیں۔ وہ ظلم و نا انصافی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو بہت ہی بُری

طرح گرجتے تھے، اُس وقت اُن کا غصہ دیدنی ہوتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں اپنے ذاتی مفادات کا خیال کرتے تھے، نہ حکومتِ وقت کی دار و گیر سے ڈرتے تھے، نہ فوج و پولس کے ذریعے گرفتاری سے گھبراتے تھے۔ حکومت کے تئیں اُن کا انداز، ہمیشہ چیلنج کرنے اور اپنے خاص اندازِ خطابت سے مشتعل کرنے اور اپنے نرالے ”فریاد کنناں“ انداز سے اُس کی انا کوٹھیس پہنچانے کا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا بے باکانہ اور مصلحت سے بے پرواہانہ انداز کسی قائد یا سیاست داں کا نہیں دیکھا۔ بعض دفعہ مفادات کا خیال رکھنے والے اور حکومت کی طرف سے پیش آنے والی گرفتاری کے خطرات کو پیش نظر رکھنے والے قائدین، بخاری صاحب کی جرأت بے باکانہ کا ناقبت اندیشی، سیاسی غباوت، زندگی اور اُس کے مسائل سے نمٹنے کے طریقوں سے حد درجہ ناواقفیت اور مسلمانوں کے مفادات کے تئیں احمقانہ رویے سے تعبیر کرتے تھے۔ میں عام لوگوں کی زبان سے، اس قسم کے تبصرے بہت سنتا تھا، اخبارات میں بھی بعض دفعہ اُن پر سخت تنقیدیں کی جاتی تھیں؛ لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مولانا بخاری نہ تو بے وقوف تھے اور نہ ہی سیاسی آگہی اور قائدانہ بصیرت سے عاری اور نہ ”فریاد کرنے“ کے موقع محل سے نا آشنا؛ لیکن وہ صاف دل آدمی تھے، اُن میں حالات اور ظلم و ناانصافی پر چیخ اُٹھنے کے حوالے سے بچوں کی سی معصومیت تھی، عوام کی سادگی تھی اور پیچیدگیوں کی فطرت پر نہ پیدا ہونے والے لوگوں کا ساعام انداز تھا؛ اسی لیے وہ مسلمانوں کو درپیش ظلم و جور کے تئیں بے ساختہ طور پر بے چین ہو جاتے تھے۔ جب کہ ”عقل مند“ سیاست داں اور قیادت راں حضرات ”فریاد“ کرنے میں بھی موقع محل کا خیال رکھتے ہیں۔ مولانا بخاری کو اس کا بہت احساس تھا کہ آزادی کے بعد سے حکومت میں رہنے والوں کے چہرے تو بدل جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے تعلق سے اُن میں سے کسی کا رویہ تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ رویہ تبدیل ہو، ورنہ کم از کم ہم تبدیل کرنے کے لیے انھیں اس طرح تو ضرور مجبور کرتے رہیں کہ وہ ایک نہ

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ
ایک دن اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

مولانا بخاری کی یکتائی کا راز و آغاز

۲۶ جون ۱۹۷۵ء (۱۵ رجب ۱۳۹۵ھ) کو ہندوستان کی وزیر اعظم
”اندرا گاندھی“ نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کر کے بڑے بڑے قائدین و سیاست
دانوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا اور فیملی پلاننگ کے سخت احکامات جاری
کر کے مرد و خواتین کی طاقت کے بل پر، بلا استثنائیں بندی کرنے کا استبدادی حکم دیا۔
ہندوستان کے باشندے اپنی زندگی میں شاید ایسے تجربے سے کبھی گزرے تھے، نہ اس
کے متعلق سنا تھا۔ ملک میں یہ ایسی صورت حال تھی، جو آزادی کے بعد کبھی دیکھنے میں
نہیں آئی۔ یہ انداز سیاست و حکومت سامراجی دور کی یاد تازہ کرتا تھا اور دورِ غلامی کا
بھیا نک نقشہ ہر شہری کی آنکھوں کے سامنے ہمہ وقت پھرتا رہتا تھا۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم
اور سیکولر ہندوستان کی بنیادیں استوار کرنے والے پنڈت نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۳ء) کی بیٹی
نے ظلم و جبر کا ایسا کھیل کھیلایا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ عزیزوں کو ذلیل کرنے کی ایسی
طرح ڈالی گئی کہ ہر شہری اپنی جگہ بلا اختلاف مذہب و ملت کانپ اٹھا، لوگ پولس
والوں کی پکڑ کے ڈر سے راتوں کو کھیتوں اور اپنی کھلیانوں میں چھپے دیکے رہتے تھے،
بہت سے لوگوں کی زمینیں اور جایداد بلا کسی قانون کے ناجائز طور پر ہڑپ کر لی گئی، دہلی
میں بالخصوص متعدد مسلم علاقوں کو اجاڑ کے، ساری جایداد کو بہ حق سرکار ضبط کر کے، اس
پر سرکاری کالونیاں تعمیر کر لی گئیں، مسلم نوجوان بہ طور خاص نشانہ بنے ہوئے تھے، پولس
اور فوج کی طاقت کے ذریعے حکومت چلائی جا رہی تھی، کس کو کب اٹھا کے کہاں اور
کتنے دنوں کے لیے بند کر دیا جائے گا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ پورے ملک پر خوف و ہراس
طاری کر دیا گیا، بڑے بڑے رہنماؤں کے اعصاب جواب دے گئے۔ چوں کہ قابل
ذکر سارے رہنماؤں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو جیل میں بند کر دیا گیا تھا؛ اس لیے

کوئی فریاد کرنے والا اور فریاد سننے والا بھی نہ تھا؛ اس لیے عوام بے حد سراسیمہ تھے۔ پولس والوں کا اتھنی ہاتھ مولانا بخاری مرحوم پر بھی دراز ہوا اور انھیں بھی دہلی کی تہاڑ جیل میں ڈال دیا گیا اور انھیں بُری طرح زد و کوب کر کے، اُن کے کپڑے تک پھاڑ دیے گئے؛ کیوں کہ یہ شیر کی طرح جامع مسجد کے منبر سے آخر دم تک چنگھاڑنے والی خوف ناک آواز تھے، جس سے ”اندرا گاندھی“ کا پتہ پانی ہو رہا تھا۔

اُن کی گرفتاری، اندرا گاندھی کے بڑھتے ہوئے ظالمانہ و جارحانہ انداز کار میں آخری کیل ثابت ہوئی، نہ صرف پوری دہلی؛ بل کہ سارا ملک اُن کی گرفتاری کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا بڑی ذات اور کیا چھوٹی ذات، ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگوں نے متحد ہو کر حکومت پر ایسا زبردست دباؤ ڈالا کہ اُس کے پاؤں اکھڑ گئے، دو ہفتے کے بعد انھیں بالآخر رہا کر دیا گیا۔ اب اُن کی آواز پہلے سے زیادہ گھن گرج بن گئی اور اُس میں پہلے سے زیادہ طاقت و قوت پیدا ہو گئی، اب اُس کو ہندو اور مسلمان مشترک طور پر سننے لگے؛ کیوں کہ اب وہ ظلم و جبر کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں کے نمائندے بن گئے تھے۔

ایمر جنسی کی سختیوں نے ہندو مسلمان کو ایسا متحد کر دیا تھا کہ اُس کی نظیر اس ملک میں پہلے دیکھی گئی نہ بعد میں، سارا ملک اندرا گاندھی کے خلاف بہ یک زبان احتجاج بن کر کھڑا ہو گیا، جس کی وجہ سے ۱۹۷۷ء میں ایمر جنسی کا حکم واپس لینا پڑا اور عوام کے مطالبے کے مطابق انتخابات کا اعلان کرنا پڑا۔ ساری سیاسی پارٹیاں ”جنتا پارٹی“ کے نام سے متحدہ محاذ بنا کر کانگریس کے خلاف انتخابات میں اُتریں۔ اندرا کے خلاف طاقت و دولت رہ نما جو ہمیشہ کانگریس کے خادم رہے تھے اور اندرا کے بڑے وفادار سمجھے جاتے تھے یعنی ”بابو جگ جیون رام“ (۱۹۰۸-۱۹۸۶ء) بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے، انھوں نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر پرچوم پرپس کانفرنس کی، جس میں بہت سے قائدین کے ساتھ ساتھ ایک بڑے سابق کانگریسی رہ نما ”ہیم وانی نندن بہوگنا“ (۱۹۱۹-۱۹۸۹ء) بھی شریک ہوئے نیز اندرا

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ

کی حقیقی پھوپھی اور جواہر لال نہرو کی ہمیشہ ”وَجْهَ لُکْشْمی پِنڈت“ (۱۹۰۰-۱۹۹۰ء) نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ الغرض ”جنتا پارٹی“ نے پورے جوش و خروش سے انتخابات لڑا۔ مولانا بخاری نے پورے ملک کا اُس کی تائید و حمایت کے لیے دورہ کیا، ہر جگہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، انھوں نے بڑے بڑے عوامی انتخابی جلسوں کو خطاب کیا، پورا ملک ایک دھاگے میں پرویا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اُس وقت لکھنؤ میں تھا اور بڑے جذبے کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوتا تھا، بڑا اچھا منظر تھا، میں نوجوان تھا اور بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کاش یہ اتحاد و یگانگت پایدار ثابت ہو، تو اس ملک سے سارے فرقہ وارانہ جھگڑے اور رگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے اور یہ ملک یہاں کے ہر مذہب کے شہریوں کے لیے جنت نما ثابت ہوگا۔

جنتا پارٹی بھاری اکثریت سے کام یاب ہوئی اور کانگریس کو اس ملک میں پہلی بار ذلت آمیز ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ ”مرارجی ڈیسا“ (۱۸۹۶-۱۹۹۵ء) ملک کے وزیر اعظم منتخب ہوئے اور اُن کی قیادت میں جنتا پارٹی نے دہلی کے ”رام لیلا“ میدان میں اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے زبردست تاریخی جلسہ کیا، جوانانوں سے کچھا کچھ بھر گیا، ساری جماعتوں اور فرقوں کے رہنماؤں نے اس جلسے میں شرکت کی اور خوشی و مسرت اور جذباتِ فتح مندی کے ساتھ تقریریں کیں، جن میں وزیر اعلیٰ نے بڑے بڑے وعدے کیے اور عوام کو سنہرے و شیریں خواب دکھائے اور یہ بتایا کہ اب اس ملک کی قسمت بدلنے والی ہے، ظلم و جور کا یکسر خاتمہ ہو چکا ہے اور اندرا گاندھی کا جارجا نہ دور اب کبھی عود نہیں کرنے کا۔

اس جلسے میں مولانا بخاری بھی شریک ہوئے، وہ جس وقت اسٹیج پر تشریف لا رہے تھے، اتفاق سے جنتا پارٹی کی حکومت میں وزارت خارجہ کا عہدہ سنبھالنے والے اٹل بھاری واجپائی صاحب (جو بعد میں ابھی چند سال قبل ملک کے وزیر اعظم بھی رہے) محوِ خطاب تھے، جیسے ہی بخاری صاحب پر نظر پڑی، فرمایا کہ اب بخاری صاحب تشریف

پس مرگ زندہ

لاچکے ہیں ان کے بعد اب میری چنداں ضرورت نہیں، اب آپ انھیں سنیے۔ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً اپنی بات ختم کر دی۔

مولانا بخاری کی تاریخی تقریر

مولانا بخاری صاحب نے اس تاریخی جلسے میں، تاریخی انداز میں اپنے خطاب میں ”مرارجی ڈیسا“ وزیر اعظم ہند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اندرا گاندھی کے خلاف متحدہ انقلاب کے نتیجے میں آج ”جنتا پارٹی“ برسرِ اقتدار آچکی ہے؛ کیوں کہ ظلم و جارحیت نے ان کا تختہ پلٹ دیا۔ ہندوستانی عوام کے مثالی اتحاد اور ہم سبھوں کی متحدہ طاقت و رکوششوں کے طفیل یہ سب کچھ ممکن ہوا؛ لہذا اب اقتدار کاں کھول کر سن لیں کہ اگر انھوں نے کج روی اختیار کی اور اندرا گاندھی کی روش پر ذرا بھی چلنے کی کوشش کی، تو جیسے ہم نے انھیں الٹ دیا ہے، انھیں بھی پلٹ دیں گے۔ دیکھیے ہم آپ سے اپنا حق مانگتے ہیں، بھیک نہیں مانگتے، مسلمانوں کو بہ طور خاص کچلا گیا ہے، آپ انھیں ان کا مارا ہوا سارا نہ سہی ضروری حق ضرور دیجیے، ہم شہری کی حیثیت سے حقوق و واجبات میں مساوی ہیں؛ لیکن ہمارے ساتھ دوہرا پیمانہ اختیار کیا گیا؛ لیکن اب اس حکومت میں، جس کے قیام میں، میں ذاتی طور پر بھی شریک رہا ہوں کوئی ظلم ہمیں گوارا نہ ہوگا۔

مولانا بخاری کی لکڑکار سن کر سارے زُعماء، جوانی پر موجود تھے، سناٹے میں آگئے اور انھیں لگا جیسے کسی نے ان کی زبردست گوش مالی کر دی ہو؛ کیوں کہ انھیں اندازہ نہ تھا کہ بخاری صاحب اس بڑے مجمع میں کھلے طور پر انھیں کھری کھری سنا دیں گے اور اپنی مثالی اور روایتی صاف گوئی و بے باکی کا انداز اس وقت بھی زبان انداز نہیں کریں گے۔ وہ واقعی بے لاگ اور بے داغ سیرت کے حامل قائد تھے اور ”عقل عیار“ کی کسی بات کو کسی وقت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے؛ کیوں کہ ضمیر کی پاکیزگی اور جراتِ دل کا گہرا احساس انھیں جنونِ بے خطر کے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ

اور واقعتاً وہی خطرہ درپیش ہوا، جس کا مولانا بخاری کو احساس تھا کہ جتنا پارٹی کی حکومت نے بالخصوص مسلمانوں کے تئیں اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ ایک تو یہ ہر طرح کے خیال کے زُعماء کا اتحاد تھی جس میں جن سنگھ پارٹی اور آریس ایس کے لوگ بھی شامل تھے اور مسلمانوں کی تائید و شراکت بھی تھی، چنانچہ مولانا بخاری کو اس حکومت کے خلاف بھی بہت جلد اپنی آواز بلند کرنی پڑی، جیسے وہ اندرا کی حکومت کے خلاف کرتے رہتے تھے، حتیٰ کہ بعض ذمے داران حکومت سے انھیں سخت کلامی بھی کرنی پڑی، بعض ذمے داروں پر خاص انداز میں اپنا ڈنڈا بھی اٹھالیا؛ کیوں کہ انھوں نے اندرا کی حکومت کو گرانے اور اس حکومت کو بنانے میں یہ طور خاص مثالی کردار انجام دیا تھا۔ انھوں نے بعض ارباب حکومت کو صاف صاف کہہ دیا کہ تمہاری حکومت بہت جلد جانے کو ہے؛ کیوں کہ ہندوستانی سیاست کی خاک میں تمہاری کوئی مستحکم جڑ نہیں ہے، اس کے باوجود تم اپنی من مانی کرنے پر بہت جلد اتر آئے ہو، قانون کا خیال ہے، نہ دستور کا۔ جب اندرا گاندھی کو مضبوط اور مستحکم سیاسی پس منظر کے باوجود، حکومت سے بے دست کیا جاسکتا ہے، تو تم کس کھیت کی مولیٰ ہو؟!۔

قیادت سازی میں مولانا کا تاریخی رول

اور وہی ہوا جو مولانا بخاری نے کہا چنانچہ اپنی میعاد پوری کیے بغیر جتنا پارٹی کی حکومت کو عام انتخابات کا اعلان کرنا پڑا، ۱۹۸۰ء میں یہ انتخابات منعقد ہوئے۔ اندرا گاندھی کو مولانا بخاری کی طاقت اور عوامی مقبولیت کا اندازہ ہو چکا تھا؛ اس لیے وہ اُن سے رجوع ہوئیں اور اس یقین دہانی کے ساتھ اُن سے تائید و حمایت کی طالب ہوئیں کہ سابقہ غلطیوں کو وہ ہرگز نہیں دہرائیں گی اور اگر وہ دوبارہ برسرِ اقتدار آتی ہیں تو غلطیوں کی تلافی اپنے مثبت اور تعمیری و منصفانہ اقدامات سے کریں گی۔ اندرا گاندھی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں، شدتِ غم سے اُن کا برا حال ہو چکا تھا کہ باپ دادا سے وراثت میں

پس مرگ زندہ

ملی ہوئی حکومت اُن کے ہاتھ سے چلی گئی تھی، جس کو وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح چلایا کرتی تھیں اور انھیں یہ فراموش ہو گیا تھا کہ وہ عوام کی منتخب نمائندہ ہیں۔

بہ ہر کیف اندرا گاندھی نے ملک کے طول و عرض کا سفر کیا، ہر جگہ وہ عوام کے ہر طبقے سے ملتیں اور گزشتہ غلطیوں پر معذرت خواہ ہوتیں اور اس انتخاب میں جتانے کی درخواست کرتیں۔ مولانا بخاری نے بھی، ان کے لیے بہت سی جگہوں کا دورہ کیا اور دہلی میں بھی اپنی تقریروں میں عوام کو اندرا کا ساتھ دینے کی اپیل کی، دگر مسلمان قائدین اور غیر مسلم سیکولر زعمائے بھی اُن کا اس انتخاب میں ساتھ دیا، چنانچہ وہ جمیتیں اور اُن کی کانگریس پارٹی کی حکومت بنی۔ کچھ دنوں تو انھوں نے مسلمانوں کے حق میں اچھا رویہ اپنایا؛ لیکن جلد ہی وہ بیچ راہ سے لوٹ آئیں اور اب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم اقلیت کو خوش کرنے کی بجائے حکومت کے استحکام کی راہ یہ ہے کہ اکثریت ہی کو ہر طرح نوازا جائے؛ کیوں کہ یہ غالب اکثریت جو ۸۰ فی صد ہے اگر خوش رہی، تو میری حکومت کا کوئی بال بیکانہ کر سکا۔ اب انھوں نے بابری مسجد اور اجدھیا کی طرف دیکھا اور رام مندر کے مسئلے کو اکثریت کی خوشی کا طاقت ور ذریعہ باور کر کے ہندو زعماء کو اکسایا کہ تم اس کے لیے احتجاج کرو اور ملک کے طول و عرض میں مظاہرے کرو، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہر جگہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، جن میں مسلمانوں کی حسب سابق خوب خوب ”تواضع“ کی گئی۔ ساتھ ہی اندرا نے اس سے بڑی اور بہت بُری ایک اور حماقت یہ کہ سکھوں کی ”خالستان“ کی تحریک کو کچلنے کے لیے، اُن کے مقدس شہر اور اُن کی سب سے مقدس عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل پر فوج کشی کر دی اور اُس کو یکسر مسمار کر دیا۔ سکھوں نے متحدہ طور پر اُسی دن یہ طے کر لیا کہ دیر یا سویر اندرا گاندھی سے، اس کا بدلہ لینا ہے۔ چنانچہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اُن کے محافظ دستے کے ایک سکھ سپاہی نے قریب سے اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور اُن کی رہائش گاہ ان کا مقتل بن گئی۔

سارے ملک کے ہندو، سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں نہ صرف

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ

یہ کہ چُن چُن کے قتل کیا؛ بل کہ اُن کی املاک کو لوٹا، مکانات کو نذر آتش کیا اور انھیں ہر طرح ستایا۔ مجھے یاد ہے کہ پورے ملک کی زمین سکھوں کے لیے، اُس وقت بُری طرح تنگ ہو گئی تھی اور اُس وقت دونوں فرقے: ہندو اور سکھ مسلمانوں کو بہت اچھا سمجھنے لگے تھے؛ کیوں کہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اُس میں مسلمان کسی طرح بھی شریک نہیں ہیں۔ چون کہ اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے اُن کے خاندان کے لیے ہمدردی کی عام لہر پیدا ہو گئی تھی؛ اِس لیے اُن کے بڑے لڑکے ”راجیو گاندھی“ (۱۹۴۴ - ۱۹۹۱ء) بھاری اکثریت سے جیتے اور ایک بار پھر کانگریس کی حکومت برسرِ اقتدار آ گئی۔

”راجیو گاندھی“ نے اپنی حکومت میں بہت سے فتنے کھڑے کیے، جن سے مسلمانوں کی توانائیاں بُری طرح ضائع ہوئیں۔ ”شاہ بانو“ کا مشہور مسئلہ انھیں کے دور میں پیدا کیا گیا؛ تاکہ گدلے پانی میں شکار کیا جاسکے۔ اُس میں مسلمانوں کو کچھ ”چارا“ دے دیا گیا، تو دوسری طرف انھی ”راجیو گاندھی“ نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابرِ مسجد کا ہندوؤں کے لیے تالا کھلوادیا، جو دونوں فرقوں: ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بند تھی کہ نہ مسلمان اُس میں نماز پڑھ سکتے تھے نہ ہندو پوجا کر سکتے تھے۔ اب ہندوؤں نے کھلے عام اُس میں پوجا پاٹ شروع کر دی۔

ان ساری نا انصافیوں اور فتنہ سامانیوں کے خلاف، مولانا بخاری حسبِ سابق گرجتے اور اپنے مخصوص انداز میں اپنا احتجاج درج کراتے رہے۔ جب بابرِ مسجد کو ہندوؤں کے لیے کھول دیا گیا، تو مسلمانوں نے دہلی کے ”بوٹ کلب“ میں زبردست مظاہرہ کیا، جس میں ۵ لاکھ مسلمان شریک ہوئے۔ اُس کی قیادت سید شہاب الدین کے ساتھ مولانا بخاری نے بھی کی اور اُن کی وہاں بھی زبردست تقریر ہوئی، جس کا حکومت پر خاص اثر پڑا اور جو کچھ وہ غالباً اُسی وقت کر لینا چاہتی تھی، وہ نہ کر سکی۔

۱۹۸۹ء کے انتخابات میں مسلمانوں کی عام ناراضگی اور مولانا بخاری کی مخالفت

پس مرگ زندہ

اور دیگر قائدین کے آڑے آنے کی وجہ سے ”راجیو گاندھی“ کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی اور ”وشونا تھ پرناپ سنگھ“ (۱۹۳۱-۲۰۰۸ء) وزیراعظم بنے، جنھیں مولانا بخاری کا آشیر واد حاصل تھا۔ انھوں نے مولانا بخاری کے کئی مطالبے پورے کیے اور متعدد ایسے اقدامات کیے، جن سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو باری مسجد کی مسامی کے بعد پورے ملک میں فسادات برپا کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تو باوجودے کہ بخاری صاحب خاصے بوڑھے اور کم زور ہو گئے تھے؛ لیکن وہ حسب سابق نہ صرف گرجے؛ بل کہ بہت سے مظاہروں کی قیادت کی اور دیگر قائدین کے ساتھ ظلم و جبر کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔

مولانا بخاری مرے بعد زندہ رہیں گے

دسیوں سال سے مولانا بخاری اپنی سن رسیدگی اور امراض کی وجہ سے گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے تھے؛ لیکن وہ اس حالت میں بھی مسلمانوں کو پہنچنے والی کسی تکلیف کو سن کر تڑپ اٹھتے تھے اور اُس کے مداوا کے لیے اُن سے جو بن پڑتا تھا، کرتے رہتے تھے۔

مولانا بخاری اب اس دنیا میں نہیں رہے اور کس کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، لیکن یہ اُن کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اپنی جرأتِ گفتار اور اپنی عوامی مقبولیت کے طفیل تادیر زندہ رہیں گے۔ مرنے کے بعد وہی لوگ زندہ رہتے ہیں، جو زندہ رہتے ہوئے، مرنے کے بعد زندہ رہنے کا سامان کر جاتے ہیں اور اپنے بعد زندہ رہنے والوں کے دلوں میں یادوں کے بہت سے نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔ (*)

یاد رکھے گا تمھیں بھی یہ زمانہ اختر
شرط لیکن یہ ہے کچھ کام نرالے تو کرو

(*) عربی تحریر شائع شدہ ”الذاع“ عربی، شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۳، بابت ماہ رمضان و شوال ۱۴۳۰ھ = ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۹ء، اردو تحریر بہ قلم خود ۵ ۱/۴ بجے شام بہ روز شنبہ ۲۰ شعبان ۱۴۳۰ھ = ۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء۔

سوانحی نقوش

- ✽ نام: (مولانا) سید عبداللہ بخاری۔
- ✽ والد: مولانا سید عبدالحمید بخاری مرحوم (گیارہویں شاہی امام ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء - ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)
- ✽ پیدائش: ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ)
- ✽ جگہ پیدائش: سانہر (راجستھان)
- ✽ تعلیم: عصری تعلیم، سینئر کیمبرج، نئی دہلی۔ درس نظامی (مذہبی تعلیم) مدرسہ عبدالرب، دہلی سے فراغت حاصل کی۔
- ✽ شادی: ۱۹۵۱ء میں رام پور (اتر پردیش) کے مشہور مذہبی مجددی گھرانے میں ہوئی۔
- ✽ اولاد: چار لڑکے دو لڑکیاں۔
- ✽ امامت: دسویں شاہی امام شمس العلماء حضرت مولانا سید احمد بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۴۶ء میں نائب شاہی امام مقرر کیا۔
- ✽ شاہی امام: ۸ جولائی ۱۹۷۳ء (۶ رجب ۱۳۹۳ھ) کو گیارہویں شاہی امام مولانا سید عبدالحمید بخاری نے، حسب رولیت قدیم اپنے فرزند (مولانا سید عبداللہ بخاری) کو عمائدین، علمائے کرام اور نمازیوں کے ایک اجتماع میں منصب امامت پر فائز کیا۔
- ✽ حالات زندگی: شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاری نے ظلم، ناانصافی اور ظالم کے خلاف ہمیشہ پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کی اور بلا لحاظ مذہب و ملت مظلوموں کا ساتھ دیا۔
- ملک کی تقسیم کے بعد دہلی کے مختلف علاقوں میں، فسادوں کے زلزلے میں پھنسے مسلمانوں کو اپنی جان، خطرہ میں ڈال کر جامع مسجد لائے اور ان کی امداد اور باز آبادی کاری کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ بے سہارا اور پریشان حال لوگوں کی خدمت میں شب و روز مصروف رہے۔
- مئی ۱۹۷۴ء میں دہلی کے ”کشن گنج“ علاقہ میں بھیا تک فرقہ وارانہ فساد اور پولس مظالم کے خلاف، پہلی احتجاجی تقریر کی اور حکومت وقت و فرقہ پرستوں کو کھل کر لاکار اور اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور حکومت وقت کے متعصبانہ رویے کے خلاف جدوجہد کو شش بنالیا۔

پس مرگ زندہ

● شاہی امام کے بے باکانہ اور جُزائے مندانہ احتجاج سے گھبرا کر، حکومتِ وقت نے ہندوستانی مسلمانوں کے اس عظیم مرکز کو توڑنے، امامت کے ساڑھے تین سو سالہ اس سلسلے کو ختم کرنے اور شاہی امام کی بے باکانہ آواز کو کچلنے کے لیے سازش تیار کی، شاہی امام نے اس سازش کو بہ طور چیلنج قبول کیا۔

● ۲۲ فروری ۱۹۷۵ء ہندوستانی مسلمانوں، جامع مسجد اور خود شاہی امام کی زندگی کے لیے اہم موڑ (Turning Point) ثابت ہوا۔ اُس روز شاہی امام کو ختم کرنے کی سازش کو انجام دینے کے لیے پولس نے انھیں بُری طرح زدوکوب کیا اور جیل میں ڈال دیا؛ لیکن حکومت کے لیے یہ سودا مہنگا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں کسی امام کے ساتھ کی گئی بدسلوکی پر پہلی بار مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا اور پولس نے نہ صرف جامع مسجد پر گولیاں برسائیں؛ بل کہ متعدد مسلمانوں کو بھی شہید کر دیا۔

● شاہی امام کو اٹھارہ روز جیل میں رکھا گیا، اس دوران شہر میں مسلسل احتجاج جاری رہا اور شاہی امام کی رہائی کے بعد ہی، اُن کی کوششوں سے امن قائم ہوا۔

● جون ۱۹۷۵ء میں ملک بھر میں ایمر جنسی نافذ کر دی گئی، تمام اپوزیشن لیڈروں کو چن چن کر جیلوں میں ڈال دیا گیا، اُس وقت شاہی امام اپوزیشن کی واحد مضبوط آواز بن کر ابھرے۔ اُنھوں نے حکومتِ وقت کے ہر جابرانہ اقدام کی پوری قوت سے مخالفت کی، چاہے وہ سنہندی کے نام سے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا معاملہ ہو یا صفائی کے نام پر ترکمان گیٹ دہلی اور مظفرنگر کے کھالہ پار کا سانحہ ہو، امام صاحب کی پرزور مخالفت اور احتجاج کی وجہ سے مسلم بستیوں کو اُجاڑنے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا گھناؤنا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

● ۱۸ ماہ کے ایمر جنسی کے بعد، جب ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا گیا، تو جے پرکاش نرائن، مرارجی ڈیسی، کے ساتھ شاہی امام صفِ اول کے اُن اپوزیشن لیڈروں میں شامل رہے، جنھوں نے کانگریس کو ۳ سال بعد اقتدار سے بے دخل کرنے میں اہم رول ادا کیا اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد مرکز میں وجود میں آنے والی، پہلی غیر کانگریسی سرکار کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ملاقاتیں

● سربراہانِ مملکت:

● ملک سعود بن عبدالعزیز، سعودی عربیہ ● سعود بن فیصل بن عبدالعزیز آل سعود، سعودی عربیہ

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاریؒ

● مارشل ٹیڈ، صدر یوگوسلاویہ ● جمال عبدالناصر، صدر جمہوریہ مصر ● کرنل معمر قذافی، لیبیا ● ملک عبداللہ بن عبدالعزیز، سعودی عربیہ ● مامون عبدالقیوم، صدر مالدیپ ● جنرل محمد ضیاء الحق، صدر پاکستان ● میاں نواز شریف، وزیر اعظم پاکستان ● سید ہاشمی رفسنجانی، سابق صدر جمہوریہ اسلامی ایران ● صدام حسین، صدر جمہوریہ عراق۔

✽ سر کردہ مذہبی شخصیات:

● شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، امام کعبہ، مکہ المکرمہ ● امام آیت اللہ خمینی، ایران۔



مولانا حکیم عزیز الرحمن مئویؒ

۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء - ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

ذرا بولتے رہو اے ہم صفیرو!
میں آواز دوں، تم بھی آواز دینا

جمعرات : ۱۹/رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۰/ستمبر ۲۰۰۹ء کو صبح تقریباً ۱۰ بجے، مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب مئوی سابق استاذ جامعہ طیبیہ دارالعلوم دیوبند و پسر اکبر حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، و برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و چیف ایڈیٹر ”البعث الاسلامی“ لکھنؤ، اپنے وطن ”مونا تھ بھجن“ کے محلہ ”الہ داد پورہ“ میں جس کے وہ باسی تھے، تقریباً ۹۱ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے، جنت الفردوس کا مکین بنائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرمائے۔

وہ خاصے بڑھاپے کے باوجود، بڑی حد تک صحت مند تھے، انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل اپنے گھر میں زینے سے پھسل گئے، جس سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کمر میں شدید چوٹ آئی، گھر ہی میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج ہو رہا تھا کہ وقتِ آخر آپہنچا اور وہ وہاں چلے گئے جہاں ہر انسان کو جانا ہے۔

حکیم صاحب کا امتیاز

حکیم صاحبؒ پختہ علم عالم دین، لدنی تباض اور ذی استعداد حکیم اور عربی کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور انگریزی پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ وہ شستہ و برجستہ اور خوب صورت اردو لکھتے تھے اور فارسی و انگریزی سے اردو میں اتنا ماہرانہ اور رواں ترجمہ کرتے تھے کہ کہیں سے ترجمے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ لگتا تھا کہ کسی اچھے اہل قلم اور اردو کے ماہر انشا پرداز نے براہ راست اردو نویسی کی ہے۔ وہ فارسی اور اردو میں مشقِ سخن بھی کر لیتے تھے اور شعر و نثر کا پاکیزہ اور لائق ذکر ذوق رکھتے تھے۔ وہ بڑے ذہین اور اخاذ طبیعت کے مالک تھے، کسی علم و فن کے سیکھنے میں، ذرا سی توجہ اُن کے لیے کافی ہوتی تھی۔

یوں تو وہ علم و فن کی دنیا میں کچھ زیادہ مشہور نہ تھے، جیسے بہت سے علما و فضلاء اللہ کی مشیت و توفیق سے، نام و ر ہو جاتے ہیں، حال اُن کہ ہر مشہور و نام ور شہرت کا واقعی مستحق نہیں ہوتا؛ لیکن حکیم عزیز الرحمن صاحبؒ میں بڑائی و عظمت کے بہت سے عناصر پائے جاتے تھے۔ وہ بڑے خلیق تھے، اُن کا دل آئینے کی طرح شفاف تھا، ساتھ ہی بڑے ذہین، خوش مزاج و ہر مذاق تھے، چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ روئی سے ملتے تھے، اُن سے ٹوٹ کے محبت کرنے کو جی چاہتا تھا، وہ ہر ایک کے لیے انتہائی دیرینہ شناسا محسوس ہوتے تھے۔ اُنھوں نے جو علم و ہنر حاصل کیا، اُس میں تعلیم گاہ سے زیادہ، اُن کی اخاذ طبیعت اور قدرتی ذہانت کا دخل صاف طور پر محسوس ہوتا تھا، وہ علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اُن کے عظیم والد مولانا محمد ایوب صاحبؒ بلند پایہ محدث، بڑے متقی اور علمائے سلف کی سیرت کے حامل تھے، اُنھوں نے اپنی اولاد کی اس طرح تربیت کی کہ ہر ایک لعل و گہر بن کر اپنی اپنی جگہ منفرد مقام کا حامل بن گیا۔ حکیم صاحبؒ کے برادر اور اوسط مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی برصغیر کے محدودے چند عالی قدر اُوبا و اہل قلم میں سے ایک اور عربی کے صاحب طرز ادیب ہیں، اُن کے منفرد اسلوب میں جاحظ کی استافت، ابن المقفع کی

سلاست، عبد الحمید الکاتب کے نرالے پن، عبد القاہر جرجانی کی بلاغت اور اُن کے عظیم استاذ و مربی اور برصغیر کے عظیم داعی و مُفکر و مؤلف و ادیب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی پُر سوز زبان کا اثر صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اُن کے برادرِ خرد جناب ڈاکٹر مسیح الرحمن صاحب اعلیٰ درجے کے عصری تعلیم یافتہ اور پروفیسر ہیں۔

حصولِ علم

اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۱۸ء (۱۳۳۶ھ) ہے۔ اُنھوں نے بیشتر تعلیم اپنے وطن ”منو“ اور زیادہ تر ”مفتاح العلوم“ منو میں حاصل کیا، جس کی تعمیر و ترقی میں اُن کے والد مولانا محمد ایوبؒ کا بھی بڑا رول رہا تھا۔ مولانا محمد ایوب عرصے تک وہاں اعلیٰ درجوں کے استاذ بھی رہے۔ حکیم عزیز الرحمن صاحب نے اپنے والد صاحب کی نگرانی میں تعلیمی سفر طے کیا۔ اُن کے اساتذہ میں محدث کبیر و عالم شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۳۱۲ھ/۱۹۹۲ء) نیز عالم بے باک و قائد ہوش مند حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانی منویؒ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۹ء - ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۳ء) جیسے اہل علم و فضل ہیں۔ اُنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں اُنھوں نے یہاں دورہ حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔ اُن کے دورے کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۹ء - ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء)، شیخ الادب و الفقه حضرت مولانا محمد اعجاز علی امرودہویؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء - ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۳ء) اور علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء - ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) وغیرہم جیسے اعلامِ علم و فضل تھے۔

عملی زندگی

دارالعلوم سے فراغت کے بعد اُنھوں نے پرائیوٹ طور پر (B.A) کا یو پی کے

بعض سرکاری اسکولوں سے امتحان دیا اور اچھے نمبرات سے کام یاب ہوئے۔ ۱۹۳۳ء (۱۳۶۳ھ) میں مئو کے (D.A.V) کالج میں فارسی زبان کے استاذ رہے۔ اُن کے برادر اوسط مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی مدظلہ نے اس ناچیز کو بتایا کہ اُنھوں نے کچھ عرصے تجارت کا مشغلہ اختیار کیا، پھر انگریزی دواخانہ قائم کیا، جس میں کلینک کا نظم بھی کیا اور باکمال ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں وہ خود بھی مریضوں کو دیکھنے کی خدمت انجام دیتے تھے، اسی لیے اُن کا دواخانہ خوب چلا اور مئو کے ممتاز دواخانوں میں شمار ہونے لگا؛ لیکن اُن کی علمی و دینی افتاد نے اُنھیں اس راہ کا تادیر مسافر بنے رہنے سے باز رکھا، وہ اس کے بعد وقت کے عالی مقام اہل دل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ آبادی (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء-۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) کے دست گرفتہ ہو گئے، جو علم و معرفت کے امام وقت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے اجل خلفا میں تھے۔ وہ کئی سال تک اُن کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے اور اُن کے نفس گرم کی تاثیر سے اپنے قلب و روح کو گرماتے رہے۔

جامعہ طبیبہ دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت اُستاذ آمد کی تقریب

اسی اثنا میں ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ دارالعلوم دیوبند نے علم طب کی تعلیم کے لیے باقاعدہ ایک ادارہ ”جامعہ طبیبہ“ کے نام سے قائم کیا ہے۔ جامعہ طبیبہ کے قیام کے دو سال بعد شاہ صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ وہاں متعدد اچھے اساتذہ طب کی ضرورت ہے، شاہ صاحبؒ نے حکیم صاحبؒ کو حکم فرمایا کہ آپ وہاں تدریسی خدمات کے لیے درخواست دے دیں، حکیم صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے باقاعدہ علم طب نہیں پڑھا ہے، صرف ذرا بہت مطالعہ اور تجربہ ہے، بھلا میں وہاں تدریس کی کیسے جرات کر سکتا ہوں؟ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: تم

درخواست گزار دو اور علم طب کی کتابوں کا مطالعہ کر لو، مجھے یقین ہے کہ تم وہاں مشکل سے مشکل کتابیں دگر اساتذہ سے اچھی پڑھاؤ گے، چنانچہ حکیم صاحب نے تدریس کے لیے درخواست دی، وہاں استاذ ہوئے اور خدا کی توفیق اور شاہ صاحب کی دعا و توجہ کی برکت سے انتہائی کامیاب استاذ ثابت ہوئے۔

جامعہ طیبہ میں بہ حیثیت استاذ تقرر

حکیم صاحبؒ نے ”جامعہ طیبہ“ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے درخواست دی اور انھیں دارالعلوم میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا، انٹرویو کے بعد جامعہ طیبہ کے پرنسپل حکیم محمد عمرؒ (متوفی شنبہ ۳۰ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۹۹۹ء) نے اہتمام کو جو رپورٹ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو پیش کی اُس میں تحریر فرمایا کہ

۱۳/۵/۱۹۶۳ ”جو اطبا انٹرویو میں شریک تھے، اُن میں سے مولوی حکیم عزیز الرحمن صاحب ہیں، جو الہ آباد سے آئے تھے، دین داری اور قابلیت کے اعتبار سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جناب والا (۱) نیز حضرت علامہ مدظلہ (۲) نے بھی اُن کو

پسند فرمایا تھا۔“ ۱۴/۵/۱۹۶۳

اہتمام کی طرف سے ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو حکیم صاحب کو الہ آباد خط لکھ کے استفسار کیا گیا کہ کیا وہ دارالعلوم کے عربی طبی نصاب کی مندرجہ ذیل کتابیں پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟: قانون چہ سیدی فن ثانی، شرح اسباب مکمل، نفیسی کلیات، قانون شیخ کلیات و حیات، کامل الصناعتہ مقالہ ثانیہ و ثالثہ و تاسعہ۔ نیز طلبہ کونسخہ نویسی کی مشق بھی کرا سکیں گے کہ نہیں؟

اس کے جواب میں حکیم صاحبؒ نے مہتمم صاحب نور اللہ مرقدہ کے نام ذیل

(۱) یعنی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(۲) یعنی علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ۔

پس مرگ زندہ

کامکتوب ارسال فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی توفیق، اپنی ذاتی محنت و ذہانت، اپنے عظیم والد اور اپنے شیخ و مربی کی دعاؤں کے طفیل، اُن میں گنتی خود اعتمادی اور استعدادِ کامل پیدا ہو گیا تھا:

”ذوالمجد والکرم ! مَتَّعَنَا اللَّهُ بِطَوْلِي بِقَائِهِ۔“

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ۱۴/۵/۱۹۶۳

گرامی نامہ مورخہ ۱۳۸۲/۱۲/۲۰ھ شرفِ صدور لایا، مسرت ہوئی، سوالات مندرجہ مکتوبِ گرامی کے جواب میں گزارش ہے کہ یعقوب اللہ تعالیٰ میں جناب کے طبیہ کالج کے جملہ مضامین و فنونِ طب پڑھانے کی پوری قدرت رکھتا ہوں۔ اگر طلبہ عربی زبان میں چاہیں تو عربی میں بھی بہ احسن وجہ تفریر کر سکتا ہوں اور اگر فارسی و اردو میں چاہیں تو اُن دونوں زبانوں میں، اہل زبان کی طرح تعلیم و تفریر کر سکتا ہوں۔ نسخہ نویسی و طبِ جدید کے مضامین خواہ وہ انگریزی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں، نہایت آسانی سے سمجھنے اور سمجھانے کی قدرت رکھتا ہوں۔ الحمد للہ کہ اس سلسلے میں کسی اعانت و رہنمائی کا محتاج ثابت نہ ہو سکوں گا۔

عزیز الرحمن

۲۲/۵/۱۹۶۳ء = 28/12/1382

۱۹۶۳/۶/۶ اس کے بعد اہتمام دارالعلوم نے، انھیں دارالعلوم حاضر ہونے کو کہا، حکیم صاحب ۱۳/محرم ۱۳۸۳ھ کو دارالعلوم حاضر ہوئے اور اپنی حاضری اور کارِ مطلوبہ کی تفویض کی درخواست ان الفاظ میں دی:

”گرامی مرتبت حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند! ۱/۱/۱۳۸۳
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حسب الحکم مورخہ ۲۵/۵/۱۹۶۳ء آج بہ

۱۳/۱/۱۳۸۳ تاریخ ۶/جون ۱۹۶۳ء حاضر ہو رہا ہوں، مجھ سے جو خدمات متعلق ہوں، اُن کی تفویض کا حکم صادر فرمادیا جائے، ممنونِ کرم ہوں گا، اطلاعاً گزارش ہے۔“

عزیز الرحمن

پنج شنبہ

۱۳/۶/۱۹۶۳ ۱۳ محرم ۱۳۸۳ھ

اس درخواست کو حکیم محمد عمر صاحبؒ پرنسپل جامعہ طیبیہ نے، اُسی دن شام کو بجے دفتر اہتمام میں بھیج دیا۔ جس پر کارروائی کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحبؒ نے بہ روز منگل ۸ محرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۶۳ء کو حکیم صاحب کا تقرر فرماتے ہوئے، یہ الفاظ تحریر فرمائے:

”حکیم عبدالکریم صاحب کے استعفادے کر چلے جانے سے، ادارہ طیبیہ کی تدریس میں جو خلا واقع ہو گیا تھا، اُس کے جلد سے جلد پُر کرنے کی ضرورت تھی؛ ورنہ تعلیم کا نقصان تھا اور آغاز سال میں یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا؛ اس لیے جناب مولوی حکیم عزیز الرحمن کو اس خدمت کے لیے بلایا گیا۔ مدوح انٹرویو میں شریک تھے، اُن کی صفات کو قابلِ اعتماد سمجھا گیا تھا؛ لہذا مدوح کا تقرر جامعہ طیبیہ میں کیا جاتا ہے۔“

محمد طیب

۱۳۸۳/۱/۱۸ھ

حکیم صاحبؒ نے جامعہ طیبیہ دارالعلوم دیوبند میں فنِ طب کی عربی و فارسی کی مشکل ترین کتابیں، جنھیں پڑھانا دگر اساتذہ کے لیے عموماً دشوار گزار تھا، کم و بیش ۲۳ سال تک ماہرانہ انداز میں پڑھائیں، اُن کے بہت سے تلامذہ طب اور فقہائے تدریس اُنھیں ”حکیم لدنی“ بھی کہتے تھے؛ کیوں کہ اُنھوں نے فنِ طب کو باقاعدہ نہ پڑھنے کے باوجود جس لیاقت کے ساتھ مشکل سے مشکل کتابوں کا درس دیا اور طلبہ و اساتذہ و ذمے داروں کی محبت و اعتماد حاصل کیا، اُس کو اُن کی ذہانت کے ساتھ ساتھ، خدا کی توفیق خاص اور اُن کے والد تقویٰ شہار حضرت مولانا محمد ایوبؒ اور اُن کے مقبول بارگاہِ الہی شیخ شاہ وحی اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا خاص ثمرہ ہی باور کیا جاسکتا ہے۔

جامعہ طیبہ بند ہو جانے کے بعد

۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء (۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ) کو حکومت ہند کی طرف سے عائد کردہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ جامعہ طیبہ کو بند کر دے؛ کیوں کہ گورنمنٹ کی ناقابل عمل قانونی پابندیوں پر عمل کرنا اور سخت شرطوں کو پوری کرنا دارالعلوم کے بس میں نہ تھا؛ کیوں کہ دارالعلوم ایک اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے جو مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت، کتاب و سنت کے علوم کی ترویج، سیکولر ہندوستان میں اسلامی وجود کی حفاظت اور حساس اسلامی سرحد پر زٹے دارانہ مورچہ بندی کے لیے معرض وجود میں آیا تھا اور الحمد للہ اس سلسلے میں وہ قائدانہ رول، ذمہ داری سے ادا کر رہا ہے۔

جامعہ طیبہ کے بند ہو جانے کے بعد، دارالعلوم نے اُس کے اساتذہ اور ملازمین کو مختلف قسم کی ذمے داریاں سپرد کیں، جو اُن کی علمی صلاحیت اور تعلیمی تجربے سے میل کھاتی تھیں۔ حکیم عزیز الرحمن صاحبؒ کے حصے میں یہ آیا کہ وہ ”شیخ الہند اکیڈمی“ کے قلمی اور تحقیقی رفیق بن جائیں اور اپنی پسند کے موضوعات پر کتابیں اور مقالات لکھیں۔ حکیم صاحبؒ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اردو زبان میں اپنی گراں قدر کتاب ”مناقبِ امام اعظم ابوحنیفہ“ لکھی؛ لیکن دو تین سال کے بعد ہی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ صفر ۱۴۰۹ھ میں اُن کی سن رسیدگی اور بڑھاپے کی وجہ سے انھیں علامتی ماہ وار وظیفہ پر ریٹائر کیے جانے کا فیصلہ کیا، جسے دارالعلوم کے مہتمم ”مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ نے ۲۲ صفر ۱۴۰۹ھ (۶ ستمبر ۱۹۸۸ء) کو نافذ کرتے ہوئے، انھیں یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ سے ۴۰۰ روپے ماہ وار وظیفہ دیے جانے کی اطلاع دی، جو اُن کی وفات تک انھیں دیا جاتا رہا۔ ۱۳/۱۰/۱۹۸۸

اُن کی وفات، رمضان کے مبارک مہینے میں ہوئی جس میں حدیث شریف کے

مطابق جنت کے دروازے کھول اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور سرکش شیطین کو قید کر دیا جاتا ہے، اس لیے اللہ کریم کے فضل سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے گا اور اُن کی اُن تمام خطاؤں اور لغزشوں سے، جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے گا۔

حکیم صاحبؒ، جامعہ طیبہ کے محبوب ترین اُستاذ تھے۔ میں نے اُن کے تلامذہ کو اُن کا بے حد ثنا خواں پایا، وہ ہر مجلس میں اُن کی تدریسی صلاحیت، تعلیمی لیاقت اور مطلوبہ مضامین کو انتہائی سہل اور شیریں انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنے کے اُن کے ملکہ کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ وہ فنِ تدریس میں اس لیے بھی کامیاب تھے کہ اُن کی مجلسِ درس سنجیدگی اور مذاق، خوش مزاجی اور ظرافتِ طبعی کا آمیزہ ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی ذہانت، اُن کے لیے زندگی کے ہر مشن کو حد درجہ آسان کر دیتی تھی۔

حکیم صاحبؒ کی تالیفی خدمات

مرحوم تصنیف و تالیف کے حوالے سے قدرتی صلاحیت کے حامل تھے۔ اُن کا قلم بہت رواں تھا۔ وہ تدریسی کمال کے ساتھ ساتھ تالیفی میدان کے بھی شہ سوار تھے۔ اُن کی مندرجہ ذیل تصنیفات شائع ہو چکی ہیں:

میڈیکل انگلش اردو ڈکشنری جس کا اصل نام حکیم صاحب نے شاہ وصی اللہؒ کی طرف نسبت کر کے وصی میڈیکل ڈکشنری (Wasi Medical Dictionary) رکھا تھا، سنگم سہ لسانی (اردو، عربی، انگلش) ڈکشنری، یہ تین جلدوں میں ہے اور انگریزی میں اس کا نام Thri Lingual Dictionary ہے۔ اُن کی بہت سی کتابوں اور تراجم کے مسوّدات منظرِ اشاعت ہیں، جن کی تعداد شائع شدہ کتابوں سے زیادہ ہے۔ اُن کی موت کے بعد اُن کے یہ علمی سرمایے اور تصنیفی و تالیفی کارنامے، اُن کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے اور اُن کے لیے اجرِ مسلسل کا ذریعہ بنیں گے۔

حکیم صاحب سے تعارف و تعلق

اُن سے طالب علمی کے زمانے میں، اس ناچیز کے متعارف ہونے کی تقریب یہ ہوئی کہ دارالعلوم کے مشہور ہاسٹل ”دارِ جدید“ کے کیمپس میں، جس کے ایک بالائی کمرے ۳۳ میں میری اور میرے ہم قریہ طلبہ کی رہائش تھی، جمعہ کے دنوں میں غسل خانوں میں بڑی بھیڑ ہو جاتی تھی، چنانچہ میں اور میرے کئی رفقاء درس عموماً جمعہ کے دنوں میں ”جامعہ طیبہ“ کی عمارت کے کیمپس کے ایک گوشے میں نصب کردہ ہینڈ پائپ پر جا پہنچتے اور اُسی پائپ پر غسل کرتے اور اپنے کپڑے صاف کرتے۔ یہ ہینڈ پائپ ”جامعہ طیبہ“ کے احاطے میں حکیم صاحب کے کمرے کے پاس واقع تھا۔ ہم جب بھی وہاں جاتے، تو وہ ہم سے خبر خیرت معلوم کرتے، ہمارے درجوں کا احوال، ہمارے وطن اور خاندان کی بابت پوچھتے، بسا اوقات وہ اپنی خدمت پر مامور طالب علم کو ہمیں چائے وغیرہ پیش کرنے کا حکم دیتے۔ اس طرح حکیم صاحب سے ہماری خوب جان پہچان ہو گئی اور وہ ہمارے لیے رفتہ رفتہ وئی لائمر کا درجہ اختیار کر گئے، وہ ہمیں نصیحتیں کرتے، مشورے دیتے اور ہماری بھلائی کی سوچتے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہے، ہم لوگ پڑھائی لکھائی میں محنت کرتے ہیں، انھیں ہمارے طور طریقے سے یہ خوش گمانی ہو گئی تھی کہ ہم سوجھ بوجھ کے طالب علم ہیں؛ اس لیے وہ ہماری خبر گیری اور تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے لگے؛ کیوں کہ انھیں ذہین طلبہ اور مخفی نوجوانوں سے ہمیشہ محبت رہی۔

انھیں کسی طرح ایک روز یہ بات معلوم ہو گئی کہ ہم دارالعلوم سے مفت دیا جانے والا کھانا کھایا کرتے ہیں، ایک دن کی بات ہے کہ ہم اپنے کمروں سے اُتر مدنی گیٹ کے زینوں سے نیچے آ کر درس گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ حکیم صاحب سے ملاقات ہو گئی، وہ دارالعلوم سے مدنی گیٹ کی طرف جا رہے تھے، اُن کا رخ اپنی ”جامعہ طیبہ“ کی

طرف تھا، اُنھوں نے ہمیں روک لیا اور فرمایا: ہمیں تم لوگوں سے ایک بات کہنی ہے: تم لوگ محنتی اور ذہین طالب علم ہو، ہماری رائے ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے مفت دی جانے والی خوراک استعمال نہ کرو، کیوں کہ یہ خوراک عموماً اُن عوامی چندوں سے پیش کی جاتی ہے، جن کا بڑا حصہ زکاة پر مشتمل ہوتا ہے۔ زکاة مال دار مسلمانوں کے مالوں کا میل پچھل ہوتی ہے۔ جس سے فکری تاریکی اور قلبی ظلمت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، کیا اچھا ہوتا کہ اگر تمہارے بس میں ہو تو تم لوگ اس سے پرہیز کرتے۔ ہم نے کہا: ہم لوگ نادار طالب علم ہیں، ہمارے گھروں پر بھی کوئی کثادگی نہیں اور یہاں تو ہم وطن سے دور دینی علوم کی طلب میں، طالب علمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ حکیم صاحبؒ نے فرمایا: تب تم لوگوں کے لیے دارالعلوم کے مفت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم لوگوں کو ایسا مشورہ دیا جس پر عمل کرنا تمہارے بس میں نہیں۔

حکیم صاحبؒ کی ہم لوگوں کے ساتھ یہ مخلصانہ شفقت و محبت صرف اُسی وقت تک قائم نہیں رہی جب تک ہم لوگ دارالعلوم میں طالب علم رہے: بل کہ دارالعلوم سے ہماری جدائی کے بعد بھی وہ برابر ہماری خبر خیریت، مراسلت اور آنے جانے والوں کے ذریعے معلوم کرتے رہے۔ ایسے مخلص اور ہم درد ”بڑے“ بہت کم ہوتے ہیں، جو کسی غرض کے بغیر ”اجنبی لوگوں“ اور دور افتادہ انسانوں سے ہمہ دم تعلق رکھیں۔ اللہ انھیں بہت نوازے اور اُن کی ساری شفقتوں کا بدلہ وہاں عطا کرے، جہاں اس بدلے کی انھیں بہت ضرورت ہوگی۔

حکیم صاحب نے کچھ سال امارتِ عربیہ متحدہ کی مشہور امارت دہلی میں بھی گزارے ہیں جہاں اُن کے صاحب زادے مولانا محی الدین طیب قاسمی مقیم تھے، جو شیخ سالم کی مسجد میں امام و خطیب رہے۔ ایک بار راقم کا امارات کا، دوستوں کی دعوت پر سفر ہوا، حکیم صاحب سے بھی اُن کی قیام گاہ پر ملاقت ہوئی۔ وہ وہاں بھی بڑی محبت، خوش اخلاقی اور اپنائیت سے ملے اور ایسا لگا کہ ہم دیوبند میں اُن کی رہائش گاہ پر اُن کی

ضیافت اور شرافتِ نفسی سے محفوظ ہو رہے ہیں۔ وہاں بھی اُن کے محبتیں اور اہل تعلق کا بڑا حلقہ نظر آیا، ہمہ وقت ملنے جلنے والے آتے رہتے اور حکیم صاحب ہر ایک کے ساتھ فیاضی اور سیرچشمی سے پیش آتے۔ اُنھوں نے وہاں قیام کے دوران بھی حکیمی دواؤں اور علاجِ معالجے کا تھوڑا بہت سلسلہ قائم کر لیا تھا، جس سے اُن کا جی بھی بہلتا تھا اور خلقِ خدا کو فائدہ بھی پہنچتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت اُستاذِ راقم کی آمد اور حکیم صاحب کی مسرت

شوال ۱۴۰۲ھ / اگست ۱۹۸۲ء میں یہ راقم بہ حیثیت اُستاذِ دارالعلوم و چیف ایڈیٹر الداعی عربی دارالعلوم آیا، تو وہ بہت خوش ہوئے، جیسے کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے سے اُس وقت خوش ہوتا ہے جب وہ اپنی دنیا یا آخرت سے متعلق کوئی بڑا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ یہاں آنے کے بعد ”جامعہ طیبہ“ کی عمارت کے احاطے میں اُن کے کمرے میں پہلے کی طرح مجلسیں جنمے لگیں، یہ مجلسیں بسا اوقات مخدوم گرامی حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتاحی (۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء - ۰۰۰۰ / ۰۰۰۰) سابق مفتی دارالعلوم دیوبند یا اُستاذِ محترم علامہ محمد حسین بہاریؒ (۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء - ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء) سابق اُستاذِ حدیث کے کمروں میں بھی جما کرتی تھیں، جن میں طرح طرح کی باتیں ہوتیں اور علمی و دینی مباحثوں کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر بصیرت مندانہ تبصرے بھی ہوتے تھے، حکیم صاحب کو سیکڑوں شعر، لطیفے، کہانیاں اور قد آور پڑھے لکھے لوگوں، علماء و فہما و صلحا اور اُدبا و شعرا کے دلچسپ واقعات یاد تھے، جنھیں وہ اپنی ذہانت، بذلہ سخی اور ظرافت کی بنا پر رنگ آمیزی کے ساتھ سنایا کرتے تھے، جس سے یہ مجلسیں زعفران زار بن چلیا کرتی تھیں۔ اب نہ مجلس والے رہے اور نہ یہ مجلسیں، جب بھی ان مجلسوں کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، کیا خوب دن تھے اور کتنے اچھے لوگ۔ رہے نام اللہ کا۔

دارالعلوم کی پرانی انتظامیہ جس کے سربراہ ہندوستان کے منفرد عالم، اسلام کے اپنے وقت کے بڑے ترجمان اور برصغیر ہندوپاک میں اُس کی تبلیغ زبان کی حیثیت رکھنے والی شخصیت، یعنی برصغیر میں دورِ آخر میں اسلام کے بہت بڑے پاسبان امامِ ہمام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۳۳۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے پوتے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ تھے، کو برخاست کر کے جب نئی انتظامیہ دارالعلوم میں برسرِ کار آئی، تو ہم خادموں کو دعوتِ خدمتِ تدریس و تخریر دی گئی۔ ہم یہاں شوق کے پروں سے اڑ کے آئے؛ لیکن چون کہ اُس وقت تک اختلاف کی گردِ بیٹھی نہ تھی اور حالات کا اونٹ صحیح کروٹ بیٹھ نہ سکا تھا، اس لیے یہاں غیر یقینی کی صورتِ حال باقی تھی، جس کی وجہ سے نہ صرف بے کیفی تھی؛ بل کہ کام کرنے والوں کو بڑی حد تک اپنے کاموں میں جی بھی نہیں لگتا تھا۔ اس راقم کی طبیعت تو اور بھی بہت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی؛ کیوں کہ اُس کو اس طرح کے حالات کا کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں حکیم صاحبؒ نے ہم لوگوں کو ذہنی طور پر یہاں خاطر جمع رکھنے اور اپنے کام میں ہمہ تن مشغول رہنے کے لیے بہت تیار کیا؛ ورنہ شاید ہم ان حالات میں یہاں جم نہ پاتے۔

صورت و سیرت

حکیم صاحبؒ گورے چٹے مائل بہ گندمی اور متوسط القامت تھے، بڑی حد تک مضبوط کاٹھی کے تھے، اُن کی ہنوس گھنیری تھیں؛ لیکن داڑھی کے بال قدرتی طور پر شکستہ تھے، اُن کی آنکھیں ذہانت سے چمکتی تھیں اور طبعی زیرکی کا پتہ دیتی تھیں۔ پیشانی کشادہ اور ناک کھڑی تھی۔ وہ قدرے جھومتے ہوئے چلتے، وہ ہمہ وقت خندہ زور رہتے، اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی؛ لیکن جب کوئی اہم معاملہ پیش آ جاتا، تو وہ گہری خاموشی اور طویل غور و فکر میں غرق ہو جاتے، وہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہتے، تازہ خبروں پر تبصرے اور تجزیے کرتے، وہ لوگوں کی طبیعتوں اور زندگی میں اُن کے سلوک،

لوگوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ اور عام گفتگو میں اُن کے لب و لہجے کے ذریعے، اُن کی اندرونی کیفیات اور بڑی حد تک اُن کی نیتوں کا ادراک کر لیتے تھے۔ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کے خیر خواہ اور اُن کی بھلائی کے طالب رہا کرتے تھے، وہ نہ صرف نماز باجماعت کے پابند؛ بل کہ دین کے آداب و احکام کے بھی پابند تھے، وہ نماز میں صفِ اوّل میں حاضری کا اہتمام کرتے، اُن کی تکبیر تحریمہ کبھی فوت نہ ہوتی، وہ بے فائدہ لوگوں سے اختلاط نہ رکھتے تھے، دنیا اور آخرت کی کوئی بھلائی اگر اُن سے متقاضی نہ ہوتی تو وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے؛ لیکن وہ کسی سے دشمنی کرتے نہ اُسے ناپسند کرتے اور نہ اُن کے دل میں کسی کی طرف سے کوئی غبار ہوتا۔ وہ بڑھاپے کے باوجود جامعہ طیبہ کے احاطے سے سڑک کو پار کر کے پانچوں نمازیں دارالعلوم کی مسجد قدیم ہی میں ادا کرنے آتے تھے۔ جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات، اُن کے اس معمول میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔

حکیم صاحب بڑے مجلسی آدمی تھے، اُن کی صحبت میں بہت دل لگتا تھا، اُن کی مجلس میں علم و ادب، شعر و نثر، فکری روشنی، عالمانہ نکتہ سنجی، ادیبانہ ضلع جگت، مبصرانہ تجزیے، ذہانت و فطانت کی گل کاریاں اور غم غلط کرنے والے ایسے اور اتنے برجستہ اور رس بھرے فقروں کی بھرمار ہوتی تھی کہ کسی باذوق کو وقت کی طوالت کا احساس ہوتا تھا نہ ضروری معمولات میں خلل اندازی پر افسوس۔

انھیں برتنے والے کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ تنگ نظر اور کم علم عالم دین نہیں؛ بل کہ وسیع النظر، روشن فکر، متوّع الثقافہ اور کھلے دل و دماغ کے آدمی ہیں۔

مرحوم بڑے سخی، کشادہ نفس اور سنتِ نبوی پر عمل پیرا تھے، بالخصوص اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینے کے حوالے سے۔ وہ سن رسیدگی اور کم زوری کے باوجود اپنے سارے کام خود انجام دیتے تھے، حتیٰ کہ مرض الموت میں وہ لیٹے لیٹے اپنی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ نہ صرف صوم و صلاۃ کے انتہائی پابند؛ بل کہ حدود

اللہ کی بے حد رعایت کرنے والے اور جوانی کے زمانے سے تہجد گزار اور شب بیدار تھے، جس پر وہ تاحیات قائم رہے، وہ بہت جلدی مانوس ہو جانے والے اور مانوس کر لینے والے تھے، وہ دوسروں کو محبوب رکھتے تھے؛ اس لیے وہ دوسروں کے محبوب تھے۔ اُن سے ہر ملنے جلنے والا، اُن سے مانوس ہو جانے، اُن کی طرف مائل ہو جانے، اُن سے محبت کرنے اور اُن کی محبت پر باقی رہنے پر مجبور ہوتا تھا؛ کیوں کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کے دلوں میں ناقابلِ زوال خوب صورت تاثر چھوڑ دیتے تھے۔

پس ماندگان

اُنھوں نے اپنے پیچھے دو بھائی چھوڑے: یعنی برادرِ اوسط مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی اور ڈاکٹر مسیح الرحمن اعظمی اور ایک لڑکا یعنی نیک خوجا عالم مولانا محی الدین طیب اور ایک لڑکی، یہ دونوں صاحبِ اولاد ہیں اور بھائیوں اور اُن کے صاحبِ زادوں اور صاحبِ زادیوں کا بھی بھرا پُر خاندان ہے۔ اللہ سمجھوں کو صحت و عافیت اور توفیقِ کارِ خیر کے ساتھ عمرِ دراز نصیب کرے۔

دنیا سے جانے والے اور دل سے نہ جانے والے

حکیم صاحبؒ آج ہماری اس دنیا میں نہیں اور اس دنیا میں ہر آنے والے کو جانا ہے؛ لیکن وہ ہمارے دلوں کی دنیا سے ہرگز جدا نہ ہوں گے؛ کیوں کہ اُنھوں نے ہمارے دلوں کو اپنے حسنِ سیرت، شفافِ طینت، کریمِ الاخلاقی، خوشِ باطنی، خوشِ مزاجی، بے پناہ ہم دردی، طبعی سخاوت، کشادہ نفسی اور اُس غیر معمولی ذہانت کے ذریعے گرویدہ کر لیا تھا، جو اُن کی شخصیت کا امتیاز تھی۔

اُس انسان کی عظمت اور سعادت مندی کا کیا پوچھنا جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے؛ کیوں کہ موت اُسے نہیں مار پاتی، موت اُس کے حوالے سے اپنی معنویت اور

پس مرگ زندہ

حقیقت کھودیتی ہے؛ کیوں کہ اُس کے جسم کو تو فنا کر دیتی ہے؛ لیکن اُس کی یاد کو نہیں مٹا پاتی، اُس کے ڈھانچے کو تو معدوم کر دیتی ہے؛ لیکن اُس کی رُوح کو ختم نہیں کر پاتی؛ لہذا وہ انسانوں کی زبانوں پر پایدار ترانہ بن کر باقی رہتا ہے، تاریخ کی پیشانی پر اُس کا نقش کندہ رہتا ہے اور وہ اُن لوگوں کے دلوں میں ناقابل فراموش یاد بن کر باقی رہتا ہے جن میں وہ اپنی اُس محبت کا بیج بوچکا ہوتا ہے جس کو کائنات کی کوئی طاقت مٹا نہیں پاتی۔ مجھے اُن کی وفات کی اطلاع بعض رسائل کے ذریعے ملی تو میرے خانہ خیال میں یہ لذیذ اور عزیز یادیں گردش کرنے لگیں۔ ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مرحوم میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میری آنکھیں انھیں دیکھ رہی ہیں، وہ اپنے مزاحیہ جملوں کے ذریعے ہمیں ہنسا رہے ہیں، جو بڑے معنی خیز، مسرت انگیز اور طرب ریز ہوتے تھے، اُن میں بلا کی لطافت ہوتی تھی، جس سے حاضرین دیر تک مزے لیتے رہتے تھے۔

موت سے نہ مرنے والے

ہر انسان کو موت کی کارروائی سے دوچار ہونا ہے، موت کی سنگ دلی اور اُس کے جبر و اکراہ سے کسی انسان کو مفر نہیں؛ لیکن اُس انسان کا استثناء ہے جو اپنی سیرت و کردار، اپنے غیر معمولی کیریکٹر اور اُن خوشیوں کے ذریعے زندہ رہتا ہے، جنھیں وہ مفت سارے انسانوں میں بانٹا کرتا تھا اور اُن غموں کے ذریعے وہ زندہ رہتا ہے، جنھیں وہ اس سے پہلے اپنی موت مرنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ وہ اُس کے جان پہچان کے لوگوں اور محبتیں اور متعلقین کے لیے، کسی تکلیف کا باعث بنیں اور اُن نیکیوں کے ذریعے زندہ رہتا ہے، جن سے وہ بہت سارے حقوق ادا کرتا، دلوں کو جیتتا اور خرچ کے ساتھ بڑھنے والی بھلائیاں انجام دیا کرتا تھا۔

مرحوم حکیم عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ وہی انسان تھے جو موت کے بعد زندہ، غائب

ہونے کے بعد موجود اور نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اللہ انھیں ہر اُس بھلائی کا بدلہ دے، جو انھوں نے زندگی میں کسی کے ساتھ کی اور ہر اُس نیکی کا ثواب عطا کرے، جو انھوں نے اپنے رب کی رضا و خوشنودی کے لیے انجام دی۔ اللہ انھیں اپنی کشادہ جنت میں بلند مقام عطا کرے۔ اور ساری تعریف تو صرف سارے جہان کے پروردگار کے لیے ہے۔ (*)

سوانحی نقوش

✽ اسم گرامی: (مولانا حکیم) عزیز الرحمن بن (مولانا) محمد ایوب بن محمد صابر۔

✽ ولادت: ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء۔

✽ جائے ولادت: محلّہ ”الہ داد پورہ“ مونا تھ بھجن، ضلع ”مونا“ سابق ضلع ”اعظم گڑھ“ یوپی۔

✽ تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، متوسط و ثانوی تعلیم کے مراحل درس نظامی کے نصاب کے مطابق (فارسی و عربی) جامعہ مقاصد العلوم مؤوی میں طے کیے۔ یہاں آپ کے اساتذہ میں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی مؤوی (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۳۱۲ھ/۱۹۹۲ء) اور عالم وقائد مولانا عبداللطیف نعمانی (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۹ء - ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۳ء) جیسے اساطین علم و فضل تھے۔

۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۰ء (۱۳۵۹ھ) میں فارغ ہوئے، یہاں آپ نے وقت کے جلیل القدر علما و صلحا کے سامنے زنانہ تلمذ کیا، جن میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، ثم پاکستانی (۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء - ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی (متوفی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) شامل ہیں۔ فلسفہ ولی اللہی کے اس زمانے کے امام مولانا عبید اللہ

(*) عربی تحریر جو یک شنبہ ۱۳ شوال ۱۳۳۰ھ مطابق ۴ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو ۱۱ بجے دن میں لکھی گئی اور ”الداعی“ عربی کے شمارہ ۱۱، جلد ۳۳، ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ = نومبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ترجمہ از عربی بہ قلم خود ۱۱ بجے دن شنبہ: ۲۰ شوال ۱۳۳۰ھ = ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۹ء۔

سندھی (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء-۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) سے بھی دو تین اسباق پڑھے۔

✽ تدریسی و عملی زندگی: فراغت کے بعد رنگون (برما) میں ڈیڑھ ماہ تدریسی خدمت انجام دی، ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) مدرسہ رحمانیہ ”رسترا“ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں آپ نے بخاری شریف کا درس دیا۔ ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ) سے ۱۹۵۱ء (۱۳۷۰ھ) تک ڈی، اے، وی (D.A.V.) انٹر کالج ممبئی میں بہ حیثیت اردو لکچرر خدمات انجام دیں۔ اسی دوران ۱۹۵۰ء (۱۳۶۹ھ) میں ہائی اسکول اور ۱۹۵۲ء (۱۳۷۱ھ) میں انٹر میڈیٹ (Intermediate) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء (۱۳۷۱ھ) تا ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) ڈسٹرکٹ کوآپریٹو سوسائٹی میں دو سال کام کیا۔ ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) میں کالج چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کیا، پہلے سوت کی دکان کی، پھر انگریزی واد خانہ قائم کیا، جس کا سلسلہ ۱۹۵۹ء (۱۳۷۹ھ) سے ۱۹۶۱ء (۱۳۸۱ھ) تک رہا؛ لیکن اس کام میں دلی اطمینان نہیں تھا، روح کی بے تابی انھیں وقت کے پاپے کے شیخ و مربی مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء-۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) خلیفہ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی خدمت میں لے گئی، جہاں پہلے سے ہی آنا جانا ہوتا رہا تھا۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) تک آپ کے آستانے سے ہی وابستہ رہے اور الہ آباد ہی میں مستقل قیام رہا۔ شاہ صاحب کے حکم سے از خود طب کی امہات الکتاب کا نہ صرف مطالعہ کیا؛ بل کہ الہ آباد بورڈ سے فاضل طب کا اعلیٰ نمبرات سے امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۳۸۳ھ/۱۹۸۳ء سے جامعہ طبیبہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کیں اور اس کے اختتام ۱۹۸۶ء (۱۴۰۶ھ) تک طب کی دشوار گزار ادکتابیں پڑھائیں، اس کے بعد بہ حیثیت رفیق تالیف ۱۴۰۹ء (۱۹۸۸ء) تک شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند میں تصنیفی و تحقیقی خدمت پر مامور رہے۔ اسی کے ساتھ ذاتی طور پر بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

دیوبند سے آنے کے بعد اپنے صاحب زادی مولوی محمد طیب قاسمی کے پاس دُئی آتے جاتے رہے، بعض دفعہ طویل قیام بھی فرمایا، وہاں بھی مریضوں کے علاج و معالجے کا سلسلہ جاری رکھا، جو خاصا مقبول ہوا۔

✽ تالیفات: ● اردو انگلش میڈیکل ڈکشنری دو جلدوں اور ۱۲ سو صفحات میں ● امراض صدر ● کتاب الرحمت (طب) ● سوانح عمری فراہی ● سوانح عطار ● سوانح ابو ہریرہ ● شاداب افریقہ ترجمہ کتاب ”افریقا الخضراء“ مؤلف شیخ محمد ناصر العبودی ● شہباز رہ گزر ● ترجمہ قصیدہ بانس سعاد

● خاتم التبیین ترجمہ کتاب علامہ کشمیری جو فارسی میں ہے ● اسلام عقیدہ و شریعت کی روشنی میں
● انگریزی عربی اردو ڈکشنری ● مآثر امام اعظم ابوحنیفہ ● مسک الختام ● سائنسی اعجاز کی بنیادیں۔
اس کے علاوہ ایک بڑا علمی ترکہ چھوڑا ہے، جس میں ۳۳ ہزار صفحات میں حدیث شریف کے الفاظ کی تشریح
پر مشتمل ڈکشنری بھی ہے۔

✽ وفات: اپنے وطن مٹویں جمعرات: ۱۹/۱۲/۱۴۳۰ھ = ۱۰/۱۰/۲۰۰۹ء کو صبح تقریباً ۱۰ بجے۔ (۱)

عزیز الرحمن



نیک دل عالم، سہل نگار اہل قلم اور بہت اچھے انسان حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ

۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء — ۱۴۰۰ھ/۲۰۰۰ء

مری مشاغلگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالے کی جنابندی

ان سطروں کے لکھنے کی تقریب

بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور نیپال کی متحدہ عظیم انجمن معروف بہ ”سجاد لاہوری“ کے ذمے دار طلبہ عرصہ دو ماہ پہلے (۱) مجھ سے ملے اور بتایا کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند، کی دارالعلوم کی خدمت سے وابستگی پر عرصہ پچاس سال مکمل ہونے کے موقع سے، ہم ذمے داران انجمن خصوصاً اور طلبہ صوبہ جات مذکورہ عموماً اور طلبہ دارالعلوم دیوبند بالاعتم، حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے تعارف اور تعریف و توصیف اور ان کی خدمات و تالیفات اور مقام و مرتبے کے تذکرے پر مشتمل ایک یادگاری مجلہ شائع کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ نسل نو کو اس کے مطالعے سے پڑھنے لکھنے اور حصول کمال و امتیاز میں، جی جان سے لگنے کا حوصلہ اور مفتی صاحب کے لیے ہمارے جذبہ عقیدت و احترام کو تسکین ملے۔

(۱) یہ سطریں جمادی الاخریٰ ۱۴۳۶ھ = اگست ۲۰۰۵ء میں لکھی جا رہی ہیں۔

یہ طلبہ میرے سر ہوئے کہ آپ بھی — اپنے مشاغل و اَعذار سے وقت نکال کر، ہم لوگوں پر شفقت فرماتے ہوئے — اس مجلے کے لیے کوئی تحریر عنایت فرمادیں، تو ہمارے لیے بڑے فائدے کی چیز ہوگی۔ میں اُن طلبہ کے خلوص اور مفتی صاحب کے حوالے سے اُن کی قدر دانی پر مبنی محبت کی وجہ سے، اُن کی درخواست کو رد نہ کر سکا؛ لیکن اپنے پاس سے اُن کے چلے جانے کے بعد، میں یہ سوچنے لگا کہ میں کب اور کیا لکھ سکوں گا؟ کب کا تعلق وقت کی تنگی سے ہے کہ اس کے گراں قدر سرمایے کو بیماری اور اُس کے مُتَنَوِّع عوارض نے تتر بتر کر کے رکھ دیا ہے اور جن لحاظ کو اُن کی دست برد سے میں بچا لینے میں کام یاب رہتا ہوں، وہ تحریری اور تدریسی فرائض کی ادائیگی اور اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی فکر کی نذر ہو جاتے ہیں؛ لہذا ”مُسْتَحْبَات و نوافل“ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس پر مُسْتَحْزاد یہ کہ زود نویس نہیں؛ بل کہ انتہائی ”سست نویس“ واقع ہوا ہوں، شکر کی بیماری اور اُس کے نتائج بد کی وجہ سے عقل کی شادابی، فکر و نظر کی زرخیزی اور فطری ملکہ کا بانک پن یا تخلیقی صلاحیت، بُری طرح مجروح ہو گئی ہے اور عائد کردہ کسی مضمون کا لکھنا تو میرے لیے اور بھی دشوار ہوتا ہے؛ لہذا وقت نہ جانے کب اس موضوع پر لکھنے کا موقع دے گا یا نہ دے گا؟

اہل قلم کے زندوں پر لکھنے سے احتراز کی عمومی وجہ

کیا لکھ سکوں گا کا تعلق اس بات سے ہے کہ مفتی صاحب مدظلہ بلاشبہ انتہائی بافیض عالم دین ہیں؛ لیکن کسی زندہ پر لکھنا ہم جیسوں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے؛ حال آں کہ زندہ باکمالوں کی قدر و قیمت سے انسانوں کو متحیر کرانا، زیادہ مفید ہے؛ اس لیے کہ اُن سے استفادے اور فیض یاب ہونے کی راہ کھلی ہوئی ہوتی ہے، جب کہ مردہ اصحاب کمال سے استفادے کا اس کے سوا کوئی امکان نہیں رہتا کہ اُن کی سیرت و سوانح — بہ شرطے کہ لکھ دی گئی ہو — کا مطالعہ کر کے اُن کے باکمال ہونے کے

منہاج کو اپنا کر، باکمال بننے کی کوشش کی جائے اور دین و دنیا کے اُن اکتسابات سے اپنا دامن بھرنے کی سعی کی جائے، جن کی وجہ سے کسی کو باکمال کہا جاتا اور لائق رشک سمجھا جاتا ہے؛ لیکن زندہ شخصیتیں ایسا لگتا ہے کہ قلم اور زبان کی راہ روک کے کھڑی ہو جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عظیم کی عظمت، باکمال کا کمال اور باصلاحیت کی صلاحیت کا حتمی نتیجہ یعنی غیرت، خودداری اور شرافت، اہل زبان اور اہل قلم کو ملامت اور عتاب کے لہجے میں کہتی ہیں کہ تمہیں کیسے یہ ہمت ہوئی کہ تم میرے حامل کے جیتے جی۔ اور بعض دفعہ اُس کے منہ پر۔ اُس کی شاخوانی کر سکو؟۔ اُس کی قدردانی اور توقیر و احترام کے اور بھی طریقے اور دن ہو سکتے ہیں؟!۔

غالباً اسی وجہ سے زندہ اہل علم و فضل کو تحریر و تقریر کا موضوع بنانے کا عام رواج نہیں؛ بل کہ صرف مُردوں کے کارناموں کو زندہ کرنے کی روش عام ہے اور معمول ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مُردوں کے حوالے سے لکھنے بولنے والا بے تکلف جتنا اور جیسا چاہتا ہے لکھتا اور بولتا ہے؛ کیوں کہ کسی روکنے ٹوکنے والے کی روک ٹوک کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا؛ اس لیے بے تکلفی، بے ساختگی، آمد اور خلوص کے عناصر کی بھرپور مدد، اُس کو حاصل رہتی ہے، جب کہ زندوں کی ”حضورِ“ کا حجاب طرح طرح کے مسائل کے ساتھ، لکھنے بولنے والے کے سامنے حائل ہو جاتا ہے اور ”احتیاط“، مصلحت بینی اور پسند و ناپسند کے جذبات کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے وہ ”آزادی رائے“ سے کما حقہ کام نہیں لے پاتا۔

زندوں پر لکھنا، بعض وجوہ سے زیادہ مفید

لیکن میری رائے میں زندوں کو، اُن کی زندگی میں اچھی طرح جاننے اور سمجھنے، خراج تحسین پیش کرنے اور اُن کے کارناموں کو انعاموں اور تمغوں کے ذریعے اُجاگر کر کے، اُن کا مزید حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ، نسل حاضر کو اُن کے نقش قدم پر

چلنے کی تلقین کی جو طرح یورپ میں قائم ہے اور جس کو اب دیا ر مشرق میں بھی برتا جانے لگا ہے؛ وہ بہت خوب اور لائقِ صد تقلید ہے کہ زندوں کے زندہ رہتے ہوئے، اُن کے کمال اور ہنر کی صحیح معرفت کے بعد، اُن سے بلا واسطہ اور بروقت فائدہ اٹھا کر اُن کی نکالی ہوئی راہ، انجام دیے ہوئے کارناموں اور روشن کی ہوئی شمع سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا اور دین و دنیا کی ترقی کی منزلیں زیادہ آسانی اور تیزی سے طے کی جاسکتی ہیں؛ کیوں کہ زندوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ”نظریہ“ اور ”نمونہ عمل“ دونوں موجود ہوتے ہیں۔ جب کہ مُردوں کے حوالے سے سچ یہ ہے کہ اُن کی سیرت و کردار کا ریکارڈ صرف ”نظریہ“ تو دیتا ہے؛ لیکن متحرک ”نمونہ عمل“ نہیں دیتا؛ اس لیے اُن کی سیرت و کردار کا مطالعہ کنندہ، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سیرت اور کردار کو کس طرح برپا کیا جائے؟ یہ ہمیں کون بتائے گا؟ مشین (Machine) کے ساتھ راہ نما کتاب (Guidebook) اور ”کتابِ مبین“ کے ساتھ ”نورِ عظیم“ ایسا قانونِ فطرت ہے، جس کو خود خداے ذوالجلال نے وضع کیا اور اُس کی راہ دکھائی اور خلق کو اُس پر چلایا ہے اور اُس کے بندوں نے اس کو طبعی طور پر قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے۔

سجادِ لائبریری کے طلبہ کا شکریہ

میں ”سجادِ لائبریری“ کے باتوفیق طلبہ کو، مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مدظلہ کو تحریری طور پر خراجِ تحسین پیش کرنے اور طلبہ عزیز کے لیے اُن کے علمی و عملی کارناموں سے، اُن کی زندگی ہی میں متعارف ہونے اور پھر اُن سے فائدہ اٹھانے اور اُن کی شخصیت کو غنیمت جان کر، اُن سے بہ راہِ راست اکتسابِ علم اور ہنر کرنے کی ہمارے دارالعلوم میں طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ اللہ اُن کی کوشش کو بار آور کرے اور انھیں اس کا بہترین صلہ اور حضرت مفتی صاحب کو صحت و عافیت کے ساتھ توفیقِ مزید سے بھرپور عطا کرے؛ تاکہ وہ اور زیادہ سے زیادہ نیکیوں

اور کام رانیوں کا ذخیرہ اکٹھا کر کے دونوں جہان میں خوب خوب سرخ رو ہوں۔ ایں دعا
از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے زیادہ گھل مل جانے کی وجہ

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب سے — بہاری ہونے کے حوالے
سے ہم وطن اور ”مسنو ناتھ بھنجن“ میں تعلیم پانے اور وہیں کے ایک مدرسہ ”مفتاح العلوم“
میں کسبِ علم و کمال کرنے کے حوالے سے، تعلیمی ہم وطنی کے باوجود؛ کیوں کہ اس
ناچیز نے بھی وہیں کے دوسرے مدرسے ”دارالعلوم“ میں متوسطات تک کی تعلیم حاصل
کی — راقم الحروف کو دارالعلوم دیوبند ہی میں داخلہ لینے کے بعد مُتَعَارِف ہونے کا
موقع ملا، نہ صرف مُتَعَارِف ہونے؛ بل کہ دگر مخفی اور ذوقِ تعلیم و مطالعہ سے سرشار
اپنے کئی معاصر دوستوں اور ہم درس ساتھیوں کے ہم راہ بہت زیادہ گھلنے ملنے اور بے
شمار علمی فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔

مفتی صاحب سے جس چیز نے ہم لوگوں کو، اُس وقت اور بہت سارے طلبہ کو
ہمیشہ، بہت زیادہ قریب ہو جانے اور بہت بہت فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، وہ اُن کی
مثالی سادگی، مومنانہ اُنسیت، پدرانہ اپنائیت، بزرگانہ شفقت، اسلامیانہ ہمدردی؛
ہر ایک کے لیے خلوص اور ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی اور ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر،
اُن سے کوئی مشورہ کر کے، کسی طرح کی طالبِ علمانہ گفتگو، یا کسی موضوع پر استفادے
کے لیے تبادلہ خیال کر کے، کبھی بھی بے مزہ نہ ہوا، نہ یہ خدشہ ہوا کہ فلاں لفظ یا جملہ اُن
کی علمی شان، بزرگانہ مقام اور راہِ علم و آگہی پر اُن کے طویل تجربہ کارانہ سفر کے حوالے
سے، اُن کی عظمت کے خلاف تھا؛ اس لیے خدا نہ خواستہ، اب وہ دوسری ملاقات میں
مجھے منہ نہ لگائیں گے۔

اُن کی اِس افتاد کی وجہ سے — جس پر خالق نے مصلحت اور حکمت ہی کے

تحت اُن کو پیدا کیا ہے۔ اُن کی طرف ہر ملنے والے کا دل کھینچتا ہے اور وہ بار بار ملنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ وصف میرے نزدیک، اُن کے سارے علمی و عملی اوصاف پر بھاری ہے؛ کیوں کہ یہ نبوی وصف ہے۔ حضور ﷺ — فداہ اُبی و اُمّی — کے پیارے ساتھی بھی اسی وصف کے حامل تھے، اسلام میں علم و عمل کے قافلے نے اسی ہتھیار سے جہاں گیری و جہاں داری و جہاں بانی کی ہے۔ خود اسلام نے دلوں کو نرم خوئی و دل جوئی، اخلاقِ کریمانہ اور خلوصِ دل برانہ کے ذریعے ہی فتح کیا ہے۔ اسلام کے سارے اکتسابات کا سہرا ”فاتحِ عالم“ محبت و خلوص اور مَحَرِّ عقل و قلب ہم دردی و غم گساری کے سر جاتا ہے۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے بہت زیادہ گھلنے ملنے کی اصل وجہ یہی تھی۔ کسی وقت، کسی بھی حال میں اُن کے پاس چلے جائیے، وہ آپ کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہیں گے اور اس طرح خوش ہوں گے جیسے وہ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ اگر لکھنے پڑھنے میں لگے ہوں، تب بھی وہ آپ کے آدھمنے سے ذرا بھی کبیدہ نہ ہوں گے؛ بل کہ وہ انتہائی ضروری مشغلے کو، جس کو وہ پھیڑے بیٹھے ہوں گے، ایک طرف کو ڈال، اب صرف آپ کے لیے خالی ہو جائیں گے۔ اُن کے رہن سہن، رفتار و گفتار، زندگی کے سارے جھمیلوں اور شب و روز کے سارے کاموں میں یہی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی نظر آئے گی۔ نُسْتَعْلِیْقِیَّت، تہذیب، متانت، نفاست، رکھ رکھاؤ اور ترتیب و تنظیم، ہے تو اپنی جگہ اچھی چیز اور جو لوگ ان اوصاف کو سلیقے سے برتنا جانتے ہیں، وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں؛ لیکن بہ ہر کیف اُن کے برتنے میں ذرا سی ”بد سلیقگی“ اور ”پے ڈھنگے پن“ کے در آنے سے، دوسروں کے ساتھ ساتھ، برتنے والے کو بھی اذیت ہوتی ہے، خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ مفتی صاحب کو آپ اپنی ذات کی طرح برت سکتے ہیں، فطرت کی عام بخششوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں، جہاں چاہیے بیٹھا دیجیے، جو چاہیے کھلا دیجیے، جس سواری پر چاہیے سفر کر دیجیے، اچھے بُرے جس انداز میں پیش

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ
آئیے، وہ اپنی بے نفسی اور پیدائشی سادگی کی وجہ سے، ذرا بھی بُرا نہ مانیں گے۔

شخصیت کی طرح تحریر و تقریر میں سادگی

اُن کی یہی سادگی، بے ساختگی، نرمی اور گدازی؛ اُن کی تحریر و تقریر میں بھی نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام فہم مُفَرَّدات و مُرَتَّبَات سے اُن کی تحریر و تقریر کے جملے اس طرح ڈھلے ہوتے ہیں کہ آپ کو، اُن کے جیسے کسی بھی کثیر التصانیف عالم اور اہل قلم کی تحریر میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ وہ نہ لفظیات کی شوخی سے قاری کے لیے باعثِ تکان ہوتے ہیں، نہ اُسلوب کی شوکت (کے) باعثِ مرعوبیت، نہ ساختیات کے بناؤ سنگار سے باعثِ اُلجھن، نہ فصاحت و بلاغت کی بے جا زور آوری سے باعثِ اذیت، نہ جملوں کی درازی اور پُر پیچ ہونے کی وجہ سے ہمت شکن۔ آپ پڑھتے اور سنتے جاتیے، آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کو، آپ ہی کی بات، آپ ہی کی زبان میں، کہی جا رہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُنھوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہم لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں نے لکھنے کے لیے کسی تکلف کو راہِ نمائیں بنایا۔ بس بلا ارادہ اور بے تکلف، اپنی بات کو اپنی زبان میں، کسی آواز اور گہری سوچ کے بغیر، لکھنے کا میں نے اپنے آپ کو عادی بنایا۔ لفظوں اور ترکیبوں کی تحسین و تزیین کی کبھی نہیں سوچی، نہ اس پر توجہ دی، نہ اس کو مسئلہ بنایا۔ غالباً اچھا اور سچا اور کھرا لکھنے کے لیے، یہ بنیادی اُصول ہے۔ اس اُصول کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بھی مرحلے میں اپنے کو تھکا تا ہے، نہ قاری کو۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں، بے شمار خوبیوں کے باوجود، بے شمار خرابیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا اُصول طبعی ہے، بے ساختہ ہے، سہل العمل ہے، سہل التقليد ہے۔ نوآموز اور نووارد بساطِ تحریر کو، آپ اس سے زیادہ سیدھی، فطری، سچی اور حقیقت سے سونی صد ہم آہنگ راہ کی راہ نمائی کر بھی نہیں سکتے؛ اسی لیے مفتی صاحب کی تحریر میں، طوالت ہے نہ تکرار، الفاظ کا الجھاؤ ہے نہ جملوں کا، ترادف کی

مفتی صاحب کا تحریری امتیاز

اُن کی طبعی نرمی و گدازی، سادگی و خوش اخلاقی ہی کا اثر، اُن کی طرزِ تحریر پر بھی ہے: وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور خوب صورت حروف میں اپنی بات لکھتے ہیں۔ سطریں بالکل سیدھی جیسے اسکیل سے لکیر ڈال کر لکھی گئی ہوں، ہر لفظ؛ بل کہ ہر حرف سے جیسے ندا آرہی ہو کہ یہ سادہ مزاج اور تکلف نا آشنا عالم کی تحریر ہے۔ مفتی صاحب بہت سے علما اور ”تعلیم یافتہ“ کہے جانے والے بد سلیقہ لوگوں کی طرح اپنی تحریر کے بھدے پن، شکستگی، سطروں کی کجی، حروف کی نامانوس صورت گری، یا اُن کے بھاری بھر کم پن اور بڑے ”ڈیل ڈول“ کے ذریعے یا بہت باریک اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قراءت ہونے کی بنا پر؛ آپ کے لیے باعثِ اذیت نہ ہوں گے۔ وہ کوئی خط لکھیں، درخواست لکھیں، مضمون تحریر کریں، کسی کتاب کی تالیف کریں؛ ہمیشہ اُن کی تحریر قلم برداشتہ، کاٹ چھانٹ سے پاک اور تمیض کی ضرورت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ میں نے جن معاصر اہل علم و کمال اور صاحبِ تالیف کو دیکھا ہے اور اُن کی صحبت سے فیض پایا ہے، اُن میں تحریر کی صفائی؛ بل کہ خوش خطی کے حوالے سے علامہ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری، ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کے صاحب زادے، ادیب و شاعر و عالم و فقیہ مولانا حفیظ الرحمن واصف (متوفی ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) کے بعد حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مدظلہ ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر تو اپنے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ باقاعدہ خطاط اور خوش خطی کے ماہرین میں تھے؛ لیکن مفتی صاحب نے خوش خطی کے فن پر شاید کبھی بھی توجہ نہ دی ہوگی، مگر طبعی طور پر اُن کی تحریریں، اُن تمام خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں، جن کی کسی باذوق قاری کو نہ صرف تلاش ہوتی ہے؛ بل کہ جن سے، ہر قاری کا جی خوش ہوتا ہے؛ کیوں کہ

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ

اُس کے قلب و ذہن کو پڑھتے وقت راحت محسوس ہوتی ہے اور دعا دیتا ہے کہ اللہ صاحب تحریر کو جزاے خیر دے کہ اُس نے راحت بخش طرزِ تحریر سے بھی فائدہ پہنچایا۔

مفتی صاحب کے تحریری و تالیفی کارنامے

مفتی صاحب نے مُتَوَّع موضوعات پر لکھا اور کام کیا، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن بن مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (متوفی ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کے فتاویٰ کی تدوین و ترتیب کا اہم کام انجام دیا، ۱۲ جلدوں میں ”فتاویٰ دارالعلوم دیوبند“ کے نام سے ہمیشہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ تعارفِ مخطوطات دارالعلوم دیوبند حصہ اول و دوم جیسا مشقّت طلب کام بھی کیا۔ انھوں نے نظامِ عقّت و عصمت، نظامِ مساجد، نظامِ تربیت، نظامِ تعمیر سیرت، اسوۂ حسنہ، تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری، تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی، مشاہیر علمائے دیوبند، حکیم الاسلام اور اُن کی مجالس، حیات مولانا گیلانی، جرم و سزا کتاب و سنت کی روشنی میں، اسلامی حکومت کے نقش و نگار، دارالعلوم کا قیام اور اُس کا پس منظر، وغیرہ بہت سی کارآمد کتابوں سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا ہے۔

مفتی صاحب نے اچھا کیا کہ اپنی سوانح بھی، اپنی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ سے ”زندگی کا علمی سفر“ کے نام سے لکھ کر علماء، طلبہ، اہل قلم اور تاریخ کے شائقین کو علمی تحفے سے نواز کر، اُن پر بڑا احسان کیا۔ آدمی اپنے حوالے سے جتنی سچی بات خود کہہ سکتا ہے، دوسرا آدمی نہیں کہہ سکتا۔ بنیادی اور اصل معلومات بھی جن کے بغیر کسی تاریخ، سوانح اور سیرت کی اُساس قائم نہیں ہو سکتی، آدمی اپنے حوالے سے خود ہی فراہم کر سکتا ہے۔ دوسروں کی فراہم کردہ معلومات اتنی لائقِ اعتماد نہیں ہو سکتیں، جتنی خود کی فراہم کردہ، نیز دوسروں کے لیے کسی کے متعلق اُساسی معلومات تک پہنچنا مشکل بھی ہوتا ہے، اسی لیے آج کل ”باپو ڈاٹا“ (ذاتی بنیادی معلومات) کا جو سلسلہ چلا ہوا ہے، بہت مفید ہے۔

مفتی صاحب کے یگانہ روزگار اساتذہ

مفتی صاحب نے ہندوستان کے عصر حاضر کے سب سے بڑے محدث اور اسماء الرجال کے فاضل یگانہ حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء جیسے استاذ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، مولانا علامہ سید سلیمان ندوی متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی متوفی ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء، مولانا عبدالرحمن امیر شریعت بہار و اڑیسہ متوفی ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی متوفی ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، مولانا شاہ فضل اللہ متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، کی صحبت سے نہ صرف فیض پایا؛ بل کہ اُن سے خوب خوب روحانی، علمی اور فکری پیاس بجھائی؛ اسی لیے نہ صرف یہ کہ اُن کا علم شریعت ٹھوس ہے؛ بل کہ اُن کے ہاں فکری استقامت، تجربے کی پختگی اور زبان و قلم کی راست روی کا جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ انھی اساطین علم و کمال و طریقت کا فیضان ہے، جو مفتی صاحب نے خدا کی توفیق سے اچھی طرح جذب کیا تھا۔

مفتی صاحب کے پاس چند منٹ بیٹھے، آپ اُن کی گفتگو سنیے، چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں میں آپ کو زندگی کی ایسی ایسی حقیقتوں سے روشناس کرادیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ عیش و عشرت کرتے رہ جائیں گے اور حیرت ہوگی کہ دیکھنے میں ایسا سیدھا سادہ بوڑھا زندگی، انسان اور کائنات کا اتنا کچھ تجربہ کیوں کر رکھتا ہے۔ اس کے بعد اپنی زندگی میں جتنا کچھ تجربہ کریں گے آپ کے نزدیک مفتی صاحب کی کہی ہوئی بات کی سچائی کی تہیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی جائیں گی اور یقین ہو جائے گا کہ جس حوالے سے، انھوں نے جو بات کہی تھی، وہ حرف آخر یا پتھر کی لکیر تھی، اب اُس سے آگے یا اُس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

ظاہر و باطن کی یکسانیت

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مفتی صاحب، صرف ظاہر کے سادہ اور نرم خوبی نہیں، وہ دل کے بھی بہت صاف اور اُس کی بیماریوں سے میرے تجربے کے مطابق خاصے پاک ہیں، کینہ، بغض، دشمنی کے جذبات کی پرورش اور انسانوں سے نفرت کا اُن کے ہاں کوئی گزر نہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اگر کسی سے، کوئی تکلیف پہنچتی ہوگی، تو میرا دل کہتا ہے کہ اُس کی وجہ سے بھی اُن کے دل میں پیدا ہونے والا تاثر، آنے اور گزر جانے والے خیال کی طرح آتا اور گزر جاتا ہوگا۔ انسان کا چہرہ اُس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے، مفتی صاحب کے چہرے کو پڑھنے والا ہر آدمی میری بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔

یہ وہ صفت ہے جو تھوڑے علم، علمی تحقیقات اور علمی افادے اور فکری نفع رسانی سے تہی دامن؛ بل کہ بالکل جہل کے ساتھ بھی انتہائی محبوب ہوتی ہے؛ لیکن اگر یہ مفتی صاحب جیسے علمی، فکری، تالیفی اور تدریسی خدمات کے بڑے سرمایے کے حامل میں پائی جائے، تو اور بھی لائق محبت اور قدردانی ہے؛ کیوں کہ عموماً اُن سے بہت چھوٹے قد کے، بہت سے لوگ علمی پندار کی وجہ سے دل کے میلے، ظاہر کے براق اور باطن کے انتہائی تاریک ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ اکثر ”اہل علم“ اور ”باکمال“ سے مل کر جی خوش نہ ہوا۔ اُنھیں برکت کر، اُنھیں سمجھ کر، دل نے کہا کہ واقعی دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، اُن کے پاس بیٹھ کر، اُن سے گفتگو کر کے، اُن سے فائدہ اٹھا کر، کبھی بھی کوئی کدورت نہ ہوئی۔

مخلص و تجربہ کار مُشیر

مفتی صاحب کا ایک اور وصف بھی بہت قدر کے لائق ہے کہ آپ اُن سے کسی مسئلے میں مشورہ کیجیے، تو بہت صحیح اور ٹھوس مشورہ دیں گے۔ مشورے کے حوالے سے یہ

بتایا گیا ہے مشورہ مخلص، صالح اور سن رسیدہ و تجربے کار سے کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب میں یہ سارے اوصاف بہ تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ اُن سے جب بھی کوئی مشورہ کیا اور مشورے کے بعد اٹھا، تو دل میں انشراح محسوس ہوا اور بعد میں اُس پر عمل کیا، تو خیر ہی خیر نظر آیا اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ اپنے اس بندے کو بہت نوازے کہ اس نے مجھے میرے مطلب اور مفاد کی صحیح راہ دکھائی۔

خُردوں کی کام یابی کو اپنی کام یابی تصور کرنے والے

مفتی صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خُردوں کی کام یابی اور ترقی سے بہت خوش ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اُن کی کام یابی کو وہ اپنی ہی کام یابی تصور کرتے ہیں، یہ بھی اُن کے مخلص ہونے کی دلیلوں میں سے ایک ہے اور صحیح انسان، سچا مسلمان اور حقیقی معنی میں مُرَبِّیٰ ہونے کی ٹھوس شہادت بھی۔ جب کہ بہت سے ”بڑے“ چھوٹوں کی ترقی کو اپنی تنزلی سمجھ کر بے حدر نجیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ بہت سے خرد اور واقعتاً ناچیز قسم کے لوگ بھی نہ صرف اپنے ہم عمروں اور ہم سفروں کے آگے بڑھنے سے مُلُول ہوتے ہیں؛ بل کہ اپنے بڑوں کے اکتسابات سے بھی بہت افسردہ ہوتے ہیں، جیسے اُن بڑوں نے اُن کا کوئی حق مار لیا ہو، یا اُن کی راہ روک کے بیٹھ گئے ہوں۔

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کی طالب علمی سے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تدریس کے دوران، حضرت مفتی صاحب سے میں اور میرے بہت سے ساتھی اس طرح جُڑے رہے، جیسے ایک بیٹا شفیق باپ سے اور ایک سچی طلب رکھنے والا مُرید اپنے حلیم و کریم و تجربے کار و خلوص شعار شیخ سے۔ اُن سے غیبت کے دوران خط و کتابت بھی رہی اور انھوں نے خطوط کے ذریعے بھی ہمیشہ ایسے خلوص و محبت کا ثبوت دیا، جس کا اب کسی سے تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ تھے، جو زمانے کی خُرد برد سے محفوظ نہ رہ سکے، اب چند خطوط رہ گئے ہیں، طوالت

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ

کے خوف سے صرف ایک دو خطوط پراکتفا کیا جاتا ہے، زندگی نے وفا کیا اور خداے کریم کی توفیق نے ساتھ دیا، تو ان شاء اللہ اپنی خودنوشت میں اُن کے باقی ماندہ خطوط بھی درج کیے جائیں گے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریس کے اولیس دنوں میں اُنھوں نے اپنے ایک شفقت نامے کے ذریعے، ناچیز کا حوصلہ بڑھایا اور اپنے تعلق خاطر کا اس طرح اظہار فرمایا:

عزیر مکرم! ایدکم اللہ تعالیٰ بروح منہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محبت نامہ ملا، دلی مسرت ہوئی، آپ نے فراموش نہیں کیا، یاد رکھا۔ یہ آپ کے انتہائی خلوص و محبت کا نتیجہ ہے۔ آپ کے پہلے خط کا جواب لکھا تھا، حیرت ہے نہیں ملا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ آپ کا خط آتا اور اس کے باوجود میں خاموش رہ جاتا۔ یقیناً آپ کو اس سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر اس میں میری کیا کوتاہی ہے؟ میں تو ہر تذکرے کے بعد، خود ہی سوچتا ہوں کہ کب آپ کا خط آئے گا؟ اس صورت میں ناراضی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ بہ ہر حال اس کا احساس ہے کہ آپ کے قلب میں اس خاک سار کی محبت ہے۔ آپ کے خط سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ آپ پڑھانے بھی لگے ہیں، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور اسے ترقی کا زینہ بنائے۔ ان شاء اللہ آپ کی طلب و محنت رائے گاں نہ جائے گی، ثمرہ مل کر رہے گا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں تو ابھی میں ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ سے گزرتا ہوا دیوبند آیا ہوں ضرور لکھنؤ اتر کر ملتا، میں نے سمجھا کہ جب آپ رمضان میں دہلی اور دیوبند نہیں آئے، تو گھر گئے ہوں گے۔ آپ یقین کریں جس قدر خواہش آپ کو ملنے کی ہے، اُس سے زیادہ قلبی طلب ادھر بھی ہے اور اسی کا غالباً نتیجہ ہے کہ جواب نہ پہنچنے کے بعد بھی آپ نے پھر یاد کیا۔

۱/۱۱/۱۳۹۲ھ

عزیزم سجاد احمد سلمہ (۱) فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں اُن کو ”سانحہ“ بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ (۲) کو جامعہ رحمانی مولگیر بھجوا دیا ہے؛ اس لیے کہ ”سانحہ“ سے قریب ہے۔ میاں احمد سجاد اُس کی نگرانی بھی کریں گے۔ البتہ عباد سلمہ (۳) کو اپنے ساتھ یہاں لایا۔ وہ یہاں حفظ کر رہے ہیں۔ مولانا علی میاں مدظلہ (۴)، مولانا سعید الرحمن سلمہ (۵) اور مولانا شمس تبریز (۶) سے سلام مسنون عرض ہے۔ اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں۔ میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے؛ اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد ناظم صاحب اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم (۷)، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے۔ طالب دعا

محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند

۱۲/۱۲/۱۹۷۲ شب ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی پر، اُن کے

- (۱) مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے، جو اس وقت اپنے وطن ”پورہ نوڈیہا“ کے جوار میں ہی کسی گاؤں کے ہائی اسکول میں بڑے ٹیچر ہیں اور مفتی صاحب کی خدمت میں جی جان سے لگے رہ کر اپنے لیے ذخیرہ آخرت اکٹھا کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیشہ با توفیق رکھے۔
- (۲) مفتی صاحب کے دوسرے صاحب زادے۔
- (۳) مفتی صاحب کے تیسرے صاحب زادے۔
- (۴) بہ وقت اشاعت اس مضمون بہ شکل کتاب ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔
- (۵) حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔
- (۶) مولانا شمس تبریز قاسمی مشہور اديب و اہل قلم، سابق رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ و حال پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔
- (۷) متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء۔

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ
انتقال کے چند ماہ بعد راقم نے اُن پر تاثر اُتی کتاب لکھی، تو مفتی صاحب نے اپنا
برجستہ تاثر اُس پر ذیل کے الفاظ میں، بہ صورت مکتوب میرے پاس ایک طالب علم
کے ہاتھ کتاب بھیجنے کے دوسرے دن ارسال فرمایا، جو راقم کے لیے ایک وقیع سند کا
درجہ رکھتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر عزیز (مولانا امینی) سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کی تازہ تصنیف لطیف ”وہ کوہ کن کی
بات“ ابھی ایک صاحب سے ملی، سرسری طور پر دیکھ گیا، پسند آئی، خاک سار پر
جو حاشیہ لکھا ہے، وہ بھی پڑھا؛ بل کہ پڑھ کر اپنے عزیز طلبہ کو سنایا۔ سمجھوں نے
پسند کیا اور مجھ پر تو آپ کا شکریہ واجب ہو گیا کہ آپ نے ایک بے مایہ کی
عزت افزائی اور قدردانی کا ثبوت دیا، یہ آپ کی محبت کا زندہ و تابندہ ثبوت
رہے گا، حماک اللہ عن شر النوائب۔ جزاک اللہ فی الدارین خیراً۔

آپ کی کتاب کالب و لہجہ اور بے ساختگی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اگر میرا
کوئی ایسا شاگرد ہوتا، تو مرجانے میں فائدہ تھا— جو بھی آپ کی کتاب پڑھے
گا اور اہل دل ہوگا، تو وہ ایسے تمیز رشید کی سعادت مندی پر لازماً فخر کرے گا اور
کہے گا کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مرجاتا— اللہ تعالیٰ آپ
کی یہ خدمت قبول فرمائے اور اس کے ثمرے میں کوئی ویسا ہی شاگرد آپ کو
بھی عطا کر دے۔ آمین

ہمارے طلبہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک نسخہ (کتاب کا) آپ تک
بھیج کر بخل کیا، معلوم ہوتا ہے، یہی حال ان کی کتاب کا تو نہیں ہے کہ تحریر ہی
تحریر ہے دل میں نقش نہیں، میں کہتا ہوں ایسی بات نہیں۔ اس کتاب کا ایک
ایک جملہ بولتا ہے کہ دل میں اُن کے اُستاد محترم کا جو نقش ہے، وہ اس سے

پس مرگ زندہ

بہت زیادہ گہرا ہے، میں استاذ نہیں؛ لیکن میں اُن کو غیر مخلص نہیں جانتا، میرے
تو صرف عزیز ہیں۔ والسلام

محمد ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

یہ سطوریں کل کے مورخ اور سوانح نگار کے لیے قیمتی سرمایہ

ان سطروں میں مفتی صاحب کی خوبیوں کا احاطہ ممکن ہے نہ مقصود، یہ چند باتیں
برجستہ قلم کی زبان پر آگئیں، تو میں نے دستورِ زبان بندی پر عمل نہ کر کے، قلم کو اپنی
باتیں بہ عجلت اس لیے کہنے دی ہیں؛ تاکہ ہمارے طلبہ اور تحصیل علم کے راہ رو، اپنے
ذوق و شوق کو ہمیز کر سکیں اور مفتی صاحب کی قدر کرنے کی، انھیں مزید توفیق ہو؛ تاکہ
اُن کی شیخوخت سے لبریز زندگی کو غنیمت جان کر، اُن سے زیادہ سے زیادہ استفادے
کے لیے کوشاں ہوں۔ واللہ وحدہ الموفق لکل خیر۔

نیز کل کے سوانح نویس اور تاریخ نگار کے لیے بھی، یہ باتیں ریکارڈ ہو جائیں؛
تاکہ انھیں اپنے کام میں سہولت ہو اور مفتی صاحب کے ساتھ ساتھ اس گنہ گار کو بھی دعا
دے کر اپنے رب سے اپنا بدلہ پاسکیں۔

وہ کوہ کن کی بات میں، ص ۱۲۰-۱۲۱ پر حاشیے پر، اس راقم نے مفتی صاحب کے
متعلق کئی سال قبل جو بات کہی تھی، جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کو اُسی پر ختم کیا جائے؛
اس لیے ذیل میں وہ ہدیہ ناظرین ہے:

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی: مفتی دارالعلوم دیوبند: جہاں

دیدہ، نرم و گرم حمیدہ، صائب الرائے، بے تکلف، رحم دل، بات میں سادہ،

معافی میں دقیق، اردو کے بے ساختہ اہل قلم، بیسیوں کتابوں کے مصنف، خط

ایسا پاکیزہ، جیسے موتیوں کی لڑی۔ تاریخ ولادت ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء ہے، اُن کا

حضرت مولانا مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ

وطن ”پورہ نوڈیہا“ ضلع دربھنگہ (بہار) ہے۔ ۱۹۴۴ء میں مفتاح العلوم متو سے فارغ ہوئے، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (محدث جلیل) (متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) کے انھن تلامذہ میں ہیں۔ دینی، تاریخی اور سیرت و سوانح کے موضوعات پر بیس سے زائد گراں قدر کتابوں کے مصنف ہیں، تحقیقی مقالات و مضامین ان کے علاوہ ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ جن چند لوگوں کا میرے اوپر جو گراں قدر احسان ہے، ان میں سے ایک ہیں۔ راقم الحروف کے اردو کے مذاق کی تخلیق میں، عجب نہیں کہ کچھ حصہ ان کا بھی ہو۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی وساطت سے پاکستان سے آمدہ اردو کے ادبی رسالے، اپنے کمرے لے جاتا اور ان سے بہت فائدے اٹھاتا۔ ہم مجبان ادب طلبہ، روزانہ دن یا رات میں ایک مرتبہ، ان کے پاس ضرور بیٹھتے اور شوقی زبان اردو کو بالیدہ کرنے کے ساتھ ساتھ، عقل و فکر کو بھی پختہ کرتے۔

دارالعلوم سے جانے کے بعد، مراسلت کے ذریعے ہمیشہ راہ نمائی کرتے رہے اور مادی و معنوی ہر طرح کی دست گیری سے، زندگی کے کسی بھی مرحلے میں دریغ نہیں فرمایا۔ رسمی طور پر میرے استاذ نہ ہونے کے باوجود، استاذ سے زیادہ کچھ جزاء اللہ خیر الجزاء (۱)۔

سوانحی خاکہ

☆ پیدائش: ۱۱ شعبان ۱۳۳۳ھ مطابق ۷ مارچ ۱۹۲۶ء، والد صاحب کا نام محمد شمس الدین تھا، جو ریلوے میں ملازم تھے، ان کی وفات ۱۹۴۶ھ/۱۳۶۵ء میں ہوئی۔

☆ وطن: موضع پورہ نوڈیہا، ضلع دربھنگہ، بہار، جو دربھنگہ سے جاپ شرق میں ۵۵ کلومیٹر کی دوری پر ”کمالا

(۱) جاسے تحریر میں مضمون: افریقی منزل قدیم، نزوح تہ مسجد، دیوبند، سہارن پور، یوپی۔ بدوقت ۱۰ بجے شب شنبہ، بد تاریخ: ۱۳۲۶/۶/۲۹ مطابق ۸/۶/۲۰۰۵ء۔

۱۳۲۶/۶/۲۹

ندی“ کے کنارے واقع ہے۔

✽ تعلیم ابتدائی و متوسط: ابتدائی تعلیم گھر پر، پھر مدرسہ محمودیہ، راج پور، ترائی نیپال میں۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک مدرسہ وارث العلوم چھپرا (بہار) میں جہاں اُن کے چچا زاد بھائی مولانا عبدالرحمن صاحب (متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء) امیر شریعت، پڑھاتے تھے۔ یہاں اُنھوں نے فارسی اور عربی کی کتابیں متوسطات تک پڑھیں۔

✽ اعلیٰ تعلیم: ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک آپ نے اعلیٰ تعلیم جامعہ مفتاح العلوم منو میں حاصل کی۔ آپ کے یہاں کے اساتذہ گرامی میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن عظمیٰ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء — ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) اور عالم وقائد مولانا عبداللطیف نعمانی منویٰ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۹ء — ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۳ء) مولانا محمد یحییٰ عظمیٰ، مولانا شمس الدین منویٰ وغیرہم تھے۔

✽ تدریسی و علمی خدمات: ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء میں فراغت کے بعد ایک سال مفتاح العلوم منو میں مڈرٹس رہے، اُس کے بعد ستمبر ۱۹۴۵ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک مدرسہ معدن العلوم، نگرام، ضلع لکھنؤ میں تین سال تدریسی خدمت انجام دی، جنوری ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم معینیہ موضع ”سانخ“ ضلع مونگیر (حال ضلع بیگوسرائے) میں مدرس ہوئے، یہاں ۱۹۵۶ء تک درس و تدریس میں مشغول رہے، درمیان میں ایک سال از محرم ۱۳۶۸ھ تا اواخر ۱۳۶۸ء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل و سملک، سابق ضلع سورت حال ضلع نوساری، میں تدریسی خدمتیں انجام دیں، وہاں بیمار ہو گئے؛ اِس لیے واپس دارالعلوم معینیہ سانخ آ گئے۔

● ندوۃ العلماء لکھنؤ میں: قابل ذکر ہے کہ مفتی صاحب مدظہ نے علامہ سید سلیمان ندوی کی تشویق و ترغیب پر شوال ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھنے کے لیے داخلہ لیا؛ لیکن وہاں کچھ مہینے ہی گزار سکے پھر ”نگرام“ ضلع لکھنؤ کے مدرسہ معدن العلوم میں حضرت مولانا محمد اویس ندوی نگرانی کی ذہن سازی کی وجہ سے مدرس ہو گئے۔ اُن کے ندوہ کے اساتذہ میں مولانا حلیم عطا شاہ، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد اسحاق سندیلوئی اور مولانا حمید الدین وغیرہ تھے۔

● دارالعلوم دیوبند میں: (۹ ستمبر ۱۹۵۶ء) ۳۳ صفر ۱۳۷۶ھ کو دارالعلوم میں شعبہ تصنیف و تالیف سے منسلک ہوئے۔ ۱۳۸۳ھ میں مَرْتَب کتب خانہ کے عہدے پر فائز ہوئے، اِسی دوران فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب کا عظیم الشان کام انجام دیا، جو ۱۲ جلدوں میں مسلسل شائع ہو رہا ہے، یہ سارے فتاویٰ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی کے ہیں۔ آپ کے مزید فتووں کی ترتیب کے سلسلے میں اب

دارالعلوم میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس وقت (۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء) میں ۱۳ ویں اور ۱۴ ویں جلدیں بعض سائنہ دارالعلوم کی نگرانی میں چھپ چکی ہیں۔

● مطالعہ علوم قرآنی کی نگرانی و سرپرستی: ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم میں ایک خصوصی شعبہ ”مطالعہ علوم قرآنی“ کے نام سے قائم کیا گیا جس کی سرپرستی، نگرانی اور رہنمائی کے لیے مجلس شوریٰ نے حضرت مفتی صاحب ہی کو منتخب کیا۔ یہ ۱۳۸۸ھ تک قائم رہا، اُس کے بعد بعض ذمہ داروں کے ایما سے اس کو بند کر دیا گیا۔ یہ شعبہ بہت کامیاب اور دارالعلوم کے ذہین طلبہ اور باصلاحیت فہلا کے لیے، اپنی علمی اور تحریری لیاقت کو پختہ کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔

✽ ادارہ رسالہ ”دارالعلوم“ کے لیے انتخاب: صفر ۱۳۸۵ھ میں مجلس شوریٰ نے رسالہ دارالعلوم کے ادارے کی تحریر کے لیے مفتی صاحب کو منتخب کیا اور انھیں باقاعدہ رکن ادارت قرار دیا۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ سے انھوں نے ادارہ لکھنا شروع کیا، یہ سلسلہ تقریباً ۷ سال تک جاری رہا، ۱۴۰۲ھ میں موقوف ہوا۔

● دارالافتاء میں مفتی: ۱۹۹۳ء میں آپ دارالافتاء میں مفتی دارالعلوم کے منصب کے لیے منتخب کیے گئے۔

۱۹ شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۱ اگست ۲۰۰۸ء بروز جمعرات تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۷/۸/۱۴۲۹

● ۲۰ شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز جمعہ کو خود سے سبک دوشی لے کر گھر چلے گئے۔ ۱۸/۸/۱۴۲۹

کیوں کہ کم زوری اور پیرانہ سالی کی وجہ سے، بہت سے اعذار پیدا ہو گئے تھے۔ دارالعلوم سے ۲۰۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ تاحیات کا اجر عمل میں آیا۔ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے۔

✽ تصنیفات: مفتی صاحبؒ میں تالیف و انشاء کا فطری ذوق ہے، زبان سادہ اور روان لکھتے ہیں، اُن کی تحریر ہر طرح کے تکلف سے پاک ہوتی ہے، انھوں نے بہت سی کتابیں اور سیکڑوں مقالات لکھے، جو ملک کے طول و عرض میں مختلف رسائل میں چھپے، انھیں جمع کر دیا جائے تو دسیوں کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ اُن کی مشہور کتابوں میں ذیل کی کتابیں ہیں:

- ۱- جماعت اسلامی کے دینی رجحانات ۲- اسلام کا نظام مساجد ۳- نظام عفت و عصمت ۴- نظام امن ۵- نظام تعلیم و تربیت ۶- نظام تعمیر سیرت ۷- اسلامی حکومت کے نقش و نگار ۸- تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ۹- تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری ۱۰- دینی جدوجہد کا روشن باب: امارت شرعیہ ۱۱- حکیم الاسلام اور اُن کی مجالس ۱۲- تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، دو جلدیں ۱۳- مشاہیر علمائے دیوبند ۱۴- دارالعلوم کا قیام اور اُس کا پس منظر ۱۵- حیات مولانا گیلانی۔

۱۶- اسلامی نظام معیشت - ۱۷- تاریخ المساجد - ۱۸- فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، بارہ جلدیں - ۱۹- جرم و سزا کتاب و سنت کی روشنی میں - ۲۰- اسوۂ حسنہ مصائب سرکارِ دو عالم (ﷺ) - ۲۱- زندگی کا علمی سفر (خود نوشت) - ۲۲- ترجمہ درمختار از ابتدا تا ختم کتاب الطلاق - ۲۳- درس قرآن - ۲۴- مسائل حج و عمرہ۔

✽ بیعت و خلافت: مفتی صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، اُن کے انتقال کے بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے دست گرفتہ ہوئے۔ آخر الذکر نے بیعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی؛ لیکن مفتی صاحبؒ اپنی سادگی اور بے نفسی کی وجہ سے ارشاد و ہدایت سے محنت رہے۔ (مزید معلومات کے لیے دیکھیے اُن کی خود نوشت ”زندگی کا علمی سفر“ شائع کردہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارن پور، یو پی)



مختصر تعارف مؤلف کتاب

- نام: (مولانا) نور عالم ظہیل امینی
- کنیت: ابواسامہ نور
- تاریخ پیدائش: جمعرات بدوخت فجر ۱۲/۱۲/۱۹۵۲ء (۱۳۷۲/۱۲/۲۸ھ)
- جائے پیدائش: (اپنی تخیال) موضع ”ہر پوریشی“ ضلع مظفر پور (بہار) جہاں اس وقت بھی رہائش ہے۔
- وطن اصلی و دھیمال: ”رائے پور“ ضلع ”سیتا موہی“ (سابق ضلع مظفر پور) بہار
- موجودہ اقامت: افریقی منزل قدیم، نزد چھ مسجد، دیوبند ۲۲۷۵۵۴، یو پی
- تعلیمی لیاقیت: (الف) فاضل
(ب) تخصص در عربی زبان و ادب
(ج) عربی زبان کی تدریس کی مہارت از کنگ سعودی یونیورسٹی، ریاض
- موجودہ ذمے داریاں: (الف) استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند
(ب) چیف ایڈیٹر ماہنامہ عربی رسالہ ”الدی“ دارالعلوم دیوبند
- عربی تالیفات: الصحابة ومكانتهم في الإسلام؛ مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام؛ المسلمون في الهند؛ الدعوة الإسلامية بين الأمس واليوم؛ مفتاح العربية؛ (دو جلدیں)؛ العالم الهندي الفريد؛ الشيخ المقرئ محمد طيب؛ فلسطين في انتظار صلاح دين۔
- اردو تالیفات: وہ کوہ کن کی بات؛ حرف شیریں؛ خطر قہ کیوں اور کیسے یکجہیں؛ صحابہ رسول اسلام کی نظر میں؛ موجودہ صلیبی صہیونی جنگ۔ جھٹکن اور دلائل؛ عالم اسلام کے خلاف حالیہ جنگ۔ کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟؛ فلسطین کی صلاح الدین کے انتظار میں۔
- تراجم: اردو سے عربی میں تقریباً ۲۵ کتابوں کا ترجمہ، یہ سبھی کتابیں چھپ چکی ہیں؛ نیز زائد از دو سو مقالات کا عربی ترجمہ جو مختلف عربی رسالوں میں ہندو بیرون ہند چھپ چکے ہیں۔
- مضامین و مقالات: علمی، فکری، دعوتی، لسانی، اجتماعی، سوانحی موضوعات اور مختلف ملی مسائل پر اردو اور عربی زبان میں پانچ سو سے زائد مضامین ہندو بیرون ہند کے رسالوں اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے الداعی دیوبند؛ البعث الاسلامی لکھنؤ؛ الراشد لکھنؤ؛ رسالہ دارالعلوم دیوبند؛ آئینہ دارالعلوم دیوبند؛ الدعوة ریاض؛ المحرس الوطنی ریاض؛ الفیصل ریاض؛ الجزيرة ریاض؛ الجمعۃ النبی دہلی؛ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ؛ الندوة مکہ مکرمہ؛ تعمیر حیات لکھنؤ؛ الفرقان لکھنؤ؛ ترجمان دارالعلوم جدید دہلی؛ رسالہ الحق پاکستان؛ اذان ہلال آگرہ؛ ریاض الجمعہ گورنمنٹی جونپور؛ ماہنامہ ہدایت بے پور؛ البدر کا کوری؛ سر روزہ دعوت نئی دہلی؛ اخبار مشرق کلکتہ؛ نقیب پٹنہ؛ راشتریہ سہارا اردو نئی دہلی؛ نئی دنیا دہلی؛ منصف حیدر آباد؛ انقلاب ممبئی؛ اردو ناگزیر ممبئی؛ عالمی سہارا نئی دہلی۔
- کانفرنسیں اور سیمینار: ہندو بیرون ہند دسیوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، جن میں سعودی عرب، کویت، مصر، امارات عربیہ متحدہ کی کانفرنسیں سر فہرست ہیں، ان ملکوں میں بار بار جانے کا اتفاق ہوا، جہاں علمی، ادبی، فکری و دعوتی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔

لآلئ منثورة

في التعبيرات الحكيمة عن قضايا الدين والأخلاق والاجتماع

المربي الكبير الشيخ الجليل العلامة «أشرف علي التهانوي»
المعروف بـ «حكيم الأمة» المتوفى ١٣٦٢هـ

تعريب: فضيلة الشيخ الأستاذ نورعالم خليل الأمين
أستاذ الأدب العربي ورئيس تحرير مجلة الداعي بالجامعة

ننشر: أكاديمية شيخ الهند

الجامعة الإسلامية دارالعلوم، ديوبند ، يوبي (الهند)



علماء ديوبند

اتجاههم الديني و مزاجهم المذهبي

تأليف

العالم الهندي الكبير الشيخ المقرئ محمد طيب رحمه الله

المعروف بـ « حكيم الإسلام »

الرئيس السابق للجامعة الإسلامية دارالعلوم / ديوبند (الهند)

١٣١٥ - ١٤٠٣ هـ / ١٨٩٧ - ١٩٨٣ م

تعريب :

نور عالم خليل الأميني

رئيس تحرير مجلة « الداعي » العربية الشهرية

وأستاذ الأدب العربي بالجامعة الإسلامية دارالعلوم / ديوبند (الهند)

قام بالنشر والتوزيع

الجامعة الإسلامية : دارالعلوم ، ديوبند ، الهند

العالم الهندي الفريد

الشيخ المقرئ محمد طيب

رئيس الجامعة الإسلامية دارالعلوم / ديوبند سابقا

تأليف

نور عالم خليل الأمين

رئيس تحرير مجلة « الداعي » العربية الشهرية
وأستاذ الأدب العربي بالجامعة الإسلامية دارالعلوم / ديوبند
ديوبند ، يوبي ، الهند



مؤسسة العلم والأدب ، أفريقي منزل قديم ، ديوبند ، الهند

اس کتاب میں

”اس کتاب کے مضامین، مُصَلَّقَہ شخصیتوں کے سوانح بھی ہیں، اُن کے سلسلے میں بھرپور تاثرات بھی اور اُن کے مکمل یا نامکمل خاکے بھی اور اُن کے عہد اور ماحول کے تذکرے بھی؛ اس لیے یہ ہر طرح کے قارئین کے لیے، اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ زبان کی چاشنی، شخصیتوں کے پیش کرنے کا خوب صورت انداز اور اُن کے حوالے سے سچائی نگاری، تحلیل و تجزیے میں دقیقہ رسی، فکر انگیزی اور خیال آفرینی کے اُسلوبِ جمیل کی وجہ سے، یہ کتاب تذکرہ نویسی کے فن میں، اپنی مثال آپ بن گئی ہے۔ مُصَنِّف کی سابقہ تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی اِن شاء اللہ قاری کے حسنِ ظن کے معیار پر نہ صرف مکمل اُترے گی؛ بل کہ اُس سے سوا ثابت ہوگی۔“



FBD

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (PVT.) LTD.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi-2
Phone : 23289786, 23289159, Fax : 23279998, Resi. : 23262486
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Website : faridexport.com faridbook.com

Rs 350/-